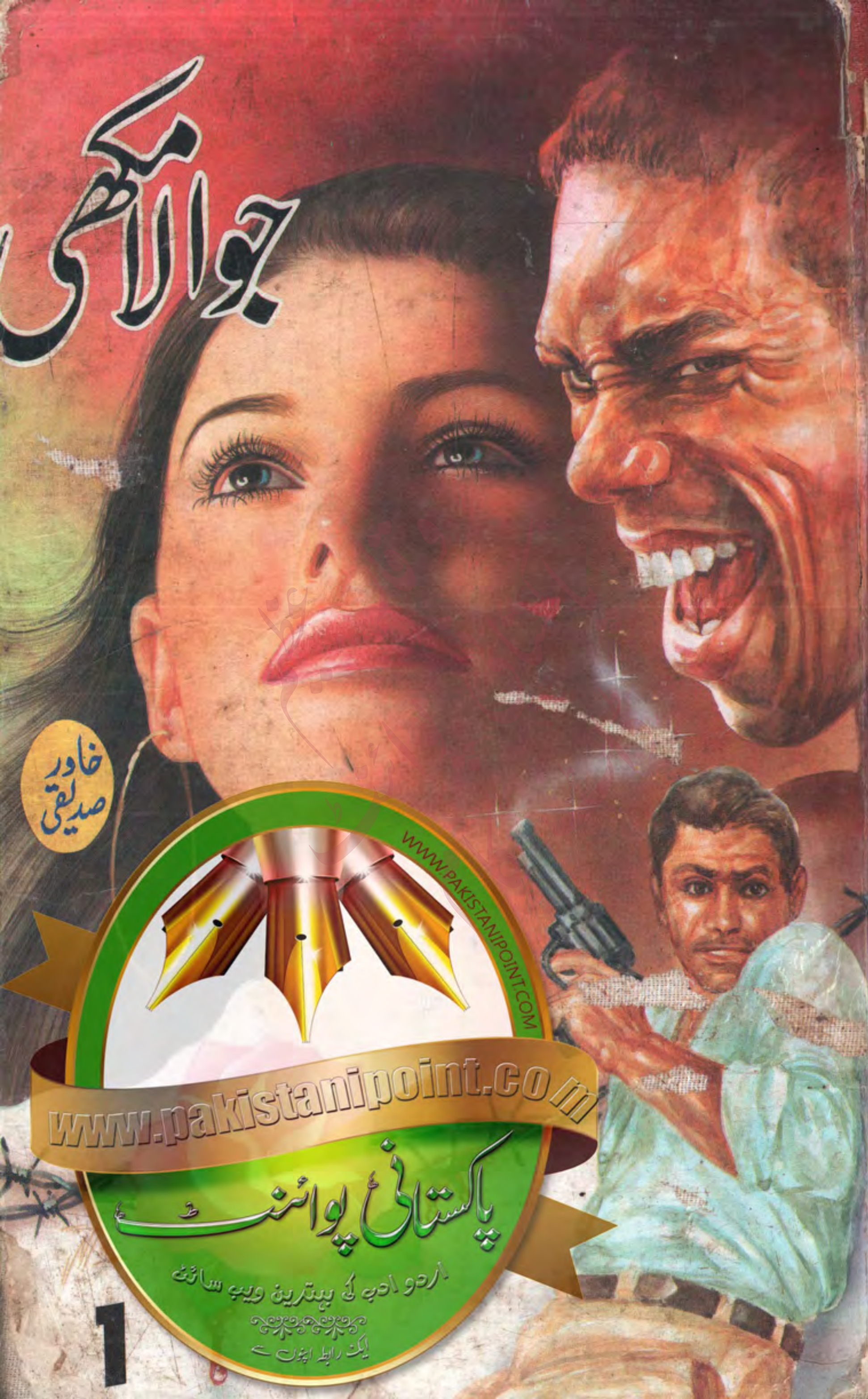
جوالا مکھی
خاور صدیقی
1
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
www.pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ
اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ
ایک رابطہ اپنوں سے

جوالا مکھی

۱

خاور صدیقی

ایک کفن بردوش نوجوان کی داستان لہو رنگ، موت جس کے ھم رکاب تھی۔

جوالا مکھی

1

خاور صدیقی

مکتبہ القریش، سرکلر روڈ، اردو بازار لاہور ۲، فون ۷۲۲۴۶۶۵

وہ دونوں جانوروں کی طرح لڑ رہے تھے۔ دونوں کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے' چہرے لہولہان تھے' اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس جنگ کا فیصلہ دونوں میں سے کسی ایک کی موت پر ہو گا۔ وہ دونوں ہی مضبوط تھے' اور دراز قدوقامت کے مالک تھے' مگر ان میں سے ایک کی حالت قدرے ابتر تھی۔ اس کے سر' اور داڑھی کے بال جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھے ہوئے تھے' جسم پر میل کی تہیں تھیں' اور وہ آہستہ آہستہ مغلوب ہو رہا تھا۔

میرے لیے یہ منظر انتہائی دہشت ناک تھا۔ میں گزشتہ آدھے گھنٹے سے گھنی جھاڑیوں میں چھپا یہ ہول ناک منظر دیکھ رہا تھا۔ پہلے داڑھی والا خستہ حال آدمی دوڑتا ہوا وہاں آیا تھا۔ اس کے تعاقب میں دوسرا آدمی تھا۔ انہیں دیکھ کر میں بوکھلا گیا' کیوں کہ میں تو خود بھی چھپتا پھر رہا تھا۔ میں پھرتی سے گھنی جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا' پھر وہ لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

اچانک فضا گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی۔ دوسرے ہی لمحے گھوڑوں پر سوار تین افراد بھی وہاں آ پہنچے۔ ان میں سے ایک سفید براق سلک کی شلوار قمیص میں ملبوس تھا' پیروں میں طلائی کام والے کھسے تھے' اور شانے سے ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ اس کا باوقار چہرہ اور تنی ہوئی گردن اس بات کی دلیل تھی کہ وہ ان سب لوگوں میں برتر ہے۔ اس کے ساتھ آنے والے بقیہ دو گھڑسوار پلے ہوئے سانڈوں کی طرح مضبوط تھے۔ ان کے چہرے کرخت تھے' شانوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں جنھیں انھوں نے اب ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

"اوئے لعنت ہے تجھ پر قادرے! چودھری رب نواز کا ملازم اور اتنا مردار!" باوقار شخص نے لڑنے والوں میں سے کسی کو مخاطب کیا۔ "تیرے قابو میں اب تک ایک بندہ نہیں آیا ہڈ حرام!"

نہ جانے ان دونوں میں سے قادر کون تھا؟ کیوں کہ وہ دونوں اتنے نڈھال ہو چکے تھے' کہ جواب دینے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھے۔

"او بس اوئے کسے سورمادی اولاد!" باوقار شخص تحقیر آمیز لہجے میں بولا' پھر وہ اپنے ساتھ آنے والوں سے مخاطب ہوا۔ "چل اوے جانو مکا دے کھیڑ۔"

اس کے ساتھ ہی گھڑ سواروں میں سے ایک نے جلدی سے کہا۔ "جو حکم چودھری صاحب!" پھر اس نے خستہ حال شخص کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ ویرانہ دھماکے اور خستہ حال شخص کی کرب ناک چیخ سے گونج اٹھا۔ گولی اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا گئی تھی۔ ایک جیتا جاگتا انسان میری نظروں کے سامنے موت کی نیند سو گیا تھا۔ میں اس منظر سے دہشت زدہ تو ہوا' مگر جلد ہی اپنی دہشت پر قابو پا لیا۔ انسانی موت کا منظر میرے لیے نیا نہیں تھا' کیوں کہ میرے ہاتھ تو خود انسانی خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اسی کی پاداش میں تو میں چھپا چھپا پھر رہا تھا' ورنہ ایک بارہ سالہ بچہ اس قسم کا منظر دیکھ کر بیہوش ہو جاتا۔ میری عمر بھی اس وقت بارہ سال تھی مگر اتنی سی عمر میں میرے ہاتھوں دو قتل ہو چکے تھے۔

"دبا دو اوئے اس کتے کو یہیں۔" چودھری نے یوں کہا جیسے مرنے والا واقعی کتا ہو۔

وہ خود ابھی تک گھوڑے پر سوار تھا' البتہ اس کے ساتھ آنے والے گھوڑوں سے اتر چکے تھے۔ قادر ایک طرف پڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اگر وہ لوگ کچھ دیر اور نہ آتے تو شاید اس خستہ حال شخص کی جگہ قادرے کی لاش پڑی ہوتی۔

گھڑ سواروں سے ایک ان جھاڑیوں کی طرف بڑھا' تو غیر ارادی طور پر میں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ اچانک میرے بازو میں ایک کانٹا پیوست ہو گیا۔ بے اختیار میرے منہ سے سسکاری نکل گئی۔ جانو نے چونک کر جھاڑیوں کی طرف غور سے دیکھا' پھر گرج دار لہجے میں بولا۔ "کون ہے اوئے تو؟ باہر آ ورنہ گولی مار کر وہیں ڈھیر کر دوں گا۔" اس نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ ان کے سامنے جانا گویا موت کو دعوت دینا تھا۔ جیسے انھوں نے اس آدمی کو مار دیا تھا' وہ مجھے بھی مار سکتے تھے' کیوں کہ میں اس قتل کا چشم دید گواہ تھا۔ میرے ابو بہت بڑے بیرسٹر تھے اس لیے میں جانتا تھا' کہ چشم دید گواہ کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔

میں جھاڑیوں میں سے باہر نکلنے کی بجائے اندر ہی اندر مخالف سمت میں بھاگا میرے پیچھے سے کوئی چیخ کر بولا۔ "رک جا اوے ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"مگر میں رکا نہیں۔ مرنا تو ویسے دونوں صورتوں میں تھا اس لیے جان بچانے کی ایک کوشش کرنا زیادہ مناسب تھا۔

"او پھڑو اوئے ایس منڈے نوں۔" چودھری گرج کر بولا۔ "ورنہ تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

پھر پے درپے کئی فائر ہوئے' مگر گولیاں مجھے گزند پہنچائے بغیر گزر گئیں۔ جھاڑیوں میں دوڑنے کی وجہ سے میرا لباس پھٹ گیا تھا' اور کانٹوں سے جسم لہولہان ہو گیا تھا' مگر میں جان توڑ کر بھاگ رہا تھا۔ ایک فائدہ البتہ مجھے تھا کہ جھاڑیوں کی وجہ سے وہ گھوڑوں پر بیٹھ

کر میرا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ جھاڑیوں ہی کی وجہ سے وہ میرا درست نشانہ بھی نہیں لے پا رہے تھے ورنہ اب تک میری کھوپڑی کے بھی پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا' اور ایسا لگ رہا تھا' جیسے کسی بھی لمحے میرے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے' حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے' مگر جب موت تعاقب میں ہو تو قریب المرگ انسان کے جسم میں بھی توانائی آ جاتی ہے۔

اچانک مجھے ایک گھنا درخت نظر آیا۔ میں نے لمحوں میں فیصلہ کیا' اور بندر کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے میں بھی کئی درخت تھے' میں ان پر چڑھتا رہتا تھا۔ اس لیے وہی مہارت میرے کام آئی تھی۔ کافی بلندی پر جاکر میں نے خود کو درخت کی گھنی شاخوں میں چھپا لیا' اور دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے مجھے آس پاس کا منظر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے درخت پر چڑھنے کا فیصلہ بروقت کیا تھا' کیوں کہ اس کے بعد کھلا میدان تھا' اور کچھ ہی فاصلے پر خاصی بڑی ایک نہر تھی۔

چودھری کے دونوں آدمی پاگل کتوں کی طرح بھاگے چلے آ رہے تھے۔ چودھری خود گھوڑے پر لمبا چکر کاٹ کر نہر کے کنارے آ پہنچا تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی جسے چودھری نے قادر کہہ کر مخاطب کیا تھا شاید ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا۔ اس میں تو فوری طور پر چلنے پھرنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔

پھر چودھری کے پلے ہوئے دونوں سانڈ بھی چودھری کے پاس جا پہنچے۔ ان میں سے ایک اپنا سانس درست کرتے ہوئے گھگھیا کر بولا۔ "چودھری صاحب! لگتا ہے وہ منڈا نہر میں کود گیا۔"

دوسرا بھی خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "پانی بہت تیز ہے چودھری جی وہ منڈا خود ہی مر جائے گا۔"

"بکواس بند کرو اوئے بڈ حرامو! اس کا ہاتھ آنا بہت ضروری ہے۔ اسے ڈھونڈو' زندہ نہ ملے تو اس کی لاش لے کر آؤ' سمجھے۔" پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا اور وہ بولا۔ "وہ قادر بھی کیا اس مردود آصف کے ساتھ مر گیا۔" اس سے کہو وہ لاش کو کھڈا کھود کر دفن کر دے' اور تم دونوں اس منڈے کو ڈھونڈو۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر تم لوگ خالی ہاتھ لوٹے تو تم پر کتے چھوڑ دوں گا۔"

ان میں سے ایک اچانک بولا۔ "چودھری صاحب! حویلی جا کر میں کتے نہ لے آؤں۔ کتے تو فوراً اسے ڈھونڈ لیں گے۔ اس وقت تک جانو اور قادرا یہاں موجود رہیں گے۔"

چودھری پہلی دفعہ مسکرایا اور بولا۔ "واہ اوئے' ترکیب تو تیری اچھی ہے' چل پھر تو' تو کتے لے کر آ جا۔ جانو یہیں رہے گا۔" یہ کہہ کر چودھری نے گھوڑے کا رخ موڑا' اور

تیز رفتاری سے روانہ ہو گیا۔
میں نے سوچا کہ جان بچانے کا یہی موقع ہے۔ قادرا تو بھاگ دوڑ کے قابل ہی نہیں ہے مجھے خطرہ صرف جانو کی طرف سے تھا' جو رائفل لے کر اسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے جنگل اور دریا کا کنارا صاف نظر آ رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں لرز رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں کتے آ جائیں گے' پھر وہ لوگ مجھے مار کے یہیں کہیں دفن کر دیں گے' یا ہو سکتا ہے کتے مجھے اس قابل ہی نہ چھوڑیں کہ مجھے دفن کیا جائے۔
میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے میں مصروف تھا کہ کسی طرح جانو پر قابو پا لوں یا اسے جل دے کر نکل جاؤں۔ اس پر قابو پانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کہاں ایک بارہ سالہ کمزور لڑکا اور کہاں ایک پلا پلایا سانڈ جس کا کام ہی شاید قتل و غارت گری تھا۔ میں یوں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ جانو کی پشت میری جانب تھی' مگر وہ بہت چوکنا بیٹھا تھا۔ پتا بھی کھڑکتا تھا تو وہ چونک اٹھتا تھا۔
"خیر دیکھا جائے گا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا زندگی ہوئی تو بچ جاؤں گا' ورنہ مرنا تو ہے ہی۔" یہ سوچ کر میں بہت آہستگی سے نیچے کی طرف کھسکنے لگا۔ میں بہت محتاط انداز میں ایک ایک انچ کر کے نیچے اتر رہا تھا۔ آخر بہت آہستگی سے میں زمین پر پہنچ گیا۔ جانو نے سگریٹ سلگائی تھی اور بھونڈی آواز میں "سانوں نہر والے پل تے بلا کے" گنگنا رہا تھا۔
میں نے کسی ایسی چیز کی تلاش میں آس پاس نظریں دوڑائیں جس سے اس پہ وار کر سکوں۔ آخر مجھے ایک خاصا بڑا پتھر نظر آ گیا۔ میں بلی کی سی پھرتی سے آگے بڑھا اور وہ پتھر اٹھا لیا۔ وہ عین وقت پر پلٹ پڑا۔ زاویہ بدلنے سے پتھر بجائے اس کے سر پر پڑنے کے دائیں شانے پر پڑا۔ اس کے حلق سے اذیت ناک چیخ بلند ہوئی اور وہ مجھے غلیظ گالیاں بکتا ہوا دہرا ہو گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ بے جان سا ہو کر پہلو میں جھول گیا۔ میں دیوانہ وار دریا کی طرف بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا' تو اس کی سخت جانی پر حیرت ہوئی وہ بائیں ہاتھ میں رائفل سنبھالے میرے پیچھے دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا' گو کہ اس حالت میں وہ میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا' مگر چودھری اور اس کا دوسرا ملازم کسی بھی وقت کتوں سمیت آ سکتے تھے' پھر مجھے قادرے سے بھی خطرہ تھا۔ اتنی دیر میں وہ بھی تازہ دم ہو چکا ہو گا۔ اپنے ساتھی کی چیخ یقیناً اس نے بھی سنی ہو گی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بھی میرا پیچھا کر سکتا تھا' کیوں کہ وہاں ابھی ایک گھوڑا بھی موجود تھا۔
میں دیوانوں کی طرح بھاگا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کہ مجھے کس طرف بھاگنا چاہیے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں اس وقت کس علاقے میں ہوں۔ دریا کے کنارے بھاگتے بھاگتے مجھے کئی منٹ ہو چکے تھے۔ میں اس دوران میں کئی کلو میٹر

بھاگ چکا تھا۔

اب دریا کے کنارے بائیں جانب کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر ان جھاڑیوں میں گھس گیا۔ گھنی جھاڑیوں کے درمیان ایک پگڈنڈی سی بن گئی تھی' جو بل کھاتی ہوئی نہ جانے کہاں جا رہی تھی۔ اس پہ بیل گاڑی کے پہیوں' اور مویشیوں کے پیروں کے نشانات واضح تھے۔

میں کچھ اور آگے بڑھا تو وہ پگڈنڈی دو حصوں میں بٹ گئی۔ میں اس دوراہے پر پہنچا تو ایک جیپ کو دیکھ کر میرے پیروں کی جان نکل گئی۔ میری اب تک کی بھاگ دوڑ رائیگاں ہی گئی تھی۔ چودھری اس دفعہ شاید گھوڑے کی بجائے جیپ میں آیا تھا' اور اس نے کوئی مختصر راستہ اختیار کیا تھا۔ مجھے اچانک تھکن کا شدید احساس ہوا' گو کہ اب بھاگنا فضول تھا کیوں کہ جیپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا' پھر کیا ضروری تھا کہ وہ میرا تعاقب ہی کرتے۔ رائفل کی ایک ہی گولی میرا کام تمام کرنے کو کافی تھی۔ اس کے باوجود میں ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی ہمت مجتمع کی اور شدید تھکن کے باوجود جیپ کی مخالف سمت میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اچانک کسی نے چیخ کر کہا۔ "رک جا اوئے' کون ہے تو؟"

مگر میں رکا نہیں۔ آہستہ آہستہ جیپ کے انجن کی گڑگڑاہٹ نزدیک آتی جا رہی تھی' پھر وہ بالکل میرے سر پر پہنچ گئی۔ میں گولی کا منتظر تھا' جو کسی بھی لمحے میرے جسم میں پیوست ہو سکتی تھی' پھر جیپ میں سے کوئی کودا اور اس نے دوڑ کر مجھے اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ چودھری کا کوئی اور آدمی تھا۔ حلیہ اس کا بھی تقریباً ویسا ہی تھا' مگر اس سے پہلے میں نے اسے چودھری کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔ "کون ہے تو اور کہاں بھاگا جا رہا ہے؟" اس کے لہجے میں کرختگی نہیں تھی۔

میں کوئی جواب دینے کے قابل ہی نہیں تھا' کیوں کہ میرا سانس پیٹ میں نہیں سما رہا تھا۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی' مگر ناکام رہا' پھر مجھے زور دار چکر آیا' اور میں زمین پر گرنے لگا۔ اس آدمی نے مجھے گرنے نہیں دیا بلکہ اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال کر نرمی سے زمین پر بٹھا دیا۔

اسی وقت جیپ سے ایک اور شخص نیچے اترا۔ اس نے خاکستری رنگ کی ڈھیلی ڈھالی بشرٹ اور اسی رنگ کی پینٹ پہن رکھی تھی' پیروں میں لانگ بوٹ تھے' اور ہونٹوں میں پائپ دبا ہوا تھا۔ وہ خاصا باوقار اور وجیہہ آدمی تھا۔ اس نے پائپ بائیں ہاتھ میں تھاما اور شستہ لہجے میں بولا۔ "نادر خان اسے پانی پلاؤ۔ نہ جانے بیچارہ کون ہے اور کس سے خوف

زدہ ہو کر بھاگ رہا ہے۔" گو کہ اس کا لہجہ نرم تھا' مگر اس میں تحکم کی جھلک تھی۔
پھر ایک اور آدمی جیپ سے باہر کودا۔ اس نے پچھلے حصے سے کولر اور گلاس نکالا اور گلاس بھر کے مجھے تھما دیا۔ ٹھنڈا پانی پی کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے اس سے مزید پانی مانگا۔ یکے بعد دیگرے دو گلاس پی کر میں اس قابل ہو گیا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔
"تم کون ہو بیٹا؟" باوقار شخص نے نرم لہجے میں پوچھا۔
مجھے ابھی تک یہی خوف تھا کہ کہیں یہ بھی چودھری کے آدمی نہ ہوں۔ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر نادر خان نے کہا۔
"ڈرو مت بیٹا! اگر تمہیں کسی سے خطرہ ہے تو ہمیں بتاؤ' اب تم ملک صاحب کی پناہ میں ہو۔"
"وہ --- وہ --- چودھری رب نواز ---"
"کیا کیا ہے اس حرام زادے نے؟" ملک صاحب نے میری بات کاٹ دی۔
میں سمجھ گیا کہ ملک صاحب کا چودھری رب نواز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جان کر مجھے خاصا اطمینان ہوا' اور میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا --- "اس نے میری آنکھوں کے سامنے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ میں جھاڑیوں میں چھپا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔" پھر میں نے اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا کہ کیسے میں نے قتل ہوتے دیکھا اور کیسے ہاں سے فرار ہوا۔
"چلو گاڑی میں بیٹھو۔" ملک صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔ "باقی باتیں حویلی چل کر کریں گے۔ تم بھوکے پیاسے بھی ہو۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "تمہارا نام کیا ہے اور تم اس علاقے میں کیا کر رہے ہو؟"
یہی وہ سوال تھا جس سے میں بچنا چاہ رہا تھا' مگر جواب دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے کہا۔ "میرا نام خرم ہے۔ لیاقت پور کے قریب ٹرین کا جو حادثہ ہوا ہے' میں اسی ٹرین میں سوار تھا۔" ملک صاحب نے حیرت سے کہا۔ "لیاقت پور تو یہاں سے بہت دور ہے۔" پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ "ابھی تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو اس لیے میں تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔" پھر وہ نادر خان سے مخاطب ہوئے۔ "اس لڑکے کے آرام کا خیال رکھنا میں شام کو اس سے ملاقات کروں گا۔"
اس وقت تک ہم حویلی پہنچ چکے تھے۔ جیپ دیکھتے ہی ملازموں نے حویلی کا بلند و بالا پھاٹک کھول دیا' اور جیپ اندر جا کر رک گئی۔
نادر خان نے مجھ سے کہا۔ "تم میرے ساتھ آؤ۔"
میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ حویلی کا وسیع و عریض دالان طے کر کے ہم اندرونی

کمروں کی طرف پہنچے۔ وہ حصہ شاید ملازمین کے لیے مخصوص تھا' کیوں کہ نہ تو کمروں میں قیمتی سامان تھا' نہ سجاوٹ کی دوسری اشیاء۔ نادر خان نے مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ اس سے ملحق ایک غسل خانہ بھی تھا۔ کمرے میں ایک پلنگ پر میلا سا بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ پرانی سی ایک میز اور ٹوٹے پھوٹے دو مونڈھے۔ یہ تھی اس کمرے کی کل کائنات۔ نادر خان نے مجھ سے کہا کہ تم غسل خانے میں جا کر نہا لو' اپنے کپڑے بھی دھو لینا۔ ہاں ٹنکی میں پانی موجود ہے۔ وہیں تمہیں صابن بھی مل جائے گا' پھر وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتا ہوں۔

اس نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا۔ چونکا تو میں اس وقت جب اس نے باہر دروازے کی کنڈی چڑھائی۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے لرز کر سوچا' کیا ملک بھی چودھری رب نواز کا آدمی ہے' اور وہ مجھے قتل کر دے گا؟ یہ سوچ کر میرا جسم پسینے میں تر ہو گیا۔ باہر سے دروازہ بند کرنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ مجھے یہاں قید کر دیا گیا ہے' پھر اگر میں ملک صاحب کا مہمان ہوتا تو کیا وہ مجھے یوں حقارت سے اس کمرے میں پھنکوا دیتے! میں عالم اضطراب میں ٹہلنے لگا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ جب مرنا ہی ہے تو ایک آدھ کو مار کر ہی مرا جائے۔ جب سے میں نے قتل کیے تھے' میری سوچ کچھ اسی قسم کی ہو گئی تھی۔ میں غسل خانے میں جا کر خوب دیر تک نہاتا رہا۔ کپڑے اس قابل نہیں تھے کہ انہیں استعمال کیا جاتا' کیونکہ وہ جھاڑیوں میں الجھ کر پھٹ گئے تھے۔ نہا دھو کر میں نے وہ میلے کپڑے ہی پہن لیے۔ نہانے سے یوں لگ رہا تھا جیسے میں دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا' اور نادر خان کھانے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور آدمی تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا جگ' گلاس اور دوسرے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ نادر خان نے ٹرے میری طرف بڑھائی' اور مونڈھا کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ دوسرا شخص جگ اور لالٹین دے کر واپس چلا گیا۔ میں نے نادر خان سے کوئی بات کیے بغیر کھانا شروع کر دیا۔ میں کئی گھنٹوں سے بھوکا تھا اس لئے بھوکوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا' اور ذرا سی دیر میں سارا کھانا چٹ کر گیا۔ پیٹ بھر کے کھانے کو ملا تو ایسا لگا جیسے کسی نے میرے مردہ جسم میں جان ڈال دی ہو۔ میں نے نادر خان کو دیکھا' وہ اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ایک بات پوچھوں نادر چاچا۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "چاچا---" پھر بلند آواز میں بولا۔ "پوچھو بیٹا!" اس لمحے اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

مجھے--- ایسا--- لگتا ہے نادر چاچا کہ--- میں یہاں--- قید ہوں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"او نئیں پتر!" اس نے مسکرا کر کہا۔ "تو' تو ملک صاحب کا مہمان ہے۔"

"نہیں چاچا!" میں نے کہا۔ "میں اگر مہمان ہوتا تو تم مجھے اس کمرے میں بند کرکے نہ جاتے پھر--- ملک صاحب کے مہمان کیا ایسے ٹوٹے پھوٹے کمروں میں رہتے ہیں' ایسے غلیظ بستروں پر سوتے ہیں۔"

نادر خان ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ "پتر تو بہت ذہین ہے' اتنی سی عمر میں اتنی باتیں کرتا ہے۔" پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "سردارا بھی بالکل ایسا ہی تھا' اتنا ہی خوبصورت' اور ذہین۔"

"کون سردارا؟" میں نے تاسف بھرے لہجے میں پوچھا' کیونکہ نادر خان ایسا فولادی انسان آنسو بہا رہا تھا۔

"وہ--- وہ مجھ سے--- روٹھ کر بہت دور چلا گیا ہے۔ پتر--- وہ---" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور قمیص کے دامن سے آنسو پونچھنے لگا' پھر وہ بغیر کچھ کہے اٹھا اور کھانے کے خالی برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔ دروازہ پھر اس نے پہلے کی طرح باہر سے بند کر دیا۔

کمرے میں آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ باہر ابھی اچھا خاصا اجالا تھا' کیونکہ دروازہ کھلتے وقت میں نے باہر کا منظر دیکھ لیا تھا۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی' مگر اس میں تختے جوڑ کے اسے بند کر دیا گیا تھا۔ خاصی بلندی پر ایک روشن دان تھا' جس میں سے برائے نام روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو بستر پر لیٹ گیا۔ جسم کو آرام ملا تو مجھ پر آہستہ آہستہ غنودگی چھانے لگی' پھر نہ جانے کب میں گہری نیند سو گیا۔

○

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ کمرے میں لالٹین موجود تو تھی' مگر اسے کسی نے جلایا نہیں تھا' پھر ایسا لگا جیسے کسی نے بہت احتیاط سے دروازہ بند کیا ہو۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ممکن تھا کہ میں چیخ اٹھتا' مگر میں نے بمشکل تمام خود پر قابو پایا' اور بہت آہستگی سے بستر سے نیچے اتر کر پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ کوئی دبے قدموں میرے پلنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے سانس تک روک لی' پھر آنے والا میرے پلنگ کے پاس آ کر رک گیا' اور میرا بستر ٹٹولنے لگا۔ مجھے بستر پر نہ پا کر اس نے ایک دم ٹارچ جلا دی۔ کمرے میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا' پھر اندھیرا چھا گیا' پھر نادر خان کی سرگوشی نما آواز سنائی دی۔ "خرم پتر! کہاں ہے تو؟ ڈرو مت بیٹا' میں نادر خان ہوں۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میرا اس پر اعتماد کرنے کو جی چاہا۔ بے اختیار میں پلنگ کے نیچے سے نکل آیا اور بولا۔ "میں یہاں ہوں چاچا!"

"آہستہ بول پتر!" اس نے سرگوشی کی۔ "چل جلدی کر یہاں سے بھاگ جا ورنہ یہ لوگ تجھے چودھری رب نواز کے حوالے کر دیں گے۔"

"مگر کیوں چاچا! میں نے ـــــ"

"باتوں کا وقت نہیں ہے پتر! باہر گھوڑا تیار ہے خود تجھے ٹیشن پر چھوڑ کر آؤں گا۔ میرے پیچھے آ جا۔ میں تجھے راستے میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

میں نے دل میں سوچا کہ شاید یہ مجھے جھانسہ دے کر اپنے طور پر چودھری رب نواز کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ وہاں سے اسے بھاری رقم ملنے کی توقع رہی ہوگی۔

"کیا سوچ رہا ہے خرم؟"

نادر خان کی سرگوشی میں جھنجلاہٹ تھی۔ "تجھے پہنچا کر صبح ہونے سے پہلے مجھے واپس بھی آنا ہے۔ چل شاباش جلدی کر۔"

پھر میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا' اور نادر خان کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر بھی گھپ اندھیرا تھا' کیونکہ چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں' لیکن کمرے کی نسبت باہر پھر بھی کچھ اجالا تھا۔ بڑے دروازے کی طرف جانے کی بجائے نادر خان دائیں ہاتھ کی طرف گھوم گیا۔ برآمدے سے گزر کر ہم حویلی کے ایسے حصے میں پہنچ گئے جہاں آم' امرود' اور بیری کے بہت سے درخت تھے۔ نادر خان نے مجھے ایک ایسے درخت پر چڑھنے کا اشارہ کیا جو حویلی کی بلند و بالا دیوار کے بالکل نزدیک تھا۔ میں پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا۔ میرے پیچھے پیچھے نادر خان بھی آ گیا۔ درخت کے ذریعے ہم لوگ دیوار پر پہنچے۔ دیوار کی دوسری طرف ہرے بھرے درخت تھے۔ نادر خان کود کر پہلے خود نیچے اترا' پھر مجھے بھی کودنے کا اشارہ کیا۔ میں دھپ سے زمین پر کود گیا۔ میرے کودنے سے اچھی خاصی دھمک پیدا ہوئی' نادر خان نے پھرتی سے ریوالور نکال لیا اور چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا' پھر وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا۔ آگے گہری تاریکی میں درخت کے تنے سے ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ نادر خان نے گھوڑے کی لگام تھامی' مجھے آگے بٹھایا' اور گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم گھوڑے کی پیٹھ پر گولی کی سی رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ نادر خان بلاشبہ بہترین گھڑسوار تھا۔

"تم نے بتایا نہیں نادر چاچا! ملک صاحب مجھے چودھری رب نواز کے حوالے کیوں کر رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"او نئیں پتر!" نادر خان نے جواب دیا۔ "وہ دونوں تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ تو چودھری کے قتل کا گواہ ہے نا' ملک صاحب تیرے بدلے اس سے کوئی سودا کرنے والے تھے۔"

"پھر--- تم کیوں مجھے یہاں سے نکال رہے ہو؟ کہیں میری وجہ سے تمہاری جان خطرے میں نہ پڑ جائے۔"

"میری فکر مت کر پتر!" نادر خان نے جواب دیا۔ "ملک صاحب کے خیال میں تو میں رسول پور میں ہوں۔ مجھ پر تو وہ شک کر ہی نہیں سکتے۔ ادھر رسول پور میں اپنا ایک یار ہے وہ بھی گواہی دے گا کہ نادر رات میرے پاس ٹھہر کر صبح گیا تھا۔ مصیبت آئے گی لطیف کی' وہ نشہ کر کے مردوں کی طرح پڑا ہو گا۔" پھر وہ ذرا رک کر بولا۔ "میں تجھے سمہ سٹہ سے گاڑی میں چڑھا دوں گا۔ تجھے وہاں سے لاہور کی گاڑی مل جائے گی۔"

"میں لاہور نہیں جاؤں گا چاچا!" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں لاہور ہی سے تو فرار ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے کراچی جانا ہے۔ میں لاہور سے نکلا ہی اسی ارادے سے تھا' کہ کراچی جاؤں گا۔"

"وقت اتنا کم ہے کہ میں تجھ سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ تو کہاں سے آیا ہے؟ کس مصیبت میں گرفتار ہے؟ اور اس ویرانے میں کیا کر رہا تھا؟"

اس نے کچھ اتنی اپنائیت سے یہ باتیں پوچھی تھیں' کہ میرا دل بھر آیا' اور آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔ میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "میرے پاس بتانے کو ہے ہی کیا۔ والدین کا سایہ اٹھ گیا' تو جائیداد کے لالچ میں چچا میرے اور بہن کے دشمن ہو گئے۔ میں اپنی اور اس کی جان بچانے کی خاطر لاہور سے بھاگا تھا' مگر بہن یہیں سے مجھ سے بچھڑ گئی۔" اس سے جھوٹ بولتے ہوئے مجھے انتہائی ندامت ہو رہی تھی' مگر میں نے ایک بات سچ بتائی تھی' کہ میں واقعی اپنی بہن کو کھو چکا تھا۔

"دولت اور جائیداد نے تجھے اتنی سی عمر میں دربدر کر دیا ہے۔" نادر خان کے لہجے میں تاسف تھا۔ "تو مجھے کراچی کا بتا دے۔ ہو سکا تو کراچی آؤں گا۔"

"میں صرف ایک مرتبہ کراچی گیا تھا چاچا! وہاں ابو کے ایک دوست رہتے ہیں۔ ان کا صحیح پتا تو مجھے معلوم نہیں' میں تمہیں پتا کیا دوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر زندگی رہی تو پھر کہیں ملاقات ہو جائے گی۔"

اب دور سے مجھے تیز روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ نادر خان نے بتایا کہ وہ سمہ سٹہ کا اسٹیشن ہے۔ وہاں سے تجھے کراچی کے لیے گاڑی مل جائے گی' مگر میں اسٹیشن پر نہیں جاؤں گا۔" اس نے گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔ "وہاں ملک صاحب کے کسی آدمی نے دیکھ لیا تو میری مصیبت آ جائے گی۔"

ہم دونوں گھوڑے سے اتر گئے تھے۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے' اور زبردستی میری جیب میں ٹھونس دیئے۔ حویلی سے روانہ ہونے سے پہلے نادر خان میرے لئے نہ جانے کہاں سے ایک کرتا' شلوار' اور ایک کھسا لے آیا تھا۔ پیسے میرے پاس

پھڑا کر رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر انسان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے' اور میں انسانوں میں نہیں بلکہ درندوں میں گھر گیا ہوں۔ اچانک گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ ان میں سے ایک چونک کر بولا۔ "گاڑی کہاں رک رہی ہے۔" یہ کون سا اسٹیشن ہے؟"

"ہو گا کوئی اسٹیشن!" دوسرا بے زاری سے بولا۔ "تو جلدی جلدی سامان سمیٹ۔"

پھر نیچے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے اس بدنصیب مسافر کا سامان سمیٹ رہے ہوں۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر وہ سوٹ کیس اٹھایا تو میں نے سانس تک روک لیا۔

"اس کے پاس اور کچھ نہیں تھا۔" ان میں سے ایک بولا۔ "ایک سوٹ کیس' ایک بیگ کیس' ہولڈال اور ایک باسکٹ تھی۔"

گاڑی آہستہ ہو کر رک گئی۔ وہ دونوں پھرتی سے نیچے اتر گئے۔ وہ شاید کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ گاڑی فوراً ہی پھر روانہ ہو گئی۔

جب گاڑی نے رفتار پکڑی تو میں ڈرتے ڈرتے نیچے اترا۔ پہلے میں نے ڈبے کا بلب جلا کر روشنی کی' پھر اس مسافر کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ چوروں نے اسے قتل نہیں کیا تھا' بلکہ صرف بیہوش کر دیا تھا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں نے سوچا میں بھی اسے اسی حال میں چھوڑ کر اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں' کیوں کہ ہوش میں آکر وہ مجھ پر بھی چوری کا الزام لگا سکتا تھا' مگر چلتی گاڑی سے بھاگ کے میں جا بھی کہاں سکتا تھا۔

مسافر اچانک کسمسایا' اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا مگر فوراً ہی اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ شاید ان لوگوں نے اس کے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل گئی۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "کہاں گئے دو اچکے؟"

"وہ تو پچھلے اسٹیشن پر اتر گئے۔" میں نے سہم کر کہا۔

"مگر تم بھی مجھے ان کے ساتھی لگتے ہو' میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا تو پولیس خود ہی ان کا نام پتا معلوم کرے گی۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے جناب!" میں نے جلدی سے کہا۔ "میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔"

"جھوٹ بھی بولتا ہے!" وہ گرج کر بولا۔ "تو سمجھتا ہے مجھے دھوکا دے دے گا۔ مجھے یہ بتا تو نے حلیہ کیوں بدل رکھا ہے؟ اس قسم کے کپڑے تو نے پہن رکھے ہیں' وہ لوگ اتنی صاف اور شستہ زبان استعمال نہیں کر سکتے' تیرے بال بھی جدید انداز میں ترشے ہوئے ہیں۔ سچ سچ بتا دے وہ لوگ کون ہیں اور کہاں گئے ہیں؟"

"آپ یقین کریں جناب!" میں نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ "میں تو اوپر کی

برتھ پر بے خبر سو رہا تھا' آنکھ کھلی تو وہ لوگ آپ کا سامان سمیٹ رہے تھے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو بے شک آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں۔" یہ کہتے ہوئے میرے آنسو بہنے لگے۔

"میں تجھے ضرور پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ تو کیا سمجھتا ہے' تیرے رونے سے میں پگھل جاؤں گا۔"

یہ ایک نئی مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ میں ہر صورت میں اس عذاب سے بچنا چاہتا تھا۔ مجھے تو پولیس کا نام سن کر ہی دہشت ہو رہی تھی۔ پولیس مجھے گرفتار کرتی تو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ میں قاتل ہوں' پھر مجھے پھانسی کے پھندے سے کون بچا سکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ گاڑی کی رفتار جونہی کم ہوگی میں نیچے کود جاؤں گا۔ بظاہر میں بہت عاجزی سے اس شخص کے سامنے بیٹھا تھا' مگر دل ہی دل میں کودنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔

وہ شخص اس زعم میں تھا کہ یہ کمزور سا لڑکا جسمانی طور پر میرا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے اس لئے اس نے صرف میرا ہاتھ پکڑنا ہی کافی سمجھا تھا۔ میں نے بھی اپنے رویے سے اسے محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں مسکین سی صورت بنائے اس کے سامنے بیٹھا تھا' اور مسلسل گڑگڑا رہا تھا کہ مجھے معاف کر دیجئے' میرا کوئی قصور نہیں ہے۔

اب صبح کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ گاڑی کی رفتار ایک مرتبہ پھر سست ہو رہی تھی۔ پھر دور ہی سے مجھے اسٹیشن کی روشنیاں دکھائی دیں۔ گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ روہڑی کا اسٹیشن تھا۔ ان صاحب نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا گاڑی جونہی دھچکے سے رکی میں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور ان صاحب کو سیٹ پر دھکیل کر باہر کی طرف لپکا۔ میں پلیٹ فارم کی مخالف سمت کودا اور پیچھے دیکھے بغیر بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے ان صاحب کے چیخنے کی آواز تو آئی' مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اپنے خیال میں تو مجھے پکڑ کر وہ مطمئن ہو گئے تھے' اور غالباً انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں ان اٹھائی گیروں کا ساتھی ہوں ورنہ شاید وہ وہیں زنجیر کھینچ لیتے جہاں انھیں ہوش آیا تھا۔

مجھے اپنے پیچھے لوگوں کا شور سنائی دے رہا تھا' مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ شور میرے بھاگنے کی وجہ سے ہو رہا ہے' یا گاڑی آنے کی گہما گہمی ہے۔ میں پڑیاں پھلانگتا ہوا ذرا ہی دیر میں کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں نسبتاً اندھیرا تھا۔ اسی وقت ایک گڈز ٹرین کے کچھ ڈبے شنٹنگ کرتے ہوئے میرے سامنے سے گزرے۔ میں اچھل کر ایک ڈبے میں چڑھ گیا' اور فرش پر بیٹھ کے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ گڈز ٹرین کا انجن اسی سمت جا رہا تھا جہاں سے میں بھاگا تھا۔ پھر گڈز ٹرین عین اسی جگہ کے سامنے رک

گئی جہاں وہ گاڑی کھڑی تھی جس میں سے میں نکل کر بھاگا تھا۔

گاڑی کو اب تک روانہ ہو جانا چاہئے تھا' مگر شاید انھی صاحب کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم کی مخالف سمت میں ہونے کی وجہ سے مجھے وہاں کا منظر تو دکھائی نہیں دے رہا تھا' مگر چیخ پکار کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں ڈبے میں کچھ اور اندر کی طرف دبک گیا۔ ڈبے میں خاصی گھٹن اور بدبو تھی۔ میرا دم گھٹا جا رہا تھا' مگر باہر نکلنے کا مطلب خود کو پولیس کے حوالے کرنا تھا۔

اس عالم میں مجھے نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ شاید ایک گھنٹہ یا شاید دو گھنٹے۔ چونکا تو میں اس وقت جب گڈز ٹرین دھچکے سے آگے بڑھی۔ خاصی دور تک جانے کے بعد گاڑی رکی تو میں نے جھانک کر باہر دیکھا۔ گاڑی پلیٹ فارم سے خاصی دور کھڑی تھی' اور غالباً پھر واپس ہونے والی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ بہت دور آؤٹر سگنل کے پاس ایک آدمی کھڑا تھا مگر اس کا رخ بھی دوسری طرف تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر باہر چھلانگ لگا دی۔

پھر میں آہستہ آہستہ پٹریاں پھلانگتا ہوا اسٹیشن سے بہت دور نکل آیا۔ کچھ فاصلے پر کچی آبادی تھی جیسی عموماً اسٹیشنوں کے آس پاس ہوتی ہیں۔ کسی نے بھی مجھ پر توجہ نہ دی' کیوں کہ اس وقت کم و بیش میرا حلیہ بھی انہی مفلوک الحال لوگوں جیسا تھا۔ میرے کپڑے گرد اور مٹی میں بری طرح اٹے ہوئے تھے' چہرے پر بھی یقیناً وحشت ہوگی۔ میں نے رات کھانا کھایا تھا' جو رات بھر کی بھاگ دوڑ اور بے آرامی میں نہ جانے کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ اب مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی' مگر ابھی خطرے کی حدود سے باہر نکلا تھا اس لئے میں بغیر رکے آگے بڑھتا چلا گیا۔

وہ نہ جانے کون سی جگہ تھی وہاں بہت سے فورسیٹر' رکشا' اور تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ فورسیٹر والے "سکھر' سکھر" کی آوازیں لگا رہے تھے۔ میں بلا سوچے سمجھے ایک فورسیٹر میں سوار ہو گیا۔

سکھر پہنچ کر پہلے تو مجھے اپنا حلیہ درست کرنے کا خیال آیا۔ میری جیب میں خاصے پیسے تھے' مگر مجھے بہت کفایت شعاری سے خرچ کرنا تھا' کیوں کہ اس رقم کے ختم ہونے تک اگر مزید کوئی بندوبست نہ ہوتا تو میرے فاقوں کا امکان بھی تھا' پھر مجھے اپنی بہن شہلا کو بھی تلاش کرنا تھا' جو نہ جانے اب تک کہاں پہنچ چکی ہوگی؟ شہلا کا خیال آتے ہی میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس بیچاری نے تو کبھی گھر سے تنہا قدم بھی باہر نہیں نکالا تھا۔ وہ تو شاید دہشت ہی سے مر جائے گی۔ پھر میرے دل میں ایک اور وسوسے نے سر ابھارا۔ شہلا کے پاس امی کے تمام زیورات بھی تھے' کہیں زیورات کے لالچ میں کوئی اسے ختم ہی نہ کر دے' کہیں وہ غلط ہاتھوں میں نہ پہنچ جائے!

سکھر کے بازار سے میں نے اپنے لیے ریڈی میڈ پینٹ شرٹ کے دو جوڑے خریدے‘ ایک سستا سا جوتا بھی خرید لیا۔ خریداری کرنے کے بعد میں ایک باربر کے حمام میں نہایا اور ہشاش بشاش ہو کے باہر نکلا۔ پرانے کپڑوں کا بنڈل کوڑے کے ایک ڈھیر میں پھینک کے میں درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں گھس گیا۔

کھانا کھانے کے بعد میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہیں لیٹوں اور سو جاؤں۔ مشکل یہ تھی کہ میں کسی بھی ہوٹل میں کمرا نہیں لے سکتا تھا۔ اتنے چھوٹے لڑکے کو کوئی بھی ہوٹل والا کمرا دینے پر راضی نہ ہوتا۔ مجھے شہلا کو تلاش بھی کرنا تھا۔ وہ اب تک کراچی پہنچ چکی ہو گی۔ میں جتنی دیر کرتا وہ مجھ سے اتنی ہی دور ہو جاتی۔

کھانا کھا کر میں نے تانگا لے کر لاری اڈے کا رخ کیا۔ براہ راست کراچی جانے والی بس آدھا گھنٹہ پہلے جا چکی تھی‘ دوسری بس دو گھنٹے بعد تھی۔ حیدر آباد سے میرپور خاص کی بسیں روانگی کے لئے تیار تھیں۔ میں حیدر آباد جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ میں نے سوچا تھا وہاں سے کوئی دوسری بس پکڑ کے کراچی چلا جاؤں گا۔ بس کی سیٹیں بہت آرام دہ تھیں۔ جب سے میں گھر سے نکلا تھا اس کے بعد سے پہلی دفعہ مجھے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔

میں نے اب تک کے حالات پر غور کیا۔ میں نے جو کچھ کیا مجھے اس پر کوئی ندامت یا پشیمانی نہیں ہوئی‘ البتہ صدمہ ضرور تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی مجھے شہلا کی طرف سے تھی۔ شہلا کا خیال آیا تو مجھے گزرنے والے وقت کی خوش گوار اور ناگوار یادوں نے گھیر لیا۔

○

میں ان دنوں چھٹی کلاس میں زیر تعلیم تھا۔ مجھ سے چھوٹی شہلا چوتھی میں تھی۔ ابو کا انتقال ہو گیا تھا۔ میری یادداشت بچپن ہی سے بہت اچھی ہے۔ اس لیے مجھے خوب یاد ہے کہ ابو وجیہہ‘ دراز قد اور سرخ و سفید رنگ کے مالک تھے۔ خاص طور پر مجھے ان کے بھونرے ایسے سیاہ بال بہت پسند تھے۔ ان کی سرخ و سفید رنگ پر وہ بال بہت بھلے لگتے تھے۔ جب وہ آفس جانے کے لیے تیار ہوتے تو میں انھیں تکتا رہتا۔ بلاشبہ میرے ابو شان دار شخصیت کے مالک تھے‘ پھر نہ جانے کیا ہوا‘ ایک رات ان کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ انھیں خون کی قے ہوئی‘ اور اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کو بلایا جاتا ابو نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ اس وقت میری عمر دس سال‘ اور شہلا کی آٹھ سال تھی۔ ہفتوں مجھے ابو کی موت کا یقین نہ آیا۔ امی اپنے غم میں تھیں اس لیے میں نے اسکول بھی جانا چھوڑ دیا۔ کافی عرصے کے بعد امی کو معلوم ہوا کہ میں اسکول نہیں جا رہا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر

اسکول گئیں' اور نئے سرے سے میرا نام لکھوایا' کیوں کہ اس دوران میں میرا نام کٹ چکا تھا۔

زندگی پھر اسی ڈگر پر چل نکلی۔ ابو کی موت سے ہمیں کوئی مالی پریشانی نہیں ہوئی تھی' کیوں کہ اچھی خاصی جائیداد تھی جس کا ہزاروں روپیہ ماہانہ کرایہ آتا تھا۔ بینک میں نقد روپیہ بھی کافی تھا۔ یوں چند ہی مہینے میں امی بھی ابو کو بھلا بیٹھیں۔ بھلا مرنے والے کے ساتھ کون مرتا ہے' مگر میں ابھی تک ابو کو یاد کرکے روتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا' جیسے ابو ابھی کہیں سے آجائیں گے' اور اپنے مخصوص لہجے میں کہیں گے۔ "ارے' ہمارا بیٹا کیوں رو رہا ہے۔ چلو آنسو پونچھو! بہادر بچے رویا نہیں کرتے۔"

میں جلدی سے آنسو پونچھ لیتا۔ جیسے ابو واقعی مجھے دیکھ رہے ہوں۔ میں نے ابو کی ایک ایک چیز سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ ان کا پائپ' لائٹر' پین' کتابیں' اور رومال! مجھے ان تمام چیزوں سے ابو کی خوشبو آتی تھی۔

حیرت تو مجھے امی پر ہوتی تھی۔ وہ کتنی جلدی ابو کو بھلا بیٹھی تھیں۔ ان کی پرانی مصروفیات پھر عروج پر تھیں۔ کلب' پارٹیز اور سماجی تقریبات! وہ گھنٹوں گھر سے غائب رہتیں۔ میں اور شہلا اپنی وسیع و عریض کوٹھی میں ایک دوسرے کے سہارے وقت گزارتے۔

ایک دفعہ حسب معمول امی کلب گئی ہوئی تھیں۔ میں اور شہلا لان میں جھولا جھول رہے تھے۔ شہلا جھولے میں تھی' اور میں الگ کھڑا اپنی باری کا منتظر تھا۔ وہ خوب اونچی اونچی پینگیں لے رہی تھی' اور کھلکھلا کر بے تحاشا ہنس رہی تھی' پھر نہ جانے کیسے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا' اور وہ دھڑام سے اوندھی منہ زمین پر آگری۔ اس کے منہ سے کرب ناک چیخ نکلی' پھر وہ بے ہوش ہوگئی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا' اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ ہم دونوں کے علاوہ گھر میں ایک باورچی' ایک مالی' اور چوکیدار تھا۔ باورچی کوٹھی میں تھا' مالی بھی شاید اپنے کوارٹر میں ہو گا۔ میں نے گھبرا کر چوکیدار کو آواز دی۔ "گل خان---- گل خان---- جلدی ادھر آؤ۔"

گل خان دوڑتا ہوا آیا۔ میرے کچھ بتانے سے پہلے ہی اس کی نظر شہلا پر پڑی۔ وہ بھی بوکھلا گیا' اور بولا۔ ام بی بی کو اندر لاتا ہے آپ ڈاکٹر کو فون کرو۔" اس نے لپک کر شہلا کو اٹھا لیا۔

میں فون کرنے اندر دوڑا مگر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت کسی پارٹی میں ہیں اس لئے آ نہیں سکتے۔

اسی دوران میں گل خان نے خون روکنے کے لیے شہلا کے سر پر پٹی باندھ دی

تھی۔ ڈاکٹر کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے گل خان کو شہلا کا خیال رکھنے کی تاکید کی، اور ڈاکٹر کے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔

وہاں واقعی پارٹی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ مہمانوں سے گفتگو میں مصروف تھے۔ میں سیدھا ان کے پاس پہنچا اور بغیر کسی تمہید کے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! جلدی چلیئے شہلا کے چوٹ لگ گئی ہے۔"

"دیکھ نہیں رہے ہو کہ میں مہمانوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔" ڈاکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔ "صاحب!" میں بھی بھنا گیا۔ "میں آپ کو فیس دوں گا مفت نہیں لے جاؤں گا۔ میری بہن کی حالت خراب ہے اور آپ۔۔۔"

"شٹ اپ!" ڈاکٹر نے مجھے جھڑک دیا۔ "بڑا آیا فیس دینے والا۔"

ڈاکٹر کے توہین آمیز رویے سے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں نے لان میں رکھا ہوا گملا اٹھایا، اور پوری قوت سے ڈاکٹر کو دے مارا۔ اگر وہ بروقت ایک طرف جھک کر اپنا سر نہ بچا لیتا تو اس کی کھوپڑی چٹخ جاتی، پھر بھی گملا اس کے شانے پر لگا اور وہ مغلظات بکنے لگا۔

میں نے دوسرا گملا اٹھایا، مگر اس وقت تک ڈاکٹر کا چوکیدار اور ایک ملازم دوڑ پڑا تھا۔ ان دونوں نے بیک وقت مجھے پکڑ لیا۔ ڈاکٹر نے کراہتے ہوئے کہا۔ "اس کم بخت کو اتنا مارو کہ اس کی شکل بگڑ جائے۔"

اس سے پہلے کہ وہ لوگ مجھے مارتے، امی کی تیز آواز میرے کانوں میں آئی۔" خرم! یہ کیا بیہودگی ہے۔ تم گھر چلو میں تمہیں اچھی طرح سزا دوں گی۔" مجھے معلوم ہوا کہ امی اس پارٹی میں موجود تھیں۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ کلب گئی ہوئی ہیں۔

"امی۔۔۔ وہ۔۔۔ شہلا کو۔۔۔ چوٹ لگ۔۔۔ گئی ہے اور۔۔۔"

"تو یہ کون سا طریقہ ہے؟" امی نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ "بالکل ہی جنگلی ہو گئے ہو تم!" پھر وہ ڈاکٹر کی طرف مڑیں۔ "سوری امجد! اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔"

مجھے شدید حیرت تھی کہ امی کو ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ شہلا زخمی ہے۔ وہ الٹا اس ڈاکٹر سے معذرت کر رہی تھیں۔

وہ مجھے لے کر گھر پہنچیں تو شہلا گھر پہ موجود نہیں تھی۔ خانساماں نے بتایا کہ گل خان اسے اسپتال لے گیا ہے۔

اسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ شہلا کے سر میں سات ٹانکے آئے ہیں۔ اس کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا اس لیے اسے خون دیا جا رہا ہے۔

شہلا تو چند دن بعد صحت یاب ہو کر گھر آ گئی، مگر میرے دل سے امی کا احترام ختم ہو

گیا- کبھی کبھی تو مجھے ان کے رویئے پر انتہائی صدمہ ہوتا تھا- وہ کیسی ماں تھیں جنھیں اپنی اولاد کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی- شہلا بیمار ہوتی تو میں ہی اس کی دوا لاتا' ساری ساری رات جاگ کر تیمارداری کرتا' اور امی اپنی رنگینوں میں' اپنی تفریحات میں مست رہتیں- اگر اس گھر میں شہلا کا وجود نہ ہوتا تو میں نہ جانے کب کا اس خوب صورت جہنم سے چھٹکارا حاصل کر لیتا- اپنی بہن مجھے جان سے زیادہ پیاری تھی- وہ بھی مجھے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی-

اس دن اگست کی چودہ تاریخ تھی- اسکول میں اس دن خصوصی پروگرام تھے- اس دن شہلا کو ہلکا ہلکا بخار تھا- اس لئے اسکول میں میرا دل نہ لگا' اور میں ایک ہی گھنٹے بعد لوٹ آیا- خلاف معمول گل خان گیٹ پر نہیں تھا- میں نے سوچا گل خان اندر کسی کام سے گیا ہو گا- پہلے میں نے بیل بجانے کا ارادہ کیا' پھر یہ سوچ کر ملتوی کر دیا کہ شہلا کے سامنے اچانک جا کر اسے حیران کر دوں گا- وہ تو یہ سمجھ رہی ہو گی کہ میری واپسی دوپہر تک ہو گی- اچانک مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ جائے گی-

کوٹھی کی پشت پر برگد کا ایک درخت تھا- اس کی شاخیں باہر تک پھیلی ہوئی تھیں- اس درخت کے ذریعے میں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ گھر میں داخل ہو چکا تھا-

پچھلی دیوار پھاند کر جب میں گھر میں داخل ہوا تو خان کہیں نظر نہ آیا- میں بے آواز قدموں سے برآمدے میں داخل ہو گیا- ایک تو میرے پیروں میں کریپ سول کے جوتے تھے' پھر کوریڈور میں دبیز قالین بھی بچھا ہوا تھا' اس لیے میرے چلنے سے ذرا بھی آہٹ نہ ہوئی- میرا اور شہلا کا کمرا کوریڈور کے دوسرے سرے پر تھا- امی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں ٹھٹھک گیا- وہ دھیمی آواز میں کسی سے باتیں کر رہی تھیں- پہلے تو میں یہی سمجھا کہ ان کے کمرے میں شہلا ہے' مگر جیسے ہی مجھے ایک مردانہ آواز سنائی دی تو میں چونک اٹھا- بولنے والا گو کہ بہت دھیمے لہجے میں بول رہا تھا' مگر میں نے ڈاکٹر کی آواز پہچان لی- وہ امی سے کہہ رہا تھا- "اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا- آخر کب تک میں یوں چوروں کی طرح آتا رہوں گا؟"

"صبر تو مجھ سے بھی نہیں ہوتا-" یہ امی کی آواز تھی- "مگر ہمیں ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا- خرم تو اب تمہیں ویسے بھی پسند نہیں کرتا ہے-"

"بھاڑ میں جائے خرم!" ڈاکٹر کی آواز بلند ہو گئی- "کم بخت بالکل اپنے باپ پر گیا ہے' لگتا ہے تم میرے ہاتھ سے دوسرا خون بھی کرواؤ گی-"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی-" امی نے کہا- پھر نہ جانے کس بات پر وہ دونوں ہنسنے لگے-

خون میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا- میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی

تھیں۔ اس وقت چاروں طرف خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر نہ صرف میرے باپ کا قاتل تھا' بلکہ میری عزت بھی پامال کر رہا تھا۔ میں نے وحشت میں دروازے کو زور دار ٹھوکر ماری تو دروازہ دھماکے سے کھل گیا۔ وہ لوگ اتنے مطمئن تھے کہ انھوں نے دروازہ بند کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ کمرے کا شرم ناک منظر دیکھ کر میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئیں۔ میں نے کونے میں رکھا ہوا ماربل کا بھاری گلدان اٹھا لیا' اور عالم جنون میں ڈاکٹر کی طرف لپکا۔ ڈاکٹر اس افتاد سے پہلے ہی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے بیڈ سے اتر کر بھاگنا چاہا' مگر میں نے پوری قوت سے گلدان اس کے سر پر دے مارا۔ چٹاخ کی آواز آئی۔ ڈاکٹر کے منہ سے بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ دوسرا وار میں نے اس سے بھی زیادہ قوت سے کیا۔ پھر تو مجھ پر جنون سوار ہو گیا' اور میں نے پے در پے ڈاکٹر کے سر پر کئی زور دار ضربیں لگا دیں۔

امی نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا' اور گلدان میرے ہاتھ سے چھین کر چیخیں۔ "خرم ہوش میں آ! پاگل ہو گیا ہے کیا؟"

میری آنکھوں میں تو اس وقت خون اترا ہوا تھا۔ میں بھلا ہوش میں کیسے آتا؟ گلدان چھن گیا تو میری نظر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی پھلوں کی ٹرے پر پڑی۔ پھلوں کے ساتھ اس میں چھری بھی رکھی تھی۔ میں نے جھپٹ کر وہ چھری اٹھا لی' اور اس سے قبل کہ امی کچھ سمجھ سکیں میں نے پوری قوت سے وہ چھری ان کے سینے میں گھونپ دی۔ ان کی چیخ بہت بھیانک تھی۔ میں نے ایک ہی وار پہ اکتفا نہیں کیا' بلکہ پے در پے چھری کے کئی وار ان کے پیٹ' گردن اور چہرے پر کیے۔ ان کا خوب صورت چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کا چہرہ تو پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ بیڈ پر خون کا ایک تالاب سا بن گیا تھا' اور خون فوم کے موٹے گدے میں جذب ہونے کے بعد فرش کے قالین پر گر رہا تھا۔

خون دیکھ کر اچانک جیسے میں ہوش میں آ گیا۔ میرے ہاتھوں سے دو انسان قتل ہو گئے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ پولیس والے قاتل کو پھانسی پر لٹکا دیتے ہیں۔ تو کیا--- تو کیا میں بھی پھانسی پر لٹک جاؤں گا! میں نے دہل کر سوچا' پھر شہلا کیا کرے گی؟ کون اس کی خبر گیری کرے گا--- وہ بیچاری تو دہشت سے مرجائے گی' پھر-- پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ بھاگ جا خرم! میرے اندر سے آواز آئی۔ بھاگ جا ورنہ تجھے پھانسی ہو جائے گی۔ شہلا کو بھی ساتھ لے جا۔ پھر میں نے وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

اچانک میری نظر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر پڑی تو میں خوف زدہ ہو گیا۔ آئینے میں میری جگہ خون میں لتھڑا ہوا ایک وحشت زدہ لڑکا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میری نظر آئینے پر پڑ گئی ورنہ میں تو گھر سے نکلتے ہی پکڑا جاتا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ امی اور ڈاکٹر کی

چیخوں کے باوجود نہ تو خانساماں ادھر آیا تھا' نہ مالی اور چوکیدار! حد تو یہ ہے کہ شہلا بھی نہیں آئی تھی۔ اس کا کمرا تو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پھر میں نے یہی سوچا کہ شاید نوکروں کو امی نے چھٹی دے دی ہو۔

میں نے امی اور ڈاکٹر کے جسموں پر چادر ڈالی اور باتھ روم میں جا کر کپڑوں سمیت شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ میں اس حالت میں شہلا کے سامنے بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ جب چہرے اور کپڑوں سے خون کے داغ کسی حد تک دور ہو گئے تو میں انھیں گیلے کپڑوں میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ شہلا بے سدھ سو رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے پھر میں نے بہ مشکل تمام شہلا کو بیدار کیا۔ اٹھنے کے باوجود وہ غنودگی کی حالت میں تھی۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر انکل نے اسے بخار کی دوا دی تھی جسے کھا کر اسے نیند آگئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اسے بتایا کہ ہم ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑ رہے ہیں۔ تم اپنے چند جوڑے کسی بیگ میں رکھ لو۔ وہ کچھ نہیں سمجھی' مگر میرے کہنے پر مشینی انداز میں عمل کرنے لگی۔ میں نے اسے اپنے بھی چند جوڑے رکھنے کو کہا' پھر مجھے خیال آیا کہ میرے پاس پیسے تو ہیں نہیں۔ شہلا کو مصروف چھوڑ کر میں ایک مرتبہ پھر امی کے کمرے میں گیا ان کا پرس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ اس میں جتنی بھی نقد رقم تھی میں نے وہ سب نکال لی۔ پرس میں ان کا ایک طلائی لاکٹ بھی تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ امی کے تمام زیورات بھی لے لوں۔ ان کے کچھ زیورات تو ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں تھے' بقیہ الماری کے سیف میں تھے۔ الماری اور سیف کی چابی بھی ان کے پرس میں موجود تھی۔ میں نے ایک دوپٹا لے کر امی کے تمام زیورات اس میں باندھ لیے۔ پھر میری نظر ڈاکٹر کے کوٹ پر پڑی جو کرسی کی پشت پر پڑا تھا۔ اس کی اندرونی جیب میں ڈاکٹر کا بٹوا تھا۔ میں نے وہ بٹوا بھی نکال لیا۔

سب چیزیں سمیٹ کر میں ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں پہنچا۔ شہلا نے اپنے اور میرے چند جوڑے ایک سوٹ کیس میں رکھ لیے تھے' مگر وہ ابھی تک الجھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "بھیا! ہم کہاں جا رہے ہیں' کیا امی بھی جا رہی ہیں؟"

"نہیں امی ہمارے ساتھ نہیں جا رہی ہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"امی ہم سے پہلے جا چکی ہیں۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے فوری طور پر امی کی موت کا علم ہو' اگر وہ امی کو اس حالت میں دیکھ لیتی تو شاید دہشت سے بے ہوش ہو جاتی۔ میں نے سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "چلو' دیر ہو رہی ہے۔"

وہ کوئی جواب دیئے بغیر مشینی انداز میں میرے ساتھ چل دی۔ امی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے قدموں میں لڑکھڑاہٹ سی پیدا ہوئی۔ وہ بہرحال تھیں تو میری ماں' بہت مہربان اور شفیق! مجھ سے وہ بہت زیادہ محبت کرتی تھیں' مگر نہ جانے کیوں شہلا کو اتنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں شہلا' امی کے کمرے میں جانے کی ضد

نہ کرے- دروازہ میں نے بھیڑ دیا تھا' اس لیے بہ ظاہر یہی لگ رہا تھا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے- میں جلدی سے آگے بڑھ گیا- میرے ہاتھ میں وزنی سوٹ کیس تھا' دوسرے سے میں نے شہلا کا ہاتھ تھام رکھا تھا- امی کے زیورات بھی میں نے سوٹ کیس میں ڈال دیے تھے- نقد رقم البتہ میرے پاس تھی-

مین روڈ پر پہنچ کر ہمیں ٹیکسی مل گئی- میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے اسٹیشن چلنے کو کہا تھا' تو اس نے حیرت سے ہمیں دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا-

میں پہلی دفعہ تنہا گھر سے باہر نکلا تھا اس لیے گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی- میں چاہتا تھا کہ فوری طور پہ لاہور سے جتنا دور چلا جاؤں' اتنا ہی بہتر ہے- ابھی تک تو میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا' کہ جاؤں گا کہاں؟ انکوائری سے معلوم ہوا کہ ایک گاڑی کراچی جانے کو تیار ہے- میں نے دو ٹکٹ کراچی کے لیے' اور پلیٹ فارم پر آگیا- مجھے دیکھ کر ایک قلی میرے پاس آگیا- اس نے میرے ہاتھ سے ٹکٹ لے کر دیکھے' پھر میرا سوٹ کیس اٹھا کر چل دیا- ہم اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے- لاہور کا اسٹیشن اتنا وسیع و عریض ہے اور اس پہ اتنے زیادہ پلیٹ فارم ہیں کہ میں کنفیوژ ہو کر رہ گیا تھا-

گاڑی میں جگہ بہت آسانی سے مل گئی- میں اور شہلا سمٹ سمٹا کر ایک سیٹ پر بیٹھ گئے- شہلا بھی حیرت بھری نظروں سے قلیوں کی بھاگ دوڑ' لوگوں کی بے چینی اور مختلف چیزیں بیچنے والوں کو دیکھ رہی تھی- اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھا- "ہم کہاں جا رہے ہیں بھیا؟"

"خاموش رہو-" میں نے اسے جھڑک دیا-

سامنے بیٹھے ہوئے ایک صاحب بہت دلچسپی سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے- میں نے جب بھی ان کی طرف دیکھا' انھیں اپنی طرف دیکھتے ہی پایا- ان کی عمر پینتیس چالیس سال ہو گی' درمیانہ قد' گٹھا ہوا جسم' انھوں نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی-

آخر انھوں نے پوچھ ہی لیا- "بیٹا آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"کراچی!" میں نے مختصر جواب دیا-

"آپ کے امی ابو--- میرا مطلب ہے--- کوئی بڑا نہیں ہے آپ کے ساتھ؟"

"ابو تو میرے ہیں ہی نہیں' امی پہلے ہی کراچی چلی گئی ہیں-" میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا-

"آپ لوگ کراچی میں کس جگہ جائیں گے؟" وہ صاحب مسلسل جرح کر رہے تھے-

"ناظم آباد!" میں نے جھٹ سے کراچی کے ایک علاقے کا نام لے دیا کیوں کہ یہی نام میں نے سن رکھا تھا-

"ناظم آباد میں کس جگہ؟" ان صاحب نے پوچھا۔

"میں پہلے بھی اکثر وہاں جاتا رہتا ہوں۔" میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "مگر مجھے مکان کا نمبر وغیرہ یاد نہیں ہے۔"

میرے اکھڑے اکھڑے ہوئے لہجے کو شاید وہ بھی بھانپ گئے' مگر مسکرا کر بولے۔ "بیٹا' میں اس لیے پوچھ رہا تھا کہ میں بھی ناظم آباد میں رہتا ہوں' پھر یہ کہ تم اکیلے ہو' اور ابھی بہت چھوٹے ہو۔ راستہ بھول بھی سکتے ہو۔ تم شاید برا مان گئے!" ان کے لہجے میں شفقت تھی۔

"نہیں--- ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "اصل میں خود میں بھی گھبرا رہا ہوں ورنہ میں برا کیوں مانوں گا۔"

پھر گاڑی ایک دھچکے سے روانہ ہو گئی۔ حیرت تو مجھے اس بات پر تھی کہ گاڑی کی دوسری بوگیوں میں مسافر بری طرح ٹھنسے ہوئے تھے' مگر ہمارے ڈبے میں سوائے ہم تینوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ میں یہ بات ان صاحب سے کہنا چاہتا تھا' مگر پھر اس خیال سے خاموش رہا کہ کہیں وہ میری کسی بات سے کھٹک نہ جائیں' کہیں وہ یہ نہ پوچھ بیٹھیں کہ تم تو پہلے بھی کراچی جاتے رہے ہو' تمہیں اتنی سی بات معلوم نہیں۔ میں تو اس قلی کو دعائیں دے رہا تھا' جو ہمیں یہاں بٹھا گیا تھا۔ میں تو اسے منع کرنے والا تھا' مگر پھر اس خیال سے خاموش رہا تھا' کہ اس کے ذریعے میں آسانی سے گاڑی تک پہنچ جاؤں گا۔

گاڑی نے اب رفتار پکڑ لی تھی۔ سامنے والے صاحب نے انگریزی کا ایک میگزین نکال کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی تھی۔ پڑھتے پڑھتے انھوں نے اچانک سر اٹھایا۔ پھر کچھ سوچ کر سیٹ کے نیچے رکھی ہوئی باسکٹ میں سے فلاسک نکالا اور ایک کپ نکال کر اس میں چائے انڈیلنے لگے' پھر مجھ سے بولے۔ "چائے پیو گے؟"

"جی نہیں شکریہ!" میں نے جواب دیا۔ حالانکہ اس وقت مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ میں صبح صرف ایک سلائس کے ساتھ ایک کپ چائے پی کر اسکول گیا تھا۔

ان صاحب نے منع کرنے کے باوجود فلاس کے کپ اور گلاس میں چائے انڈیلی اور مجھے اور شہلا کو دے دی۔ ظاہر ہے کپ تو ان کے پاس ایک ہی ہو گا' پھر انھوں نے بسکٹ کا ایک ڈبہ نکال کر ہمیں بسکٹ بھی دیے۔ شہلا نے چائے کے ساتھ ایک بسکٹ کھایا تھا کہ اسے الٹی آ گئی۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا' اور اسے بہت تیز بخار تھا۔ مجھے یاد آیا کہ شہلا کی تو طبیعت خراب تھی' اور بھاگ دوڑ میں اسے پھر تیز بخار ہو گیا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ چلتی ٹرین میں اس کے لیے دوا کہاں سے لاتا؟ مجھے پریشان دیکھ کر انھوں نے ہمدردی سے کہا۔ "پریشان مت ہو بیٹا! میرے پاس بخار کی ٹیبلیٹس ہیں۔ ایک ٹیبلٹ کھلا دو ابھی بخار اتر جائے گا۔" پھر وہ ہنس کر بولے۔ "کتنی عجیب بات ہے' میں نے ابھی تک

تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔ چلو پہل میں ہی کرتا ہوں۔ میرا نام احسان اللہ بیگ ہے۔ کراچی کی ایک پرائیویٹ فرم میں جنرل مینجر ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنے بیگ میں سے کوئی گولی نکالی اور شہلا سے بولے۔ "لو بیٹی یہ کھا لو مگر پہلے ایک دو بسکٹ کھا لو خالی پیٹ دوا کھانا بہتر نہیں ہوتا۔"

شہلا نے زبردستی دو بسکٹ کھائے' پھر ٹیبلٹ کھا کر وہ سیٹ پر لیٹ گئی۔

احسان صاحب نے مجھ سے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔ "بیٹا' تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

میں انھیں اپنا نام نہیں بتانا چاہ رہا تھا' پھر میں نے سوچا کہ کوئی غلط نام بتا دوں' مگر شہلا کی موجودگی میں' میں یہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام خرم ہے اور یہ میری بہن ہے شہلا!"

گاڑی دو ایک اسٹیشنوں پر ذرا دیر کو رکی پھر چل دی۔ باہر آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ شہلا بھی شاید سو گئی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار محسوس کیا۔ اس کا بخار پہلے سے کم تھا' مگر وہ وقفے وقفے سے پانی پی رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک احسان صاحب کچھ پڑھتے رہے' پھر وہ بھی برتھ پر لیٹ گئے' اور مجھ سے کہا کہ تم بھی اوپر جا کر اطمینان سے سو جاؤ۔

میں بھی اوپر والی برتھ پر چلا گیا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی مگر ابھی تک ایسی سردی نہیں ہوئی تھی' کہ رات کو لحاف یا کمبل کی ضرورت پڑتی۔ احسان صاحب کے پاس ایک چادر تھی' جو انھوں نے ازراہ ہمدردی شہلا کو اوڑھا دی تھی۔ انھیں ہم دونوں پر شاید شبہ ہو گیا تھا' کہ ہم گھر سے فرار ہو رہے ہیں' مگر ابھی تک انھوں نے اپنے اس شبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔

اچانک ٹرین کے دھچکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے نیچے جھانک کر شہلا کو دیکھا' وہ سوتے میں بھی کچھ بے چین سی دکھائی دے رہی تھی۔ احسان صاحب خوب گہری نیند میں تھے' اور ہلکے ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ شہلا کا بخار دیکھنے کے لیے میں برتھ سے نیچے اترا' اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا' تو ایسا لگا جیسے میرا ہاتھ کسی جلتی ہوئی چیز پر پڑ گیا ہو۔ اچانک گاڑی کی رفتار ست ہونے لگی۔ شہلا نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں' اور نحیف آواز میں بولی "پانی--- بھیا--- پانی---"

میں نے احسان صاحب کی صراحی سے پانی نکالنا چاہا' تو معلوم ہوا کہ پانی ختم ہو چکا ہے۔ میں گلاس لے کر دوڑتا ہوا باتھ روم میں گیا' مگر نل میں بھی پانی نہیں آ رہا تھا۔ شہلا وقفے وقفے سے پانی مانگ رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار بالکل ست ہو گئی' پھر وہ رک ہی گئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ نیم پختہ پلیٹ فارم پر مدقوق سا ایک بلب روشن تھا' مگر اس کی روشنی میں مجھے پانی کا ہینڈ پمپ نظر آ گیا۔ میں نے صراحی

اٹھائی' اور پھرتی سے اتر کے پانی لینے دوڑا۔ وہاں ایک آدمی پہلے سے منہ دھو رہا تھا۔ وہ پہلے پمپ چلاتا' پھر چلو میں پانی لے کر منہ پر ڈالتا۔ وہ شاید ریلوے ہی کا کوئی مقامی ملازم تھا اس لیے اتنے اطمینان سے بلکہ سلوموشن میں حرکت کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"جناب' آپ ذرا ٹھہر جائیں' میں پانی لے لوں۔ میری گاڑی چلی جائے گی۔"

"اچھا۔" اس نے میری طرف دیکھا' چل پھر لے لے۔" یہ کہہ کر وہ گیلے ہاتھ جھٹکتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

میں نے صراحی نل کے نیچے رکھی اور پمپ چلانے لگا۔ اچانک گاڑی نے ہارن دیا۔ میں نے آدھی بھری ہوئی صراحی اٹھائی اور اپنے ڈبے کی طرف دوڑ پڑا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی تھی۔ اسے میری حماقت کہیں یا گھبراہٹ میں بہت آسانی سے گاڑی کے کسی نہ کسی طرح ڈبے میں چڑھ سکتا تھا مگر میری کوشش تھی کہ میں کسی نہ کسی طرح اپنے ڈبے تک پہنچ جاؤں۔ اب گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی تھی۔ ڈبا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ صراحی بھی ٹوٹ چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر اس کے ٹھیکرے اور پانی رہ گیا تھا۔ گاڑی کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی تھی' پھر لمحوں میں وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اٹھ کر اضطراب کے عالم میں پھر گاڑی کے پیچھے بھاگا' مگر اب میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ شہلا کا خیال آیا تو دل سے ایک ہوک سی اٹھی' اور تھکن کا خیال کیے بغیر دیوانہ وار اس سمت میں بھاگنے لگا جدھر گاڑی گئی تھی۔ اب میں سوچتا ہوں تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ گاڑی اگلے اسٹیشن پر رکی تو میں اس تک پہنچ جاؤں گا۔ یہ بھی امکان تھا' کہ وہ کسی آؤٹر سگنل پر رک جائے۔

اصولاً تو میں اسٹیشن ماسٹر سے کہہ کر گاڑی اگلے اسٹیشن پر رکوا سکتا تھا' مگر اس وقت مجھے اتنی عقل کہاں تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ تو میں تنہا سفر کر رہا تھا۔ مجھے احساس بھی نہ ہوا کہ میں بھاگتے بھاگتے گھنے درختوں کے جھنڈ میں پہنچ چکا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ لاری اڈے سے کراچی کی طرف جانے والی بس میں سوار ہو کر گاڑی سے پہلے یا اس کے ساتھ ساتھ کراچی پہنچنے کی کوشش کروں گا' مگر مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا' کہ میں اس وقت ہوں کہاں؟ بس میں بلا سوچے سمجھے چلا جا رہا تھا۔

صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ اس سے مجھے خاصی تقویت پہنچی۔ میں کچھ اور تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ مزید گھنے ہوتے جا رہے تھے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں صحیح سمت میں جا رہا ہوں یا غلط سمت میں۔ صبح کا اجالا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ اب سامنے کی ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی۔

اچانک کچھ آوازیں سن کر میں ٹھٹھک گیا۔ جہاں میں کھڑا تھا' وہاں جھاڑیاں کچھ زیادہ ہی گھنی تھیں۔ میں سمجھا' جنگلی درندے آپس میں لڑ رہے ہوں گے۔ ان آوازوں

میں ایسی ہی غراہٹ شامل تھی۔ میں گھبرا کر مزید جھاڑیوں میں دبک گیا۔ وہاں مٹی کے اونچے نیچے ٹیلے' اور گھنی خود رو جھاڑیاں تھیں۔ جھاڑیوں کے درمیان میں جانوروں اور انسانوں کے چلنے سے پگڈنڈی سی بن گئی تھی۔ پگڈنڈی کہیں کہیں سے خاصی چوڑی تھی۔

اچانک دو آدمی وحشیانہ انداز میں لڑتے ہوئے ایک ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک خوب ہٹا کٹا تھا۔ دوسرا تھا تو لمبا تڑنگا' مگر اس کی حالت بھی خستہ ہو رہی تھی' سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے' اور ایسا لگ رہا تھا' جیسے برسوں سے اس نے پانی کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ اس کی کوشش یہی تھی' کہ وہ کسی طرح وہاں سے بھاگ جائے' مگر ہٹا کٹا آدمی' اسے بھاگنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان دونوں میں سے کوئی مرے گا' تبھی اس لڑائی کا خاتمہ ہو گا۔ ان کے چہرے خون میں تر تھے۔ اس عالم میں وہ اور بھیانک لگ رہے تھے۔ میں سہم کر رہ گیا تھا۔

ہٹا کٹا آدمی ہانپتے ہوئے بولا۔ "آج تیری سب جاگیرداری دھری رہ جائے گی۔"

جواب میں خستہ حال شخص نے اس کے منہ پر بھرپور گھونسا مارا' اور غرا کر بولا۔ "تجھ جیسے کتے آج تک میری جوتیاں سیدھی کرتے آئے ہیں' سمجھا!"

ان کی گفتگو سے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا' کہ وہ کیوں لڑ رہے ہیں' مگر مجھے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا' کہ ان دونوں میں سے ایک ضرور مرجائے گا۔

○

ایک دھچکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں کہاں ہوں۔ اچانک میرے برابر بیٹھا ہوا مسافر تیز لہجے میں بولا۔ "آرام سے بیٹھو اوئے میرے اوپر کیوں چڑھا جا رہا ہے۔" پھر وہ آگے مسافر سے مخاطب ہوا۔ "یہ ایسا سو رہا ہے جیسے اس نے بھنگ پی رکھی ہو۔"

میں نے شرمندگی سے کہا۔ "معاف کیجئے گا جناب میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شام پھیلنے لگی تھی' پھر کنڈیکٹر نے چیخ کر ڈرائیور سے کہا۔ استاد' آج تو گولی کی طرح لایا ہے گاڑی کو' آدھا گھنٹہ پہلے ہی حیدر آباد پہنچ گئے۔"

تھوڑی دیر بعد میں حیدر آباد کے اسٹاپ پر کھڑا کراچی جانے والی بس کی تلاش میں تھا۔

کراچی پہنچتے پہنچتے مجھے رات ہو گئی۔ میں کراچی پہنچ تو گیا تھا' مگر اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں؟ شہلا کو کہاں تلاش کروں؟ میں نے سوچا مجھے پہلے اسٹیشن دیکھ لینا چاہیے۔ ممکن ہے شہلا مجھے وہاں مل جائے وہ بیچاری جا بھی کہاں سکتی ہے؟

سوچ کر میں نے ایک رکشا روک لیا۔ اس زمانے میں رکشا اور ٹیکسی کے کرائے آج کے مقابلے میں برائے نام تھے۔ یعنی رکشا کا کرایہ پچیس پیسے فی میل اور ٹیکسی کا کرایہ چالیس پیسے۔

رکشے والے نے مجھے گھور کر دیکھا' پھر بولا۔ "میٹر سے ایک روپیہ زیادہ ہو گا۔"

مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ جہاں میں کھڑا ہوں وہاں سے اسٹیشن تک بہ مشکل رکشا کا میٹر پچاس یا اسی پیسے بنائے گا۔ میں رکشا میں بیٹھ گیا اور اس سے چلنے کو کہا۔

"سواری کہاں ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے جواب دیا۔ "بس میں ہی جاؤں گا۔"

"سٹی اسٹیشن چلوں یا کینٹ؟" رکشا والے نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔

"کینٹ۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ مجھے یاد آگیا میرے ٹکٹ پر بھی کراچی کینٹ ہی لکھا تھا۔ ٹکٹوں کا خیال آیا تو میں مزید پریشان ہو گیا۔ دونوں ٹکٹ میری جیب میں تھے۔ اگر کسی نے ٹکٹ چیک کیے ہوں گے تو شہلا نے کیا کہا ہو گا۔ کہیں اسے ریلوے پولیس ہی نے نہ پکڑ لیا ہو؟

اسٹیشن پر اس وقت بھی رش تھا۔ شاید کوئی ٹرین جانے والی تھی۔ میں پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر کاٹتا رہا' مگر شہلا بھلا وہاں کہاں تھی جو مجھے ملتی۔ تھک ہار کے میں پلیٹ فارم کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور خالی الذہنی کے عالم میں مسافروں کو بھاگتے دوڑتے دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہو گئی' اور اسٹیشن پر ایسا سکوت چھا گیا جیسے سب کچھ جادو کے زور سے غائب ہو گیا ہو۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے شاید آدھا گھنٹہ ہوا تھا یا شاید ایک گھنٹہ' مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔ کچھ مجھے خیال آتا تھا کہ شہلا کو پولیس نے پکڑا ہو گا اور لاوارث سمجھ کے یتیم خانے میں چھوڑ دیا ہو گا۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ ممکن ہے اسے احسان صاحب اپنے ساتھ لے گئے ہوں' مگر وہ کیوں ایسا کرنے لگے! میں خود ہی ایک بات سوچتا' پھر اسے رد کر دیتا۔ ہوش تو مجھے اس وقت آیا جب کسی نے میری گردن پر زور دار ہاتھ جمایا' ساتھ ہی ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ "کون ہے اوئے تو' یہاں کیوں بیٹھا ہے؟"

میں نے گھبرا کے پیچھے دیکھا وہ کوئی پولیس کانسٹیبل تھا' شکن آلود وردی' میلی سی ٹوپی' اور مدقوق سے چہرے والا! اس کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی مونچھیں

تھیں۔

اس نے پھر بید لہرا کر کہا۔ "بولتا کیوں نہیں اوئے! گھروں نس کے ایا ایں؟"

"او نہیں جناب!" میں نے جلدی سے کہا۔ "میرے ابا جی مجھے یہاں بٹھا کے کسی سواری کی تلاش میں گئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔"

میرے فطری انداز سے زیادہ وہ ایک طرف رکھے ہوئے اس سامان سے مطمئن ہو گیا جو نہ جانے کس کا تھا' اور بولا "معاف کرنا پتر' میں کچھ اور سمجھا تھا۔" پھر وہ جاتے جاتے بولا۔ "مگر تم اس سامان کے پاس بیٹھو ورنہ کچھ نہ کچھ چوری ہو جائے گا۔"

جب وہ مجھ سے کافی دور چلا گیا تو میں پھرتی سے اٹھا' اور نکاسی کے راستے کی طرف دوڑا۔

اسٹیشن عمارت سے باہر آ کر میں ایک مرتبہ پھر شش و پنج میں پڑ گیا' کہ اب میں کہاں جاؤں۔ باہر بھی سناٹا تھا۔ اکا دکا ٹیکسی والے اپنی اپنی ٹیکسیوں میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ وہاں زیادہ دیر کھڑا رہنا بھی مناسب نہیں تھا' ورنہ کوئی اور پولیس کانسٹیبل بھی آ سکتا تھا۔

اسٹیشن کی طرف سے ایک قلی آتا دکھائی دیا۔ وہ میرے نزدیک آ کر بولا۔ "کیا ہوا بیٹا کچھ کھو گیا ہے کیا؟ میں کافی دیر سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟"

قلی کے ہمدرانہ لہجے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی بہن کو ڈھونڈ رہا ہوں۔

"بے وقوف ہو۔" اس نے شفقت سے کہا۔ "وہ تو تمہارے امی ابو کے ساتھ گھر چلی گئی ہو گی' مگر عجیب ہیں تمہارے ماں باپ!" وہ منہ میں بڑبڑایا۔ "وہ تمہیں یہیں چھوڑ گئے۔ کہاں رہتے ہو تم؟"

"ناظم آباد۔" میں نے جواب دیا۔

"ایسا کرو' یہاں سے ٹیکسی میں بیٹھو اور سیدھے گھر چلے جاؤ۔ رات بہت ہو گئی ہے۔" پھر وہ چونک کر بولا "گھر تو یاد ہے نا!"

"اچھی طرح یاد ہے مجھے۔" میں نے جواب دیا اور جلدی سے ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔

ٹیکسی ڈرائیور پچھلی سیٹ پر گٹھڑی بنا پڑا تھا۔ میں نے اسے دو تین آوازیں دیں تو وہ سر کھجاتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ "کیا ہے؟" اس نے لال لال آنکھوں سے مجھے گھورا۔

"ناظم آباد چلو گے؟" میں نے پوچھا۔
"میٹر سے پانچ روپیہ زیادہ ہو گا۔" اس نے جماہی لے کر کہا۔
میں نے گھوم کر دیکھا۔ بوڑھا قلی مطمئن ہو کر جا چکا تھا۔ ناظم آباد تو میں خود بھی جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ ٹیکسی والا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا' پھر سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ میں آہستہ آہستہ وہاں سے نکل کر اس سڑک پر آ گیا جو نہ جانے کہاں جا رہی تھی۔ میں ابھی کہیں جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا' کہ سڑک کے عین درمیان میں مجھے ایک زیر تعمیر مسجد دکھائی دی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ بھلا بیچ رستے میں مسجد تعمیر کرنے کی کیا تک ہے۔ وہیں بجری کے ڈھیر پر دو آدمی سو رہے تھے۔ بجری دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے بھی اللہ کا نام لے کر رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بھی بجری کے ڈھیر پر پڑ گیا۔ مجھے اپنی بے بسی پر رونا بھی آیا تھا۔ بیرسٹر معظم علی کا بیٹا' لاکھوں کی جائیداد کا وارث اس وقت بجری کے ایک ڈھیر پر پڑا تھا۔ بھوک کے مارے میرا دم نکلا جا رہا تھا۔ میں نے حیدر آباد کے اسٹاپ پر دو سموسے کھائے تھے۔ میں خود پر جبر کیے پڑا رہا' پھر نہ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

○

میری آنکھ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سے کھلی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ایسا لگا جیسے گھوڑا مجھے روندتا ہوا گزر جائے گا' مگر گھوڑا مجھ سے کافی دور تھا۔ چاروں طرف اجالا پھیل چکا تھا۔ اسٹیشن کے سامنے مجھے بہت سے تانگے نظر آئے۔ اس وقت خاصی گہما گہمی تھی۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک ہوٹل تھا جہاں سے پراٹھوں کی اشتعال انگیز مہک آ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ ہوٹل کے عین سامنے بس اسٹاپ تھا جہاں اس وقت آگے پیچھے دو بسیں کھڑی تھیں۔ خوب ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد میں بس اسٹاپ پر آگیا۔ پھر وہی سوال کہ اب کہاں جاؤں؟ بس میں اکا دکا مسافر بیٹھے تھے۔ میں بھی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کافی دیر بعد بس چلنے کے آثار پیدا ہوئے۔ کنڈیکٹر ٹکٹ کے لیے آیا تو میں نے ناظم آباد کا ٹکٹ مانگا۔

"ناظم آباد نہیں جائے گی۔" کنڈیکٹر نے جواب دیا۔

"صدر سے دوسری بس میں بیٹھ جانا۔" یہ کہہ کر اس نے ٹکٹ اور بقیہ پیسے مجھے دیے اور آگے بڑھ گیا۔

ایک مسافر سے پوچھ کر میں صدر کے اسٹاپ پر اتر گیا۔ گو کہ اس وقت زیادہ دن نہیں چڑھا تھا' مگر صدر میں ٹریفک کا ازدحام تھا۔ اتنی بہت سی گاڑیاں نہ جانے کہاں سے آ رہی تھیں' اور کہاں جا رہی تھیں۔ وہیں میں نے روڈ پر ٹرین چلتے دیکھی' پھر مجھے یاد آگیا کہ اسے ٹرام کہتے ہیں۔ میں نے اب تک ٹرام تصویروں میں دیکھی تھی۔ میں بلا سوچے سمجھے ٹرام میں سوار ہو گیا۔ ٹرام ذرا آگے بڑھی تو اس میں اتنا رش ہو گیا کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ دوسروں کے مقابلے میں میرا قد بہت چھوٹا تھا۔ اسی وجہ سے میں گھٹن کا شکار تھا۔ ایک اسٹاپ پر ٹرام رکی تو میں لوگوں کو دھکیلتا راستہ بناتا نیچے اتر گیا۔ مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ سامنے ہی شربت والا کھڑا تھا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے ایک اور دھچکا لگا۔ ٹرام میں کسی نے میری جیب صاف کر دی تھی۔ اجنبی جگہ اور جیب خالی' یہ سوچ کر ہی مجھے چکر سا آگیا۔ اب کیا کروں

گا' کہاں سے کھاؤں گا؟ اچانک ایک اور افتاد پڑ گئی تھی۔ میں پھر وہاں رکا نہیں بلکہ ایک طرف چل دیا۔ میں نے اب خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے یہ کہہ کر دل کو بہلا لیا کہ اگر میری زندگی ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی ذریعہ پیدا کرے گا' موت ہی آ گئی ہے تو پھر فاقوں مر جاؤں گا۔ یہی سوچتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ اب دکانیں کھلنے لگی تھیں اور فٹ پاتھ پر بھی لوگوں نے مختلف چیزوں کی دکانیں سجائی ہوئی تھیں۔ وہاں ایک عمارت کے اوپر بڑی سی ایک گھڑی لگی تھی۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جگہ ایمپریس مارکیٹ کے نام سے مشہور ہے۔ وہیں صدر دوا خانے سے ذرا آگے بڑھ کر مجھے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔

میں بھی تجسس سے مجبور ہو کر اس ہجوم میں شامل ہو گیا' اور کسی نہ کسی طرح آگے پہنچ گیا۔ مجمع کے وسط میں ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کا اوپری جسم برہنہ تھا' اس نے انگلش فلموں والے ہیرو کے اسٹائل کی پینٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں لانگ بوٹ تھے' اور کمر سے ایک تلوار بھی لٹک رہی تھی۔ مجھے وہ شخص اچھا لگا۔ وہ دراز قد' اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک مریل سا لڑکا سرکس کے مسخروں کی طرح کپڑے پہنے پیتل کی ایک تھالی کو چمچے سے گھنٹی کی طرح بجا رہا تھا۔ ہیرو نما شخص نے کرتب دکھانا شروع کر دیے۔ کبھی وہ سر کے بل کھڑا ہو جاتا' کبھی ہاتھوں کے بل چلتا' لکڑی کے ایک بیلن نما ٹکڑے پر تختہ رکھ کر بیلنس کر کے دکھاتا۔ اچانک اس نے کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تلوار سونتی اور اسے نگل گیا۔ صرف تلوار کا دستہ اس کے منہ سے باہر تھا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں اور حتی المقدور پیسے بھی دیے۔ پھر مجمع چھٹ گیا' مگر میں وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اس قسم کے کرتب پہلی دفعہ دیکھے تھے اس لیے وہ سب مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ ممکن ہے اس قسم کا تماشا لاہور میں بھی ہوتا ہو' مگر مجھے کبھی دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

سینڈو نے اپنا سامان سمیٹا' پھر اس کا ساتھی لڑکا کھانا لے آیا۔ وہ لوگ فٹ پاتھ ہی پر ایک طرف بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی' مگر میری جیب میں تو اب پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اچانک سینڈو کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا۔ "میں بہت دیر سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا تم کسی کے انتظار میں بیٹھے ہو؟"

"نہیں' میں پہلی دفعہ کراچی آیا تھا۔ ٹرام میں میری جیب کٹ گئی۔"

"ارے۔" پھر بولا "کھانا کھاؤ۔" پھر اس نے بہت اصرار کر کے مجھے کھانے میں شریک کر لیا۔

نہ جانے کیوں مجھے وہ آدمی سچا اور کھرا لگ رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے سگریٹ سلگایا اور وہیں نیم دراز ہوتے

ہوئے بولا۔ "پتھر بھی فقیروں کی سرہانے کے نہیں ہم' کچھ بھی ہو ہر انسان ٹھکانے کے نہیں ہم! خیر چھوڑو' تم پہلے تو اپنا نام بتاؤ پھر جلدی سے یہ بتاؤ کہ تم کہاں سے آئے ہو؟"

میرا دل چاہا کہ میں اس پر اعتبار کر لوں۔ ممکن ہے شہلا کو ڈھونڈنے میں بھی یہ میری کچھ مدد کر سکے۔ میں نے اسے شروع سے آخر تک ساری داستان بلا کم و کاست سنا دی' مگر اس میں سے میں نے ڈاکٹر اور امی کے قتل کا تذکرہ گول کر گیا تھا۔ میں نے اسے یہی بتایا کہ امی کے رویے سے تنگ آکر میں نے بہن کو لے کر گھر چھوڑ دیا۔

سینڈو خاموش بیٹھا مجھے گھور رہا تھا' وہ لڑکا شاید اس کا ملازم تھا جو اس کے ساتھ کام کرتا تھا۔ پھر سینڈو نے لڑکے سے کہا۔ "جاؤ اچھی سی چائے لے کر آ۔" لڑکے کے جانے کے بعد سینڈو نے مجھ سے کہا۔ "تم اتنے اچھے بچے ہو کر جھوٹ بھی بولتے ہو؟"

میں سٹپٹا گیا۔ "جی! وہ ---"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھ پر بھروسا نہیں کیا۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ اخبارات میں یہ خبر آ چکی ہے۔ خبر کے ساتھ نہ صرف تمہاری تصویر تھی بلکہ تمہاری امی اور بہن کی تصویریں بھی تھیں۔"

میرا جسم پسینے میں تر ہو گیا' دماغ سائیں سائیں کرنے لگا' اور میرا دل چاہا کہ میں یہاں سے اٹھ کر بھاگ جاؤں۔"

سینڈو نے شاید میرے خیالات پڑھ لیے۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "گھبراؤ مت! میں کسی کو بتانے نہیں جا رہا ہوں کہ تم لاہور سے آئے ہو اور ----"

اتنے میں وہ لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ سینڈو نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا' اور اس لڑکے سے کہا۔ "بالے' تو سامان لے کر گھر چل۔ آج کام کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ میں بھی ایک جگہ سے ہو کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ قمیص پہن کر اس نے لانگ بوٹ اتارے اور دوسرے جوتے پہن لئے' پھر مجھ سے بولا "آؤ خرم چلیں!۔"

مجھے لے کر وہ ڈھنگ کے ایک ہوٹل میں جا بیٹھا اور بولا۔"میں بالے کے سامنے کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اب میرے ساتھ ہی رہو۔ میں سب کو یہی بتاؤں گا کہ تم میری بہن کے بیٹے ہو اور میرپور خاص سے پڑھنے کے لیے کراچی آئے ہو۔"

"مگر کیوں؟" میں نے الجھ کر کہا۔" آپ میرے لیے یہ سب کیوں کریں گے؟ آپ تو مجھے کہیں چھوٹا موٹا کام دلوا دیں اور ----"

"خرم!" سینڈو نے نہایت اپنائیت سے کہا۔ "میرے بھانجے ہو کر ایسی بات کرتے ہو۔ بس آج سے تم میرے ساتھ ہی رہو گے اور مجھے ماما کہو گے سمجھے!" پھر وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "مجھے بیٹے کی بہت آرزو تھی۔ اللہ نے مجھے ایک بیٹا دے ہی دیا۔

میرے گھر میں تمہیں بہت آرام ملے گا۔ وہاں تمہاری مامی ہے۔ ذکیہ باجی ہے اور میں ہوں۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے ماما مگر آپ شاید بالے کو بھول گئے۔" میں نے کہا۔ "وہ تو سب کو بتا دے گا کہ استاد کا خرم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔" ماما نے کہا۔ "مگر میں اسے سمجھا دوں گا۔ وہ بہت اچھا بچہ ہے میرا کہنا کبھی نہیں ٹالتا' چلو اب گھر چلیں۔"

"میری ایک بات مان لیں ماما!" میں نے کہا۔

"ہاں بولو!" ماما نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"آپ جس طرح جمناسٹک کے کرتب دکھا رہے تھے' مجھے بہت اچھا لگا وہ سب کچھ۔ آپ مجھے بھی سکھا دیں گے؟"

"تم ان چکروں میں مت پڑو بیٹا!" ماما کا لہجہ بدل گیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم بھی میری طرح ایک ناکام اور سڑک چھاپ انسان بن کر رہ جاؤ۔"

"نہیں ماما!" میں نے ضد کی۔ "میں صرف اپنے شوق کے لیے سیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ارے تو کیا ابھی فوری طور پر سکھا دوں! گھر تو چلو۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تو پھر وعدہ؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وعدہ' یار وعدہ!" ماما نے ہنس کر کہا۔ ہم لوگ ہوٹل سے باہر نکلے تو ماما مٹھائی کی ایک دکان پر رک گئے اور گرم گرم امرتیوں کا آرڈر دے کر بولے۔ "ذکیہ کو امرتیاں بہت پسند ہیں۔"

امرتیاں لے کر وہ بس میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے نیو کراچی کے ٹکٹ لیے تو میں چونکا اور ان سے پوچھا۔ "کیا یہاں دو کراچی ہیں نیو اور اولڈ!"

"ہاں بیٹا!" ماما نے جواب دیا۔ "نیو کراچی ابھی آباد ہو رہا ہے۔ وہاں حکومت نے بے گھر لوگوں کو مکانات الاٹ کیے ہیں۔ وہیں مجھے بھی مکان مل گیا ہے۔ اس سے پہلے میں قائداعظم کے مزار کے پاس جھونپڑیوں میں رہتا تھا۔"

ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے زیادہ خود سے باتیں کر رہے ہیں۔

ان کی کچھ باتیں میری سمجھ میں آئیں' کچھ نہیں آئیں' مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا اور ہم نیو کراچی پہنچ گئے۔ واقعی وہاں آبادی برائے نام تھی۔ وہاں ابھی تک مکان بن رہے تھے۔ بہت سا علاقہ اب بھی ویران تھا۔ دور دور تک دھول مٹی کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں۔ تھوڑی دور تک پیدل چلنے کے بعد کوارٹرز کی ایک رو شروع ہوئی۔ دو گلیاں چھوڑ کر ماما تیسری گلی میں داخل ہو گئے۔ اس گلی کا پانچواں مکان ماما کا تھا۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ دروازے کے فوراً بعد چھوٹا سا ایک صحن تھا' صحن

میں ایک طرف کچن تھا' اور دوسری طرف باتھ روم وغیرہ' سامنے دو کمرے تھے۔ صحن میں ایک تخت پڑا تھا۔ تخت پر ادھیڑ عمر کی ایک خاتون بیٹھی تھیں۔

وہ مجھے دیکھ کر چونکیں' پھر سوالیہ انداز میں ماما کی طرف دیکھا تو ماما نے خوشی سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "دیکھو زینت' اللہ نے ہمیں بھی بیٹا دے دیا۔ تمہیں بہت ارمان تھا نا بیٹے کا!" پھر ماما مجھ سے بولے۔ "خرم بیٹا! یہ تمہاری مامی ہیں۔"

مامی نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا' پھر ماما سے مخاطب ہوئیں۔ "مجھ سے مذاق مت کریں۔ یہ بتائیں کہ یہ بچہ کون ہے؟"

"ذرا صبر کرو۔" ماما نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سب بتا دوں گا۔" پھر وہ چونک کر بولے۔ "ذکیہ کہاں ہے؟"

اسی وقت باہر سے ایک انتہائی حسین لڑکی اندر داخل ہوئی اور ابو کہہ کر ماما سے لپٹ گئی۔ ماما نے اس سے کہا۔

"ذکیہ بیٹا! آج میں تیرے لیے دو خوشخبریاں لایا ہوں۔"

"کون سی ابو؟" ذکیہ نے جلدی سے پوچھا۔ اس کی آواز بھی اسی کی طرح حسین تھی۔

"بیٹے! پہلی تو یہ کہ میں تیرے لیے ایک چھوٹا بھائی لایا ہوں۔" انہوں نے میری طرف اشارہ کیا' پھر مجھ سے بولے۔ "خرم! اپنی باجی کو سلام کرو۔"

میں نے جلدی سے سلام کیا۔

اس نے گھوم کر مجھے دیکھا' پھر وہ باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ ماما نے کہا۔ "بیٹی یہ خرم ہے۔ آج سے یہیں رہے گا۔"

ذکیہ باجی کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔ اس عالم میں وہ مزید حسین لگ رہی تھیں۔ یوں بھی ان کے حصے میں ماما کی سب خوبصورتی آ گئی تھی۔ انہی کی طرح دراز قد' سرخ و سفید رنگت اور متناسب جسم! دونوں باپ بیٹی میں ایسی مشابہت تھی کہ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا' صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ذکیہ باجی مجھے پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگیں۔

ماما نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور دوسری خوشخبری یہ ہے کہ یہ میں تیرے لیے امرتیاں لایا ہوں۔"

یہ سن کر تو ذکیہ باجی بچوں کی طرح کھل اٹھیں۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ بھلا مٹھائی بھی ایسی چیز ہے جس کے لیے خوش ہوا جائے۔ ہمارا فریج تو انواع و اقسام کی اشیا سے بھرا رہتا تھا۔ مجھے جس چیز کی بھی خواہش ہوتی' فوراً مل جاتی۔

یہ احساس تو مجھے اب ہو رہا تھا' کہ انتظار کرنے کے بعد کوئی دل پسند چیز ملے تو کتنی

خوشی ہوتی ہے۔

رات تک میں ان لوگوں میں گھل مل چکا تھا' اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اسی گھرانے کا ایک فرد ہوں۔ ماما نے ذکیہ باجی اور مامی کو میرے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ خرم کے والدین مرچکے ہیں۔ یہ اپنی بہن کے ساتھ کراچی آیا تھا کہ راستے میں اس کی بہن بچھڑ گئی' اور بہن کے علاوہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

مامی نے مجھے سینے سے لگا کر ممتا بھرے لہجے میں کہا۔ "بیٹا! آج سے میں تیری ماں ہوں۔"

ذکیہ باجی مجھ سے اتنی ہی دیر میں فری ہو گئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "واہ بھئی خرم! تمہارے تو عیش ہو گئے۔ ایک ہم ہیں کہ امی نے کبھی ہم سے یہ نہیں کہا کہ آج سے میں تمہاری ماں ہوں۔"

ان کی بات پر ماما اور مامی بے اختیار مسکرا اٹھے۔ ماما نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے ابھی سے جلنے لگی اس سے۔"

اس دن یہ طے ہوا کہ ذکیہ باجی کل میرا ایڈمیشن اسکول میں کرائیں گی۔ ماما نے ان دونوں کو بھی تاکید کر دی کہ سب کو یہی بتانا' خرم میرا بھانجا ہے۔ میرے لئے کھانے میں بھی بہت اہتمام کیا گیا۔ ذکیہ باجی اور مامی دونوں مجھے ہر چیز زبردستی کھلا رہی تھیں۔ ان کی محبت اور خلوص دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں سونے کو لیٹا تو انہی لوگوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہاں بے شک غربت تھی' مگر سکون تھا' چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں' ان کے رویے کھرے تھے' وہ لوگ ہر طرح سے سچے لوگ تھے۔ یہی سوچتا سوچتا نہ جانے میں کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اتنے دن کے بعد اس رات مجھے پرسکون نیند آئی ورنہ میں نے جب سے گھر چھوڑا تھا' مجھے سکون نصیب نہیں ہوا تھا۔

صبح مجھے ذکیہ باجی نے اٹھایا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "اٹھیئے نواب صاحب! بہت سو لیا۔" میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا' کہ وہ پھر بولیں۔ "حضور! آپ کے انتظار میں کنیز بھی بھوکی ہے۔"

ماما اپنے کام پر جا چکے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ذکیہ باجی نے کہا کہ تھوڑی سی شاپنگ کر آئیں۔

"آج تمہاری وجہ سے میں نے بھی کالج سے چھٹی کی ہے۔" ذکیہ باجی نے کہا۔

ذکیہ باجی نے میرے لئے ڈھیروں شاپنگ کر ڈالی۔ کپڑے' جوتے' بنیان' موزے' اور بہت سی چیزیں۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میری سگی بہن ہو۔ ان کے چہرے پر بہنوں جیسا ہی تقدس تھا۔

دوسرے دن ذکیہ باجی مجھے اسکول لے گئیں' اور ٹیسٹ دلوا کر میرا ایڈمیشن کرا دیا۔ اسکول سے واپسی پر میری نظر چھوٹی سی ایک لڑکی پر پڑی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے بالکل شہلا لگی۔ میرے ذہن کو دھچکا سا لگا۔ شہلا نہ جانے کہاں تھی' کس حال میں تھی اور میں اسے بھلائے بیٹھا تھا۔ میں نے خود کو ملامت کی کہ بہن کا کچھ پتا نہیں' وہ زندہ بھی ہے یا نہیں اور میں عیش کر رہا ہوں۔

ذکیہ باجی شاید مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ چلتے چلتے رک گئیں اور تڑپ کر بولیں۔ "تم رو رہے ہو خرم! مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟"

ان کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ واقعی میرے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے' اور جبراً مسکرا کر بولا۔ "نہیں ذکیہ باجی ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"ذکیہ باجی ! اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے شہلا یاد آ گئی تھی۔" میں ایک بار پھر رونے لگا۔

"صبر کرو میرے بھائی۔" ذکیہ باجی تاسف سے بولیں۔" میں ابو سے کہوں گی کہ وہ شہلا کو جلدی سے ڈھونڈ لائیں' پھر ہم تینوں ایک ساتھ رہیں گے' کتنا مزہ آئے گا۔" وہ مجھے بچوں کی طرح بہلانے لگیں۔

میں اب اتنا بچہ بھی نہیں تھا' مگر جس انداز سے وہ مجھے بہلا رہی تھیں' اس پر مجھے پیار آ گیا' پھر راستے بھر ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم رہے۔

شام کو ماما آئے تو ذکیہ باجی نے ان سے کہا۔ "ابو ! آپ نے شہلا کے لئے کیا کیا ہے؟ خرم آج بہت رو رہا تھا۔"

"ہیں۔" ماما چونک کر بولے۔ "خرم رو رہا تھا!" وہ میری طرف مڑے۔ "بے وقوف ! تو کیا سمجھتا ہے کہ مجھے فکر نہیں ہے شہلا کی۔ تو جانتا ہے کہ میرے کام کی نوعیت کیا ہے۔ دن بھر ہزاروں آدمیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ میں نے کچھ لوگوں سے کہہ دیا ہے وہ شہلا کو تلاش کر رہے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ اپنوں سے بچھڑ جانے کا دکھ کیسا ہوتا ہے۔" ماما کی آواز لرزنے لگی۔ "میں بھی یہ دکھ جھیل چکا ہوں خرم بیٹا ! میری بہنیں بھی مجھ سے جدا ہو چکی ہیں۔" ماما کی آواز ڈوبنے لگی۔ "تجھے یہ تو اطمینان ہے کہ شہلا زندہ ہے۔ میری بہنیں تو میری آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئی تھیں۔" ماما کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

انہیں روتا دیکھ کر ذکیہ باجی بھی رونے لگیں۔ مامی تو پہلے ہی رو رہی تھیں۔ ذکیہ باجی نے روتے ہوئے کہا۔ "ابو ! آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ شہیدوں کے لئے رونا نہیں چاہیے اور آج آپ خود رو رہے ہیں۔"

ماما نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے اور مسکرا کر بولے۔ "میں رو تو نہیں رہا ہوں بیٹا!

خرم کو دکھی دیکھ کر میرے دل کا درد بھی آنکھوں سے چھلک اٹھا۔"

"ابو!" ذکیہ باجی نے کہا۔"ایک بات پوچھوں' ہمیشہ کی طرح آج ٹالیے گا مت۔ آپ نے کبھی نہیں بتایا کہ میرے دادا کون تھے؟ کیا کرتے تھے؟ جب دوسری لڑکیاں اپنے دادا دادی کے واقعات سناتی ہیں تو مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ آج تو میں آپ سے پوچھ کر رہوں گی۔"

"وہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے بیٹا!" ماما نے سنبھل کر کہا۔ تیرے دادا بہت بڑے آدمی تھے' بہت بڑے زمیندار تھے۔ علاقے کے دولت مند لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔"

"پھر ابو! دادا جی نے وہ جاگیر کسے دے دی؟" ذکیہ باجی نے حیرت سے پوچھا۔

"بیٹا! تیرے دادا مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ پر ایسی شرط عائد کر دی تھی کہ میں دو چیزوں میں سے صرف ایک کا انتخاب کر سکتا تھا۔" ماما یہ کہہ کر مسکرائے۔ "میں نے جاگیر چھوڑ دی۔"

"پھر جاگیر کے بدلے میں آپ نے کس چیز کی چوائس کی؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

ماما نے زور سے قہقہہ لگایا پھر بولے۔ "اب تم لوگوں سے کیا چھپانا۔ میں نے تمہاری امی کا انتخاب کر لیا۔"

میں نے اور ذکیہ باجی نے بیک وقت امی کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ستارے سے جگمگا رہے تھے۔ اس لمحے امی مجھے بہت حسین لگ رہی تھیں۔ پھر مجھے ایک خیال آیا اور میں نے ماما سے پوچھا۔ "اور۔۔۔ آپ کی۔۔۔"

"میں ابا جی سے الگ ہو گیا تھا' مگر رہتا اسی شہر میں تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو میں تمہاری امی کو لے کر اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں پاکستان جانے والوں کا ایک قافلہ پہلے سے موجود تھا۔ میرے محلے کے بھی بہت سے لوگ وہاں موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی محلے کے ایک آدمی نے بتایا کہ صفدر بھائی ہمارے محلے پر حملہ ہونے والا ہے۔ آپ اپنی والدہ اور بہنوں کو لے کر آ جائیں۔ آپ کے والد دہلی گئے ہوئے ہیں۔" یہ سنتے ہی میں نے تمہاری امی کو وہیں چھوڑا اور محلے کے ایک آدمی سے کہا کہ میری بیوی کا خیال رکھنا' پھر میں خطرے کی پروا کئے بغیر بھاگتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ میری ماں اور بہنیں سہمی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہروں پر رونق آ گئی۔ اسی وقت ابا جی بھی ہانپتے کانپتے پہنچ گئے۔

ابا جی کو گھر میں داخل ہوئے مشکل سے ایک منٹ ہوا ہو گا کہ دروازے پر زور دار دستک ہوئی پھر فلک شگاف نعروں کی آواز سنائی دیں۔ میری ماں اور دونوں بہنوں کے چہرے دھواں ہو گئے۔ اس وقت مردوں میں صرف میں اور ابا جی تھے۔ حویلی کے تمام ملازم اپنے

اپنے خاندانوں کو لے کر نکل گئے تھے' پھر کسی نے چیخ کر کہا۔ "دروازہ کھولو ورنہ توڑ دیں گے۔"

گھر میں صرف تین رائفلیں اور ایک ریوالور تھا۔ اس اسلحے کا اندراج تھانے میں نہیں تھا' ورنہ یہ بھی جمع ہو چکا ہوتا۔ میں نے ایک رائفل اباجی کو دی' دوسری رائفل خود لی' اور کارتوس کا ڈبا لے کر اوپر کی طرف دوڑا جہاں اباجی یہ کہہ رہے تھے کہ وہ دروازے کا خیال رکھیں گے' اور کوئی بھی شخص دیوار پھلانگنے کی کوشش کرے تو اسے بے دھڑک گولی مار دیں گے۔

میں نے دوسری منزل سے نیچے دیکھا۔ بلوائی سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ وہ سب رائفلوں' لاٹھیوں' ڈنڈوں سے مسلح تھے' پھر مجھے اپنے اصطبل کی چھت پر دو آدمی دکھائی دیئے۔ انہیں دیکھ کر میرا حوصلہ دوچند ہو گیا۔ وہ دونوں اباجی کے باڈی گارڈز تھے' اور شکار میں بھی اباجی کے ساتھ رہتے تھے۔ان میں سے ایک اکیلا ہی دس پر بھاری تھا۔ وہ دونوں شاید پہلے سے وہاں مورچہ بنائے بیٹھے تھے' کیونکہ وہ جگہ مورچے کے لئے بہترین تھی۔ وہاں سے وہ چاروں طرف نگاہ رکھ سکتے تھے۔ ایک بات اور بتا دوں۔ انہی میں سے ایک گارڈ بہترین جمناسٹ تھا۔ اس کا نام منیر تھا۔ میں نے جمناسٹک کے کرتب اسی سے سیکھے تھے۔

ان دونوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا' اور فائر کھول دیا۔ بلوائی ہراساں ہو کر پیچھے ہٹے۔ ان میں سے کئی گر کر تڑپنے لگے۔ جن بلوائیوں کے پاس رائفلیں تھیں' انہوں نے جوابی فائر کھول دیا' مگر وہ دونوں گارڈز اباجی کے بہترین شکاری تھے۔ انہوں نے بلوائیوں پر ایک مرتبہ پھر گولیوں کی بوچھاڑ کی۔ کئی چیخیں ابھریں' کچھ بلوائی گرے باقی پیچھے ہٹ گئے۔ اسی دوران کچھ اور لوگ حویلی کے صدر دروازے تک پہنچ گئے پھر ان میں سے کوئی چیخ کر بولا۔ "دروازے کو آگ لگا دو۔"

میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ اگر دروازے کو آگ لگ جاتی تو وہ ذرا ہی دیر میں جل کر گر جاتا اور بلوائی بلا کسی رکاوٹ کے اندر پہنچ جاتے۔ اباجی ایک رائفل سے انہیں کتنی دیر روک سکتے تھے یا میں کتنے بلوائیوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ دروازے کو آگ لگانے کی بات شاید منیر اور لطیف نے بھی سن لی تھی۔

حویلی کے اصطبل سے لے کر اندرونی حصے تک ایک چوڑی سی دیوار تھی۔ اتنی چوڑی کہ بیک وقت دو آدمی اس پر دوڑ سکتے تھے۔ میں نے دیکھا' منیر تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اسی دیوار پر چڑھ گیا تھا۔ وہ شاید حویلی کے اندرونی حصے میں جانا چاہتا تھا۔ بلوائیوں نے جونہی اسے دیکھا اس پر دو فائر ہوئے' مگر میں اس کی پھرتی دیکھ کر عش عش کر اٹھا۔ وہ ہوا میں دائرے بناتا ہوا گویا دیوار پر اڑ رہا تھا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پہیہ تیز رفتاری سے حویلی کی طرف جا رہا ہو۔ یہ اس کا بہت خاص کرتب تھا۔ اس نے یہ کرتب

مجھے بھی سکھایا تھا، مگر اتنی پھرتی سے تو میں بھی دائرے نہیں بنا سکتا تھا۔ دیوار پر تو اس کے پاؤں ٹکتے ہوئے معلوم ہی نہیں ہوتے تھے۔ بلوائی بھی شاید پریشان ہو گئے تھے، کہ یہ آدمی ہے یا چھلاوا! آنا" فانا" وہ حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا، مگر اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس کرتب بازی میں اس کی رائفل ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

اپنی ناکامی پر جھنجلا کر بلوائیوں نے حویلی کے صدر دروازے کو آگ لگا دی، اور دروازہ دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ اصطبل کے مورچے پر اب لطیف اکیلا تھا۔ اس نے نیچے صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے باہر سر نکالا تو کسی بلوائی نے تاک کر نیزہ پھینکا۔ پھینکنے والے کا نشانہ بہت غضب کا تھا۔ نیزہ لطیف کی گردن میں پیوست ہو گیا اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح اصطبل کی چھت پر گر گیا۔ میں نے نشانہ لیا اور یکے بعد دیگرے دو بلوائیوں کو جہنم رسید کر دیا، مگر وہ کم بخت بھی ایک دو نہیں، سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔

اچانک دروازہ چرچرایا، اور دھماکے سے اندر کی طرف گر پڑا۔ میں گرتا پڑتا نیچے کی طرف بھاگا۔ اس دروازے میں اباجی اور منیر پاگلوں کی طرح حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے، پھر منیر نے چیخ کر کہا۔ "سرکار! میرے پاس گولیاں ختم ہو گئی ہیں۔"

جلتے ہوئے دروازے کی وجہ سے بیشتر حملہ آور باہر ہی تھے۔ کچھ جوشیلے نوجوانوں نے اندر گھسنے کی کوشش کی بھی تو اباجی اور منیر کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔

اباجی اندر کی طرف لپکے، میں بھی پیچھے پیچھے دوڑا۔ اس وقت تک وہ میری دونوں بہنوں اور ماں کو ایک لائن میں کھڑا کر چکے تھے۔ وہ ان پر رائفل پر تانے ہوئے تھے، اور کہہ رہے تھے۔ "ساجدہ بیٹی! راشدہ گڑیا! اپنے باپ کو معاف کر دینا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد میری عزت پامال ہو۔"

"جلدی کیجئے اباجی!" ساجدہ نے تڑپ کر کہا۔ "کہیں آپ کا ارادہ بدل نہ جائے۔"

"وہ منظر دیکھ کر میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "ساجدہ، راشدہ! اباجی، اباجی ٹھہر جائیں ابھی میں زندہ ہوں۔ میں مر جاؤں تو انہیں مار دیجئے گا۔ ابھی میں مایوس نہیں ہوا اباجی۔!" میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ "اگر بچ نکلنے کی کوئی امید نہیں رہی تو میں انہیں۔۔۔"

میرا جملہ درمیان ہی میں رہ گیا۔ اباجی کی رائفل نے شعلہ اگلا اور ساجدہ خون میں نہا گئی، پھر اباجی نے دوسرا فائر کیا۔ میری پیاری بہن، میری گڑیا بھی زمین پر گر پڑی۔ میں بھاگ کر ان دونوں کے پاس پہنچا۔ ساجدہ تو گرتے ہی شہید ہو گئی تھی، مگر گڑیا میں ابھی سانس باقی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کچھ کہنا چاہا، چہرے پر مسکراہٹ آئی پھر وہ مسکراہٹ امر ہو گئی۔ میں تو اباجی کی ہمت کو داد دے رہا تھا۔ جن بیٹیوں کو کبھی انہوں نے پھول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا، انہیں اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ انہوں

نے تیسرا فائر کرنے کے لئے امی پر رائفل تان لی، مگر اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہ کھڑے قد سے فرش پر گریں، اور ساکت ہو گئیں۔ میں نے بڑھ کر ان کی نبض محسوس کرنے کی کوشش کی۔ دل کی دھڑکن سننا چاہی، مگر وہاں سناٹا تھا۔ وہ بھی اپنی دونوں بیٹیوں کے پاس پہنچ چکی تھیں۔

میری آنکھوں میں جلن سی ہو رہی تھی۔ مجھے ہر طرف خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا۔ میں اور اباجی باہر نکلے تو منیر کو تنہا پانچ چھے آدمیوں سے لڑتے دیکھا۔ اب اس کے ہاتھ میں رائفل کی جگہ ایک ڈنڈا تھا اور وہ بندر کی طرح اچھل اچھل کر ان پر حملے کر رہا تھا اور خود کو بھی بچا رہا تھا۔

بلوائیوں کے پاس بھی ایمونیشن شاید ختم ہو گیا تھا، مگر میرے پاس ابھی بہت گولیاں تھیں۔ آدھی گولیاں میں نے اباجی کو دے دیں۔ ہم دونوں نے تابڑ توڑ ان پر ایسی فائرنگ کی کہ وہ لوگ چیختے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ منیر بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اباجی نے جیب سے ریوالور نکال کر اس کی طرف پھینک دیا۔

اتنے میں باہر سے کوئی چیخا۔ "فوج آگئی، بھاگو۔"

پھر ان لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی، اور فوج کے جوانوں نے ہم تینوں کو وہاں سے نکال لیا۔ فوجی گاڑی میں بیٹھ کر میں بلک بلک کر رونے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اباجی میری بات مان لیتے اور ذرا دیر اور ٹھہر جاتے تو اس وقت ساجدہ، راشدہ اور امی بھی ہمارے ساتھ ہوتیں۔

ہم اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی جانے کو تیار کھڑی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے زینت کو ڈھونڈا پھر ہم لوگ کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچ گئے۔

"اور ابو، دادا جی کہاں گئے؟" زکیہ باجی نے وہی سوال کیا جو میرے ذہن میں تھا۔

ماما مسکرائے۔ "میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ تمہارے دادا جی بہت سخت گیر اور آن والے انسان تھے۔ لاہور پہنچ کر انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم جہاں چاہے جاؤ، اپنی بیوی کو لے کر کبھی میری چوکھٹ پار مت کرنا۔" مجھے اباجی کے اس رویے سے شدید دکھ پہنچا۔ میرے سوا اب بچا ہی کون تھا ان کا، مگر اپنی آن پر تو وہ مجھے بھی اپنے ہاتھ سے گولی مار سکتے تھے۔ میں شاید کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑتا، مگر انہوں نے شرط ہی ایسی عائد کر دی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دو پھر میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا، مگر میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اب میں اپنی بیوی کو طلاق دے بھی دیتا تو وہ کہاں جاتی؟ منیر آخر وقت تک ان کے ساتھ رہا۔ پاکستان آنے کے فوراً بعد ان کا کلیم منظور ہو گیا تھا۔ انہیں ضلع نواب شاہ میں خاصی زرعی زمین مل گئی، مگر اپنے انتقال سے پہلے ہی انہوں نے ساری جائیداد، بینک بیلنس، کوٹھی وغیرہ سب کچھ منیر اور اس کے بچوں کے نام کر دیا۔ وہ

سال پہلے جب اباجی کا انتقال ہوا تو منیر ملا تھا۔ وہ اس منیر سے بہت مختلف تھا جسے میں نے میرٹھ میں دیکھا تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ دولت آتے ہی لوگوں میں وقار اور دبدبہ پیدا ہو جاتا ہے' مگر مجھ سے وہ پہلے ہی کی طرح ملا۔

"ابو! آپ نے تو واقعی امی کے لئے بہت بڑی قربانی دی ہے۔"

"بس ذکیہ!" ماما نے سخت لہجے میں کہا۔ "آئندہ یہ بات نہ کرنا۔ میں اسی لئے تم سے اصل بات چھپاتا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میں محرومی کا احساس پیدا ہو اور تم اپنی ماں کو قصوروار سمجھنے لگو۔"

"میں بھی آپ ہی کی بیٹی ہوں ابو!" ذکیہ باجی بھی سنجیدہ ہو گئیں۔ "امی میری بھی تو ماں ہیں۔ میں انہیں کیوں قصور وار سمجھوں گی۔"

ماما کی داستان عبرت انگیز بھی تھی' اور ہمارے لئے مثال بھی! رات خاصی گزر چکی تھی۔ لالٹین بھی بھڑکنے لگی تھی۔ ماما نے لالٹین میں مٹی کا تیل ڈالا' اس کی لو نیچی کی' اور سونے کے لئے لیٹ گئے۔ شروع شروع میں مجھے لالٹین کی روشنی سے بہت گھٹن محسوس ہوتی تھی' مگر اب تو میں بھی اس نیم اندھیرے' نیم اجالے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہاں الیکٹرک اس وقت پہنچی ہی نہیں تھی۔ میں سونے کے لئے لیٹا تو مجھے ایک عجیب خیال آیا۔ ماما کے والد نے بھی تو اپنی عزت کی خاطر اپنی دونوں بیٹیوں کو مار ڈالا تھا۔ میں نے بھی عزت ہی کی خاطر اپنی ماں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کی بیٹیوں نے ہنسی خوشی جان دی تھی' مگر میری ماں۔۔۔ یہی سوچتا ہوا میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○

پھر زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی۔ میں صبح اسکول جاتا' سہ پہر کے وقت ذکیہ باجی مجھے پڑھاتیں' پھر شام کو ماما کے آنے پر میں جمناسٹک کی مشقیں کرتا۔ اس شوق میں دو دفعہ گر کے زخمی بھی ہو چکا تھا' مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور مشقیں جاری رکھیں۔ اب میں لکڑی کے گول بیلن نما ٹکڑے پر تختہ رکھ کر اس پر بغیر کسی سہارے کے کھڑا ہونے لگا تھا۔ جمناسٹک کی سخت مشقوں نے میرے جسم میں ربڑ جیسی لچک پیدا کر دی تھی۔ میں شہلا کی طرف سے بھی اب تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ میں نے ناظم آباد سمیت کراچی کا چپہ چپہ چھان مارا' مگر نہ تو مجھے شہلا ہی مل سکی' نہ احسان صاحب! میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا تھا کہ اگر شہلا زندہ ہوئی تو ایک نہ ایک دن مجھے ضرور ملے گی۔

پھر وقت کا پہیہ اتنی تیزی سے گھوما کہ کئی ماہ و سال گرد بن کر اڑ گئے۔ میں اب میٹرک میں تھا۔ ذکیہ باجی بی اے کر چکی تھیں اور ماما ان کی شادی کرنے کی فکر میں تھے۔ میں اس دوران میں جمناسٹک میں طاق ہو چکا تھا۔ اب میں اپنے جسم سے ہوا میں دائرے

بتاتا تو ماما کہتے تھے کہ خرم کو دیکھ کر مجھے منیر یاد آتا ہے۔ مجھے تو حسرت ہی رہی کہ کبھی اتنی پھرتی سے گردش کر سکوں۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں ماما!" میں ہنس کر کہتا۔ "میں آپ ہی کا تو شاگرد ہوں۔"

ماما کبھی کبھی کہتے۔ "خرم بیٹا! اپنے اس شوق کو شوق ہی رکھنا اور پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بننا۔"

اس دن اسکول کی چھٹی ہوئی تو میں مٹھائی والے کی دکان پر رک گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ آج ذکیہ باجی کے لیے گرم گرم امرتیاں لے کر جاؤں گا۔ میں دکان میں داخل ہوا تو پیچھے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "سنئے ایک سیر مکس مٹھائی دے دیں۔"

میں چونک کر پلٹا۔ مجھے ایسا لگا جیسے شہلا میرے سامنے کھڑی ہو۔ وہی ناک نقشہ' وہی رنگ روپ' ویسے ہی بھورے گھنگریالے بال! دکان دار نے مٹھائی تول کر اس کے حوالے کی تو میں نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ۔۔۔ آپ کا نام۔۔۔"

"اپنے کام سے کام رکھیں مسٹر!" لڑکی نے بھنا کر کہا۔

"آپ کو کیا مطلب ہے میرے نام سے!"

"مجھے غلط مت سمجھیں۔" میں نے لجاجت سے کہا کہا۔ "میں تو صرف۔۔۔۔"

"سن اوئے باؤ!" مٹھائی والے نے میری بات کاٹ دی۔ "آئندہ اس طرح کی حرکت میری دکان میں مت کرنا! اب جلدی بول تجھے کیا چاہیے؟" پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ "آپ جائیں بی بی!"

لڑکی کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ "بھائی مجھے غلط مت سمجھو' میں اس قسم کا لڑکا نہیں ہوں۔ میں تو برسوں سے اپنی بہن کی تلاش میں ہوں۔ وہ بہت چھوٹی تھی تو مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میں سمجھا کہ میری بہن میرے سامنے کھڑی ہے۔"

مٹھائی والے نے میری بات کا یقین کیا یا نہیں' مگر اس کے چہرے کا ناگوار تاثر ختم ہو گیا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے امرتیاں تولیں اور مجھے تھما دیں۔ میں نے امرتیوں کی تھیلی لی' اور بوجھل قدموں سے باہر آ گیا۔

میں گھر پہنچا تو ماما اور مامی کسی بات پر زوردار بحث کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ میں صرف اتنا اندازہ لگا سکا کہ موضوع بحث ذکیہ باجی تھی۔ ذکیہ باجی شاید اندر تھیں۔ میں نے وہیں سے آواز لگائی۔ ذکیہ باجی! دیکھیے میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔" ذکیہ باجی' باہر نہ آئیں میں نے ماما سے اشارے میں پوچھا کہ ذکیہ باجی کہاں ہیں؟ انہوں نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ میں سمجھا کہ وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہی ہیں' میں نے پھر بلند آواز میں کہا۔ "ذکیہ باجی! جلدی آئیں ورنہ ساری امرتیاں میں کھا جاؤں گا۔"

یہ بات رائیگاں گئیں- میں نے سوچا ممکن ہے ذکیہ باجی سو رہی ہوں-
میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا اندر پہنچ گیا- ذکیہ باجی تکئے میں منہ دیے پڑی تھیں، اور ان کے جسم کی لرزش سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہیں- میں نے ان کا کندھا پکڑ کر ہلایا اور کہا- "کیا بات ہے باجی! آپ رو رہی ہیں؟" انھوں نے اس پر بھی میری بات کا جواب نہ دیا تو میں نے غصے میں کہا- "ٹھیک ہے ذکیہ باجی! آپ بات نہیں کرنا چاہتیں تو مت کریں- آیندہ میں بھی آپ سے بات نہیں کروں گا-"
یہ کہہ کر میں پلٹا ہی تھا کہ ذکیہ باجی نے تڑپ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں- "اب تو بھی مجھ سے روٹھ جائے گا خرم!"
میں نے بہ بغور ان کے چہرے کا جائزہ لیا- ان کا خوب صورت چہرہ آنسوؤں میں اوبا ہوا تھا، آنکھیں متورم تھیں- اس عالم میں وہ اور بھی اچھی لگ رہی تھیں- میں نے ہنس کر کہا- "اب، تو بھی" سے کیا مطلب ہے- آپ کا کیا کوئی اور بھی روٹھا ہوا ہے آپ سے؟ ویسے بھی انسان کو مہینے میں ایک آدھ بار رو لینا چاہیئے، آنکھوں کی صفائی ہو جاتی ہے-"
"یہ رونا تو عمر بھر کا ہے خرم!" انھوں نے گلوگیر لہجے میں کہا-
"آخر ہوا کیا؟" میں واقعی جھنجلا گیا- "امی اور ماما بھی چپ چپ سے ہیں، آپ بھی مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں- میں آپ کا سگا بھائی نہیں ہوں نا!" میں نے بھی جذباتی انداز میں کہا- مجھے واقعی افسوس ہوا تھا-
"ایسی باتیں مت کر خرم!" ذکیہ باجی پھر رونے لگیں- "میں تجھے سب کچھ بتا دوں گی--- اب تجھی سے تو مجھے امید ہے-"
ذکیہ باجی کی اس بات سے میں مزید الجھ گیا-
"مجھے پہلے بتائیں تو سہی کہ بات کیا ہے؟" میں نے پوچھا-
"بیٹھ جاؤ خرم!" ذکیہ باجی نے کہا- میں بیڈ ہی پر ایک طرف ٹک گیا، تو ذکیہ باجی نے ہچکچاتے ہوئے کہا- "خرم! ابو میری شادی کرنا چاہتے ہیں-"
"لاحول ولاقوۃ" میں نے ہنس کر کہا- "یہ بھی کوئی رونے کی بات ہے- بھئی ایک نہ ایک دن ہر لڑکی کو پرایا ہونا پڑتا ہے- لڑکیاں یوں بھی پرایا دھن ہوتی ہیں-" پھر میں نے گا کر کہا- "جا کے سسرال سکھی میکے کی لاج رکھنا!"
"خرم!" ذکیہ باجی نے چیخ کر کہا- "بکواس کیے جاؤ گے یا میری بات بھی سنو گے!"
میں سنجیدہ ہو گیا اور بولا- "کیا آپ شادی نہیں کرنا چاہتیں؟"
"وہاں نہیں کرنا چاہتی جہاں ابو چاہتے ہیں-" ذکیہ باجی نے آہستہ سے کہا-
"گویا آپ کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہیں- اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کسی

سے عشق فرماتی ہیں۔" میں نے شوخی سے کہا تو انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "ہمیں پتا بھی نہیں چلا کہ یہ سانحہ بھی ہو گیا یعنی ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔"

"خرم کے بچے' سنجیدہ ہو جاؤ ورنہ میں مار بیٹھوں گی۔" ذکیہ باجی نے منہ پھلا لیا۔

"اچھا چلیں سنجیدہ ہو گیا' مگر وہ موصوف ہیں کون؟ مجھے بتائیں تو سہی تاکہ میں ماما سے سفارش کروں۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ پچھلی گلی میں تو رہتے ہیں۔"

"بھئی یہ اشاروں کی زبان میں کیوں بات کر رہی ہیں۔" میں جھنجلا گیا۔ "صاف صاف نام بتائیں۔"

"جاوید۔" ذکیہ باجی نے مجھ سے نظر چرا کر کہا۔

"جاوید!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "وہ ہیرو وہ---"

"خرم!" ذکیہ باجی نے کہا۔ "کوئی غلط بات نہیں سنوں گی میں۔"

"اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہیں۔ یہ وہی جاوید ہے نا جو ایم اے کرنے کے بعد بھی جاب لیس ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" باجی نے مختصر جواب دیا۔

"سوری ذکیہ باجی!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ان موصوف کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ ان کے لیے تو میں بھی آپ کی سفارش نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے بھی ان کے دو تین اسکینڈل مشہور ہو چکے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔" ذکیہ باجی نے جواب دیا۔ "جاوید نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا مگر میرے ساتھ تو وہ سنجیدہ ہیں' شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"جاب کرتے نہیں ہیں' خود والدین پر بوجھ ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ مجھے واقعی غصہ آ گیا تھا۔ اس لڑکے کو سوائے بن ٹھن کر آوارہ گردی کرنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ کئی دفعہ میں نے اسے محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس میں بس ایک ہی خوبی تھی' کہ وہ خاصا خوب رو نوجوان تھا۔ لڑکیاں اس کے مردانہ حسن سے متاثر ہو جاتی تھیں' مگر میں ذکیہ باجی کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ جاوید سے مجھے پہلے بھی چڑ تھی۔ اب تو یکایک نفرت سی ہو گئی تھی۔ ماما بھی اسے اچھی طرح جانتے تھے' جبھی تو انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔

"کیا سوچنے لگے خرم!" ذکیہ باجی نے پوچھا۔

"ذکیہ باجی! آپ مجھے بھائی سمجھتی ہیں نا!" میں نے پوچھا۔

"اس بات کا یہ کون سا موقعہ ہے' اور یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھائی سمجھ کر تو

اتنی بات کر لی۔" ذکیہ باجی نے کہا۔

"تو پھر میری بات مان لیں۔ جاوید واقعی اچھا لڑکا نہیں ہے، آپ کو سوائے بدنامی کے اور کچھ بھی نہیں دے گا وہ۔"

"آخر تم لوگ اس کے دشمن کیوں ہو؟" ذکیہ باجی نے غصے میں بپھر کر کہا۔

"اس لئے کہ ہم آپ کا بھلا چاہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ جاوید سے ملتی بھی رہی ہیں۔ میں بھائی ہی کی حیثیت سے درخواست کروں گا کہ آیندہ اس سے مت ملئے گا۔"

"کون روکے گا مجھے ملنے سے؟" ذکیہ باجی بپھر گئیں۔

ان کی اس بات پر مجھے بھی ایک دم غصہ آیا۔ میں نے بھی چیخ کر کہا۔ "میں روکوں گا آپ کو۔ آپ مل کر تو دیکھیے۔"

"تم!" انھوں نے حقارت سے کہا۔ "تم روکو گے مجھے۔"

"ہاں، میں روکوں گا۔" میں نے چیخ کر کہا اور پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر صحن میں ماما اور مامی بیٹھے تھے۔ شاید انھوں نے میری اور ذکیہ باجی کی گفتگو سن لی تھی۔ ماما نے مجھے روکنا چاہا، مگر میں گھر میں نہیں رکا، غصے میں باہر نکل گیا۔ گلی میں گھر کے آگے ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اسی چبوترے پر جا بیٹھا۔ ماما بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آ گئے اور بولے۔ "خرم بیٹا! ذکیہ کی کسی بات کا برا مت ماننا۔"

"میں برا کیوں ماننے لگا ماما۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر آج مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ آپ، مامی اور ذکیہ باجی سب مجھے غیر سمجھتے ہیں، باہر کا آدمی ہوں نا میں اور باہر کے آدمیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔"

"ایسی باتیں مت کر خرم!" ماما تڑپ کر بولے۔ "ذکیہ کو میں نے خود ہی لاڈ پیار میں بگاڑا ہے۔ اب اس کی مرمت بھی میں ہی کروں گا۔"

"اب اس کا ایک ہی علاج ہے ماما!" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ "جلد از جلد ذکیہ باجی کی شادی کر دیں۔"

ہم دونوں تھوڑی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر ماما کے پاس محلے کے ایک اور صاحب آ بیٹھے تو میں اٹھ گیا۔ میں سلگتا ہوا بازار کی طرف چلا گیا۔ اس زمانے میں وہاں ایک ہی ہوٹل تھا۔ وہاں سارا دن بلند آواز میں ریکارڈنگ ہوتی رہتی تھی۔ لوگ کاغذ کے پرزوں پر اپنے پسندیدہ گانے کاؤنٹر تک پہنچا دیتے تھے، پھر ہوٹل کا مالک باری باری سب کی فرمائش پوری کر دیتا تھا۔ بعض اوقات وہ لوگوں کی فرمائش پر کوئی ریکارڈ خرید بھی لیتا تھا۔ ریکارڈنگ ہی کی بنیاد پر اس کا ہوٹل چلتا تھا۔

میں اسی ہوٹل میں جا بیٹھا۔ بیرے کو چائے کا آرڈر دے کر میں نے کرسی کی پشت

سے ٹیک لگائی تو میری نظر جاوید پر پڑی۔ وہ اپنے ایک اوباش ساتھی نسیم کے ساتھ بیٹھ
تھا۔ ہاف آستین کی ٹی شرٹ اور چست پینٹ میں وہ خاصا ہینڈ سم لگ رہا تھا' کم بخت اس
سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ ذکیہ باجی کا خیال آیا تو میرے دماغ میں چونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں
کرسی سے اٹھا' اور اس کے پاس پہنچا۔ میں اسے جاوید بھائی کہتا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔ "کیسے ہو خرم!"

"اب تو تک ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"بیٹھو!" اس نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "چائے پیو گے؟"

"بھئی بڑی خاطر ہو رہی ہے۔" نسیم بے ڈھنگے پن سے ہنس کر بولا۔ "میں پچھلے ایک
گھنٹے سے چائے کا کہہ رہا تھا' یعنی میری کوئی اہمیت ہی نہیں تمہاری نظر میں۔ خرم کے
آتے ہی چائے کی آفر بھی کر ڈالی۔ لوگ سچ ہی کہتے ہیں ساری خدائی ایک طرف۔۔۔"

اس کے گھٹیا جملے پر میری کھوپڑی ایک دم گھوم گئی۔ میں نے میز پر رکھا ہوا جگ
اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ المونیم کا ہلکا پھلکا جگ تھا۔ اس میں پانی بھی بہت کم تھا۔
میں نے زور سے مارا بھی نہیں تھا اس کے باوجود نسیم کرسی سے الٹ کر گر پڑا۔

"یہ کیا حرکت ہے خرم!" جاوید تلملا کر کھڑا ہو گیا۔

"تم بھی غور سے میری بات سن لو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "آئندہ اگر تم نے
میری بہن کے متعلق سوچا بھی تو اتنا ماروں گا کہ تمہاری شکل نہیں پہچانی جائے گی۔"

جاوید نے اچانک ہاتھ گھمایا' مگر میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مجھ پر حملہ کرتا' ہوٹل کا مالک ہم دونوں کے بیچ میں آگ
اور بولا۔ "او بھائی' لڑنا ہے تو باہر جا کر لڑو۔ یہ میرا ہوٹل ہے کوئی جنگ کا میدان نہیں
ہے۔"

میں باہر نکل گیا۔ میں بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اس میں بھی ذکیہ باجی کی
بدنامی تھی' میری اور ماما کی بدنامی تھی۔ جاوید بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آگیا۔ اسے شاید
اپنے دراز قد اور صحت مند جسم پر ناز تھا۔ اس کے مقابلے میں میں دبلا پتلا تھا' میری عمر بھی
کم تھی۔ یہی سوچ کر وہ میرے پیچھے لپکا اور ہاتھ بڑھا کر میرا کالر پکڑ لیا۔ اس نے کالر پکڑ
کر اچانک مجھے جھٹکا دیا تو میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا' اور زمین پر گر گیا۔ اس نے
میری کمر پر زور دار ٹھوکر رسید کر دی۔ تکلیف کے مارے میری جان نکل گئی۔ اس نے
دوسری ٹھوکر مارنا چاہی' مگر اب میں ہوشیار تھا۔ لیٹے ہی لیٹے میں نے جست لگائی' اور اٹھ
کھڑا ہوا۔ پھر جاوید ایسے لوگ مجھے کب ہاتھ لگا سکتے تھے۔ میں نے اس کے منہ پر پوری
قوت سے گھونسا مارا اور اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی مدد کو نسیم بھی آگیا مگر میں نے اس
کی بھی پٹائی کر دی۔

جمناسٹک سیکھی تو میں نے شوق میں تھی مگر اب وہ میرے بہت کام آ رہی تھی۔ اسکول میں بھی لڑکے مجھ سے ڈرتے تھے، محض اس لیے کہ وہ مجھے پکڑ نہیں سکتے تھے۔ یہی حال اب جاوید اور نسیم کے ساتھ ہو رہا تھا۔

میں نے مار مار کے ان دونوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا، اگر کچھ لوگ بیچ بچاؤ نہ کرتے تو شاید میں انہیں مزید مارتا۔ خاص طور پر نسیم کو تو میں نے بہت بری طرح مارا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ اس نے بات ہی ایسی کہی تھی۔

وہ دونوں گالیاں اور خوفناک انتقام کی دھمکیاں دیتے ہوئے چلے گئے۔ میں بھی بوجھل قدموں سے گھر آ گیا، پھر اس رات کو کوئی خاص بات نہیں۔ ذکیہ باجی بھی روٹھی سی تھیں۔ وہ مجھ سے تو بات ہی نہیں کر رہی تھیں۔

دوسرے دن جب اسکول سے آیا تو ذکیہ باجی غصے میں بھری بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی چیخ کر بولیں۔ "ادھر آؤ خرم!" میں بستہ رکھ کے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مامی اس وقت کچن میں تھیں۔ انھوں نے تند لہجے میں پوچھا۔ "کل تم جاوید سے لڑے تھے؟"

"پہل انھی لوگوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ ان کے دوست نسیم نے آپ کے بارے میں بہت گھٹیا بات کی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تم نے جاوید پر ہاتھ اٹھایا۔" ذکیہ باجی بپھر کر کھڑی ہو گئیں۔

"میں نے تو صرف نسیم کو مارا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "جاوید تو خواہ مخواہ بیچ میں آ گیا اس لیے اسے بھی۔۔۔"

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ذکیہ باجی نے زناٹے کا ایک تھپڑ میرے منہ پر رسید کر دیا۔ "نمک حرام! تجھے ہم نے اس لیے گھر میں رکھا ہے کہ تو ہم ہی پر غرائے۔" انھوں نے چٹاخ چٹاخ کئی تھپڑ میرے چہرے پر رسید کر دیے۔

میرے رخسار سلگ اٹھے، توہین کے احساس سے میرا جسم تپنے لگا۔ میں نے غصہ ضبط کرنے کے لیے اتنی زور سے ہونٹ بھینچے کہ میرے ہونٹ زخمی ہو گئے۔ میں بہ مشکل تمام خود پر قابو پائے ہوئے تھا، پھر ذکیہ باجی نے چپل اٹھا لی اور تڑاتڑ کئی چپلیں میرے سر اور چہرے پر رسید کر دیں۔ میں خاموشی سے مار کھاتا رہا۔ آخر میں نے انھیں باجی کہا تھا، میں یوں بھی ان کا بہت احترام کرتا تھا۔

"تو ہمیں کس بات سے روکے گا۔ آوارہ ماں کا آوارہ بیٹا!" ذکیہ باجی نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

میں نے لپک کر ذکیہ باجی کا ہاتھ پکڑ لیا، اور چیخ کر بولا۔

"ذکیہ باجی! مجھے چاہے آپ جان سے مار دیں، مگر میری ماں کو ایک لفظ بھی نہ کہو۔۔۔"

"کہوں گی، تو میری زبان روک سکتا ہے۔" انھوں نے اس لہجے میں کہا۔ خون کا اثر تو آتا ہے نا! ماں آوارہ تھی، بد چلن تھی تو، تو کیسے۔۔"

"ذکیہ باجی!" میں غصے میں دہاڑا اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ نے اب میری ماں کے بارے میں اب ایک لفظ بھی کہا تو۔۔۔"

ذکیہ باجی دھپ سے بیڈ پر گر گئیں، اور زار و قطار رونے لگیں۔ اسی وقت مامی کمرے میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے پہلے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر ذکیہ باجی کو دیکھا، اور مجھ سے بولیں۔ کیا بات ہے خرم! کیوں چیخ رہے تھے، اور یہ ذکیہ رو کیوں رہی ہے؟"

"امی اس نے کل جاوید سے جھگڑا کیا ہے۔ دس آدمیوں کی موجودگی میں اس کی بے عزتی کی ہے۔" مامی نے کچھ کہنا چاہا کہ ماما کمرے میں آ گئے۔ وہ نہ جانے کس وقت گھر آئے تھے۔ انھوں نے ذکیہ باجی کا آخری جملہ سن لیا تھا۔ انھوں نے کہا۔ "خرم نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ ایک بھائی کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "چلو خرم! اس کے منہ مت لگو۔"

اس دن کے بعد سے میرے اور ذکیہ باجی کے تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے۔ اس ماحول میں میرا دم گھٹ رہا تھا، دل چاہ رہا تھا یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں۔ میں نے ایک مرتبہ وہاں سے جانا بھی چاہا، مگر میں چوروں کی طرح وہاں سے منہ چھپا کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے ایک دن ایسے وقت ماما سے بات کرنے کا فیصلہ کیا جب ذکیہ باجی گھر میں نہیں تھیں۔ میں نے ماما سے کہا۔ "ماما! میں اب یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

ماما چونک اٹھے۔ "کہاں؟"

"اللہ کی اتنی بڑی دنیا پڑی ہے کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ آپ کا احسان ہے کہ آپ نے مجھے پڑھایا لکھایا، ہر طرح کی ضرورت پوری کی، مجھے یہاں ماں کی ممتا، اور باپ کی شفقت ملی۔ آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ میں اب۔۔۔"

"خرم!" ماما نے خشمگین نگاہوں سے مجھے گھورا۔ "کیا بکواس ہے۔ تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں ماما! میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "دراصل ذکیہ باجی کو میرا یہاں رہنا پسند نہیں ہے۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہیں۔"

"یہ تیرا خیال ہے بیٹا!" مامی بولیں وہ بھی میری آواز سن کر کچن سے نکل آئی تھیں۔ "ذکیہ تو تجھے آج بھی اتنا ہی چاہتی ہے۔" اچانک مامی رونے لگیں۔ "تو ہم لوگوں کو چھوڑ کر کہاں جائے گا بیٹا! تیرے بغیر ہم رہ سکیں گے زندہ!"

"پرائی اولاد ہے زینت!" ماما کا لہجہ شکستہ تھا۔ "اسی لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ میرا سگا بیٹا ہوتا تو کیا مجھے چھوڑ کر جاتا، اپنی بہن کو چھوڑ دیتا ان حالات میں۔" پھر وہ بھرائی ہوئی

آواز میں مجھ سے بولے۔ "تم جوان ہو بیٹا جہاں دل چاہے جا سکتے ہو' مگر ایک بات یاد رکھنا اگر کبھی ہماری ضرورت پڑے--- تو---" ماما بچوں کی طرح رونے لگے۔

"تم کہیں نہیں جائے گا خرم!" مامی نے سسکتے ہوئے کہا۔

میں خود بھی ان لوگوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا' مگر مجبوری یہ تھی کہ اس گھٹے گھٹے ماحول میں رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ صبح جلدی گھر سے نکل جاتا۔ اسکول سے واپسی پر گھر آنے کی بجائے اپنے کلاس فیلو سرفراز کے گھر چلا جاتا' وہیں رات تک پڑھتا رہتا' رات کا کھانا بھی اکثر اسی کے ساتھ کھا لیتا۔ دوپہر کا کھانا میں نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح مزید دو مہینے گزر گئے۔

میرے امتحان سر پہ تھے۔ اس لیے میں رات کو گھر آنے کے بعد بھی دیر تک پڑھتا رہتا تھا۔

ایک دفعہ ناشتا کرنے کے بعد میں نکلنے والا تھا کہ ذکیہ باجی نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ مجھے ان کے یوں آواز دینے پر خوش گوار حیرت ہوئی۔

"ٹھہرو' میں بھی چلوں گی۔ مجھے آج ذرا بازار جانا ہے۔" انھوں نے کہا اور اپنا پرس اٹھا کر میرے ساتھ چل دیں۔

میں خاموشی سے چلتا رہا انھوں نے اسی پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ "خرم! مجھ سے ناراض ہو۔"

میں نے جواب دیا۔ "نہیں ذکیہ باجی' مگر یہ---"

"مجھے معاف کر دو خرم!" انھوں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "میں بہت بری ہوں۔"

"آپ جا کہاں رہی ہیں؟" میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"میری ایک سہیلی ہے شمع!" انھوں نے جواب دیا۔ "اس کے گھر چل رہے ہیں۔ آج میری خاطر تم اسکول کی چھٹی نہیں کر سکتے۔"

شمع شادی شدہ تھی۔ اس کا شوہر ملازمت پر جا چکا تھا' اور وہ اس وقت تنہا تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے شمع کو گھر میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ ذکیہ باجی کی بہت گہری سہیلی تھی۔

وہ دونوں دوسرے کمرے میں جا کر کچھ کھسر پھسر کرتی رہیں' پھر ذکیہ باجی میرے پاس آئیں اور بولیں' خرم! تم ذرا یہاں بیٹھو' ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔"

ان دونوں کے جانے کے بعد میں گھر میں تنہا رہ گیا۔ میں نے سوچا بور ہونے سے بہتر ہے کہ میں اسکول کا کام ہی دیکھ لوں۔ میں نے انگلش کی کتاب نکال لی' پھر اسے پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو شمع باجی اور ذکیہ باجی دونوں موجود تھیں۔ شاید انھی کی آوازوں

سے میری آنکھ کھلی تھی۔ دروازے کی ایک چابی شمع باجی کے پاس بھی تھی۔ انھوں نے اسی سے دروازہ کھولا ہو گا۔

شمع باجی تو دوسرے کمرے میں چلی گئیں، ذکیہ باجی میرے پاس آ بیٹھیں، میں نے انھیں غور سے دیکھا ورنہ جب سے وہ مجھ سے روٹھی تھیں، میں نے ان کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ انھیں دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ ان کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے، اور وہ چہرے سے برسوں کی مریض لگ رہی تھیں۔

"خرم!" انھوں نے کہا۔ "مجھے معاف کر دینا میرے بھائی، تم سچے تھے۔ جاوید واقعی دھوکے باز نکلا۔"

میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا کہہ رہی ہیں ذکیہ باجی!"

"میری بات صبر سے سن لو خرم! پھر شاید تمھیں موقع نہ ملے۔" ذکیہ باجی نے کہا۔ "اگر تم نے جاوید سے کچھ کہا تو اس میں میری ہی بدنامی ہوگی۔ کیا تم اپنی بہن کو بدنام کرنا چاہو گے۔"

"مگر ذکیہ باجی۔۔۔"

"نہیں خرم!" ذکیہ باجی نے پھر میری بات کاٹ دی۔

"صرف چار دن کی بات ہے پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ بات تو مجھے چار دن بعد ہی معلوم ہوئی کہ "سب ٹھیک ہونے" سے ذکیہ باجی کا مطلب کیا تھا؟ انھوں نے خواب آور گولیوں کی پوری شیشی کھا کر جان دے دی تھی۔ صبح میری آنکھ مامی کی چیخ پکار سے کھلی۔ میں دوڑتا ہوا ان کے کمرے میں پہنچا ذکیہ باجی اپنے بستر پر لیٹی تھیں، ان کے نزدیک ہی ویلیم فائیو کی خالی شیشی پڑی تھی۔ ان کے تکیے کے پاس ہی دو لفافے پڑے تھے۔ ایک پر ماما کا نام تھا دوسرے پر میرا، اس پر لکھا تھا۔ "صرف خرم کے لیے اور کوئی نہ کھولے۔"

مامی کی نظر بچا کر میں نے وہ لفافہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

میں نے لفافہ جیب میں رکھا ہی تھا کہ ماما آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔

انھوں نے چیخ کر مامی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔۔۔ کیا ہوا؟"

"یہ۔۔۔ ذکیہ۔۔۔ مامی صرف اتنا ہی کہہ سکیں۔"

"کیا ہوا ذکیہ کو؟" ماما نے وحشت زدہ لہجے میں کہا، اور ذکیہ باجی کی طرف لپکے۔ انھوں نے ذکیہ باجی کی نبض دیکھی، دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی، پھر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔

میں جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں، اور پاؤں گویا من من بھر کے ہو رہے تھے۔ مجھے ذکیہ باجی کو قریب سے دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہو

رہی تھی۔ ان کے خوب صورت چہرے پر موت کی زردی تھی۔ وہ ہونٹ جو ہر دم مسکراتے رہتے تھے۔ اب عجب سے انداز میں کھلے ہوئے تھے' اور ان سے کف بہہ کر تکیے پر بکھر گیا تھا۔

ذرا سی دیر میں ہمارا گھر محلے کی عورتوں' اور مردوں سے بھر گیا۔ ہر شخص ذکیہ باجی کی موت پر اشک بار تھا۔ ماما کو تو اتنا ہوش بھی نہیں تھا' کہ ذکیہ باجی کے سرہانے رکھا ہوا لفافہ ہی اٹھا لیتے۔ نہ جانے ذکیہ باجی نے اس میں کیا لکھا ہو گا؟ یہ سوچ کر میں نے ہی ماما کو لفافے کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے لفافہ اٹھایا' پھر میری طرف بڑھا دیا اور روتے ہوئے بولے۔ "خرم بیٹا!--- پڑھ کر بتا دے کہ اس نے کیا لکھا ہے۔"

میں نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور خط نکال کر پڑھنے لگا۔ ذکیہ باجی نے لکھا تھا۔

پیارے ابو! میں ہر طرف سے مایوس ہو کر موت کو گلے لگا رہی ہوں۔ میں اس کی وجہ آپ کو نہیں بتاؤں گی۔ اس کے لیے مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ ابو! میں جانتی ہوں کہ آپ کو کتنا صدمہ ہو گا' مگر یہ صدمہ اس صدمے سے کہیں کم ہے جو میرے زندہ رہنے کی صورت میں آپ کو اٹھانا پڑتا۔ میری موت کو تماشا نہ بننے دیجئے گا۔ آپ کی بدنصیب بیٹی۔

اس وقت تک کمرے میں محلے کی چند عورتیں' اور بچے آ چکے تھے۔ اس سے پہلے ہی میں نے ذکیہ باجی کے چہرے پر چادر ڈال دی تھی۔ محلے کی عورتیں ماں سے ذکیہ باجی کی موت کا سبب پوچھ رہی تھیں' مگر وہ تو غم سے نڈھال تھیں' کہ کچھ بتانے کے قابل ہی نہیں تھیں۔ ماما البتہ کافی حد تک سنبھل چکے تھے۔ انھوں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "ذکیہ رات ہی سے درد کی شکایت کر رہی تھی' کہہ رہی تھی میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ میں سمجھا اسے نزلے کی وجہ سے سینے میں درد محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ دل کا درد ہے۔"

میں ماما کے مصلحت آمیز جھوٹ پر حیران رہ گیا۔

پھر وہ روتے ہوئے مجھ سے بولے۔ "خرم بیٹا! جا ذرا غوری کو بلا لا۔ ممکن ہے ہماری ذکیہ ابھی زندہ ہو' ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا' خدا کرے ایسا ہی ہو' پھر میں باہر کی طرف لپکا۔ ڈاکٹر غوری کا گھر ہمارے گھر سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں مجھے ذکیہ باجی کے اس خط کا خیال آیا' جو انھوں نے میرے نام لکھا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر لفافہ نکالا' اور چاک کر کے خط نکال لیا۔ میرے نام انھوں نے خاصا طویل خط لکھا تھا۔

پیارے بھائی خرم! تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جاوید اچھا آدمی نہیں ہے۔ کاش' میں

تمہاری بات مان لیتی تو آج میں جان دینے پر مجبور نہ ہوتی۔ میں تو الٹی تمہاری دشمن ہو گئی تھی۔ بھیا! جب انسان کی عقل پر پردہ پڑ جائے تو اسے ہر شخص اپنا دشمن نظر آتا ہے۔ میں نے تمہاری بہت دل آزاری کی ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔ میرے بعد اب تم ہی ابو اور امی کا سہارا ہو۔ انھیں میری کمی محسوس نہ ہونے دینا۔ میں اپنی موت کی وجہ تم سے ہرگز نہیں چھپاؤں گی۔ بھائی سے زیادہ تم میرے دوست بھی تو تھے۔ میں دل پر بوجھ لے کر مرنا نہیں چاہتی۔ جاوید نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا' اور میں اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ جب میں نے اس سے تذکرہ کیا تو اس نے مجھے بری طرح دھتکار دیا' اور کہا کہ نہ جانے کس کا گناہ تم میرے سر تھوپنا چاہتی ہو۔ خرم بھیا! اس نے مجھے آوارہ اور بدچلن کہا۔ اب تم ہی بتاؤ جان دینے کے سوا اور کون سا راستہ تھا' عزت بچانے کا۔ ممکن ہے یہ طریقہ بھی غلط ہو' مگر لوگوں کی ملامت بھری باتیں سننے کو میں تو موجود نہیں ہوں گی۔ اپنی بدنصیب بہن کو معاف کر دینا' ذکیہ

خط پڑھ کر خون میری کن پٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں نے جاوید کا تصور کیا' تو نفرت کی شدید لہر نے مجھے جکڑ لیا۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔ "جاوید! اگر تجھے تڑپا تڑپا کر نہ مارا تو میرا نام بھی خرم نہیں۔"

میں ڈاکٹر غوری کو لے کر پہنچا تو ذکیہ باجی کے کمرے میں محلے کی عورتیں بھری ہوئی تھیں۔ مامی شدید غم سے بیہوش ہو چکی تھیں' اور محلے کی ایک عورت انھیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماما مردوں میں گھرے ہوئے ۔۔ ڈاکٹر غوری نے سب عورتوں کو کمرے سے نکالا' ذکیہ باجی کی نبض دیکھی' اسٹیتھوا سکوپ سے ان کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی' پھر مایوسی سے سر ہلا دیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب صرف فارملٹی پوری کر رہے ہیں' کیوں کہ یہ اندازہ تو مجھے ایسے ناتجربے کار کو بھی ہو گیا تھا کہ ذکیہ باجی زندگی سے ناتا توڑ چکی ہیں۔ ماما بھی شاید ڈاکٹر غوری سے اپنے اندازے کی تصدیق ہی چاہتے تھے' اس لیے انھوں نے ذکیہ باجی کی موت کی تصدیق ہونے پر صبر و سکون کا مظاہرہ کیا۔ پھر کمرے کے ایک گوشے میں جا کر ڈاکٹر صاحب سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ میرا ذہن اس وقت ماؤف ہو رہا تھا' اس لیے میں نے ان کی باتوں پر توجہ نہ دی۔ میرے ذہن میں تو صرف ایک ہی نام کی گونج تھی۔ جاوید--- جاوید اور یہ گونج سب آوازوں پر حاوی ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر غوری کمرے سے باہر نکلے اور انھوں نے محلے والوں کے سامنے ماما سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے' آپ کی بیٹی کی حرکت قلب بند ہو چکی ہے۔ کیا اسے دل کی تکلیف تھی؟"

"کئی دنوں سے وہ سینے میں درد کی شکایت کر رہی تھی۔" مجھے ماما کا جواب سن کر

حیرت ہوئی۔ "میں یہ سمجھا کہ معمولی درد ہے اس لیے میں نے توجہ نہ دی۔"

ڈاکٹر غوری کے رخصت ہونے کے بعد انھوں نے محلے والوں کو فرداً فرداً یہی بتایا اور ہر آدمی نے یقین کر لیا کہ ذکیہ باجی کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔ حقیقت سے میں اور ماما واقف تھے' یا پھر ڈاکٹر غوری۔ ماما نے شاید ڈاکٹر غوری کو موت کا یہ سبب بتانے پر راضی کر لیا تھا۔ رہ گئیں مامی تو محلے والوں کی طرح وہ بھی لاعلم تھیں۔

شام تک ذکیہ باجی کو منوں مٹی کے نیچے سلا دیا گیا۔ ہنستی کھیلتی ذکیہ باجی چپ چاپ موت کی نیند سو گئیں۔ مجھے رہ رہ کر ان کی باتیں یاد آ رہی تھیں' ان کی مترنم آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی' گھر میں ابھی تک مجھے ان کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ میں ماما اور مامی کی وجہ سے اب تک نہ جانے خود پر کیسے قابو پائے ہوئے تھا۔ ضبط کا بندھن اچانک ہی ٹوٹ گیا' اور میں بلک بلک کر رویا کہ مجھے گردوپیش کی کچھ خبر نہ رہی۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ ماما مجھے دلاسا دے رہے تھے' اور محلے کا کوئی آدمی کہہ رہا تھا کہ اسے رونے دو تاکہ اس کی بھڑاس نکل جائے۔

کافی دیر بعد میری حالت سنبھلی' مگر ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ تھا۔

پھر اسی حالت میں کئی دن گزر گئے۔ آہستہ آہستہ مجھے بھی صبر آ گیا' مگر جاوید کا نام ذہن میں آتے ہی میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتی تھیں۔ میں ایک آدھ دفعہ باہر بھی نکلا تھا' مگر اس دوران مجھے جاوید دکھائی نہ دیا۔ شاید وہ کراچی میں موجود ہی نہیں تھا۔

ماما اور مامی کافی حد تک سنبھل چکے تھے' مگر وہ دونوں ایک دم بہت بوڑھے لگنے لگے تھے۔ ماما کے مجبور کرنے پر میں بھی اسکول جانے لگا تھا۔ اسکول جانے کو میرا بالکل دل نہیں چاہتا تھا' مگر امتحان سر پر تھے اس لیے میں دل پہ جبر کر کے اسکول جاتا رہا۔

پھر کچھ وقت اور گزر گیا۔ میرے امتحان شروع ہو گئے۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ جاوید لاہور میں ملازمت کر رہا ہے۔ میں بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔ مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ملنے پر میرا ردعمل کیا ہو گا؟ بس یہ سوچتا تھا کہ اسے اس بری طرح ماروں گا کہ وہ آیندہ کسی لڑکی کے ساتھ فلرٹ کرنے کا تصور کرتے ہوئے بھی کانپے گا۔

میرا رزلٹ آیا تو میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا' مگر مجھے ذرا برابر خوشی نہ ہوئی۔ ذکیہ باجی ہوتیں تو وہ خوشی سے ناچ اٹھتیں' مگر ان کے بغیر تو یہ خوشی بے معنی تھی۔

ماما نے حتی المقدور خوشی منائی' محلے بھر میں مٹھائی بانٹی۔ مامی نے اس خوشی میں میلاد بھی کیا' مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ کسی اور کے لیے ہو رہا ہو۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ بہن کے معاملے میں میرے نصیب ہی کھوٹے ہیں۔ ایک بہن کو میں نے بچپن میں کھو دیا' دوسری بہن اب مجھ سے بچھڑ گئی۔ شاید میری تیرہ بختی انھیں نگل گئی

تھی۔

پھر ماما نے مجھ پر زور دیا کہ میں کالج میں ایڈمیشن لے لوں' مگر میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اب ملازمت کرنا چاہتا ہوں' وقت ملا تو پرائیویٹ طور پر تعلیم بھی جاری رکھوں گا۔ ماما اب تھک چکے تھے۔ اب میں ان کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اب وہ آرام کریں۔ آخر میری ضد کے آگے انھیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ میں نے مختلف محکموں میں ملازمت کے لیے اپلائی کر دیا۔ اس زمانے میں میٹرک پاس افراد کو بھی ملازمت مل جاتی تھی۔

اس دن میں صبح ہی صبح تیار ہو کر انٹرویو دینے کے لیے نکلا۔ میں بس اسٹاپ پر پہنچا تو پان کے ایک کیبن پر مجھے جاوید دکھائی دیا۔ وہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اچانک میں پاگل سا ہو گیا' جسم میں خون کی گردش ایک دم تیز ہو گئی' اور ہر طرف مجھے خون ہی خون دکھائی دینے لگا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈائری پھینکی اور لپک کر پیچھے سے جاوید کا کالر پکڑ لیا۔ جھٹکے سے اس کے منہ میں دبی ہوئی سگریٹ زمین پر گر گئی۔ اس نے گردن تھوڑی سی گھما کر حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا' پھر وہ ایک دم غضب ناک ہو گیا' اور مجھ سے بولا۔ "تیرا دماغ تو صحیح ہے خرم! کالر چھوڑ دے میرا ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟" میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا' اور اچانک اس کے منہ پر تھوک دیا۔ "ذلیل انسان' کمینے! تو سمجھتا تھا کہ زندگی بھر میرے ہاتھ سے بچا رہے گا۔ میں تجھے بتاؤں گا کہ کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا۔

جاوید مجھ سے عمر میں کافی بڑا تھا' اور قد کاٹھ میں بھی' مگر شاید وہ اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا تھا۔ میں نے دوسرا تھپڑ مارا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔

"خرم!" اس نے چیخ کر کہا' اور میرے منہ پر گھونسا مارنے کی کوشش کی جو منہ کی بجائے میرے شانے پر پڑا۔ اس سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ میرے ہاتھ سے اس کا کالر چھوٹ گیا۔

"وہ بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح میری طرف لپکا' مگر اب اس کے فرشتے بھی مجھے نہیں چھو سکتے تھے۔" گھونسا بھی میں اس وجہ سے کھا گیا تھا' کہ اس کا کالر میرے ہاتھ میں تھا۔ اتنی سی دیر میں وہاں مجمع سا لگ گیا۔ لوگ مجھے اور جاوید کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے ہوا میں اچھل کر جسم سے ایک دائرہ بنایا' اور اس کے سینے پر اتنی بھرپور فلائنگ کک رسید کی کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا پنواڑی کے کیبن سے ٹکرا کر ڈھیر ہو گیا۔ پھر میرے اور اس کے درمیان بہت سے لوگ آ گئے۔ ان میں سے کچھ نے مجھے پکڑ لیا' اور کچھ جاوید کو پکڑ کر باہر لے گئے۔

جاوید نے جاتے جاتے کہا۔ "خرم! تو اپنی اس حرکت پر بہت پچھتائے گا۔"
میرا اتنا موڈ خراب ہوا کہ میں انٹرویو دینے بھی نہیں گیا۔

○

اس واقعے کے چار دن بعد میں جوگنگ کر رہا تھا۔ جوگنگ کرتا ہوا میں کافی دور نکل گیا۔ دور تک تو خیر میں روزانہ ہی جاتا تھا' مگر اس دن کچھ زیادہ ہی فاصلہ طے کر لیا تھا۔ اب تو نیو کراچی کے اس علاقے میں بھی گنجان آبادی ہے' مگر اس وقت وہ ویرانہ تھا۔ دور دور تک جھاڑ جھنکار اور خودرو گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں اپنی دھن میں مگن بھاگا جا رہا تھا' کہ اچانک جھاڑیوں میں سے دو آدمی نکل کر میرے سامنے آ گئے۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ چہروں سے وہ دونوں ہی بدمعاش دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں' جن سے اس کا چہرہ مزید خوف ناک ہو گیا تھا۔ دوسرا کلین شیو تھا۔ مونچھوں والے نے کرخت لہجے میں کہا۔ "خرم تیرا ہی نام ہے؟"

"جی ہاں' آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"جتنا بولنا ہے بول لے۔" کلین شیو والے نے دانت پیس کر کہا۔ "کیوں کہ پھر تجھے بولنے کا موقع نہیں ملے گا۔" یہ کہہ کر اس نے گراری والا چاقو نکال لیا۔

میں اب تک سمجھ نہیں پا رہا تھا' کہ وہ لوگ کون ہیں' اور کیا چاہتے ہیں؟ وہ دونوں میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "مجھ سے آپ لوگوں کو کیا شکایت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔"

"تیرا خیال صحیح ہے منے۔" مونچھوں والے نے کہا' مگر تو کچھ زیادہ ہی اونچا اڑنے لگا ہے۔ ہمارے ایک دوست کو تجھ سے شکایت ہے۔"

اس کے جملے پر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ "آپ جاوید کی بات کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا' کیوں کہ اس کے علاوہ کسی کو مجھ سے شکایت نہیں ہو سکتی تھی۔

"دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا' پھر مونچھوں والے نے کہا۔ "اب تو سمجھ ہی گیا ہے تو ہم بھی نہیں چھپائیں گے۔ ویسے بھی تو یہاں سے واپس نہیں جا سکے گا۔ ہاں' ہم جاوید کے دوست ہیں۔" اس نے بھی چاقو نکال کر کھول لیا۔ چاقو کا چمکتا پھل صبح کی دھوپ میں جھلملانے لگا۔

میں غیر محسوس طریقے پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا' اور ان دونوں پر نظریں جما دیں۔ وہ جتنی شدت سے مجھ پر حملہ کرتے' اتنا ہی نقصان اٹھاتے' کیوں کہ وہ اپنے ہی زور میں رہے جاتے۔ ان دونوں کے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہیں تھی' ورنہ وہ مخالف سمت سے مجھ پر حملہ آور ہوتے۔ اس صورت میں مجھے خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اگر وہ پھرتیلے

ہوتے تو مجھے زخمی کر سکتے تھے۔ میں نے انھیں اشتعال دلانے کو کہا۔ "جاوید بہت چالاک ہے۔ وہ خود تو میرے مقابلے پر نہیں آیا' تمہیں قربانی کا بکرا بنا کر بھیج دیا۔ ویسے بھی تم دونوں شکل ہی سے گاؤدی لگتے ہو۔"

"اس کی آواز بند کر بندو۔" کلین شیو والا تپ کر بولا۔ "کاٹ کر پھینک دے سالے کی زبان۔"

بندو غضب ناک ہو کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں ذرا سا دائیں طرف سرک گیا۔ وہ اپنے ہی زور میں آگے نکل گیا۔ میں نے گھوم کر اس کی پیٹھ پر زور کی لات ماری تو وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا' مگر فوراً ہی کھڑا بھی ہو گیا۔ اس دوران میں کلین شیو والا بھی حرکت میں آ چکا تھا۔ میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس نے بائیں طرف جھکائی دے کر دائیں طرف سے حملہ کیا۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ مجھے دائیں طرف ہی ہونا چاہئے تھا' مگر میں اچانک ہوا میں اچھل گیا' پھر میں نے اسے دہشت زدہ کرنے کو ہوا میں اپنے جسم سے دو دائرے بنائے اور زمین پر کودنے کی بجائے اس کے جسم پر کودا۔ وہ بھینسے کی طرح ڈکرایا' کیوں کہ میرا ایک پیر اس کے سر پر اور دوسرا بھرپور انداز میں چہرے پر پڑا تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس دن میرے پیروں میں اسپائکس کی بجائے پی ٹی شوز تھے' ورنہ اس کے چہرے میں گڑھے پڑ جاتے پھر میں نے توقف کیے بغیر اچھل اچھل کر ان دونوں کی اتنی دھنائی کی کہ وہ خوشامد پر اتر آئے' اور انھوں نے چاقو پھینک دیے۔

میں نے ان دونوں سے کہا۔ "اب یہاں سے دفع ہو جاؤ' اور اس مردود جاوید کو بتا دینا کہ جس دن وہ میرے ہتھے چڑھ گیا' اس دن اس کا وہ حشر کروں گا' کہ دوسرے لوگ عبرت پکڑیں گے۔"

وہ دونوں جلدی سے گرتے پڑتے ایک طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے جھک کر ان دونوں کے چاقو اٹھائے' اور تھکے تھکے انداز میں وہاں سے چل دیا۔ جاوید کی طرف سے کسی شدید ردعمل کی مجھے توقع تو تھی' مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے قتل کرانے کی کوشش کرے گا۔ میں یہی سوچتا ہوا واپس گھر آ گیا۔

دوسرے دن سے جاوید پھر دکھائی دیا' مگر وہ پرانی سی ایک موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ خاصی معقول نوکری کر رہا تھا۔ موٹر سائیکل بھی اس زمانے میں وہی لوگ رکھتے تھے جو خاصے خوش حال بلکہ عام آدمی کی نظروں میں امیر ہوتے تھے۔ موٹر سائیکل سوار بھی خود کو لکھ پتی سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ نہ تو مجھے جاوید ملا' نہ اس کا کوئی "دوست۔" اس دن بھی حسب معمول میں جوگنگ کر کے لوٹ رہا تھا۔ میں صبح چھ بجے نکلتا تھا' اور لوٹتے لوٹتے مجھے

آٹھ بج جاتے تھے۔ سڑک کے کنارے مجھے جاوید دکھائی دیا۔ اس کی موٹرسائیکل میں شاید کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ وہ جھکا ہوا اس کے انجن میں جھانک رہا تھا۔ موٹر سائیکل سائیڈ اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر پھر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا کالر پیچھے سے پکڑا' اور اسے جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ اس نے گھبرا کر مجھے دیکھا' میرا چہرہ دیکھ کر وہ مزید گھبرا گیا' اور بولا۔ "کیسے--- ہو-- خرم!"

جواب دینے کی بجائے میں نے اس کے منہ پر زناٹے کا تھپڑ جڑ دیا' اور سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "حرام زادے! تو سمجھتا ہے کہ پیسے خرچ کرکے میری جان لے لے گا۔ اگر تجھ میں جرات ہے تو خود مجھے مار۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو خرم!" جاوید نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں اسے بچانے والا کوئی بھی نہ تھا۔

میں اس کی گھبراہٹ کی وجہ جان رہا تھا۔ جب اس کے دوستوں نے اسے بتایا ہو گا کہ خرم نے مار مار کر ہمارا بھرکس نکال دیا' تو جاوید مجھ سے خوف زدہ ہو گیا ہو گا۔ جب میں ان دو پیشہ ور بدمعاشوں کو مار سکتا ہوں تو جاوید کی حیثیت ہی کیا تھی۔

میں نے تابڑ توڑ کئی زور دار تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیئے۔ وہ خاموشی سے مار کھاتا رہا۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ جب میں خوب دل بھر کے اسے مار چکا تو لات مار کر اس کی موٹر سائیکل بھی گرا دی' اور چیخ کر کہا۔ "اگر اب تیری طرف سے کوئی حرکت ہوئی تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں اسے کراہتا ہوا چھوڑ کر فوراً گھر آگیا۔

گھر آکر میں نے غسل کیا' کپڑے بدلے اور ناشتا کرکے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ماما اس وقت تک جا چکے تھے۔ مامی باورچی خانے میں تھیں۔ میں نے دروازہ کھولا تو باہر پولیس کے ایک سپاہی کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "جی فرمایئے' کیسے زحمت کی۔"

"خرم تمہارا ہی نام ہے؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ میرے اقرار میں سر ہلانے پر وہ اسی لہجے میں بولا۔ "تمہیں انچارج صاحب نے تھانے بلایا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"زیادہ ٹر ٹر مت کر اوئے۔" سپاہی اپنی اصلیت پر آ گیا۔ "کیوں' کب اور کیسے تھانے چل کر کرنا' سمجھا۔"

"آپ چلیں' میں آتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اوئے سیدھی طرح چلتا ہے یا ہتھکڑی لگا کر لے جاؤں۔" سپاہی نے فرعونیت سے کہا۔

"کیا آپ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں؟" میں نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

"اوئے، گرفتار کرنے آتا تو اب تک ہتھکڑی لگا چکا ہوتا۔ اب تو نے دیر لگائی تو یہی کروں گا۔"

"چلو میں چل رہا ہوں۔" میں نے بھی آپ جناب کا تکلف چھوڑ دیا۔ "مگر میں امی کو تو بتا آؤں۔"

"اوئے کون سا لام پر جا رہا ہے کہ امی کو بتائے گا' چل میرے ساتھ۔" پولیس والے نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

توہین اور ذلت کے احساس سے میں پسینے پسینے ہوگیا' کیوں کہ پولیس والے کی آواز سن کر محلے کے دو ایک بزرگ وہاں آ گئے تھے۔ آس پاس کے گھروں کی لڑکیاں بھی دروازوں سے جھانک رہی تھیں۔ میں مزید کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ ہو گیا۔

تھانے میں جاوید کو دیکھ کر میں سب کچھ سمجھ گیا۔ اس کا مطلب تھا اسی نے میرے خلاف رپورٹ لکھوائی ہوگی۔ انچارج سپاہی سے بھی زیادہ فرعون تھا۔ میں کرسی پر بیٹھنے لگا' تو وہ ڈپٹ کر بولا۔ "کھڑا رہ اوئے نواب کے بچے! میں نے تجھے یہاں دعوت میں نہیں بلایا۔"

میں نے بیٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جاوید مزے سے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تحقیر تھی' جیسے کہہ رہا ہو' دیکھا مجھ سے الجھنے کا انجام۔

"مسمی خرم!" تھانے دار سپاٹ لہجے میں بولا۔ "تیرے خلاف جاوید صاحب نے رپورٹ درج کرائی ہے کہ تو نے آج صبح ان سے گھڑی' اور بٹوا چھین لیا ہے جس میں بارہ سو روپے نقد' ان کا ڈرائیونگ لائسنس' اور چند ضروری کاغذات تھے۔ ابھی انھوں نے پرچہ نہیں کٹایا ہے' اگر تو ان کا مال واپس کر دے' تو میں تیرے ساتھ اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ معاملے کو یہیں ختم کر دوں۔" اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے تھانے دار صاحب!" میں نے بھنا کر کہا۔ "میں اس قسم کی گھٹیا حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ بے شک محلے والوں سے میرے بارے میں پوچھ لیں۔"

"بک بک مت کر۔" تھانے دار گرج کر بولا۔ "اوئے محلے والوں سے کیا پوچھوں۔ محلے والے بھی تجھ سے تنگ ہیں۔ محلے کی لڑکیوں کو تو چھیڑتا ہے' اور وہ کیا نام تھا اس لڑکی کا--- وہ جو فوت ہو گئی۔"

"ذکیہ---" جاوید جلدی سے بولا۔

"ہاں ذکیہ--- سنا ہے اس کے ساتھ بھی تیرا چکر تھا۔"

"اپنی زبان کو لگام دے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "ذکیہ میری بہن تھی۔ تجھے شرم

نہیں آئی ایسی بات۔۔"

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی تھانے دار کا بھرپور ہاتھ میرے منہ پر پڑا۔ "اوئے پھنے خان! تو جانتا ہے یہاں اونچی آواز میں بولنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے؟ نہیں جانتا نا اس لیے اتنی بکواس کر رہا ہے۔ اب تو اگر مال واپس بھی کر دے تو تجھے سزا کرائے بغیر نہیں چھوڑں گا۔" پھر وہ دروازے کی طرف منہ کر کے چیخا۔ "فضل دین!"

فوراً ہی چق اٹھا کر ایک دیو ہیکل سپاہی اندر آ گیا۔ "حکم چودھری جی!" اس نے چراغ کے جن کی طرح پوچھا۔

"اوئے اس کاکے سے ذرا انٹرویو کرو۔ یہ بڑی اچی شے ہے' بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے۔" پھر وہ جاوید سے بولا۔ "آپ جائیں جناب' شام تک آپ کا مال برآمد ہو جائے گا۔"

جاوید نے ایک مرتبہ پھر حقارت سے میری طرف دیکھا' پھر سگریٹ کو اپنے جوتے سے مسل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت فضل دین نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مجھے باہر کی طرف کھینچا۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں عجیب عجیب چیزیں بکھری ہوئی تھیں' ریت بھرے تھیلے تھے' پانی کی کالی بالٹیاں تھیں' اور چھت کے عین درمیان میں کنڈے سے مضبوط سی ایک رسی لٹک رہی تھی۔

فضل دین نے گویا مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "دیکھ برخوردار! بھلائی اسی میں ہے کہ بغیر مارے ہی سب کچھ بتا دو ورنہ تمہیں ابھی اندازہ نہیں کہ پولیس کی مار کیسی ہوتی ہے' چلو شاباش شروع ہو جاؤ۔"

"مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے تو بتاؤں کیا۔"

فضل دین نے مایوسی سے سرہلایا اور اچانک اتنی زور سے میری منہ پر تھپڑ مارا کہ میں لڑکھڑا کر سامنے والی دیوار سے ٹکرا گیا۔ میری آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ لمحے بھر کو میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ کچھ دیر تک میں دیوار سے سر ٹکائے کھڑا رہا' پھر آہستہ آہستہ میرے ذہن سے دھند صاف ہونے لگی۔ میں نے دیکھا فضل دین دور کھڑا مایوسی سے سر ہلا رہا تھا جیسے مجھے مار کے اسے افسوس ہوا ہو۔ شاید یوں سر ہلانا اس کم بخت کی عادت تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ "اگر کچھ یاد آ گیا ہو تو مجھے بتا دے ورنہ اب تیرے ساتھ رعایت نہیں کروں گا۔"

"کچھ ہو گا تو مجھے یاد آئے گا!" میں نے چیخ کر کہا۔

"ہشکے بھئی' شاباش' ہے تجھ پر!" فضل دین یہ کہہ کر ایک مرتبہ پھر مجھ پر جھپٹا۔

اس دفعہ مجھے مارنے کی حسرت اس کے دل میں رہ گئی کیوں کہ میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ہی زور میں سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ وہ پھرتی سے پلٹا تو'

غصے سے زیادہ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر محتاط انداز میں مجھ پر جھپٹا' مگر میں پھر بندر کی طرح اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا' کہ میں اسے تھکا ماروں گا۔ فضل دین مجھے ننگی ننگی گالیاں دینے گا۔ یہ شاید وہاں کا معمول تھا۔ باہر والوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ فضل دین حسب عادت ملزم کو مارنے کے ساتھ ساتھ گالیاں دے رہا ہے۔ اس نے جب مجھے بہن کی گالی دی تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے ہوا میں اچھل کر پوری قوت سے اس کے منہ پر فلائنگ کک ماری۔ وہ لڑکھڑا کر گرا تو میں اس کے جسم پر چڑھ گیا' اور دو تین دفعہ زور زور سے اچھلا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی ایک دو پسلیاں ضرور ٹوٹ گئی ہوں گی۔ وہ بھیانک انداز میں چیخا۔ اس کے باوجود کوئی کمرے میں نہیں آیا۔ لوگ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ زیر تفتیش ملزم چیخ رہا ہے۔ میں نے وہاں پڑا ہوا ایک ڈنڈا اٹھا کر اس کے سر پہ ضرب لگائی۔ میں کچھ دیر کے لیے اسے بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔ ضرب کچھ زیادہ ہی سخت پڑ گئی' کیوں کہ فضل دین ایک دم ساکت ہو گیا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ کسی بھی لمحے کوئی آ سکتا تھا۔ پھر وہ لوگ مجھ پر نہ جانے کون کون سی دفعات لگا دیتے۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا' کوریڈور میں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ تھانے دار کا کمرا دوسری جانب تھا۔ میرا خیال تھا اس برآمدے میں ضرور کوئی نہ کوئی ہو گا۔ وہاں سے باہر نکلنے کے لیے نہ صرف مجھے تھانے دار کے کمرے کے سامنے سے گزرنا پڑتا بلکہ تھانے کا گیٹ بھی عبور کرنا پڑتا۔ سب سے زیادہ خطرہ گیٹ ہی پر تھا' کیوں کہ وہاں ایک مسلح سنتری موجود تھا۔ خیر دیکھا جائے گا' میں نے دل ہی دل میں کہا' اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس برآمدے تک پہنچ گیا جہاں تھانے دار کا کمرہ تھا۔ میں اعتماد سے چلتا ہوا تھانے دار کے کمرے کے سامنے سے گزر گیا۔ کمرے کے باہر بینچ پر بیزار بیزار سے دو کانسٹیبل بیٹھے تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا' پھر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ میں اطمینان سے برآمدہ عبور کر گیا۔

ابھی میں گیٹ کی طرف مڑنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے کوئی چیخا۔ "او پکڑو اوئے اسے۔"

میں پیچھے دیکھے بغیر باہر کی طرف بھاگا۔ اسی وقت پیچھے سے کسی نے مجھ پر فائر کیا' مگر گولی مجھے نہ لگ سکی۔ اس سے مجھے اتنا ضرور نقصان ہوا کہ گیٹ پر سنتری چوکنا ہو گیا' اور اس نے اپنی رائفل سیدھی کر لی۔ میں ادھر ادھر جانے کی بجائے تیر کی طرح اس کی طرف لپکا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں کسی اور طرف بھاگا تو سنتری بلا دھڑک مجھے گولی مار دے گا۔ اس کی طرف بھاگنے کا کم از کم مجھے یہ فائدہ تو تھا کہ میں اسی کی چلائی ہوئی گولی سے بچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

رائفل ہاتھ میں ہونے کے باوجود مجھے یوں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا۔ وہ

اتا گھبرا گیا تھا کہ اس نے فائر کرنے کی کوشش کی' مگر ٹریگر نہ دب سکا' یا شاید گولی ہی پھنس گئی تھی۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ میرے لیے اتنی مہلت بہت تھی۔ میں پھرتی سے اچھل کر دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف کود کر ایک طرف بھاگ نکلا۔

میں وہاں سے بھاگ تو آیا تھا' مگر اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں جاؤں کہاں؟ اس صورت حال میں گھر جانا بھی مناسب نہیں تھا۔ میرا کوئی دوست بھی ایسا نہیں تھا جو مجھے پناہ دے سکتا۔ میں یہی سوچتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے نہ جانے میں کتنی دور آ گیا تھا۔ ہوش تو مجھے اس وقت آیا جب میری نظر خانہ بدوشوں کے پھٹے پرانے خیموں پر پڑی۔ خانہ بدوش آج بھی کراچی کے مختلف علاقوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے اپنی رفتار سست کر لی' اور چلتا ہوا ان کے ڈیرے میں داخل ہو گیا۔

اچانک ایک کتا میری طرف جھپٹا۔ میں غیر ارادی طور پہ اچھل کے ایک طرف ہو گیا۔ کتا پھر جھپٹا۔ میں فضا میں اڑتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ کتے کی غراہٹ سن کر مرد' عورتیں اور بچے خیموں سے باہر نکل آئے تھے۔ ان کے لیے شاید یہ ایک دلچسپ تماشا تھا۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ کتا کچھ اور غضب ناک ہو کر میری طرف جھپٹا۔ وہ خاصا جسیم کتا تھا' اور اگر میری ٹانگ اس کے جبڑوں میں پھنس جاتی تو وہ مجھے بری طرح بھنبھوڑ ڈالتا۔ ان لوگوں کے قہقہوں سے مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ اس مرتبہ کتا جھپٹا تو میں نے نہ صرف اچھل کر اپنا بچاؤ کیا' بلکہ کتے کے جسم پر اتنی زور سے کک ماری کہ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر ایک مرتبہ پھر جھپٹتا میں نے اچھل کر ایک اور بھرپور کک اس کے جسم پر رسید کر دی۔ وہ چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا دم دبا کر ایک خیمے کی طرف بھاگا۔

"اے بابو!" ایک کرخت آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کیا ہے رے؟"

میں نے گھوم کر سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ درمیانے قد' اور پھیلے ہوئے جسم کا کالا بھجنگ شخص تھا۔ سر اور مونچھوں کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے میلی سی ایک دھوتی اور سامنے سے کھلی ہوئی بنڈی پہن رکھی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ کسی نشے کا عادی تھا۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں ادھر سے گزر رہا تھا' کہ تمہارا ڈیرہ نظر آ گیا' بہت تھک گیا ہوں اس لیے پانی پینے کو رک گیا' مگر یہاں تمہارا کتا میرے پیچھے پڑ گیا۔ مجھے تھوڑا سا پانی مل جائے گا؟"

"پانی تو یہاں بہت ہے' مگر تو ہمارے برتن میں پانی پی لے گا؟" اس شخص نے مشتبہ انداز میں مجھے گھورا۔

"ہاں' کیا ہوا۔ کیا تم لوگ انسان نہیں ہو۔" میں نے جواب دیا حالانکہ مجھے ان لوگوں سے شدید کراہت محسوس ہو رہی تھی۔

"اسے پانی پلا لالی۔" اس نے قریب کھڑی ہوئی ایک لڑکی سے کہا۔

لڑکی فوراً ہی خیمے میں غائب ہو گئی' اور پانی سے بھرا ہوا المونیم کا گلاس لے کر اٹھلاتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ میں نے اس لڑکی کا بہ غور جائزہ لیا۔ وہ بلا کی حسین تھی سرخ و سفید رنگت' گھنے سیاہ بال' خوب صورت اور متناسب جسم' اس کی چال بہت قیامت خیز تھی۔ آج تک میں نے کسی لڑکی کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے شدید حیرت تھی کہ ان کالے کلوٹوں خانہ بدوشوں میں اس چاند چہرہ حسینہ کا کیا کام! اس نے بہت ادا سے پانی کا گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے وہاں پانی پینے کے تصور سے کراہت محسوس ہو رہی تھی' مگر اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر میں ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گیا۔ لڑکی اپنی ہرنی ایسی سیاہ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ میں نے گلاس اسے واپس کیا تو وہ کھنک دار آواز میں بولی۔ "اور دوں پانی تو تو بہت پیاسا لگتا ہے۔"

میں نے جواب دینے کی بجائے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ لچکتی بل کھاتی خیمے کی طرف چل دی اور میں پلکیں جھپکائے بغیر اس کی تھرکتی چال کو دیکھتا رہا۔ مجھے خود پر حیرت ہو رہی تھی۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے بہت سی حسین لڑکیاں دیکھی تھیں' مگر اس خانہ بدوش حسینہ میں جانے کیا بات تھی۔ ایک لمحے کو تو میں یہ بھی بھول گیا کہ میں تھانے سے فرار ہوا ہوں' اور پولیس مجھے ڈھونڈتی ہوئی یہاں بھی آ سکتی ہے۔

وہ چاند چہرہ پھٹے پرانے خیمے سے ایک مرتبہ پھر طلوع ہوا۔ میں نے پانی پی کر گلاس اسے واپس کیا تو وہی کالا بھجنگ شخص بولا۔ "چل بابو اب اپنا رستہ پکڑ۔"

"میں بہت تھک گیا ہوں۔ گھڑی دو گھڑی آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

"یہاں تجھے آرام ملے گا؟" کالا شخص تلخ لہجے میں بولا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ نہیں جو نظر آ رہا ہے۔ اگر تو پولیس کا مخبر ہے تو یہاں تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ ہم سب محنتی لوگ ہیں۔ میں پہلے بھی پولیس والوں کو بتا چکا ہوں کہ سب بنجارے چور نہیں ہوتے۔"

"میں اور پولیس کا مخبر!" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں تو خود پولیس سے بچتا پھر رہا ہوں۔"

میری بات سن کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا' اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ تو مسافر نہیں ہے' اگر پولیس تیرے پیچھے ہے تو ہمیں معاف رکھ۔ اگر پولیس والوں کو بھنک بھی مل گئی کہ تجھے ہم نے پناہ دی ہے تو وہ مار مار کر ہم سب کی کھال ادھیڑ دیں گے۔ میں اس ڈیرے کا سردار ہوں' نہیں چاہتا کہ تیری وجہ سے

میرے لوگ مصیبت میں پڑیں۔ جا بابو' یہاں سے بھاگ جا۔"

"پولیس کو کیسے معلوم ہو گا کہ تم نے مجھے پناہ دی ہے۔" میں نے خوشامد کی۔ میں نے اپنی رسٹ واچ کھولی اور اس کی طرف بڑھا دی۔ "میری طرف سے یہ تحفہ رکھ لو۔" میں جانتا تھا کہ وہ لوگ لالچی ہوتے ہیں۔

سردار کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار پیدا ہوئے' اور وہ بھڑک کر بولا۔ "ہمیں غلط مت سمجھ بابو! اپنا یہ تحفہ اپنے پاس رکھ لے' کہیں کام آئے گا۔ آ اندر آ جا۔ میں تجھے ایک دو دن سے زیادہ نہیں چھپا سکوں گا۔"

میں نے سکون کا طویل سانس لیا۔ اس دوران میں ڈیرے کا کوئی فرد کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ سب کینہ توز نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں سردار کے پیچھے پیچھے اس کے پھٹے پرانے خیمے میں داخل ہو گیا۔ یہ خیمہ دوسرے خیموں سے نسبتاً بڑا اور بہتر حالت میں تھا۔ خیمے کے اندر زمین پر پیال کے دو بستر بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کسی گاڑی کی پرانی سی سیٹ صوفے کی طرح رکھی ہوئی تھی جو شاید سردار نے کسی کباڑی سے لی تھی۔ ایک کونے میں پانی کا مٹکا' ٹوٹے پھوٹے چند برتن اور اینٹوں کا ایک چولھا تھا۔ سردار پیال کے ایک بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے سرہانے ٹین کے دو بکس رکھے ہوئے تھے۔ سردار نے مجھے اس سیٹ نما صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسی وقت وہ حسین قیامت اندر چلی آئی۔ میں نے سوچا اگر یہ لڑکی کراچی کی کسی مہذب بستی میں ہوتی تو اب تک نہ جانے کتنے نوجوان اس کے لیے پاگل ہو چکے ہوتے۔

"یہ میری بیٹی لالی ہے۔" سردار کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "تیرا نام کیا ہے لڑکے؟"

"میرا نام خرم ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پھر سردار کے پوچھنے پر مختصراً بتا دیا کہ میں تھانے سے کیوں بھاگا تھا۔ میری بات سن کر سردار نے فکر مندی سے کہا۔ "تجھے وہاں سے بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔ تو ان پولیس والوں کو نہیں جانتا اب وہ لوگ تیری ماں اور تیرے باپ کو پریشان کریں گے۔ اب تک انھوں نے تیرے باپ کو پکڑ بھی لیا ہو گا۔ یہ لوگ نہ بڈھا دیکھتے ہیں نہ جوان۔"

میں اچانک تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس سے پہلے پولیس والوں سے میرا واسطہ ہی کب پڑا تھا جو مجھے ان کی عادات و خصلات کا علم ہوتا۔ اب جبکہ زندگی کی ہر قدر بدل چکی ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے مگر نہیں بدلی ہے تو ہماری پولیس۔

مجھے پریشان دیکھ کر سردار نے مجھے تسلی دی' مگر اس تصور سے ہی مجھے وحشت ہو رہی تھی' کہ پولیس والوں نے ماما کو پکڑ لیا ہو گا۔ میں نے سردار سے کہا۔ "تم نے ٹھیک ہی کہا۔ مجھے وہاں سے نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھ

کھڑا ہوا۔

"بیٹھ جا لڑکے!" سردار نے مجھے جھڑک دیا۔ "اب اگر تو واپس چلا گیا تو پولیس والے تیرا بہت برا حشر کریں گے۔ تو مجھے اپنے گھر کا پتا بتا دے۔ میں اپنے کسی آدمی کو بھیجتا ہوں وہ معلوم کر آئے گا کہ بعد میں کیا ہوا۔"

میں نے اسے اپنے گھر کا پتا سمجھایا' مختلف نشانیاں بتائیں' پھر وہ باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد لالی نے کہا۔ "تو شکل سے تو بہت بھولا نظر آتا ہے' پھر یہ پولیس والے تیرے دشمن کیسے ہو گئے؟"

"میں تیرے بابا کو بتا تو چکا ہوں۔" میں نے اس کی بڑی بڑی خوب صورت سی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"بابا نے تیری بات پر یقین کر لیا ہو گا' مجھے یقین نہیں آیا۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بھلا تھانے سے بھی کوئی بھاگ سکتا ہے۔ وہاں تو اتنے بہت سے پولیس والے ہوتے ہیں۔"

"ہاں' میں تھانے سے ہی بھاگا ہوں لالی! میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"

"ہاں تو بھاگ سکتا ہے۔" وہ بولی جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ تو موتی کے سامنے بھی کرتب دکھا رہا تھا۔"

"موتی---کون موتی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ اچانک کھلکھلا اٹھی۔ "تو موتی کو نہیں جانتا! ارے موتی ہمارا کتا ہے۔ وہی جس کے سامنے تو بندر کی طرح ناچ رہا تھا۔"

"اچھا' اچھا وہ ہے موتی!" میں نے ہنس کر کہا۔

"تو قسمت کا اچھا تھا کہ موتی کے ہتھے نہیں چڑھا' ورنہ یوں باتیں نہ بنا رہا ہوتا۔"

"یوں کہہ کہ تیرا موتی قسمت کا اچھا ہے جو وہ میرے ہاتھ سے بچ گیا۔" میں نے اسے چڑانے کو کہا۔

"مگر--- تو--- وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "تو ہے بہت پھرتیلا یا پھر شاید موتی ہی سست ہو گیا تھا۔"

اسی وقت سردار اندر داخل ہوا اور بولا۔ "میں نے جانو کو تیرے گھر بھیج دیا ہے۔ وہ معلوم کرکے آئے گا کہ وہاں کا کیا حال ہے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "تو تو بھوکا بھی ہو گا۔ لالی بٹی اس کے لیے کچھ کھانے کو لا۔"

لالی بغیر کچھ کہے خیمے سے باہر نکل گئی۔ سردار نے کونے میں رکھا ہوا حقہ اٹھایا اور چلم میں خشک تمباکو سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔ مجھے وہ سب کچھ بہت عجیب سا لگ

رہا تھا۔ ان لوگوں کے رہن سہن پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ اس مہذب دور میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو محض ایک پھٹے پرانے خیمے میں ساری زندگی بتا دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد لالی ایک چنگیر میں موٹی موٹی روٹیاں اور المونیم کے پرانے سے پیالے میں سالن لے آئی۔ ہرچند کہ مجھے بہت بھوک لگی ہوئی تھی، مگر وہ کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اگر لالی کھانے پر اصرار نہ کرتی تو شاید میں ایک لقمہ بھی نہ لے پاتا۔ میں نے جیسے تیسے اگل نگل کر ایک روٹی حلق سے نیچے اتار لی، اور پانی پی کر ہاتھ کھینچ لیا۔ سردار نے کہا۔ "کھا بیٹا، تو نے ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟" پھر وہ خود ہی بولا۔ "مگر تجھے یہ روکھا سوکھا، بدمزہ کھانا کیسے پسند آئے گا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "بس بھوک ہی نہیں ہے۔"

لالی نے خاموشی سے برتن سمیٹے اور خیمے سے باہر نکل گئی۔

میں ایک مرتبہ پھر گاڑی کی آرام دہ سیٹ پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ خیمے کے اندر ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ شاید سورج ڈھل چکا تھا۔ سردار نے احتیاط کے طور پر خیمے کے دروازے پر بھی ٹاٹ کا ایک پردہ تان دیا تھا اس لیے مجھے باہر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک خیمے کا پردہ ہٹا اور غلیظ سا ایک آدمی خیمے کے اندر آگیا۔ وہ پہلی نظر میں مجھے فقیر لگا۔ پھٹے پرانے غلیظ کپڑے اس کے جسم پر چیتھڑوں کی طرح جھول رہے تھے۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ سردار نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "ہاں جانو! کیا خبر ہے؟"

سردار نے اس کا نام لیا تو میں چونک اٹھا۔ اسے تو سردار نے میرے گھر کی طرف بھیجا تھا۔

"خبر اچھی نہیں ہے سردار!" جانو نے بلغم زدہ آواز میں جواب دیا۔ "پولیس اس کے باپ کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ وہ ابھی تک تھانے میں ہے۔"

میں اضطراری کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔ کیوں--- کیا قصور کیا ہے میرے باپ نے؟" میں نے اس سے یوں پوچھا جیسے اسی نے میرے باپ کو گرفتار کیا ہو۔

"اس کا سب سے بڑا قصور تو یہی ہے کہ وہ تیرا باپ ہے۔" جانو فلسفیانہ انداز میں بولا۔

"میں جاؤں گا بابا!" میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ میرا باپ نہیں ماما ہے۔ اسی نے مجھے پالا ہے۔ وہ کیا سوچ رہا ہو گا کہ خرم اپنی جان بچانے کے لیے بڑھاپے میں مجھے اس عذاب میں پھنسا گیا۔ وہ--- تو---"

"حوصلہ رکھ بیٹا!" سردار نے مجھے تسلی دی۔

"نہیں بابا! میں جاؤں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تو جا کر کرے گا کیا؟ دوبارہ اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسائے گا۔"

کچھ بھی ہو بابا! پولیس والے چاہے مجھے پھانسی پر لٹکا دیں‘ مگر میں جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے جوتے پہنے اور جانے کو تیار ہو گیا۔

میں خیمے سے باہر نکلا تو شام پھیل چکی تھی۔ ڈیرے کی عورتیں کھلے آسمان کے نیچے چولھے جلائے کھانا پکانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ لالی لپک کر میرے پاس آئی اور حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ "تو جا رہا ہے کیا؟"

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے دور نکل گیا۔

میں تھانے پہنچا تو انچارج مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "قصور میں نے کیا تھا تو تم نے میرے ماما کو کیوں پکڑ لیا؟"

"اوئے ہشکے بھئی۔" وہ اپنی مخصوص مکروہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا۔ "اوئے بھانجا ہو تو ایسا۔ پھر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا۔ "اوئے فضل دین! لے بھئی منڈے نے خود گرفتاری دے دی ہے۔"

اس کی بات کے جواب میں فضل دین پھر چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ غضب ناک ہو گیا‘ اور دانت پیس کر بولا۔ "اوئے بندر کی اولاد! تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ تجھ میں کتنا دم خم ہے۔ پہلے تو ذرا اپنے ماما سے ملاقات کر لے۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

واپس آیا تو اس کے ساتھ ماما بھی تھے مگر اس حالت میں کہ ان کے چہرے پر نیل تھے‘ ہونٹ پھٹ چکے تھے‘ دائیں آنکھ کے نیچے چوٹ کا نشان تھا‘ کپڑے تار تار تھے‘ اور وہ بہت مشکل سے چل رہے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میں تڑپ اٹھا‘ اور چیخ کر بولا۔ "ماما! کیا ہوا آپ کو! آپ کی یہ حالت کس نے بنائی ہے۔"

"چل اوئے ابھی پتا چل جائے گا کہ اس کی یہ حالت کس نے کی ہے۔" فضل دین نے مجھے باہر دھکیلا۔

"گھبرا مت خرم!" ماما نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں زیادہ دیر تجھے یہاں نہیں چھوڑوں گا۔"

اس مرتبہ فضل دین نے نہ صرف مجھے ہتھکڑی لگا دی بلکہ ایک رسی لے کر میرے پیر بھی باندھ دیے۔ پھر بولا۔ "اب دکھا ذرا بندر کا ناچ! حرام زادے‘ تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا‘ حوالدار فضل دین پر‘ میرے سامنے بڑے بڑے اشتہاری مجرم کانپتے ہیں۔ تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔"

یہ کہہ کر اس نے پوری قوت سے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔

میں سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر گر گیا۔ تھپڑ کی ضرب سے میرا ہونٹ پھٹ گیا تھا‘

اور میری زبان بھی دانتوں تلے آکر زخمی ہو گئی تھی۔ اس نے بال پکڑ کر مجھے اٹھایا' پھر اور دار تھپڑ رسید کیا اور بولا۔ "اب دکھا بندر کا ناچ۔"

مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ میں نے بھی چیخ کر کہا۔ "باندھ کر تو بچے بھی شیر مار سکتے ہیں۔ مجھے کھول دے' پھر تجھے بھی بندر کا ناچ نہ نچاؤں تو خرم نام نہیں۔"

"کچھ دیر اور بول لے۔" فضل دین دانت پر دانت جما کر بولا۔ "ابھی کرتا ہوں تیرا بندوبست!" یہ کہہ کر اس نے چھت سے لٹکی ہوئی رسی سے میرے دونوں پیر مضبوطی سے باندھے' رسی کا دوسرا سرا کمرے کی دیوار میں لگے ہوئے ایک کنڈے سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ دوسرا سرا کھینچنا شروع کیا۔ پہلے میں دھڑام سے نیچے گرا' پھر میری ٹانگیں ہوا میں معلق ہو گئیں اور میں الٹا لٹک گیا۔ ہتھکڑی اب بھی لگی ہوئی تھی۔ فضل دین نے ہتھکڑی کھول دی اور میرے شانے پکڑ کے مجھے پنڈولم کی طرح جھلا دیا۔

پھر وہ پوری رات مجھے اذیت دیتا رہا۔ مار مار کے اس نے میرا جوڑ جوڑ ہلا دیا۔ صبح کے وقت اس نے مجھے نیچے اتارا تو میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میری ٹانگیں ربڑ کی بنی ہوئی ہوں۔ میں نے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو وہ بالکل ربڑ کی طرح مڑ گئیں۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا' اور سر اس بری طرح چکرا رہا تھا کہ مجھ سے آنکھیں کھولنا دوبھر ہو رہا تھا۔ پھر میرے کانوں میں فضل دین کی آواز گونجی۔ "سنا بھئی بندر کی اولاد! تیرے کس بل نکلے یا نہیں؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کتنی دیر تک میں اسی حالت میں مردوں کی طرح پڑا رہا۔ آہستہ آہستہ میرا ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل ہو رہا تھا۔ میں نے لرز کر سوچا کہ اگر مزید ایک رات فضل دین نے مجھ پر تشدد کیا تو میں زندہ بھی رہ سکوں گا؟ جب میرے حواس کچھ ٹھکانے آئے تو میں گھسٹتا ہوا دیوار کے پاس پہنچا' اور اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب میری آنکھیں بھی پوری طرح دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جس میں فضل دین نے مجھ پر تشدد کیا تھا۔ شاید وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں مجھے یہاں لایا تھا۔ یہ حوالات کی چھوٹی سی ایک کوٹھری تھی۔ اس کا دروازہ سلاخوں والا تھا' اور باہر کچھ فاصلے پر ایک سنتری کھڑا اونگھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک سنتری دروازے کے پاس آیا اور بولا۔ "یہ تیرے گھر سے ناشتا آیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور ٹفن اندر کھسکا کر پھر بند کر لیا۔

بھوک کے مارے میرا برا حال تھا۔ میں گھسٹتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا اور ٹفن اٹھا کر گرتا پڑتا پھر واپس چلا گیا۔ ٹفن میں تین پراٹھے' انڈوں کا آملیٹ اور ملائی تھی۔ میں یہی ناشتا کرتا تھا۔ پراٹھوں سے اشتہا انگیز مہک اٹھ رہی تھی۔ نہ جانے ماما نے کیا جتن کرکے یہ ناشتا مجھ تک پہنچایا تھا۔ میں بھوکوں کی طرح ناشتے پر ٹوٹ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے

تینوں پراٹھے کھا گیا۔ پانی کا مٹکا وہیں ایک کونے میں موجود تھا۔ اس کے ساتھ مٹی کا ایک کوزہ بھی تھا۔ میں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ پیٹ بھر کے ناشتا کرنے سے میری جان میں جان آئی۔

پھر ایک سنتری دروازے پر آیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور ہتھکڑی لے کر میرے طرف بڑھا۔ میں نے بغیر کچھ کہے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ ہتھکڑی لگا کر وہ بولا۔ "چل اوئے! تیری ملاقات آئی ہے۔"

میں سمجھا ماما ہوں گے۔ میں بہ مشکل تمام لڑکھڑاتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے لے کر انچارج کے کمرے میں پہنچا' مگر وہاں ماما نہیں تھے' بلکہ سوٹ میں ملبوس باوقار سے ایک صاحب تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے اور بولے۔ "خرم تم ہی ہو؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ درشت لہجے میں تھانے دار سے بولے۔ "اس پر تشدد کیوں کیا گیا ہے۔ اس کی گرفتاری کو چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔۔ اسے ابھی تک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیوں نہیں کیا گیا؟"

"او بادشاؤ! اس کی گرفتاری کو تو ابھی مشکل سے بارہ گھنٹے گزرے ہیں۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ!"

"اسے آپ نے کل صبح گھر سے گرفتار کیا تھا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے ہیں۔ ذرا حساب لگائیے کتنے گھنٹے ہوئے ہیں۔"

"یہ یہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ اسے دوبارہ ہم نے شام ات بجے گرفتار کیا ہے۔

"کہاں سے گرفتار کیا ہے دوبارہ۔" وکیل صاحب نے چبھتے لہجے میں کہا۔

"وہ جی۔۔۔ یہ۔۔۔ ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا۔" تھانے دار گڑبڑا گیا۔

"کس ہوٹل میں بیٹھا تھا؟" وکیل صاحب جرح کے موڈ میں تھے۔

"یہ عدالت نہیں وکیل صاحب!" تھانے دار لاجواب ہو گیا۔ "میں اپنی رپورٹ میں سب کچھ لکھ دوں گا۔ آپ عدالت میں شوق سے مجھ پر جرح کر لیجئے گا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کروں گا۔"

"یہ کام جتنا جلد کر لو اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔" وکیل صاحب نے خشک لہجے میں کہا' پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "خرم تم گھبرانا نہیں' میں آج ہی تمہاری ضمانت کرا لوں گا۔"

ایک گھنٹے بعد مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے علم ہوا کہ پولیس نے مجھ پر ڈکیتی' ناجائز اسلحہ برآمد ہونے اور تھانے سے فرار ہونے کے سنگین الزامات عائد کیے ہیں۔ وکیل صاحب نے ضمانت کی درخواست دی مگر مجسٹریٹ نے میری ضمانت منظور نہ کی' اور پولیس کو دس دن کا ریمانڈ دے دیا۔

وہ دس دن میری زندگی کے تلخ ترین دن تھے۔ میں نے کئی بار خلوص دل سے یہ خواہش کی کہ کاش مجھے موت آ جائے۔ فضل دین نے مجھ سے ان الزامات کا اقرار کرا لیا جو پولیس نے مجھ پر عائد کیے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ عدالت میں' میں اپنے بیان سے پھر گیا۔

پھر مجسٹریٹ نے مجھے جیل بھجوا دیا۔ کافی عرصے تک مقدمہ چلا مگر وکیل صاحب اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود مجھے سزا سے نہ بچا سکے اور مجھے تین سال کی سزا ہو گئی۔

اس دوران میں ماما مجھ سے ملنے جیل آتے رہے۔ ایک دفعہ ان کے ساتھ مامی بھی آئی تھیں' اور وہ مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر یوں بلک بلک کر روئیں کہ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں نے ماما سے کہہ دیا کہ آئندہ مامی کو یہاں نہ لایئے گا۔ پھر ماما اکیلے ہی جیل آتے رہے۔ میں انھیں جب بھی دیکھتا مجھے شدت سے یہ احساس ہوتا کہ ماما پہلے سے کچھ اور کمزور ہو گئے ہیں۔ گزرنے والا ہر دن انھیں کمزور اور بوڑھا کر رہا تھا۔ انھیں شاید قوی امید تھی کہ میں باعزت بری ہو جاؤں گا' مگر جب مجھے سزا ہوئی تو وہ بھی ہمت ہار بیٹھے۔ جب وہ عدالت کے برآمدے میں مجھ سے ملے تو اس بری طرح روئے کہ ذکیہ باجی کی موت پر بھی نہ روئے تھے۔ میں جیل کی تنہائیوں میں اتنا رو چکا تھا کہ میرے تو آنسو ہی خشک ہو چکے تھے۔

جیل میں بھی وہی معمولات جاری رہے۔ ماما ہفتے میں ایک دن آتے تھے۔ اکثر وہ میرے لیے کھانے کی چیزیں لے آتے تھے۔ سنتری مہربان ہوتے وہ چیز مجھے مل جاتی ورنہ وہ لوگ اسے ہڑپ کر جاتے۔

سزا ہوئے مجھے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ پچھلے ایک مہینے سے ماما مجھے ملنے نہ آئے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی؟ میں انتہائی فکر مند تھا۔ بار بار یہی سوچتا تھا کہ کہیں وہ بیمار نہ ہو گئے ہوں۔ آخری مرتبہ وہ مجھے بہت زیادہ کمزور لگے تھے۔ میں اب دوسرے قیدیوں میں گھل مل گیا تھا۔ ان میں نامی گرامی ڈکیت بھی تھے' اور مجھ ایسے بے گناہ بھی۔ وہاں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو خود کو بے گناہ ہی کہتے تھے۔ چند قیدی ایسے بھی تھے جو بہ بانگ دہل اپنے جرم کا اقرار کرتے تھے۔ میں ہر قیدی سے خلوص سے بات کرتا تھا اسی لیے وہ بھی میرا خیال رکھتے تھے۔ جیل میں آئے دن لڑائی جھگڑا ہوتا تھا' مگر میں نے کبھی کسی فریق کی حمایت نہ کی۔

اس دن ایک نیا قیدی جیل میں آیا تھا۔ وہ دراز قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ شیو کئی دن کا بڑھا ہوا تھا' اور چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ بیرک کے دروازے کے پاس ہی میرا بستر تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی مجھے زور دار لات ماری اور بھاری آواز میں بولا۔ "چل اوئے! میرے پیر دبا۔"

میں بھنا کر رہ گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کسی سے الجھوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں شرافت کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ پولیس کے ظلم کے بعد شاید ہی کوئی ایسا ملزم ہو جو شرافت کی زندگی گزارنا چاہے گا۔ میں تو جلد از جلد جیل سے رہا ہونا چاہتا تھا' تاکہ جاوید سے حساب کتاب برابر کر سکوں۔ اسی لیے میں جیل میں کسی لڑائی جھگڑے سے پرہیز کرتا تھا' کہ میری سزا میں اضافہ نہ ہو جائے' مگر اس قیدی نے مجھے یوں کتے کی طرح لات ماری تو میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ جیل ہے' تیرا گھر نہیں ہے' اور میں تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ تیرے پیر دباؤں۔"

میرے جواب سے وہ قیدی مشتعل ہو گیا' اور اس نے پھر لات ماری' مگر اب میں پوری طرح چوکنا تھا اس لیے اس کی لات پڑنے کا کیا سوال! وہ مغلظات بکنے لگا اور بولا۔ "تجھے شاید معلوم نہیں کہ میرا نام دلاور ہے۔ میرا نام سن کر بڑے بڑے سورماؤں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ اس کا نام سن کر کئی قیدی سہم کر دیوار سے چپک گئے۔ شاید وہ دلاور کی دہشت سے واقف تھے۔ میں اسے نہیں جانتا تھا' جانتا بھی ہوتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سر جھکانا تو میری سرشت میں تھا ہی نہیں۔ میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ "تم دلاور ہو یا زور آور' اپنی ٹانگ کو قابو میں رکھو ورنہ زندگی بھر بیساکھی کے سہارے چلو گے۔"

وہ مجھ پر پھر حملہ آور ہوا۔ میں نے اچھل کر اس کے سامنے ہوا میں دو تین دائرے بنائے اور اسے حیرت زدہ ہونے کا موقع دیے بغیر اس کے سینے پر فلائنگ کک مار کے دور جا کھڑا ہوا۔ لات کھا کر وہ لڑکھڑا گیا۔ اب اس کی آنکھوں میں غصے سے زیادہ حیرت تھی' اور وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میری تحقیر آمیز مسکراہٹ سے اسے پھر غصہ آ گیا' اور بولا۔ "تو کیا کسی سرکس میں کام کرتا ہے؟"

"میں کہیں بھی کام کرتا ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' لیکن اب تم نے مجھے گالی دی تو تم کہیں بھی کام کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

اس نے اچانک میرے اوپر چھلانگ لگائی' اور اڑتا ہوا مجھ پر آ گرا۔ اس سے مجھے اس پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ اس لیے مار کھا گیا۔ اسی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے میری گردن دبوچ لی۔ میں طاقت اور جسامت میں اس سے کہیں کم تھا' اور اس وقت تک محفوظ تھا جب تک اس کی پہنچ سے دور تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری گردن کسی شکنجے میں پھنس گئی ہو۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا' اور سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا آخری وقت آ پہنچا' اور میں مر رہا ہوں۔ پھر اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میری گردن شکنجے سے آزاد ہو گئی ہو۔ میں نے دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور میرے ذہن سے دھند چھٹنے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا' دلاور پانی کا گلاس لیے مجھ پر جھکا

ہوا تھا۔ اس نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا' اور پانی کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی پی کر میری جان میں جان آئی اور دلاور کے رویے پر حیرت بھی ہوئی۔ کہاں تو وہ میری جان کا دشمن ہو رہا تھا' اور کہاں اب مجھے پانی پلا رہا تھا۔ میں نے حیرت بھرے انداز میں اسے دیکھا' تو شاید وہ میرا سوال سمجھ گیا۔ اس نے میرا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ "دلاور کام کے آدمیوں کی قدر کرتا ہے۔ مجھے تیری پھرتی اور جی داری پسند آئی۔ ایسے لوگوں کو مارتے ہوئے مجھے افسوس ہوتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا' اور اپنی گردن سہلاتا رہا۔

دلاور نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "آج سے تو میرا دوست ہے۔ دلاور یاروں کا یار ہے۔ تیرا نام کیا ہے؟"

"خرم!" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا' کیوں کہ میرے گلے میں ابھی تک تکلیف ہو رہی تھی۔

پھر اس نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں بے گناہ سزا کاٹ رہا ہوں تو وہ دانت پیس کر بولا۔ "خرم! اب تو فکر مت کر۔ جیل سے چھوٹتے ہی میں جاوید سے تیرا حساب بے باق کروں گا۔"

"نہیں دلاور!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "جاوید میرا مجرم ہے۔ اسے میں اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔" دوسرے قیدی پہلے بھی مجھ سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ دلاور کے آنے کے بعد وہ میرا احترام کرنے لگے تھے۔ ایک مہینہ مزید گزر گیا اور ماما نہ آئے تو مجھے فکر ہوئی۔ دلاور سے ملنے اس کا ایک دوست آیا تو میں نے اسے ماما کا پتا دیا اور درخواست کی کہ وہ مجھے ان کی خیریت معلوم کر دے۔

اگلے ہفتے وہ آیا تو میرے لیے کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ دو مہینے پہلے تمہارے ماما کا ہارٹ فیل ہو چکا ہے۔

"اور مامی!" میرے لہجے میں وحشت تھی۔

"وہ نیم پاگل سی ہو گئی ہیں۔ محلے کا کوئی شخص کھانے کو دے دے تو کھا لیتی ہیں' ورنہ دو دو دن بھوکی رہتی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں اضطراب کے عالم میں ہاتھ ملنے لگا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ جیل کی سلاخیں توڑ کر مامی تک پہنچ جاؤں۔ جس شخص نے مجھے باپ کی طرح شفقت دی' وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا تھا۔ میں ایسا ناہنجار بیٹا تھا کہ اپنے منہ بولے باپ کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا' اور وہ عورت جس نے مجھے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی' مجھے سگوں سے بڑھ کر چاہا' آج نیم دیوانگی میں مبتلا دوسروں کے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی سوچتی ہو گی کہ اپنا خون' اپنا ہی ہوتا ہے۔ خرم کون سا میرا حقیقی بیٹا تھا۔ میرا یہ

احساس اتنا شدید تھا کہ میں اس رات ایک پل کو بھی نہ سو سکا۔

دوسری رات بھی میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ مجھے کسی طرح سکون ہی نہیں مل رہا تھا۔ مجھے جاگتا دیکھ کر دلاور بھی اٹھ کر میرے نزدیک آ گیا' اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "سو جاؤ تم! یوں پریشان ہونے سے کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میں تیرا دکھ سمجھ رہا ہوں مگر تو کر بھی کیا سکتا ہے؟"

"میں جیل سے فرار ہونا چاہتا ہوں!" میں نے اپنے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"یہ اتنا آسان نہیں ہے خرم!" دلاور نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "پھر تو فرار ہو بھی گیا تو اپنی ماں کے لیے کیا کر لے گا۔ پولیس تیری بو سونگھتی ہوئی وہاں پہنچ جائے گی۔ یا تو تو وہاں سے فرار ہو جائے گا' یا پھر گرفتار ہو جائے گا۔ ماں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا' یا تو انھیں بھی ساتھ لیے لیے گھومے گا؟"

اس کی بات درست تھی۔ ظاہر ہے میں جیل سے فرار ہو کر بھی ماں کی کیا خدمت کر سکتا تھا۔ اس بڑھاپے میں انھیں اپنے ساتھ لے بھی جاتا تو کہاں؟ میرا تو کہیں اور ٹھکانا بھی نہیں تھا۔

"تو ماں کی فکر مت کر خرم!" دلاور کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کرم علی اس مرتبہ آئے گا تو میں کہہ دوں گا کہ وہ ماں کا خیال رکھے بلکہ اپنی بیوی کو انھی کے پاس چھوڑ دے۔ تو ان کی فکر کیوں کرتا ہے۔ میں نے تو پچھلی دفعہ بھی کرم علی سے کہا تھا کہ وہ کچھ رقم ماں کو پہنچا آئے۔ تو فکر مت کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ دیر تک مجھے بچوں کی طرح بہلاتا رہا۔ اس کی باتوں سے کسی حد تک میں مطمئن ہو گیا۔

اگلے ہفتے کرم علی آیا تو دلاور نے اسے تاکید کی کہ جب تک خرم رہا نہ ہو جائے تو اپنی بیوی کو لے کر اس کی ماں کے گھر چلا جا۔ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔

پھر مزید دو مہینے گزر گئے۔ کرم علی ماں کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ماں کی دماغی حالت بھی اب کافی بہتر تھی' مگر وہ مجھے یاد کر کے روتی رہتی تھیں۔ یہ سب باتیں مجھے کرم علی نے بتائیں تھیں۔ اس نے ایک حیرت انگیز بات اور بتائی تھی۔ خانہ بدوش حسینہ لالی بھی اکثر ماں کے پاس آ جاتی تھی۔ کبھی وہ تنہا ہوتی' کبھی اس کا باپ اس کے ہمراہ ہوتا۔ یہ بات سن کر مجھے خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی۔

پھر ایک روز میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کرم علی کے ساتھ خانہ بدوش سردار بھی تھا۔

"بابا تم یہاں کیسے؟"

بیٹا! میں بہت پہلے تیرے پاس آنا چاہتا تھا مگر اس خوف سے نہیں آیا کہ کہیں تجھے برا نہ لگے۔"

"مجھے برا کیوں لگے گا بابا!" میں نے ہنس کر کہا' پھر بولا۔ "ماما کی موت کے بعد مجھے حسرت ہی رہی کہ کوئی مجھ سے بھی ملنے آتا۔" پھر میں زبردستی مسکرا کر بولا۔ "خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ لالی کیسی ہے؟ موتی کا کیا حال ہے؟"

"تجھے اب تک موتی یاد ہے۔" بابا ہنس کر بولا۔ "لالی بھی خیریت سے ہے اور موتی بھی۔ لالی ہی نے ضد کر کے مجھے یہاں بھیجا ہے۔

"تمہیں اطلاع مل گئی تھی کہ مجھے سزا ہو گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تو دوسرے روز معلوم ہو گیا تھا کہ تو ماما کی وجہ سے خود تھانے پہنچ گیا تھا۔ جانو اور لالی اکثر تیرے گھر جاتے رہتے تھے۔ تیرے ماما کے انتقال کے بعد البتہ ہم لوگوں نے وہاں جانا کم کر دیا تھا کہ محلے والے چور نہ سمجھیں۔ ان دنوں تیری مامی کی دماغی حالت بہت خراب تھی۔ اب خیر سے کرم علی اور اس کی بیوی آئے ہیں' لالی بھی بلاناغہ تیری مامی کے پاس چلی جاتی ہے۔"

میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر لالی کو مامی سے اتنی ہمدردی کیوں ہو گئی ہے؟"

ملاقات کا وقت ختم ہوا تو کرم علی اور بابا رخصت ہو گئے۔ میں اور دلاور دوبارہ بیرک میں آئے۔ دلاور نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "یہ لالی کون ہے خرم؟"

"اسی خانہ بدوش کی بیٹی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک بار بابا نے مجھے پناہ دی تھی۔"

"مگر تو نے تو لالی کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"میں نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "اب مجھے خود حیرت ہے کہ اس لڑکی کو آخر مامی سے کیا دلچسپی ہے؟"

دلاور ہنسنے لگا اور بولا۔ "اسے مامی سے نہیں بلکہ تجھ سے دلچسپی ہے۔ اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے عجیب سا سرور محسوس ہو رہا تھا۔ لالی کے نام میں عجیب تاثیر تھی' کہ میرا دل بے اختیار بے ترتیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

پھر تو جیل میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ چونکا تو میں اس وقت جب جیلر صاحب نے مجھے بلا کر بتایا کہ میری سزا کی مدت پوری ہو چکی ہے' اور اگلے دن مجھے رہا کر دیا جائے گا۔ میں نے سب سے پہلے یہ خبر دلاور کو سنائی۔ وہ پہلے تو بے انتہا خوش ہوا' پھر

اس کی آنکھیں بجھ کر رہ گئیں، اور وہ اداس لہجے میں بولا۔ "خرم! مجھے خوشی ہے کہ کل تو آزاد ہونے والا ہے، مگر دکھ اس بات کا ہے کہ میں اتنی طویل سزا کس کے سہارے کاٹوں گا۔ خیر تو جا مگر مجھ سے ملتے رہنا۔"

"کیسی غیروں والی باتیں کر رہے ہو دلاور!" میں نے کہا۔ "یہ بھی بھلا کوئی کہنے کی بات ہے۔ تمہارے بغیر میرا دل بھی نہیں لگے گا۔ تم سے ملے بغیر تو مجھے بھی چین نہیں آئے گا۔"

مجھے دلاور کے دکھ کا احساس تھا۔ اسے قتل کے جرم میں سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ فوری اشتعال کے عالم میں اس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ وہ یوں بھی معاشرے کی نظر میں اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس نے لیاری میں کچی شراب کی ایک بھٹی لگا رکھی تھی، اور وہیں بڑے پیمانے پر جوا بھی کھلاتا تھا۔

اس رات ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ سو سکا۔ ہم مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ وہ جانتا تھا کہ جیل سے نکلنے کے بعد مجھے کوئی باعزت ملازمت نہیں ملے گی۔ اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ یہاں سے نکلنے کے بعد سیدھے لیاری جانا۔ وہاں میرا خاص آدمی قاسو ہر طرح سے تمہاری مدد کرے گا۔ میں نے کرم علی کو بتا دیا ہے۔ وہ تمہیں قاسو سے ملوا دے گا۔"

اگلے روز دلاور نے پرنم آنکھوں سے مجھے رخصت کیا۔ میں وہاں سے سیدھا گھر پہنچا۔ ماں کو دیکھ کر میرے ذہن کو دھچکا سا لگا۔ کرم علی اور لالی کا باپ مجھ سے جھوٹ بولتے رہے تھے کہ ماں خیریت سے ہیں۔ وہ شدید بیمار تھیں، اور پلنگ سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں تھیں۔ کرم علی کی بیوی ہی ان کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ کرم علی ہی ان کا علاج کرا رہا تھا۔ مجھے کرم علی پر شدید غصہ آیا، کہ اس مردود نے مجھے اندھیرے میں کیوں رکھا؟ مگر اس نے بھی مصلحتاً ہی جھوٹ بولا تھا، اگر وہ مجھے صحیح صورتحال بتا دیتا تو شاید میں جیل میں اتنے سکون سے نہ رہ پاتا۔

میں بے اختیار ماں سے لپٹ گیا، اور ٹوٹتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ماں! یہ آپ نے کیا حالت بنا لی ہے؟"

انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا، مسکرائیں اور نحیف لہجے میں بولیں۔ "خرم تو آگیا بیٹا! میں اب تک تیرے ہی انتظار میں جی رہی تھی۔ میں چاہتی تھی مرنے سے پہلے ایک دفعہ تجھے دیکھ لوں۔ تیرے ماما تیری ایک امانت میرے حوالے کر گئے تھے۔ وہ امانت بھی لوٹانا تھی۔" پھر انھوں نے پلنگ کے نیچے رکھا ہوا صندوق باہر نکالنے کو کہا اور بولیں "اس میں مکان کے کاغذات ہیں، کچھ نقد رقم ہے، اور کچھ زیورات ہیں جو میں نے ذکیہ کے لیے رکھے تھے۔ ذکیہ نہ رہی تو سوچا تھا یہ زیورات اپنی بہو کو دوں گی۔ میری یہ خواہش

تو پوری نہ ہو سکی۔ تو اپنی امانت سنبھال لے بیٹا۔

"ایسی باتیں مت کریں مامی!" میرے آنسو بہنے لگے۔ "میرا اب اس دنیا میں آپ کے سوا ہے کون؟ میں آپ کو مرنے نہیں دوں گا مامی!"

"پاگل کہیں کا!" مامی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "کوئی جانے والے کو بھی کبھی روک سکا ہے۔"

مامی کا کہنا درست ہی ثابت ہوا' کہ وہ صرف میرے انتظار میں جی رہی تھیں۔ میرے آنے کے تین ہی دن بعد وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں۔ میں بھی کیسی پھوٹی تقدیر لے کر آیا تھا۔ جس نے مجھ سے ذرا سی بھی اپنائیت برتی وہ زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

جس دن مامی کا انتقال ہوا۔ اسی دن لالی ان سے ملنے آئی تھی۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ مامی کا انتقال ہو چکا ہے تو وہ یوں دھاڑیں مار مار کر روئی جیسے اس کی ماں کا انتقال ہوا ہو۔ میں اپنا غم بھول کر اسے تسلی دینے لگا۔ کرم علی کی بیوی بھی رو رہی تھی' اور کرم علی کی بیوی ہی کیا' محلے کا ہر فرد ان کی موت پر اشک بار تھا۔

مامی کے سوئم کے بعد کرم علی کی بیوی بھی رخصت ہو گئی۔ گھر میں اچانک سناٹا ہو گیا۔ اس گھر میں میرا لڑکپن گزرا تھا۔ اس گھر کے درودیوار سے مجھے اپنوں کی خوشبو آتی تھی۔ کبھی میرے کانوں میں ذکیہ باجی کی آواز گونجتی تھی' کبھی ماما کی آواز سنائی دیتی تھی' کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مامی ابھی باورچی خانے سے نکلیں گی اور کہیں گی۔ خرم! جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر لو ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

میں نے سوچا اگر میں مزید کچھ دن یادوں کے اس مدفن میں رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں سنجیدگی سے یہ سوچ رہا تھا کہ مکان کو تالا لگاؤں اور کہیں اور منتقل ہو جاؤں۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ مکان کو تالا لگاؤں اور چل دوں' مگر پھر میں نے مکان کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر میں کچھ دن مزید وہاں رہتا تو شاید پاگل ہو جاتا۔ میں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ یہاں سے کہاں جاؤں گا' بس میں وہ مکان چھوڑ دینا چاہتا تھا' گو کہ دلاور نے مجھے اپنے ایک آدمی کا پتا دیا تھا' مگر میں وہاں بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں شرافت کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ اپنی بچھڑی ہوئی بہن شہلا کو تلاش کرنا چاہتا تھا' اسی لیے میں دلاور کے اڈے سے دور ہی رہا۔

میں نے مکان کی فروخت کے لیے ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کی۔ اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر مکان فروخت کروانے کا وعدہ کر لیا' مگر یہ ایک ہفتے بھی وہاں گزارنا مجھے عذاب لگ رہا تھا۔

مامی نے دو ڈھائی ہزار روپے نقد بھی میرے حوالے کیے تھے اس لیے فی الحال

اخراجات کی پریشانی نہیں تھی۔ میں صبح سے رات تک باہر ہی رہتا تھا۔ یوں ہی بے مقصد سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہتا یا کسی پارک میں پڑا رہتا۔ رات گئے گھر لوٹتا اور صبح ہوتے ہی پھر نکل کھڑا ہوتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کہیں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت مل جائے' تاکہ میرے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔

اس دن بھی حسب معمول میں صبح گھر سے نکلا تو جاوید کو دیکھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ جیل سے آنے کے بعد میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں بہت اچھی ہو گئی تھی۔ اس سے میری نظر ملی تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا تمسخر اڑا رہا ہو۔ میں نے بہ مشکل تمام اپنے غصے پر قابو پایا اور نزدیک کے ایک ہوٹل میں جا بیٹھا۔ ناشتہ میں وہیں کرتا تھا۔

جاوید بھی اپنے ایک دوست کے ساتھ اسی ہوٹل میں آگیا۔ وہ دونوں مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے اس لیے ان کی باتیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جاوید تمسخر آمیز انداز میں اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "یار عاقل! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جیل کاٹنے کے بعد بھی بعض لوگ خود کو باعزت سمجھتے ہیں۔" اس نے یہ بات خاصی بلند آواز میں کہی تھی' اور واضح طور پر مجھ کو سنانا چاہ رہا تھا۔

"بے غیرت آدمی کے لیے جیل آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" عاقل نے ہنس کر کہا۔

"ہاں یار۔" جاوید کا لہجہ تضحیک آمیز تھا۔ "یہ بے غیرت لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جسے بہن کہتے ہیں اسی سے عشق بھی کرتے ہیں۔" جاوید کے گھناؤنے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اتر گئے۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں میں نے چیخ کر کہا۔ "جاوید!"

اس نے طنزیہ انداز میں مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے کھولتی ہوئی چائے کا کپ اٹھایا' اور پوری قوت سے اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ کرب ناک انداز میں چیخا۔ عاقل نے بھاگنے کی کوشش کی' مگر میں نے اس پر بھی پانی کا جگ کھینچ مارا۔

میں کاؤنٹر کے نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ کاؤنٹر کے ساتھ ہی فرش پر اوپر تلے کولڈ ڈرنکس کے کریٹ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جھپٹ کر دو بوتلیں نکالیں اور جاوید کے سر پر جا پہنچا۔ وہ آنکھیں بند کیے ابھی تک اندھوں کی طرح چلا رہا تھا' اور مجھے گالیاں بک رہا تھا۔ چائے نے شاید اس کی آنکھوں کو بھی جھلسا دیا تھا۔ میں غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے دونوں بوتلیں میز پر توڑ دیں۔ اگر وہ بھری ہوئی ہوتیں تو شاید میں بھی زخمی ہو جاتا۔ پھر میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' ٹوٹی ہوئی دھار دار بوتل سے پے درپے جاوید کے چہرے اور گردن پر

کئی وار کیے۔ عاقل نے ایک مرتبہ پھر بھاگنا چاہا' مگر اس وقت تو مجھ پر خون سوار تھا۔ میں نے اسے بھی بری طرح زخمی کر دیا۔ جاوید کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ اس کی گردن سے فوارے کی شکل میں خون بہہ رہا تھا۔ عاقل کی آنتیں باہر لٹک رہی تھیں' اور وہ بھی قریب المرگ تھا۔ میرے کپڑے اور ہاتھ خون میں لتھڑ گئے تھے۔ ہوٹل میں اس وقت اچھے خاصے لوگ موجود تھے' مگر کسی میں اتنی جرات پیدا نہ ہو سکی کہ وہ مجھے پکڑتا۔ یوں میرے ہاتھوں کوئی بے گناہ قتل نہ ہوا ورنہ اس وقت تو جو بھی سامنے آتا میرے ہاتھوں مارا جاتا۔

جاوید تڑپ تڑپ کر ساکت ہو گیا تھا۔ عاقل میں ابھی جان باقی تھی۔ میں نے ان دونوں پر ایک نظر ڈالی' پھر تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ہوٹل کے باہر بھی اچھا خاصا مجمع ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر لوگ سہم کر یوں ایک طرف ہٹ گئے جیسے انھوں نے ملک الموت کو دیکھ لیا ہو۔ آج کی طرح اس زمانے میں ماؤزر اور کلاشنکوف عام نہیں تھی۔ بڑے بڑے بدمعاش چاقو رکھا کرتے تھے۔ لوگ بھی اس قتل و غارت گری کے عادی نہیں تھے اس لیے میرے خون آلود ہاتھ اور کپڑے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔

میں ہوٹل سے نکلا اور بھاگتا ہوا اسی طرف نکل گیا جہاں میں جوگنگ کرتا تھا۔ آبادی سے کچھ فاصلے پر کسی کے کھیت تھے۔ کھیت کے مالک نے وہاں ہینڈ پمپ بھی لگا رکھا تھا۔ میں فوری طور پر اپنے ہاتھوں اور کپڑوں سے خون کے داغ مٹانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں اسی طرف جا رہا تھا۔

وہاں عموماً ایک ہی آدمی ہوتا تھا۔ وہ بھی زیادہ وقت کھیتوں کی بجائے اپنے گھر میں گزارتا تھا۔ میں جوگنگ کرتے ہوئے روزانہ ہی اس طرف سے گزرتا تھا' ہمیشہ کھیت مجھے خالی ہی ملتا تھا۔

میں اطمینان سے کھیت میں داخل ہوا۔ ہینڈ پمپ سے اپنے ہاتھ اور کپڑے دھوئے اور مطمئن ہو کر وہاں سے نکل آیا۔ کپڑوں کے داغ بالکل تو صاف نہیں ہوئے تھے' مگر اب وہ داغ اتنے واضح نہیں رہے تھے' کہ پولیس کا کوئی آدمی مجھے قاتل سمجھ کر گرفتار کر لے۔

مجھے یقین تھا کہ اب تک پولیس میری تلاش میں نکل پڑی ہو گی۔ کسی تھانے کی حدود میں قتل کی کوئی واردات کبھی کبھار ہی ہوا کرتی تھی' پھر یہ تو دہرے قتل کا کیس تھا۔ اس دور میں پولیس میں فرض شناس لوگ زیادہ ہوتے تھے۔ میں لوٹ کر آبادی کی طرف نہیں جا سکتا تھا' نہ لالی کے ڈیرے کا رخ کر سکتا تھا۔ پہلے کی بات اور تھی' مگر اب دہرے قتل کا مجرم تھا' اپنے ساتھ لالی کے باپ کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں آبادی کی مخالف سمت میں چلتا رہا۔

چلتے چلتے مجھے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ مار پیٹ میں میری گھڑی بھی گر گئی تھی اس لیے وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ میرے کپڑے سوکھ چکے تھے۔ اب مجھے تھکن اور

بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے گزشتہ رات بھی ہلکا پھلکا کھانا کھایا تھا' اور ناشتہ کرنے کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ میں نے نقدی کا جائزہ لینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے ایک اور دھچکا لگا۔ میں گھر سے نکلتے وقت اپنا پرس لینا بھی بھول گیا تھا۔ اس میں ابھی اتنی رقم تھی کہ میں مزید دو مہینے آرام سے گزارا کر سکتا تھا۔ میں گھبرا کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا' اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ دوسرے ہی لمحے سامنے والے موڑ سے بجری کا ایک ٹرک نمودار ہوا۔ آس پاس کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں میں چھپ سکتا۔ میں نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسی اثنا میں ٹرک مجھ تک آ پہنچا۔ مجھے دیکھ کر ڈرائیور نے بریک لگا دیئے۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کھڑکی میں سے منہ نکال کر پوچھا۔ "اوئے چھوکرا--- تم ادھر کیا کرتا ہے؟"

عین وقت پہ مجھے ایک بہانہ سوجھ گیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "خان صاحب! میرے دوست شرارت میں مجھے یہاں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ وہ مجھے اچھی طرح پریشان کرکے لوٹیں گے۔"

"تم جائے گا کدھر؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"ناظم آباد۔" میں نے جواب دیا۔ پھر عاجزی سے بولا۔ "خان صاحب! اگر آپ مجھے ناظم آباد تک چھوڑ دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"پیچھے چڑھ جاؤ' ہم تو ادھر نئی آبادی کی طرف جا رہا ہے۔" نئی آبادی کا مطلب تھا نارتھ ناظم آباد۔

وہ علاقہ نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ وہاں بھی اکا دکا مکان ہی تعمیر ہوئے تھے۔

میں لپک کر پیچھے سوار ہو گیا۔ جسے اب تک میں بجری کا ٹرک سمجھ رہا تھا۔ وہ دراصل سامان لانے لے جانے والا ٹرک تھا۔ پچھلے حصے میں تین افراد مجھ سے پہلے ہی موجود تھے۔ حلیوں سے وہ لوگ مزدور دکھائی دے رہے تھے۔ میرے سوار ہوتے ہی ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا روانہ ہو گیا۔ میں نے خود کو نہایت ہوشیاری اور غیر محسوس طریقے سے سامان کے پیچھے چھپا لیا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے مزدوروں نے مجھ پر سرسری نظر ڈالی' پھر اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

ایک گھنٹے بعد ٹرک نے مجھے نارتھ ناظم آباد چھوڑ دیا' میں وہاں سے پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ آج کل اس علاقے میں جتنی رونق اور گہما گہمی ہے' اس دور میں اتنی ہی ویرانی اور سناٹا تھا۔

بھاگ دوڑ سے مجھے شدید تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک کے مارے برا حال

تھا۔ وہیں ایک جھونپڑی ہوٹل میں لوگوں کو کھانا کھاتے دیکھ کر میری بھوک بھی چمک اٹھی۔ روٹی کی اشتہا انگیز مہک مجھے پاگل کیے دے رہی تھی، مگر میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا لوگوں کو کھانا کھاتے دیکھتا رہا، پھر دل پر جبر کرکے آگے بڑھ گیا۔

پھر میں بے مقصد چلتا ہی رہا۔ مجھے یہ ہوش نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں، اور کیوں جا رہا ہوں۔ اچانک میرے پاس سے گزرنے والی ایک کار کی رفتار سست ہوئی، اور وہ آگے جا کر رک گئی۔ میں نے اس پر توجہ بھی نہ دی۔ چونکا تو میں اسی وقت جب گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔ "کہاں جاؤ گے بیٹا؟"

ان کے اچانک اور غیر متوقع سوال سے میں گڑبڑا گیا اور بولا۔ "جی۔۔۔ وہ۔۔۔ میں ٹاور جاؤں گا۔" اس وقت نہ جانے کیوں میرے ذہن میں ٹاور کا نام آ گیا۔

"آؤ بیٹھ جاؤ، میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔" انھوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

میں ان کی اس پیشکش پر حیران تھا۔ آخر انھیں کیا ضرورت تھی مجھے لفٹ دینے کی؟ میں نے تو انھیں روکا بھی نہیں تھا۔ حلیے سے وہ صاحب مجھے معقول ہی لگ رہے تھے۔ میں اللہ کا نام لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

سارے راستے وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے، اور میں انھیں جھوٹے سچے جواب دے کر مطمئن کرتا رہا۔

ٹاور پہنچ کر انھوں نے مجھ سے کہا۔ "بس بیٹا، مجھے تو یہیں تک آنا تھا۔ تمھیں اگر زیادہ دور جانا ہو تو میں ڈراپ کر دوں؟"

"نہیں انکل!" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے بھی بس سامنے ہی جانا ہے۔" میں ان کا شکریہ ادا کرکے گاڑی سے اتر گیا۔

اب پھر وہی سوال تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ فوری نوعیت کا مسئلہ تو پیٹ بھرنا تھا۔ جس کے حل کی مجھے کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں بلامقصد واپس بولٹن مارکیٹ کی طرف چل دیا تھا۔

اچانک ایک ہوٹل کے سامنے مجھے بہت سے مفلوک الحال افراد دکھائی دیے۔ ان میں سے بیشتر پیشہ ور فقیر تھے۔ ان کی گفتگو سے مجھے علم ہوا کہ وہاں مفت کھانا بٹ رہا ہے۔ اکثر خدا ترس لوگ ہوٹل والے کو پیسے دیتے ہیں کہ بھوکوں کو کھانا کھلا دیا جائے۔

جونا مارکیٹ کے علاقے میں ایک صاحب سامان سے لدے پھندے گرتے پڑتے جا رہے تھے۔ میں نے ازراہ ہمدردی ان کا آدھے سے زیادہ سامان اٹھا لیا۔ انھوں نے سخت لہجے میں کہا۔ "سارا سامان اٹھانے کے پانچ روپے سے زیادہ نہیں دوں گا۔" میں نے حیرت

سے انھیں دیکھا' تو وہ جلدی سے بولے۔ "چلو تم چھے روپے لے لینا۔ تم شریف دکھائی دیتے ہو۔"

میں کوئی جواب دیے بغیر ان کے پیچھے چلتا رہا۔ گلی سے باہر کھٹارا سی ایک اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ سامان اس میں رکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر واپس چل دیے۔ وہ مجھے لیے ہوئے ایک دوکان پر پہنچے۔ دوکان پر چھوٹے بڑے مختلف تھیلوں کا ایک ڈھیر تھا۔ وہ صاحب دوکان دار تھے' اور اپنی ددکان کے لیے سامان خریدنے آئے تھے۔ دوکانوں کے آس پاس بہت سے مزدور کھڑے تھے۔ خان صاحب کا سامان دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے' اور ان کی دریا دلی بھی سمجھ میں آ گئی۔ چھ روپے اس دور میں خاصی معقول رقم تھی۔ دوسرے مزدوروں نے شاید زیادہ پیسے مانگے ہوں گے۔ نقاہت اور کمزوری سے مجھے چکر آ رہے تھے' مگر چھ روپے ملنے کی خوشی میں مجھے تھکن اور بھوک کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

ان کے سامان سے فارغ ہو کر میں سیدھا ہوٹل میں پہنچا اور خوب ڈٹ کر کھانا کھا کر جان میں جان آئی تو میرا ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ آدھے گھنٹے کی محنت سے میں نے چھے روپے کمائے تھے' جس میں سے ابھی چار روپے میری جیب میں موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ تھوڑی سی مزدوری اور کر لوں تاکہ کم از کم تین چار دن تک مجھے کھانے کی فکر نہ ہو۔ اس دوران میں آیندہ کے لیے کچھ سوچا جا سکتا تھا۔

میں ایک مرتبہ پھر دکانوں کے سامنے پہنچ گیا۔ ایک دوکان کے آگے موٹا سا ایک شخص ایک لڑکے سے سامان اٹھانے کی بات کر رہا تھا۔ اس کا سامان بہت کم تھا اور صرف ایک ہی دفعہ میں گاڑی تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ لڑکا اس سے پانچ روپے مانگ رہا تھا' اور وہ تین روپے دینے پر مصر تھا۔ اس کی تکرار سن کر میں نے کہا۔ "چلئے صاحب! میں اٹھاتا ہوں آپ کا سامان! تین روپے ہی دے دیں۔"

لڑکے نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا۔ اس کی پروا کیے بغیر میں نے سامان اٹھایا' اور روانہ ہو گیا' پیسے لے کر واپس آیا تو چار پانچ بدمعاش قسم کے لڑکے وہاں موجود تھے' ان میں وہ لڑکا بھی تھا' جو سامان اٹھانے کے پانچ روپے مانگ رہا تھا۔ وہ مجھے یوں گھور رہے تھے جیسے کچا چبا جائیں گے۔ ان میں سے ایک لڑکا آگے بڑھا' اور درشت لہجے میں بولا۔ کون ہے اوئے تو' اور ہماری مزدوری خراب کرنے یہاں کہاں سے آ مرا؟"

"میں تم لوگوں سے کچھ کہہ تو نہیں رہا ہوں۔ میری مرضی ہے کہ میں کسی کا سامان پیسے لے کے اٹھاؤں یا مفت میں۔" میں نے جواب دیا۔

"سالے' اب کسی کے سامان کو ہاتھ لگایا تو مار مار کے الو کا پٹھا بنا دوں گا۔"

گالی سن کر میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا' ورنہ میں اس کی اتنی پٹائی کرتا کہ اس ک حلیہ بگڑ جاتا' مگر فی الحال میں لڑائی جھگڑوں سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے مارپیٹ میر

بات پولیس، تھانے تک جا پہنچتی، پھر پولیس اطمینان سے مجھے گرفتار کرتی، اور دہرے قتل کے مقدمے میں پھانسی پر چڑھا دیتی۔ میں خاموشی کے ساتھ بازار سے باہر نکل گیا۔

کھانا میں نے خوب ڈٹ کر کھا لیا تھا، ابھی کچھ روپے باقی بھی تھے اس لیے مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو گا کراچی چھوڑ دوں گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ قتل، اور ڈکیتی کے مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی نگرانی کرتی ہے اس لیے میں فی الحال ریلوے اسٹیشن کا رخ نہیں کر رہا تھا۔ حالات سازگار ہونے تک میں نے مزدوری کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس زمانے میں گو کہ کراچی کی آبادی اب کے مقابلے میں بہت کم تھی، مگر اس کے باوجود صدر اور دوسرے مصروف علاقوں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔

اپنا حلیہ بدلنے کی خاطر میں نے فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہوئے ایک نائی سے سر منڈوا لیا۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر مجھے خود ہی ہنسی آ گئی۔ میرے کپڑے بھی میلے ہو رہے تھے۔ میں نے شرٹ بھی پینٹ سے باہر نکال لی۔ میرا حلیہ اب اس حد تک بدل گیا تھا کہ پہلی نظر میں مجھے کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔

شام آہستہ آہستہ رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں ٹہلتا ہوا صدر کی طرف آ گیا۔ جوں جوں اندھیرا پھیل رہا تھا، میری فکر، اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ دن تو میں نے کسی طور گزار دیا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ

ابھی تو دن کی تھکن سے نڈھال ہیں یارو
کھڑی ہے منزل شب سر پہ آزمانے کو!

ریگل پہنچ کر میں بس اسٹاپ کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا، اور کن میلیے کو لوگوں کے کان صاف کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے سر پر کپڑے کی کشتی نما ٹوپی منڈھ رکھی تھی۔ اس ٹوپی میں مختلف سائز کی تیلیاں اٹکی ہوئی تھیں۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ لوگ اس سے کان بھی صاف کرا رہے تھے، اور وہ نہ جانے کیسے ان کے کانوں سے میل نکال رہا تھا۔

میں نہ جانے کتنی دیر تک حیرت اور دلچسپی سے اس منظر کو دیکھتا رہا۔

پھر آہستہ آہستہ ریگل کا علاقہ بھی ویران ہونے لگا۔ مزید آدھے گھنٹے بعد وہ کن میلیا بھی رخصت ہو گیا۔ اچانک اس پر رونق علاقے میں ہو کا عالم طاری ہو گیا۔ میں گھبرا کر بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے مقصد ایک طرف چل دیا۔ وہاں جگہ جگہ لوگ فٹ پاتھ پر بھی سو رہے تھے، اور دکانوں کے چبوتروں پر بھی۔ میں کسی ایسی ہی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا

جہاں رات گزاری جا سکے۔

کچھ اور آگے بڑھا تو خاصی گہما گہمی دکھائی دی۔ وہاں خاصی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ کوئی نائٹ کلب تھا۔ اس وقت میرے ذہن سے اس کا نام نکل گیا ہے۔ کلب کے سامنے کے حصے میں تو خوب رونق تھی، مگر آس پاس بالکل سناٹا تھا۔

اچانک میں ٹھٹک گیا۔ کلب میں سے چھوٹے قد اور گٹھیلے جسم کا ایک آدمی دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک بریف کیس تھا۔ لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنی میں مجھے اس کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ پاکستانی نہیں تھا، شاید مشرق وسطیٰ کے کسی ملک کا باشندہ تھا۔ مجھے اتنی پہچان نہیں تھی کہ محض اس کا چہرہ دیکھ کر اس کی قومیت کا اندازہ لگا لیتا۔

ہوٹل سے اس جیسی قدوقامت کے تین آدمی بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے لپکے۔ بریف کیس والا انھیں دیکھ کر بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے ایک گاڑی کی اوٹ سے دو آدمی مزید نکلے، اور بریف کیس والے کا رستہ روک لیا۔ ان کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے۔ پھر وہ سب بریف کیس والے پر ٹوٹ پڑے۔ بریف کیس والے کی پھرتی دیکھ کر میں اش اش کر اٹھا۔ اس نے بجلی کی سی پھرتی سے ہاتھ چلائے اور ان میں سے دو کو ناکارہ کر دیا۔ مگر حملہ آور بھی کم پھرتیلے نہیں تھے۔ بریف کیس بردار اور اس کے حملہ آور دونوں ہی بہترین کراٹے فائٹر تھے۔ میں نے کراٹے کا صرف نام ہی سنا تھا، دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں عام آدمی تو کراٹے کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ انگریزی اور اردو فلموں کے ہیرو بھی کراٹے کی بجائے ریوالور استعمال کرتے تھے۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے بریف کیس والا مغلوب ہو رہا ہو۔ اب اس میں وہ پہلی سی پھرتی بھی نہیں رہی تھی، مجھے نہ جانے کیوں اس کے ساتھ ہمدردی سی ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اکیلا جی داری سے پانچ آدمیوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی، کہ وہ سب بہت خاموشی سے لڑ رہے تھے ورنہ وہ کلب سے اتنی دور نہیں تھے کہ کوئی ان کی آواز سن پاتا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے حملہ آور اس سے وہ بریف کیس چھیننا چاہتے ہوں۔ آخر ان میں سے ایک بریف کیس چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بریف کیس لے کر برق رفتاری سے اس طرف بھاگا جہاں میں کھڑا تھا۔ وہ جونہی نزدیک پہنچا میں نے غیر ارادی طور پر پاؤں اڑا کے اسے گرا دیا۔ وہ اتنی رفتار سے بھاگ رہا تھا کہ گرنے کے بعد کافی دور تک گھسٹتا چلا

گیا۔ بریف کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ بریف کیس تک پہنچتا میں نے زقند بھری' اور بریف کیس اٹھاتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

گرنے والا بھی پھرتی سے کھڑا ہو گیا' اور اس کے بقیہ ساتھی بھی وہاں آ پہنچے۔ بریف کیس والے نے جن دو آدمیوں کو شروع ہی میں ناک آؤٹ کر دیا تھا وہ بھی اس وقت تک سنبھل چکے تھے۔ وہ سب میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے' مگر ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ ان کے سامنے ایک ماہر جمناسٹ کھڑا تھا۔ میں نے پنجوں پر اپنے جسم کو تولا اور اچھل کر ان کے حصار سے باہر نکل گیا' اگر مجھے بریف کیس کے مالک کا خیال نہ ہوتا' تو وہ لوگ اب میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے' مگر میں اسے چھوڑ کر بھاگنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بیچارا شاید بہت بری طرح زخمی ہو چکا تھا ورنہ یوں خاموشی سے ایک طرف نہ پڑا رہتا۔

وہ سب ایک مرتبہ پھر میری طرف لپکے۔ میں نے اس محدود علاقے میں انھیں تین چار چکر دیے۔ اب وہ سبھی بری طرح ہانپ رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک کے چہرے پر میں نے پوری قوت سے بریف کیس مار دیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ چکرا کر گر گیا' میں نے دوسرے آدمی کا بھی یہی حشر کیا' پھر تو میرے بدن میں برق سی دوڑنے لگی۔ میں نے اتنی تیزی سے حرکت کی کہ وہ سٹ پٹا گئے۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں دائرے بناتے ہوئے بھرپور لات مار کے ایک اور آدمی کو ناکارہ کر دیا۔ بقیہ دو شاید وہ تھے جو بریف کیس والے سے پٹ چکے تھے۔ وہ دونوں مقابلہ کیے بغیر ہی فرار ہو گئے۔

میں لپک کر بریف کیس والے کے پاس پہنچا۔ وہ ہوش میں تھا۔ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس نے انگلش میں کہا۔ "پارکنگ لاٹ میں میری گاڑی موجود ہے۔ مجھے سہارا دے کر وہاں تک لے چلو' ان ذلیلوں نے چاقو سے میرا دایاں شانہ ادھیڑ دیا ہے۔ اس جگہ پہلے بھی خاصا گہرا زخم تھا اس لیے میں ان سے مار کھا گیا ورنہ یوں آسانی سے ان کے قابو میں نہ آتا۔"

میں نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور پارکنگ لاٹ کی طرف لے چلا۔ کلب کے سامنے تو خاصی روشنی تھی' مگر پارکنگ لاٹ میں اندھیرا تھا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ فرار ہونے والے حملہ آور یہاں ہماری گھات میں نہ بیٹھے ہوں۔ بریف کیس والا سیاہ رنگ کی ایک سیڈون کے پاس جا کھڑا ہوا اور نحیف لہجے میں بولا۔ "مجھ سے ڈرائیونگ نہ ہو سکے گی۔ تم گاڑی چلا لو گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔"

"خیر میں خود ہی کوشش کرتا ہوں۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اگر تمہیں تکلف نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔"

بریف کیس اب بھی میرے ہی ہاتھ میں تھا۔ میں کوئی جواب دیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ گو کہ گاڑی میں اندھیرا تھا اور مجھے اس کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر اس کے تیز تیز سانسوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شدید تکلیف میں ہے۔ میں نے سوچ لیا کہ اب موقع ملتے ہی ڈرائیونگ بھی سیکھوں گا۔ میں نے اس کا دھیان تکلیف سے ہٹانے کے لیے کہا۔ "یہ لوگ آخر آپ کے دشمن کیوں ہو رہے تھے؟" یہ جملہ میں نے انگریزی میں ادا کیا تھا۔ میری انگریزی ایسی نہیں تھی کہ میں بے تکان بول سکتا اس لیے بولنے سے پہلے مجھے الفاظ جمع کرنا پڑے تھے۔

"لمبی کہانی ہے۔" اس نے طویل سانس لیا۔ "اگر زندہ رہا تو تمہیں ضرور سناؤں گا۔" اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

"ابھی کتنی دور جانا ہے ہمیں؟" میں نے پوچھا۔ مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ گاڑی کا رخ کس سمت میں ہے۔

"بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک وسیع و عریض بنگلے کے آہنی گیٹ کے سامنے رک گئی۔ اس نے مخصوص انداز میں تین دفعہ ہارن بجایا تو گیٹ کھل گیا۔ اندر سے کتوں کی غراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ گاڑی پورچ میں روک کر اس نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا تو میں گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔ مجھے خوف تھا کہ نیچے اترتے ہی وہ خوف ناک کتے بھنبھوڑ ڈالیں گے جنھیں گاڑی کے ہیڈ لیمپ کی روشنی میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس لیے گاڑی کا اندرونی بلب روشن ہو گیا تھا۔ مجھے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر وہ مسکرا کر بولا۔ "تم میرے ساتھ ہو اس لیے یہ کتے تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ چلو اب اترو جلدی سے۔"

میں نے دروازہ کھول کر ڈرتے ڈرتے نیچے قدم رکھا۔ اس وقت تک پورچ میں دو افراد پہنچ گئے تھے۔ حلیے سے وہ ملازم دکھائی دے رہے تھے۔ میرے ساتھ آنے والے کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر وہ دونوں اسے سہارے دینے کو لپکے، مگر اس نے انھیں روک دیا، اور کسی غیر مانوس زبان میں گفتگو کرنے لگا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ بھی اسی کے ہم وطن تھے۔

میں نے دیکھا' کتے اسے دیکھ کے حیرت انگیز طور پر پرسکون ہو گئے تھے۔ میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ "اب مجھے اجازت دیں۔ آپ اپنے لوگوں میں پہنچ گئے ہیں۔"

اس نے چلتے چلتے چونک کر مجھے دیکھا' پھر بولا۔ "چلے جانا کیا اسی وقت تمہارا جانا ضروری ہے؟"

"ضروری تو نہیں ہے مگر۔"

"بس تو پھر رات یہاں گزارو۔ صبح چلے جانا۔"

میں تو یوں بھی بے گھر تھا اس لیے مجھے بھلا اس بات پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے ایک بیڈ روم میں داخل ہوا۔ اس نے وہ بریف کیس بیڈ روم کے ایک دیوار گیر سیف میں رکھا' اور ایک ملازم کو طلب کرکے اسے کچھ ہدایات دیں۔ بیڈ روم کی تیز روشنی میں پہلی دفعہ میں نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ اس کا قد درمیانے سے کچھ چھوٹا تھا' مگر جسم کسرتی تھا' عمر تیس اور چالیس کے درمیان کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے کوٹ کی ایک آستین خون میں تر تھی۔ اس وقت بھی شاید اس کے زخم سے خون رس رہا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے بے پروائی سے کہا۔ "میری ایک ملازمہ تربیت یافتہ نرس ہے۔ وہ ابھی مرہم پٹی کر دے گی۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "میرا نام وانگ یو ہے' آبائی وطن کوریا ہے' مگر میں نے عمر کا بیشتر حصہ ہانگ کانگ میں گزارا ہے۔ انگلش کے ساتھ ساتھ فرنچ اور جرمن بھی آتی ہے۔ میرے خیال میں اتنا تعارف کافی ہے۔"

○

اسی وقت بوٹے سے قد کی ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر بلا کی کشش تھی۔ دوسری کورین لڑکیوں کے برعکس اس کی رنگت سرخ و سفید تھی۔ اس نے سر جھکا کر وانگ کو سلام کیا' پھر اس کا زخم دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ وانگ کے شانے پر خاصا گہرا زخم تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پرانا زخم تھا۔ میں حیرت سے وانگ یو کے گٹھے ہوئے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے اس کے زخموں کا جائزہ لیا' پھر مسکرا کر کچھ بولی۔ جواب میں وانگ نے انگلش میں کہا۔ "چیکو! انگلش میں بات کرو' میرا مہمان بور ہو رہا ہے۔" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ "یہ خرم ہے اس کی بدولت اس وقت میں زندہ دکھائی دے رہا ہوں۔"

لڑکی نے حیرت زدہ ہو کر مجھے دیکھا' شاید اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ مجھ ایسا نوعمر لڑکا وانگ کی جان بھی بچا سکتا ہے۔

"خرم!" وانگ نے کہا۔ "میری پی اے" مس چیکو' مگر انھیں بھی کورین مت سمجھ لینا۔ ان کا تعلق جاپان سے ہے۔

لڑکی نے بہت ادا سے سر جھکا کر مجھے سلام کیا' پھر انگلش میں بولی۔ آپ پاکستانی ہیں؟" میرا تو خیال تھا کہ آپ کا تعلق ترکی یا ایران سے ہے۔"

"چلیے حساب برابر ہو گیا۔" میں مسکرا کر بولا۔ "میں بھی آپ کو کورین سمجھ رہا تھا۔"

"چیکو!" وانگ نے مرہم پٹی سے فارغ ہونے کے بعد کہا۔ "خرم کے لیے کھانا بھجوا دو' مگر پہلے اس کے لیے معقول لباس کا بندوبست کرو۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔"

میں تقریباً بیس منٹ تک گرم پانی سے نہاتا رہا۔ وانگ نے باتھ روم میں ایک سلیپنگ سوٹ پہلے ہی رکھوا دیا تھا۔ نہا دھو کر میں نے وہ سلیپنگ سوٹ پہن لیا۔ وہ لمبائی میں تو چھوٹا تھا' مگر چوڑائی میں خاصا بڑا تھا۔

"ہاں خرم! اب بتاؤ تم کس سے خوف زدہ ہو؟" کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے

وانگ نے مجھ سے پوچھا۔
میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ کہیں وانگ کا تعلق خفیہ پولیس سے تو نہیں ہے۔
مجھے حیران دیکھ کر اس نے کہا۔ "پریشان مت ہو۔ اس کا اندازہ تو مجھے تمہارے چہرے سے ہو گیا تھا کہ تم کسی سے خوف زدہ ہو۔ تم نے آج ہی سر بھی منڈوایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے حلیہ بدلنے کی کوشش کی ہے۔ تم جیسا پڑھا لکھا اور اسمارٹ نوجوان بلا سبب تو گنجا نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو۔"
پھر میں نے اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ نہ جانے کیوں اس پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا تھا' یہ خیال بھی تھا کہ وانگ یو ان حالات میں میری مدد کر سکتا ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اسے ہر بات بتا دی پھر مسکرا کر بولا۔ "ویسے آپ نے بہت چالاکی سے خود کو بچا لیا۔ اپنے متعلق تو آپ نے کچھ بھی نہیں بتایا۔"
وانگ اچانک سنجیدہ ہو گیا' اور خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ شاید وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھ پر اعتماد کرے یا نہ کرے۔ پھر وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "خرم! تم اچھے لڑکے ہو اس لیے میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا مگر میری ایک خواہش ہے' تم ہمیشہ کے لیے میرے پاس رہو۔"
"میری وجہ سے آپ بھی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ شاید ابھی تک آپ کا واسطہ ہماری پولیس سے نہیں پڑا ہے۔"
وہ زور سے ہنسا' پھر بولا۔ پاکستانی پولیس! میں اسے خاطر میں نہیں لاتا۔ پولیس سے تو میری شروع ہی سے آنکھ مچولی رہی ہے۔ میں نے تقریباً دنیا کے ہر ملک کی پولیس دیکھی ہے۔"
"کیا مطلب؟" میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔
پھر وانگ نے مجھے بتایا کہ میں کوریا میں پیدا ہوا۔ میرا بچپن اور لڑکپن کوریا ہی میں گزرا۔ وہ دور میری زندگی کا بھیانک خواب ہے۔ میرا باپ مر چکا تھا' اور ماں کسی کے کھیتوں میں کام کرتی تھی۔ کہنے کو میں اکلوتا تھا' مگر اکثر مجھے پورا پورا دن بھوکا رہنا پڑتا تھا۔ ماں بیچاری جو کچھ کماتی اتنا ناکافی ہوتا تھا کہ ہم ماں بیٹے کا پیٹ بھی نہیں بھرتا تھا۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ان دنوں میری عمر دس گیارہ سال ہو گی۔ بھوک اور افلاس نے مجھے تند خو اور جھگڑالو بنا دیا تھا۔ ماں تو کام پر جا چکی تھی۔ میں حسب معمول محلے کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے میری لڑائی محلے کے ایک لڑکے سے ہو گئی۔ وہ نہ صرف عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا بلکہ خاصا صحت مند بھی تھا۔ محلے کا ہر لڑکا اس سے ڈرتا تھا۔ وہ گویا ایک طرح سے بچوں کا بدمعاش تھا۔ اس دن اس نے مجھے گالی

دی تو میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے پیٹ میں بھرپور لات رسید کر دی۔ پھر تو وہاں میدان کارزار گرم ہو گیا۔ محلے کے لڑکے کونوں میں دبک گئے۔ ظاہر ہے اس لڑائی میں نقصان میرا ہی زیادہ ہوا۔ میرا چہرہ خون میں تر تھا' مگر میں ہار ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے بھی شاید طے کر لیا تھا کہ مجھے جان سے مار کے دم لے گا۔ اس کے ایک بھرپور گھونسے نے میں اوندھے منہ زمین پر گرا تو مجھے بڑا سا ایک پتھر نظر آ گیا۔ میں نے پتھر اٹھایا اور اندازے سے اس کی طرف اچھال دیا۔ اندازے سے اس لیے کہ سر سے بہنے والا خون میری آنکھوں میں بھی چلا گیا تھا' اور میں وقتی طور پر نابینا ہو گیا تھا۔

مجھے اس کی اذیت ناک چیخ سنائی دی تو میں نے اپنی قمیص کی آستین سے جلدی جلدی آنکھیں صاف کیں۔ میرا حریف اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ پتھر شاید اس کے سر میں لگا تھا' کیوں کہ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے پے در پے اس کے سر پر کئی لاتیں جما دیں۔ پھر تو گویا مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔ اس کے چہرے اور جسم پر میں نے اتنی لاتیں ماری کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔ پھر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس لحیم شحیم لڑکے نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

اچانک ایک دبلا پتلا' لمبا سا آدمی میرے سامنے آ کھڑا ہوا' اور میری پیٹھ ٹھونک کر بولا۔ "شاباش! تم واقعی بہادر ہو' مگر اب یہاں سے بھاگ چلو ورنہ پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔ تم نے اسے شدید زخمی کر دیا۔ بھاگ جاؤ' ممکن ہے یہ سر کی چوٹ سے مر ہی جائے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ بھاگ کر کہا جاؤں؟

اس نے شاید میرے خیالات پڑھ لیے وہ جلدی سے بولا۔ "آؤ میرے ساتھ!"

میں اس وقت اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ میں نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے جائے گا۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس شخص نے ہر طرح سے میرا خیال رکھا۔ اس نے میری ماں سے کہا کہ اب وانگ میرے پاس رہے گا۔ میری ماں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو خود چاہتی تھی کہ مجھے بہتر مستقبل مل سکے۔ اس شخص نے نہ صرف مجھے تعلیم دلائی بلکہ مجھے مارشل آرٹ کی تربیت بھی دی۔ اس کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ میں نے مارشل آرٹ میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

پھر وہ مجھے اپنے ساتھ ہانگ کانگ لے گیا۔ اس وقت تک میری عمر سولہ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرا استاد کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث ہے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ میرا استاد ایک ملک کے فوجی راز چرا کر دوسرے ملک کو منہ مانگے داموں فروخت کرتا تھا۔ اس خرید و فروخت میں وہ کسی اصول یا ضابطے کا پابند نہیں تھا۔ اسے کسی ملک سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اسے صرف اور صرف

دولت کی خواہش تھی۔ اس نے جرمنوں کے راز اتحادیوں کو فروخت کیے اور اتحادیوں کے راز جرمنوں کو! آخر دونوں فریقوں کو علم ہو گیا کہ انھیں ڈبل کراس کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد سے میرے استاد کے پیچھے امریکن سی آئی اے کے ساتھ ساتھ اسکاٹ لینڈ یارڈ جرمنی کے نازی پڑ گئے۔ پھر وہ نازیوں ہی کے ہاتھوں مارا گیا۔

وانگ خاموش ہو کر فضا میں یوں تکنے لگا جیسے وہاں ابھی تک ماضی کی فلم چل رہی ہو۔ میں بھی کافی دیر تک خاموش رہا' پھر میں نے ہی اس سناٹے کو توڑا اور کھنکار کر بولا۔

"رات آپ پر حملہ کن لوگوں نے کیا تھا؟"

وانگ مسکرا کر بولا۔ "میرے استاد نے مرنے سے پہلے کچھ اہم دستاویزات میرے حوالے کی تھیں۔ وہ آج بھی اتنی ہی اہم ہیں کہ امریکن سی آئی اے' سوویت یونین کے جی بی اور اسرائیل کی موساد اس کے لیے پاگل ہو رہی ہیں۔ میں نے ان دستاویزات کو مائیکرو فلمز میں محسوس کر لیا ہے۔ ہر ملک مجھے ان کے عوض کروڑوں ڈالر ادا کرنے کو تیار ہے' مجھے خود بھی آج کل رقم کی شدید ضرورت ہے اس لیے میں نے ان دستاویزات کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے زیادہ آفر سی آئی اے کی طرف سے تھی۔ میں نے ان کے ایجنٹ سے رابطہ قائم کیا' اور اسے درمیانے درجے کے ایک کلب میں ملنے کو کہا۔ وہیں اس سے سارے معاملات طے پائے۔ آج مجھے وہ دستاویز سی آئی اے کے حوالے کرنا تھیں' مگر یہ خبر دوسری ایجنسیوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس سے پہلے کہ میں سی آئی اے کے ایجنٹ سے ملتا' دوسروں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ بعد کے واقعات تو تمہارے علم میں ہیں۔"

"مگر وہ لوگ شاید آپ ہی کے ہم وطن تھے!" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے' مجھے قابو میں کرنے کے لیے کوئی ایسا شخص ہی درکار ہو گا جو میری خوبیوں اور خامیوں کو جانتا ہو۔ میری طرح استاد کے کئی اور شاگرد بھی تھے انھی میں سے کوئی میرے پیچھے ہے۔"

"مگر آپ یہاں پاکستان میں کیا کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں بہ ظاہر تو میں اعلیٰ نسل کے کتوں کو ٹرینڈ کرتا ہوں' مگر درحقیقت میں اسلحے کا بیوپاری ہوں۔" اس کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی؟" ایک بات یاد رکھنا خرم! میں نے تم پر اعتماد کر کے سب کچھ تمہیں بتا دیا ہے۔ میرے اعتماد کو ٹھیس مت پہنچانا۔"

"میں مر تو سکتا ہوں مگر عہد شکنی نہیں کر سکتا۔ میرے زبان سے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"صبح ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہے۔" وانگ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ اب تم آرام کرو میں بھی ذرا کمر سیدھی کر لوں۔ وانگ یو اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے ایک

دوسرے بیڈ روم میں پہنچایا اور خود بھی سونے چلا گیا۔

○

میں بستر پر لیٹا ہوا اپنی زندگی پر غور کرتا رہا۔ میں تو ایسا تیرہ بخت تھا کہ محبت مجھے راس ہی نہیں آتی تھی۔ وقت جب بھی مجھ پہ مہربان ہوتا' تقدیر کوئی ایسا وار کرتی کہ میں تلملا کر رہ جاتا۔ میں نے تو شرافت سے زندگی گزارنا چاہی تھی' مگر شاید میرے مقدر میں ایسا نہیں تھا اس لیے کوئی غیبی طاقت گھما پھرا کر مجھے ایسے دوراہے پر لے جاتی تھی' جہاں شرافت کا گزر مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ پھر میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں گا۔ یوں ہے تو پھر یونہی سہی! یہی سب کچھ سوچتا ہوا میں سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ وانگ یو غائب تھا البتہ اس کی خوب صورت سیکریٹری چیکو موجود تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "مسٹر خرم! وارڈ روب میں آپ کے لیے کپڑے موجود ہیں۔ میں نے ان کپڑوں کا بہت جلدی میں انتظام کیا ہے۔"

دوپہر کا وقت ہو رہا تھا اس لیے میں نے ناشتا اور کھانا ایک ساتھ ہی کھایا' پھر اخبار لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم نے مجھے اطلاع دی کہ صاحب آ گئے ہیں اور آپ کو ڈرائنگ روم میں بلوا رہے ہیں۔

میں اٹھ کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ وانگ یو کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وانگ نے کہا۔ "یہ خرم ہے' اور خرم یہ میرے دوست رحیم اور اقبال ہیں۔ میں نے تمہیں خاص طور پہ ان سے ملانے کو بلایا تھا۔ یہ دونوں اپنے تئیں ماہر جمناسٹ ہیں مگر یہ تسلیم نہیں کرتے کہ کوئی جمناسٹ ہوا میں دائرے بھی بنا سکتا ہے۔"

میں نے دیکھا وانگ کی اس بات سے ان دونوں کے چہروں پر عجیب طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ دونوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا' پھر اقبال نے ہنس کر کہا۔ "خرم میاں! اچھل کود کرنا اور بات ہے' اور جمناسٹک بالکل مختلف چیز ہے۔ ہم لوگ پچھلے پچیس سال سے اس فیلڈ میں ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ اب سے پانچ سال پہلے تک ہم نے ترکی کے ایک معروف سرکس میں کام بھی کیا ہے۔ پروفیشن اور شوقیہ جمناسٹک میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

"ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو' میں خود بھی ابھی خود کو کسی قابل نہیں سمجھتا۔ آپ پچھلے پچیس سال سے اس فیلڈ میں ہیں تو یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہوں گے' مگر یہ بات صحیح ہے کہ میں ہوا میں اپنے جسم سے دائرے بنا سکتا ہوں۔"

"گھوڑا دور ہے نہ میدان' کہو تو ابھی جمناسٹک کا مظاہرہ ہو جائے۔"

"دیکھیے میں یہاں کسی قسم کا کوئی مظاہرہ کرنے نہیں آیا۔ اگر آپ کو اس بات پر

یقین نہیں ہے تو نہ سہی۔" میں اس بات پر کچھ جھنجلا سا گیا تھا۔ "نہ ہی جمناسٹک میں مہارت کا دعویٰ کیا ہے میں نے۔"

"برا مت مانو یار!" رحیم نے کہا۔ "وانگ نے تم سے باتیں ہی اس قسم کی منسوب کی تھیں کہ ہمیں ہنسی آ رہی تھی۔"

میں نے وانگ کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ شرمندہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک میں نے اقبال سے کہا۔ "آپ کوئی ایسا کرتب ضرور جانتے ہوں گے جو کوئی دوسرا نہ کر سکے۔" میرا لہجہ چیلنج کرنے والا تھا۔

میرا لہجہ شاید اسے گراں گزرا تھا۔ وہ بھنا کر بولا۔ "میں لوہے کے گولوں پر دوڑ سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" وانگ نے مداخلت کی۔ "خرم بھی تمہاری طرح لوہے کے گولوں پر چل کر دکھائے گا۔ پھر تم لوگوں کو بھی وہی کرتب دکھانا ہو گا جو بعد میں خرم دکھائے گا ورنہ اپنی ہار تسلیم کر لینا' منظور؟"

ان دونوں ہی نے تحقیر آمیز انداز میں مجھے دیکھا اور رضا مندی کا اظہار کر دیا۔

وانگ نے اسی وقت نہ جانے کہاں سے لوہے کے دو گولے منگوا لیے۔ ان کا حجم کرکٹ کے بال جتنا تھا۔ میں نے پہلے اقبال کو گولوں پر چلنے کا اشارہ کیا۔

اقبال نے جوتے اتارے' احتیاط سے گولوں پر کھڑے ہو کر اپنا توازن کیا اور دوسرے ہی لمحے وہ سارے کمرے میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ کمرے کے فرش پر قالین تھا نہ کوئی فرنیچر! اقبال کو اس لیے ذرا بھی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ بلاشبہ وہ اپنے فن میں ماہر تھا' مگر یہ وہ کام تھا جو ماما نے مجھے ابتدائی زمانے میں سکھا دیا تھا۔ تقریباً دس منٹ تک کمرے میں تھرکنے کے بعد اقبال اچھل کے گولوں سے اتر گیا۔ وہ میری طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو' یہ کام بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ رحیم اور اقبال دونوں ہی تمسخرانہ انداز میں مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ وانگ کچھ شرمندہ سا تھا' شاید اسے امید نہیں تھی کہ میں وہ کرتب دکھا سکوں گا۔

میں آگے بڑھا' لوہے کے دونوں گولے فرش سے اٹھا کر انہیں برابر رکھا اور اقبال سے کہا۔ "ننگے پیر تو یہ کرتب بچے بھی دکھا لیتے ہیں بات تو جب ہے جب اسے جوتوں سمیت دکھایا جائے۔ اس وقت میرے پیروں میں چمڑے کے جوتے تھے۔ ان کی ہیل اس کرتب میں سب سے بڑی رکاوٹ بن سکتی تھی۔ میں نے گولوں پر پاؤں رکھ کر جسم کو تولا اور جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے اسکیٹنگ کے انداز میں انتہائی تیز رفتاری سے کمرے کے دو چکر لگائے' پھر رحیم اور اقبال کے گرد دائرے میں گھومتا ہوا بولا۔ "اب میں صرف ایک گولے پر حرکت کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے بایاں پیر اٹھا لیا۔ بائیں پیر کا گولا لڑھکتا

ہوا سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔

اب میں صرف ایک گولے پر گردش کر رہا تھا۔ میں نے اسی حالت میں رحیم اور اقبال کے گرد دائرے لگائے۔ پھر اسی پاؤں پر رقاصوں کی طرح گھومنے لگا۔ پھر مزید دو چکر لگا کر میں تیرتا ہوا دوسرے گولے تک پہنچا اور بایاں پاؤں گولے پر رکھ کر دایاں پاؤں ایک دم اٹھا لیا۔ جو لوگ یہ کرتب کرتے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ گولوں پہ دوڑتے ہوئے ایسا کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے مزید ایک چکر بائیں پاؤں پر لگایا اور اقبال کے عین سامنے جا ٹھہرا۔

پہلے تو وہ حیرت سے مجھے دیکھتا رہا' پھر بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "یار خرم! تم تو واقعی کسی پیشہ ور فن کار کی طرح اپنے فن میں ماہر ہو۔" پھر وہ وانگ سے انگریزی میں مخاطب ہوا۔ "یہ لڑکا ہیرا ہے وانگ' اسے مزید چمکانا تمہارا کام ہے اب مجھے یقین آ گیا کہ یہ جمناسٹک کے دوسرے کرتب بھی دکھا سکتا ہے۔ میرا ایک مشورہ ہے وانگ!" اقبال خاموش ہو کر وانگ کو دیکھنے لگا۔ "اگر تم اسے مارشل آرٹ سکھا دو تو یہ لڑکا دو دھاری تلوار بن جائے گا۔ پھر اس نے مجھ سے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا' اور رحیم کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ رحیم نے مجھ سے' اور وانگ سے مصافحہ کیا تھا' مگر اس کے انداز میں وہ گرم جوشی نہیں تھی۔ میرے لیے اس کی آنکھوں میں اب بھی حقارت تھی' یا ممکن ہے کہ یہ میرا وہم ہو۔ بہت سے لوگوں کی آنکھیں ہوتی ہی ایسی حریص ہیں۔

ان دونوں کے جانے کے بعد وانگ نے مجھ سے کہا۔ "یہ دونوں ایک زمانے میں سرکس میں ملازمت کرتے تھے۔ آج کل یہ دونوں کسی اور ہی دھندے میں ملوث ہیں۔ بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں تمہیں مارشل آرٹ بھی سکھاؤں گا' مگر اس میں محنت ہو گی۔ کیا تم اتنی جان توڑ محنت کر سکو گے۔؟"

"جب ماما نے جمناسٹک کی تربیت دی تھی تو انھوں نے بھی اسی قسم کے سوالات کیے تھے۔" میں مسکرا کر بولا۔ "میں محنت سے نہیں گھبراتا۔"

پھر تیسرے ہی دن وانگ کی نگرانی میں میری تربیت کا آغاز ہو گیا۔ اس نے پہلے میرے ہاتھوں کو مضبوط کرنے کے لیے صرف ہاتھوں کی ایکسرسائز کرائی' مگر جوں جوں تربیت بڑھتی گئی' سختیاں بھی بڑھنے لگیں۔ بعض اوقات وانگ رات کے تین بجے پانی کی بھری ہوئی بالٹی الٹ کر مجھے بیدار کرتا' پھر تربیت شروع ہو جاتی' کبھی وہ مجھے چھت کے کنڈے کے ساتھ الٹا لٹکا دیتا۔ میں کسی قسم کا احتجاج کیے بغیر کافی دیر اسی طرح لٹکا رہتا۔ صبح سویرے جوگنگ کرنا میرے لیے تھا ہی ضروری' میری عادت بھی تھی' مگر وانگ یو ذرا مختلف طریقے سے جوگنگ کراتا تھا۔ وہ اگر دو میل کی جوگنگ پیروں پر کراتا تو اتنا ہی فاصلہ ہاتھوں پر طے کرواتا۔ وہ میری دونوں ٹانگیں پیچھے سے پکڑ لیتا' اور مجھے ہاتھوں کے بل بھاگنے

ار کرتا۔ ابتدا میں مجھے بہت تکلیف ہوئی' میری ہتھیلیوں کی کھال ادھڑ گئی' مگر وانگ یو
۔ مجھے ایک دن کی بھی رعایت نہ دی۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار ورزشیں تھیں' پھر شام
سو ئمنگ بھی اتنی ہی ضروری تھی۔ اکثر جھنجلا کر کہتا کہ تم بنیادی طور پہ کتوں کے ٹرینز
اس لیے مجھے بھی کتا ہی سمجھتے ہو۔ وہ مسکرا کر جواب دیتا۔ "تم بھلا کتوں کی برابری کہاں
ر سکتے ہو۔ کتا اٹھارہ گھنٹے محنت کرنے کے باوجود بھی جھنجلاتا نہیں ہے۔"

○

دن اسی طرح گزرتے رہے۔ وانگ یو شاید کسی خاص بات کے انتظار میں تھا۔ اس
ران میں نے اسے کہیں آتے جاتے بھی نہیں دیکھا۔ البتہ اس نے اپنے محافظوں اور
ک ناک کتوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا اس لیے میں
نے بھی اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

چھ مہینے بعد نہ صرف مارشل آرٹ کافی حد تک سیکھ چکا تھا بلکہ میرا کمزور جسم بھی
اد بن چکا تھا۔ خاص طور پر میرے بازو تو اتنے مضبوط ہو گئے تھے کہ اگر میں کسی مضبوط
ڑے کے وار کو اپنی کلائی پر روکتا تو ڈنڈا ہی ٹوٹتا۔ اب میرے سر پر بھی گھنے سیاہ بال تھے
ر اچھی خوراک کے باعث میرے چہرے پر خوب تروتازگی تھی' اس کا احساس اکثر مجھے
ئینے کے سامنے ہوتا تھا۔

وانگ نے مجھے باہر جانے کی اجازت بھی دے دی تھی' مگر وانگ کے دو محافظ سائے
ی طرح میرے ساتھ رہتے تھے۔ وہ دونوں بھی مجھ سے برائے نام گفتگو کرتے تھے۔ شاید وہ
نگلش سے نابلد تھے' یا پھر وہ وانگ یو کی ہدایت پر زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ وانگ یو
رے لیے روز بہ روز پراسرار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سرگرمیاں بھی مشتبہ تھیں۔ اگرچہ
ں نے اب ان باتوں پر غور کرنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

ایک دن وانگ یو نے مجھے خود ہی بتایا کہ میں نے ان دستاویزات کا ایک مرتبہ پھر
دا کر دیا ہے۔

"مگر آپ نے بتایا تھا کہ ان کا سودا تو ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ اسی دن کی تو
ت ہے جب میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اس کے بعد جو کچھ ہوا' تمہیں شاید اس کا علم نہیں۔" وانگ نے جواب دیا۔ "وہ
یجنٹ جو دستاویزات مجھ سے لینے آیا تھا' مخالفین کے ہاتھوں مارا گیا۔ پھر اس سودے کی
یک محدود مدت تھی' وقت گزرنے کے بعد وہ سودا منسوخ ہو گیا تھا۔ اب میں نے اسے
لے سے بھی زیادہ قیمت پر اسی پارٹی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" وانگ نے تفصیل
سے بتایا۔

"مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ " دستاویزات کے لیے دونوں سپرپاورز بھی کوشاں ہیں ان کے لیے کیا مشکل ہے۔ وہ لوگ آپ سے طاقت کے زور پر وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز حاصل کر سکتے ہیں۔

میری بات سن کر وانگ مسکرایا اور بولا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم بہت دور تک سو ہو' مگر تمہیں شاید یہ اندازہ نہیں ہے کہ میری پشت پر کون ہے۔" اس کی مسکراہٹ گ ہوگئی۔ "میں نے دونوں ہی سپرپاورز کو چکمہ دے رکھا ہے کہ وہ دستاویزات میں ان حوالے کروں گا۔ اب دونوں پارٹیاں آپس ہی میں لڑتی مرتی رہتی ہیں۔ اصل خطرہ تو ا وقت ہو گا جب میں وہ دستاویزات کسی ایک پارٹی کے حوالے کروں گا۔"

"مگر وہ جو اس دن آپ پر حملہ۔۔۔"

"وہ ایک تیسرے ملک کے ایجنٹ تھے۔" وانگ نے میری بات کاٹ دی۔

"بہرحال یہ بہت خطرناک کھیل ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک نہ ایک دن تو آپ کو کھل کے سامنے آنا پڑے گا۔ پھر۔۔ پھر کیا ہو گا؟"

"تمہارے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتی خرم۔" وانگ نے منہ بنا کر کہا۔

"میں نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ دو بہ دو تو کسی سے بھی مقابلہ کیا جا س ہے' مگر اندھیرے کے تیر سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔"

"بچا جا سکتا ہے' اگر آدمی کی کھوپڑی میں عقل ہو۔" وانگ نے کہا پھر بولا "بہرحال' تم ان باتوں میں اپنا دماغ مت کھپاؤ۔ اگر کوئی خطرہ ہے بھی تو وہ صرف میر لیے ہے۔"

میں بھی خاموش ہو گیا' مگر اب میرا وہاں دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں صرف کراٹے ک تربیت کے لیے وہاں رکا ہوا تھا ورنہ اب تک کبھی کا وہاں سے بھی نکل گیا ہوتا۔

میری تربیت اب آخری مراحل میں تھی۔ سخت محنت سے میرا جسم فولاد کی طر سخت ہو گیا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ' موٹر سائیکلنگ' اور سوئمنگ میں بھی مہارت حاصل لی تھی۔

وانگ یو کے پاس آئے ہوئے مجھے دو سال گزر گئے تھے' اور بہ قول اس کے اس نے مجھے کراٹے' اور جمناسٹک کے امتزاج سے دو دھاری تلوار بنا دیا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ وانگ نے ان دستاویزات کا سودا کیا یا نہیں' مگر اب میرا جی اس چار دیواری سے اک گیا تھا' جہاں انسانوں سے زیادہ کتے تھے' اور جو انسان تھے' وہ بھی کتوں ہی کی طرح خونخوا تھے۔

ایک دن وانگ بہت اچھے موڈ میں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "مجھے یہاں رہتے ہوئے دو سال گزر گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں اس وسیع و عریض عمارت میں نظربند ہ

کر رہ گیا ہوں۔ آخر میری یہاں موجودگی کا مقصد کیا ہے؟ میں اب یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے' کوئی پابندی ہے تم پر! تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ تم یہاں نظربند ہو۔ مس چیکو ایک اہم مشن پر فرانس گئی ہوئی ہے' وہ دو چار دن میں آنے والی ہے' پھر تمہاری تنہائی بھی رفع ہو جائے گی۔"

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے مس چیکو سے!" میں جھنجلا گیا۔ "میں بس یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

"جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔" وانگ نے سامنے والی دیوار کو تکتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بھی تو بتاؤ کہ تم جاؤ گے کہاں؟"

"کہیں بھی۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں خود محنت کر کے کھانا چاہتا ہوں۔ یوں کب تک آپ پر بوجھ بنا رہوں گا۔"

"تم مجھ پر بوجھ نہیں ہو۔" وانگ نے سرد لہجے میں کہا۔ "وانگ کبھی خسارے کا سودا نہیں کرتا۔ میں تم سے ایک بڑا کام لینا چاہتا ہوں' اسی لیے تم پر اتنی محنت کر رہا ہوں۔ میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ میں تو نہی تم پر لاکھوں روپیہ خرچ کروں۔ میں نے تمہیں فرنچ' جرمن اور اٹالین سکھائی ہے جانتے ہو ان ٹیوٹرز کو میں نے کتنا معاوضہ دیا ہے؟ ہزار امریکی ڈالرز فی ہفتہ۔ پھر تمہارے رہن سہن اور لباس پر جو اخراجات آئے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں' میں نے یہ رقم تم پر ایک طرح سے انویسٹ کی ہے' جسے میں خطیر منافع کے ساتھ وصول کروں گا۔ اب تم مطمئن ہوئے یا نہیں؟"

"میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں۔" میں بھنا کر بولا۔ "یہ سب کرنے سے پہلے مجھے اعتماد میں لیا جانا چاہیے تھا' یہ ضروری تو نہیں کہ میں تمہاری اس تجویز سے اتفاق کروں۔ تم نے کیا مجھے بھی اپنے کتوں میں سے ایک سمجھا ہے' جو تمہارے ایک اشارے پر دم ہلانے لگتے ہیں یا تو مجھے وجہ بتاؤ کہ تم نے مجھے کس مقصد کے لیے روک رکھا ہے' یا پھر مجھے جانے دو۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہاں سے جانے کا خیال تو تم دل سے نکال دو۔" وانگ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "رہی یہ بات کہ میں تم سے کیا کام لینا چاہتا ہوں وہ میں تمہیں بہت جلد بتا دوں گا۔"

"میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں آج ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ میں دیکھتا ہوں کون میرا راستہ روکے گا۔"

"میں جانتا ہوں کہ میرے محافظ تمہیں نہیں روک سکیں گے' مگر کیا تمہیں اپنی گم شدہ بہن سے بھی دلچسپی نہیں ہے۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا--- کیا-- تم جانتے ہو کہ شہلا کہاں ہے؟"
میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ "بتاؤ کہاں ہے شہلا؟" میری آواز شدت جذبات سے لرز رہی تھی۔

"وہ جہاں بھی ہے خیریت سے ہے۔ اسے تو میں نے بہت پہلے تلاش کر لیا تھا۔ نہ صرف تلاش کیا تھا' بلکہ اسے لے بھی آیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنا کام ہونے کے بعد میں تمہیں سرپرائز دوں گا' اور تمہیں شہلا سے ملا دوں گا۔"

"بھاڑ میں گیا تمہارا کام۔" میں چیخ کر بولا۔ "میں ابھی اور اسی وقت اپنی بہن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"زیادہ جذباتی مت بنو۔" وانگ کا لہجہ حسب معمول سرد تھا۔ "میرے کہنے پر چلو گے تو تمہیں تمہاری بہن مل جائے گی' ورنہ زندگی بھر اس کی صورت دیکھنے کو ترستے رہو گے۔" یہ کہہ کر وانگ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بے دم سا ہو کر بیڈ پر گر گیا۔ اس لمحے میری کیفیت ہیجانی ہو رہی تھی۔ میری بہن میرے آس پاس ہی کہیں موجود تھی' مگر اس کم بخت وانگ نے اسے مجھ سے ملنے نہیں دیا۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتا تھا۔ شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ شہلا سے ملنے کے بعد میں اس کا وہ کام نہیں کروں گا۔ شہلا کی خاطر تو میں سب کچھ کر سکتا تھا۔ وانگ شاید میری اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

رات لمحہ بہ لمحہ گزر رہی تھی' مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں اپنی سوچوں میں غلطاں کمرے میں بے تابی سے ٹہل رہا تھا۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی گھٹی ہوئی آواز میں چیخا ہو۔ آواز کافی خفیف' اور بہت دور کی معلوم ہوتی تھی' مگر میری چھٹی حس ایک دم بیدار ہو گئی۔ میں نے لپک کر کمرے کی لائٹ آف کر دی اور محتاط انداز میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ کوریڈور میں دور تک سناٹا تھا حتیٰ کہ کتے بھی بالکل خاموش تھے۔ کتوں کی خاموشی مجھے غیر فطری محسوس ہو رہی تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر کمرے میں گیا' اور بغیر کسی آواز پیدا کیے الماری کھول کر اس میں سے اپنا پوائنٹ تھری ایٹ کا ریوالور نکال لیا۔ ریوالور سلیپنگ گاؤن کی جیب میں ڈال کر میں ایک مرتبہ پھر کوریڈور میں نکل آیا۔

باہر نکلتے ہی مجھے کسی تبدیلی کا احساس ہوا۔ غور کرنے پر مجھے یاد آگیا کہ کوریڈور کے دوسرے سرے پر اس وقت ایک بلب روشن تھا جب میں باہر نکلا تھا' اب وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر میں دیوار سے چپک گیا۔ وانگ کا کمرا کوریڈور کے دوسرے سرے پر تھا' مگر مجھے امید نہیں تھی' کہ وہ اپنے کمرے میں موجود بھی ہو گا۔ وہ آج کل اپنی راتیں نہ جانے کہاں گزار رہا تھا' گھر میں تو وہ کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

اچانک ایسی آواز آئی جیسے کسی نے دیوار پر لات ماری ہو۔ اس کے ساتھ ہی گھٹی

گھٹی سی انسانی چیخ سنائی دی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے چیخنے والے کی گردن دبوچ لی ہو اور اس کی چیخ حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی ہو۔ چیخ کی آواز واضح طور پر وانگ کے کمرے سے سنائی دی تھی۔ میں پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا' اور پیٹ کے بل کھسکتا ہوا وانگ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ کوریڈور کا فرش موزائیک کا تھا اس لیے میں بہت آسانی اور تیز رفتاری سے پیٹ کے بل رینگ رہا تھا۔ میں تو اسی رفتار سے سخت اور پتھریلی زمین اور کانٹے دار جھاڑیوں میں بھی رینگ سکتا تھا۔

وانگ کے کمرے کے نزدیک پہنچ کر اندر کی آوازیں مزید واضح ہو گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کمرے میں موجود لوگ آپس میں ہاتھا پائی کر رہے ہوں۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے اپنے ڈریسنگ گاؤن کی ڈوری کھولی' اور اس کی جیب سے ریوالور نکال کر اسے جسم سے علیحدہ کر دیا۔ میں اب ہر قسم کے خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ پھر میں آہستگی سے کھڑا ہوا' اور ہاتھ بڑھا کر کوریڈور کا بلب روشن کرنا چاہا' مگر بلب شاید ہولڈر میں موجود ہی نہیں تھا۔ اچانک اندر سے ایک کرب ناک انسانی چیخ کی آواز سنائی دی۔ اس مرتبہ میں نے وانگ کی آواز واضح طور پر پہچان لی۔

ہر قسم کی احتیاط کو بالائے طاق رکھ کے میں نے کمرے کے دروازے پر زور دار لات ماری۔ دروازہ اندر سے بولٹ نہیں تھا اس لیے لات کی ضرب سے چوپٹ کھل گیا۔ کک مارتے ہی میں پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی چیز میرے اوپر سے زن سے گزر گئی۔ کمرے میں بھی اندھیرا تھا اس لیے مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ اندر کی صورت حال کیا ہے۔ میں یوں ہاتھ پہ ہاتھ رکھے لیٹا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کمرے کی کوئی دیوار مجھ پر آگری ہو۔ مجھ پر حملہ کرنے والا کسی دیوار ہی کی طرح بھاری بھرکم اور مضبوط تھا۔ دھچکے سے ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں دور جا گرا۔ حملہ آور نے ٹٹول کر میری گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری گردن کے گرد آہنی شکنجہ کس دیا گیا ہو۔ لحہ بہ لحہ اس کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ میرا سانس گھٹ رہا تھا' کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی' اور آنکھیں حلقوں میں ابل پڑ رہی تھیں۔

وانگ نے اپنے تئیں مجھے ناقابل تسخیر بنایا تھا' مجھ پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا تھا' مگر اس وقت وہی ناقابل تسخیر خرم جس کے بدن میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں' کسی بے ضرر کیچوے کی طرح زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں شہلا کا خیال آیا۔ بہ قول وانگ کے وہ اس کے پاس تھی۔ شہلا کا خیال آتے ہی گویا میرے جسم میں نئی توانائی دوڑ گئی۔ میں نے تمام تر قوت جمع کر کے اپنا داہنا ہاتھ حملہ آور کے گھٹنے کے نیچے سے نکالا' اور پوری قوت سے اس کی تھوڑی پر ضرب لگائی۔ میرا ہاتھ جھنجھنا کر رہ گیا' ایسا

لگا جیسے میں نے لوہے کے کسی ٹکڑے پر گھونسا مارا ہو۔ میرا وہ پنچ ایسا تھا کہ عام آدمی کو پڑتا تو ٹھوڑی کے ساتھ ساتھ اس کا جبڑہ بھی چور چور ہو جاتا' مگر وہ شخص نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا' اس پر صرف اتنا اثر ہوا کہ میری گردن میری چھوڑی نہیں۔ اس کا منوں وزنی جسم میرے پیٹ پر تھا۔ میری گردن کو مزید دبانے کے لیے وہ کھسک کر میرے سینے پر آگیا' اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اب میرے پیر آزاد تھے' اور میں ایسے موقعوں پر ہاتھوں سے زیادہ پیروں سے کام لیتا تھا۔ میں نے کمر کو تھوڑا سا خم دے کر اپنے دونوں پیر اٹھائے اور انھیں اپنے سر کی طرف موڑ کر حملہ آور کی گردن دبوچ لی۔ اسے مجھ سے شاید اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ وہ بری طرح کسمسایا' مگر میں نے اس کی گردن کو پوری قوت سے رگڑ دیا۔ اس نے گھبرا کر میری گردن چھوڑ دی۔ یہ اس کی دوسری بڑی غلطی تھی۔ میں نے پیروں کے شکنجے میں جکڑے جکڑے اس کی گردن کو زور دار جھٹکا دیا۔ چٹ کی آواز آئی جیسے کوئی سوکھی ہوئی شاخ ٹوٹی ہو۔ پھر وہ بے جان ہو کر ایک طرف گر گیا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ کبھی نہیں اٹھ سکے گا کیونکہ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے جھپٹ کر کمرے کی لائٹ آن کر دی۔ کمرے میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ مجھ پر حملہ کرنے والے میں ابھی تک جان باقی تھی' اور وہ نزع کی حالت میں مبتلا تھا۔ وانگ کے بستر کے پاس دو افراد اڑھے ترچھے پڑے تھے۔ وانگ بھی دیوار کے سہارے بیٹھا تھا' مگر اس حال میں کہ ایک خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست تھا۔ وہ بھی گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں لپک کر اس کی طرف بڑھا اور اس کے سینے سے خنجر نکالنا چاہا' مگر اس نے اشارے سے مجھے روک دیا' دھندلائی آنکھوں سے مجھے دیکھا' اور ڈوبتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "خرم آخر ان لوگوں۔۔ کا۔۔ داؤ چل ہی۔۔ گیا۔۔۔ وقت بہت کم ہے۔۔۔ میرے سیف میں۔۔۔ وہ بریف کیس۔۔۔ موجود ہے۔۔۔ وہ بریف کیس۔۔۔ متعلقہ شخص۔۔۔ تک پہنچانا تمہاری ذمے داری ہے۔ میں۔۔۔"

"ان باتوں کو چھوڑو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ۔۔۔ نہیں ہے۔۔۔ تم میری بات سن لو۔۔۔ وہ۔۔۔ سیف اس بڑی۔۔۔ تصویر کے پیچھے ہے۔۔۔ اس کا نمبر۔۔۔ میری سرخ۔۔۔ جلد والی ڈائری میں۔۔۔ موجود ہے۔۔۔ بریف کیس لے کر۔۔۔ فوراً۔۔۔ یہاں سے نکل جاؤ۔۔۔ اس آدمی کا نام۔۔۔ بھی اسی ڈائری میں۔۔۔ موجود ہے۔۔۔ جس کے حوالے تمہیں وہ بریف کیس کرنا ہے۔" وانگ نے یہ کہہ کر خون کی قے کی' پھر بہ مشکل تمام بولا۔ "اس۔۔۔ بریف کیس۔۔۔ کی اس طرح حفاظت کرنا۔۔۔ جس طرح۔۔۔ میں نے کی ہے۔"

"اور میری بہن شہلا کہاں ہے؟" میں ہیجانی انداز میں بولا۔

"تمہاری بہن---- اس کی آواز ڈوبنے لگی-" وہ---- وہ---"

"ہاں بولو' وہ کہاں ہے؟" میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا-

وانگ کا جسم زور سے کانپا' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی' مگر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی- میں نے اسے آہستگی سے فرش پر لٹا دیا- وہ زندگی سے ناتا توڑ چکا تھا- مجھے اس کی موت سے دہرا صدمہ پہنچا تھا- اگر وہ مجھے سہارا نہ دیتا تو یا تو میں پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا' یا پھر بھوکا مرجاتا- میں نے حملہ آوروں کا جائزہ لیا- وہ نہ جانے کون لوگ تھے' کسی سفید فام قوم سے تعلق رکھتے تھے- ان میں سے دو کو وانگ نے جہنم رسید کر دیا تھا' مگر تیسرا اس کے لیے فرشتہ اجل ثابت ہوا- وہ انتہائی جسیم اور طاقتور دشمن تھا- اس کی جسامت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس میں اتنی پھرتی ہوگی- میری زندگی باقی تھی جو میں اس کے ہاتھوں بچ نکلا تھا' یا پھر اس کی موت آگئی تھی- میں نے تیزی سے ان تینوں کی تلاشی لی' اور جو کچھ بھی ملا اسے اپنی جیب میں ٹھوس لیا- اس وقت میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ان چیزوں کا جائزہ بھی لیتا- ممکن ہے باہر ان کے مزید ساتھی بھی موجود ہوں- میں نے الماری میں سے وانگ کی پاکٹ ڈائری نکالی' اس میں مجھے کہیں سیف کا نمبر دکھائی نہ دیا- ایک صفحے پر البتہ وانگ کے نام کے ساتھ ایک ٹیلی فون نمبر درج تھا- اسے دیکھ کر میں چونکا- وہ نمبر سیون ایٹ سے شروع ہو رہا تھا- میں جانتا تھا کہ کراچی کے کسی بھی ایکسچینج کا نمبر سیون ایٹ نہیں ہے- تصویر ہٹا کر سیف کے ڈائل پر وہی نمبر آزمایا' دوسرے ہی لمحے سیف کھل گیا- اس میں سیاہ رنگ کے اس بریف کیس کے ساتھ امریکن ڈالرز' برطانوی پونڈز اور پاکستانی نوٹوں کی بے شمار گڈیاں تھیں- آئندہ نہ جانے مجھے کن حالات سے گزرنا پڑتا- اسی خیال کے پیش نظر میں نے وہ تمام نوٹ ایک بیڈ شیٹ میں باندھ کر گٹھری سی بنا لی' اور کمرے پر الوداعی نظر ڈالتا ہوا لائٹ آف کرکے آہستگی سے باہر نکل آیا-

کمرے کے عین سامنے بڑی سی ایک پینٹنگ لگی تھی- اس میں دستے تک ویسا ہی ایک خنجر پیوست تھا جیسا وانگ کے سینے میں تھا- مجھے یاد آگیا کہ جونہی میں نے دروازہ کھولا تھا کوئی چیز زن سے میرے سر کے اوپر سے گزری تھی- اس کا مطلب تھا کہ حملہ آور نے مجھ پر پہلے خنجر سے حملہ کیا تھا- اگر میں پھرتی سے زمین پر گر نہ جاتا تو وہاں میری لاش بھی پڑی ہوتی- کوریڈور میں میرا ڈریسنگ گاؤن بھی پڑا تھا- اچانک مجھے اپنے ریوالور کا خیال آیا جو کمرے ہی میں رہ گیا تھا- میں ایک مرتبہ پھر کمرے میں گیا- لائٹ آن کرکے ریوالور اٹھایا تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ شخص کسمایا ہو جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا- مجھے اس کی سخت جانی پر حیرت ہوئی میں نے جھک کر پوری قوت سے کراٹے کا ایک خوف ناک وار اس کی گردن پر کیا- وہ بری طرح تڑپا پھر ساکت ہوگیا- میں نے لائٹ آف کی' بریف کیس اور

نوٹوں کی گٹھری اٹھائی اور دبے قدموں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر میں نے بہت عجلت میں لباس تبدیل کیا۔ سارے نوٹ ایک سوٹ کیس بھرے' الماری میں سے دو تین کپڑوں کے جوڑے بھی نکال کر سوٹ کیس میں ڈالے' وہ بریف کیس بھی اسی سوٹ کیس میں رکھ دیا جس کی وجہ سے وانگ مارا گیا تھا۔

ہر طرح سے تیار ہو کر میں باہر نکلا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا پورچ طرف بڑھا۔ سامنے ہی تین کتے مردہ حالت میں پڑے تھے۔ ان کے نزدیک ہی گوشت کچھ ٹکڑے بھی پڑے ہوئے تھے۔ انھیں شاید کوئی بہت سریع الاثر زہر دیا گیا تھا۔ گیٹ کے پاس وانگ کے دو محافظ بھی غیر فطری انداز میں پڑے ہوئے تھے۔ پہلی ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکے ہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ بقیہ محافظوں کی لاشیں بھی پاس ہی کہیں موجود ہوں گی۔

اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ یہ تین آدمیوں کا کام تو نہیں ہو سکتا۔ وانگ وہ محافظ موم کے بنے ہوئے نہیں تھے کہ یوں خاموشی سے مرجاتے۔ میں نے مین گ سے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا' اور باؤنڈری وال پھلانگ کر دائیں طرف والی کوٹھی لان میں کود گیا۔ اگر میں خالی ہاتھ ہوتا تو اس سے دگنی اونچی دیوار بھی آسانی سے پھلا سکتا تھا' مگر بھاری بھرکم سوٹ کیس کی وجہ سے مجھے خاصی دقت پیش آئی تھی۔ یہ خطرہ تھا کہ کہیں اس کوٹھی میں کتے نہ ہوں' یا کوٹھی کا چوکیدار میری طرف متوجہ ہو جائے' اس کوٹھی میں شاید کتے نہیں تھے' اور رات کے اس پہر چوکیدار بھی اپنی کوٹھری میں تانے سو رہا تھا۔

میں دبے پاؤں گیٹ کی طرف بڑھا اور گیٹ کھول کر باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ سخت سی چیز میری پیٹھ سے آ لگی' اور پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ "ہلنا مت ورنہ ہم کر دے گا۔ خانہ خراب چور کا بچہ--- تم آیا کدھر سے تھا؟"

اس کے بولنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس کوٹھی کا چوکیدار تھا۔ میرا اندازہ ثابت ہوا تھا کہ وہ لمبی تانے سو رہا ہو گا۔ بہرحال مجھے یہ اطمینان تھا کہ وہ عام چوکیدار حملہ آوروں کا ساتھی نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے سوٹ کیس زمین پر رکھا' اور دو ہاتھ اٹھا کر خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "خان صاحب! میں چور نہیں ہوں۔ تم یہ سوٹ کھول کر دیکھ لو یا اگر تمہیں اس پر بھی یقین نہ ہو تو مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔" کہتے ہوئے میں غیر محسوس طریقے پر اس کی طرف گھوم گیا۔

وہ لمبا تڑنگا' مضبوط جسم کا آدمی تھا' اور اپنے مالکوں کا حق نمک ادا کرنا جانتا اس نے دانت پیس کر کہا۔ "ہم کو پاگل مت بناؤ۔ تم اندر سے کیا نماز پڑھ کر نکلا ہے۔ تمہیں پولیس کے حوالے تو ضرور کرے گا' مگر پہلے صاحب کو اٹھائے گا۔

میں نے اچانک کہا۔ "لو وہ صاحب بھی آ گئے۔" وہ دھوکے میں آ گیا۔ اس نے گھوم کر ایک دم پیچھے کی طرف دیکھا۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے رائفل کی نالی ایک طرف ہٹائی' اور دائیں ہاتھ سے اس کی کن پٹی پر ہلکی سی ضرب لگا کر اسے ناک آؤٹ کر دیا۔

پھر میں اطمینان سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ ذیلی کھڑکی کھول کر میں نے باہر جھانکا تو مجھے کچھ فاصلے پر ٹویوٹا کی ایک جیپ دکھائی دی۔ میں نے پھرتی سے سر اندر کر لیا۔ اس جیپ میں حملہ آوروں کے ساتھی بھی ہو سکتے تھے ورنہ رات کے اس پہر اس کی وہاں موجودگی کا کیا جواز تھا۔ وہ کوئی ایسا علاقہ نہیں تھا جہاں لوگ اپنی گاڑیاں گلیوں میں کھڑی کرتے ہوں۔ میں کوٹھی کی باؤنڈری وال سے لگا لگا اس کی پشت کی طرف بڑھا۔ باؤنڈری وال پشت کی طرف تھی' اور اس پر نوکیلی سلاخوں کے ساتھ ہی خاردار تاروں کی باڑ بھی تھی۔ وہاں آس پاس کوئی ایسا درخت بھی نہیں تھا جس کے ذریعے میں باہر کود سکتا۔ سوٹ کیس نہ ہوتا تو شاید میں وہ دیوار بھی کسی نہ کسی طرح پھلانگ لیتا' مگر سوٹ کیس سمیت ایسا کرنا بہت مشکل تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ سوٹ کیس باہر پھینک کر خود ہی کود جاؤں' پھر خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ سوٹ کیس گرنے کے دھماکے سے نہ صرف حملہ آور' بلکہ اردگرد کی کوٹھیوں کے چوکیدار بھی متوجہ ہو سکتے تھے۔

اچانک میری نظر ایک دروازے پر پڑی۔ پہلی نظر میں مجھے وہ دروازہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ دروازہ شاید ملازمین کی آمدورفت کے لیے تھا' مگر اس میں بھاری بھرکم تالا جھول رہا تھا۔ میں تالا کھولنے پر غور کر رہا تھا کہ کسی کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ لوگ اب تک لوٹے نہیں۔ مجھے تو دال میں کچھ کالا محسوس ہو رہا تھا۔" بولنے والا انگریزی میں بول رہا تھا۔

"مجھے بھی گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔" دوسرا آدمی بھی انگلش میں بولا۔" وانگ پر قابو پانا آسان نہیں ہے۔"

"یار وہ البرٹ بھی تو وانگ سے کم نہیں ہے۔ وہ ایک دفعہ گردن پکڑ لے تو مرنے کے بعد ہی چھوڑتا ہے۔"

میرے اعصاب تن گئے۔ گویا ان لوگوں نے ہر طرف سے گھیراؤ کر رکھا تھا کہ اگر وانگ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو اسے نکلنے نہ دیا جائے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں اس کوٹھی میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ چوکیدار کسی بھی وقت ہوش میں آ کر شور مچا سکتا تھا۔ میں نے فرار کے کسی ممکنہ راستے کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا' بائیں طرف مجھے سرونٹ کوارٹرز دکھائی دیے۔ میں نے رات انھی میں سے ایک کوارٹر میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کوارٹر اگر خالی ہوا تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا' اور اگر اس میں کوئی موجود ہوا تو میں اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دوں گا۔

یہی سوچ کر میں سرونٹ کوارٹرز کی طرف بڑھا۔ ایک ہی لائن میں تین سرونٹ کوارٹ
تھے۔ وہ تینوں ہی آباد تھے' کیونکہ تینوں کے برآمدوں میں ہلکی روشنی والے بلب روشن تھ
میں نے اللہ کا نام لے کر ایک کوارٹر کی دیوار پر اپنا سوٹ کیس رکھا' پھر خود بھی اچھل کر
دیوار پر چڑھا اور پنجوں کے بل دوسری طرف کود گیا۔ ان کوارٹرز کی دیواریں بہت نیچ
تھیں۔ دیواروں اونچی رکھنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ بنگلے کی چار دیواری ہی کافی تھی۔
ان دیواروں کا مقصد محض پردہ پوشی تھا۔ میرے کودنے سے ہلکا سا دھمکا ہوا تھا اس لیے میں
احتیاطاً ایک ستون کی آڑ میں دب گیا۔ پھر میں آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ کمرے سے کس
عورت کے ہنسنے کی آواز سن کر ٹھٹھک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کوارٹر کے مکین جاگ
رہے تھے۔ اس صورت میں مجھے کچھ دشواری ہو سکتی تھی' مگر بہرحال مجھے بقیہ رات تو وہاں
گزارنا تھی۔ سوٹ کیس کو دیوار کے ساتھ رکھ کر میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آگ
بڑھا۔ کوارٹر کا صحن خاصا بڑا تھا۔ صحن کے ایک کونے میں کار کے استعمال شدہ ٹائروں کا
ایک ڈھیر تھا۔ اسی کے ساتھ وھیل کیپ' جیک اور دوسرے چھوٹے موٹے اوزار پڑے
تھے۔ صحن کے دوسرے کونے میں ایک بکری بندھی تھی۔ صحن کا جائزہ لے کر میں کمرے
کی طرف بڑھا۔ ریوالور نکال کر میں نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ مجھے اندر موجود لوگوں سے
کوئی خطرہ نہیں تھا' مگر عام آدمی ریوالور کی جھلک دیکھ کر ہی خوف زدہ ہو جاتا ہے مقصد ان
لوگوں کو نقصان پہنچانا نہیں' بلکہ صرف دہشت زدہ کرنا تھا۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر میں
ٹھٹھک گیا۔ اندر کوئی عورت کسی سے کہہ رہی تھی۔ "بس اب جاؤ' اگر بادشاہ ٹہلتا ہو
اس طرف آگیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

"بادشاہ خان اس وقت بھلا یہاں کیا لینے آئے گا۔" مرد نے ہنس کر کہا۔ "وہ نسوا
دبائے گیٹ کے آس پاس ٹہل رہا ہو گا' یا سونے کی تیاری کر رہا ہو گا۔ وہ ادھر صبح سے
پہلے نہیں آئے گا۔"

"خیر وہ رات میں سوتا تو نہیں ہے یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔" عورت نے کہا۔ "مگ
تم کیا رات بھر یہیں رہو گے۔" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"تو تیرا کیا خیال ہے' میں یہ موقع اپنے کوارٹر میں سو کر ضائع کر دوں گا۔ کبھی کبھ
تو ایسا موقع آتا ہے۔" اس نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔

عورت کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی "ویسے تم بوہت کمینے! اگر کریم کو پتا چل گیا
وہ تمہارا خون کر دے گا۔"

"کریم پرسوں سے پہلے نہیں آئے گا۔ ڈرائیور کی یہی تو مشکل ہوتی ہے۔ صاحب
دن باہر رہے تو ڈرائیور بھی باہر۔" یہ کہہ کر وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ "دعا دے صاحب
کو کہ انھیں کار کے ذریعے حیدر آباد جانے کا خیال آگیا ورنہ---"

اچانک ساری صورت حال واضح ہو گئی وہ کوارٹر' ڈرائیور کا تھا جو اپنے مالک کے ساتھ حیدر آباد گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مرد بھی کوٹھی ہی کا کوئی ملازم ہے۔ بادشاہ خان شاید چوکیدار کا نام تھا' جو فرض شناسی کے صلے میں گیٹ کے پاس بے ہوش پڑا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے پر دستک دی تو عورت کے منہ سے خوف میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی اور اندر اچانک سناٹا چھا گیا۔ میں نے دوسری مرتبہ دستک دی تو عورت نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

"ہم ہے بادشاہ خان۔" میں نے حتیٰ الامکان چوکیدار کی آواز اور لب و لہجہ اپنانے کی کوشش کی۔

"کیا بات ہے خان؟" عورت کی لرزتی ہوئی آواز آئی۔

"ہمارے کو تھوڑا چینی چاہیے چائے کے واسطے' ہمارے پاس ختم ہو گیا ہے۔" میں نے اسی لب و لہجے میں کہا۔ "اچھا دیتی ہوں۔" عورت نے جواب دیا۔ وہ شاید اتنی گھبرا گئی تھی کہ اس نے میری آواز اور لب و لہجے پر غور نہیں کیا ورنہ بھانڈا پھوٹ جاتا۔ فوراً ہی دروازے کے نزدیک چوڑیاں کھنکھنائیں' اور اس نے دروازہ کھول کر ایک ہاتھ باہر نکال دیا۔ صحن میں جلتے ہوئے بلب کی مدھم روشنی میں' میں نے دیکھا اس کا ہاتھ بہت خوب صورت تھا۔ وہ یقیناً خود بھی خاصی خوش شکل ہو گی۔ اس کے ہاتھ میں چینی کی پڑیا تھی۔

"میں نے چینی لینے کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑا اور لات مار کے دروازہ پورا کھول دیا۔" اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا' مگر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر پھرتی سے اس کا منہ بند کر دیا' اور ریوالور اس کی کن پٹی سے لگا کر سفاک لہجے میں بولا۔ "آواز نکالی تو یہیں ڈھیر کر دوں گا۔ اندر چلو۔" میں نے سرگوشی کی۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس نے سر سے پیر تک سفید رنگ کی ایک چادر لپیٹ رکھی تھی۔ میں نے آہستگی سے دروازہ بند کیا' اور اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ وہ شاید پلنگ کے نیچے یا پھر لوہے کی بڑی سی الماری کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

"تیرے ساتھ اور کون تھا؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کو۔۔ کوئی بھی نہیں۔" اس نے تھوک نگل کر کہا۔

"جھوٹ بولے گی تو ابھی تجھے گولی مار کر ٹھنڈا کر دوں گا۔ کریم کو پہلے ہی شبہ تھا کہ تم اس کی امانت میں خیانت کر رہی ہے۔ اسی نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔" میری بات سن کر وہ لرزنے لگی۔ پھر میں بلند آواز میں بولا۔ "مردود میں نے تجھے دیکھ لیا ہے' خیریت چاہتا

ہے تو باہر آ جا ورنہ گولی تو وہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔" میں ریوالور کو یونہی گردش دی۔
دوسرے ہی لمحے جوان عمر کا ایک شخص میرے سامنے آ گیا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا' اور اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بے اختیار میرے قدموں میں گر گیا۔

میں نے ٹھوکر مار کے اسے اٹھایا اور لہجے کو خوف ناک بنا کر بولا۔ "سیدھی طرح کھڑا ہو جا۔ اگر تم دونوں نے میری بات مانی تو میں کریم کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔" پھر مجھے اپنے سوٹ کیس کا خیال آ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "وہ سامنے دیوار کے پاس میرا سوٹ کیس رکھا ہے۔ وہ اٹھا کر لے آ مگر کوئی چالاکی مت دکھانا ورنہ ریوالور کی گولی وہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔ میں نے یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ کھلے دروازے میں سے سوٹ کیس صاف دکھائی دے رہا تھا۔"

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے سوٹ کیس کی طرف بڑھا۔ اس کی دھوتی بار بار اس کے پیروں میں الجھ رہی تھی۔ مجھے امید تو نہیں تھی کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کرے گا' مگر پوری طرح ہوشیار تھا' اگر وہ ایسی کوئی کوشش کرتا تو بیرونی دروازے تک پہنچنے سے پہلے میں اسے جا لیتا۔ وہ سوٹ کیس اٹھا کر گرتا پڑتا پھر کمرے میں آ گیا۔ اس دوران عورت حلیہ درست کر چکی تھی' اور وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ پر اعتماد نظر آ رہی تھی۔ اس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لے کر کہا۔ "تم جو کوئی بھی ہو مگر کریم کے دوست ہرگز نہیں ہو۔" وہ پچاس سال کا بوڑھا ہے اور تم نوجوان ہو۔ پھر تم حلیے سے بھی بڑے آدمی ہو۔ تمہاری دوستی ایک ڈرائیور سے کیسے ہو سکتی ہے۔"

وہ کم بخت میری توقع کے خلاف کہیں زیادہ ذہین تھی۔

"میں جو کوئی بھی ہوں مگر ایک بات تم دونوں کان کھول کر سن لو! اگر ذرا بھی آواز نکالی تو اپنی جان سے جاؤ گے۔ میں یہاں صرف رات گزارنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو فائدے میں رہو گے۔ میں تمہیں اتنا انعام دوں گا کہ تم نے تصور بھی نہ کیا ہو گا۔"

"اچھا تو تم چور ہو۔" عورت اب کافی حد تک اپنے خوف پر قابو پا چکی تھی۔ "مگر تم بھی کہوں بادشاہ خان اندر کیسے آ گیا باہر کا دروازہ تو میں نے خود بند کیا تھا۔"

"میرے پیچھے بہت خطرناک لوگ لگے ہوئے ہیں۔" میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اگر انھیں بھنک بھی مل گئی کہ میں یہاں موجود ہوں تو میرے ساتھ تم دونوں بھی مارے جاؤ گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ مجھ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔

"ٹھیک ہے تم دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ۔" عورت نے اطمینان سے

، وہ مرد کے مقابلے میں زیادہ پُراعتماد اور زیادہ باہمت تھی۔ اس کا ساتھی مرد ابھی تک لرز رہا تھا۔ عورت نے طنزیہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ "او شمسو! تجھے سانپ سونگھ گیا' یہ کہہ تو رہے ہیں کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے تو دوسرے کمرے میں ان کا بستر لگا دے جا کر۔"

"اتنا بے وقوف نہیں ہوں میں' رات میں تم دونوں کے ساتھ گزاروں گا سمجھیں اب ذرا جلدی سے مجھے گرم گرم چائے پلاؤ۔ میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر میں ایک کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔

"باورچی خانہ بھی تو باہر ہے۔ چائے بنانے کے لیے مجھے باہر جانا پڑے گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف لپکی۔

میں نے لپک کر اس کی چوٹی پکڑ لی اور زناٹے کا تھپڑ اس کے پر رسید کیا۔

"ابھی تک تیری سمجھ میں میری بات نہیں آئی' بے وقوف سمجھتی ہے مجھے' باورچی خانہ اس طرف ہے۔ میں نے کمرے کے ایک اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "باورچی خانہ باہر ہوتا تو تو مجھے چینی اندر سے نہ پکڑاتی۔" اسے چھوڑ کر میں مرد سے مخاطب ہوا۔ چائے بنا شمسو ورنہ یہ اپنے ساتھ تجھے بھی مروا دے گی۔" اس کے معاملے میں شمسو زیادہ بزدل تھا۔

عورت مار کھا کے بھی خوفزدہ نہیں ہوئی۔ شاید وہ اس قسم کی چھوٹی موٹی پٹائی کی عادی تھی۔ وہ ترچھی نگاہوں سے مجھے گھورتی ہوئی دوبارہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شمسو چائے بنانے چلا گیا۔

صبح کے آثار نمودار ہوئے تو شمسو نے خوشامدانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے صبح سویرے کوٹھی میں جا کر ناشتا تیار کرنا ہوتا ہے۔ میں وہاں نہیں پہنچا تو بیگم صاحبہ یا ثمینہ بی بی ادھر آ جائیں گی۔ میری تو نوکری جائے گی ہی' کنیز بھی بے موت ماری جائے گی' اور آپ بھی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ بیرونی دروازہ پر زوردار دستک ہوئی کنیز نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے پھرتی سے ریوالور نکال لیا اور اسے دروازے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں دروازہ دوسری مرتبہ زیادہ شدت سے پیٹا گیا۔

"کون ہے؟" کنیز نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پولیس۔" باہر سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولو۔"

پولیس کا نام سن کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ میں نے شمسو کی طرف دیکھا اس کا رنگ بھی فق ہو رہا تھا۔ شمسو کا ہاتھ پکڑ کے بجلی سی سرعت کے ساتھ لوہے کی بڑی سی الماری کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے کنیز کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا' اور یہ بھی واضح کر دیا

کہ اگر تو نے زبان کھولی تو میں کم از کم تجھے ضرور ٹھکانے لگا دوں گا۔ وہ دروازہ کھولنے گئی تو میں دیوار سے بالکل چپک گیا۔ اب میں کنیز کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ چاہتی تو بہت آسانی سے مجھے گرفتار کرا سکتی تھی۔ تھوڑی سی امید مجھے ثمسو کی موجودگی سے تھی۔ مجھے تو کنیز چور ثابت کر سکتی تھی، مگر ثمسو کی وہاں موجودگی کا کیا جواز تھا؟

دروازہ کھلتے ہی کوئی دندناتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ کمرے کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا اس لیے میری تمام حسیات کانوں میں سمٹ آئی تھیں۔

"کون ہو تم؟" کنیز تیز لہجے میں بولی۔ "تم پولیس والے تو نہیں ہو۔"

"ہاں، ہم پولیس والے ہی ہیں۔" کوئی غرا کر بولا۔ "ہمیں اپنے ایک دشمن کی تلاش ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اسے یہیں ہونا چاہیے۔"

"اپنے پاس رکھو اپنے اندازے۔" کنیز تڑخ کر بولی۔ واقعی وہ خاصے مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ اس کا تجربہ تو مجھے بھی ہو چکا تھا۔ "تم الٹے سیدھے اندازے لگا کر دوسروں کے گھروں میں گھستے پھرو گے، اور تم نے اس کوٹھی میں گھسنے کی جرات کیسے کی؟ جانتے نہیں ہو یہ کوٹھی کس کی ہے؟"

"زیادہ بکواس مت کر!" اس مرتبہ دوسری مردانہ آواز گونجی۔ "ہم ایک آدمی کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔ اس نے جو گر پہن رکھے ہیں۔ جس جگہ سے وہ اس کوٹھی میں کودا ہے وہاں بھی اس کے قدموں کے نشانات ہیں، اور اس گھر کے باہر بھی ویسے نشانات ہیں۔ تیرے گھر کے صحن میں بھی جوتوں کے وہ نشان ہیں۔ مجھے قدموں کے نشانات پہچاننے کا بہت تجربہ ہے اب جلدی سے بتا کہاں ہے وہ؟"

"تم زبردستی گھر میں آ ہی گئے ہو تو اسے خود ہی تلاش کر لو۔ میری بات پر تو تم یقین کرو گے نہیں۔" کنیز کے لہجے میں بیزاری تھی۔ "میں بھی کہوں کہ پولیس لوگوں کے گھروں کی دیوار کود کے کب سے آنے لگی۔ اب جلدی سے تلاش کرو اسے اور جاؤ یہاں سے۔ صاحب کو پتا چل گیا تو پھر تم واپس نہ جا سکو گے۔"

"کون روکے گا ہمیں۔ وہ نکما چوکیدار! وہ تو بیچارا پہلے ہی گیٹ کے پاس نشے میں دھت پڑا تھا۔ ہم نے اسے بھی لمبی نیند سلا دیا۔"

"مار دیا اسے؟" کنیز ہیجان آمیز لہجے میں بولی۔

"اسے تو صرف بے ہوش کیا ہے، مگر تو ماری جائے گی ہمارے ہاتھوں!" پہلی آواز پھر سنائی دی۔ "ہٹ ہمارے راستے سے۔"

مجھے اطمینان ہو چکا تھا کہ وہ صرف دو آدمی ہیں۔ میں نے زیادہ دیر وہاں چھپے رہنا مناسب نہ سمجھا، اور ایک دم باہر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا، مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے وہیں سے جست لگائی

اور ریوالور کا دستہ اس کے سر پہ بھرپور انداز میں مارتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ دوسرا آدمی خطرہ دیکھ کر سنبھل چکا تھا۔ میں نے گھوم کے اسے بھی لات مارنا چاہی' مگر وہ جھکائی دے کر بچ گیا۔ وہ مجھ سے کہاں تک بچ سکتا تھا۔ میں نے ایڑھیوں پر تھوڑا سا گھوم کے اس کے چہرے پر ایک کک ماری۔ وہ لڑکھڑا کر آگے گرا تو میں نے دائیں ہاتھ کے شکنجے میں اس کی گردن دبوچ لی۔ پھر اسے حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا۔ میں اسے صرف بے ہوش کرنا چاہتا تھا' مگر شاید میری گرفت کچھ زیادہ ہی سخت تھی۔ میں نے اس کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ چٹاخ سے ماچس کی تیلی کی طرح ٹوٹ گئی۔ میں نے گرفت ڈھیلی کی تو وہ کیچوے کی طرح فرش پر گر پڑا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی آڑھا ترچھا فرش پر پڑا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ بھی مر چکا ہے یا صرف بے ہوش ہے کیونکہ ریوالور کا دستہ اس کے سر پہ بھی بھرپور انداز میں پڑا تھا۔ یقیناً ان میں سے کوئی پیشہ ور کھوجی رہا ہو گا اس قسم کے کھوجی گاؤں دیہات میں آج بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے فن میں ماہر بھی ہو گا' مگر ماہر فائٹر ان میں سے ایک بھی نہیں تھا۔ وانگ یو کے دشمن صرف اس سے خوف زدہ تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ کوئی وانگ یو سے زیادہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بیچارے بے خبری میں مارے گئے تھے۔ ان کا خیال ہو گا کہ مقابلے پہ وانگ یو کا کوئی گارڈ یا ملازم ہو گا اسی لیے انھوں نے ریوالور تک نکالنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی۔

ابھی پوری طرح اجالا نہیں پھیلا تھا۔ میں اب جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ شمو ابھی تک الماری کے پیچھے دبکا ہوا تھا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ وہ خشک پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے اس سے لہجے میں پوچھا۔ "شمو کوٹھی کے پچھلے دروازے کے علاوہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کوٹھی میں کوئی گاڑی موجود ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' گاڑیاں تو دو دو موجود ہیں' مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"یہاں چاروں طرف میرے دشمن پھیلے ہوئے ہیں' میں چاہتا ہوں کہ کسی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جاؤں' تمہیں آتی ہے ڈرائیونگ؟"

"مجھے نہیں آتی۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کوٹھی میں اور کسے آتی ہے ڈرائیونگ؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"ایسا ہی ہے تو تم خود لے جاؤ گاڑی!" کنیز بولی۔ "گاڑی میں دیکھ کے وہ تمہیں کیا پہچان پائیں گے۔ بس ایک دم نکل جانا!" اس نے گویا مشورہ دیا۔ میں نے بھی سوچا کہ ظاہر ہے وانگ یو کے دشمن مجھے تو نہیں پہچانتے ہوں گے' وہ زیادہ سے زیادہ یہی سمجھ رہے ہوں

ے کہ وانگ یو کا بریف کیس اس کا کوئی آدمی لے گیا اور وانگ یو کے تمام خاص آدمی
لوریا اور جاپان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس صورت میں وہ کسی مقامی آدمی پر توجہ بھی نہ
دیتے۔

"ٹھیک ہے' گاڑی میں خود لے جاؤں گا۔" کہاں ہے گاڑی۔

"دونوں گاڑیاں اس وقت گیراج میں ہوں گی۔ ان کی چابیاں تو ثمینہ بی بی کے کمرے میں ہوں گی' مگر تم ان میں سے کسی کا اگنیشن ڈائریکٹ کر لینا۔" ثمو نے کہا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا پھر دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ "مجھ سے جھوٹ کیوں بولا کہ تجھے ڈرائیونگ نہیں آتی!" میں نے اس کے منہ پر دوسرا تھپڑ مارا۔ "بول' جھوٹ کیوں بولا مجھ سے کوئی ایسا آدمی سیلف کو ڈائریکٹ کرنے کی بات نہیں کر سکتا جسے ڈرائیونگ نہ آتی ہو۔"

"ثمو بری طرح سہم گیا تھا۔ وہ لرزتے کانپتے ہوئے بولا۔ "میں نے مجبوراً یہ جھوٹ بولا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ صاحب کریم کی جگہ مجھے ڈرائیور بنا دیں۔ وہ کئی دفعہ کہہ چکے ہیں کہ کریم سے اب اتنی محنت نہیں ہوتی' کوئی بھروسے کا آدمی ڈھونڈو۔"

"اور تم گویا بھروسے کے آدمی ہو!" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم کتنے قابل اعتماد ہو' اس کا ثبوت تو مجھے مل ہی چکا ہے۔ اب جلدی سے میرے ساتھ چلو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

پھر میں اسے لے کر پہلے گیٹ کے پاس پہنچا۔ چوکیدار کے سر سے خون بہ رہا تھا' اور وہ مردوں کی طرح پڑا تھا۔ پہلی نظر میں تو مجھے یہی لگا وہ مر چکا ہو' مگر وہ ابھی زندہ تھا۔ میں نے ثمو کی مدد سے اسے اٹھا کر اس کے کوارٹر میں پہنچایا اور ثمو کو تاکید کر دی کہ واپس آکر اسے اسپتال لے جانا' ورنہ یہ مر جائے گا۔

اجالا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ مجھے یہ خوف بھی تھا کہ کوٹھی کی مالکن یا اس کی بیٹی نہ اٹھ جائے۔ سب سے بڑا مسئلہ گاڑی نکالنے کا تھا۔ اگر ثمو بہ خیر و عافیت گیراج میں سے گاڑی نکال لاتا تو میری پریشانی خاصی حد تک دور ہو جاتی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ بلا چوں و چرا میرے احکامات کی تعمیل کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی موقع پر مجھے دھوکا بھی دے سکتا تھا' مگر وہ فطری طور پر برا آدمی نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے کنیز نے ورغلایا ہو گا۔

گیراج پورچ کی بائیں طرف تھا۔ اس میں لکڑی کے بھاری بھرکم دروازے لگے ہوئے تھے' مگر وہ مقفل تھے۔ ثمو گیراج میں داخل ہوا تو میں کچھ فاصلے پر بڑے سے ایک گملے کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ ریوالور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے گاڑی کا بونٹ کھولا' اور اس میں جھکا اگنیشن کو ڈائریکٹ کرتا رہا۔ مجھے صرف اس کے جسم

کا نچلا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اچانک گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ وہ بونٹ بند کر کے گاڑی میں بیٹھا اور اسے باہر نکالنا ہی چاہتا تھا کہ کوٹھی کے برآمدے کا دروازہ کھلا' اور اٹھارہ بیس سال کی ایک خوب صورت لڑکی باہر نکل آئی۔ اس نے شب خوابی کے لباس پر ریشمی ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ پیروں میں بیڈ روم سلیپر تھے' اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی خوب صورت آنکھیں نیند سے اٹھنے کے باعث خمار آلود لگ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔ میں پوری طرح گملے کے پیچھے چھپ گیا۔ اس موقع پر میں ثمسو کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔

اچانک لڑکی نے بھی گاڑی کے انجن کی آواز سن لی۔ وہ چونک کر گیراج کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ثمسو کو مشتبہ حالت میں گاڑی نکالتے ہوئے دیکھے' اور اس بیچارے کی ملازمت جاتی رہے۔ میں نے ایک جست لگائی اور لڑکی کے سر پر جا پہنچا۔ وہ اچانک پلٹی میں نے ریوالور جیب میں رکھا اور پھرتی سے اس کا منہ بند کر دیا' ورنہ اس کی چیخ سے آس پاس کی کوٹھیوں والے بھی متوجہ ہو سکتے تھے۔ پھر میں نے دائیں ہاتھ سے اس کی پیشانی پکڑ لی' اور انگشت شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے اس کی کنپٹیوں پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ لمحوں میں وہ میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ میں نے اسے احتیاط سے فرش پر لٹایا اور گاڑی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ثمسو اسے ریورس کر کے پورچ میں لے آیا تھا۔ میں نے پھرتی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اپنا سوٹ کیس اندر ٹھونسا' اور خود بھی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ میری ہدایت کے مطابق ثمسو گاڑی لے کر گیٹ پہ پہنچا' اور گیٹ کھول کے گاڑی باہر نکال لی۔ میں سیٹوں کے درمیان دبک گیا۔ پھر ثمسو نے گیٹ بند کیا' اور گاڑی لے کر روانہ ہو گیا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ گاڑی اس وقت تک شاہراہ فیصل پر پہنچ چکی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ اگر ثمسو اس گاڑی میں واپس جاتا تو یقیناً بری طرح پھنس جاتا۔ اس کا واپس جانا بھی ضروری تھا ورنہ ان دو آدمیوں کے قتل کا شبہ اسی پر کیا جاتا جو کریم کے کوارٹر میں مردہ پڑے تھے۔ مجھے کنیز کی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ ہرچند میں اسے سمجھا آیا تھا کہ پولیس کو کیا بیان دینا ہے' مگر وہ کچھ بھی بک سکتی تھی۔ گورا قبرستان کے پاس میں نے ثمسو سے گاڑی روکنے کو کہا۔ وہ گاڑی روک کر میری اگلی ہدایت کا انتظار کرنے لگا۔

"گاڑی یہیں چھوڑ دو ثمسو اور ٹیکسی کے ذریعے گھر چلے جاؤ۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ تمہاری چھوٹی بی بی نے گاڑی کے انجن کی آواز سن لی تھی۔ میں نے انھیں بھی بے ہوش کر دیا کہ وہ کہیں تمہاری شکل نہ دیکھ لیں۔

"مگر تم نے مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا؟" وہ جھنجلا کر بولا' پھر منہ ہی منہ میں

بڑبڑایا۔ "یار کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے مجھے ! یہ سب میرے کرتوتوں کی سزا ہے۔ میں اس آوارہ عورت کے چکر میں آتا' نہ اس مصیبت میں پڑتا۔"

"اگر تم نے عقل مندی سے کام لیا تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تم خاموشی کے سا اپنے کوارٹر میں جا کر لیٹ جاؤ۔ کوئی پوچھے تو یہی کہنا کہ طبیعت خراب ہے' اس لیے کو میں نہیں گئے۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا' نہ سنا۔ بس یہ بات یاد رکھنا۔ میں نے کنیز کو بھ سمجھا دیا ہے۔ وہ پولیس کو یہی بیان دے گی کہ پہلے دو آدمی کوارٹر میں گھس آئے۔ وہ ک سے خوف زدہ تھے' اور پناہ چاہتے تھے پھر ان کے پیچھے ایک کورین بھی کوارٹر میں آگیا۔ ا تینوں میں زبردست لڑائی ہوئی اور کورین نے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر کوارٹر کا دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا۔

"اور وہ چھوٹی بی بی اور چوکیدار۔" شمسو نے پوچھا۔

"کنیز کے بیان کے مطابق ہی سمجھا جائے گا کہ اسی کورین نے چوکیدار کو زخمی او چھوٹی بی بی کو بے ہوش کیا ہو گا' پھر گاڑی کی چوری بھی اسی کورین کے کھاتے میں ڈال د جائے گی۔ بس تم جلدی کرو۔" پھر میں نے سوٹ کیس کھول کر نوٹوں کی گڈی نکال ک اس کی طرف بڑھائی۔" "یہ تمہارا انعام ہے۔"

"مم--- میں اتنے پیسے کیا کروں گا!" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"رکھ لو انھیں تمہارے کام آئیں گے۔"

اس نے **جھجکتے** ہوئے نوٹوں کی گڈی کرتے کی سائیڈ پاکٹ میں رکھ لی اور بولا "یہ گاڑی---"

"اسے میں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ بعد میں پولیس خود ہی پہنچا دے گی۔ اب تم جاؤ۔

اس کے اترنے کے بعد میں نے رومال سے گاڑی کا ہر وہ حصہ صاف کر دیا جہا جہاں میرے فنگر پرنٹس ملنے کے امکانات تھے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد می بھی گاڑی سے اترا اور بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ می فوری طور پر کہاں جاؤں؟ پھر میں نے کراچی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ جلد ہی مجھے ٹیکسی م گئی۔ ٹیکسی والا بغیر حیل و حجت کے ایئرپورٹ چلنے پر آمادہ بھی ہو گیا۔ مجھے اندازہ نہیں کہ اس وقت کوئی فلائیٹ لاہور یا اسلام آباد جاتی ہے۔

پی آئی اے کے انکوائری کاؤنٹر سے مجھے اطلاع ملی کہ ایک فلائیٹ ساڑھے دس ب اسلام آباد جائے گی۔ خوش قسمتی سے اس میں مجھے سیٹ بھی مل گئی۔ اب مسئلہ ریوالور تھا۔ میں ریوالور لے کر جہاز میں سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نہتا ہونا بھی نہیں چاہتا تھا' مگ اس کے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں ٹہلتا ہوا باتھ روم کی طرف گیا' اور آنکھ بچا ک ریوالور ایک کونے میں ڈال دیا' پھر میں تیزی سے واپس لاؤنج میں آگیا۔ ایئرپورٹ شاپ

سے مجھے اخبار بھی مل گیا۔ میں وقت گزاری کے لیے اخبار پڑھنے لگا' کیوں کہ ابھی صرف آٹھ بجے تھے اور فلائیٹ کی روانگی میں دو گھنٹے باقی تھے۔

اخبار پڑھتے پڑھتے یونہی میری نظر لاؤنج کے دوسرے سرے پر پڑی۔ وہاں دو جاپانی کھڑے تھے' اور لاؤنج میں بیٹھے ہوئے ہر شخص کا جائزہ لے رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر میری چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ بہ ظاہر وہ آپس میں باتیں کرر ہے تھے' مگر اب ان کی نظریں' متلاشی انداز میں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں بھی بہ ظاہر اخبار پڑھنے میں مصروف تھا' مگر اخباری اوٹ سے بہ غور ان کا جائزہ لے رہا تھا۔

اچانک کسی کو دیکھ کر ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہنی ماری۔ ان دونوں کی نظروں کے تعاقب میں' میں نے بھی دروازے کی طرف دیکھا تو اچھل پڑا۔ وانگ یو کی خوب صورت سیکریٹری مس چیکو نپے تلے قدم رکھتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ میں نے جلدی سے اخبار سامنے کر لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مس چیکو مجھے مخاطب کرے۔ اس طرح وہ دونوں جاپانی بھی میری طرف متوجہ ہو سکتے تھے' اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان دونوں جاپانیوں کا تعلق وانگ یو کے مخالفین سے ہے' اگر ان کا تعلق وانگ یو سے ہوتا تو وہ مس چیکو سے انجان نہ بنتے بلکہ اس سے بات چیت کرتے۔ مس چیکو مجھ سے کچھ فاصلے پر آکر بیٹھ گئی۔ دونوں جاپانی بھی اس کے نزدیک ہی براجمان ہو گئے۔ اب مجھے یقین آگیا کہ وہ دونوں مس چیکو ہی کی نگرانی کر رہے تھے' کیوں کہ اب ان کی پوری توجہ مس چیکو کی طرف تھی۔

اچانک ان میں سے ایک جاپانی اٹھا' اور مسکراتا ہوا مس چیکو کی طرف بڑھا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر مس چیکو بھی رسمی طور پر مسکرائی۔ جاپانی نے جھک کر اسے تعظیم دی' اور نہ جانے اس سے کیا کہا۔ اس کی آواز مجھے واضح طور پر سنائی نہیں دے رہی تھی' کیونکہ وہ بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔

پھر میں نے دوسرے جاپانی کو بھی مس چیکو کی طرف آتے دیکھا۔ وہ تینوں ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ ان کی گفتگو سن سکوں' مگر ان کی آوازیں اب بھی واضح نہیں تھیں۔

پھر میں نے مس چیکو کو اٹھتے دیکھا۔ دونوں جاپانی بھی کھڑے ہو گئے' اور وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے لاؤنج سے نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھے۔ میری چھٹی حس مسلسل کسی خطرے کی نشان دہی کر رہی تھی۔ میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ اب بھی فلائیٹ میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ پھر میں نے بھی ان لوگوں کے تعاقب کا فیصلہ کر لیا۔ مشکل یہ تھی کہ میرے پاس گاڑی نہیں تھی۔ وہ تینوں پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جائیں گے۔ میں سوٹ کیس لے کر تیزی کے ساتھ

اس طرف بڑھا جہاں ایک قطار میں ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں نے میٹر سے دگنے پیسے دینے کا وعدہ کرکے اسے چلنے پر راضی کر لیا۔ پارکنگ لاٹ کا منظر وہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تینوں سفید رنگ کی ایک ہل مین کار میں بیٹھ گئے۔ دونوں جاپانی اگلی سیٹ پر تھے' اور مس چیکو پچھلی سیٹ پر! میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا' اور ڈرائیور کو دیتے ہوئے بولا۔ "اگر تم بغیر کسی سوال کیے میری ہدایات پر عمل کرو گے تو یہ تمہارا انعام ہو گا۔"

"کسی الٹے سیدھے چکر میں مت پھنسا دیجئے گا۔" ڈرائیور نے نوٹ لے کر کہا۔

"کوئی الٹا سیدھا چکر نہیں ہے۔" بس تمہیں ایک گاڑی کا پیچھا کرنا ہے۔"

"کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہے صاحب۔" ڈرائیور ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"یار تم ہو بہت ذہین۔" میں بھی خوش دلی سے مسکرایا۔

"اب تم سے کیا چھپانا۔ واقعی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔" پھر میں نے سفید ہل مین کو روانہ ہوتے دیکھ کر کہا۔ "چلو جلدی کرو۔ وہ سفید ہل مین جا رہی ہے اس کا پیچھا کرنا ہے' مگر ذرا احتیاط سے' لڑکی کے بھائیوں کو شبہ نہ ہو جائے کہ ہم ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔" آج تو میں اس کا گھر معلوم کرکے رہوں گا۔"

"آپ فکر مت کریں صاحب!" ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ان کے باپ کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ میں ان کے پیچھے ہوں۔"

پھر ہل مین شاہراہ فیصل پر پہنچ کر بائیں طرف مڑ گئی اب اس کا رخ لانڈھی کی طرف تھا۔ دونوں گاڑیاں تیز رفتاری سے آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔ لانڈھی کا پل اتر کے ہل مین دائیں طرف واقع ایک عمارت کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ اس عمارت پہ نمایاں الفاظ میں سوئیڈش انسٹیٹیوٹ لکھا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔ تقریباً دس منٹ تک انتظار کرنے کے بعد میں نے کرائے کے علاوہ اسے مزید سو روپے دیے اور ٹیکسی سے نیچے اتر گیا۔ ڈرائیور نے خوشی سے باچھیں پھیلا کر مجھے سلام کیا' اور رخصت ہو گیا۔ میں تذبذب میں مبتلا تھا کہ اندر جاؤں یا یہیں ٹھہر کر مس چیکو کا انتظار کرتا رہوں۔ سب سے بڑی رکاوٹ وہ سوٹ کیس تھا۔ میں خالی ہاتھ ہوتا تو بے جھجک اندر داخل ہو جاتا' مگر سوٹ کیس کی موجودگی سے پریشان ہو گیا تھا۔ سوٹ کیس کی بدولت میں خواہ مخواہ لوگوں کی نظروں میں آ جاتا۔ پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ اندر نہ جانے کس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑے۔

سڑک پار کرکے میں اس انسٹی ٹیوٹ کے گیٹ کی طرف بڑھا تو ایک آدمی گیٹ سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ میں نے آواز دے کر اسے روک لیا اور کہا۔ "بھائی صاحب! یہاں صدیقی صاحب ہوتے ہیں۔ کیا وہ اس وقت بھی موجود ہیں؟"

"کون صدیقی؟" اس نے بھنویں چڑھا کر اپنی یادداشت پر زور ڈالا۔ "وہ جو یہاں پڑھاتے ہیں؟"

"ہاں---- ہاں--- وہی۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "کیا وہ اس وقت موجود ہیں؟"

"انسٹی ٹیوٹ تو بند ہے۔ کلاسز ایک ہفتے بعد شروع ہوں گی۔ اس نے بتایا' پھر ہمدردی سے بولا۔ "آپ شاید کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں؟"

"ہاں بھائی!" میں نے مایوسی کا مظاہرہ کیا۔ "میں ابھی ٹنڈو آدم سے آ رہا ہوں۔"

"اندر چوکیدار موجود ہے شاید اسے صدیقی صاحب کے گھر کا پتا ہو۔" اس نے کہا۔ "سیدھے چلے جایئے' بلڈنگ کی پچھلی طرف چوکیدار کا کوارٹر ہے۔"

"شکریہ بھائی صاحب!" میں نے ممنونیت کا اظہار کیا اور سوٹ کیس اٹھا کر اندر بڑھ گیا۔

عمارت بالکل سنسان پڑی تھی۔ سفید ہل مین بھی نظر نہیں آ رہی تھی' مگر جونہی میں گھوم کر عمارت کی پشت پر پہنچا' ہل مین نظر آ گئی۔ وہ ایک کوارٹر کے آگے کھڑی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ادھر بڑھ گیا۔

میں کوارٹر کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ اچانک چوکیدار ٹائپ ایک شخص میرے سامنے آ گیا۔ "اوئے کدھر جاتا ہے؟ اس نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔"

"بھائی صاحب! یہاں میرے دوست ہیروہیٹو آئے ہیں۔" میں نے جلدی سے جاپانی شہزادے کا نام لے دیا۔ "ان سے مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میں دوپہر کی گاڑی سے کوئٹہ جا رہا ہوں۔"

"ادھر کوئی ہیرو میرو نہیں آیا۔" اس نے اسی اکھڑ لہجے میں کہا۔ "ہٹو سامنے سے وہ اندر بیٹھے ہیں۔ ان کی گاڑی تو یہیں موجود ہے۔"

"تم جاتا ہے کہ نہیں۔" چوکیدار نے میرا گریبان پکڑنا چاہا۔

میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ کے زوردار جھٹکا دیا اور اس کی کنپٹی پر نپا تلا ہاتھ جما دیا۔ چوکیدار وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اسے گھسیٹ کے ہل مین کی آڑ میں ڈالا' اور دبے قدموں کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ اندر چھوٹا سا صحن تھا اس کے بعد ایک کمرا تھا جس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اس کمرے میں سے کسی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں ذرا نزدیک پہنچا تو آواز واضح طور پر سنائی دی۔ کوئی جاپانی زبان میں بولا "سیدھی طرح بتاتی ہے یا---"

"میں کہہ تو چکی ہوں کہ جس وقت وانگ قتل ہوا' میں وہاں نہیں تھی۔"

"تو ایسے نہیں بتائے گی۔" مرد دانت پیس کر بولا تھا' پھر وہ کسی سے مخاطب ہوا۔

"الٹا لٹکا دو اسے۔ یہاں اس کی چیخ پکار سننے والا کوئی نہیں ہے۔"

میں نے احتیاط سے سوٹ کیس صحن میں رکھے ہوئے پلنگ کے نیچے چھپایا' اور کمرے کے دروازے پر پہنچ کر بلند آواز میں بولا۔ "بھئی دوستو! تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ حرکت مت کرنا ورنہ یہاں گولی کی آواز سننے والا بھی کوئی نہیں ہے۔" میں نے یہ جملے جاپانی ہی میں ادا کیے تھے۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنا ریوالور پھینک کیوں دیا تھا۔

وہ دونوں اچانک میری آواز سن کر سکتے میں رہ گئے۔ میں نے اس انداز سے جیب میں ہاتھ ڈال رکھے تھے جیسے میری داہنی جیب میں واقعی ریوالور موجود ہو۔ مس چیکو کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی ایک کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔ دونوں جاپانیوں نے بے اختیار ہاتھ اوپر اٹھا لیے تھے۔ پھر ان میں سے ایک سنبھل کر بولا۔ "کون ہو تم اور یہاں کیسے آ گئے؟"

"کوئی سوال نہیں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "اب تم دونوں گھوم کر دیوار پر ہاتھ ٹکا کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ۔۔۔" میں نے یونہی اپنے داہنے ہاتھ کو جیب کے اندر حرکت دی۔

○

وہ دونوں جلدی سے گھوم کر دیوار سے ٹک گئے۔ میں نے مس چیکو کی بندشیں کھولیں' اور انھیں سنانے کے لیے اس سے کہا' یہ ریوالور پکڑو۔ میں ان کی تلاشی لیتا ہوں۔ یہ ذرا سی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کریں تو بے دریغ فائر کر دینا۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھا' اور میں نے باری باری دونوں کی تلاشی لی۔ ان دونوں کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ شاید وہ ابھی اسی فلائٹ سے جا رہے تھے' ورنہ ان کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ضرور ہوتا۔ وہ دونوں ہی کسرتی اور مضبوط جسموں کے مالک تھے۔ ان میں سے ایک کے سر پہ گھنے بال تھے' دوسرا جاپانی فارغ البال تھا۔ اس کا سر انڈے کی طرح شفاف تھا۔ وہی مجھے زیادہ خطرناک لگ رہا تھا۔ پھر اس نے میرے خیال کی تصدیق بھی کر دی۔ اس کی تلاشی سے فارغ ہو کر ایک لمحے کو میرا دھیان ہٹ گیا۔ اس نے پینترا بدل کر گدھے کی طرح لات گھمائی جو عین وقت پر ہٹنے کی وجہ سے میرے منہ کی بجائے دائیں شانے پر پڑی۔ ایک لمحے کو مجھے ایسا لگا جیسے میرا بازو شانے سے اکھڑ گیا ہو۔ اسے دیکھ کر دوسرا جاپانی بھی شیر ہو گیا۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ دونوں کراٹے کے بہترین فائٹر ہیں۔ میں نے کن انکھیوں سے مس چیکو کی طرف دیکھا وہ بھی میدان میں آنے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ مس چیکو بھی کراٹے کی زبردست فائٹر ہے' مگر اس کی وجہ سے میں آزادانہ حرکت نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے آواز دے کر اسے روک دیا۔ اچانک گنجا اڑتا ہوا مجھ پہ آ پڑا۔ واقعی وہ بہت پھرتیلا تھا۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ سے میری گردن پر کراٹے کا خوف ناک وار کرنا چاہا' مگر میں نے جسم کو تھوڑا سا پیچھے جھکا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ ہاتھوں کے بل دوڑ دوڑ کے میرے ہاتھ فولاد کی طرح سخت' اور مضبوط ہو گئے تھے۔ میری گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ تلملا کر رہ گیا۔ اگر وہ کلائی چھڑانے کے لیے زور لگاتا تو اس کا ہاتھ ٹوٹ جاتا۔ یہ بات شاید وہ بھی جانتا تھا اسی لیے اس نے گھٹنا پوری طاقت سے میرے پیٹ میں مارا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس ضرب سے وہیں گر کر بے ہوش ہو جاتا' مگر وانگ نے مجھے ناقابل تسخیر بنانے کے لیے میرے پیٹ' کمر' سینے اور پیٹھ پر ڈنڈے برسائے تھے۔ مجھے اس ضرب کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا' پھر میں نے اس کی بیلٹ میں ہاتھ ڈال کر اسے

کمرے میں گردش دی اور اچانک اس کے ساتھی کی طرف اچھال دیا- وہ اپنے ساتھی کو ساتھ لیتا ہوا سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا- میں انھیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ان کے سر پہ جا پہنچا' پھر ایک کی کمر پہ میری گھوڑے ایسی طاقت ور لات پڑی اور گنجے کے سر کو میں نے ہاتھ سے نشانہ بنایا- دوسرے ہی لمحے وہ اوپر تلے ڈھیر ہو گئے- میں نے چیکو کا ہاتھ پکڑا' اور باہر کی طرف دوڑا- ہل مین کے پاس چوکیدار پڑا کسمسا رہا تھا- میں نے ہلکی سی ضرب اس کے سر پر لگا کے اسے دوبارہ ناک آؤٹ کر دیا- گاڑی کی چابی اگنیشن میں موجود نہیں تھی- میں نے مس چیکو سے چابی لانے کو کہا اور خود سوٹ کیس لینے چل دیا-

تھوڑی دیر بعد ہم اسی ہل مین میں دوبارہ ایئرپورٹ کی طرف جا رہے تھے- مجھے ایئرپورٹ کی طرف مڑتے دیکھ کر مس چیکو نے کہا- "آج کہیں نہ جاؤ تو بہتر ہے- انھیں علم ہو چکا ہے کہ میں کراچی سے باہر جا رہی ہوں-"

"میں ایئرپورٹ پر صرف گاڑی چھوڑوں گا' پھر ہم لوگ ٹیکسی کے ذریعے واپس آ جائیں گے- گاڑی ایئرپورٹ پر دیکھ کر وہ یہی سمجھیں گے کہ ہم لوگ اسلام آباد روانہ ہو گئے ہیں-

میں نے گاڑی ایئرپورٹ کے پارکنگ لاٹ میں چھوڑی' اور سوٹ کیس لے کر باہر آ گیا-.چیکو اس دوران میں ایک ٹیکسی روک چکی تھی- میں نے سوٹ کیس ڈکی میں رکھوایا' اور چیکو کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا- چیکو نے ڈرائیور سے انٹرکانٹ چلنے کو کہا- اس زمانے میں انٹر کانٹ' پرل کانٹی نینٹل نہیں بنا تھا-

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا- مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ ان دونوں جاپانیوں کو زندہ چھوڑ دیا- وہ نہ صرف میرا حلیہ دوسروں کو بتا دیں گے' بلکہ خود بھی مجھے شدومد سے تلاش کریں گے- میں اب آزادی سے باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا- میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار چیکو سے کیا تو وہ ہنس کر بولی "ویسے بھی تمہیں بہت سے لوگ پہچانتے ہیں- تم شاید رحیم اور اقبال کو بھول گئے جنھیں تم نے لوہے کے گولوں پر دوڑ کر دکھایا تھا- ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تمہاری صورت سے آشنا ہیں- اکثر وہ لوگ وانگ کے پاس آتے رہتے تھے- انہی میں سے کچھ لوگ دشمنوں سے مل گئے ہیں- رحیم اور اقبال بھی ان ہی لوگوں میں شامل ہیں-"

"اس کا مطلب ہے میں یہاں بند ہو کر بیٹھ جاؤں-"

میری بات پر چیکو کھل کھلا کر ہنسنے لگی- "تم ذہنی طور پر ابھی تک بچے ہو خرم! میں نے کب کہا ہے کہ تم یہاں قید ہو جاؤ-" پھر وہ کچھ سوچ کر بولی- "وہ بریف کیس کہاں ہے؟"

"کون سا بریف کیس---؟" میں نے حیرت ظاہر کی-

"زیادہ انجان مت بنو۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ میں وانگ کے بریف کیس کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔

"میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "تمہیں کیسے یہ شبہ ہوا کہ بریف کیس کے بارے میں مجھے علم ہے۔"

"وانگ تم پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ جب اس پہ حملہ ہوا تو تم بھی موجود تھے۔ پھر وہ بریف کیس تمہارے سوا کس کے حوالے کر سکتا تھا؟"

"جب تک میں وہاں پہنچا۔ وانگ کے دشمن اپنا کام کر چکے تھے۔ وانگ اگر زندہ ہوتا تو ضرور مجھے بریف کیس کے بارے میں بتاتا، مگر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے تو میں اس سے اپنی بہن کا پتا پوچھتا۔ میں برسوں سے اسے تلاش کر رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے، ارے--- تم تو ایک دم جذباتی ہو گئے۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں نے تو صرف اس لیے پوچھ لیا کہ بریف کیس حملہ آوروں کو بھی نہیں ملا۔ پھر وہ گیا کہاں؟"

"میں اس سلسلے میں کیا کہوں۔" میں نے شانے اچکا کر کہا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت بریف کیس کی طرف میرا دھیان ہی نہ گیا۔ مجھے وانگ کی موت سے زبردست صدمہ پہنچا تھا کہ دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔"

"حیرت تو مجھے اس بات پر ہے کہ وانگ جیسا آدمی مار کیسے کھا گیا؟"

"جب انسان کی موت آتی ہے تو کوئی معمولی سی بات اس کا بہانہ بن جاتی ہے۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "بس اس کی موت آ گئی اس لیے مار کھا گیا۔"

"مگر وہ بریف کیس گیا کہاں؟" چیکو خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"ارے یار، تمہاری سوئی ابھی تک اسی بات پر اٹکی ہوئی ہے۔" میں نے جھلاہٹ ظاہر کی۔ "لعنت بھیجو بریف کیس پر! تمہیں آخر کیا دلچسپی ہے اس سے؟"

"وہ معمولی بریف کیس نہیں ہے خرم!" چیکو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں کہ وہ معمولی بریف کیس نہیں ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "اسی لیے تو اتنے انسانوں کو کھا گیا، اور شاید ابھی مزید خون بہے گا اس کی وجہ سے۔ تم یہ سوچو کہ میں باہر کیسے نکل سکتا ہوں؟"

"اپنی بہت فکر ہے تمہیں۔" چیکو ہنس کر بولی۔ "میں تو کہیں زیادہ خطرے میں ہوں۔ مجھے تو بے شمار لوگ پہچانتے ہیں--- مگر تم پریشان مت ہو۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں ایک شخص کو جانتی ہوں وہ کسی زمانے میں فلموں کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ حلیہ بدلنے میں ماہر ہے۔ جب سے فلم انڈسٹری لاہور منتقل ہوئی ہے اس کے حالات بھی بہت خراب ہیں۔ وہ ہمارے حلیے بدل دے گا، مگر تم باہر نکل کر کرو گے کیا؟"

"میں اپنی بہن کو تلاش کروں گا- تم آج ہی اس شخص کو لے آؤ-"

چیکو جواب میں کچھ نہ بولی- وہ خاموشی سے کچھ سوچتی رہی-

پھر ہم نے کمرے ہی میں ناشتا کیا' اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد چیکو کہیں روانہ ہو گئی- اس کے جانے کے بعد میں بھی کمرا لاک کر کے باہر نکلا' اور ہوٹل کی دکان سے چمڑے کا ایک بیگ خرید کر لے آیا- میں بریف کیس کا سامان بیگ میں منتقل کر کے اسے کسی بینک لاکر میں رکھنا چاہتا تھا- میں نہیں چاہتا تھا کہ چیکو کو بریف کیس کے بارے میں علم ہو- اگر مناسب سمجھتا تو وانگ ہی بریف کیس اس کے حوالے کر دیتا- میں نے بریف کیس کھولا' اور اس کی تمام چیزیں چرمی بیگ میں منتقل کر دیں- پھر میں نے نوٹوں کی دو تین گڈیاں اوپر رکھ کر باقی نوٹ بھی کپڑوں کی تہوں میں چھپا دیئے- احتیاطاً میں نے بریف کیس کو ادھیڑ ڈالا کہ ممکن ہے' اس میں کوئی خفیہ خانہ بھی ہو' مگر اس میں کوئی خفیہ خانہ نہیں تھا- بریف کیس کا ملبہ میں نے ایک اخبار میں باندھا' اور بیگ کندھے سے لٹکا کر باہر نکل گیا- تھوڑی دیر بعد میں ٹیکسی میں سوار بینک کی طرف جا رہا تھا- میں نے جان بوجھ کر ہوٹل میں واقع بینک میں لاکر لینے سے گریز کیا تھا-

آدھے گھنٹے بعد میں واپس ہوٹل پہنچ گیا' پھر مزید احتیاط کے طور پر میں نے سوٹ کیس کی تمام رقم کا بڑا سا ایک پیکٹ بنایا- اس مقصد کے لئے میں باہر ہی سے خاکی کاغذ اور ٹیپ کے کئی رول لے آیا تھا- پیکٹ کو چاروں طرف سے بند کرنے کے بعد میں نے اس پر اپنا فرضی نام "محمد اکرم جنجوعہ" لکھا- میں نے ہوٹل میں اسی نام سے کمرا لیا تھا' پھر وہ پیکٹ میں نے کاؤنٹر پر جا کر ہوٹل کے لاکر میں رکھ دیا اور احتیاطاً انہیں ہدایت کر دی کہ میں چند دنوں کے لیے کراچی سے باہر جا رہا ہوں' مگر کمرا میرے نام سے بک رہے گا- میں نے ایک ہفتے کا ایڈوانس کرایہ بھی دے دیا-

ساری رات کی بھاگ دوڑ کے بعد جب میں بستر پر لیٹا تو ایسی زبردست نیند آئی کہ دروازے پر ہونے والی دستک ہی سے آنکھ کھلی- میں نے احتیاط کے طور پر یہ دروازہ بھی بولٹ کر دیا تھا-

"کون ہے؟" میں نے جھلا کر پوچھا-

"میں ہوں چیکو- دروازہ کھولو-"

چیکو کی آواز سن کر میں جھپٹ کر اٹھا- نہ جانے وہ کتنی دیر سے دروازہ پیٹ رہی تھی- میں نے دروازہ کھولا تو وہ ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ اندر آ گئی-

"کیسے بے خبر ہو کے سوتے ہو!" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا- "میں پچھلے پانچ منٹ سے دروازہ پیٹ رہی ہوں- اگر تم اب بھی دروازہ نہ کھولتے تو میں ہوٹل کے مینجر کو بلا لیتی-" پھر اسے اپنے ساتھ آنے والے شخص کا خیال آیا تو بولی- "یہ شریف صاحب ہیں-

مشہور میک اپ مین- میں نے انہی کا تذکرہ کیا تھا-"

شریف حیرت سے منہ کھولے وہ جناتی زبان سن رہا تھا- ظاہر ہے' جاپانی زبان تقریباً ہر پاکستانی کے لیے اتنی ہی نامانوس ہے-

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر!" میں نے مسکرا کر اردو میں کہا-

میرے منہ سے شستہ اردو سن کر وہ حیرت سے اچھل پڑا- شاید وہ مجھے بھی جاپانی سمجھ رہا تھا-

میں نے اس کی حیرت رفع کرنے کو کہا- "شریف صاحب! میں خالص پاکستانی ہوں- جاپانی زبان تو مجھے اس بت طناز نے سکھائی ہے-" میں نے چیکو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا-

"بھئی! خوب سکھائی ہے-" وہ خوش دلی سے بولا- "کیا یہ کافر ادا' یہ خوش نوائی ہمیں بھی سکھا سکتی ہے؟"

"اسی سے پوچھ کر دیکھ لیجیے- ویسے میرا خیال ہے کہ اس نے آپ زبان سیکھنے کے لئے تو یہاں نہیں بلایا ہو گا- پہلے کام کی بات ہو جائے پھر دوسری کوئی بات-" میں نے ہنس کر کہا- مجھے اس شخص پر رشک آیا- حالات کی چکی میں پستے پستے اس کی حالت پتلی ہو چکی تھی- جسم پر ڈھنگ کا لباس بھی نہیں تھا' اور وہ اتنا معمر تھا نہیں' جتنا نظر آتا تھا- اس کے باوجود اس کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی باقی تھی- اس قسم کے لوگ بے حس نہیں ہوتے' بلکہ اپنے غموں کو قہقہوں میں اڑا دینے کے عادی ہوتے ہیں- نہ جانے وہ کب سے نامساعد حالات سے نبرد آزما تھا-

"کیا سوچنے لگے برخوردار؟" اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا- "بتاؤ! کیا بننا پسند کرو گے؟ بوڑھا یا جوان؟ پاکستانی یا غیر ملکی؟"

"آپ مجھے کیا بنا سکتے ہیں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا- چیکو خاموشی سے ہم دونوں کو گھور رہی تھی-

"بھئی! میں تو بوڑھے کو جوان اور جوان کو بڑھا بنا دوں-"

"آپ مجھے بھی جاپانی بنا دیں-" میں نے یونہی کہہ دیا-

"ٹھیک ہے-" اس نے سر ہلایا پھر چیکو کی طرف اشارہ کر کے بولا- "ان عفیفہ کو کیا بناؤں؟ قمری یا فاختہ؟"

"ہو سکے تو انہیں چیل بنا دیں-" میں نے سنجیدگی سے کہا- "اگر مکمل بنا سکیں تو تب ہی اچھا ہو-"

پھر اس نے بیگ سے انواع و اقسام کے لوشنز' کلرز اور مختلف کریمز نکال کر ٹیبل پر ڈھیر کر دیں' پھر وہ میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر مختلف زاویوں سے اس کا جائزہ لینے

لگا۔

پھر طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں بہت غور سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی دیکھ کر میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا مایوسی ہوئی میرے چہرے سے؟"

"تمہارا جاپانی بننا ممکن نہیں ہے۔ میں تمہیں امریکن سیاح کا روپ دے دوں گا۔"

پھر وہ بہت مہارت اور تیزی سے میرے چہرے پر کام کرتا رہا۔ اس نے میرے بالوں پر کوئی کلر لگایا' وہی کلر مونچھوں اور بھنوں پر بھی لگایا' پھر میرے چہرے پر مختلف کریموں اور لوشنوں کی مالش کرتا رہا۔ اس دوران میں چیکو ایک رسالے کی ورق گردانی رہی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے کام سے فارغ ہو گیا' اور مجھ سے آئینہ دیکھنے کو کہا۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو چونک اٹھا۔ آئینے میں بیک کومب کئے ہوئے براؤن بالوں' اور گھنی براؤن مونچھوں والا کوئی امریکن کھڑا تھا۔ شریف نے اپنے بیگ سے ایم ایس فریم کا چشمہ نکال کر میری آنکھوں پر لگایا تو میری شکل مزید بدل گئی۔ اس نے نہ جانے میرے چہرے پر کس لوشن کی مالش کی تھی کہ میری رنگت پھیکے شلجم ایسی ہو گی تھی۔ پھر اس نے بیگ سے تمباکو نوشی کا پائپ نکال کر میرے ہونٹوں میں تھما دیا' اور بولا۔ "اب تمہاری شخصیت مکمل طور پر بدل گئی ہے۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ جب تم یہ فرنچ کٹ داڑھی بنا کر بالوں کو پرانے اسٹائل میں بناؤ گے تو لوگ تمہیں خرم کی حیثیت سے پہچان لیں گے۔"

میں اس کی کاریگری پر حیران تھا۔ پھر اس نے چیکو کے چہرے پر کارروائی شروع کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سرخ و سفید رنگ سیاہ ہو گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد چیکو کی جگہ ایک نیگرو لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے خوب صورت بال بھی گھونگھریالے ہو گئے۔ تھے۔ جب چیکو نے آئینہ دیکھا تو بے ساختہ قہقہے لگانے لگی۔ شریف نے برا مان کر کہا۔ "آخر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ میرے فن کی تعریف کرنے کی بجائے تم لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہو!"

"یہ آپ کے فن کی تعریف ہی تو ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

شریف نے ایک ٹیوب چیکو کے حوالے کیا اور بولا کہ باتھ روم میں جا کر جسم کے دوسرے حصوں پر بھی اس کریم کی مالش کر لو ورنہ بلیک اینڈ وائٹ لڑکی سمجھ کر اخبار والے تمہارے پیچھے لگ جائیں گے۔

"خرم کا میک اپ تو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ یہ کسی وقت بھی اپنے پرانے روپ میں آ سکتا ہے مگر تم چھ مہینے سے پہلے اپنی اصلی شکل نہ دیکھ سکو گی۔ مزید ضرورت ہو تو یہ ٹیوب استعمال کر لینا۔" شریف نے سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

میں نے چند بڑے نوٹ نکال کر اسے دینا چاہے' مگر اس نے انکار کر دیا کہ میں اتنے

زیادہ معاوضے کا حق دار نہیں ہوں۔ میں نے نوٹ زبردستی اس کی جیب میں ٹھونس دیے۔ میں نے روم سروس کے ذریعے چائے منگا لی۔ چائے پی کر شریف رخصت ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد چیکو بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا کمرا میرے کمرے کے عین سامنے تھا۔ چند منٹ بعد وہ پھر لوٹ آئی اور تشویش سے بولی۔ "میک اپ کراتے وقت مجھے بالکل خیال نہ رہا کہ میں ہوٹل میں مقیم ہوں۔ اب بتاؤ کیا کیا جائے؟" ہوٹل والے اس کمرے میں میرے بجائے کوئی اجنبی شکل دیکھیں گے تو ایک مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔"

"جب شریف مجھ سے بات کر رہا تھا تو تمھیں خیال نہیں آیا۔ وہ بھی تو مجھ سے یہی کہہ رہا تھا کہ ---"

"تم اس سے اردو میں بات کر رہے تھے۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"اچھا ابھی تو یہ مکروہ صورت میرے سامنے سے ہٹاؤ۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "مجھے کچھ سوچنے دو۔"

"اس کم بخت نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اس رنگت سے چھٹکارا پانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"ارے بابا، یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ تمھیں اس کے ٹھکانے کا علم ہے۔ اس کے پاس جاؤ اور پوچھ آؤ۔"

"کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو" وہ جھنجلا کر بولی۔ "میں تو تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد اس کے پاس جاؤں گی۔"

اچانک دروازے پر کسی نے ناک کیا۔

"کم ان! میں نے بے نیازی سے کہا۔ میرا خیال تھا کہ ویٹر ہو گا، اور چائے کے خالی برتن لینے آیا ہو گا۔"

دروازہ اچانک کھلا اور تین آدمی اندر گھس آئے۔ انھیں دیکھ کر میں نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی، مگر ان میں سے ایک نے اچانک ریوالور نکال لیا، اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "سنیں سر! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا!" پھر وہ چیکو سے مخاطب ہوا۔ "تم کون ہو؟"

"میری فکر مت کرو۔" چیکو نے اپنی اصلی آواز میں کہا۔ تو وہ اچھل پڑا۔

چیکو کے رویے پر میں بھی حیرت زدہ تھا۔ وہ آنے والے سے یوں بات کر رہی تھی جیسے اسے پہلے سے جانتی ہو۔

"اوہو! تو یہ تم ہو؟" دوسرے شخص نے زبان کھولی۔ "پھر یہ یقیناً خرم ہو گا۔"

"کون ہو تم لوگ؟" میں نے متعجب لہجے میں پوچھا اور ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

ریوالور والے نے ایک دم لات گھمائی جو میرے چہرے پر پڑی۔ میں کرسی سمیت

الٹ گیا۔ "میں نے کہا ناکہ حرکت کرنے کی کوشش مت کرو۔" پھر وہ چیکو سے مخاطب ہوا۔ "چیکو اس کی تلاشی لو۔"

"کچھ نہیں اس کے پاس!" چیکو نے کہا۔

میں حیرت سے کبھی چیکو کی شکل دیکھ رہا تھا' کبھی ریوالور والے کی۔ میں ابھی تک کرسی میں الجھا ہوا فرش پر پڑا تھا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے ان تینوں کا جائزہ لیا۔ ان کے قدوقامت اور حلیے سے قومیت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا' کہ وہ کسی سفید فام قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اب بقیہ دو نے بھی ریوالور نکال لیے تھے۔ ان تینوں کے ریوالورز بھی سائیلنسر چڑھے ہوئے تھے۔ گویا وہ پوری تیاری سے آئے تھے۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ فائر کرنے میں بھی دیر نہیں کریں گے' پھر ان میں سے ایک نے اپنی جیب سے ریشمی ڈوری کا گولہ نکالا اور چیکو کی طرف پھینک کر بولا کہ اس کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح جکڑ دو۔ ان تینوں میں سے کوئی نزدیک آنے کا رسک نہیں لے رہا تھا۔ شاید انھیں میرے بارے میں بریف کر دیا گیا تھا۔ میرے چہرے پر بھرپور لات پڑی تھی' اور ہونٹوں سے خون بھی بہہ رہا تھا' مگر چوٹ سے زیادہ مجھے چیکو کے رویے نے صدمہ پہنچایا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دشمنوں سے مل گئی ہے۔

چیکو گھوم کر میری پشت پر آئی' پھر گویا میرے سر پہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سر پر پڑنے والی ضرب اتنی ہی زبردست تھی۔ سر جھٹک کر حواس بحال کرنے کی کوشش کی مگر ذہن آہستہ آہستہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

مجھے ہوش آیا تو میں فرش کی بجائے بستر پہ تھا' مگر ہاتھ پیر ہلانے سے معذور تھا کیوں کہ مجھے بہت سختی سے باندھا گیا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں چیکو کی آواز آئی۔ "میں نے اس کے سامان کی اچھی طرح تلاشی لے لی ہے اس میں کوئی چیز ہمارے کام کی نہیں ہے۔"

"تم نے اس سے پوچھا کہ بریف کیس کہاں ہے؟" یہ اسی آدمی کی آواز تھی جس نے مجھے لات ماری تھی۔

"پوچھا تھا۔" چیکو تھکے تھکے انداز میں بولی۔ "مگر یہ کہتا ہے کہ اسے کچھ علم نہیں۔"

"بکواس کرتا ہے۔" وہ شخص غرا کر بولا۔ "وانگ یو کا خفیہ سیف کھلا ہوا' مگر بالکل خالی ملا تھا ہمیں۔ وہ کاغذات اور مائکرو فلمیں ہم نے نہیں لیں تو پھر کون لے گیا؟ اور یہ وہاں سے فرار کیوں ہوا؟"

"اسی بات نے مجھے شبے میں مبتلا کر رکھا ہے۔" چیکو نے کہا۔ "خیر دیکھتے ہیں یہ کب تک زبان نہیں کھولتا۔" اسے ذرا ہوش میں آنے دو پھر پوچھوں گی اس سے۔"

میں یونہی آنکھیں بند کیے پڑا رہا' وہ چاروں آپس میں صلاح مشورے کرتے رہے کہ میری زبان کیسے کھلوائی جائے۔ بالآخر انھوں نے یہی طے کیا کہ مجھے فوری طور پر ہوٹل سے نکال کر کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا جائے۔ میں ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے ہوٹل سے لے آئے ہوں گے۔ میں نے مزید بے ہوش رہنا مناسب نہ سمجھا' اور کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ میری آواز سن کر وہ چاروں بولتے بولتے خاموش ہو گئے۔ پھر ریوالور والا میرے سامنے آگیا اور بولا۔ "دیکھو خرم! ہم تھوڑی دیر بعد تمہیں یہاں سے نکال لے جائیں گے۔ بہتر ہے کہ تم اس سے پہلے ہی زبان کھول دو ورنہ اس پوچھ گچھ کے دوران میں تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔" میں خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ "حیران ہونے کی اداکاری مت کرو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم وہ دستاویزات اور مائکرو فلمز کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔"

"مجھے جو کچھ معلوم تھا میں چیکو کو بتا چکا ہوں۔ اس وقت تو مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ میرے دشمنوں کے ساتھ ہے۔ کیا یہ میری سچائی کا ثبوت نہیں ہے۔"

"چھوڑو ایڈی!" چیکو نے کہا۔ "یہاں اس سے کچھ پوچھنا فضول ہے۔ اسے یہاں سے لے چلو۔"

"ایڈی نے ریوالور نکال کر نالی کی طرف سے پکڑا اور دستے سے میرے سر پہ پھر ضرب لگا دی' میں ایک مرتبہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں کسی گاڑی میں تھا' اور گاڑی تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔ ان خبیثوں نے نہ جانے کس بہانے سے مجھے بے ہوشی کی حالت میں ہوٹل سے نکالا ہو گا۔ مجھے اطمینان تھا کہ میں نے وانگ یو کا سامان بینک لاکرز میں محفوظ کر دیا تھا۔ لاکر کی چابی میں نے ٹیپ کی مدد سے ٹیبل کی سطح کے نیچے چپکا دی تھی۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ انھیں وہ چابی نہ مل گئی ہو۔ اس صورت میں میری مشکلات میں اضافہ ہو جاتا' نہ جانے گاڑی کتنی دیر سے چل رہی تھی' اور میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی' اور تھوڑی دیر بعد وہ جھٹکے سے رک گئی۔ کسی نے انگریزی میں گیٹ کھولنے کا حکم دیا۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی پھر حرکت میں آئی' اور کسی عمارت میں داخل ہو کر رک گئی۔ گاڑی رکتے ہی مجھے کتوں کی غراہٹیں سنائی دیں۔ ایک لمحے کو تو مجھے خیال آیا کہ شاید وہ لوگ مجھے دوبارہ وانگ کی کوٹھی میں لے آئے ہیں۔

اچانک گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا تو باہر جلنے والے بلب کی روشنی اندر بھی آگئی' میں نے جلدی سے آنکھیں موند لیں۔ پھر کسی نے وہ سیٹ پکڑ کر کھینچ لی جس پر میں لیٹا ہوا

تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ اسٹریچر تھا' اور گاڑی ایمبولینس تھی۔ میں اب بھی ہلنے جلنے سے معذور تھا' کیونکہ ان لوگوں نے میرے ہاتھ پاؤں نہیں کھولے تھے۔ بندشیں چھپانے کے لیے انھوں نے اوپر سے چادر ڈال دی تھی۔ دو آدمیوں نے دونوں سروں سے اسٹریچر اٹھا لیا اور وہ مجھے اندر کی طرف لے چلے۔ میں نے آنکھیں بہت خفیف سی کھولیں' اور اس جگہ کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ یہ وانگ یو کی کوٹھی نہیں تھی۔ کتے بھی اب خاموش ہو گئے تھے۔ وہ دونوں میرا اسٹریچر اٹھائے ہوئے ایک کمرے میں پہنچے' اور اسٹریچر وہاں پٹخ کے الٹے قدموں باہر نکل گئے۔ وہ کمرا کسی کا بیڈ روم تھا' اور خوب آراستہ تھا۔ فرش پر وال ٹو وال کارپیٹ تھا' بیڈ بھی قیمتی معلوم ہو رہا تھا' اور میرے سامنے والی دیوار پر خوفناک قسم کے گرے ہاؤنڈ کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کتا اچانک تصویر میں سے نکل کر حملہ کر دے گا۔ وہ بیڈ روم جس کا بھی تھا شاید اسے کتوں سے بہت محبت تھی۔

ابھی میں کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ کمرے میں چار آدمی آگے پیچھے داخل ہوئے۔ ایڈی اور اس کے دونوں ساتھی میرے لیے اب اجنبی نہیں رہے تھے' مگر چوتھا شخص میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اس کا چہرہ بہت بارعب تھا' مونچھیں اتنی گھنی تھیں کہ ہونٹ تقریباً چھپ کر رہ گئے تھے۔ اس کی رنگت سرخ و سفید تھی' مگر آنکھیں' اور بال سیاہ تھے جن سے وہ کسی ایشیائی ملک کا باشندہ لگ رہا تھا۔ وہ میرے اوپر جھک کر ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔" ویل منسٹر کورم! اب ہم لوگوں کا زیادہ وقت برباد مت کرو۔"

"وقت تو میرا برباد ہو رہا ہے انکل!" میں نے یوں اطمینان سے جواب دیا جیسے میں اپنے بیڈ روم میں لیٹا ہوں' اور وہ مونچھوں والا میرا ملاقاتی ہو۔"

میرے جواب سے اس کا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گیا۔ وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔ "تو شاید مجھے جانتا نہیں ورنہ ماسٹر کے نام کی دہشت سے عام آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔"

"حساب کے ماسٹر کی دہشت سے بچپن میں بھاگتا تو میں بھی تھا اسکول سے۔"

"کورم!" وہ چیخ کر بولا۔

خرم' ماسٹر صاحب! میں نے اس کی تصحیح کی۔

اچانک اس کا مگدر نما گھونسا بلند ہوا' اور میرے جبڑے پر ہتھوڑے کی طرح پڑا۔ ہتھوڑے کی ضرب سے میں چکرا کر رہ گیا۔ 'ایک مرتبہ پھر میرے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ مجھے بھی اچانک غصہ آ گیا' اور میں زہریلے لہجے میں بولا۔ "بندھے ہوئے شیر کو تو گلیوں کے آوارہ کتے بھی شکار کر سکتے ہیں ماسٹر! تو اتنا ہی بڑا دہشت گرد ہے تو میرے ہاتھ کھول دے۔"

ماسٹر ہنس کر بولا۔ "میں تیری باتوں میں آنے والا نہیں۔ یہ کوئی ریسلنگ کا مقابلہ نہیں ہے کہ اس کے کچھ رولز اور ریگولیشنز بھی ہوں۔ تجھ سے جو کچھ پوچھا جائے اس کا صحیح صحیح جواب دے۔"

"پوچھو' کیا پوچھتے ہو؟" میں نے بے زاری کا مظاہرہ کیا۔

"وانگ یو نے تمہیں جو کاغذات اور مائکرو فلمز دی تھیں وہ کہاں ہیں؟"

"وانگ یو کو میں نے مردہ حالت میں دیکھا تھا اس لیے وہ کوئی چیز مجھے کیسے دے سکتا تھا!" میں نے جواب دیا۔

ماسٹر نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا' پھر ایڈی کی طرف مڑ گیا۔ "اس کی زبان کھلواؤ ایڈی۔" اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ "ورنہ تم سب کی زبانیں بند کر دوں گا۔"

"اوکے ماسٹر!" ایڈی نے مستعدی سے جواب دیا' پھر میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو' "اس کی تو ایسی کی تیسی۔"

ماسٹر پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ ایڈی نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اسے اسٹریچر سے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دو۔ دونوں آدمی آگے بڑھے اور انھوں نے گھسیٹ کر مجھے اٹھا لیا' پھر انھوں نے جان بوجھ کر مجھے چھوڑ دیا۔ میں دھڑام سے نیچے گرا مگر کارپٹ کی وجہ سے مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ وہ دونوں پاگلوں کی طرح ہنسنے لگے۔ ان میں سے ایک نے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی گھسیٹ کر کمرے کے وسط میں کر دی' اور مجھے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ ان ذلیلوں نے مجھے اتنی سختی سے جکڑا تھا کہ پتلی سی ریشمی ڈوری میرے گوشت میں گھسی جا رہی تھی۔

میرے پیر بری طرح جکڑے ہوئے تھے' اور ہاتھ بھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مصیبت سے چھٹکارا کیسے پاؤں۔ میں کرسی پر بیٹھ چکا تو ایڈی مختلف طریقے سے وہی سوال کرتا رہا۔ میرے انکار پر وہ برہم ہو گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا' ایک سگریٹ سلگائی اور میرے بالکل قریب آ گیا۔ پھر اسی نے اچانک جلتی ہوئی سگریٹ میری گردن پر مسل دی۔ میں کسمسا کر رہ گیا' اور بہ مشکل حلق سے نکلنے والی چیخ پر قابو پایا۔

"بتاؤ کاغذات کہاں ہیں۔" اس نے بپھر کر پوچھا' اور ایک مرتبہ پھر سگریٹ سلگا لی۔ میرے انکار پر اس نے اس مرتبہ بھی میری گردن کو نشانہ بنایا۔

اس مرتبہ میں اپنی چیخ پر قابو نہ پا سکا اور بے اختیار چیخ اٹھا۔ پھر اس نے کئی دفعہ یہ عمل دہرایا' مگر میں دانت پر دانت جمائے اذیت برداشت کرتا رہا۔

"بتا دو خرم!" وہ بھنا کر بولا۔ "ورنہ ماسٹر تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ علیحدہ کرا دے گا کتوں سے۔ شاید تم جانتے نہیں کہ ماسٹر جنون کی حد تک کتے پالنے کا شوقین ہے۔ اس کے پاس گرے ہاؤنڈز' بلڈ ہاؤنڈز اور جرمن شیفرڈ جیسے خونخوار کتے ہیں۔

اس کے پاس بھالو اور بندر بھی ہوں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" شدید تکلیف کے باوجود میں مسکرا کر بولا۔ "آخر تم لوگوں کو یقین کیوں نہیں آتا کہ مجھے ان چیزوں کا علم نہیں۔" اگر تم نے وہ کاغذات وہاں سے نہیں نکالے تو پھر وانگ کا کوئی آدمی ہی انھیں لے گیا ہوگا۔"

اچانک کمرے میں رکھا ہوا انٹر کام بج اٹھا۔ ایڈی نے ریسیور اٹھایا چند لمحے تک دوسری طرف کی بات سنتا رہا، پھر "اوکے ماسٹر!" کہہ کر ریسیور رکھ دیا، اور مجھ سے بولا۔ "ماسٹر کو فوری طور پر کہیں جانا ہے۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہے اس لیے بقیہ پوچھ گچھ صبح ہو گی۔ امید ہے کہ صبح تک سچ بولنے کا فیصلہ کر لو گے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں آدمیوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔

جانے سے پہلے ان لوگوں نے مجھے کرسی سے اٹھا کر بیڈ پر ڈال دیا، اور دروازہ باہر سے لاک کر کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں پھر وہاں سے رہائی کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو گیا، مگر کوئی صورت نظر نہ آئی۔ میں نے ہاتھ پیر ہلا کر رسی کی بندشیں ڈھیلی کرنے کی کوشش کی تو وہ مزید میری جلد میں پیوست ہو گئی۔ انھوں نے مجھے اتنی سختی سے باندھا تھا کہ میرے ہاتھوں اور پیروں کا دوران خون بھی رک گیا تھا، اور میرے ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے۔ تھک ہار کے میں نے سونے کا فیصلہ کر لیا، اور بہت مشکل سے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند تھی کہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ رسی کی بندش اور جبڑے کی تکلیف اس وقت مجھے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ تنگ آکر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

اچانک میری نظر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی۔ وہاں ایڈی سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر بھول گیا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے اسی لائٹر سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے ہاتھ پشت پر نہیں بندھے تھے، مگر انھوں نے رسی کو کچھ اس طرح بل دیے تھے کہ میں ہاتھ پہلوؤں سے نکال نہیں سکتا تھا۔ میری انگلیاں البتہ آزاد تھیں۔ میں کھسکتا ہوا سائیڈ ٹیبل کے نزدیک ہو گیا۔ پھر بہت مشکل سے میں نے اپنا چہرہ سائیڈ ٹیبل پر ٹکا دیا۔ میں دانتوں سے وہ لائٹر اٹھانا چاہتا تھا۔ ایک ایک انچ پر سرک کر میں نے لائٹر کو دانتوں میں پکڑ لیا۔ وہ عام سا لائٹر تھا۔ ایسے لائٹر پنواڑیوں کی دکانوں میں عام ملتے ہیں۔ میں نے وہ لائٹر اٹھا کر اپنی گود میں گرا لیا۔ پھر جسم کو جھٹکا دے کر اسے اپنے پہلو میں لڑھکایا اور دائیں بائیں تھام لیا۔ میں نے لائٹر کی لو سے رسی کو جلانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ بہت خطرناک کام تھا، مگر اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ماسٹریوں بھی میری جان لے لیتا۔ بہ قول ایڈی کے وہ مجھے اتنی اذیت پہنچاتا کہ میں خود موت کی تمنا کرنے لگتا۔ اس نے ماسٹر کے خونخوار کتوں کا بھی حوالہ دیا تھا کہ وہ چشم زدن میں انسان کو بھنبھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

میں نے اللہ کا نام لے کر لائٹر جلایا' اور اس کی لو اوپر کی طرف کر دی۔ مجھے اپنی کلائی کی جلد جھلسنے کا احساس ہوا' مگر میں دانت پر دانت جمائے تکلیف برداشت کرتا رہا۔ ذرا سی دیر میں میری کلائی بری طرح جھلس گئی' مگر جلتی ہوئی رسی کو دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ دائیں کلائی پر رسی کی بندش ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ میں نے لائٹر بجھا دیا۔ کلائی کو جھٹکا دے کر رسی کے بل نکالنے لگا۔ اپنے دائیں ہاتھ کو آزاد دیکھ کر مارے خوشی کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رسی ابھی تک سلگ رہی تھی اور کئی جگہ سے میرے کپڑے بھی جل گئے تھے۔ میں نے پھرتی سے جسم کے گرد لپٹی ہوئی رسی کھولی تو ایسا لگا جیسے میں برسوں کے بعد آزاد ہوا ہوں۔ میں نے رسی کا گولا سا بنا کر اسے بیڈ کے نیچے اچھال دیا' پھر کمرے میں تھوڑی دیر اچھل کود کر کے اپنے ہاتھوں اور پیروں کا دوران خون درست کیا۔ کمرے کے ساتھ اٹیچ باتھ تھا۔ ہاں جا کر میں نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے تو میں بالکل فریش ہو گیا۔ پھر میری نظر وہاں رکھے ہوئے ٹوتھ پیسٹ پر پڑی تو میں نے پیسٹ نکال کر اسے اپنی جھلسی ہوئی کلائی پر مل لیا۔ اس سے مجھے کافی سکون ملا۔ میں کمرے میں واپس آیا تو ہر طرح سے تیار تھا۔ باندھنے سے پہلے ان لوگوں نے میرے جوتے اتارنے کی زحمت بھی نہ کی تھی۔ یہ ایک طرح سے میرے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ ہر طرح سے تیار ہو کر میں دوبارہ بیڈ پر اسی انداز میں جا لیٹا۔ اب مجھے دروازہ کھلنے کا انتظار تھا۔ وال کلاک اس وقت صبح کے چار بجا رہی تھی۔ میں بے چینی سے کسی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

میرا وہ انتظار خاصا طویل ہو گیا تھا۔ صبح کے سات بج چکے تھے۔ اس دوران میں مجھے دو دفعہ نیند کے زبردست جھونکے آئے تھے' مگر میں نے خود کو سونے سے باز رکھا تھا۔ اس وقت سونے کا مطلب تھا دوبارہ قید' اور میں کسی بھی صورت میں دوبارہ قید ہونا نہیں چاہتا تھا۔ نیند بھگانے کے لیے میں نے باتھ روم میں جا کر کئی دفعہ منہ دھویا تھا' اور کافی دیر تک کمرے ہی میں چہل قدمی کی تھی۔ یہ نہ کرتا تو ممکن تھا میں سو جاتا۔

ساڑھے سات بجے دروازے کے لاک میں چابی لگنے کی آواز آئی تو میں آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ میں نے آنکھوں میں ذرا سی جھری بنا کر دیکھا آنے والا ایڈی تھا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ چیکو بھی تھی' مگر اب وہ اپنی اصل صورت اور رنگ روپ میں تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو مجھے اپنی بھیانک غلطی کا احساس ہوا' مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب تو میں دعا ہی کر سکتا تھا کہ فوری طور پر ایڈی یا چیکو کا دھیان اس طرف نہ جائے۔ رسی مرے پورے جسم کے گرد لپٹی ہوئی تھی' اور وہ واضح طور پر دکھائی بھی دیتی تھی۔ میں نے خوشی میں آ کر رسی کو بیڈ کے نیچے پھینک دیا تھا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں دکھاوے کے لیے رسی کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیتا مگر اب تو حماقت ہو ہی چکی تھی۔

ایڈی میرے بالکل قریب آگیا تو اسے احساس ہوا کہ رسی میرے جسم کے گرد نہیں ہے۔ اس کے حلق سے حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی اور اس نے بے اختیار چیکو سے کہا۔
"اس کے ہاتھ پیر کس نے کھول دیے۔"

میں نے اچانک اپنی جگہ سے زقند لگائی اور ایڈی کی گردن پیروں کی قینچی میں جکڑتا ہوا فرش پر جا ٹکا۔ چیکو ابھی تک سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن بھی دبوچ لی۔ ایڈی میرے مضبوط پیروں کی گرفت میں بری طرح مچل رہا تھا' مگر اب وہ جیتے جی میرے گرفت سے نہیں چھوٹ سکتا تھا۔ چیکو نے چیخنے کے لیے منہ کھولا تو میں نے بایاں ہاتھ اس کے منہ پر جما کر دائیں ہاتھ سے اس کی کن پٹی پر وار کیا۔ غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ کچھ سخت ہو گیا' چیکو کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکی ہے۔ میں نے اسے آہستگی سے فرش پر لٹایا۔ اس دوران میں ایڈی رہا ہونے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں چلا چلا کر بے دم ہو چکا تھا' اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں نے چیکو سے فارغ ہو کر اس کی گردن کو اپنے پیروں میں زور سے جکڑ کر جھٹکا دیا۔ چٹاخ کی آواز آئی اور ایڈی کا جسم میرے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ مجھے زندگی کی ناپائیداری پہ وحشت سی ہوئی۔ ایڈی نے چند منٹ پہلے سوچا بھی نہ ہو گا کہ اس کمرے میں موت اس کی منتظر ہے۔ میں نے اس پہ ایک تاسف بھری نظر ڈالی' اور اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔ اس کی تلاشی لینے پر مجھے پوائنٹ فور فائیو کا خوفناک ریوالور اور لمبے پھل والا ایک چاقو ملا۔ اس کے پرس میں ساڑھے پانچ سو روپے اور تین سو ڈالر تھے۔ کسی خوب صورت سی لڑکی کی تصویر بھی تھی۔ میں نے اس کا پرس جوں کا توں اس کی جیب میں ڈال دیا' البتہ ریوالور اور چاقو اپنے پاس رکھ لیا۔ اگلہ مرحلہ اس عمارت سے باہر نکلنے کا تھا۔ وہاں اگر کتے نہ ہوئے تو شاید باہر نکلنا اتنا مشکل نہ ہوتا' مگر کتوں کی موجودگی نے خاصی مشکل پیدا کر دی تھی۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ عمارت ہے کہاں' کتنی بڑی ہے' اور اس میں کتنے کمرے ہیں۔ اگر عمارت کا نقشہ ذہن میں ہو تو وہاں سے نکلنا قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ بہرحال یہاں سے باہر تو نکلنا ہی تھا۔

میں نے چاقو جیب میں رکھا اور ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اسے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ پھر میں نے بہت آہستگی سے دروازہ کھولا۔ کوریڈور سنسان پڑا تھا۔ جس کمرے سے میں نکلا تھا اسی کی قطار میں تین کمرے اور تھے۔ کمروں کے سامنے کوریڈور کی چھوٹی سی دیوار تھی۔ اس کے بعد کوٹھی کا وسیع و عریض لان تھا۔ لان کے کسی گوشے سے کتے کی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک مرتبہ پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا' اور پھونک پھونک کے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا۔ کوریڈور کے اختتام پر مجھے ایک زینہ دکھائی دیا۔ اسی وقت مجھے

سامنے سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ میں پھرتی سے بیٹھ گیا۔ اب میرے اور اس کے درمیان کوریڈور کی چھوٹی سی دیوار حائل تھی۔ میں نے اس آدمی کی نقل و حرکت دیکھنے کے لیے سر تھوڑا سا اوپر اٹھایا' گیٹ لیمپ کی روشنی میں اس شخص کے ساتھ خوفناک قسم کا ایک کتا دیکھ کر میرا دل گویا اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں کسی انسان سے نمٹ سکتا تھا' مگر خونخوار کتے سے نمٹنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھکا جھکا زینے کی طرف بڑھا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا۔ مکان کی اس منزل کا بھی وہی نقشہ تھا۔ میں وہاں رکے بغیر پھر زینے کی طرف بڑھ گیا اور مزید اوپر پہنچ گیا۔ اس سے اوپر کھلی چھت تھی۔ وہاں سے آس پاس کا منظر واضح تھا۔ وہ علاقہ یا تو گلشن اقبال کا تھا یا پھر ڈیفنس کا ! کوٹھیوں اور بنگلوں سے ہی انداز ہو رہا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا' اس کے عقب میں کھلا میدان تھا۔ دائیں بائیں اس طرح کی وسیع و عریض کوٹھیاں تھیں۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ مجھے فوری طور پہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں بائیں طرف والی کوٹھی میں اتروں یا دائیں طرف والی میں۔ اس دوران میں کوئی بھی اس کمرے میں داخل ہو سکتا ہے جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ چیکو اور ایڈی کی لاشیں دیکھتے ہی وہاں بھونچال آ جاتا' اور وہاں موجود ایک ایک فرد میری تلاش میں نکل پڑتا۔ کتوں کی مدد سے وہ مجھے خرگوش کی طرح شکار کر لیتے۔ میں تن بہ تقدیر ہو کر دائیں طرف والی کوٹھی کی طرف بڑھا۔ دونوں کوٹھیوں کے درمیان تقریباً بارہ فٹ کا فاصلہ تھا' مگر چھتوں کی بلندی تقریباً یکساں تھی۔ اللہ کا نام لے کر میں نے جست لگائی اور دوسری چھت پر پہنچ گیا۔

وہاں سے میں سیڑھیوں کے ذریعے نیچے کی طرف پہنچ گیا۔ کتوں کا خطرہ یہاں بھی تھا۔ اس کوٹھی کا لان بھی بہت وسیع و عریض تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی چوکیدار کا کمرا تھا' مگر چوکیدار اس وقت بھی گیٹ کے پاس اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا اس وجہ سے اس کی جسامت اور قدوقامت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا' مگر اس نے جو رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی وہ مجھے مارنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے لان میں نکل کر ایک لمبا چکر لگایا' اور چوکیدار کی پشت پر پہنچ گیا۔ نزدیک پہنچ کر میرا اندازہ غلط ہو گیا' کہ وہ مستعدی سے چوکیداری کر رہا ہے' کیونکہ وہ بیٹھے ہی بیٹھے بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے خراٹوں کی آواز کافی فاصلے سے میرے کانوں میں آئی تھی۔ میں اطمینان سے آگے بڑھا اور اچانک چوکیدار کی گردن کو اپنے دائیں بازو میں جڑ لیا۔ وہ بری طرح تڑپا' مگر میرا بایاں ہاتھ اس کی ناک' اور منہ پر جم گیا۔ ایک دم وہ بے ہوش ہو کر میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اس کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور تالے پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ پانچویں کوشش کامیاب رہی اور تالا ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ میں نے آہستگی سے گیٹ کھولا اور پھرتی سے باہر نکل گیا' پھر میں تیزی سے ایک سمت روانہ ہو گیا۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ صبح کے اس پہر اگر کوئی

پولیس وین مل گئی تو پولیس والوں کو مطمئن کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس وقت کسی سواری کے ملنے کا تو امکان نہیں تھا اس لیے میں پیدل ہی تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ سب سے بڑی الجھن یہ تھی کہ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ میں اس وقت ہوں کس علاقے میں' بس کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ کرنے کی دھن میں' میں منہ اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ تقریباً چالیس منٹ تک مسلسل چلنے کے بعد مین روڈ پر آگیا۔ مین روڈ پر آ کر مجھے احساس ہوا کہ میں ڈیفنس کے علاقے میں ہوں' تھوڑی دیر رک کر میں نے پھر چلنا شروع کر دیا۔

صبح کے آثار نمودار ہوئے تو میں گورا قبرستان کے راؤنڈ اباؤٹ تک پہنچ چکا تھا' مگر وہ مصروف ترین چوراہا بھی اس وقت سنسان تھا۔ میں وہاں سے صدر کی طرف چل دیا۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ فوری طور پر دشمنوں کی پہنچ سے دور آگیا۔ اے بی سینیا کے پاس مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ ڈرائیور شاید اسی علاقے میں رہتا تھا۔ وہ ٹیکسی لے کر صدر کی طرف جا رہا تھا۔

ان لوگوں نے میری جیبوں کی رقم کو نہیں چھیڑا تھا۔ میری جیبوں میں ساری رقم جوں کی توں موجود تھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ "اگر صدر کی بجائے تم مجھے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل تک پہنچا دو تو بہت مہربانی ہوگی۔"

"مہربانی کی اس میں کیا بات ہے؟" ڈرائیور جلدی سے بولا۔ "آپ حکم کریں۔"

میں نے حکم کر دیا۔ دس منٹ بعد ٹیکسی ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے کاؤنٹر کلرک کو نیند سے جگا کر اپنے کمرے کی چابی لی' اور اوپر پہنچ گیا۔ مجھے لاکر کی چابی کی وجہ سے پریشانی تھی' ورنہ میں اب اس ہوٹل کا رخ بھی نہ کرتا۔

لاکر کی چابی حسب توقع ٹیبل کے نیچے چپکی ہوئی تھی۔ میں نے چابی نکال کر جیب میں ڈالی' پھر اپنے کپڑے سمیٹ کر چلنے کو تیار ہو گیا۔ میں سوٹ کیس لے کر ایک مرتبہ پھر کاؤنٹر پر پہنچا۔ کاؤنٹر کلرک پوری طرح مستعد تھا۔ میں نے اس سے بل بنانے کو کہا' اور اسے حکم دیا کہ میں نے جو پیکٹ رکھوایا تھا' اسے بھی منگوا لو! اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں میرا نام اور پتا دیکھنے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ "کیا اسی وقت تشریف لے جائیں گے آپ؟"

"ہاں' میں ابھی جاؤں گا۔ مجھے فلائٹ پکڑنا ہے۔"

"ہوٹل کا حساب بیباق کرنے کے بعد میں وہاں سے نکل آیا۔ اب پھر وہی سوال تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ پھر دماغ میں فیصلہ کیا کہ فی الحال مجھے کراچی چھوڑ دینا چاہیے۔ اس مرتبہ میں نے بس کے ذریعے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہوٹل ہی سے مجھے ٹیکسی مل گئی۔ اس کے ذریعے میں بولٹن مارکیٹ پہنچ گیا۔ وہاں سے بسیں مختلف جگہ جاتی تھیں۔ فوری طور پر

کوئٹہ جانے والی ایئرکنڈیشنڈ کوچ تیار تھی۔ میں نے اسی کا ٹکٹ لیا' اور بس میں سوار ہو گیا۔ بس کی سیٹیں خاصی آرام دہ تھیں۔ میں نے سیٹ کی پشت پیچھے کی طرف جھکائی' اور نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ بس میں ٹی وی بھی چل رہا تھا۔ کچھ لوگ میری طرح اونگھ رہے تھے' اور کچھ ذوق و شوق سے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ جو لوگ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ چونکہ صبح ہو چکی تھی اس لیے میں کسی کے بولنے پر اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا' ورنہ رات بھر کی مشقت اور بھاگ دوڑ سے سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ دل تو میرا یہی چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر سکون سے سو لوں۔ میں نے بس میں ہونے والے شور کو ذہن سے جھٹکا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے پیچھے شاید کوئی نئے نویلے میاں بیوی تھے۔ بس میں چڑھتے وقت میں نے ان کی طرف دیکھا نہیں تھا۔ وہ کبھی زور زور سے باتیں کرنے لگتے' کبھی لڑکی کھلکھلا کر ہنستی' اور کبھی وہ دونوں سرگوشیاں کرنے لگتے۔ ایسے میں صرف لڑکی کی چوڑیاں کھنکتی رہتیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک جملہ سن کر میں چونک اٹھا۔ وہ ذرا سخت لہجے میں بولی تھی۔ "اب تم مجھے سچ مچ کی بیوی مت سمجھو اور ذرا ہوش میں رہو۔"

"سوری رخشی۔" لڑکا جلدی سے بولا۔ "میں واقعی بھول گیا تھا کہ تم میری بیوی نہیں ہو' اور یہ سب ایک ڈراما ہے۔"

ان کے اس مکالمے سے میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ انھیں کیا ضرورت تھی اس قسم کا گھٹیا ڈراما کرنے کی۔ کیا پریشانی ہے؟ وہ ڈراما کر رہے ہیں تو کیا کرتے رہیں۔ میں تھوڑی دیر تو سیٹ پر پہلو بدلتا رہا' پھر اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا' اور کان پھر ان کی طرف لگا دیے مگر اب وہاں خاموشی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بس ایک ویران سی جگہ پر رک گئی۔ سڑک کے کنارے گھاس پھوس سے ایک ہوٹل بنایا گیا تھا جس میں فرنیچر کی جگہ بڑے بڑے پلنگ پڑے تھے۔ ان پلنگوں کے ساتھ ہی لکڑی کی چھوٹی چھوٹی میزیں پڑی تھیں۔ ان پر المونیم کے گندے گلاس اور گھی کے استعمال شدہ ڈبوں میں پانی رکھا ہوا تھا۔ میرا چائے پینے کو دل تو بہت چاہ رہا تھا' بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی' مگر کپ بھی میلے اور گندے تھے' اور دوسرے برتن بھی! میں نے کھڑکی سے ایک نظر باہر کا جائزہ لیا' پھر اترنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ پچھلی سیٹ والا جوڑا بھی بس سے نیچے نہیں اترا تھا۔ وہ دونوں حیرت انگیز طور پر خاموش تھے' پھر لڑکا اچانک بولا۔ "میں کھانے پینے کو کچھ لاتا ہوں۔"

"بیٹھے رہو۔" لڑکی نے بے زاری سے کہا۔ "مجھے ان گندے برتنوں کو دیکھ کر گھن آ رہی ہے' تم کھانے کی بات کر رہے ہو!"

ان ہوٹلوں کی چائے اور کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے۔" لڑکے نے کہا۔ "شاید اسے بھی

بھوک لگ رہی تھی۔"

"تو پھر تم ہی کھاؤ یہ لذیذ کھانا!" لڑکی نے جواب دیا' پھر خاموشی چھا گئی' کیوں کہ لڑکا اتر کے جا چکا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے گردن کو تھوڑا سا خم دے کر پیچھے کی طرف دیکھا' وہ لڑکی انتہائی حسین تھی۔ اس نے جدید تراش کے کپڑے پہن رکھے تھے' آنکھیں بڑی بڑی اور انتہائی پرکشش تھیں۔ سیاہ دھوپ کا چشمہ اس نے آنکھوں کی بجائے سر پہ ٹکا رکھا تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل بیس سال ہی ہو گی۔ اسے دیکھ کر میرا تجسس دوچند ہو گیا کہ آخر اتنی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کو ڈراما رچا کر ایک نوجوان کے ساتھ سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان کی بات چیت سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ محبت میں مبتلا ہو کر گھر سے بھاگے ہوں گے۔ میں جتنا غور کرتا گیا' میرا تجسس سوا ہوتا گیا۔ پھر میں نے بات کی تہہ تک اترنے کا فیصلہ کر لیا۔

"سنئے!" میں نے اچانک لڑکی کو مخاطب کیا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"آپ کے پاس ڈسپرین یا اسی طرح کی کوئی ٹیبلیٹ ہو گی؟ میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔"

"ایک منٹ!" لڑکی نے جواب دیا اور اپنا پرس کھولتے ہوئے بولی۔ "دیکھتی ہوں شاید پرس میں کوئی ٹیبلیٹ پڑی ہو۔"

اسی وقت اس کا ساتھی لڑکا بس میں داخل ہوا۔ مجھے لڑکی کی طرف متوجہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ناگواری کی پرچھائیاں نظر آئیں' دوسرے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پا لیا' اور لڑکی سے بولا۔ "کیا بات ہے رینو؟"۔ ان صاحب کو پین کلر کی ضرورت ہے۔ "وہی ڈھونڈ رہی ہوں۔"

لڑکے نے میری طرف دیکھا تو میں نے مسکین سی شکل بنا لی۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "میرے بیگ کی سائیڈ پاکٹ میں ٹیبلیٹس موجود ہیں' ٹھہرو دیتا ہوں۔" اس نے سیٹ کے نیچے سے بیگ گھسیٹا اور ٹیبلیٹ نکال کر مجھے دے دی۔

اس کے انداز سے مجھے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو' لو مرو! لڑکی نے جلدی سے تھرمس میں سے پانی نکال کر مجھے دیا۔ میرے سر میں درد تو تھا نہیں۔ میں نے پھرتی سے ٹیبلیٹ شرٹ کی جیب میں لڑھکا دی' اور ظاہر کیا جیسے میں نے ٹیبلیٹ منہ میں رکھ لی ہو' پھر میں نے جلدی سے پانی پی لیا' اور ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

تھوڑی دیر وہاں رکنے کے بعد بس ایک مرتبہ پھر روانہ ہو گئی۔ پچھلی سیٹ پر پھر خاموشی تھی۔ میں نے بھی کوئٹہ پہنچنے تک ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا' اور موجودہ

صورت حال پر غور کرنے لگا۔ سوچتے سوچتے مجھے ایک مرتبہ پھر چیکو کا خیال آیا۔ میرے ذہن نے اب تک اس بات کو قبول نہیں کیا تھا کہ چیکو دشمنوں سے مل گئی ہے۔ پھر مجھے میک اپ مین کا ناٹک یاد آیا۔ دراصل شریف' میک اپ تھا ہی نہیں یا زیادہ سے زیادہ چھوٹے موٹے اسٹیج ڈراموں کے لیے کام کرتا ہو گا۔ بالوں یا جلد کو رنگنا کوئی مشکل نہیں۔ یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ بازار میں ایسے بے شمار لوشنز اور کریمز موجود ہیں جن کے استعمال سے گوری رنگت سانولی اور کالی رنگت گوری ہو جائے۔ پھر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ میک اپ وغیرہ محض ڈھونگ تھا۔ چیکو اس بہانے شاید مجھے اپنے ساتھیوں کی آمد تک روکنا چاہتی تھی' اور وہ اس میں کامیاب رہی تھی۔

پچھلی سیٹ پر پھر سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ میں کچھ دیر اسی حالت میں رہا تو نیند آنے لگی۔ میں آنکھیں موندے اپنی نیند سے لڑتا رہا۔

اچانک لڑکا سخت لہجے میں ذرا زور سے بولا۔ "آخر کیا ضرورت تھی اس پر مہربان ہونے کی۔ تم نے کیا ساری دنیا کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟" اس کی آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ میں سن سکتا' مگر میں کان انہی کی باتوں کی طرف لگائے ہوئے تھا اس لیے سننے میں کامیاب ہو گیا۔

"کیا میں اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتی۔" لڑکی تلخ لہجے میں بولی۔ "اگر میں نے ہمدردی سے اس کی بات سن لی اور اسے سر درد کی ٹیبلیٹ دینا چاہی تو اس میں تمہارا یا کسی کا کیا نقصان ہو گیا؟"

اپنا تذکرہ سن کر میں چونک اٹھا' اور پہلے سے بھی زیادہ توجہ سے ان کی باتیں سننے لگا۔

"دیکھو رینو!" نوجوان نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"ہم جن کے لیے کام کر رہے ہیں' اس کی ہدایات کی صریح خلاف ورزی کی ہے تم نے' وہ کسی کی ذرا سی غلطی کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ بس آئندہ ایسی غلطی مت کرنا۔"

"میں تو اس دن کو ستی ہوں' جب میں اس کے چکر میں پھنسی تھی۔" رینو کا لہجہ اب بھی تلخ تھا۔ "مگر تم بھی اس کی وکالت کرنا چھوڑو۔ یہاں تو وہ موجود نہیں ہے۔"

"اس خوش فہمی میں رہنا بھی مت!" نوجوان نے جلدی سے کہا۔ "اس کے کم از کم دو آدمی اس بس میں بھی موجود ہیں۔ بس اب خاموش رہو۔" پھر پچھلی نشست پر خاموشی چھا گئی۔

میں دیر تک ان کی طرف کان لگائے بیٹھا رہا' مگر ان دونوں ہی نے شاید اب خاموش رہنے کا تہیہ کر لیا تھا' پھر اسی حالت میں نہ جانے کب مجھے بھی نیند آ گئی۔

میری آنکھ شاید بس کے دھچکے سے کھلی تھی۔ ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بس چلنے کی بجائے کھڑی ہوئی تھی، پھر باہر سے کسی نے بلند آواز میں کہا کہ بس کی تلاشی ہوگی، اس لیے خاموشی سے سب لوگ نیچے اتر آئیں۔ میرا سوٹ کیس چونکہ خاصا بڑا تھا۔ سب مسافر ایک ایک کر کے نیچے اتر رہے تھے۔ پچھلی سیٹ والی لڑکی اور لڑکا بھی اتر چکے تھے۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھنے ہی والا تھا کہ میری نظر سوٹ کیس کے کنڈے پر پڑی۔ ایک طرف کا کنڈا کھلا ہوا تھا۔ میں چونک اٹھا اس کا مطلب ہے کسی نے میرا سوٹ کیس کھولنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے جھٹ کر سوٹ کیس کھولا تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس میں کیا چیز نکالی گئی ہے۔ نوٹوں کا پارسل اور لاک کی چابی بھی اس میں تھی۔ دونوں چیزیں موجود تھیں، مگر اوپر ہی کپڑے کی ایک اور تھیلی دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ پل بھر میں ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ جس کسی نے بھی وہ تھیلی میرے سوٹ کیس میں رکھی تھی اسے معلوم تھا کہ اس جگہ بس کی تلاشی لی جاتی ہے۔ شاید وہ اس تھیلی کو کسی محفوظ جگہ چھپانے میں ناکام رہا تھا اور یقیناً اس میں کوئی چیز تھی جسے لے جانا غیر قانونی تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے اس نے گویا مال کی قربانی دی تھی، مگر اس طرح میں مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔

بس کا آخری مسافر بھی نیچے اتر گیا تھا، اور اب کسی بھی لمحے تلاشی شروع ہو سکتی تھی۔ میں نے بھی ہی فیصلہ کیا کہ اس سوٹ کیس سے لاتعلقی کا اعلان کر دوں گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد سوٹ کیس بند کر کے میں بھی نیچے اتر گیا۔ وہ نہ جانے کون سی پوسٹ تھی۔ رینجرز کے دو افراد بس میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے سرسری نظر سے بس کا جائزہ لیا، سیٹوں کے نیچے جھانکا، پھر مطمئن ہو کر اتر گئے اور مسافروں کو بس میں چڑھنے کی اجازت دے دی۔ جتنی دیر رینجرز والے بس میں رہے، میں گویا سولی پر ٹنگا رہا۔ میرے اعصاب بہت بری طرح کشیدہ ہو گئے تھے۔ مجھے رہ رہ کر اس شخص پر غصہ آ رہا تھا جس نے مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہا تھا۔ ظاہر ہے اب وہ اپنی تھیلی واپس لینا چاہے گا، میں نے سوچا پھر میں دیکھوں کہ وہ ہے کون؟

سارے مسافر بس میں سوار ہو گئے تو بس چل دی۔ اس تلاشی پر لوگ بلند آواز میں تبصرہ کر رہے تھے۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ کہیں سے مخبری ہوئی ہے، کراچی سے آنے والی بس میں کچھ تخریب کار سوار ہیں۔ وہ کوئٹہ کے راستے ایران میں داخل ہونا چاہتے ہیں، اور یہ کہ ان کا مقصد شاہ ایران کو نقصان پہنچانا ہے۔ بس کی تلاشی تو محض بہانہ تھا۔ ان کا ایک افسر مسافروں کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس بس میں چونکہ وہ تخریب کار موجود نہیں تھے اس لیے بس کو روانگی کی اجازت مل گئی تھی۔

ان دونوں ایران میں بادشاہت تھی۔ پاکستان اور ایران کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار اور برادرانہ رہے ہیں اسی لیے ان تخریب کاروں کو اتنی مستعدی سے تلاش کیا جا رہا تھا۔

رینجرز اور پولیس کے پاس ان کی تصویریں بھی ہوں گی۔
"تم اتنی پریشان کیوں ہو؟" نوجوان لڑکی سے مخاطب تھا۔
"میں--- نہیں تو--- وہ دراصل--- پہلی دفعہ--- ہے نا اس لیے میں کچھ نروس--- ہو رہی تھی۔"
"اسی طرح نروس ہوتی رہیں تو اپنے ساتھ تم مجھے بھی پھنسواؤ گی۔"
"نہیں' اب تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" لڑکی سنبھل کر بولی۔ "میں نے ایک بہت محفوظ ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے۔"
"کیا مطلب؟" نوجوان گھبرا کر بولا۔
"مطلب تو کوئٹہ ہی چل کر بتاؤں گی۔" لڑکی نے جواب دیا۔
"رینو!" نوجوان سرگوشی میں بولا' پھر اس کی آواز بالکل ہی سرگوشی میں ڈس گئی اس لیے کوشش کے باوجود میں کچھ سن نہ سکا۔ جواب میں لڑکی بھی کچھ بولی تھی۔
مجھے بہرحال کسی حد تک یہ علم ہو چکا تھا کہ تھیلی اس لڑکی ہی نے میرے سوٹ کیس میں رکھی تھی۔ آخر اس تھیلی میں کیا تھا؟ میرا دل چاہا کہ میں ابھی سوٹ کیس کھول کر تھیلی نکالوں اور اسے لڑکے کی خدمت میں پیش کر دوں کہ حضور! آپ نے مجھے جیل بھجوانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی' مگر میری طرف سے یہ امانت حاضر ہے۔
میں جتنا اس واقعے پر غور کرتا گیا' غصہ بڑھتا گیا۔ میں نے لڑکی اور اس کے ساتھی کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں کوئٹہ سے پہلے ہی اترنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کی منزل کوئٹہ ہے۔ کوئٹہ آنے سے پہلے ہی اتر کر میں لڑکی اور اس کے ساتھی کی بے بسی دیکھنا چاہتا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے وہ کس حد تک جا سکتے ہیں۔ بہ قول لڑکے کے اس بس میں ان کے دو آدمی مزید موجود ہیں۔ میں نے سر جھٹک کر سوچا' پھر بس زیارت کے اسٹاپ پر رکی تو میں اچانک اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنا بھاری بھرکم سوٹ کیس اٹھایا اور دروازہ کی طرف چل دیا۔ ان دونوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔
میں بس سے نیچے اترا تو بس کے چلنے سے پہلے ہی رینو اور وہ نوجوان اپنے اپنے بیگ اٹھا کر باہر آ گئے۔ ان کے بعد چار آدمی اور اترے اور ایک طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے بھی سوٹ کیس اٹھایا اور اسی طرف چل دیا جہاں دوسرے لوگ گئے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ لڑکی یا اس نوجوان نے ابھی تک مجھے روکا نہیں! حالانکہ وہ محض اس تھیلی کی خاطر بس سے اتر پڑے تھے۔ میں یونہی چلتا گیا۔ ٹیڑھے میڑھے پتھریلے راستوں سے ہو کر جب میں ایک موڑ مڑنے لگا تو پیچھے سے کوئی کرخت آواز میں چیخا۔ "رک جاؤ--- رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

میں نے مڑ کر دیکھا تو حیرت کا شدید دھچکا لگا۔
میرے سامنے انھی جاپانیوں میں سے ایک جاپانی کھڑا تھا جنھیں میں سویڈش انسٹی ٹیوٹ میں زخمی کر کے چھوڑ آیا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا' اور وہ قہر آلود نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم کیا سمجھے تھے کہ ہم تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گے؟ ہم تو تمہیں زمین کی تہہ میں سے کھود کر نکال لیں گے۔ اب سیدھی طرح یہ سوٹ کیس میرے حوالے کر دو۔"
"اس سوٹ کیس میں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔" میں نے پرسکون انداز میں کہا۔ "تم چاہو تو اس کی تلاشی لے سکتے ہو۔" میں دو قدم آگے بڑھ کر بولا۔
اپنی جگہ سے ہلو مت ورنہ یہیں قصہ ختم کر دوں گا۔" اس نے ڈپٹ کر کہا اور ریوالور کے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔
وہ ابھی میری پہنچ سے دور تھا البتہ اگر وہ علاقہ پتھریلا نہ ہوتا تو میں زمین پر ڈائیو لگا کر اس پر قابو پا سکتا تھا۔ وہاں ڈائیو لگانے سے مجھے تو خیر چوٹ آتی' مگر میں اتنی تیزی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ذرا سی سستی میری موت کا باعث بن سکتی تھی۔ میں نے اسے باتوں میں الجھانے کے لیے کہا "میں تو سمجھ رہا تھا تم مر چکے ہو گے' مگر تم تو بہت ہی ڈھیٹ ہو۔"
"وقت ضائع مت کرو اور یہ سوٹ کیس میرے حوالے کر دو۔" وہ چیخ کر بولا۔ "میں پانچ تک گنوں گا' پھر فائر کر دوں گا۔" اس نے کہا اور بلند آواز میں گنتی گننے لگا۔ "ایک--- دو---"
"فلمی قسم کا بدمعاش بننے کی کوشش مت کرو۔" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔
"اگر یہ سوٹ کیس لے کر تمہارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو یہ لو سوٹ کیس۔" میں نے سوٹ کیس اس کے سامنے پھینکتے ہوئے دو قدم اور بڑھا دیے مگر وہ اب بھی میری پہنچ سے دور تھا اور انتہائی درجے محتاط دکھائی دے رہا تھا۔
"اپنے ہاتھ اٹھاؤ اور دوسری طرف گھوم جاؤ۔" اس نے کہا۔
"میں نے ہاتھ اٹھا دیے اور گھومنے ہی والا تھا کہ مجھے اس کے عقب میں کوئی سایہ سا حرکت کرتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے باتوں میں لگانے کو کہا۔ "یار گولی مارنا ہے تو سینے پر مارو۔ میں بزدلوں کی طرح پیٹھ پر گولی نہیں کھانا چاہتا۔"
"تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "تم جہاں کہو گے وہاں---"
اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ عقب سے اس کے سر پر پڑنے والا پتھر اتنا ہی زبردست تھا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا' اور وہ مدہوش شرابی کی طرح آگے پیچھے ڈولنے

لگا۔ اس سے پہلے کہ صورتحال واضح ہوتی' وہی بس والا نوجوان عقب کی پہاڑی سے نمودار ہوا اور چیخ کر بولا۔ "اپنی جگہ کھڑے رہو۔ یہ سوٹ کیس اب میں لے جاؤں گا۔"

جاپانی تیورا کر زمین پر گرا تو اس نوجوان نے جھپٹ کر ریوالور اٹھا لیا۔

"یار میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ میرے سوٹ کیس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ سوٹ کیس چاہیے تو سوٹ کیس لے لو' کپڑے چاہئیں تو کپڑے لے لو مگر یہ خوف ناک ریوالور تو میرے سامنے سے ہٹاؤ۔ مجھے اس سے بہت وحشت ہو رہی ہے۔ خواہ مخواہ گولی وولی چل جائے گی۔" میں نے خوف زدہ انداز میں کہا۔

وہ نوجوان دھوکا کھا گیا۔ وہ سمجھا میں واقعی ریوالور سے خوف زدہ ہوں۔ وہ تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔ "گولی چلے گی نہیں بلکہ میں چلاؤں گا' اگر تم نے سوٹ کیس میرے حوالے نہ کیا۔"

"ارے یار تو میں نے کب منع کیا ہے۔ میں نے جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ سوٹ کیس لے جاؤ اور میری جان چھوڑو۔"

وہ مجھے بے ضرر سمجھ کر سوٹ کیس اٹھانے کو جھکا۔ بس مجھے اتنی ہی مہلت درکار تھی۔ میں نے زقند بھری اور اسے دبوچ لیا۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ میری آہنی گرفت میں تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ میری گرفت سے نکل جائے' یا کم از کم ریوالور والا ہاتھ ہی آزاد کرا لے' مگر اسے مایوسی ہوئی۔

"زیادہ زور لگاؤ گے تو تمہاری کلائی کا جوڑ نکل جائے گا۔" میں نے اس کی کلائی پر مزید دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ریوالور چھوڑ دو ورنہ زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاؤ گے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس نے گھبرا کر ریوالور پھینک دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر کنپٹی پر ہلکی سی ضرب لگائی تو وہ بھی اس جاپانی کے برابر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ میں نے ریوالور اور سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بی بی! پردے سے باہر آ جاؤ' تمہارے شوہر نامدار قیلولہ کر رہے ہیں۔" میں نوجوان کی ساتھی لڑکی سے مخاطب تھا۔ میں نے پہاڑ کی اوٹ میں اس کی ہلکی سی جھلک دیکھ لی تھی۔" میں جانتا ہوں کہ تم کہاں چھپی ہوئی ہو۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "باہر آؤ ورنہ میں واقعی فائر کر دوں گا۔"

دوسرے ہی لمحے وہ سہمی ہوئی سی باہر نکل آئی۔

"تم دونوں تو مجھے پھنسانے کا سامان کر بیٹھے تھے' مگر تمہیں معلوم نہیں کہ میں پیچھے بھی دو آنکھیں رکھتا ہوں۔" میں نے زہر آلود لہجے میں کہا۔ کیا چھپایا ہے میرے سوٹ میں؟" میں نے اچانک اس سے پوچھا۔

"کک --- کچھ بھی --- نہیں ---" وہ ایک دم گڑبڑا گئی۔

اچانک مجھے ایسی آواز سنائی دی کہ جیسے کچھ پتھر اپنی جگہ سے لڑھکے ہوں۔ شاید کوئی اور بھی میری گھات میں تھا۔ مجھے اچانک ان لوگوں کے مزید دو ساتھیوں کا خیال آیا۔ وہ دونوں تو میرے ذہن سے نکل ہی گئے تھے۔

میرے چونکنے پر ریتو بھی چونک اٹھی۔ میں نے جھک کر پھرتی سے سوٹ کیس اٹھایا' لڑکی کی کلائی مضبوطی سے تھامی' اور سخت لہجے میں کہا۔ "خاموشی سے میرے ساتھ چلو ورنہ---

"مگر تم---- مجھے کہاں---- لے جا رہے ہو؟" وہ ہکلا کر بولی۔

"اپنی چونچ بند رکھو۔" میں نے اسے جھڑک دیا' پھر طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم اتنی معصوم اور سیدھی ہو نہیں جتنی نظر آنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

اسی وقت پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے پتھر کسی کے پیر سے لڑھکے ہوں۔ یہ آواز قدرے نزدیک کی تھی۔ اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا۔ ریتو نے حیرت سے مجھے دیکھا' پھر اس کی نظریں میری پشت کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں خوف کا سایہ سا لہرایا۔ میری چھٹی حس نے اچانک خطرے کا احساس دلایا۔ میں لیٹے ہی لیٹے قلابازی کھا گیا۔ اس کوشش میں میرا سوٹ کیس اسی جگہ پڑا رہ گیا۔ قلا بازی کھا کے میں نے اپنی سمت بدل لی تھی۔ میرے سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کے خوف ناک ریوالور تھے۔ ریوالورز میں سائیلنسر بھی فٹ تھے۔ ان کے چہروں پر خباثت برس رہی تھی۔

"خاموشی سے اپنی جگہ پڑے رہو۔" ان میں سے ایک پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔ "ہم تمہارے سوٹ کیس سے صرف اپنی چیزیں لیں گے۔ ہمیں سوٹ کیس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ سانس لینے کو رکا' پھر بولا۔ اور کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ یہ ریوالور دکھاوے کے لیے نہیں ہیں' اور ہمارا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔" اس نے دوسرے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ کے سوٹ کیس اٹھانے لگا۔ میں اپنی جگہ سے چھلانگ لگا کر اس تک پہنچنے کی کوشش کرنے ہی والا تھا کہ اس کا ساتھی بول اٹھا۔ بری بات' آرام سے پڑے رہو۔"

اس دوران میں اس کے ساتھی نے سوٹ کیس کھول کر وہ تھیلی نکالی۔ "ریتو تم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔" اس نے بے ہوش نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

اس سے کچھ فاصلے پر وہ جاپانی پڑا تھا جسے ریتو کے ساتھی نے پتھر مار کے بے ہوش کر دیا تھا۔

ریتو اپنے نام نہاد شوہر کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "شکیل! اٹھو' آنکھیں کھولو۔"

ذرا سی کوشش کے بعد شکیل نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولتے ہی وہ جھپٹ

کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے اس کی نظر مجھ پر پڑی' مگر مجھے زمین پر لیٹا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر وہ سوٹ کیس کی طرف جھپٹا' مگر ریوالور والے نے اسے چونکا دیا۔

"زیادہ پھرتی دکھانے کی کوشش مت کرو۔" اس نے کہا۔ "اب یہاں سے نکل چلو۔"

"اس کا کیا کرو گے؟" شکیل نے میری طرف اشارہ کیا۔

"اس کا اچار ڈالیں گے۔" یہ کہہ کر وہ بھونڈے انداز میں ہنسنے لگا' پھر ہنستے ہنستے وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا' اور مجھ سے بولا "کھڑے ہو جاؤ۔"

میں کھڑا ہو گیا تو اس نے مجھے سوٹ کیس اٹھانے کا حکم دیا۔ میں جونہی سوٹ کیس اٹھانے کو جھکا' میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سر پر پڑنے والی ضرب اتنی ہی زور دار تھی۔ میری آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے' روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا' پھر گویا بھک سے فیوز اڑ گیا' اور میرے ذہن کا اسکرین تاریک ہو گیا۔

○

میری آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو چکا تھا' اور آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اٹھنے سے میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا تو کچھ فاصلے پر وہی جاپانی دکھائی دیا۔ میرا سوٹ کیس بھی وہیں پڑا تھا۔ اس جاپانی کی اتنی طویل بے ہوشی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ مجھ سے پہلے بے ہوش ہوا تھا' اور اب تک انٹا غفیل پڑا تھا۔ تکلیف کا احساس کچھ کم ہوا تو میں آہستگی سے کھڑا ہو گیا۔ پہلے میں نے سوٹ کیس کا جائزہ لیا۔ اس کی ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ رقم کا لفافہ بھی تھا اور لاک کی چابی بھی! ادھر طرف سے مطمئن ہو کر میں اس جاپانی کی طرف متوجہ ہوا۔ پتھر کی ضرب سے اس کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ غیر فطری انداز میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر میں چونکا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے جھک کر اس کی نبض دیکھی۔ نبض کی حرکت معدوم تھی۔ میں نے طویل سانس لیا۔ وہ جاپانی مر چکا تھا۔ پتھر کی ضرب اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ اسے یونہی چھوڑ کر میں اٹھ کھڑا ہوا' سوٹ کیس اٹھایا' اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس مجھے قتل کے الزام میں دھر لے۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ میری بے ہوشی کے دوران میں کوئی وہاں سے گزرا نہیں۔

میں ایک لمبا چکر کاٹ کر مین روڈ پر پہنچا۔ سڑک دور دور تک سنسان تھی۔ میں یہ سوچ کر پیدل ہی کوئٹہ کی طرف روانہ ہو گیا کہ کوئی گاڑی دکھائی دی تو میں اس سے لفٹ لے لوں گا۔

مجھے پیدل چلتے ہوئے آدھا گھنٹا ہو گیا تھا' ہر طرف ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل گیا تھا' تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی' اور بھوک بھی! جب مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے گزشتہ اٹھارہ گھنٹے سے کچھ بھی نہیں کھایا تو اچانک مجھے نقاہت محسوس ہونے لگی' تھکن دگنی ہو گئی' اور مجھ سے آگے بڑھنا محال ہو گیا۔ میں سڑک کے کنارے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ پھر بیٹھے بیٹھے بھی مجھے کافی دیر ہو گئی۔ اندھیرا پوری طرح اجالے پر غالب آ گیا' اور فضا میں خنکی خاصی بڑھ گئی۔ میں اپنے خیالات میں گم یونہی بیٹھا رہا۔ میں نے سوچا آخر میں ہی کیوں بار بار نشانہ بنتا ہوں۔ بچپن سے لے کر آج تک تقدیر نے بار بار مجھے چرکے لگائے تھے۔ جو دن ماما کے گھر میں گزرے تھے بس وہی پرسکون دن تھے۔ شاید وقت نے مجھے ستانے کا موقع دیا تھا' پھر وہی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ پھر مجھے وانگ کا خیال آیا۔ پہلے میں اسے اپنا محسن سمجھتا تھا' مگر وہ میرا محسن ہرگز نہیں تھا۔ وہ مجھے اپنے ہی کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اپنے مقصد کے لیے تو لوگ خونخوار کتوں کی بھی خدمت کرتے ہیں' انھیں کھلاتے ہیں' تربیت دیتے ہیں' پھر انھیں استعمال کرتے ہیں۔ مجھے شہلا کا خیال آیا وہ نہ جانے کہاں تھی۔ وانگ یو نے اس کا سراغ بھی لگا لیا تھا' مگر اپنی کسی مصلحت کے تحت مجھے بتایا نہیں تھا۔ وہ اگر زندہ رہتا تو شاید بتا بھی دیتا۔ وہ نہ جانے کن سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ اگر وہ مجھے تفصیل سے سب کچھ بتا دیتا تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ اب تو اس نے وہ خفیہ کاغذات میرے حوالے کر کے مجھے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر میرے ساتھ یہ بکھیڑے نہ ہوتے تو میں اطمینان سے شہلا کو تلاش کرتا' مگر اب تو میری اپنی ہی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

اچانک کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ میں اپنے خیالات سے چونک کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی گاڑی تیزی سے آ رہی تھی۔ میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور ذرا آگے بڑھ کر گاڑی کو روکنے کے لیے ہاتھ ہلانے لگا۔ گاڑی زناٹے سے میرے قریب سے گزر گئی۔ پھر فوراً ہی ڈرائیور نے بریک لگائے' سڑک پر پہیوں کی رگڑ سے خاصی آواز پیدا ہوئی اور گاڑی مجھ سے کچھ فاصلے پر جا رکی' دوسرے ہی لمحے وہ ریورس ہو کر میرے نزدیک آ گئی' اور ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر کچھ پوچھا جسے میں سمجھ نہ سکا' کیوں کہ اس نے وہ جملہ بلوچی میں ادا کیا تھا۔ میں نے جلدی سے انگلش میں کہا "میں بلوچی نہیں جانتا۔"

"کہاں جاؤں گے؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو؟"

"کوئٹہ جاؤں گا جناب۔" میں نے جواب دیا۔ "میں زیارت پر بس سے اتر گیا تھا پھر وہاں سے کوئی سواری نہیں ملی۔"

آ جاؤ' گاڑی میں آ جاؤ۔ میں بھی کوئٹہ ہی جا رہا ہوں۔"

میں نے پچھلی طرف کا دروازہ کھول کے سوٹ کیس گاڑی میں رکھا' پھر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ گاڑی بہت شاندار تھی' جدید ماڈل کی بیوک تھی۔ اس میں شاید ہیٹر چل رہا تھا' کیونکہ اندر کا درجہ حرارت باہر کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ دروازہ کھلنے سے کچھ لمحے کو گاڑی کے اندر کا بلب روشن ہوا تھا۔ اس کی روشنی میں میں نے گاڑی کے مالک کا سرسری سا جائزہ لیا تھا۔ وہ خاصا باوقار شخص تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا' لب و لہجے سے بھی خاصا پڑھا لکھا اور مہذب لگ رہا تھا۔ گاڑی ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

"تم ترک ہو شاید! اس نے کہا۔ "پاکستان گھومنے آئے ہو؟"

"آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ میں ترک ہوں۔" میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "تمہارے رنگ اور روپ اور قدوقامت سے۔" اس نے جواب دیا۔

"میں پاکستانی ہوں جناب!" میں نے کہا۔

پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے بتایا کہ میں گھومنے کی غرض سے کوئٹہ جا رہا ہوں۔ کراچی میں میرا ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس ہے۔ شکر ہے' اس نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کیا چیز ایکسپورٹ کرتا ہوں' اور باہر سے کیا منگاتا ہوں۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ کب مجھے نیند آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو وہ میرا شانہ پکڑ کر ہلا رہا تھا۔ "اٹھو' ہم لوگ کوئٹہ پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے کھڑکی سے باہر نظریں دوڑائیں۔ ہم لوگ واقعی کوئٹہ پہنچ چکے تھے۔ رات خاصی ہو گئی تھی اس لیے کوئٹہ کی سڑکیں ویران تھیں۔

"تھینک یو ویری مچ سر!" میں نے ممنونیت سے کہا۔ "مجھے یہیں ڈراپ کر دیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ چلو۔" گاڑی والے نے آفر کی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے اب تک آپ کا نام بھی نہیں پوچھا۔" مجھے واقعی شرمندگی تھی۔

"تو میں نے کب تمہارا نام پوچھا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "چلو حساب برابر ہو گیا۔ میرا نام عبداللہ خان پانیزئی ہے۔ سردار عبداللہ خان پانیزئی۔"

"میرا نام خرم ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ کی آفر کا بہت شکریہ' مجھے یہاں اپنے ایک دوست سے ملنا ہے اسی کے ساتھ قیام بھی کروں گا' اس لیے مجھے اجازت دیں۔"

"میں تمہیں اپنے ساتھ ہی ٹھہراتا مگر صبح صبح مجھے ایک ضروری کام سے قلات جانا ہے اس لیے مجبوراً تمہیں خدا حافظ کہہ رہا ہوں۔" عبداللہ خان نے کہا' پھر اپنی جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا اور بولا "میرا کارڈ رکھ لو میں تین دن میں لوٹ

آؤں گا۔ کوئٹہ میں کسی بھی قسم کی پریشانی ہو تو میرے پاس آ جانا۔" پھر وہ چونک کر بولا۔
"مگر تمہارا وہ دوست رہتا کہاں ہے؟" اس وقت تمہیں کوئی سواری نہیں ملے گی۔ چلو میں تمہیں وہیں ڈراپ کر دوں۔"

میں گڑبڑا گیا' پھر جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ "میرا دوست بھی کراچی ہی سے آیا ہے۔ وہ یہاں ہوٹل میں مقیم ہو گا۔ مجھے بھی وہیں چھوڑ دیں۔"

"کون سے ہوٹل میں؟" عبداللہ خان الجھ گیا۔

"میں دراصل پہلی دفعہ کوئٹہ آیا ہوں اس نے ہوٹل کا نام بتایا تو تھا مگر میرے ذہن سے نکل گیا اچھا سا نام تھا۔ ہوٹل---" میں نے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کی۔

"فرح!" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"فرح!" میں جلدی سے بولا۔

"میرا اندازہ درست نکلا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "دراصل یہاں وہی ڈھنگ کا ہوٹل ہے۔"

دس منٹ بعد عبداللہ خان کی گاڑی ہوٹل کے باہر کھڑی تھی۔ گاڑی دیکھ کر ہوٹل کا باوردی پورٹر دوڑتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس نے سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے لیا۔ عبداللہ خان نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا اور روانہ ہو گیا۔

مجھے بغیر کسی دقت کے کمرا مل گیا' کیوں کہ سیزن شروع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ کمرے میں پہنچ کر میں گرم پانی سے نہایا تو آدھی تھکن دور ہو گئی۔ میں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا' پھر لمبی تان کر سو گیا۔ میں دوسرے دن گیارہ بجے تک سوتا رہا۔ سو کر اٹھا تو پھر وہی پریشانی کہ اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ میرے دشمنوں کو شاید یہ بھی علم تھا کہ میں کوئٹہ کی طرف آیا ہوں' ورنہ وہ جاپانی میرے پیچھے کیسے آتا؟ پہلے میں نے سوچا کہ کمرے میں ہی کھانا منگا لوں' مگر پھر یہ سوچ کر ڈائننگ ہال میں آ گیا کہ ممکن ہے مجھے اپنے دشمنوں میں سے کوئی نظر آ جائے۔ میں چوہے بلی کے اس کھیل سے اکتا گیا تھا۔ ڈائننگ ہال میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں نے ایک خالی میز پر بیٹھ کر سوپ کا آرڈر دیا اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں مقامی لوگ برائے نام تھے' اکثریت ایرانیوں کی تھی' کچھ غیر ملکی سیاح بھی نظر آئے جو یا تو ایران جا رہے تھے یا پھر ان کا رخ کراچی کی طرف تھا۔ میں ابھی ہال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دائیں طرف کی میز سے اٹھ کر ایک مقامی آدمی میری میز پر آ گیا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اسے گھورا تو وہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ "کچھ چاہیے سر؟ میرا مطلب ہے کچھ---"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے انگلش ہی میں جواب دیا۔

"آپ حکم تو کریں جناب! وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "میں آپ کی ہر خدمت کرنے کو

تیار ہوں۔"

"ہر خدمت!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے انٹرنیشنل پاسپورٹ چاہیے۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"پاکستانی پاسپورٹ!" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، مجھے پاکستانی پاسپورٹ چاہیے!" میں نے جواب دیا۔

"پاکستانی نیا پاسپورٹ مشکل سے ملے گا۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا کسی اور ملک کا پاسپورٹ کہیں تو لا سکتا ہوں۔ بس اس پر مجھے آپ کی تصویر لگانا پڑے گی۔" اس نے جواب دیا مگر اس میں پیسے بہت خرچ ہوں گے۔"

"تم پاسپورٹ کب تک لا سکتے ہو؟"

"اگر آپ ابھی فوٹو دے دیں تو شام تک۔" اس نے جواب دیا۔

"فوٹو میں تمہیں کل دے سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس وقت میرے پاس فوٹو نہیں ہے۔"

چلیں، کل سہی۔ اس نے جواب دیا، پھر ہچکچاتے ہوئے بولا اگر کچھ رقم مل جائے تو ۔۔۔

"ابھی نہیں میں نے جواب دیا۔ "پوری رقم کام ہونے کے بعد۔" وہ مایوس ہو کر اٹھنے لگا تو مجھے ترس آ گیا۔ میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکالا، اور اسے دے دیا۔ "فی الحال یہ رکھ لو۔"

"شکریہ جناب!" اس نے جلدی سے نوٹ جیب میں رکھ لیا، اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے اٹھنے ہی والا تھا کہ ہوٹل کے ایک بیرے کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے ہماری طرف آیا۔ بیرے کو دیکھتے ہی وہ جلدی سے اٹھا اور تیر کی طرح ڈائننگ ہال سے باہر نکل گیا۔

"یہ آپ کو کیا بیچ رہا تھا؟" بیرے نے پوچھا۔ "پرانے سکے یا کوئی نادر چیز؟"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"جناب، یہ شخص بہت دھوکے باز ہے۔ کئی مرتبہ غیر ملکی سیاحوں کو دھوکے سے لوٹ چکا ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ اسے یہاں نہیں گھسنے دیتی۔"

"اس وقت یہ نہ جانے کیسے اندر آ گیا۔ یہ آپ سے کچھ لے تو نہیں گیا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو بیرا مطمئن ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔

شام کو میں ایک مرتبہ پھر ڈائننگ ہال میں پہنچ گیا۔ ہال اس وقت خوب آباد تھا۔ زیادہ تعداد مردوں کی تھی، مگر غیر ملکی عورتیں خوب تھیں۔ میری میز سے کچھ فاصلے پر کئی

آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں ایک تو مقامی ہی تھا بقیہ تین میں سے دو ایرانی اور ایک شاید امریکی تھا۔ امریکن کی وجہ سے وہ سب انگلش میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں شاید ان پر توجہ نہ دیتا' مگر زیارت کا نام سن کر میں چونکا۔ پھر امریکن نے ایک ایسی بات کی کہ میں بری طرح چونک اٹھا۔ اس نے گفتگو کرتے ہوئے ایک دفعہ شکیل کا نام استعمال کیا اور دو مرتبہ رینو کا' وہ بہت دھیمی آواز میں بات چیت کر رہا تھا۔ میں سوائے ان دو ناموں کے اور کچھ سمجھ نہ سکا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں ایرانی اور امریکن اسی ہوٹل میں مقیم ہوں گے۔ وہ مقامی البتہ کہیں باہر سے آیا ہو گا۔ میں نے اس مقامی کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا۔

پھر میں ان لوگوں کے اٹھنے کا منتظر رہا۔ وہ جونہی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے' میں بھی تیزی کے ساتھ اٹھ کر داخلی دروازے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق دونوں ایرانی اور امریکن اپنے کمروں کی طرف چلے گئے' صرف وہ مقامی باہر نکلا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس کے پاس گاڑی ہوئی تو میں کیا کروں گا؟ عین اسی وقت ایک رکشا ہوٹل کے سامنے مل گیا۔ وہ شاید سواریوں ہی کے لیے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے سامنے آگیا۔ میری نظریں ہوٹل سے باہر نکلنے والے شخص پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ فاصلے پر ایک جیپ کھڑی تھی۔ وہ آدمی اس جیپ میں سوار ہوا تو میں رکشا میں سوار ہو گیا' اور رکشا ڈرائیور سے جیپ کے پیچھے چلنے کو کہا۔ اس نے چلنے میں تھوڑی پس و پیش کی' مگر میرے ہاتھ میں سو کا نوٹ دیکھ کر فوراً راضی ہو گیا۔

جیپ مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی کانسی روڈ پر جا نکلی۔ رکشا ڈرائیور بہت احتیاط سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ کانسی روڈ پر پہنچ کر جیپ والا بائیں طرف ایک آبادی میں مڑ گیا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر پہاڑیاں تھیں اور انہی کے درمیان تھوڑے فاصلے پر کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ جیپ ایک کچے احاطے کے سامنے رکی اور وہ آدمی اتر کے اندر چلا گیا۔ میں نے بھی رکشا والے کو پیسے دے کر رکشا چھوڑ دیا۔

اس وقت میں جینز اور چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس تھا۔ مجھے دیکھ کر کئی لوگ ٹھٹکے' ہر آدمی مجھے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے اپنے لباس کی وجہ سے میں ان کے لیے عجوبہ بن کر رہ گیا۔

میں ٹہلتا ہوا اسی احاطے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ وہ دروازہ بھی خاصا بوسیدہ تھا۔ میری دستک کے جواب میں دبلے پتلے ایک ہزارے نے دروازہ کھولا۔ میں نے جلدی سے انگلش میں کہا۔ "صاحب کو بولو' مہمان آئے ہیں۔" وہ ہونقوں کی طرح میرا منہ تکنے لگا۔ میں نے جان بوجھ کر انگلش استعمال کی تھی۔ وہی جملہ میں نے دوبارہ ادا کیا تو اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں گردن ہلائی اور اندر کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر میرے سامنے وہی شخص کھڑا تھا' جس کا تعاقب کرتے ہوئے میں وہا

تک پہنچا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے انگلش میں کہا۔ "مجھے رفیق بزنجو نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں۔۔"

"کون رفیق بزنجو؟" اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"رفیق بزنجو کراچی میں ہوتا ہے۔ اس نے مجھے آپ کا ایڈریس دیا تھا اور کہا تھا۔۔۔"

"بھاگ جاؤ' میں کسی رفیق بزنجو کو نہیں جانتا۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"بکومت" میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

"وہ حیرت سے منہ پھاڑے مجھے گھورتا رہ گیا۔ بات تھی بھی حیرت زدہ کرنے والی۔ میں اسی کے دروازے پر کھڑا ہو کر اسی کو جھڑک رہا تھا۔ وہ جسمانی طور پر بھی میرے مقابلے میں ڈیوڑھا تو ضرور رہا ہو گا۔ یوں بھی اس کا شمار علاقے کے معززین میں ہوتا ہو گا' کیونکہ نہ اس آبادی میں کسی کا مکان اتنا بڑا تھا' نہ کسی دروازے کے آگے کوئی گاڑی کھڑی تھی۔

"میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اس نے اچانک ریوالور نکال لیا۔

مگر اسے ریوالور سیدھا کرنے کی مہلت دیے بغیر میں نے اس کی طرف جھپٹا مارا اور ریوالور چھین لیا۔

"اب سیدھی طرح اندر چلو۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔" مجھے شکیل اور رینو سے ملنا ہے۔" میں نے ریوالور کو جھٹکا دیا۔ "اب یہ مت کہنا کہ کون شکیل اور کون رینو۔"

وہ تھوک نگل کر رہ گیا اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے موقع ملتے ہی مجھے کچا چبا جائے گا۔

"مجھے ابھی اور اسی وقت ان دونوں سے ملنا ہے اور میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم ہو کون؟" وہ حیرت کے شدید جھٹکے سے کسی حد تک سنبھل چکا تھا۔

"کالا چور۔" میں نے تمسخرانہ انداز میں جواب دیا۔ "اور اگر تم نے انکار کیا تو تمہیں گولی مار کے چلتا بنوں گا اس لیے سوچ سمجھ کر انکار کرنا۔"

"اس نے طویل سانس لیا' پھر مجھ سے بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔

"سنو' میں نے اسے ٹوک دیا۔" کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ۔۔۔"

"زیادہ دھمکیاں مت دو۔" اس نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔ "صمد خان جب بھی مارے گا سامنے سے مارے گا سمجھے۔"

وہ احاطہ خاصا وسیع و عریض تھا' اقامتی عمارت وہاں سے کافی فاصلے پر تھی۔ احاطے کے ایک کونے میں لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر اور بلیاں پڑی تھیں۔ اس کے سامنے ہی مختلف قسم کا کاٹھ کباڑ کا ایک ڈھیر تھا۔ اچانک مجھے وہی ہزارہ دکھائی دیا۔ میں نے جھپٹ کر ایک ہاتھ اس کی گردن پر مارا وہ بہت سعادت مندی سے بے ہوش ہو گیا۔ وہ ہزارہ بھی مجھے کاٹھ کباڑ کا ایک حصہ لگا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "یار تم کباڑی ہو گیا؟"

اس نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا' بس دانت پر دانت جمائے آگے بڑھتا رہا۔ احاطے کے بعد بڑا سا ایک برآمدہ تھا۔ اس کی تیاری میں لکڑی کے موٹے موٹے شہتیر اور بڑے بڑے پتھر استعمال کیے گئے تھے۔ کمروں کے دروازے بھی بدنما اور بھدے تھے' مگر اتنے مضبوط تھے کہ آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتے تھے۔ ایک کمرے کا بھڑا ہوا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں آرام کرسی پر شکیل نیم دراز تھا' ور ربنو صوفے پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں آتش دان روشن تھا اس لیے اندر کا درجہ حرارت خوش گوار تھا۔

شکیل نے ایک نظر صمد خان پر ڈالی' پھر اس کے پیچھے مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹ گئیں۔ یہی حال ربنو کا بھی تھا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں شکیل سے کہا۔ "تم کیا سمجھتے تھے کہ مجھے دھوکا دے کر بھاگ جاؤ گے' اور میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا۔" پھر میں ربنو کی طرف مڑا۔ "اور تم ---- تم نے تو پھنسانے کی پوری کوشش کی تھی۔"

میرا دھیان اس دوران میں صمد خان کی طرف سے ہٹ گیا تھا' مگر اس سے غافل نہیں تھا۔ اس نے اچانک مجھ پر چھلانگ لگائی' مگر میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ صمد خان فرش پر اوندھے منہ گرا۔ میں نے اس کے پہلو میں زوردار قسم کی ایک لات رسید کی۔ وہ کراہ کر سیدھا ہو گیا۔

"اونہہ !' صمد خان سامنے سے وار کرتا ہے' یہی کہا تھا نا تم نے اب دیکھو سامنے کا وار ایسا ہوتا ہے۔" میں نے اس کے منہ پر بھرپور لات رسید کی۔ اس کے سامنے کے کئی دانت جھڑ گئے اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ "دھوکا دینے والوں کو تو میں نہایت بے دردی سے مارتا ہوں۔" میں نے اس کے منہ پر ایک اور لات رسید کی۔ اس مرتبہ وہ الٹ کر گرا تو پھر نہ اٹھ سکا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے شکیل سے پوچھا۔ "یہاں مزید کتنے آدمی ہیں؟"

"اور تو کوئی بھی نہیں ہے سوائے ایک ہزاریے کے۔ دراصل صمد خان بھی یہاں ہوتا نہیں ہے۔ یہ عمارت کو گودام کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ وہ عمارتی لکڑی کا تاجر ہے۔ یہاں تو ہم لوگ عارضی طور پر ٹھہرے ہوئے تھے۔"

ہوٹل کی بجائے تم لوگ یہاں کیوں ٹھہرے؟" میں نے پوچھا۔
"ہمیں تم سے خطرہ تھا۔ تمہارا رخ بھی کوئٹہ کی طرف تھا۔ وہ دونوں تو تمہیں ٹھکانے لگانا چاہتے تھے' مگر رینو نے اس بات کی شدید مخالفت کی۔ میں نے بھی انھیں یقین دلایا کہ تم ہمارے دشمن نہیں ہو بلکہ رینو کی حماقت کی وجہ سے ہمارے ساتھ الجھ پڑے ہو۔"

"جان بخشی کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے رینو سے کہا۔ "مگر تم نے مجھے پھنسانے کی کوشش کیوں کی؟"
"نادانستگی میں ایسا ہو گیا۔" رینو شدید شرمندگی سے بولی۔ "دراصل مجھے خود بھی علم نہیں تھا کہ اس تھیلی میں کیا ہے۔ بس مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہ تھیلی کسی بھی حالت میں پولیس کے ہاتھ نہ لگے' اور اگر ایسی نوبت آ جائے تو کوشش کرنا کہ یہ تمہارے پاس سے برآمد نہ ہو۔"
"تم لوگ جا کہاں رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔
"اب میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔" اچانک رینو رونے لگی۔ "میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے' خوف و ہراس' بے چینی اور جواب طلبی!"
"رینو!" شکیل نے اسے آنکھیں دکھائیں۔
"مجھے بولنے دو۔" میں اپنے ذہن پر زیادہ دیر یہ بوجھ نہیں رکھ سکتی۔"
"شاباش!" صمد خان کی طنز بھری آواز سنائی دی۔ نہ جانے کب ہوش میں آ گیا تھا۔ "باس نے خوب کارکن رکھے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو چل چکا کاروبار! کچھ دن بعد ہم سب جیل میں نظر آئیں گے۔"
"بکومت!" میں نے اسے پھر جھڑک دیا۔
"ابھی تو خوب بول لے۔" وہ رینو سے مخاطب تھا۔ "مگر تو بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ غداری کی سزا موت ہے۔"
رینو سہم کر رہ گئی۔ شاید صمد خان کے کہنے پر اسے اپنا انجام یاد آ گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر غائب دماغی کی سی کیفیت میں باری باری شکیل اور صمد خان کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ چیتے کی طرح جھپٹی اور میرے ہاتھ میں سے ریوالور لے کر دوسری طرف نکل گئی۔ اس کی پھرتی پر میں بھی اش اش کر اٹھا۔
"شاباش رینو!" صمد خان چہک کر بولا۔ "خوب دھوکا دیا ہے اسے۔"
"واقعی۔" شکیل نے بھی ہنس کر کہا۔ "تم تو بہت ذہین اور پھرتیلی ہو گئی ہو۔ لاؤ اب یہ ریوالو مجھے دے دو۔" شکیل نے رینو سے کہا۔
"بکواس مت کرو۔" رینو چیخ کر بولی۔ "جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔"

"ریتو!" صمد خان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "پاگل تو نہیں ہو گئیں؟"

"میں اب زیادہ دن تک اس ذہنی دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ میں آزادی چاہتی ہوں، کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں۔ اس ماحول میں میرا دم گھٹ جائے گا۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی جھلک محسوس ہوئی۔

"ٹھیک ہے بے بی۔" صمد خان جلدی سے بولا۔ "میں باس سے سفارش کروں گا کہ کچھ مہینے کے لیے آرام کی غرض سے تمہیں یورپ بھجوا دے۔ گھوم پھر لو گی تو تمہارے ذہن سے بوجھ ہٹ جائے گا۔"

"شٹ اپ!" ریتو چیخ کر بولی۔ اس قسم کی لچھے دار باتوں میں میری زندگی تباہ ہو گئی۔ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔۔۔ زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے پاگلوں کی طرح کہا، اور ریوالور کا رخ صمد خان کی طرف کر دیا۔

"ریتو!" صمد خان نے بھی چیخ کر کہا۔ پہلی دفعہ مجھے اس کے چہرے پر خوف و دہشت کی پرچھائیاں نظر آئیں۔

"شٹ اپ!" وہ چیخ کر بولی اور اچانک فائر کر دیا۔

گولی صمد خان کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ شکیل نے فرار ہونے کی کوشش کی، مگر اس کی بھی موت آچکی تھی۔ گولی اس کی پشت پر لگی اور وہ دروازے کے پاس اوندھے منہ گر پڑا۔

میں پوری طرح چوکنا تھا۔ ممکن ہے پاگل پن میں ریتو مجھے بھی نشانہ بنا لیتی، مگر اس نے ریوالور پھینک دیا، اور ویران آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"یہ تم نے کیا کیا ریتو!" میں نے کہا۔

"میں نے وہی کیا جو مجھے بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔" اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اچھا اب یہاں سے نکلو۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "فائرنگ کی آواز دور تک گئی ہو گی۔"

"تو کیا ہوا۔" ریتو نے کہا۔ "یہاں پہاڑیوں میں فائرنگ ہوتی ہی رہتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ آواز لوگوں تک پہنچ ہی گئی ہو۔ یہ مکان تو بالکل الگ تھلگ ہے۔"

"تو کیا ساری زندگی یہاں گزارنے کا ارادہ ہے۔" میں جھنجلا کر بولا۔ "چلو اب یہاں سے نکل چلو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے باہر کی طرف کھینچا۔ اس کی ذہنی حالت درست نہیں تھی۔ پھر مجھے جیپ کا خیال آیا۔ میں نے چابی کی تلاش میں صمد خان کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو چابی کے ساتھ ساتھ اس کا پرس بھی میرے ہاتھ میں آگیا۔ پرس میں سوائے کرنسی نوٹوں کے اور کوئی چیز نہیں تھی۔ شکیل کی جیب میں بھی صرف نوٹ ہی تھے

یو نے چلتے چلتے ایک سفری بیگ بھی اٹھا لیا۔ ہم دونوں جیپ میں جا بیٹھے۔ دوسرے ہی ے جیپ کوئٹہ کی شفاف سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ میرا رخ ہوٹل کی طرف تھا۔ پھر مجھے ال آیا کہ ہوٹل میں مقیم ایرانی اور امریکن ریتو کو پہچانتا نہ ہو، ممکن ہے وہ ایرانی صمد ن کی جیپ کو شناخت کر لیں۔ یہ سوچ کر میں نے جیپ ایک بھری پری شاہراہ پر چھوڑ ی۔ کچھ فاصلہ میں نے اور ریتو نے پیدل طے کیا، پھر ہم لوگ ایک دوسری سڑک پر جا نچے۔ اس سڑک کا نام شارع لیاقت تھا۔ اس کی دونوں اطراف میں بڑی بڑی دکانیں یں۔ ایک دکان کے شوکیس میں برقع دیکھ کر میں نے سوچا کیوں نہ ریتو کو برقع پہنا دیا ائے۔ وہ کم از کم فوری خطرے سے تو محفوظ ہو جائے گی۔ میں نے یہ بات ریتو کو بتائی تو س نے بھی تائید کی۔ میں نے ایک دکان سے اپنے لیے جینز کا جیکٹ، دستانے اور ورکوٹ خریدا کیوں کہ موسم روز بہ روز سرد ہو رہا تھا۔ وہاں سے میں نے ریتو کے لیے دید تراش کا سیاہ برقع خریدا۔ ریتو جب برقع پہن کر دکان سے باہر نکلی تو ایک لمحے کے لیے تو اسے میں بھی نہ پہچان سکا۔ برقعہ پہن کر وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ سیاہ برقع سے اس کی گوری گوری کلائیاں غضب ڈھا رہی تھیں۔ وہ برقع میں کچھ اس قسم کا تھا وہ جسمانی خطوط کو چھپانے کی بجائے اور نمایاں کرتا تھا۔ میرا مقصد تو ریتو کا چہرہ چھپانا تھا، اور اس کا چہرہ اچھی طرح چھپ گیا تھا۔ میں اب ریتو کو بھی اپنے ساتھ ہوٹل لے جانا چاہتا تھا، مگر اسے میرے ساتھ دیکھ کر ہوٹل کے بیرے اور مینجر وغیرہ نہ جانے کیا سمجھتے اس لیے میں نے اس سے کہا۔ "ریتو، میں فرح ہوٹل جا رہا ہوں۔ تم کچھ دیر یہاں گھومو پھرو۔ آدھے گھنٹے بعد تم بھی ہوٹل پہنچ جانا، اور میرے متعلق معلوم کرنا۔ کاؤنٹر کلرک کو بتانا کہ تم مسز خرم ہو، اور کراچی سے آئی ہو، اوکے۔۔۔"

"اوکے!" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس کا سفر بیگ اسی کے پاس چھوڑ دیا، اور خود رکشا کر کے فرح ہوٹل پہنچ گیا۔ میں نے کمرے کی چابی لیتے ہوئے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا۔ "میری بیوی تو نہیں آئی ابھی؟"

"نو سر!" کاؤنٹر کلرک نے جواب دیا۔

"وہ آج کسی وقت یہاں پہنچے گی، میرے حساب سے تو اسے اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ بہرحال اگر وہ میری غیر موجودگی میں بھی آئے تو اسے میرے کمرے میں پہنچا دینا۔" میں نے کاؤنٹر کلرک کو ہدایت کی اور چابی لہراتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔"

"ٹھیک آدھے گھنٹے بعد مجھے اطلاع ملی کہ مسز خرم پہنچ چکی ہیں۔ میں نے اسے کمرے میں بھیجنے کی تاکید کی۔

ریتو کمرے میں پہنچی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ میں نے

پریشانی کا سبب پوچھا تو وہ بولی۔ ”ہمارے گینگ کے ایک آدمی نے مجھے دیکھ کر پہچان لیا
ہے۔“

”کہاں‘ کب--- کون تھا وہ؟“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”بازار میں۔“ رینو نے جواب دیا۔ ”میں ایک دکان سے خریداری کرنے کے بعد
کاؤنٹر پر پیسے دے رہی تھی اس وقت میں نے نقاب الٹ دیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے گینگ کا
ایک آدمی دکھائی دیا۔ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ انھی دونوں میں سے ایک تھا جو
بس میں بھی ہمارے ساتھ سوار تھے۔“

”پھر--- پھر کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”پھر میں اتنی گھبرائی کہ وہاں سے سیدھی ہوٹل پہنچی۔ وہ بھی میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں
پہنچا ہو گا--- اب کیا ہو گا خرم!“ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”بس فوری طور پر ہمیں یہاں سے بھی بھاگنا پڑے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔ ”ڈرتے ہو ان لوگوں سے؟“

”تم بھول رہی ہو کہ ابھی اپنے گروہ کے دو آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر آئی ہو۔ اس
سے پہلے ایک جاپانی مارا گیا ہے۔ وہ لوگ خود کچھ نہ بھی کریں تو پولیس کو ہمارے پیچھے لگا
دیں گے‘ پھر پولیس آنکھیں بند کر کے تینوں قتل ہمارے کھاتے میں لکھ دے گی۔“ میں
سانس لینے کو رکا‘ پھر بولا۔ ”اور ہمارے کیا‘ صرف میرے کھاتے میں کیوں کہ تمہاری طرف
تو ان کا دھیان جا ہی نہیں سکتا۔“ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے ساڑھے چھے بجے
تھے۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”چلو‘ اب یہاں سے بھی نکلنے کی تیاری کرو۔ تمہارے گروہ
کے تین آدمی اس ہوٹل میں مقیم ہیں جو آدمی تمہارے پیچھے آیا ہے‘ ممکن ہے اس نے
اب تک یہاں والوں کو بھی تمہاری موجودگی سے آگاہ کر دیا ہو۔ انھیں شاید ابھی تک اپنے
بندوں کے مارے جانے کا علم نہیں ہوا ہے ورنہ وہ وقت ضائع کیے بغیر ہم پر چڑھ
دوڑتے۔“ میں نے اپنے کپڑے سوٹ کیس میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

”مگر ہم جائیں گے کہاں؟“ رینو نے پوچھا۔

اس کے سوال پر میں بری طرح جھنجلا گیا۔ ”ارے بابا‘ یہاں سے تو نکلو‘ جدھر منہ
اٹھے گا چل دیں گے۔“ ابھی تک میں نے خود بھی نہیں سوچا کہ ہم کہاں جائیں گے۔

میرے سخت لہجے سے اس کا موڈ آف ہو گیا۔ اس کا بیگ تو تیار ہی تھا۔ میں نے
بھی اپنا بیگ پیک کر لیا۔ وہ برقع پہننے لگی تو میں نے اسے منع کر دیا۔ پھر میں نے انٹرنل
فون پر کاؤنٹر کلرک سے اپنا بل بنانے کو کہا۔

دس منٹ بعد ہوٹل کا حساب بیباق کر کے فارغ ہو گیا۔ میں نے پورٹر سے ٹیکسی
لانے کو کہا تو اس نے بتایا کہ یہاں پرائیویٹ کاریں ٹیکسی کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

میں نے اس سے پرائیویٹ کار ہی منگوا لی۔ پورٹر کو میں نے یہی بتایا تھا کہ ہمیں ایئرپورٹ جانا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اطلاع دی کہ ٹیکسی آگئی ہے۔ میں نے اس سے اپنا اور ریتو کا سامان ٹیکسی میں رکھوایا' پھر ریتو کو لے کر انتہائی تیز رفتاری سے ٹیکسی کی طرف روانہ ہوگیا۔ ریتو نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ بازار سے بڑی سی سلک کی ایک چادر خرید لی تھی۔ اس وقت برقع کی بجائے وہی چادر اس نے اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ بھی حتی الامکان چادر میں چھپا لیا تھا۔

ہمارے بیٹھتے ہی ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ میں نے کوشش تو کی تھی کہ کوئی مجھے دیکھنے نہ پائے۔ میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکالا' اور ٹیکسی ڈرائیور کی بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ہمیں ایئرپورٹ نہیں جانا ہے۔ یہ تمہارا انعام ہے۔ تم کسی کو یہ مت بتانا کہ ہم کس طرف گئے ہیں۔"

ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے پوچھا۔ "مگر آپ کو جانا کہاں ہے؟" اس نے ابھی تک نوٹ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"ہم چمن جائیں گے۔" میری بجائے ریتو بول اٹھی۔ وہ اس سے پہلے بھی اس علاقے میں آ چکی تھی۔

"ٹھیک ہے صاحب!" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "میں آپ کو چمن لے چلتا ہوں' مگر وہاں جانے کے پانچ سو روپے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے' تم لے چلو۔" میں نے کہا۔

میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ وہ گاڑی خاصی آرام دہ تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ کوئٹہ میں اس وقت گاڑیاں بہت کم تھیں' تھیں بھی تو جیپیں تھیں' یا پھر بڑی بڑی جہازی سائز کاریں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہاں یا تو لوگ بہت غریب تھے' یا پھر بہت دولت مند! درمیانے طبقے کا وجود نہیں تھا۔ اس وقت جس گاڑی میں ہم جا رہے تھے۔ وہ کہنے کو تو ٹیکسی تھی' مگر اصل میں شیورلیٹ امپالا تھی۔ اس میں شاید ڈیزل انجن فٹ کیا گیا تھا' کیونکہ اس کے انجن کی آواز بہت زیادہ تھی۔

"چمن سے کہاں جائیں گے صاحب؟" ڈرائیور کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"وہاں سے ہمارا اردہ ایران جانے کا ہے۔" میری بجائے ایک مرتبہ پھر ریتو نے جواب دیا۔

میں نے پھر یہ سوچا کہ ریتو اتنی سیدھی اور بھولی ہے نہیں جتنی دکھائی دیتی ہے۔ شاید وہ پہلے بھی اس روٹ پر سفر کر چکی تھی اس لیے اتنے اعتماد سے ایران جانے کی بات کر رہی تھی' حالانکہ اسے بھی علم تھا کہ میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔ پاسپورٹ ہوتا

بھی تو کیا تھا۔ اس پر ویزے کی موجودگی کی بھی ضرورت ہوتی ہے' مگر ریٹو اتنے اعتماد سے یہ بات کر رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ ہم لاہور سے پنڈی جائیں گے۔

"پولیس ولیس کا چکر تو نہیں ہے صاحب؟" ڈرائیور نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

مجھے اس کا لہجہ ناگوار گزرا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم اپنے کام سے کام رکھو۔ پولیس کا چکر ہو گا بھی تو تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ پولیس سے ہم خود نمٹ لیں گے۔"

میرے سخت لہجے سے ڈرائیور کا منہ بن گیا' مگر وہ کچھ بولا نہیں' خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

ٹیکسی کے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ روڈ پر صرف اتنے ہی حصے میں روشنی تھی جہاں تک گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی پہنچ تھی۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ پھر میں نے سوچا کہ اگر باہر اجالا بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا۔ میرے لیے تو وہ علاقہ یوں بھی اجنبی تھا۔

اچانک ٹیکسی پختہ سڑک چھوڑ کر کچے میں اتر گئی۔

ریٹو نے چونک کر پوچھا۔ "یہ تم کس راستے سے جا رہے ہو؟"

"میں شارٹ کٹ لگا رہا ہوں۔ اس راستے سے ہمارا کم از کم ایک گھنٹہ بچے گا۔" ڈرائیور نے جواب دیا' پھر خاموشی سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ اب ٹیکسی اونچے نیچے راستے پر اچھل رہی تھی' پھر ایک ہموار پگڈنڈی پر دوڑنے لگی۔ اب مجھے ہیڈ لائٹ کی روشنی میں دائیں بائیں کچھ فاصلے پر سنگلاخ چٹانیں دکھائی دی تھیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد اس ویرانے میں آبادی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ کچے مکانوں اور جھونپڑوں پر مشتمل کوئی چھوٹی سی بستی تھی۔ ٹیکسی آبادی میں داخل ہوئی تو بے شمار کتوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ کتے تھے تو دیسی مگر انتہائی خونخوار لگ رہے تھے۔ بعض کتوں کے کان اور دم کٹی ہوئی تھی۔ کچھ آگے بڑھنے کے بعد ٹیکسی رک گئی۔

کتوں کے شور سے گھروں کی کھڑکیاں کھلنے لگیں' پھر ایک لحیم شحیم آدمی کندھے پر رائفل لٹکائے نمودار ہوا۔ اس نے کتوں کو ڈانٹا اور ٹیکسی کی طرف آ کر بلند آواز میں کچھ بولا۔ اس نے وہ جملہ بلوچی میں ادا کیا تھا اس لیے میں سمجھ نہ سکا' مگر اندازہ سے سمجھ گیا کہ وہ پوچھ رہا ہے ہم کون ہیں؟

ڈرائیور نے جواب میں کچھ کہا۔ میری سمجھ میں صرف دو الفاظ آ سکے سعد اللہ اور مہمان! شاید اس نے یہ کہا تھا کہ ہم سعد اللہ کے مہمان ہیں۔

"یہ تم ہمیں کہاں لے آئے ہو؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔
"خاموش بیٹھو۔" ڈرائیور نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔
"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے غیر محسوس طریقے سے ریوالور نکالتے ہوئے پوچھا۔ باہر والا آدمی شاید سعد اللہ کو اطلاع دینے جا چکا تھا۔ میں نے ایک دم ریوالور ڈرائیور کی گدی سے لگا دیا۔ "ٹیکسی یہاں سے نکالو' ورنہ یہیں ڈھیر کر دوں گا۔"
ڈرائیور بری طرح کسمسایا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ "گاڑی اسٹارٹ کرو۔" میں نے پھر سخت لہجے میں حکم دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔
میں نے ریوالور نال کی طرف سے پکڑا اور اچانک اس کے سر پر وار کیا۔ وہ جھوم کر اسٹیئرنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے بہ مشکل تمام اسے پسنجر سیٹ پر کھینچا اور خود اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا' پھر میں نے انجن اسٹار کیا' اور تیزی سے یوٹرن لے کر واپس چل دیا۔ میں نے گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی تھی اس لیے کچے راستے پر گاڑی بری طرح اچھل رہی تھی۔ مجھے گاؤں کے اس آدمی کی طرف سے بھی خطرہ تھا جسے ڈرائیور نے اپنے آنے کی اطلاع بھجوائی تھی' اگر اس کے پاس کوئی گاڑی ہوئی تو وہ تعاقب ضرور کرے گا۔ میں اس علاقے میں اجنبی تھا' راستوں کا علم نہیں تھا۔ پیچھا کرنے کی صورت میں وہ کوئی دوسرا مختصر اختیار کر کے مجھے روک سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ پیچھے آنے والے پوری طرح مسلح ہوں گے۔ میرے پاس صرف وہ ریوالور تھا جو میں نے صمد خان سے چھینا تھا۔ اس میں بھی دو گولیاں کم تھیں۔ اسی ریوالور سے رینو نے صمد خان اور شکیل کو ہلاک کیا تھا۔ ٹیکسی کے دھچکوں سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا۔ مجھ سے زیادہ خراب حالت رینو کی تھی۔ میں تو یوں بھی سخت جان تھا' اور انتہائی سخت قسم کی ایکسرسائز کا عادی تھا۔ اس تیز رفتاری سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہم جلد ہی مین روڈ پر جا نکلے۔ روڈ پر چڑھتے ہی میں نے اندازے سے سمت کا تعین کیا' اور گاڑی کی رفتار دگنی کر دی۔
تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے ایک سنگ میل دکھائی دیا جس پر لکھا تھا' چمن 25 میل' سنگ میل دیکھ کر میں نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی۔ گاڑی کا انجن انتہائی طاقتور تھا اس لیے میں رفتار بڑھائے جا رہا تھا۔
بیس منٹ سے بھی کم عرصے میں ہم چمن پہنچ گئے۔ میں نے رینو سے کہا۔ "اب کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟ میں تو اب تمہارے ہی رحم و کرم پر ہوں۔"
"اس مصیبت سے تو چھٹکارا حاصل کرو پہلے۔" اس نے بے ہوش ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔
"گردن مروڑ دوں اس کی؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔
"فی الحال تو اسے یہیں کہیں پھینک دو۔" رینو نے کہا تاکہ یہ ہوش میں آتے ہی

شور مچا دے کہ ایک مرد اور ایک عورت مجھ سے ٹیکسی چھین کر لے گئے' پھر گاڑی کے نمبروں کے سہارے پولیس ہمیں دھر لے گی۔ ہم فوراً ہی تو چمن سے نکل نہیں سکتے۔"

میں نے ٹیکسی مین روڈ سے ہٹا کر ایک پہاڑی ٹیلے کی آڑ میں کھڑی کی تھی اس لیے کوئی گاڑی وہاں سے گزری بھی تو ہماری ٹیکسی نظروں میں نہیں آتی۔

"پھر کیا کریں اس مصیبت کا۔" ریٖو نے کہا۔

اچانک مجھے جھٹکا سا لگا' اور کوئی مجھ پر آ پڑا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ وہ شاید بہت پہلے ہوش میں آچکا تھا' اور خاموشی سے موقع کا منتظر تھا۔ ریٖو سے بات کرتے وقت میری توجہ گردوپیش سے ہٹ گئی تھی۔ اگر ڈرائیور کو یہ معلوم ہوا کہ یہ حملہ اسے بہت مہنگا پڑے گا تو شاید وہ کبھی مجھ پر جھپٹنے کی جرات نہ کرتا۔ وہ خاصہ صحت مند آدمی تھا۔ میں سیٹ اور اسٹیرنگ کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ اس نے گھٹنا میرے پیٹ میں اڑایا اور دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچ لی۔ اس نے میری گردن اتنی زور سے پکڑی کہ لمحے بھر کو میری سانس رک گئی۔ میں نے بائیں ہاتھ کو تھوڑی سی حرکت دی' پھر ڈرائیور کے سینے پر اتنی زور سے کہنی ماری کہ وہ میری گردن چھوڑ کر سینہ دونوں ہاتھوں سے دبا کر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس کی گدی پر ہاتھ مارا۔ میں اسے ایک مرتبہ پھر بے ہوش کرنا چاہتا تھا' مگر اس کی گردن پر ہاتھ مارتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اس کی گردن ٹوٹ گئی ہے۔ غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور سے پڑ گیا تھا۔ میں نے اس کی جیب سے ڈرائیونگ لائسنس نکال لیا تاکہ فوری طور پر اس کی شناخت نہ ہو سکے' پھر اس کے مردہ جسم کو ایک ٹیلے کے پیچھے پھینک کر دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھا۔

"اب بتاؤ کہاں چلنا ہے؟" میں نے ریٖو سے پوچھا۔

"یہاں چمن میں ایک شخص رہتا ہے' نصر اللہ' ہمیں اسی کے پاس چلنا ہے۔ وہ پیسے لے کر ہمیں حفاظت سے بارڈر کراس کرا دے گا' تم چلو' میں راستہ بتاتی ہوں۔ ریٖو نے جواب دیا۔

"کیا تم پہلے بھی اس کے ذریعے سرحد پار کر چکی ہو؟" میں نے پوچھا۔ "کہیں وہ ہم لوگوں کو پھنسا نہ دے۔"

"وہ شخص پیشہ ور اسمگلر ہے۔ ایسے لوگ اپنے معاملات میں بہت کھرے ہوتے ہیں۔ اس کا کام ہے پیسے لے کر سرحد پار کرانا۔ اس سے غرض نہیں کہ میں کس غرض سے سرحد پار کر رہی ہوں' اور میرا تعلق کس گروہ یا تنظیم سے ہے۔"

"ارے بابا' میں نے تم سے تقریر کرنے کو نہیں کہا تھا' چلو راستہ بتاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد ہماری گاڑی ایک پختہ مکان کے آگے جا رکی۔ میں نے اتر کر دروازے پر دستک دی۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد کسی کی اونگھتی ہوئی

سی آواز آئی۔ اس نے شاید فارسی زبان استعمال کی تھی۔ میں نے اسکول میں تھوڑی بہت فارسی پڑھی تھی اس لیے سمجھ گیا کہ وہ ہمارے متعلق استفسار کر رہا ہے۔

"میں نے انگلش میں جواب دیا۔ "ہم نصراللہ کے مہمان ہیں' کوئٹہ سے آئے ہیں۔"

"فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ شخص انگلش بھی سمجھتا تھا۔

میں اور ربیو اس کے پیچھے پیچھے ایک کمرے میں پہنچے۔ اس کمرے کے فرش پر دبیز ایرانی قالین بچھا ہوا تھا' اور دیوار کے ساتھ ساتھ بیٹھنے کے لیے گدیاں اور بڑے بڑے گاؤ تکیے رکھے تھے۔ میں اور ربیو اطمینان سے گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد درمیانے قد اور مضبوط جسم کا ایک سرخ و سفید شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک ملازم ٹرے میں چائے اور خشک میوہ لے کر آیا تھا۔ وہ شاید اس قسم کے ملاقاتیوں کا عادی تھا اس لیے اس کے چہرے پر ذرہ برابر تکدر کے آثار نہیں تھے۔ وہ مجھے ایرانی لگ رہا تھا۔

میں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا' اور اپنا تعارف کرایا۔

"فرمایئے مسٹر خرم! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس نے شستہ انگلش میں پوچھا۔

"ہم لوگ سرحد پار کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا' پھر طویل سانس لے کر بولا۔ "ٹھیک ہے' آپ کا کام ہو جائے گا' مگر پیسے کچھ زیادہ خرچ ہوں گے' دگنے سمجھ لیں۔ میرا مقصد آپ کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں ہے۔ اصل میں آج کل بارڈر پر حفاظتی انتظامات کچھ زیادہ ہو گئے ہیں۔ ایرانی ایجنٹ نے اسی وجہ سے پیسے بڑھا دیے ہیں۔" پھر وہ ہماری طرف چائے کا کپ بڑھا کر بولا۔ "آپ لوگ چائے تو پئیں۔"

"پیسوں کی فکر مت کریں آپ!" میں نے چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔ "بس فوری طور پر ہماری روانگی کا بندوبست کریں۔"

"ایک دن تو یہاں آپ کو ٹھہرنا پڑے گا۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اطمینان رکھیں' یہاں آپ ہر طرح سے محفوظ ہیں۔" میرا اضطراب دیکھ کر شاید وہ سمجھ گیا کہ ہم کسی کے خوف سے سرحد پار جا رہے ہیں۔ "ہمیں انتظامات کرنے کے لیے کم از کم چوبیس گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ جب تک آپ کے جانے کا بندوبست نہیں ہو جاتا' آپ دونوں نصراللہ کے مہمان ہیں۔ اسے بالکل اپنا ہی گھر سمجھیں۔ یہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"وہ اصل میں ہماری گاڑی ـــ بھی ـــ"

"آپ اطمینان رکھیں۔" نصراللہ نے میری بات کاٹ دی۔" میں گاڑی کا بندوبست

بھی کر دوں گا۔"

نصراللہ ہمیں اس کمرے میں لے گیا جہاں وہ اس قسم کے خاص مہمانوں کو ٹھہرایا کرتا تھا۔

جاتے جاتے پھر اس نے کہا۔ "آپ بالکل اطمینان رکھیں۔ یہاں آپ ہر طرح سے محفوظ ہیں۔"

"اس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا' اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ صبح ہونے میں اب صرف دو گھنٹے رہ گئے تھے۔ رینو آرام دہ کرسی پر نیم دراز جمائیاں لے رہی تھی۔ جب میں اس بری طرح تھک گیا تھا تو وہ تو نازک اندام لڑکی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم بیڈ پر سو جاؤ' میں نیچے فرش پر سو جاؤں گا۔"

بہ مشکل تمام میں نے اسے بیڈ پر لیٹنے پر آمادہ کیا' اور خود کمبل اور تکیہ لے کر قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ رینو ابھی تک بے سدھ تھی۔ میں نے جلدی سے تکیہ اور کمبل فرش سے اٹھا کر بیڈ پر رکھا' اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر نصراللہ کا وہی ملازم کھڑا تھا جو رات ہمارے لیے چائے لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا' اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں پوچھا۔ "آپ بیڈ ٹی لیں گے یا غسل کے بعد ناشتا کریں گے؟"

میرا جی تو چاہا کہ اسے ایک زوردار جھانپڑ رسید کر دوں' پھر کہوں کہ پہلے تو اتنی صبح اٹھانے پر میں تمہیں پیٹنا چاہوں گا' مگر اسی وقت میری نظر وال کلاک پر پڑ گئی۔ وال کلاک بارہ بجا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا نصراللہ نے خاصی دیر انتظار کرنے کے بعد اپنے ملازم کو بھیجا ہو گا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں غسل کے بعد ناشتا کروں گا۔ وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ میں نے رینو کو آواز دی تو وہ بولی۔ "تم نہا دھو کر فارغ ہو جاؤ۔"

ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھے تو نصراللہ آ گیا۔ اس نے مجھے اطلاع دی کہ ہماری روانگی کا بندوبست ہو گیا ہے' صبح چار بجے ہمیں باڈر کراس کرنا تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے یہ اطلاع دی' پھر معذرت کر کے چلا گیا۔

"اس کے جانے کے بعد میں نے ملازم سے چائے منگوائی اور رینو سے کہا۔ "تم نے اب تک اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا۔"

"اس کا موقع ہی کب ملا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اور میں اپنے متعلق کیا بتاؤں' میری کہانی کوئی نئی یا انوکھی نہیں ہے۔ میں بھی ایک نوجوان کی محبت کے جال میں پھنس کر اس حال کو پہنچی ہوں۔ وہ ایک فوٹوگرافر تھا۔ میں اس کی محبت میں اتنی اندھی ہو چکی تھی کہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی۔ بات اگر یہیں تک رہتی تب بھی غنیمت تھا۔ اس حرام

زادے نے ان لمحات کو مووی کیمرے کے ذریعے نہ جانے کیسے فلم بند کر لیا تھا۔ جب اس نے مجھے وہ شرم ناک وڈیو فلم دکھائی تو میں حواس باختہ ہو گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ شروع ہی سے میرے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ میں نے مایوس ہو کر مرنا چاہا' مگر مر بھی نہ سکی' شاید اپنی بزدلی کی وجہ سے۔ پھر وہ مجھے اپنے اشاروں پر نچاتا رہا۔ اسی کے کہنے پر میں اس گینگ کے لیے کام کرنے لگی۔ وہ لوگ پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکیوں سے اسمگلنگ کراتے ہیں' انھیں رشوت کے طور پر اعلیٰ حکام کو پیش کر کے ناجائز مراعات حاصل کرتے ہیں' ان کے ذریعے امیرزادوں کو پھانستے ہیں' پھر انہیں بھی بلیک میل کرتے ہیں۔"

"تمہارے والدین اور بہن بھائی وغیرہ کہاں ہیں؟"

والدین کے تذکرے پر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "میرے والدین کراچی میں ہیں' بھائی کوئی نہیں ہے' صرف ایک بہن ہے اس کی بھی شادی ہو چکی ہے۔" ریتو نے خلا میں تکتے ہوئے کہا۔ "میرے والد ایک میڈیکل اسٹور پر ملازم تھے۔ گھر میں مفلسی' بھوک اور بیماریوں کا ڈیرہ تھا۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح فرزانہ باجی کی شادی اپنے ہی جیسے ایک گھرانے میں کر دی۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا اس لیے میں نے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دیں ورنہ ابا نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میٹرک سے آگے پڑھانا میرے بس میں نہیں ہے۔ اسی دوران میں میری ملاقات سجاد سے ہو گئی اور میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔"

"گھر سے باہر رہنے کے لیے والدین سے کیا بہانہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ابا سمجھتے ہیں کہ میں ایک ملٹی نیشنل کاسمیٹک کمپنی میں سیلز آفیسر ہوں۔ پہلے پہل تو انہوں نے میری ملازمت کی شدید مخالفت کی' مگر جب ہر مہینے ان کے ہاتھ پر تین ہزار روپے رکھنے لگی تو ان کی مخالفت دم توڑ گئی۔ اتنی رقم تو وہ چار پانچ مہینے میں کما پاتے تھے۔ انہوں نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ ایسی کون سی کمپنی ہے پاکستان میں جو اپنے معمولی ملا ۔۔پھنے کا
کو بھی اتنی بھاری تنخواہ دیتی ہے۔ بس جب سے لے کر آج تک نہ ابا کچھ پوچھتے ہ رضوانہ
اماں ٹوکتی ہیں۔ میرے بیرون ملک تنہا جانے پر بہن اور بہنوئی نے مخالفت کی تھی' مگ پڑے۔
یں نے انہیں بیش قیمت گھڑی' گنگن رنج او قیمتی کپڑوں کے تحفے دیے تو ان کا م
ند ہو گیا۔ میں نے ایک ہی سبق سیکھا ہے کہ پیسا ہی اس دور کی سب سے بڑی طاقت حد پار کر
سب سے بڑی سچائی ہے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میرے والدین یہ سمجھتے ہیں کہ ہ
ٹی بہت نیک اور پارسا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ بیٹی ان کی عزت کو بہت پہلے نیلام کر چکی بھی
ہے۔" قبال

"اس فوٹو گرافر کی دکان کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نیو کراچی میں رہتی ہوں۔ اس فوٹو گرافر کی دکان نارتھ ناظم آباد میں ہے۔ وہ

رہتا بھی وہیں ہے مگر تم کیا کر سکو گے' مجھے تو تم بھی انہی راہوں کے راہی لگتے ہو۔"

"ریبو! مجھے ایک دم غصہ آگیا۔۔۔ تم۔۔۔"

"سوری خرم!" وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولی۔ "مگر تم مجھے ریبو مت کہا کرو۔ یہ نام بھی مجھے اسی کمینے سجاد نے دیا تھا۔ میرا اصل نام تو رضوانہ ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ جب ہم باتیں کرکے تھک گئے تو رضوانہ نے کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔ مجھے ملازم نے اطلاع دی کہ صاحب آپ کو ڈرائنگ روم میں بلا رہے ہیں۔

ڈرائنگ روم میں چقندر ایسے چہرے والا ایک شخص بیٹھا تھا۔ نصراللہ نے مجھے بتایا کہ یہ عباس مشہدی ہیں اور یہی ہمیں بارڈر کراس کرائیں گے۔ میں نے عباس مشہدی سے مصافحہ کیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آغا!" عباس مشہدی نے مجھے مخاطب کیا۔ "؟آپ کو کرنسی تو تبدیل نہیں کرانا ہے؟"

اس کے کہنے پر مجھے یاد آیا کہ اتنا اہم کام میں بھلا بیٹھا تھا۔ میں نے عباس مشہدی سے کہا۔ "جی ہاں' کرنسی تو تبدیل کرانا ہے مجھے۔" پھر میں ان لوگوں سے معذرت کرکے اپنے کمرے میں آیا اور سوٹ کیس میں سے پاکستانی کرنسی کی دو گڈیاں نکال کر واپس ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ مشہدی نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔ "ویسے ایران میں بھی ہمارے آدمی ہیں' مگر وہ آپ کو ریٹ کم دیں گے۔ میں روانگی کے وقت آپ کو ان کے ایڈریس دے دوں گا۔" وہ رات کو مجھے تیار رہنے کی تاکید کرکے چلا گیا۔ کرنسی نوٹ وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا' اور وعدہ کیا تھا کہ روانگی کے وقت ایرانی کرنسی بھی دے دوں گا۔

میں نے

رات کے کھانے کے بعد میں کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا' پھر آرام دہ کرسی پر

دراز ہو گیا۔ رضوانہ نے مجھ سے کہا۔ "تھوڑی دیر سو لو یوں بھی رات کو تو جاگنا ہی

ہماری

کھڑے

اس کی بات معقول تھی اس لیے میں فرش پر بستر لگا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

نہ جانے کب میں گہری نیند سو گیا۔

اب

روز بہ روز سردی میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ اس کمرے میں نہ آتش دان تھا' نہ الیکٹرک ہیٹر اس لیے مجھے سوتے میں کچھ زیادہ ہی سردی لگی۔ شاید سردی ہی کی وجہ سے

بتا میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت ڈیڑھ بج رہا تھا۔ رضوانہ کمبل میں گٹھری بنی گہری نیند سو رہی تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں بری طرح اچھل پڑا۔ رضوانہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دروازے پر نصراللہ کا ملازم تھا۔ وہ ہمیں بیدار کرنے آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم ناشتا لے آیا۔ ہم نے اس خیال سے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا کہ نہ جانے پھر کب کھانے کو ملے۔ ہم ناشتے سے فارغ ہو کر کافی پی رہے تھے کہ نصراللہ خود آگیا۔ میں نے اسے پاکستانی روپوں میں ادائیگی کی' اور اس سے کہا "گاڑی میں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ ممکن ہو تو اسے بیچ کر رقم تم لے لینا' ورنہ گاڑی کو بالکل غائب کرا دینا کیوں کہ وہ گاڑی چوری کی ہے۔"

"یہ بات تو مجھے اسی دن سے معلوم ہے جب آپ یہاں آئے تھے۔ بہرحال آپ گاڑی کی فکر مت کریں۔ اس کا بندوبست میں کروں گا۔" پھر اس نے مجھے چند لوگوں کے پتے دیے اور کہا کہ اگر ضرورت پڑے تو ان سے رابطہ کر لیجئے گا۔

پھر مشہدی آگیا۔ وہ ٹویوٹا جیپ میں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دراز قد' اور اکھڑ نوجوان بھی تھا۔ مشہدی نے بتایا کہ وہ نوجوان ایران کے شہر زاہدان تک ہمارے ساتھ جائے گا۔" پھر اس نے بھی مجھے چند لوگوں کے پتے دیے اور کہا "ان لوگوں سے مل کر میرا حوالہ دیجئے گا' یہ لوگ آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔"

اسٹیرنگ مشہدی ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بہت تیز رفتاری سے جیپ دوڑا رہا تھا۔ پھر ہم دو گھنٹے تک مسلسل سفر کرتے رہے۔ عین پانچ بجے اس نے جیپ ایک جگہ روک دی' اور بتایا کہ سامنے ہی ایران کی سرحد ہے۔ علی اکبر آپ لوگوں کو وہیں سے سرحد پار کرائے گا' پھر زاہدان تک باحفاظت پہنچانے کے بعد لوٹ آئے گا۔"

اس نے گاڑی سے اتر کر مجھ سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا' اور ہمیں اپنے خونخوار شکل کے نوجوان کے حوالے کرکے لوٹ گیا۔

علی اکبر محتاط انداز میں پہلے خود وہاں کا جائزہ لے کر آیا' پھر ہم دونوں کو بھی چلنے کا اشارہ کیا۔ ایرانی کرنسی کا ایک پیکٹ میرے پاس تھا' دوسرا میں نے اس خیال سے رضوانہ کے سفری بیگ میں ڈال دیا تھا کہ نہ جانے آئندہ کس قسم کے حالات سے واسطہ پڑے۔ اگر رضوانہ مجھ سے بچھڑ بھی جائے تو وہ فاقوں نہ مرے۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک چلنے کے بعد علی اکبر نے بتایا کہ اب ہم ایران کی سرحد پار کر چکے ہیں۔

مزید کچھ دور پیدل چلنے کے بعد مجھے ایک گاڑی دکھائی دی۔ اس کے اسٹیرنگ پر بھی کوئی موجود تھا۔ علی اکبر کو دیکھ کر وہ گاڑی سے باہر آگیا اور پرتپاک انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ وہ شاید اس قسم کی سواریوں کو زاہدان پہنچاتا رہتا تھا' کیوں کہ اس نے بغیر کسی ہدایت کے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی تھی۔ علی اکبر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہم دونوں پچھلی نشست پر تھے۔ علی اکبر اور ڈرائیور دونوں فارسی میں گفتگو کر رہے تھے۔ مجھے فارسی

کی شدھ بدھ تو تھی' مگر وہ لوگ اتنی روانی سے بول رہے تھے کہ ان کی کوئی بات پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ میں نے اسی لمحے تہیہ کر لیا کہ اب پہلی فرصت میں فارسی سیکھوں گا۔"

صبح کاذب کا دھندلکا آہستہ آہستہ اجالے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اس دوران میں رضوانہ گہری نیند سو گئی تھی۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ مجھے بھلا اس اجنبی سرزمین پر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہی ملا کہ اپنی جان بچانے کی خاطر میں نے ملک چھوڑ دیا تھا' یا شاید میں غیر شعوری طور پر رضوانہ کے مشورے پر عمل کرتا چلا گیا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو' اس وقت میں ایران میں تھا' اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟

اچانک جھٹکے سے گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ میں نے چونک کر باہر دیکھا' اچھا خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔

علی اکبر نے انگلش میں مجھے مخاطب کیا۔ "یہاں سے ایک کلو میٹر کے فاصلے پر زاہدان ہے۔ اگر شہر میں رکنا نہ چاہو تو تمہیں یہاں سے ایران کے ہر شہر کے لیے بس مل جائے گی۔"

رضوانہ بھی بیدار ہو گئی تھی' اور آنکھیں مل مل کر گاڑی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے اترنے کا اشارہ کیا' اور خود بھی اتر گیا۔ علی اکبر نے گاڑی سے اتر کے ہمارا سامان اتارا' اور دونوں مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

جب ان کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں بھی ان کی بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہو گیا۔ رضوانہ کا سفری بیگ میں نے پشت پر لٹکا لیا تھا۔ سوٹ کیس میرے دائیں ہاتھ میں تھا' اور میں یہ دیکھے بغیر چلا جا رہا تھا کہ رضوانہ میرے پیچھے آ رہی ہے یا نہیں؟

رضوانہ تیزی سے چلتی ہوئی میرے برابر آئی' اور بولی "یہاں سے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

میں نے چلتے چلتے ایک نظر اس پر ڈالی اور بولا "میں تو تمہارے ڈسپوزل پر ہوں' جہاں تم لے جاؤ گی' چلا جاؤں گا۔" پھر بجلی کی سی تیزی سے ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے رضوانہ سے پوچھا۔ "رضوانہ ایک بات سچ سچ بتانا تم جانتی ہو کہ تمہارے ساتھیوں کی منزل بھی ایران ہے' پھر تم یہاں کیوں دوڑی چلی آئیں؟"

اس نے طویل سانس لیا اور بولی "جو کچھ ہوا' تمہارے سامنے ہی تو ہوا ہے۔ اب اس سوال کا مقصد؟"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔" میں چلتے چلتے رک گیا۔ مجھے بتاؤ' سب کچھ جانتے بوجھتے تم نے ایران کا رخ کیوں کیا؟"

"میں تمہارے شکی ذہن کو کیا کروں۔" رضوانہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ "پے

دریے واقعات ہی ایسے پیش آئے کہ میری عقل خبط ہو کر رہ گئی۔ میں خود بھی نہیں جانتی کہ میں نے ایران کا رخ کیوں کیا۔"

اس وقت ایک گاڑی ہمارے نزدیک سے گزری' ڈرائیور نے ہمیں دیکھ کر اچانک بریک لگائے اور گاڑی ریورس ہو کر ہمارے نزدیک آ رکی۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ اتار کر فارسی میں کچھ کہا' پھر ہماری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر انگلش میں بولا۔ "کہاں جائیں گے آپ لوگ؟"

"خیابان طوسی۔" میری بجائے رضوانہ نے جواب دیا۔ گاڑی کے ڈرائیور نے ہنس کر کہا "آیئے' میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔"

اس نے ڈکی کھول کر ہمارا سامان رکھا اور ہمیں گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہو گیا۔"

آدھے گھنٹے بعد گاڑی ایک بھری پری سڑک پر جا رکی۔ رضوانہ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ہمارا سامان اتار کر روانہ ہو گیا تو رضوانہ بھی ایک طرف چل دی۔ میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ایک وسیع و عریض بنگلے کے آہنی گیٹ کے سامنے جا رکی۔ میں ایک مرتبہ پھر الجھ کر رہ گیا۔ اب رضوانہ کی حرکات و سکنات مجھے الجھن میں ڈال رہی تھیں۔ کال بیل بجانے پر ایک پستہ قد ایرانی گیٹ پر نمودار ہوا۔ رضوانہ نے اس سے کہا۔ "ہمیں آقائے ہمدانی سے ملنا ہے' ہم بہت دور سے آئے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ایک فربہ اور گورے چٹے ایرانی کے سامنے بیٹھے تھے۔ رضوانہ نے اس سے یوں ملاقات کی جیسے اسے برسوں سے جانتی ہو' پھر اس نے ایرانی سے میرا تعارف بھی کرایا۔ نہ جانے کیوں مجھے وہ شخص پسند نہیں آیا۔ رسمی گفتگو کے بعد اس نے ہمیں فریش ہونے کا مشورہ دیا۔

○

مجھے صاف صاف بتاؤ رضوانہ! میں جھنجلا کر بولا۔ "آخر تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

ہم نہا دھو کر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ مجھے رضوانہ کے رویے نے الجھن میں ڈال رکھا تھا اس لیے میں اس سے بار بار ایک ہی سوال کر رہا تھا۔

"دیکھو' اگر تم اب بھی مجھے ٹالتی رہیں تو میں تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں گا' پھر جانو اور تمہارا کام۔" وہ پھر خاموش رہی تو میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا' اور اس سے کہا۔ "میں جا رہا ہوں' خدا حافظ۔" میں نے یہ کہہ کر دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"رک جاؤ خرم! رضوانہ نے کہا۔ "یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"کیا آسان نہیں ہے؟" میں بھنا گیا۔ "یہاں سے جانا! مجھے کون روکے گا اور کیوں

روکے گا؟"

"پلیز خرم! رضوانہ نے کہا۔ "یہاں سے جانے کی کوشش مت کرنا۔"

"آخر کیوں؟" میں بپھر کے بولا۔

"اس لیے کہ آقائے ہمدانی کی مرضی کے بغیر تم یہاں سے نکل نہیں پاؤ گے۔"

"آقائے ہمدانی کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا؟" میں غصے میں پھٹ پڑا۔ "میں جاؤں گا' اور ابھی جاؤں گا۔" میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

آقائے ہمدانی نے ہمیں اس بنگلے کی اوپری منزل پہ ٹھہرایا تھا۔ کوریڈور میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ میں بے آواز قدموں سے چلتا ہوا زینے تک پہنچا تو اچانک ایک لمبا تڑنگا ایرانی سامنے آگیا' اور دانت نکال کر ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ "اپنے کمرے میں واپس جاؤ مسٹر!"

"کیا تم مجھے روکو گے؟" میں نے اسے گھورا۔ اس نے پھر دانت نکال دیے۔ میں سوٹ کیس دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کیا اور اس شخص کو دھکیل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی' مگر وہ کسی چٹان کی طرح اڑ گیا' اور قدرے سخت لہجے میں بولا۔ "میں کہتا ہوں واپس جاؤ۔"

"اور میں کہتا ہوں میرا راستہ چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر میں نے ہاتھ گھما دیا۔ تھپڑ بھرپور انداز میں اس کے منہ پر پڑا۔ لمحے بھر کو وہ سناٹے میں رہ گیا' مگر یہ تھپڑ مجھے بہت مہنگا پڑا۔ اس شخص نے اچانک لات گھما دی۔ مجھے اس بھاری بھرکم ایرانی سے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی اس لیے دھوکا کھا گیا۔ اس کی لات میرے پیٹ میں لگی۔ میں سوٹ کیس چھوڑ کر دوہرا ہو گیا۔ دوسرا وار اس نے میرے دائیں شانے پر کیا' مگر میری ہڈیاں بہت مضبوط تھیں اس لیے مجھے زیادہ محسوس نہیں ہوا۔ اس وقت تک میں سنبھل چکا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر لات چلائی۔ میں جھکے جھکے ہوا میں الٹی قلا بازی کھا گیا۔ پھر میں نے اس ایرانی پر تابڑ توڑ اتنے حملے کیے کہ اس کے سارے کس بل نکل گئے' مگر وہ تھا بہت سخت جان۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے' جسم کئی جگہ سے زخمی تھا' مگر وہ ہار ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر کراٹے کا ایک جچا تلا وار کیا تو وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح پورے قد سے فرش پر گر پڑا۔

اسے بے ہوش کر کے میں نے سوٹ کیس اٹھایا۔ اچانک کوئی زور سے بولا۔ "گڈ ویری گڈ!"

میں چونک کر پلٹا تو آقائے ہمدانی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آقائے ہمدانی کے عقب میں دو خونخوار قسم کے گارڈز موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید ساخت کی مشین گنیں تھیں' اور ان کا رخ میری ہی طرف تھا۔ مجھے حیران دیکھ کر آقائے ہمدانی کی مسکراہٹ کچھ

اور کھڑی ہو گئی۔ میں نے بھنا کر پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے! کیا میں تمہارا قیدی ہوں؟"

"اپنے کمرے میں جاؤ ورنہ میرے یہ گارڈ سوائے فارسی کے کوئی زبان نہیں جانتے' اور گولیاں چلانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔"

میں نے سوچا فی الحال مجھے کمرے میں چلا جانا چاہیے فرار ہونے کے اور بھی موقع ملیں گے۔ میں نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور سوٹ کیس اٹھا کر کمرے میں لوٹ آیا۔ رضوانہ کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ وہ اطمینان سے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میں نے دروازہ اندر سے بولٹ کیا' اور رضوانہ کی گردن دبوچ لی۔" مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے۔ ورنہ تمہاری گردن خشک ٹہنی کی طرح توڑ دوں گا۔ بتاؤ۔" میں نے اس کی گردن پر ہاتھوں کا دباؤ مزید بڑھا دیا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ پہلے میری گردن چھوڑو۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی' اور سخت لہجے میں بولا۔ "شور شرابا مت کرنا ورنہ تمہارے حمایتی جب تک یہاں پہنچیں گے تمہاری گردن ٹوٹ چکی ہو گی۔ اب جلدی سے شروع ہو جاؤ۔"

"میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیتی ہوں' مگر مجھ سے وعدہ کرو کہ سچ جاننے کے بعد بھی میری مدد کرو گے۔"

"کوئی وعدہ نہیں کروں گا۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "تمہارے سچ پر منحصر ہے کہ میں تمہاری مدد کرتا ہوں یا نہیں۔ تم لوگ بہت چالاک بنتے ہو' مگر تمہارا آقائے ہمدانی یہ بھول گیا کہ میں تمہیں بھی زبان کھولنے پر مجبور کر سکتا ہوں یا ہمیشہ کے لیے خاموش کر سکتا ہوں۔"

اس نے سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا' پھر نظریں جھکا کر بولی۔ "ہم لوگ کراچی ہی سے تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔"

اس کی بات پر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ "تو کیا تم مجھے پہلے سے جانتی ہو؟"

"ظاہر ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "اور اب مجھے درمیان میں ٹوکنا مت!"

"نہیں ٹوکوں گا' مگر مجھے ایک بات بتا دو' کیا تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بھی وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمیں چاہئیں جو وانگ یو کے قبضے میں تھیں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ اتنے خطرناک کام نہیں کرتے کہ حکومتوں کی خفیہ ایجنسیاں ہمارے پیچھے لگ جائیں۔ میں نے وانگ یو کا نام ضرور سنا ہے' تمہارا تذکرہ بھی رہتا تھا' مگر ہمیں ان دستاویزات اور فلموں سے کوئی سروکار نہیں۔"

"ایک طرف تم یہ کہتی ہو کہ تم لوگ کراچی سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے' اور دوسری طرف یہ بھی کہتی ہو کہ تمہیں یا تمہارے ساتھیوں کو ان دستاویز اور فلموں سے کوئی

سروکار نہیں۔"

"دونوں ہی باتیں درست ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔" ہمارا باس تمہیں بہت عرصے سے جانتا ہے۔ شاید تمہیں وہ دو آدمی یاد ہوں جن کے سامنے تم نے لوہے کے گولوں پر دوڑنے کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ دونوں آدمی ہمارے باس کے خاص آدمی ہیں۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ وانگ یو نے کتنی محنت سے تمہاری تربیت کی تھی۔ اب باس کو ایسے ہی ایک نوجوان کی ضرورت ہے جو کراٹے میں ماہر ہو' بہترین جمناسٹ ہو' اور سب سے بڑی بات یہ کہ دلیر ہو۔ تم باس کے معیار پر پورے اترتے ہو۔ اس لیے اس نے مجھے تمہارے پیچھے لگا دیا۔ جب سے تم وانگ یو کے بنگلے سے فرار ہوئے ہو اس کے بعد تمہاری ایک ایک لمحے کی مصروفیت ہمارے علم میں ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تم نے بینک لاکرز میں کوئی قیمتی چیز رکھوائی ہے' اور ہمیں یہ بھی علم ہے کہ تمہارے پاس کروڑوں کی مالیت کے کرنسی نوٹ ہیں۔"

تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں نے طویل سانس لیا۔

"میں نے کہا نا کہ باس تم سے کام لینا چاہتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے نوجوان شاید گنتی کے ہوں گے جن میں اتنی بہت ساری خصوصیات یکجا ہوں' اور جو باس کے لیے کام کرنے پر مجبور بھی ہوں۔"

"اگر میں کام کروں گا بھی تو اپنی خوشی سے کروں گا۔ اس میں کسی مجبوری کا دخل نہیں ہو گا۔"

"باس نے بھی یہی چاہا تھا کہ تم ہر کام اپنی خوشی سے کرو۔ اسے شاید میرے حسن کی قوت تسخیر پر بھروسا تھا۔ اسے ہی کیا' مجھے خود اپنی حسن کی قیامت خیزی پر خوش فہمی تھی' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ باس کا خیال تھا کہ تم میرے عشق میں پاگل ہو کر سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ گے' مگر زندگی میں پہلی دفعہ میرا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔"

میں دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔ مجھے ابھی تک لوگوں کو پرکھنے کا سلیقہ نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے چیکو مجھے دھوکا دے چکی تھی۔ میں پھر دھوکے میں آ گیا۔ اگر رضوانہ مجھے کسی اور حالات میں ملی ہوتی تو ممکن ہے میں اس پر عاشق بھی ہو جاتا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کوئٹہ والی بس میں تم لوگ کیسے پہنچ گئے تھے؟"

"میں بتا تو رہی ہوں کہ ہمارا ایک آدمی مسلسل تمہاری نگرانی کر رہا تھا۔ جب تم سوٹ کیس لے کر روانہ ہوئے تو ہمیں اطلاع مل گئی۔ بس میں ہم نے جان بوجھ کر ایسے ڈائیلاگ بولے جن سے تم تجسس میں مبتلا ہو جاؤ' پھر وہ تھیلی بھی اسی لیے تمہارے سوٹ کیس میں رکھی گئی تھی کہ اسی ذریعے سے تعلقات بڑھیں گے۔ یہاں شکیل سے غلطی یہ

ہوئی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی ملوث کر بیٹھا ورنہ اس تھیلی میں پرانے اخبار وغیرہ تھے۔

"مگر تم نے تو اپنے ہی گینگ کے دو آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس کا کیا جواب دو گی؟"

"وہ بھی ڈراما تھا، تمہیں اپنا ہمدرد بنانے کے لیے ورنہ وہ کارتوس ہی نقلی تھے۔ شکیل اور صمد خان زندہ ہیں۔"

میں حیرت سے گنگ رہ گیا، میرے لیے اتنے پاپڑ بیلے تھے ان لوگوں نے۔ میں نے یہ سوچ کر پوچھا "مگر اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ میں وہاں آؤں گا؟"

"اس کے لیے خاص طور پر گراؤنڈ تیار کیا گیا تھا۔" رضوانہ نے کہا۔

اس کی ہر بات مجھے حیرت زدہ کر رہی تھی۔

"ہوٹل میں وہ لوگ جان بوجھ کر ایسی میز پر بیٹھے تھے جو تم سے قریب ہو، اور تم آسانی سے ان کی باتیں سن لو۔ میرا اور شکیل کا نام بھی انہوں نے تمہیں سنانے کے لیے لیا تھا۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ تم صمد خان کا پیچھا ضرور کرو گے، اگر تم پیچھا نہ بھی کرتے تو وہ کسی اور ذریعے سے تمہیں پھانستے۔"

"پھانستے!" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "میں دیکھتا ہوں، وہ مجھ سے کیسے کام لیتے ہیں۔"

"میرے کہنے سے بھی نہیں کرو گے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"تم کیا خالہ ہو میری؟" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "پہلے تو شاید میں کر بھی دیتا، مگر اب تو کسی صورت میں نہیں!"

"خرم پلیز! غصہ تھوک دو۔ ہمارے ساتھ کام کرو۔ باس تمہیں ہر طرح کا تحفظ مہیا کرے گا۔ تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ کئی ممالک کے خونخوار ایجنٹ تمہاری تاک میں ہیں۔ تم تنہا اس کا مقابلہ کر لو گے؟"

"کچھ بھی ہو مگر میں یہاں نہیں رکوں گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "یہ لوگ مجھے مار دیں گے نا! شوق سے مار دیں مگر میں تمہاری بات نہیں مانوں گا۔" میں نے بریف کیس اٹھا لیا اور باہر کی طرف بڑھا۔

"خرم پلیز!" رضوانہ نے پھر خوشامد کی۔

میں اس کی آواز سنی ان سنی کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

دروازے پر کرخت چہروں والے دو گارڈز موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے میرے سینے پر اسٹین گن رکھ دی۔ دوسرے نے کچھ پیچھے جا کر پوزیشن لے لی۔ ان کی اس حرکت پر میں بھنا گیا۔ میں نے تھوڑا سا ترچھا ہو کر گارڈ کی اسٹین گن پکڑی اور اسے اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ بری طرح دیوار سے ٹکرا گیا۔ جھٹکے سے اسٹین گن میرے ہاتھ سے بھی

نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ دوسرا گارڈ سنبھل کر فائر کرتا' میں نے بھاری بھرکم سوٹ کیس پوری قوت سے اس پر اچھا دیا۔ وہ سوٹ کیس کی ضرب سے لڑکھڑا گیا تو میں نے بھی اس پر چھلانگ لگا دی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی اسٹین گن بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے جنون کے عالم میں اسٹین گن ڈنڈے کی طرح اس کے سر پر دے ماری۔ وہ تیورا کر گرا تو میں نے دوسرے گارڈ کے ساتھ بھی یہی کیا۔ یہ کارروائی مشکل سے ایک منٹ میں ہو گئی' اور دونوں گارڈز انٹا غفیل ہو گئے۔ میں چاہتا تو ان دونوں کو ٹھکانے لگا سکتا تھا' مگر ان بچاروں سے مجھے کیا دشمنی تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر سوٹ کیس اٹھا کر زینے کی طرف لپکا۔ اس دوران میں رضوانہ بھی کمرے سے باہر آ چکی تھی' اور مسلسل مجھے آوازیں دے رہی تھی۔ میں دائیں ہاتھ میں سوٹ کیس اور بائیں ہاتھ میں برین گن لے کر زینے کے پاس پہنچا تو مجھے وہی گارڈ اوپر آتا دکھائی دیا جس نے مجھے پہلے روکا تھا۔ میں نے سوٹ کیس چھوڑ کر اسٹین گن سیدھی کر لی۔ اس کی اسٹین گن شانے سے لٹک رہی تھی۔ اسے گن ہاتھ میں لینے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں نے سیڑھیاں اتر کر اس کے نزدیک پہنچا اور کراٹے کے ایک ہی وار میں اسے بھی ناک آؤٹ کر دیا۔

پھر میں باہر کی طرف بڑھا ہی تھا' کہ پیچھے سے کوئی لڑکی چیخ کر بولی۔ "رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اسٹین گن کا ایک برسٹ مارا۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

میرے پیچھے ایک لحیم شحیم لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے قومیت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید اور بال سرخ تھے' جسم پر اسکن ٹائٹ بنیان اور جینز تھی۔ دراز قد' اور صحت مند ہونے کے باوجود بے ڈول نہیں تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سخت لہجے میں کہا۔ "اپنے کمرے میں واپس جاؤ۔" زبان انگلش میں تھی۔ پھر بھی مجھے اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کس ملک سے تعلق رکھتی ہے۔

میرا خیال تھا کہ وہ جرمن ہے یا پھر امریکن۔ لہجے سے زیادہ میں اس اسٹین گن سے متاثر ہوا جو اس کے دائیں ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی' اور تیور سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے فائر کر دے گی۔

"تم کیا بلا ہو بھئی!" میں اردو میں بولا۔ "اتنی خوب صورت بلا میں نے پہلی دفعہ دیکھی ہے جو سریلے انداز میں ڈانٹ پلاتی ہے۔"

ظاہر ہے میری باتیں اس کے پلے نہیں پڑی تھیں' کیوں کہ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ "اپنے کمرے میں واپس جاؤ۔"

"ابے یار' تم نے کیا صرف یہی جملہ رٹ لیا ہے۔" میں نے اس مرتبہ انگلش میں

کہا۔ "یا ریکارڈ کی سوئی اسی جملے پر اٹک گئی ہے۔"

وہ کوئی جواب دیے بغیر نپے تلے قدموں سے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے آئی اور میرے عین سامنے آ ٹھہری۔ وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔

میں نے اسے تاؤ دلانے کو مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہاری آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں؟ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی کھسیانے لگو گی۔"

وہ کمبخت بھی شاید میری چال سمجھ گئی تھی کہ میں اسے غصہ دلانا چاہتا ہوں اس لیے میرے اس جملے پر بھی اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا' پھر اس نے مجھے ذہنی طور پر ایک اور دھچکا پہنچایا۔ اس نے اسٹین گن اچانک پیچھے کی طرف اچھال دی' اور سخت لہجے میں بولی۔ تمہیں بہت ناز ہے اپنی فائیٹنگ پر! میں ابھی تمہارے سارے کس بل نکالے دیتی ہوں۔ تم جیسے کل کے لونڈے تو میرا ایک تھپڑ بھی نہیں سہ سکتے۔" اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے اسکول کی سخت گیر ٹیچر کسی بچے کو ڈانٹ پلا رہی ہو۔

وہ آہستہ آہستہ میری کک کی رینج میں آ گئی تھی۔ میں غیر محسوس طریقے پر تھوڑا سا آگے سرکا اور ایک دم لات گھما دی۔ وہ اتنی پھرتی سے بیٹھی کہ میں ہکا بکا رہ گیا' پھر مجھے حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے جھپٹ کر میری ٹانگ پکڑ لی۔ وہ مجھے دھچکے پر دھچکے پہنچا رہی تھی۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں اش اش کر اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے میری ٹانگ کو زوردار جھٹکا دیا' مگر اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔ میں نے اس پوزیشن میں اچھل کے اس کے سینے پر دوسری ٹانگ سے زوردار وار دیا۔ اس کے ہونٹوں سے دبی دبی ایک کراہ نکلی اور میرا پاؤں آزاد ہو گیا۔ میں الٹی قلا بازی کھا کر دوبارہ اپنی جگہ جا کھڑا ہوا۔ حیرت تو مجھے اس بات پر تھی کہ اتنی زوردار کک کھانے کے باوجود نہ صرف وہ اپنے پیروں پر کھڑی تھی' بلکہ دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ "بے بی' اگر ہڈی پسلی تڑوانے کا شوق ہے تو کسی بس کے نیچے آ جاؤ۔ مجھے کیوں گناہگار کرتی ہو۔ ویسے بھی میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا' بس کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔ میں اب خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی ٹھیک ٹھاک فائٹر لگ رہی تھی مجھے۔

"میڈم! وقت مت ضائع کریں۔" اس کے پیچھے کھڑا ہوا ایک گارڈ بولا۔ "یہ آپ کو باتوں میں الجھا کر نکلنا چاہتا ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں یہی آپ کے بھائی کا قاتل ہے۔"

گارڈ کے ان الفاظ میں نہ جانے کون سا سحر تھا۔ وہ اچانک غضب ناک ہو گئی۔ اس

کی آنکھیں گویا شعلے برسانے لگیں۔ مجھے ان میں دیوانگی کی جھلک محسوس ہوئی۔ اس نے اچانک ایک چیخ ماری' اور گویا اڑتی ہوئی مجھ پہ آ پڑی۔

"اسے زندہ پکڑنا ہے میڈم! باس اس سے پوچھ گچھ کرے گا کہ پیٹر کی لاش کہاں ہے؟" گارڈ نے کہا۔

میں ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھا کہ وہ اچانک مجھ پر حملہ کر بیٹھے گی۔ اس کے دھکے سے میں فرش پہ گر پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھ میری گردن پر جمائے' اور ان کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ "ظالم' درندے! کیوں مارا تو نے میرے بھائی کو! کیا بگاڑا تھا اس نے تیرا؟"

اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ مجھے اپنی موت نظر آنے لگی' آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے ناچنے لگے۔ میں نے بہ مشکل آنکھیں کھول کے اسے دیکھا' وہ پاگلوں کی طرح مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ "نہیں چھوڑوں گی اپنے بھائی کے قاتل کو! نہیں چھوڑوں گی--- نہیں چھوڑں گی۔" وہ ہاتھوں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہنا چاہا کہ میں تو پیٹر کو جانتا تک نہیں' مگر میری آواز حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میری آنکھیں حلقوں سے نکل جائیں گی۔

"میڈم!" پیچھے سے کوئی گارڈ چیخا۔ "اسے زندہ پکڑنا ہے۔"

گارڈ کی آواز پر ایک لمحے کو اس کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی۔ نتیجے کے طور پر اس کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی۔ میں اب تک اسے عورت ہونے کے ناتے رعایت بھی دے رہا تھا' مگر جب اپنی جان پر آ بنے تو کیسی رعایت' اور کہاں کی رعایت! اسی لمحے مجھے موقع مل گیا' میرا بایاں ہاتھ آزاد تھا۔ اسی ہاتھ سے میں نے اس کی پسلیوں پر پوری قوت سے ضرب لگائی۔ میں پوری طرح وار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے ضرب کاری نہ لگ سکی۔ اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی گرفت کچھ اور کم زور پڑ گئی۔ میں نے دونوں گھٹنے سمیٹے اور اسے پیچھے کی جانب اچھالنے کی کوشش کی مگر وہ اچھل کر دائیں طرف ہو گئی۔ یوں میرا دوسرا ہاتھ بھی آزاد ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائیاں تھام لیں' اور انہیں اتنی زور سے دبایا کہ اس نے بلبلا کر میری گردن چھوڑ دی۔ میں نے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان کہا۔ "اب شرافت سے کھڑی ہو جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری یہ خوب صورت کلائیاں توڑ کے تمہیں زندگی بھر کے لیے معذور کر دوں۔"

اس پر ایک مرتبہ پھر جنون طاری ہو گیا۔ وہ ہاتھ چھڑانے کو بری طرح مچلی مگر اب وہ میری آہنی گرفت میں تھی' اور شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ مزید زور لگائے گی تو اس کی کلائیاں ٹوٹ جائیں گی۔

"بس کرو مسٹر خرم!" کوئی بھاری آواز میں بولا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم اس لڑکی

کے ہاتھوں مارے جاؤ۔" میرے سر پہ ادھیڑ عمر کا ایک ایرانی کھڑا تھا۔ "خاموشی سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اس کے ہاتھ میں جرمن لیوگر تھا۔ پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ "مس ریکا اب ہم اس سے نمٹ لیں گے۔"

میں نے لڑکی کی کلائیاں چھوڑ دیں اور خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

"اب ہیرو مت بنا ورنہ نقصان میں رہو گے۔" ایرانی نے مجھے تنبیہہ کی۔

"آخر تم لوگ ہو کون؟" میں جھنجلا کر بولا۔ "اور میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

"اگر تم نے ہمارے کہنے پر عمل کیا تو دوست ہیں ورنہ اپنا بدترین دشمن سمجھو۔" اس نے ریوالور کو جنبش دے کر کہا۔

"پہلے مجھے یہ تو معلوم ہو کہ تم لوگ کون ہو؟ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اب اپنے کمرے میں چلو۔ آج شام کو باس یہاں پہنچ رہا ہے کام تمہیں وہی بتائے گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ باس کے آنے تک تم مجھے قیدی بنا کر رکھو گے؟"

"تم ہمارے مہمان ہو۔ یہاں تمہیں کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں ہو گی۔ بس یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔ یوں بھی باہر تمہارے لیے خطرہ ہے۔ تم غیر قانونی طور پر ایران میں داخل ہوئے ہو۔ ایرانی پولیس تمہیں کسی بھی لمحے پکڑ سکتی ہے۔"

میں نے کندھے اچکائے اور زینے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ایرانی بھی میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

اچانک اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "ایک بات یاد رکھنا مسٹر خرم! اگر اب تم نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو یہ گارڈ تمہیں گولی مار دیں گے۔ جب کوئی شخص ہمارے لیے بیکار ہو جاتا ہے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے۔"

"کیا بات ہے تمہاری مہمان نوازی کی!" میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ "بہ قول تمہارے میں تمہارا معزز مہمان ہوں۔ معزز مہمانوں کو گولی مارنے کی دھمکی دی جاتی ہے؟"

"دیکھو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ جو چیز ہمارے لیے بیکار ہو ہم اسے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتے ہیں۔"

"مگر سوال تو یہ ہے کہ تمہارے لیے کار آمد ہی کب تھا جو اب بیکار ہو گیا ہوں۔" میں پھر جھنجلایا۔

"تم ہمارے لیے کار آمد ہو' دوستانہ فضا میں بات کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔" یہ کہہ کر وہ زینے کی جانب پلٹ گیا۔

میں نے بھی اپنا دماغ کھپانا فضول سمجھا کہ آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔ میں

صوفے پر اطمینان سے پھیل کر بیٹھ گیا۔

اچانک رضوانہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر میں ایک دم بھنا گیا۔ اسی نے تو مجھے اس گورکھ دھندے میں پھنسایا تھا۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اگر تم اپنی منحوس شکل یہاں سے لے جاؤ تو مجھ پر احسان ہو گا۔“

”مجھ سے بدگمان کیوں ہوتے ہو۔“ وہ تنک کر بولی۔

”تو پھر آپ ایسی بات بتا دیجئے کہ آپ سے خوش گمان ہوا جائے۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”ایسی بات بتاؤں گی تو تم بھی اچھل پڑو گے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”مجھے فی الحال اچھل کود کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔ اب ذرا اپنا تھوبڑا دوسری طرف کر لو تاکہ مجھے ذہنی اذیت نہ ہو۔“

اس نے جھٹکے سے یوں منہ پھیرا جیسے کوئی تنک مزاج بیوی شوہر کی کسی بات کا برا مان گئی ہو۔

○

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

میں نہ جانے کب کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے سو گیا' آنکھ کھلی تو رضوانہ بیڈ پر لمبی تانے سو رہی تھی۔ وال کلاک پانچ بجا رہا تھا۔ میں نے باتھ روم جا کر گرم پانی سے شاور لیا تو ساری کسلمندی دور ہو گئی۔

باتھ روم سے نکلا تو دستک دے کر ایک گارڈ اندر آ گیا اور بولا۔ "باس یہاں پہنچ چکے ہیں' اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" بولنے والے کی زبان انگلش مگر لہجہ فارسی تھا۔

میں اس کے ہمراہ بلکہ اس کی اسٹین گن کے سائے میں سیکنڈ فلور پر پہنچا۔ وہ ایک وسیع و عریض ہال تھا' درمیان میں بیضوی میز تھی۔ میز کی چاروں طرف کرسیاں رکھی ہوئی تھیں' اور میز کے ایک سرے پر باوقار سا ایک ایرانی بیٹھا تھا۔ وہ نہ صرف خوب رو تھا' بلکہ بہت شاندار صحت کا مالک تھا۔ وہ میرے استقبال کے لیے کھڑا ہوا تو احساس ہوا کہ وہ خاصا دراز قد تھا۔

"خوش آمدید مسٹر خرم!" اس نے پرتپاک انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا' پھر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "پلیز مسٹر خرم! تشریف رکھیے۔" وہ بالکل اہل زبان کی طرح انگلش بول رہا تھا۔

میں اس کی گریس فل پرسنالٹی سے بہت متاثر ہوا' اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ "میرا نام شہریار مشہدی ہے۔" اس نے نہ جانے کون سا بٹن دبایا کہ ملازم چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ اس نے ملازم سے چائے لانے کو کہا۔ چائے آنے تک وہ مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

ہم چائے پی کر فارغ ہوئے تو وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "ہم تم سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں' وہ کام بہت بڑا ہے۔ یوں سمجھو اگر تم اس میں کامیاب ہوئے تو کروڑوں روپے کا فائدہ تو صرف تم ہی کو ہو گا۔" وہ خاموش ہو کر میرے چہرے کو بہ غور دیکھنے لگا۔" اگر تم کام کرنے پر راضی ہو تو پھر آگے بات کروں؟"

"مجھے کام کی نوعیت تو بتاؤ اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کروں گا کہ مجھے یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں؟" میں نے بھی اس کی طرح جواب دیا۔

"کام انتہائی خفیہ نوعیت کا ہے۔" اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بتا دیا تو پھر ہر صورت میں تمہیں وہ کام کرنا ہو گا۔"

"مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔" یہ بھی خوب ہے۔ گویا تم مجھے کام کی نوعیت بتائے بغیر ہی یہ وعدہ لینا چاہتے ہو کہ مجھے وہ کرنا ہو گا۔"

"یہاں یہی سمجھ لو۔"

"ایک بات میری بھی سن لو۔" میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ زبردستی مجھ سے کوئی کام لے لو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

"ہم ایسا ہی کریں گے۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "اگر تم نے انکار کیا تو۔۔"

"تو؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو تم اپنی بہن سے کبھی نہ مل سکو گے۔"

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اس سے کیا کہوں۔ پھر میں نے ہی خاموشی کو توڑا۔ "اس بات سے کیا مطلب ہے تمہارا! کیا تم جانتے ہو کہ شہلا کہاں ہے؟"

وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔ "جاننا کیا مطلب شہلا ہمارے ہی پاس ہے۔ وانگ یو نے ہمارے ہی ذریعے اسے تلاش کیا تھا۔"

میں بے تابانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ "کہاں ہے شہلا' میں۔۔۔"

"بے صبری مت دکھاؤ نرم!" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "تمہاری بہن ہر طرح سے آرام میں ہے' اور اگر تم نے ہمارا کام کر دیا تو تم اس سے ضرور ملو گے۔"

"میں تمہارا کام کروں گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "مگر میری ایک شرط ہے۔ میں پہلے شہلا سے ملنا چاہوں گا۔"

"کوئی شرط نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"میں کیسے یقین کر لوں کہ تم مجھ سے بلف نہیں کر رہے ہو؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"اس کی ایک صورت ہے۔" وہ پرخیال انداز میں بولا۔ شہلا سے ٹیلی فون پر تمہاری بات کرا دی جائے۔

"عجیب باتیں کرتے ہو۔ اتنے برسوں میں اس کی آواز کیا وہی رہی ہو گی؟"

"تم اسے شکل سے تو پہچان لو گے؟" شہریار نے پوچھا۔

"ہاں میں اب بھی اسے پہچان لوں گا۔" میں نے پریقین لہجے میں کہا۔

"گڈ!" اس نے میز پر ہاتھ مارا۔ "تو پھر مسئلہ ہی حل ہو گیا۔" ہمارے پاس ایک تقریب کی ویڈیو فلم موجود ہے۔ اس میں شہلا بھی ہے۔ اس میں نہ صرف تم اسے دیکھو گے

بلکہ اس کی آواز بھی سن سکو گے پھر ٹیلی فون پر بات کرنے میں بھی تمہیں آسانی رہے گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ اس تصور ہی سے میں مارے خوشی کے بے حال ہو گیا تھا کہ برسوں بعد شہلا کو دیکھوں گا۔ میں نے شہریار سے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ کیا کرنا ہے؟"

"پہلے تم ویڈیو فلم دیکھ لو۔" اس نے مردانہ لہجے میں کہا' اور میز کے پائے کے ساتھ لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی ایک ملازم وہاں آگیا۔ شہریار نے اس سے کہا۔ "وی سی آر اور ٹی وی سیٹ لے آؤ۔"

ملازم کے جانے کے بعد وہ خود بھی ہال کے ایک بغلی دروازے میں غائب ہو گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک ویڈیو کیسٹ لے آیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹی وی اسکرین پر کسی پارٹی کا منظر دکھائی دیا۔ پارٹی میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی' مگر کئی غیر ملکی چہرے بھی موجود تھے۔

"اب تم اپنی بہن کو پہچانو۔" شہریار نے کہا۔ "تم چاہو گے تو میں اس منظر کو اسٹیل کر دوں گا' بلکہ یہ ریموٹ تم اپنے ہی ہاتھ میں رکھو۔" اس نے ریموٹ مجھے دے دیا۔

میں ٹی وی اسکرین پر نظریں جما کر بیٹھ گیا اچانک ایک سین میں مجھے وانگ یو دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ چیکو بھی تھی وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ میری نظریں پارٹی میں موجود دوسری لڑکیوں کا جائزہ لینے لگیں۔ ابھی تک مجھے کوئی ایسا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا جس پہ شہلا کا شبہ ہوتا۔

فلم چلتی رہی وہ شاید کسی سالگرہ کی تقریب تھی کیوں کہ ہر آنے والا مہمان ایک نوجوان کو ہی برتھ ڈے کہہ رہا تھا۔ وہ نوجوان بھی پاکستانی ہی تھا۔ خاصا خوب رو اور اسمارٹ نوجوان تھا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا' مگر مجھے یاد نہ آسکا کہ میں نے اس نوجوان کو اس سے پہلے کبھی دیکھا ہے' پھر کیک کٹنے کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ میں بے دلی سے فلم دیکھ رہا تھا کہ ایک چہرہ دیکھ کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں اسے دیکھنے میں اتنا محو ہو گیا کہ ریموٹ کا بٹن دبانا بھی یاد نہیں رہا۔

وہ شہلا ہی تھی' بالکل وہی تھی۔ وہ ہوبہو امی کی تصویر تھی۔ انھی کی طرح دراز قد' گوری رنگت اور گھنے سیاہ بال! اس کی آنکھیں البتہ میری آنکھوں کی طرح براؤن تھیں۔

اچانک وہ کیمرے کی آنکھ سے اوجھل ہو گئی۔ میں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا خرم؟" شہریار میری بے تابی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"وہ--- وہ شہلا تھی--- خدا کی قسم وہ شہلا تھی۔" میں نے جوش میں اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"تم نے واقعی اسے پہچان لیا۔ وہ شہلا ہی تھی۔ شہریار مسکرا کر بولا۔
"فلم ریوائنڈ کرو۔" میں نے بے تابی سے کہا۔
"صبر مائی ڈیر صبر!" شہریار نے ریموٹ کنٹرول لے لیا۔ آگے بھی کیمرے نے اسے بہت کور کیا ہے۔" شہریار کیسٹ فارورڈ کرتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے ایک سین اسٹل کر دیا۔ وہ شہلا کا کلوز اپ تھا۔وہ مسکرا کر کسی طرف دیکھ رہی تھی' اور وہی مسکراہٹ اس وقت فریز ہو گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہو۔ میں اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شہریار نے پھر کیسٹ پلے کر دیا۔ فلم میں وانگ یو شہلا کے نزدیک آگیا۔ اچانک شہلا نے اس سے کہا۔ "مسٹر وانگ یو! کہاں ہے میرا بھائی؟ آپ نے تو کہا تھا کہ مجھے میرے بھائی سے ملوائیں گے۔"
شہریار نے کیسٹ ریوائنڈ کر کے وہ منظر مجھے دو مرتبہ دکھایا' اس کے بعد وی سی آر آف کر دیا۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ارے! تم رو رہے ہو؟"
اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ شدت جذبات سے میرے آنسو نکل آئے ہیں۔
"پلیز شہریار۔" میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے میری بہن سے ملوا دو' پھر تم مجھ سے آگ میں چھلانگ لگانے کو بھی کہو گے تو میں انکار نہیں کروں گا۔"
"میں تمہیں شہلا سے ضرور ملواؤں گا مگر کام ہونے کے بعد۔" وہ مسکرا کر بولا۔
"تو پھر مجھے کام بتاؤ میں آج ہی اسے کر ڈالوں۔"
"اتنی جلد بازی مت دکھاؤ۔" وہ کام اتنا آسان نہیں ہے کہ تم آج ہی اسے کر ڈالو۔ اس کے لیے ہم نے مہینوں پلاننگ کی ہے۔ اگر وانگ یو نہ مرتا تو شاید یہ کام وہی کرتا۔" پھر وہ ذرا توقف کر کے بولا۔ "آج رات میں کسی وقت شہلا سے تمہاری بات بھی کرا دوں گا۔ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ' کام تمہیں کل بتاؤں گا۔ امید ہے اب تم یہاں سے نکلنے کی کوشش نہیں کرو گے' گڈ لک۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔
میں وہاں سے نکل کر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دو گارڈ اب بھی سائے کی طرح میرے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں جن کا رخ میری طرف تھا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے گھوم کے اچانک ایک گارڈ کی گن پٹی پر ہاتھ مارا اور دوسرے کے پیٹ میں بھرپور لات رسید کی۔ لات کھانے والا سامنے کی دیوار سے ٹکرا کر فرش پہ گر گیا۔ دوسرا گارڈ بھی آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ پھر وہ بھی اوندھے منہ فرش پہ جا گرا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اپنے باس سے کہنا کہ اب بد اعتمادی چھوڑ دے۔ اگر میں چاہوں تو کسی بھی وقت یہاں سے نکل سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں کمرے میں آگیا۔
رضوانہ صوفے پر نیم دراز کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے میگزین

رکھ دیا اور مسکرانے لگی۔

"دانت مت نکالو۔ تمہاری مسکراہٹ سے میرا خون جلنے لگتا ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے، میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔" رضوانہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کر باہر کی طرف چل دی۔

اس کے جانے کے بعد میں یکسوئی سے اب تک کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ شہلا واقعی مل گئی ہے، مگر میں اپنی آنکھوں سے اسے چلتے پھرتے، اور بات چیت کرتے دیکھ چکا تھا۔ کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ لوگ رات کو اس سے میری گفتگو بھی کرانے والے تھے۔ مجھے رات ہونے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ مجھے یہ بھی تجسس تھا کہ وہ لوگ مجھ سے ایسا کون سا کام لینا چاہتے ہیں جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ میں کافی دیر تک اس بات پر غور کرتا رہا، مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تھک ہار کے میں نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

پھر واقعی مجھے نیند آ گئی۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک سوتا رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو رضوانہ میرے سر پہ کھڑی تھی۔ شاید اسی کی آواز سے آنکھ کھلی تھی۔

میں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"آٹھ بج رہے ہیں شام کے۔" اس نے میرے لہجے کی پروا کیے بغیر کہا۔ "اب اٹھ جاؤ ورنہ پھر رات کو نیند نہیں آئے گی۔"

میں اسے کوئی سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ ایک ملازم نے آ کر بتایا، باس نے آپ کو ہال کمرے میں بلایا ہے۔

میں نے باتھ روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور تولیہ سے چہرے خشک کرتا ہوا باہر آ گیا۔

میں ہال میں پہنچا تو رضوانہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ شہریار مشہدی کے ساتھ وہاں دو اجنبی بھی موجود تھے۔ ان دونوں کا تعلق شاید امریکہ سے تھا۔ اس کا اندازہ مجھے ان کی گفتگو سے ہوا۔

"آؤ خرم ان سے ملو۔" شہریار ان سے گفتگو کرتے کرتے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ بلی ہے اور وہ برڈ۔" اس نے باری باری دونوں کا تعارف کرایا۔ "یہ دونوں ہمارے امریکی دوست ہیں۔ اور یہ خرم ہے۔" شہریار نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے باری باری ان دونوں سے مصافحہ کیا۔ وہ دونوں ہی شکل سے چھٹے ہوئے معاش لگ رہے تھے۔ ان کے چہرے سخت اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ ڈیبی دبلا

پتلا دراز قد شخص تھا۔ برڈ کا جسم کسی ارنے بھینسے کی طرح مضبوط تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بھی مجھے بہت مضبوط لگ رہے تھے۔ اس کا قد اتنا لمبا نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے اپنے سوا سب کو حقیر سمجھ رہا ہو۔ وہ شخص مجھے پہلی ہی نظر میں پسند نہیں آیا تھا۔

"برڈ اور ڈینی کو ہم نے خاص طور پہ ٹیکساس سے بلایا ہے۔ یہ دونوں ہی اپنے فن میں یکتا ہیں۔" شہریار نے کہا۔ "برڈ نہ صرف ایک ماہر پائلٹ ہے بلکہ اس کا نشانہ اتنا زبردست ہے کہ اندھیرے میں محض آواز پہ نشانہ لگا سکتا ہے۔"

میں نے دیکھا' برڈ کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کہہ رہا ہو'کیا سمجھے مسٹر خرم۔"

"ڈینی بھی اپنے فن میں ماہر ہے۔" شہریار نے بات جاری رکھی دنیا کا کیسا ہی زبردست تالا ہو ڈینی اسے چٹکی بجاتے کھول لیتا ہے۔"

"اگر یہ تالے کھول لیتا ہے یا وہ ماہر نشانے باز ہے تو میں کیا کروں؟" میں جھنجھلا کر بولا۔

"یہ ہمارے کام کے لوگ ہیں۔" شہریار کا موڈ خراب ہو گیا۔ "تم اپنا کام کر لو گے تو ڈینی کا کام شروع ہو گا۔ یہ دونوں بھی تمہارے ساتھ ہی ہوں گے۔"

"کیا تم کسی بینک ڈکیتی کا منصوبہ بنا رہے ہو؟" میں چونک کر بولا۔

"ہم اس قسم کے اچکے نہیں ہیں۔" شہریار نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ایک ملازم نے ریسیور اٹھایا' اور دوسری طرف کی بات سننے کے بعد شہریار کو بتایا کہ آپ کی کال ہے۔

شہریار نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا' اور فون پر بات کرنے لگا۔ میں اس دوران میں ڈینی اور برڈ کا جائزہ لیتا رہا۔ رضوانہ بھی وہاں موجود تھی' مگر اب تک اس نے گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔ برڈ اب ہوس ناک نظروں سے رضوانہ کو گھور رہا تھا۔

شہریار نے مجھ سے کہا۔ "خرم' بات کرو' تمہاری بہن بات کرے گی۔"

میں نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور پکڑا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہیلو شہلا۔ میں۔۔ خرم ہوں۔۔" دوسری طرف سے مجھے سسکیاں سنائی دیں۔ "شہلا' بات کرو میں تمہارا بھائی بول رہا ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بھا۔۔۔ بھائی جان۔۔۔ مجھے یقین۔۔۔ نہیں آرہا کہ۔۔۔ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر سسکنے لگی۔"

میرا دل بھی بھر آیا میں نے کہا۔ "شہلا' یقین کرو میں ہی تمہارا بدنصیب بھائی ہوں۔"

"بدنصیب تو میں ہوں بھائی جان!" شہلا نے روتے ہوئے کہا۔

"اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ابھی میں ایک بہت ضروری کام میں الجھا ہوا ہوں' اس سے فارغ ہوتے ہی تم سے ملوں گا۔"

شہریار نے ریسیور میرے ہاتھ سے لے لیا۔ "بس اتنا ہی کافی ہے۔ میرے خیال میں اب تمہیں یقین آگیا ہو گا کہ شہلا ہمارے قبضے میں ہے۔"

میں جواب میں کوئی سخت بات کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اوکے' مجھے یقین آگیا اب کام بتاؤ۔"

"میرے خیال میں اب تمہاری یہاں موجودگی ضروری نہیں ہے۔" وہ رضوانہ سے مخاطب ہوا۔ "تمہارا کام بس اتنا تھا کہ تم خرم کو یہاں تک پہنچا دو۔ تم چاہو تو پاکستان واپس جا سکتی ہو' شہریار نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"مگر اس کے لیے میرا ایران آنا ہی کیا ضروری تھا۔ یہ بات تو تم پاکستان میں بھی کر سکتے تھے۔" میں نے شہریار سے کہا۔

"ہاں کر سکتے تھے' مگر اس وقت تمہاری بہن ہمارے قبضے میں نہیں رہی تھی۔ تمہارے یہاں پہنچنے کے بعد وہ دوبارہ ہمارے ہاتھ لگی ہے۔

"باس' اس چڑیا کو پاکستان بھیجنے کی بجائے میرے حوالے کر دو۔" برڈ نے رضوانہ کو گھورتے ہوئے کہا' پھر اٹھ کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔

رضوانہ سہم کر کھڑی ہو گئی۔ شہریار نے بے پروائی سے کہا۔ "اوکے بے بی' تم ابھی یہیں رک جاؤ۔ برڈ تم سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔"

برڈ نے اچانک رضوانہ کی کلائی تھام لی' اور اسے اپنی طرف گھسیٹا۔ رضوانہ نے زناٹے کا تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔

ایک لمحے کو میں بھی سناٹے میں رہ گیا۔ مجھے رضوانہ سے یہ امید نہیں تھی۔ برڈ پہلے تو منہ کھولے اسے حیرت سے دیکھتا رہا' پھر اس نے رضوانہ کو اتنی غلیظ گالیاں دیں کہ میں بھی شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اس نے جواب میں رضوانہ کے چہرے پر بھرپور تھپڑ مارا اور آگے بڑھ کے اسے کندھے پر ڈال لیا۔ یہ دیکھ کر میری کھوپڑی گھوم گئی۔ میں ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا' اور برڈ کے راستے میں حائل ہو گیا۔ "لڑکی کو چھوڑ دو مسٹر برڈ۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ورنہ؟" اس نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"ورنہ میں یہ بھی خیال نہیں کروں گا کہ تم کتنے ماہر پائلٹ ہو یا تمہارا نشانہ بے خطا ہے۔"

برڈ نے بھنا کر شہریار کی طرف دیکھا۔ رضوانہ ابھی تک اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی ہاتھ پیر ہلا رہی تھی' اور اسے گالیاں دے رہی تھی۔

"خرم!" شہریار نے مجھے مخاطب کیا۔ "برڈ ہمارا مہمان ہے۔"
"ہو گا تمہارا مہمان۔" میں نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "مگر اس سے کہو کہ یہ لڑکی کو چھوڑ دے ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"
"برڈ نے اچانک رضوانہ کو چھوڑ دیا۔ وہ پھسل کر پہلو کے بل نیچے گری اور پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ برڈ نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو! میں جانتا ہوں تم کتنے پانی میں ہو۔"
اچانک ڈینی آگے بڑھا' اور برڈ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "برڈی' پلیز ہم یہاں کام کرنے آئے ہیں۔ آپس میں لڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ جب تک کام نہیں ہو جاتا' خرم ہماری ٹیم کا ایک فرد ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "مسٹر خرم آپ بھی غصہ تھوک دیں۔ برڈی کی طرف سے میں معذرت چاہتا ہوں۔"
میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ برڈ بھی جیسے ہوش میں آگیا۔
"چلو دونوں ہاتھ ملاؤ۔" ڈینی نے یوں کہا جیسے کوئی استاد دو لڑتے ہوئے شاگردوں میں صلح کراتا ہے۔ مجھے ڈینی کے اس انداز پر ہنسی آگئی مجھے ہنستا دیکھ کر برڈ بھی مسکرانے لگا۔ وہ اچانک آگے بڑھ کر میرے گلے لگ گیا۔ میں نے رضوانہ کو آنکھ کے اشارے سے کمرے سے جانے کو کہا۔ وہ پھرتی سے باہر نکل گئی۔
فضا ایک مرتبہ پھر خوش گوار ہوگئی۔ شہریار نے ملازم سے کافی منگوائی اور ہم سب کافی پینے لگے۔
"میرا خیال ہے اب تمہیں بتا ہی دیا جائے کہ ہم تم سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔" شہریار نے کافی کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ اب تم پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔"
"یار وہ کام تو مجھے کسی جاسوسی فلم کی کہانی لگ رہا ہے۔" میں نے بے زاری سے کہا۔ اب بتا بھی چکو۔"
"کروڑوں بلکہ اربوں روپے کا معاملہ ہے۔" شہریار سرگوشی میں بولا۔ "اگر ہمارا پلان بدقسمتی سے ناکام ہو گیا تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکے گا' شہریار نے ادھر ادھر دیکھا جیسے کسی نادیدہ وجود کو دیکھ رہا ہو۔ ہم میں سے کسی نے بھی اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اس میں سب سے اہم رول خرم کا ہے۔ اس لیے اس کے لیے خطرہ بھی زیادہ ہے۔"
"میں خطروں سے کبھی نہیں گھبرایا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے شہریار کی تمہید سے الجھن ہو رہی تھی۔
"تو پھر سنو!" شہریار کی آواز بالکل سرگوشی میں بدل گئی۔ "ہم شاہ ایران کا اربوں روپے کا خزانہ اڑانے کا پلان بنا رہے ہیں۔"

"شاہ ایران کا خزانہ؟" بڑ نے حیرت سے دہرایا۔ "مگر تم نے تو کہا تھا کہ ہم ایران کے کسی جاگیردار کا خزانہ لوٹیں گے۔"

"پہلے میری پوری بات سن لو۔" شہریار نے اسے ٹوک دیا۔

"نہیں مسٹر شہریار!" بڑ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں کم از کم اتنا طاقتور نہیں ہوں کہ حکومتوں سے ٹکر لیتا پھروں۔ تم کیا سمجھتے ہو! وہ خزانہ کسی کھلے میدان میں پڑا ہو گا ہم جائیں گے اور اسے لے آئیں گے۔"

"یہ معاملہ واقعی خطرناک ہے۔" ڈیبی نے کہا۔ "تم نے ایسی کوئی بات مجھے بھی نہیں بتائی تھی۔"

"تم لوگ پہلے پوری بات سن لو۔ اگر تمہیں منظور ہو تو یہ کام کرنا ورنہ میں کسی اور سے رابطہ قائم کر لوں گا‘ مگر ایک بات ذہن نشین کر لو۔" شہریار نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا "جب تک یہ کام نہیں ہو جاتا تم میرے مہمان رہو گے‘ میری اجازت کے بغیر یہاں سے جا نہیں سکو گے۔"

"اس میں‘ میں بھی شامل ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں شہریار نے سخت لہجے میں کہا۔ تمہیں تو ہر صورت میں یہ کام کرنا پڑے گا۔"

"اس لیے کہ میری بہن تمہارے قبضے میں ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ایک وجہ یہ بھی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ تمہارے سوا کوئی دوسرا یہ کام نہیں کر سکتا‘ ممکن ہے کہ کر بھی لے‘ مگر ایسا آدمی کروڑوں میں کوئی ایک ہو گا‘ اور میں اس کی تلاش میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ رہی ان دونوں کی بات تو چوبیس گھنٹے کے نوٹس پر مجھے ماہر پائلٹ بھی مل جائے گا‘ اور قفل شکن بھی۔"

"ارے یار‘ مجھ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ مجھ ایسے جمناسٹ بھی لاکھوں ہوں گے دنیا میں۔"

"مگر تم اپنی ایک صلاحیت کو بھول رہے ہو۔" شہریار نے کہا۔ "تم فضا میں تنی ہوئی رسی پر وزن اٹھا کے آسانی سے چل سکتے ہو۔ اور وہ فاصلہ دو چار فٹ کا نہیں بلکہ ساٹھ فٹ کا ہے۔ اب بولو تمہاری نظر میں کوئی ایسا آدمی ہے جو یہ کام کر سکے‘ اس کے علاوہ اور بھی کئی کام ہیں۔ تم لوہے کے گولوں پر دوڑ سکتے ہو‘ بہت اونچی جمپ لگا سکتے ہو‘ اور اس کے ساتھ ساتھ بہترین فائٹر بھی ہو اور۔۔۔"

"بس بس۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تم نے تو میری تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ ایران ہی میں بے شمار آدمی ایسے ہوں گے جو یہ سب کام کر سکتے ہوں گے۔"

"مگر کوئی ایک آدمی یہ سب کام نہیں کر سکتا ہو گا۔" ڈیبی نے توصیفی انداز میں کہا اور کچھ سوچ کر بولا۔ "تمہارا نشانہ کیسا ہے؟"

"برڈ سے کم نہیں ہو گا۔" میری بجائے شہریار نے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے' آگے بات کرو۔" میں نے کہا۔
"پہلے میں ان لوگوں سے بات کر لوں۔" اس نے برڈ اور ڈینی کی طرف اشارہ کیا۔
پھر ان لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "پھر کیا فیصلہ ہے تم لوگوں کا؟"
"اگر خرم تیار ہے تو ہم بھی تیار ہیں۔" ڈینی بولا۔
"اس خزانے پر سخت پہرہ ہے اور حفاظتی انتظامات بہت زبردست ہیں' مگر میں ان سب انتظامات کو ناکارہ کر سکتا ہوں' کیوں کہ میں شاہ کے اس محل کا سیکورٹی انچارج ہوں' کرنل شہریار مشہدی!" اس کی بات پر ہم تینوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ہنس کر بولا۔
"حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" اگر ہم نے وہ خزانہ لے لیا تو شاہ ایران غریب نہیں ہو جائے گا' ہاں ہماری بقیہ زندگی عیش و آرام سے گزرے گی۔"
"اس میں سے ہمیں کیا ملے گا؟" برڈ نے پوچھا۔
"یہ سوال تو تم نے بہت دیر سے کیا ہے۔" شہریار نے مسکرا کر کہا۔ "بہرحال میں اس خزانے میں سے پچاس پچاس لاکھ تم دونوں کو دوں گا' یہ رقم مقامی کرنسی میں نہیں بلکہ ڈالرز میں ہو گی۔ خرم کا حصہ ایک کروڑ ہو گا۔"
"اربوں ڈالر کے خزانے میں صرف پچاس لاکھ!" برڈ نے منہ بنا کر کہا۔
"تم پچاس لاکھ ڈالرز کو کم سمجھ رہے ہو۔ بے وقوف! تمہاری تو سات پشتیں بیٹھ کر کھائیں گی۔"
"ہمیں یہ بھی منظور ہے' تم پلان بتاؤ۔" ڈینی نے کہا۔ برڈ کے مقابلے میں وہ معاملہ فہم اور تجربہ کار معلوم ہوتا تھا۔
شہریار نے میری طرف دیکھا' پھر بولا "تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں اس پر؟"
"مجھے صرف اپنی بہن چاہیے تم اگر کچھ بھی نہ دو تو بھی میں یہ کام کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔
"گڈ! یہ ہوئی نا بات۔" شہریار نے خوش ہو کر کہا' پھر بولا۔ "اب غور سے سنو۔ شاہ کا وہ خزانہ یہاں نہیں بلکہ قم میں ہے۔ محل کے اندر اور باہر چپے چپے پر سیکیورٹی فورس کا پہرہ ہے۔ رات کو حفاظتی دیواروں کے جنگلے میں گیارہ سو وولٹ کا کرنٹ دوڑتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک نقشہ نکال کر میز پر پھیلایا' اور بولا۔ "یہ دیکھو یہ محل ہے جو کئی ہزار ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس حصے میں محل کے ملازمین اور ان کے بیوی بچے رہتے ہیں۔ یہاں سے محل کی اصل عمارت کا فاصلہ تقریباً" ساٹھ فٹ ہے۔ یہ جو ایک ٹاور نظر آ رہا ہے۔ اس پر قابو پانا مشکل نہیں ہے۔ یہاں سے محل تک خرم کو ایک رسے کے ذریعے جانا پڑے گا۔ یہ برڈ کو لے کر جائے گا اور وہاں جا کر حفاظتی کرنٹ آف کر دے گا۔

محل کی وسیع و عریض چھت جو رن وے کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے وہاں ایک چھوٹا جنگی طیارہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ چھت پر موجود دو محافظ ہوتے ہیں ان پر قابو پانا آسان ہو گا۔ کرنٹ آف ہوتے ہی میرے مزید آدمی رسی کی سیڑھی کے ذریعے محل کی چار دیواری عبور کر کے اندر داخل ہو جائیں گے' پھر دوسرے محافظوں پر قابو پانا ان کا کام ہو گا۔"

"ایک منٹ مسٹر شہریار۔" برڈ نے اسے ٹوک دیا۔ "خرم کو سینکڑوں فٹ کی بلندی پر اس رسے کے ذریعے جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیا ضرورت ہے؟" شہریار طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "اس لیے کہ وہاں تک جانے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ مین سوئچ پر جن لوگوں کا پہرہ ہے وہ شاہ کے خاص آدمی ہیں۔ خزانے کے گرد بھی ایسے ہی محافظوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ براہ راست شاہ کے محافظ دستے کے چیف عدنان البقائی کی کمانڈ میں ہیں۔ میں اگر انہیں وہاں سے ہٹانا بھی چاہوں گا تو وہ میرا حکم نہیں مانیں گے' اور خرم رسے کے ذریعے محل تک اس لیے جائے گا' کہ اس ٹاور سے لے کر محل تک کے درمیانی راستے میں درجنوں بلڈ ہاؤنڈز اور گرے ہاؤنڈز ایسے خونخوار کتے ہوتے ہیں رات میں۔ نہ صرف کتے بلکہ وہ سدھائے ہوئے چیتے بھی ہیں۔ اگر بدقسمتی سے خرم نیچے گرا تو اس کے بچنے کے چانسز بہت کم ہیں' گرنے سے بچ بھی گیا تو خونخوار کتے اور چیتے لمحوں میں اس کی تکا بوٹی کر دیں گے۔"

اس کی بات سن کر ایک لمحے کو مجھے بھی جھرجھری آ گئی۔ رسے پر چلنا گویا پل صراط پر چلنا تھا۔ ایک ذرا سی غلطی نہ صرف میری بلکہ برڈ کی جان بھی لے سکتی تھی۔ مجھے اچانک ایک خیال آیا اور میں نے شہریار سے پوچھا "ٹاور سے محل تک اس رسے کا کیا جواز ہے؟"

"کوئی جواز نہیں ہے" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "رسہ تو تم لوگوں کو باندھنا ہو گا رسے کے ایک سرے پر خاصا وزنی ہک لگایا گیا ہے۔ برڈ بھاری گولہ پھینکنے کا ماہر ہے اس کے لیے وہ وزنی ہک محل کی عمارت تک پھینکنا مسئلہ نہیں ہو گا۔"

"اور اگر محافظ ہوشیار ہو گئے تو؟" برڈ نے پوچھا۔

"محافظ اندرونی حصے میں ہوتے ہیں۔ ان کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو سکے گا۔" اس نے پھر نقشے کا سہارا لیا۔ "یہ دیکھو محل کی چار دیواری یہاں سے محافظوں کے کمرے بہت دور ہیں۔ وہ اطمینان سے اپنے کمروں میں بیٹھے رہتے ہیں' کیوں کہ ان کی نظروں میں آئے بغیر سیڑھیوں سے کوئی بھی اوپر نہیں آ سکتا۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کوئی ٹاور کی طرف اوپر نہیں آ سکتا ہے۔" وہ سانس لینے کو رکا' پھر بولا۔ "میرے آدمیوں کے آنے کے بعد تم لوگ نیچے آ جاؤ گے۔ مجھے ایک مرتبہ پھر خرم کی ضرورت پڑے گی۔ سونا اور نقد روپیہ تو دوسرے کمرے میں ہے' مگر نایاب اور بیش قیمت ہیرے ایک اسٹرانگ روم میں ہے۔ اسٹرانگ روم میں زبردست حفاظتی اقدامات کئے گئے ہیں۔ اس کا فرش' دیواریں'

چھت ہر چیز لوہے کی ہے ' اور نہ جانے اسے کہاں سے کرنٹ فراہم کیا گیا ہے۔ اس کا علم صرف عدنان البقائی کو ہے۔ کنسیلڈ وائرنگ ہے اس لیے باوجود کوشش کے میں اس حفاظتی انتظام کو ناکارہ نہیں کر سکتا' ناکارہ کر بھی دوں تو شاہی محل ہی میں کسی جگہ خطرے کا الارم بجنے لگے گا۔ اگر کوئی اسٹرانگ روم میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا' تو وہ اپنی جان سے تو جائے گا ہی' خطرے کا الارم بھی چیخ اٹھے گا۔"

"پھر تم نے کیا سوچا ہے؟" ڈینی نے پوچھا۔

"یہاں بھی ہم رسے سے کام لیں گے۔ خرم رسے کے ذریعے کمرے کے دوسرے سرے تک جائے گا' اور چھوٹا سا وہ سیف ٹرالی پر گھسیٹ لائے گا جس میں کروڑوں ڈالرز کے ہیرے ہیں۔"

"اتنا زبردست خزانہ ہے ' اور اتنے خوف ناک حفاظتی انتظامات ہیں۔ اس پر تم کہہ رہے ہو یہ خزاہ شاہ کے لیے معمولی ہے!" برڈ نے کہا۔

شہریار بے اختیار ہنس دیا۔ "تمہیں شاہ کی دولت کا اندازہ نہیں ہے کسی کو بھی نہیں ہو گا۔ یہ حفاظتی انتظامات خزانے سے زیادہ سرکاری دستاویزات اور فائلوں کے لیے ہیں۔ ان کے گرد اس سے کہیں زیادہ پہرہ ہے۔ میرے خیال میں تم لوگ مطمئن ہو گئے ہو گے!" پھر اسے کچھ خیال آیا اور ڈینی سے بولا۔ "تم ہمارے ساتھ چلو گے ہی' ممکن ہے وہاں بھی تمہاری ضرورت پڑ جائے' کیوں کہ ابھی تک میں نے اندر سے ان کمروں کا جائزہ نہیں لیا جہاں خزانہ رکھا گیا ہے' مگر تمہارا اصل کام اس سیف کو کھولنا ہے جو خرم اسٹرانگ روم سے لائے گا۔ وہ سیف دیکھنے میں بہت چھوٹا ہے مگر اس کی تیاری میں گن میٹل استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں تین قسم کے قفل ہیں۔ دو تالوں میں دو دو چابیاں استعمال ہوتی ہیں۔ تیسرا تالا نمبروں والا ہے۔"

"وہ تو خیر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" ڈینی نے بے نیازی سے کہا۔ "مگر خرم اکیلا اس سیف کو اٹھائے گا کیسے؟"

"یہ تو میں بتانا ہی بھول گیا تھا کہ جب خرم اس سیف تک پہنچ جائے گا تو اصل مسئلہ حل ہو جائے گا۔ سیف کے نزدیک ہی ایک سوئچ موجود ہے۔ اس سوئچ کو آف کر دینے سے نہ صرف الیکٹرک کرنٹ منقطع ہو جائے گا بلکہ الارم بھی نہیں بجے گا۔ وہ سوئچ احتیاطاً" لگایا گیا ہے تاکہ کوئی شخص سیف میں کچھ رکھ رہا ہو تو الیکٹرک کرنٹ سے محفوظ رہے ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اندر شاہی خاندان کا کوئی فرد یا خود شاہ موجود ہو' اور اس کا کوئی دشمن اسٹرانگ روم کا کرنٹ آن کر دے۔ سوئچ بند ہو گا تو باہر سے سوئچ کرنٹ آن نہ ہو سکے گا' مگر اس سوئچ تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔" یہ کہہ کر وہ سانس لینے کو رکا' پھر ذرا توقف کے بعد بولا "میں تم لوگوں کو محل کا ایک ایک نقشہ اور تمام تفصیلات

لکھ کر بھی دے دوں گا۔ تم لوگ آپس میں مشورہ کر لو ' اور ہر پہلو پر خوب غور کر لو۔ آپریشن اگلے ہفتے ہو گا۔"

"ایک منٹ مسٹر شہریار!" میں نے جلدی سے کہا مجھے لکڑی کے ،، گولوں کی ضرورت پڑے گی گولے حجم میں ٹینس کی گیند سے دوگنے ہونے چاہئیں ' اور مضبوط لکڑی کے ہوں میں اسٹرانگ روم میں رسی کی بجائے لکڑے کے دو گولے استعمال کروں گا۔"

"شہریار نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا' پھر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے خوشی سے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ونڈر فل! میں ابھی تک اس سلسلے میں خود بھی پریشان تھا۔ اسٹرانگ روم کی دیواریں سپاٹ ہیں۔ وہاں رسی کا ہک پھنسانے کی جگہ نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ وہیں پہنچ کر دیکھا جائے گا کہ ہک کہاں پھنسایا جائے' خرم نے میری یہ مشکل بھی حل کر دی۔"

"تم نے ایک بات پر غور نہیں کیا مسٹر شہریار!" برڈ نے کہا "ہمارے وہاں سے نکلتے ہی کوئی پولیس کو اطلاع دے گا اور آنا" فانا" پورے شہر کی ناکہ بندی ہو جائے گی۔ ہم اگر جان پر کھیل کر وہ خزانے لے بھی آئے تو ایک ہی گھنٹے میں چوہوں کی طرح پکڑے جائیں گے۔"

"اس کی بات پر شہریار یوں مسکرایا جیسے اس نے کوئی انتہائی احمقانہ بات کر دی ہو' پھر وہ ہنس کر بولا۔ "مسٹر برڈ' تم اس ہوائی جہاز کو بھول رہے ہو حالانکہ تم خود پائلٹ ہو ' اور تمہیں اسی مقصد کے لیے بلایا ہے میں نے۔ سارا خزانہ اسی جہاز میں جائے گا۔ اس میں ڈینی' خرم اور میرے علاوہ کوئی نہیں ہو گا۔ میرے بقیہ ساتھی قم ہی میں روپوش ہو جائیں گے ' اور ایک گھنٹے میں تو ہم نہ جانے کہاں پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے ائیرفورس کے جہاز ہمارا پیچھا کریں ' اور ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں اس وقت برڈ کی مہارت کام آئے گی۔"

"برڈ کی مہارت تو اس وقت کام آئے گی جب وہ خونخوار کتوں اور چیتوں سے بچ کر زندہ سلامت محل تک پہنچے گا۔" برڈ نے ہنس کر کہا۔

"خطرات تو ہر بڑے کام میں ہوتے ہیں۔" شہریار نے کہا۔ "جتنا بڑا خطرہ اتنا ہی بڑا فائدہ۔ ممکن ہے ہم سب مارے جائیں۔ کامیابی اور ناکامی کا تناسب ففٹی ففٹی ہے۔"

پھر ہم دیر تک منصوبے کی ہر بات پر بحث کرتے رہے۔ برڈ چاہتا تھا کہ میں ٹاور سے محل تک اکیلا ہی جاؤں گا' مگر شہریار کا استدلال تھا کہ خرم اکیلا ہی بالائی منزل کے آٹھ محافظوں سے نہیں نمٹ سکے گا۔ اس سلسلے میں ریکا کا نام بھی زیر غور آیا' مگر پھر شہریار نے اسے خود ہی مسترد کر دیا۔ ریکا بہترین فائٹر تو تھی' مگر اس کا نشانہ اتنا سچا نہیں تھا۔ برڈ بہترین فائٹر بھی تھا' اور نشانے باز بھی۔ ریکا ان دس افراد میں شامل تھی جنہیں بعد میں محل میں داخل ہونا تھا۔ ریکا وہی لڑکی تھی جو مجھے اپنے بھائی کا قاتل سمجھ رہی تھی۔

دوسرے دن شہریار نے لکڑی کے گولے منگوا دیئے تھے۔ وہ شیشم کے گولے تھے۔ میں نے تین دن تک مسلسل ان گولوں پر پریکٹس کی۔ اس کے ساتھ ہی شہریار نے بنگلے کے وسیع و عریض لان میں ایک رسہ لگوا دیا۔ میں دن میں کئی دفعہ برڈ کو پیٹھ پر اٹھا کر اس تنے ہوئے رسے پر چلتا تھا۔ برڈ خاصا وزنی نوجوان تھا۔ اسے پیٹھ پر لاد کر رسے پر چلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بیس پچیس فٹ کا وہ فاصلہ طے کرنے میں مجھے دانتوں پسینہ آ جاتا۔ میں نے اسے ہدایات دی تھیں کہ کسی بھی موقع پر نہ تو وہ حرکت کرے، اور کسی بھی قسم کی آواز نکالے ورنہ میں ڈس بیلنس ہو جاؤں گا' اور دونوں مارے جائیں گے۔ برڈ دم سادھے میری پیٹھ پر لدا رہتا۔ وہ خاصے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ پریکٹس کے دوران میں کئی مرتبہ غیر متوازن ہوا' مگر اس نے ہلکی سی آواز بھی نہ نکالی' نہ حرکت کی' وہ تو ایسے موقع پر اپنا سانس بھی روک لیتا تھا۔

پھر ہم لوگ بنگلے کی چھت پر چلے جاتے، اور گھنٹوں نشانہ بازی کی مشق کرتے۔ مجھے اعتراف ہے کہ برڈ کا نشانہ مجھ سے اچھا تھا۔ چھت پر ہی میں گولوں پر دوڑتا۔ اس موقع پر اکثر رضوانہ بھی موجود ہوتی۔ وہ لوگ مجھے گولوں پر دوڑتے دیکھ کر بہت حیران ہوتے۔ برڈ نے ایک دفعہ کوشش کی تھی تو اوندھے منہ گرا تھا۔

پہلے دن کے بعد اس نے رضوانہ کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا' شاید وہ یہ سمجھا تھا کہ رضوانہ کے ساتھ میرا جذباتی قسم کا تعلق ہے۔ وہ دل کا برا نہیں تھا۔ اب وہ مجھے بالکل برا نہیں لگتا تھا حالانکہ پہلے دن تو وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

اب شہریار مشہدی بھی مجھ پر اعتماد کرنے لگے، اور اس نے مجھے باہر گھومنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ میں نے ان دنوں جی بھر کے تہران کی سیر کی۔ یہ انقلاب سے پہلے کی بات ہے۔ جب وہاں نائٹ کلب عام تھے۔ میں یہ سوچ کر خوب تفریح کر رہا تھا کہ جانے میں زندہ بھی رہوں یا نہیں۔ ایسے ہر موقع پر برڈ میرے ساتھ ہوتا تھا۔

اس دن بھی ہم دونوں شام ڈھلے بنگلے سے نکلے۔ اسٹیرنگ برڈ کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے گاڑی کا رخ خیابان ولی عصر کی طرف موڑ دیا۔ وہاں ایک نائٹ کلب میں ترک رقاصہ کا خصوصی شو چل رہا تھا۔

میری طرح برڈ بھی دل کھول کر عیاشی کر رہا تھا' مگر میری اور اس کی عیاشی میں فرق تھا۔ میں صرف گھومنے پھرنے اور اچھے ہوٹلوں میں کھانے کو عیاشی سمجھتا تھا۔ وہ جی کھول کر شراب پیتا' کسی کیسینو میں جا کر ہزاروں روپے کی بازی لگاتا، اور واپسی کے وقت کوئی نہ کوئی ایرانی شعلہ جوالا اس کے پہلو میں ہوتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ نشے میں اتنا مدہوش ہوتا کہ اس کے کمرے تک میں ہی اسے پہنچاتا۔

ترک رقاصہ کا شو دیکھنے کے بعد برڈ نے ایک بار میں حلق تر کیا' پھر ہم چہار راہ حقوقی

سے گزرتے ہوئے ایک کیسینو کے آگے رک گئے۔ میں برڈ کے ساتھ ضرور ہوتا' مگر خود کبھی جوا کھیلنے کی خواہش نہیں ہوئی۔ اس دن نہ جانے برڈ کو کیا سوجھی' وہ اڑ گیا کہ میں بھی اپنی قسمت آزماؤں۔ اس کا دل رکھنے کو میں بھی ایک رولٹ ٹیبل پر کھڑا ہو گیا اب یہ اتفاق تھا یا میری قسمت زوروں پر تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے میں ایک خطیر رقم جیت گیا۔ برڈ ایک دوسری ٹیبل پر قسمت آزما رہا تھا۔ میں رقم سمیٹ کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ بری طرح ہار رہا تھا۔ میں نے اسے مزید رقم لگانے سے روک دیا۔ برڈ کے پہلو میں جو شخص کھڑا تھا اس نے اچانک مڑ کے مجھے دیکھا اور چونک اٹھا۔ اس کے چونکنے پر میں الجھ کر رہ گیا مجھے اس کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی مگر یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔ وہ شخص فوراً" ہی دوسری طرف متوجہ ہو گیا تھا مگر وقفے وقفے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

برڈ کسی قیمت پر وہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا میں نے زیادہ اصرار کیا تو وہ بھنا کر بولا۔ "خرم پلیز! اگر تم بور ہو رہے ہو تو واپس چلے جاؤ مجھے اپنا نقصان پورا کرنا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ شخص ٹہلتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ میں ایک مرتبہ پھر برڈ کو روکنے والا تھا کہ اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس کے پہلو میں نہایت خوب صورت لڑکی کھڑی تھی۔

وہ ہر بار برڈ کو پہلے سے زیادہ رقم لگانے پر اکسا رہی تھی۔ وہ لڑکی یقیناً کیسینو ہی کی ملازم تھی۔ اس قسم کی لڑکیاں ہر کیسینو میں ہوتی ہیں جو گاہکوں کی جیبیں خالی کراتی ہیں یہ بات برڈ بھی جانتا تھا' مگر جان بوجھ کے بے وقوف بن رہا تھا۔

ہم نے ابھی تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے برڈ سے کہا۔ "میں جا رہا ہوں تم ٹیکسی کے ذریعے آ جانا۔ یوں بھی واپسی میں تم اس قابل تو ہو گے نہیں کہ گاڑی خود ڈرائیو کر سکو۔"

برڈ نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے کان پر بیٹھی ہوئی مکھی اڑا رہا ہو' پھر اس نے گاڑی کی چابیاں میری طرف اچھال دیں۔ میں برڈ کو اس کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے' اور سیٹی بجاتا ہوا پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھا۔ ہماری گاڑی پارکنگ لاٹ کے دوسرے سرے پر تھی۔ میں مزید آگے بڑھا تو ایک بیوک کی آڑ سے تین آدمی اچھل کر میرے سامنے آ گئے۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ ان میں ایک وہی تھا جسے میں کیسینو کے اندر دیکھ چکا تھا ان تینوں میں ایک جاپانی کو دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا۔ گویا وانگ یو کے دشمن مجھے تلاش کرتے ہوئے تہران تک آ پہنچے تھے۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا' اور سخت لہجے میں بولا "کون ہو تم لوگ؟" میں نے یہ جملہ انگلش میں ادا کیا تھا۔

"بحث مباحثے کا وقت نہیں ہے مسٹر خرم!" کیسینو میں نظر آنے والے نے کہا "خاموشی سے ہمارے ساتھ چلے چلو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔ یہ ریوالور بے آواز چلتا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔"

تیسرے آدمی نے بڑھ کے اسی بیوک کا دروازہ کھول دیا جس کی اوٹ میں وہ چھپے ہوئے تھے۔ پھر وہ ریوالور لہرا کر بولا۔ "چلو گاڑی میں بیٹھو۔"

"آج تم لوگ مجھے مار ہی دو۔ میں روز روز کی اس بھاگ دوڑ سے تنگ آگیا ہوں۔" میں نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا' اور ہاتھ جیب سے باہر نکالنا چاہا۔

"یونہی کھڑے رہو۔" جاپانی غرا کر بولا۔

"عجیب مصیبت ہے" میں جھنجلانے کی اداکاری کرتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے آگے بڑھ گیا۔ "ایک آدمی کہتا ہے گاڑی میں بیٹھو' دوسرا کہتا ہے کہ یونہی کھڑے رہو۔ پہلے تم لوگ آپس میں فیصلہ کر لو کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

میرے اس طنز پہ جاپانی مشتعل ہو گیا' اور اس نے آگے بڑھ کے مجھے تھپڑ مارنا چاہا۔ میں تو چاہتا ہی یہ تھا۔ اسے وہ کوشش بہت مہنگی پڑی۔ وہ جونہی آگے بڑھا' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا' اور پھرتی سے ایڑھی پر گھوم گیا۔ اب وہ جاپانی میری گرفت میں مچل رہا تھا۔ میں نے اسے ڈھال بنا کر اس کے ساتھیوں سے کہا۔ "اب چلاؤ گولی۔ اگر یہ تمہاری گولی سے نہ مرا تو میں اس کی گردن مروڑ دوں گا' چلاؤ گولی۔"

وہ دونوں حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ جاپانی مسلسل اس کوشش میں تھا کہ میری گرفت سے آزاد ہو جائے مگر اس کا ایک ہاتھ ' اور گردن میں نے کچھ اس طرح جکڑی تھی کہ' اگر وہ زیادہ زور لگاتا تو اپنی گردن تڑوا بیٹھتا۔

اس جاپانی کے ساتھیوں میں سے اچانک ایک آدمی میری پشت کی طرف دیکھ کر چیخا۔ "نہیں نہیں گولی مت مارنا!"

میں نے ایک دم پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں میری گرفت کچھ ڈھیلی ہو گئی۔ جاپانی چکنی مچھلی کی طرح میری گرفت سے نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس آدمی نے میرے ساتھ بلف کیا تھا اور اس میں کامیاب بھی رہا تھا۔ میں نے اچانک جست لگائی ' اور ایک مرسڈیز کی چھت سے پھسلتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ فرش پر پہنچتے ہی میں چھپکلی کی طرح اسی مرسڈیز کے نیچے رینگ گیا۔ اب میں نے بھی ریوالور نکال لیا تھا۔ ان کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں مجھے سنائی دیں۔ وہ اسی طرف آئے تھے جہاں میں مرسڈیز کی چھت سے نیچے پھسلا تھا۔

مجھے ان کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک بولا "وہ غائب کہاں ہو گیا؟"

"چھلاوہ ہے کم بخت۔" یہ آواز جاپانی کی تھی۔ "غلطی میری ہی تھی۔ مجھے اس کے

نزدیک جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"لیکن وہ گیا کہاں؟" تیسری آواز سنائی دی۔ "ایسا کرتے ہیں' پارکنگ لاٹ کے دونوں راستوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ باہر تو یہیں سے نکلے گا۔"

وہ تینوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں گاڑیوں کے نیچے ہی نیچے رینگتا ہوا اپنی گاڑی تک پہنچا' اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔ اب میں کسی ایسے شخص کے انتظار میں تھا جو پارکنگ لاٹ سے اپنی گاڑی باہر نکالے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اسی کے ساتھ ساتھ میں بھی نکلوں گا کسی' اور کی موجودگی میں وہ مجھ پر فائر کرنے کی جرات نہیں کریں گے' پھر میں نے سوچا کہ گاڑی میں مکمل اندھیرا ہے۔ ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں یوں بھی ان کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ وہ مجھے پہنچانیں گے کیسے! یہ سوچ کر میں نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا' اور اسے زناٹے سے پارکنگ لاٹ کی طرف دوڑا۔ جب میں سڑک کا موڑ مڑ رہا تھا تو مجھے عقبی شیشے میں گہرے رنگ کی بیوک نظر آئی۔ وہ گولی کی سی رفتار سے میرے پیچھے آ رہی تھی۔ میں نے ایک دم پورا ایکسی لیٹر دبا دیا۔ گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے چہار راہ حقوقی کا ایک چکر لگایا' اور وہاں سے تخت جمشید کی طرف مڑ گیا۔ بیوک مسلسل میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ آگے ایک چوراہا تھا اور پریشانی کی بات یہ تھی سگنل کی لائٹ سرخ تھی۔ میں سگنل بھی توڑ دیتا' مگر آگے کئی گاڑیاں کھڑی تھیں اس لیے مجبوراً مجھے رکنا پڑا۔ بیوک بھی میرے عین پیچھے آ کر رکی' پھر دو ہلکے سے دھماکے ہوئے' اور میری گاڑی کے دونوں پچھلے ٹائر زمین سے لگ گئے۔ ان لوگوں نے فائر کر کے ٹائر ناکارہ کر دیئے تھے۔ میں نے زیر لب انہیں گالی دی' اور آؤ دیکھا نہ تاؤ' پھرتی سے دروازہ کھول کے باہر نکلا' اور آگے کھڑی ہوئی ایک سیڈان میں سوار ہو گیا۔ ڈرائیور نے چونک کر مجھے دیکھا تو میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "خاموشی سے چلتے رہو۔"

میں نے یہ جملہ انگریزی میں ادا کیا تھا۔ وہ میری بات سمجھا یا نہیں مگر ریوالور دیکھ کر یہ ضرور سمجھ گیا کہ اس کی جان خطرے میں ہے۔ عین اسی وقت سگنل کھل گیا۔ اس نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا میری گاڑی سے بیوک کا راستہ مسدود ہو گیا تھا اور وہ ریورس ہوئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی تھی بیوک ریورس بھی نہیں ہو سکتی تھی' کیوں کہ اس کے پیچھے بھی گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ میں دل ہی دل میں ان کی بے بسی پر ہنسنے لگا۔ چوراہے کے فوراً" بعد ایک سڑک دائیں طرف مڑ رہی تھی سیڈان جونہی اس طرف مڑی میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا' پھر میں اطمینان سے اتر گیا' اور ٹہلتا ہوا واپس اس طرف چل دیا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔

وہاں ٹریفک ابھی تک جام تھا۔ بیوک بھی ابھی تک وہیں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ لوگ

مجھے ایک گاڑی میں سوار ہوتے دیکھ چکے تھے ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ میں ان کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوں' پھر ٹریفک پولیس کے دو کانسٹیبل وہاں آ گئے انہوں نے دھکیل کے میری گاڑی کو سائیڈ پر لگایا۔ راستہ ملتے ہی بیوک گولی کی سی رفتار سے اس طرف روانہ ہو گئی جدھر میں گیا تھا۔

میں اطمینان سے ٹہلتا ہوا ایک ٹیکسی تک پہنچا اور اسے بنگلے کا پتا بتا کر پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا مجھے حیرت تھی کہ وہ لوگ میرے پیچھے تہران تک کیسے پہنچ گئے۔ ان سے آخری معرکے میں ایک جاپانی مارا گیا تھا۔ اسے بھی میں نے نہیں مارا تھا۔ یہی سوچتا ہوا میں بنگلے تک پہنچ گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے لباس تبدیل کیا' اور ملازم سے کھانا لانے کو کہا۔ بھوک کے مارے میرے پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ میں شہریار کو ان لوگوں کے بارے میں بتا دینا چاہتا تھا' مگر ملازم سے معلوم ہوا کہ وہ سو چکا ہے۔

کھانے کے بعد میں کمرے ہی میں ٹہلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم برڈ کو بھی اس کے کمرے میں چھوڑ گیا۔ حسب معمول وہ نشے میں دھت تھا۔ وہ اس وقت کوئی معقول بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس لیے میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

صبح ناشتے کے وقت ڈائننگ ٹیبل پر صرف میں' اور برڈ تھے۔ شہریار علی الصبح اٹھنے کا عادی تھا۔ ڈینی بھی جلدی اٹھتا تھا۔ اس لیے دونوں ہم سے پہلے ہی ناشتا کر لیتے تھے۔ اٹھتا تو میں بھی منہ اندھیرے تھا' مگر ناشتا برڈ کے ساتھ کرتا تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے مجھے ایک خیال آیا تو میں بری طرح چونک اٹھا۔ ان لوگوں نے برڈ کو بھی میرے ساتھ دیکھا تھا۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ برڈ کیسینو میں رہ گیا تھا۔ اگر انہوں نے ذہانت سے کام لیا ہو گا تو واپس جا کر برڈ کے نکلنے کا انتظار کیا ہو گا' اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے اطمینان سے یہ جگہ دیکھ گئے ہوں گے۔ برڈ سے تو کچھ پوچھنا ہی فضول تھا۔ تعاقب کا علم ہونا تو دور کی بات ہے' اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ وہ اپنے کمرے تک کیسے پہنچا۔ شہریار صبح کہیں نکل گیا تھا اس لیے اس سے بھی بات نہ ہو سکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ لوگ پوری تیاری سے بنگلے پر دھاوا بولیں گے' اور شہریار کے سارے انتظامات دھرے رہ جائیں گے' پھر میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے آیا۔ کیوں نہ میں ان لوگوں سے ایک سودا کر لوں! ان سے کہوں کہ میں دستاویزات اور مائیکرو فلمیں تمہارے حوالے کر دوں گا' مگر اس کے بدلے میں مجھے شہلا چاہیے۔ ان لوگوں کے پاس شہریار سے کہیں زیادہ وسائل بھی تھے' اور قوت بھی! یہ سودا ان کے لیے بہت سستا تھا۔ دو بین الاقوامی تنظیمیں تھیں' اور شہلا کا حصول ان کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں نے بہت دیر تک اس خیال پر غور کیا' آخر اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ فوری طور پر شہریار میری

طرف سے شبے میں مبتلا ہو جائے ممکن ہے اس صورت میں وہ شہلا کو کسی قسم کا نقصان پہنچا دیتا۔

دوپہر سے کچھ پہلے شہریار لوٹ آیا۔ ان دنوں وہ چھٹی پر تھا' اور دوسرے دن اس کی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ وہ بہت پرجوش دکھائی دے رہا تھا' آتے ہی بولا۔ "میں نے سارے انتظامات مکمل کر لیے ہیں کل میں قم جا کر ڈیوٹی جوائن کروں گا۔ پرسوں کا دن میں نے آپریشن کے لیے مقرر کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر چھوٹی سی ایک پریشانی ہے۔"

"کیسی پریشانی؟" شہریار کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"وانگ یو کی موت کے بعد کچھ لوگ میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ ......"

"میں جانتا ہوں۔" انہیں شبہ ہے کہ وانگ یو کی دستاویزات اور مائیکرو فلمیں تمہارے پاس ہیں۔"

"انہیں شبہ نہیں بلکہ یقین ہے حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔"

"اس بات کا یہ کون سا موقع ہے؟" شہریار جھنجلا گیا۔

"وہ لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے تہران پہنچ گئے ہیں۔ کل انہوں نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں انہوں نے میری گاڑی پر فائرنگ بھی کی تھی۔ گاڑی کے دو ٹائر ناکارہ ہو گئے' مگر میں کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"اچھا تو یہ معاملہ ہے۔" وہ پرخیال انداز میں بولا۔ "گاڑی مجھے مل چکی ہے میں خواہ مخواہ تمہاری اور برڈ کی طرف سے بدگمان ہو رہا تھا کہ تم لوگوں نے اس واقعے کی اطلاع مجھے کیوں نہیں دی۔"

"برڈ تو خیر اس وقت میرے ساتھ نہیں تھا اسے میں نے کیسینو میں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے صبح سے اب موقع ملا ہے تم سے بات کرنے کا!"

"ٹھیک ہے' تم فکر مت کرو وہ لوگ ایران میں تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ میں ان سب کو چیونٹی کی طرح مسل دوں گا ان کی موت ہی شاید انہیں ایران لائی ہے۔"

پھر میں اور برڈ حسب معمول رسے پہ چلنے کے لیے لان میں چلے گئے۔ رسے پہ چلتے ہوئے بھی میں انہی لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا اس لیے دو دفعہ گرتے گرتے بچا' پھر نشانے بازی اور دوسری مشقوں میں شام ہو گئی۔

ہم لوگ حسب معمول باہر جانے لگے تو شہریار نے احتیاط کے طور پر دوسری گاڑی میں مسلح محافظ بھی ساتھ کر دیئے۔ میں نے گذشتہ رات کا واقعہ برڈ کو بھی بتا دیا تھا اس لیے وہ بھی چوکنا تھا۔ اس شام برڈ نے شراب پینے سے بھی گریز کیا۔ برڈ ہوش و حواس میں اکیلا

ہی دس پر بھاری ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں نے ہمارا ٹھکانہ دیکھ لیا ہو گا اور اب ہماری گھات میں ہوں گے۔ آنے والے وقت کا خیال کر کے مجھے ہول آ رہا تھا۔ شہریار نے کہہ دیا تھا تم لوگ ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرو تو بے دھڑک فائر کر دینا۔ میں بعد میں پولیس سے بھی نمٹ لوں گا۔ برڈ کی طرف سے مجھے زیادہ خطرہ تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے وہ لوگ مجھے اغوا نہیں کر سکتے تھے۔ میرے اعصاب سخت کشیدہ تھے۔ اس دن کسی نائٹ کلب میں بھی میرا دل نہ لگا ' پھر چھوٹے سے ایک ریسٹورنٹ میں ہم نے کھانا کھایا ' اور برا حسب معمول کیسینو میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ تصادم کی صورت میں انہیں زبردست جانی نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ میں کشت و خون نہیں چاہتا تھا' اور برڈ ان لوگوں میں سے تھا جو بات بعد میں کرتے ہیں' گولی پہلے چلاتے ہیں۔ کل کے مقابلے میں وہ لوگ بھی بھرپور تیاری کے ساتھ آئیں گے۔ ممکن ہے ہم دونوں یا ہم میں سے کوئی ایک کام آ جائے۔

دو گھنٹے بعد ہم دونوں کیسینو سے باہر نکلے۔ شہریار کے گارڈز سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں برڈ کے ساتھ پارکنگ لاٹ میں پہنچا تو ہر دم مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ ابھی کسی گاڑی کی اوٹ سے وہ لوگ اچانک ہمارے سامنے آ جائیں گے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ آج ہم لوگوں کے استعمال میں کراؤن تھی۔

برڈ نے یونہی بلامقصد گاڑی کو مختلف سڑکوں پر دوڑایا مگر کوئی بھی گاڑی ہمارے تعاقب میں نہ تھی۔ تھک ہار کے اس نے بنگلے کا رخ کر لیا۔

بنگلے سے ایک بلاک پہلے چوراہے پر کسی الیکٹرک کمپنی کا ایک منی ٹرک سامنے آ گیا جس سے ہمارا راستہ مسدود ہو گیا۔ برڈ نے منی ٹرک کے ڈرائیور کو با آواز بلند گالیاں دیں مگر ٹرک ٹس سے مس نہ ہوا۔

برڈ بھنا کے نیچے اترا۔ میں بھی دروازہ کھول کر نیچے اترنے والا تھا کہ ایک ہورڈنگ کی اوٹ سے چار آدمی اچھل کر سامنے آ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے' برڈ نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکالا ' اور دو فائر اتنی پھرتی سے کیے کہ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ دو آدمی لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گئے۔ تیسرا بوکھلاہٹ میں ادھر بھاگ آیا جہاں ہمارے گارڈز کی گاڑی موجود تھی۔ مشین گن کے ایک برسٹ نے اسے بھی زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ چوتھا آدمی وہی کل والا جاپانی تھا۔ اس کی میں نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی' پھر وہ چھلاوے کی طرح نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔

"فائرنگ کی آواز دور دور تک سنی گئی ہو گی۔" برڈ نے کہا۔ "اس لیے فوراً یہاں سے چل دینا چاہیے۔"

ہم پھرتی سے اپنی گاڑی میں بیٹھے ' اور فوراً ہی بنگلے پر پہنچ گئے۔

شہریار اس وقت جاگ رہا تھا۔ میں اور برڈ دونوں سیدھے شہریار کے بیڈ روم میں پہنچ گئے۔ برڈ نے نمک مرچ لگا کے وہ واقعہ شہریار کو سنایا' پھر بولا۔ "میں نے ان تینوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا' صرف ایک جاپانی بچ نکلا۔"

میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ابھی برڈ یا شہریار کو ان لوگوں کی قوت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ برڈ ان کے تین آدمی قتل کر کے یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے' مگر میں جانتا تھا کہ اب وہ لوگ پوری قوت سے حملہ آور ہوں گے۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب فائرنگ کی تڑاتڑ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے پھرتی سے بستر چھوڑ دیا دو منٹ سے بھی کم وقت میں جینز' جیکٹ اور جوگرز چڑھا لیے۔ میں نے پینٹ کی دونوں جیبوں میں ایک ایک ریوالور ڈالا' فاضل میگزین ساتھ لیے' اور باہر نکلنے کو تیار ہو گیا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی' میں بری طرح اچھل پڑا اور پھرتی سے اپنا مشین پسٹل نکال لیا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو میں محتاط انداز میں دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کے میں تیزی سے اسی دروازے کے پٹ کی اوٹ میں ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے رضوانہ ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئی' اور بولی۔ "خرم! یہ .... یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"میں خود نہیں جانتا۔" میں نے کھلے ہوئے دروازے سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔

فائرنگ شدت اختیار کر گئی تھی اب باہر کوریڈور میں بھی بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بنگلے کے تمام محافظ کوریڈور میں سمٹ رہے ہوں' پھر کوریڈور میں تڑاتڑ گولیاں چلنے کی آواز آئی' کوئی اذیت ناک انداز میں چیخا اور اچانک امڑ سے میرے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ وہ برڈ تھا۔ اس کا دایاں شانہ خون میں تر تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالنا چاہا' اسی وقت دو کورین کمرے میں گھس آئے۔ ان میں سے ایک نے آتے ہی کک مار کے میرا مشین پسٹل دور اچھال دیا۔ دوسرے نے ریوالور کے دستے سے میری کھوپڑی پر وار کیا۔ میں برڈ کو سنبھالنے میں مصروف تھا اس لیے مار کھا گیا۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ آخری احساس مجھے یہ تھا کہ رضوانہ ہسٹریانی انداز میں چیخ رہی تھی' پھر میں گردوپیش سے بے خبر ہو گیا۔

○

مجھے ہوش آیا تو میرے اردگرد کوئی نہ تھا' ہلنے کی کوشش کی تو کسمسا کر رہ گیا' کیوں کہ مجھے بہت مضبوطی سے باندھا گیا تھا' حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی مگر آواز نہ نکل سکی۔ پیاس کے مارے میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔

اچانک دروازہ کھلا اور گول مٹول سا ایک پستہ قد جاپانی اندر آگیا' پھر اس کے پیچھے بلا اور رضوانہ کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ برڈ کا دایاں ہاتھ ابھی تک بے جان انداز میں جھول رہا تھا۔ رضوانہ بھی بری طرح سہمی ہوئی تھی۔

"مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" میں نے اس گول مٹول جاپانی سے پوچھا۔ اس کی شکل مجھے کچھ دیکھی بھالی لگ رہی تھی مگر یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔ میں نے اس سے جان بوجھ کر جاپانی میں بات نہیں کی تھی بلکہ وہ جملہ انگریزی میں ادا کیا تھا۔

وہ جیسے میری طرف متوجہ ہی نہیں تھا' پھر برڈ اور رضوانہ کے پیچھے مزید دو آدمی کمرے میں گھس آئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں' اور ان کا رخ برڈ کی طرف تھا۔ جاپانی نے انگلش میں برڈ سے کہا۔ "زیادہ ہیرو مت بننا ورنہ ....."

"ختم کرو یار۔" برڈ اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ ہلا کر بولا۔ اس کا ایک ہاتھ بری طرح زخمی تھا مگر چہرے سے تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ "اب جلدی سے بتا دو۔ تمہیں ہم سے کیا کام آ پڑا؟" برڈ کا لہجہ طنز آمیز تھا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" جاپانی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ "تم تو محض طفیلی ہو ورنہ کام تو دراصل ہمیں خرم سے ہے۔"

"یار' تو پھر ہمیں کیوں پکڑ لیا ہے۔" برڈ نے برا سا منہ بنایا۔ "تم جانو اور خرم جانے۔"

"تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے مسٹر!" جاپانی نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم خود بھی انہی مائیکرو فلموں اور کاغذات کے چکر میں ہو۔ اب یہ مت کہہ دینا کہ میرا کسی ملک کی خفیہ ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں۔"

"ہاں' نہیں ہے۔ نہ جانے تم کیا بک بک کر رہے ہو۔ کیسی مائیکرو فلمیں' کیسے کاغذات!" برڈ الجھ کر بولا۔

"ابھی سب کچھ یاد آ جائے گا۔" جاپانی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اے' مجھ سے بھی بات کر لو۔" میں نے جاپانی کو چھیڑا۔ "ایسی بھی کیا ناراضگی! اور میرے وہ جکڑ بند تو کھولو۔ مجھ سے سانس نہیں لیا جا رہا ہے۔"

جاپانی جھٹکے سے میری طرف گھوم گیا۔ "تمہارے ہاتھ پیر کھول دوں!" جاپانی نے پھر طنز کیا۔ "تاکہ تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو ٹھکانے لگا کر یہاں سے نکل جاؤ۔ اتنے بے وقوف سمجھتے ہو مجھے؟"

"سمجھتے ہو کیا مطلب؟" میں نے پھر اسے چڑایا' پھر میں سنجیدہ ہو کر بولا۔ "یار' مطلب کی بات کرو۔"

"مطلب کی بات۔ یہ ہے کہ مجھے وہ مائیکرو فلمیں اور کاغذات چاہئیں۔"

"بس اتنی سی بات!" میں نے ہنس کر کہا۔ "میرے ہاتھ کھولو گے تو دوں گا۔"

جاپانی آگے بڑھا اور اس نے اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ چٹاخ کی آواز کمرے سے باہر تک گئی ہو گی۔ میرا بایاں رخسار سنسنانے لگا۔ اس نے دانت پیس کر کہا۔ "حرام زادہ' بکواس کیے جا رہا ہے۔ پاگل سمجھتا ہے مجھے؟"

"اب میں کچھ بولوں گا ہی نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا ورنہ غصہ تو مجھے اتنا آیا تھا کہ اگر میرے ہاتھ کھلے ہوتے تو اس گول مٹول شخص کو فٹ بال کی طرح لڑھکاتا۔

"تو اتنا محب وطن ہے نہیں جتنا ظاہر کرتا ہے۔" جاپانی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"یہ وطن کہاں سے بیچ میں آیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

جاپانی نے آگے بڑھ کر پہلے سے زیادہ طاقت سے تھپڑ رسید کیا۔ میں تلملا کر رہ گیا۔ اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "اب کوئی احمقانہ بات کی تو الٹا لٹکا دوں گا۔ تو مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہ رہا ہے کہ تجھے ان فلموں اور کاغذات کی اہمیت کا علم نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تجھے کئی اسلامی ممالک سے اس سلسلے میں بڑی بڑی آفرز ہوئی ہوں گی۔ ان دستاویزات سے پورے اسلامی بلاک کا مفاد وابستہ ہے۔ سعودی عرب نے بھی تجھے بہت بڑی آفر کی ہو گی مگر ایران نے اس سے بھی بڑھ کر بولی لگائی ہو گی۔ تیری یہاں موجودگی ہی اس کا ثبوت ہے۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کیا دلچسپی ہے۔ کیا تمہیں بھی کسی اسلامی ملک نے بھیجا ہے؟"

"مجھے صرف پیسے سے دلچسپی ہے۔" جاپانی نے ہنس کر کہا۔

"گڈ!" میں نے خوشی کا مظاہرہ کیا۔ "ہم دونوں میں یہ ایک قدر مشترک ہے۔"

"مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ تمہاری ایران میں موجودگی بلامقصد نہیں ہو سکتی۔" پھر وہ میرے کان کے پاس منہ لا کر دھیمے لہجے میں بولا۔ "شاہ کی آفر کیا ہے؟" ممکن ہے' میں تمہیں اس سے زیادہ دلا دوں۔"

اس کی بات سن کر میں بے اختیار ہنسنے لگا اور یوں ظاہر کیا جیسے اس نے کوئی انتہائی احمقانہ بات کر دی ہو۔ برڈ اور رضوانہ بھی حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں کو یہ گفتگو نہیں سننا چاہیے۔ میں نے سوچا' اس جاپانی سے کہہ کر ان دونوں کو باہر بھجوا دوں' پھر مجھے جاپانی زبان کا خیال آیا۔ میں اس سے جاپانی زبان میں گفتگو کر سکتا تھا۔ یہ زبان نہ برڈ کے پلے پڑ سکتی تھی' نہ رضوانہ کے!

میں نے جاپانی زبان میں کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھیوں کو سودے بازی کا علم ہو۔ میں نے انہیں اس سے بہت کم رقم بتائی ہے جتنی شاہ نے مجھے آفر کی ہے۔"

جاپانی اچھل پڑا۔ "اوہ۔ تم میری زبان بھی جانتے ہو!"

"بہت اچھی طرح۔" میں نے ہنس کر جواب دیا' پھر اس سے بولا۔ "یار تم بھی عجیب آدمی ہو۔ اتنی دیر سے باتیں کر رہے ہو مگر اپنا نام بھی نہیں بتایا۔"

"چھوڑو نام جان کر کیا کرو گے۔ تم مجھے مسٹر ایکس' وائی زیڈ کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔"

"گڈ۔" میں نے خواہ مخواہ دانت نکالے۔ "پھر مسٹر آلو کیسا رہے گا۔"

"خبردار!" اردو میں دہاڑا۔ "بھرتا بنا دوں گا' اگر اب مذاق کیا۔"

اب اچھلنے کی میری باری تھی۔

مگر اس نے زیادہ دیر مجھے حیرت زدہ نہ ہونے دیا' اور جاپانی میں بولا۔ "مجھے بتاؤ کہ شاہ کی آفر کیا ہے؟"

"یار اس پوزیشن میں تو قیامت تک نہیں بتاؤں گا۔ ہاں' یہ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک تمہاری طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہو گی' میں تم پر یا تمہارے کسی آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا اور یہ کسی اچکے کا نہیں بلکہ میرا وعدہ ہے۔"

وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا' پھر ایک گن مین سے بولا "اسے کھول دو!" گن مین نے اسٹین گن شانے سے لٹکائی' اور آگے بڑھ کے مجھے کھولنے لگا۔ اسی دوران میں نے اس جاپانی سے کہا کہ میرے ساتھیوں کو یہاں سے کہیں منتقل کر دو تاکہ میں کھل کے گفتگو کر سکوں۔ میرے کہنے پر اس نے دوسرے گن مین سے کہا کہ ان دونوں کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔"

آزاد ہونے کے بعد میں نے چند مخصوص ایکسر سائز کر کے اپنا دوران خون بحال کیا۔ ایک ہی طرح پڑے پڑے جسم سن ہو کر رہ گیا تھا اور کمر بالکل اکڑ گئی تھی۔ چند منٹ بعد میں اس قابل ہو سکا کہ آرام سے کرسی پر بیٹھ جاؤں۔ میں اطمینان سے پیر پھیلا کر بیٹھا اور جاپانی سے کہا۔ "ہاں! اب پوچھو کیا پوچھنا ہے؟"

"میں صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ شاہ کی طرف سے تمہیں ان دستاویزات کی کیا آفر ہوئی ہے؟"

"یار' بتانے میں کوئی حرج نہیں مگر کہیں تم بے ہوش نہ ہو جاؤ سن کر مسٹر اوپازیٹو!"

"اب بتا بھی چکو یار۔" وہ جھنجھلا گیا۔

"شاہ کی طرف سے مجھے دس کروڑ ڈالر کی پیشکش ہوئی ہے۔"

"کیا؟" جاپانی مارے حیرت سے کھڑا ہو گیا۔ "تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے تم جیسے آدمی سے مذاق کرنے کی' دس کروڑ کا نام سن کے ہی جس کے جسم پر کپکپی طاری ہو جائے۔"

"شٹ اپ!" جاپانی نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ "یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے اس جھوٹ پر اعتبار کر لوں گا۔ میں اپنے ذرائع سے بھی اس کی تصدیق کروں گا۔"

"تصدیق تو خیر ہو ہی جائے گی۔ تم یہ تاؤ کہ اس سے زیادہ دلوا سکو گے مجھے؟"

"ممکن ہے دلوا ہی دوں۔" جاپانی نے پرخیال انداز میں کہا۔ "مگر تم اتنی رقم کا کرو گے کیا؟"

میں ایک مرتبہ پھر ہنسنے لگا۔ "واہ بھئی واہ! ابھی تم کہہ رہے تھے کہ مجھے پیسے سے دلچسپی ہے۔ اب خود ہی کہہ رہے ہو کہ اتنی رقم کا کیا کرو گے' پھر میں سرد لہجے میں بولا۔ "یہ فکر کرنا تمہارا کام نہیں ہے کہ میں اس رقم کا کیا کروں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ یہ سودا منظور ہے یا نہیں۔ اگر منظور نہ ہو تو مجھے جانے دو' اور خود بھی آرام کرو۔"

"سنو مسٹر خرم!" جاپانی نے درشت لہجے میں کہا۔ "ہم پہلے کوشش کرتے ہیں کہ کام خوش اسلوبی سے ہو جائے۔ اگر تم ہماری اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو ہم دوسرا طریقہ آزمائیں گے' اور وہ طریقہ خوش گوار نہیں ہے۔ یہ بھی طے ہے کہ میں تمہیں اتنی بڑی رقم نہیں دلا سکتا۔ اس آفر کی تصدیق ہو یا نہ ہو' ہمیں ہر حال وہ دستاویزات چاہئیں' اور تم انکار مت کرنا ورنہ ہم چھیننا بھی جانتے ہیں۔"

"ارے یار' اس قسم کی دھمکیاں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ جو کچھ کرنا چاہتے ہو' کر گزرو' خواہ مخواہ دھمکیاں مت دیا کرو۔" میں نے بیزاری ظاہر کی۔

"اسے دھمکی مت سمجھنا۔" جاپانی نے کہا' پھر اسٹین گن برادر سے مخاطب ہوا۔ "اسے پھر پہلے کی طرح باندھ کر ڈال دو۔"

"اوکے سر!" یہ کہہ کر گارڈ نے اسٹین گن شانے سے لٹکائی' اور میری طرف بڑھا۔

"ایک منٹ!" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "مسٹر او پازیٹو! میں نے کہا تھا کہ میں اس وقت تک تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا جب تک مجھ پر زیادتی نہیں ہو گی۔ یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے؟" جاپانی جھنجلا کر بولا۔ "میں تمہاری ٹوٹ پھوٹ کے حق میں نہیں ہوں' اور زندہ بھی رکھنا چاہتا ہوں۔ جب میں دیکھوں گا کہ تم میرے کام کے نہیں رہے تو گولی مار دوں گا۔ فی الحال میں تمہیں صبح تک سوچنے کی مہلت دے رہا ہوں۔ خوب اچھی طرح غور کر لو۔ صبح تک تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ چاہو تو اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ کر سکتے ہو۔ میں تم سب کو ایک ہی جگہ رکھوں گا۔ انہیں بھی سمجھا دینا کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ لوگ تو موقع پر ہی مارے جائیں گے۔" پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ "یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری فائٹنگ یا جمناسٹک سے مرعوب ہو گیا ہوں یا اس سے خوف زدہ ہوں۔ تم جیسے بیسیوں شاگرد میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ ہاں وانگ یو میری برابری کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں۔"

"اس کی بات سن کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آگیا کہ میں نے اس

جاپانی کو کہاں دیکھا تھا- میں نے وانگ یو کے پاس اس کی ایک تصویر دیکھی تھی- وہ واقعی وانگ یو کا ساتھی تھا اور جو کچھ کہہ رہا تھا سچ کہہ رہا تھا' پھر اس نے آواز دے کر دو مزید گارڈز کو طلب کیا' اور ان سے کہا کہ ان صاحب کو بہت احتیاط سے "مہمان خانے" میں لے جاؤ- اس نے مہمان خانے پر خاصا زور دیا-

"ان کے ساتھیوں کو بھی وہیں پہنچا دینا-" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا- "اوکے مسٹر خرم! اب کل صبح ملاقات ہو گی- کوشش کرنا کہ ہماری یہ ملاقات خوشگوار انداز میں ہو-" یہ کہہ کر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کے باہر نکل گیا-

اس کے گول مٹول جسم اور معصوم چہرے کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنا خوف ناک فائٹر ہو گا- اس کے متعلق خود وانگ یو نے مجھے بتایا تھا' وانگ یو خود بھی اس سے خوف زدہ تھا- اسے سامنے دیکھ کر میں خواہ مخواہ وہی احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا- اگر وہ اپنے متعلق نہ بتاتا تو شاید اب تک ہم لوگ ان سب پر قابو پا چکے ہوتے-

وہ گارڈز مجھے گن پوائنٹ پر ایک جگہ لے گئے- تہہ خانہ دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ اس جاپانی نے "مہمان خانے" پر اتنا زور کیوں دیا تھا- وہ لوگ مجھے تہہ خانے میں بند کر کے چلے گئے- ان کے جانے کے بعد میں نے تہہ خانے کا جائزہ لیا- وہ خاصا کشادہ اور ہوادار تہہ خانہ تھا- نہ جانے وہاں تازہ ہوا کہاں سے آ رہی تھی- گھٹن نام کو نہیں تھی-

تھوڑی دیر بعد تہہ خانے کے باہر قدموں کی ایک آہٹ ابھری' دوسرے ہی لمحے رضوانہ اور برڈ نظر آئے- ان لوگوں نے برڈ کی مرہم پٹی بھی کرا دی تھی- کل رات کے مقابلے میں اس وقت برڈ کے چہرے پر خاصی خوشحالی تھی- رضوانہ بھی رات کے مقابلے میں فریش لگ رہی تھی-

برڈ تیر کی طرح میری طرف آیا' اور بولا- "یار خرم! یہ آخر کون لوگ ہیں' ہم سے کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم سے نہیں' صرف مجھ سے-" میں نے جواب دیا- "اور اس جاپانی کی گفتگو تم پہلے ہی سن چکے ہو- اسی سے اندازہ لگا لو-"

"وہ تو مائیکرو فلمیں اور کاغذات کی بات کر رہا تھا- اس نے شاہ کا نام بھی لیا تھا-" پھر وہ الجھ کر بولا- "خرم! آخر تمہارے پاس کون سی ایسی چیز ہے جس کی حکومتوں کو طلب ہے؟ ایک تو حکومت کی سطح سے کم کوئی کام ہوتا ہی نہیں-" اس نے برا سا منہ بنایا- "یار یہ کیا چکر ہے؟"

"میرے پاس کچھ دستاویزات اور مائیکرو فلمیں ہیں-" میں نے جواب دیا- "یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ میں ان دستاویزات کا سودا کرنے ایران آیا ہوں-"

"پھر تم سودا کیوں نہیں کر لیتے؟" برڈ نے بیزاری سے کہا-

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا اس لیے میں نے آنکھیں موند لیں۔ رضوانہ جب سے تہہ خانے میں آئی تھی، بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

تھوڑی دیر بعد برڈ نے جھنجلا کر کہا۔ "یار، ہم اپنے بیڈ روم میں نہیں ہیں کہ تم نے باقاعدہ سونا شروع کر دیا۔ کیا زندگی بھر یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟"

"میں سو نہیں رہا ہوں۔" میں بگڑ کر بولا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے کیسے نکلا جائے۔"

رضوانہ دیوار سے ٹک کر سو چکی تھی یا پھر میری طرح وہ بھی آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ میں آنکھیں موند کر ایک مرتبہ پھر سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر نہ جانے مجھے کس وقت نیند آ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو چار افراد اسٹین گنیں تانے ہمارے سروں پر کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے شاید لاتیں مار کے ہمیں اٹھایا تھا۔ برڈ انہیں گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ ان میں سے ایک غرایا۔ "تم سب اوپر چلو۔"

ہم تینوں خاموشی سے اٹھ کر تہہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

گول مٹول جاپانی کمرے میں موجود تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "پہلے تم لوگ ناشتا کر لو، کاروباری گفتگو بعد میں۔"

"بہت نوازش آپ کی۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا، اور ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر گول مٹول جاپانی مجھ سے بولا۔ "ہاں خرم! پھر کیا فیصلہ کیا؟"

"میرا فیصلہ تو وہی ہے رات والا، یعنی میری طرف سے مکمل انکار!" میں نے کافی کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

میرے انکار پر وہ جاپانی ایک دم مشتعل ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردعمل ظاہر کرتا، میں نے اچانک گرم گرم کافی جاپانی پر اچھالی۔ میں نے اتنی احتیاط کی تھی کہ اس کا چہرہ بچ جائے۔ گرم گرم کافی اس کے دائیں شانے اور سینے پر پڑی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ سے زقند بھری اور میں جاپانی کو ساتھ لیتا ہوا کمرے کے دوسرے سرے پر جا کر ڈھیر ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جاپانی انتہائی خطرناک ہے۔ اسے ذرہ برابر موقع ملا تو وہ میری گردن توڑ دے گا۔ مگر جاپانی اتنا حیرت زدہ تھا کہ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے پیچھے سے اس کی گردن میں بایاں ہاتھ ڈال کے اسے جکڑ لیا اور ڈپٹ کر بولا۔ "اپنے کرائے کے بدمعاشوں سے کہو کہ اسٹین گنیں پھینک دیں ورنہ میں تمہارا جھٹکا کر دوں گا۔"

جاپانی نے مری مری آواز میں اپنے گارڈز کو حکم دیا۔ "اسٹین گنیں پھینک دو۔"

ان سب نے یکے بعد دیگرے اپنی اپنی گنیں پھینک دیں۔ جاپانی بڑبڑانے والے انداز

میں بولا۔ "یہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو اپنے حق میں۔"

میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا' اور برڈ کو گنیں اٹھانے کا اشارہ کیا۔ اس نے پھرتی سے گنیں سمیٹیں۔ ایک رضوانہ کو دی' ایک اپنے شانے سے لٹکا لی' اور ایک اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی۔ چوتھی گن اس نے خالی کر کے وہیں پھینک دی اور غرا کر بولا۔ "کیا ان سب کو ٹھنڈا کر دوں؟"

"کچھ دیر صبر کرو۔" میں نے کہا۔ "میں ذرا ان لوگوں سے کل کا حساب بیباق کر لوں' پھر ان سب کو ڈھیر کر دینا فی الحال خاموش رہو۔" پھر میں نے ان چاروں گارڈز کو مخاطب کیا۔ "دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

پھر میں نے برڈ کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کے باری باری سب کی کھوپڑیاں اسٹین گن کے دستے سے سہلا دیں۔ انہیں ڈھیر کرنے کے بعد برڈ نے' اور میں نے اس جاپانی کو باندھا' اس کے منہ میں بھی اچھی طرح کپڑا ٹھونس دیا' پھر میں نے محتاط انداز میں باہر کی طرف جھانکا۔ وہ چھوٹی سی ایک عمارت تھی۔ باہر بالکل سناٹا تھا مگر ممکن تھا' اس جاپانی کا کوئی اور ساتھی بھی وہاں موجود ہو' پھر مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ یہ عمارت شہر کے کس حصے میں ہے۔ بہرحال یہاں سے باہر تو نکلنا ہی تھا۔ میں نے برڈ کو پوری طرح ہوشیار رہنے کی تاکید کی' اور دروازہ کھول کر دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ باہر ایک طویل کوریڈور تھا جس میں آمنے سامنے تین تین کمرے تھے۔ جس کمرے میں ہم لوگ تھے وہ درمیانی کمرہ تھا۔ ایک کے علاوہ سب کمروں کے دروازے بند تھے۔ میں محتاط قدموں سے اس کمرے کی طرف بڑھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دیوار سے چپک کر میں نے اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی مگر اندر سناٹے کا راج تھا۔ میں غیر محسوس طریقے سے آگے کھسکا اور کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں دروازے کے آگے سے گزر کر عمارت کے مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ کار پورچ میں پرانی سی ایک سیڈان کھڑی تھی۔ خلاف توقع گیٹ پر بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے گاڑی میں جھانکا' مگر وہ بھی خالی تھی' گاڑی میں جھانک کر سیدھا ہو ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے خفیف سی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں بجلی کی سی تیزی سے پلٹا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دائیں شانے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ ایک جسیم غیر ملکی تھا۔ اس نے پیچھے سے میرے سر کو نشانہ بنانا چاہا تھا مگر بروقت پلٹنے سے میرے سر کی بجائے شانے پر ضرب لگی تھی۔ چند لمحے کو میرا دایاں ہاتھ بالکل بیکار ہو گیا۔ حملہ آور کے ہاتھ میں اعشاریہ چار پانچ کا خوف ناک ریوالور تھا۔ اسی کے دستے سے اس نے ضرب لگائی تھی۔ مجھے سنبھلنے میں چند لمحے لگے۔ میں نے اس کے منہ پر زوردار لات ماری کہ وہ گاڑی سے ٹکرا کر ڈھیر ہو گیا۔ یہ دیکھنے کا موقع نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مرگیا۔ میں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے پورچ کے ایک تاریک گوشے میں گھسیٹ لیا۔ اس نے شاید مجھے

کمرے سے باہر آتے دیکھ لیا تھا' اور جبھی سے میری تاک میں تھا۔ پھر میں نے محتاط انداز میں پوری عمارت کا جائزہ لیا۔ وہاں مزید کوئی آدمی نہیں تھا میرے دائیں شانے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کم بخت نے میرا شانہ توڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر اس کمرے میں پہنچا جہاں رضوانہ اور برڈ موجود تھے۔ میں نے برڈ کو اشارہ کیا کہ اس جاپانی کو اٹھا لو مگر اس نے انکار میں سر ہلا دیا' کیوں کہ اس کا بھی ایک ہاتھ زخمی تھا۔ پھر میں نے ہی اسے اپنے بائیں کندھے پر ڈالا اور ہم تینوں باہر نکل آئے۔

میں نے اسی سیڈان کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی چابی ہمارے پاس نہیں تھی اس لیے برڈ نے اگنیشن کے تار کھینچ کر اسے ڈائریکٹ کر دیا اور ہم لوگ اس عمارت سے باہر نکل آئے۔

پھر تقریباً" ایک گھنٹے تک مختلف سڑکوں پر چکرانے کے بعد میں صحیح راستے پہنچ سکا۔

ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو مشہدی بہت پریشانی کے عالم میں ٹہلتا نظر آیا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکا۔ وہ سب کچھ جان لینا چاہتا تھا مگر اس وقت نہ میں اسے تفصیل سنانے کے موڈ میں تھا' نہ برڈ! اس نے رضوانہ سے تفصیلی طور پر سارے واقعات سنے۔

اس دوران میں اور برڈ بیڈ روم میں چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہیں ایک ڈاکٹر نے برڈ کے زخم کا معائنہ کر کے اس کی ڈریسنگ کی۔ میرے شانے کا معائنہ کیا اور بتایا کہ خوش قسمتی سے آپ کی ہڈی محفوظ ہے۔ پھر وہ مجھے کچھ ٹیبلیٹس دے کر چلا گیا۔ صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی' مگر ہم لوگ رات بھر بے چین رہے تھے اس لیے لمبی تان کر جو سوئے تو دوسرے دن دوپہر کی خبر لائے۔

میری آنکھ کھلی تو برڈ تکیے کے سہارے بیڈ پر نیم دراز کافی پی رہا تھا۔ سامنے ہی کرسی پر مشہدی بیٹھا تھا۔ میں نے باتھ روم میں جا کر گرم پانی سے غسل کیا تو مجھے بہت آرام ملا۔

باتھ روم سے فارغ ہو کر واپس آیا تو ناشتا تیار تھا۔ مشہدی حسب سابق اسی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ناشتے میں شامل ہو گیا۔

جب میں ناشتے سے فارغ ہو گیا تو مشہدی نے کھنکار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور بولا۔ "خرم! مجھے بتاؤ کہ وہ لوگ تم سے کیا چاہتے تھے؟"

"تم جانتے تو ہو۔" میں نے جواب دیا۔ "کہ وانگ یو کے پاس کچھ دستاویزات اور مائیکرو فلمیں تھیں۔ اب ان لوگوں کو شبہ ہے کہ وہ دستاویزات میرے پاس ہیں۔"

"صرف شبہ ہے یا واقعی۔" مشہدی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اگر وہ چیزیں میرے قبضہ میں ہوتیں تو میں اب تک ان کا سودا کر چکا ہوتا۔" میں نے برہمی ظاہر کی۔ "یوں دربدر نہ پھرتا۔"

"دیکھو خرم!" مشہدی نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔ تم تنہا کچھ

بھی نہیں کر سکو گے' اور خواہ مخواہ اپنی جان سے جاؤ گے۔ اگر وہ چیزیں واقعی تمہارے قبضے میں ہیں یا تمہیں ان کے بارے میں علم ہے تو مجھ پر اعتماد کرسکتے ہو۔ ہم ایران یا سعودی عرب سے ان کا سودا کرلیں گے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ میرے پاس کچھ نہیں۔" میں بھنا گیا۔

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" برڈ نے پرخیال انداز میں کہا۔ "آخر ایران یا سعودی عرب کو ان چیزوں سے کیا دلچسپی ہے؟"

"کیا دلچسپی ہے؟" مشہدی نے کہا۔ "اگر وہ دستاویزات یا فلمیں اسرائیل' امریکہ یا سوویت یونین کے ہاتھ لگ گئیں تو پورے اسلامی بلاک کو نقصان پہنچے گا۔ اس میں پاکستان سمیت تمام اسلامی ممالک شامل ہیں۔ وانگ یو نے بہت محنت سے پاکستانی محکمہ خارجہ سے وہ راز حاصل کیے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ اس میں اسرائیل کی تباہی کا پلان بھی ہے اور فلسطین کی آزادی کا منصوبہ بھی! اگر وہ تمام راز غیر مسلم ممالک کے ہاتھ لگ گئے تو کم از کم پاکستان' ایران اور ترکی کی سیاسی موت واقع ہو جائے گی۔ سعودی عرب اس میں براہ راست شامل نہیں' مگر سب سے زیادہ اسی کو دلچسپی ہے۔ اگر وہ راز طشت ازبام ہو گئے تو سعودی عرب اور امریکہ کے سفارتی تعلقات بگڑ جائیں گے۔ یہی صورت ایران میں بھی ہو گی۔ اب تم سمجھے حکومتیں کیوں ان دستاویزات کے چکر میں ہیں۔"

مشہدی کی زبانی تفصیل سن کر مجھے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ آگیا۔ گو کہ میں محب وطن نہیں تھا اب تک میرے وقت کا بیشتر حصہ جرائم پیشہ افراد کی صحبت میں گزرا تھا مگر میرے اندر اب بھی ایک خود دار اور محب وطن پاکستانی زندہ تھا۔ میں ابھی اتنا بے حس اور بے ضمیر نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی عزت و وقار کا سودا کر دوں۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ چاہے اس مقصد کے لیے مجھے اپنی جان دینا پڑے یا شہلا کو ہمیشہ کے لیے کھونا پڑے۔ میں ان دستاویزات کا سودا نہیں کروں گا' کسی بھی قیمت پر نہیں!"

"کیا سوچ رہے ہو خرم؟" مشہدی بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کو کیسے یقین دلایا جائے کہ میرے پاس وہ دستاویزات نہیں ہیں کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔" میں نے ایک لمحہ توقف کیا' پھر کہا۔ "اس چکر میں ہم اپنا کام بھلا بیٹھے۔ تم دونوں تیار تو ہو؟"

"اس منصوبے کو فی الحال کچھ دن کے لیے ملتوی کر دو۔" برڈ نے کہا۔ "میں بھی زخمی ہوں اور خرم بھی پوری طرح چاق و چوبند نہیں ہے۔ تمہیں میرے زخم مندمل ہونے تک انتظار کرنا ہو گا۔" برڈ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔" مشہدی بڑبڑایا۔ "تمہارا زخم ایسا تو نہیں ہے کہ ......"

"نہیں۔" برڈ نے اس کی بات کاٹ دی۔ میں ایک ہاتھ سے کام نہیں کر سکتا۔ ایک ا

پہلے ہی میری ذمہ داری بہت زیادہ ہے' پھر زخمی حالت میں تو میرے لیے مزید خطرہ ہو گا' اور میں ابھی خود کشی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"برڈ ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "میرا دایاں ہاتھ پوری طرح حرکت نہیں کر رہا ہے۔ وہاں سارا کام بیلنس کا ہے۔ برڈ کا کام تو بعد میں شروع ہو گا۔ اگر میں ڈس بیلنس ہو گیا تو ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔"

"او کے۔" مشہدی نے طویل سانس لیا۔ "میں اس مہم کو چند دن کے لیے ملتوی کر دیتا ہوں' مگر اس دوران میں تم لوگ مکمل آرام کرو گے' میری اجازت کے بغیر کہیں باہر نہیں جاؤ گے۔ میں اب مزید رسک لینے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اس پابندی کو محسوس نہ کرنا۔ یہ محض تم لوگوں کی حفاظت کے لیے ہے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

برڈ نے برا سا منہ بنایا اور بولا۔ "یہ اسی حالت میں ہم سے کام لینا چاہتا ہے۔ ہمارے مرنے جینے سے اسے کوئی سروکار نہیں۔"

"ہم یہ کام پیسے کے لیے کر رہے ہیں نا!" میں نے جان بوجھ کر "ہم" کا لفظ استعمال کیا۔ "اور وہ پیسا دے رہا ہے۔ بس ہمارا اور اس کا یہی تعلق ہے' پیسے کا تعلق! ہم نہیں ہوں گے تو وہ یہی کام کسی اور سے لے لے گا۔ یہ بات ہم بھی جانتے ہیں اور مشہدی بھی! اس میں اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

برڈ نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا' بس خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ میں بھی بیڈ روم پر نیم دراز ہو گیا۔ میرے شانے میں ابھی تک درد تھا اور رہ رہ کے اس میں ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ نہ جانے اس مردود نے کتنی قوت سے وار کیا تھا۔ اگر میں بروقت نہ پلٹتا تو میری کھوپڑی پاش پاش ہو جاتی۔

ہم دونوں کچھ دیر تک یونہی بے مقصد گفتگو کرتے رہے پھر برڈ نے تجویز پیش کی کہ وقت گزاری کے لیے تاش ہی کھیل لیں۔ اس نے خود ہی کہا کہ رضوانہ کو بھی بلا لو!

تھوڑی دیر بعد رضوانہ بھی آ گئی۔ شام تک ہم تینوں تاش کھیلتے رہے' درمیان میں ہم لنچ کے لیے اٹھے تھے' پھر تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ سارا دن یونہی بے مقصد گزار کے رات کو میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔

دوسری صبح پھر وہی معمولات رہے۔ مشہدی نے دوسرے دن شام کو بتایا کہ "آپریشن" کے لیے ہم نے انیس تاریخ رکھی ہے۔ اس دن پندرہ تاریخ تھی۔ یعنی ہمارے پاس چار دن تھے۔

اگلے دن ہم نے دوبارہ پریکٹس شروع کر دی۔ میرے شانے کا درد بھی برائے نام تھا اور برڈ کا زخم بھی تیزی سے مندمل ہو رہا تھا۔ وہ بھی پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ میں نے سخت قسم کی مشقیں شروع کر دی تھیں۔ اسی دوران میں ڈینی مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

رات کو ہم نے ایک مرتبہ پھر آپریشن پر تفصیلی بحث کی' اور ہر طرح سے مطمئن ہو کر تیاریوں میں لگ گئے۔

دوسرا دن خاصا ہنگامہ خیز تھا اس دن ہم لوگ قم پہنچ کر ایک بنگلے میں ٹھہر گئے۔ آنے والے لمحوں کے تصور سے میرے اعصاب کشیدہ تھے۔ مجھے تو خیر اس قسم کی مہمات یا وارداتوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا' مگر برڈ ایسا دہشت گرد بھی ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ روانگی سے پہلے میں نے شہلا سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ شہریار نے پہلے تو انکار کر دیا' پھر میرا موڈ دیکھ کر بات کرانے پر آمادہ ہو گیا۔

میری آواز سنتے ہی شہلا رونے لگی' اور ہچکیوں کے درمیان بولی۔ "بھائی جان! آپ آخر مجھ سے ملتے کیوں نہیں۔ میں آپ کے پاس آ جاتی' مگر اس کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی ہوں۔"

"میں ایک ضروری کام نمٹا کر بہت جلد تم سے ملوں گا گڑیا!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں نا؟"

"بھائی جان' سب سے بڑی تکلیف تو یہی ہے کہ میں آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتی۔"

"تم پریشان مت ہو۔ بس میں پہنچنے ہی والا ہوں۔" میں نے شہلا کو تسلی دی۔ پھر میں اس سے مزید بات کرنے والا تھا کہ مشہدی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

○

آپریشن ڈائمنڈ اسٹار رات کے ٹھیک دو بجے شروع ہونے والا تھا۔ میں نے رات کو کھانا بھی بہت ہلکا پھلکا کھایا۔ مشہدی اور ڈینی شام سات ہی بجے سے روانہ ہو گئے تھے۔ مشہدی نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ مجھے اور برڈ کو کہاں پہنچنا ہے۔ اس موقع پر کسی بھی قسم کی گڑبڑ نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لیے اس نے ہماری حفاظت کا معقول بندوبست کر دیا۔ ہماری گاڑی کے آگے اور پیچھے مسلح محافظوں کی ایک ایک گاڑی تھی۔ ہم گھر سے ٹھیک بارہ بجے روانہ ہوئے تھے اور ساڑھے بارہ بجے محل کے اس تاریک حصے کی طرف پہنچ گئے تھے جہاں سے ہمیں اندر داخل ہونا تھا۔ مشہدی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے اور برڈ کو اس ٹاور کے نیچے پہنچا دیا' جہاں سے ہمیں کاروائی کا آغاز کرنا تھا۔ حیرت انگیز طور پر میرے ذہن سے ہر قسم کا بوجھ ہٹ گیا۔ اب میں ایکشن میں آنے کے لئے بے تاب تھا۔

اس ٹاور کے گرد تقریباً" تیرہ' چودہ فٹ بلند ایک باؤنڈری وال تھی۔ مجھے اور برڈ کو باؤنڈری وال عبور کرنے کے بعد ٹاور پر پہنچنا تھا۔ اس مقصد کے لئے شہریار مشہدی نے

مجھے لمبا سا ایک بانس بھی فراہم کر دیا تھا۔ اس بانس کے ذریعے میں ایک ہی زقند میں دیوا ر پر پہنچ گیا۔ میں نے اپنی کمر کے گرد باریک اور مضبوط ریشمی ڈوری لپیٹ رکھی تھی۔ میں نے وہ ڈوری نیچے لٹکا دی۔ اس کے ذریعے برڈ بھی اوپر پہنچ گیا۔ ہمارے اوپر پہنچنے کے بعد مشہدی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ہم دونوں بہت آسانی سے دوسری طرف کود گئے۔ میں نے وہاں ایک مرتبہ پھر اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ میرے پاس جدید قسم کی ایک برین گن اور ڈھائی سو کے قریب فاضل راؤنڈ تھے۔ ایسی ہی ایک برین گن برڈ کے پاس بھی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دونوں کے پاس ایک مشین پسٹل' ایک پوائنٹ تھری ایٹ کا کولٹ ریوالور' ایک ایک شکاری چاقو' گیس ماسک' اسٹیل کٹر بھی تھا۔ برڈ کے پاس دھوئیں کا ایک بم اور دو ہینڈ گرینیڈ بھی تھے۔ بنیادی چیز وہ مضبوط رسہ تھا جس کے ایک سرے پر خاصہ بھاری ہک لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں کا لباس بھی خصوصی قسم کا تھا۔ اسکنا ٹائٹ جینز' چمڑے کے جیکٹس اور کریپ سول کے لانگ بوٹس! ہم نے اپنی شرٹس کے نیچے بلٹ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی تھیں۔ میں اتنے زیادہ سازوسامان کے حق میں نہیں تھا۔ وہ چیزیں تنے ہوئے رسے پر چلنے میں رکاوٹ بھی بنتیں اور مجھے آزادانہ ہاتھ پیر چلانے میں بھی دشواری ہوتی مگر شہریار نہیں مانا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس سازوسامان اور برڈ سمیت میں نے رسے پر چلنے کی خاصی پریکٹس کی تھی۔ اس سے میری رفتار میں فرق پڑا تھا مگر میں با آسانی دوسرے سرے پر پہنچ جاتا تھا۔ گھر کے لان کو عبور کرنا کوئی کمال نہیں تھا۔ اصل کمال تو ٹاور سے عمارت تک پہنچنے کا تھا' اس صورت میں کہ ایک بھی غلطی کی گنجائش نہ ہو۔ میری پہلی غلطی ہی آخری ثابت ہوتی اور پھر کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ وہ خرم جو خود کو ناقابل تسخیر سمجھتا تھا' کتوں اور چیتوں کا رزق بن گیا۔ یہ سوچ کر ہی مجھے جھرجھری آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے وانگ یو کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی کہ تم کسی مہم پر جاؤ تو کبھی اس کے تاریک پہلوؤں کے متعلق مت سوچو' صرف اور صرف کامیابی پر نظر رکھو۔ میں نے ذہن سے ان منفی خیالات کو جھٹک دیا اور ٹاور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

○

برڈ اس دوران میں موٹے سے رسے کو ہر طرح سے آزما چکا تھا' اور اب وہ چلنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ میں نے ریڈیم ڈائل والی گھڑی پر نظر ڈالی اور سرگوشی میں برڈ سے کہا۔

"ابھی پانچ منٹ باقی ہیں۔"

"میں اتنی دیر میں ایک سگریٹ پی لوں؟" اس نے بھی سرگوشی کی۔

"نہیں۔" میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ "تم لاکھ احتیاط برتو' سگریٹ کے شعلے کو بالکل چھپا دو' مگر تمباکو کی بو پر قابو نہیں پا سکتے۔ بعض لوگوں کی سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اگر ٹاور پر پہنچتے ہوئے گارڈ نے بو محسوس کر لی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

ٹھیک پانچ منٹ بعد ہم نے ٹاور کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق آگے برڈ تھا' اور پیچھے میں۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں پوائنٹ تھری ایٹ کے ریوالور تھے' اور ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بہت آہستگی سے اوپر چڑھ رہے تھے۔ دور کہیں کتوں کے غرانے' اور بھونکنے کی خوف ناک آوازیں آ رہی تھیں۔ ٹاور کے اندرونی حصے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہم وہاں پنسل ٹارچ تک روشن کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئی تھیں۔ مجھے برڈ کا دھندلا دھندلا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ حرکات و سکنات سے وہ مجھے چیتے کی طرح چاق و چوبند اور محتاط لگ رہا تھا۔ جن لوگوں نے برڈ کو صرف نشے کی حالت میں دیکھا تھا وہ یقین ہی نہیں کر سکتے تھے کہ برڈ اتنا چاق و چوبند ہو سکتا ہے۔

ایک ایک کر کے ہم ٹاور کی ساری سیڑھیاں چڑھ گئے۔ اب صرف چند سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں۔ ٹاور کے بالائی حصے کی طرف سے بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ گارڈ شاید ٹہل رہا تھا۔ ہم دونوں بالکل دیوار سے چپک گئے' اور اپنا سانس تک روک لیا۔ تھوڑی دیر بعد جوتوں کی دھمک معدوم ہو گئی۔ گارڈ شاید اپنی جگہ پر بیٹھ چکا تھا۔ ہمارے پاس ابھی دو منٹ تھے۔ گھڑی دیکھ کر میں نے ایک منٹ تک انتظار کیا' پھر برڈ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ برڈ نے بہت غیر محسوس طریقے پر ایک ایک انچ سرک کر اپنی گردن تھوڑی سی اونچی کی۔ اسی وقت گارڈ اپنی بھونڈی آواز میں خانم گوگوش کا گایا ہوا ایک مقبول

گیت سنانے لگا۔ برڈ کے پیچھے میں سرکتا ہوا دو سیڑھیاں اوپر چڑھ گیا۔

اچانک گارڈ نے ہمیں دیکھ لیا۔ برڈ پیچھے کھسک گیا۔ گارڈ نے بلند آواز میں کچھ کہا' پھر شانے پر لگی ہوئی رائفل اتارنے لگا۔ اسی وقت برڈ کتے کی طرح بھونکنے لگا۔ گارڈ حیرت زدہ ہو کر چند قدم آگے آگیا۔ شاید وہ کتے کی آواز سن کر حیران ہوا تھا' پھر وہ مزید آگے آنے کی بجائے وہیں پر رک گیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں رائفل تھامی' اور دوسرے ہاتھ سے ایک طرف رکھا ہوا واکی ٹاکی اٹھا لیا۔ اب انتظار کا وقت نہیں تھا۔ میں نے وہیں سے چھلانگ لگائی' اور گارڈ کو لیتا ہوا دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ چھلانگ لگاتے وقت میں نے ایک ہاتھ اس کی رائفل پر مارا تھا' اور دوسرا واکی ٹاکی پر! وہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھوں سے نکل کر اندھیرے میں نہ جانے کہاں جا گری تھیں۔ پھر میں نے پلٹ کر بائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبا دیا۔ دائیں ہاتھ سے میں نے اس کی گردن جکڑ لی تھی۔ وہ بری طرح مچلنے لگا' خاصا طاقت ور آدمی تھا' اور میری گرفت سے نکلنے کے لئے پوری قوت لگا رہا تھا۔ میں اسے بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔ اس بیچارے سے میری کیا دشمنی تھی کہ میں اس کی جان لیتا' مگر برڈ نے کچھ کہنے سے پہلے ہی سائلنسر والے ریوالور سے اس کے سینے پر فائر کر دیا۔ گارڈ بری طرح تڑپا' اور ساکت ہو گیا۔ نہ جانے کیوں اس کی موت پر مجھے افسوس ہوا۔ وہ بیچارہ ابھی نوجوان تھا۔ وہ بھی کسی بہن کا بھائی ہوگا۔ اس کی بہن بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی' مگر اب وہ محض ایک لاش تھا' سرد اور بے جان لاش!

گارڈ کی لاش ایک طرف ڈال کر برڈ نے پھر گھڑی دیکھی' اور ساتھ لائے ہوئے رسے کے بل نکالنے لگا' پھر اس نے مجھے ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کیا' اور ہک کو عمودی دائرے میں تیزی سے گردش دینے لگا' پھر اس نے پوری قوت سے رسہ سامنے والی بلڈنگ کی طرف اچھال دیا۔ میں کشیدا اعصاب کے ساتھ ہک کو بلڈنگ کی طرف اڑتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اگر بدقسمتی سے ہک اس بلڈنگ تک نہ پہنچ پاتا تو نہ جانے کیا صورت پیش آتی۔ ہک سیدھا اس بلڈنگ پر جا کر گرا۔ برڈ نے پھرتی سے رسہ کھینچا تو ہک وہیں کہیں اٹک گیا۔ پھر ہم دونوں نے پوری قوت سے رسے کو کھینچا اور اسے پوری طرح تان کے ٹاور کے ایک ستون سے باندھ دیا۔

اب اس آپریشن کا خطرناک ترین مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنی کامیابی کی دعا مانگی' اور رسے پر چلنے کو تیار ہو گیا۔

میں ٹاور کی قد آدم دیوار پر چڑھا اور آخری بار رسے کی مضبوطی آزمانے کے بعد برڈ کو بھی اوپر چڑھنے کا اشارہ کیا۔ سخت سردی کے باوجود برڈ کا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے چہرے پر سرسراہٹ ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں خود بھی پسینے میں تر ہوں۔ یہ صورت حال خوشگوار نہیں تھی۔ اعصاب کی کشیدگی کو کم کرنے کے لئے میں نے شہلا کا

تصور کیا' بابا کو یاد کیا' ذکیہ باجی کو تصور میں دیکھا' پھر وانگ یو میرے سامنے آ گیا اور اپنے مخصوص انداز میں ہدایات دینے لگا۔

"چلو خرم!" برڈ نے مجھے چونکا دیا۔ "میں رات بھر یہاں کھڑے رہنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

وہ اچک کر میری پشت پر سوار ہو گیا۔ برین گن اس نے شانے پر لٹکائی تھی۔ اپنے جسم کو تولا اور اللہ کا نام لے کر رسے پر پاؤں رکھ دیا۔ بیلنس کرنے کے لیے میں نے وہی بانس ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ جس کے ذریعے ٹاور کی باؤنڈری وال عبور کی تھی۔ میں ایک ایک قدم آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھا رہا تھا۔ برڈ نے شاید سانس بھی روک لی تھی۔ سینکڑوں فٹ نیچے سے کتوں کے غرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ بھی ہمارے حق میں اچھا تھا کہ نیچے صرف خونخوار کتے اور چیتے تھے۔ اگر وہاں بھی گارڈ ہوتے تو شاید ٹاور سے بلڈنگ تک پہنچنا اتنا آسان نہ ہوتا۔ وہ ہمیں یقیناً" دیکھ لیتے اور دیکھتے ہی ہمیں گولی مار دیتے مگر حفاظتی انتظامات کرنے والوں کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ کبھی کوئی شخص اس ناقابل یقین طریقے سے بلڈنگ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

میں اسی قسم کی باتوں پر غور کرتا ہوا قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اس وقت تک میں رسے کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ اچانک میرا پاؤں تھوڑا سا سلپ ہو گیا۔ میرا تو دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ میں بری طرح ڈگمگایا اور بہ مشکل تمام خود کو بیلنس کیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرا بیلنس برابر ہو چکا ہے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ برڈ کی گرفت غیر شعوری طور پر سخت ہو گئی تھی۔ پھر شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ گرفت سخت کرنا خود اس کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی۔ میں تو اس پوزیشن میں تھا کہ رک کر اپنا سانس بھی بحال نہیں کر سکتا تھا۔ رکنے کا مطلب تھا ایک عبرت ناک موت۔ کوئی بھی ماہر فن اسے محض کھڑا رہ کر اپنا بیلنس قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ اب منزل صرف چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔ منزل کو اتنا قریب دیکھ کر مجھ میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ میں جلدی جلدی قدم بڑھانے لگا۔ برڈ کی گرفت سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ تیز رفتاری کے حق میں نہیں ہے۔ ناچار مجھے اپنی رفتار کم کرنا پڑی۔

ٹاور سے اس عمارت تک کا فاصلہ میں نے چالیس منٹ میں طے کیا۔ حالانکہ پروگرام کے مطابق ہمیں آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس عمارت تک پہنچنا تھا۔ بلڈنگ تک پہنچتے ہی سلیمان اچھل کر اترا اور دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ ساتھ ساتھ سرگوشی میں میری تعریف بھی کر رہا تھا۔ وہاں پہنچ کے برڈ مجھے چیتے کی طرح چوکنا دکھائی دینے لگا۔ شہریار مشہدی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ محافظ اپنے کمروں میں ہوں گے یا ہال میں خوش گپیاں کر

رہے ہوں گے۔
ہم دونوں آگے بڑھے ہی تھے کہ اچانک پیچھے سے دو آدمی حملہ آور ہوئے۔ ایک نے مجھے بے بس کرنا چاہا' دوسرا برڈ کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غنیمت ہے کہ ان دونوں ہی کے ہاتھ میں رائفلیں نہیں تھیں ورنہ وہ ہم پر چھلانگ لگانے کے بجائے فائر کرتے۔ یہاں شہریار مشہدی کا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ وہ دونوں نہ جانے کب سے وہاں بیٹھے تھے۔ ممکن ہے وہ دونوں یونہی ٹہلتے ہوئے باہر آ گئے ہوں' اسی لیے تو ان دونوں کے پاس رائفلیں نہیں تھیں۔ پھر حماقت ان سے یہ ہوئی کہ اپنے ساتھیوں کو آواز دینے کی بجائے ہم پہ چھلانگ لگا بیٹھے۔ میرا خیال تھا کہ برڈ صرف ریوالور سے نشانہ لینا جانتا ہے' مگر یہاں اسے لڑتا دیکھ کر مجھے اپنی رائے بدلنا پڑی۔ اس نے آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں حملہ آور کو ملک عدم پہنچا دیا۔ میں ایک گارڈ کو پہلے ہی ناک آؤٹ کر چکا تھا۔ ان دونوں کو آہستگی سے ایک طرف ڈال کے ہم اندرونی کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ وہاں آمنے سامنے کم از کم بیس کمرے تھے' درمیان میں ایک طویل کوریڈور تھا۔ کئی کمروں کی لائٹ روشن تھی مگر ان میں سناٹا تھا۔ صرف ایک کمرے سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ ہم دونوں دیوار سے چپکے چپکے آگے بڑھے اور اس کمرے تک پہنچ گئے جہاں سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہاں کل آٹھ گارڈز تھے جن میں سے دو باہر پڑے تھے۔ اس حساب سے ہال میں چھ گارڈز ہونا چاہیے تھے۔ ہم دونوں نے ریوالور جیبوں میں رکھ کر برین گن سنبھال لی۔

پھر اچانک ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''کوئی شخص اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔''

وہ سب بری طرح اچھل پڑے اور یوں حیرت سے ہم دونوں کو دیکھنے لگے جیسے ہم کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں۔

''تم سب اپنے ہاتھ سروں پر رکھ لو۔'' برڈ نے کرخت لہجے میں کہا۔ پھر اچانک اس نے برین گن سے تڑاتڑ گولیاں چلائیں اور ایک محافظ خون میں لوٹ گیا۔ ''میں نے کہا ہے ناکہ اپنے ہاتھوں کو سروں پر رکھو۔''

میں نے برڈ سے کہا۔ ''میں ان لوگوں کو ناک آؤٹ کرتا ہوں۔ تم الیکٹرک کرنٹ کا مین سوئچ آف کر دو بلکہ کٹ آؤٹ ہی نکال کر پھینک دو۔''

برڈ کے جانے کے بعد ان میں سے ایک محافظ حیرت سے بولا۔ ''کیا ملک میں بغاوت ہو گئی یا کوئی اور غیر معمولی بات ہوئی ہے؟''

''کیوں؟'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ سیکیورٹی کے افسران یونہی تو کسی کو اوپر آنے کی اجازت نہیں دیتے۔''

"ہم نیچے سے آئے ہی کب ہیں؟" میں نے ہنس کر کہا۔
"تو کیا براہ راست آسمان سے نازل ہوئے ہو؟" ان میں سے ایک نے جھنجلا کر کہا۔
برڈ نے واپس آکر بتایا کہ میں نے کرنٹ کا سوئچ آف کر دیا ہے۔
میں نے ان سب سے کہا۔ "تم لوگ اوندھے منہ فرش پر لیٹ جاؤ' جلدی کرو مگر ہاتھ سر سے نہ ہٹنے پائیں۔"
وہ سب عجیب مضحکہ خیز انداز میں اوندھے ہو گئے۔ ان کے نزدیک ہی اس گارڈ کی لاش پڑی تھی جو برڈ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔
برڈ نے ایک مرتبہ پھر برین گن ہاتھوں میں لے لی۔ وہ ان لوگوں پر فائرنگ کرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔ "نہیں برڈ! میں اس قتل عام کے حق میں نہیں ہوں۔"
پھر میں نے ایک ایک کر کے سب کو ریوالور کے دستے سے بے ہوش کر دیا۔ "یہ لوگ کم از کم دو گھنٹے تک ہوش میں نہیں آئیں گے۔ اس وقت تک ہم نہ جانے کہاں پہنچیں گے۔"

اچانک نیچے سے تڑاتڑ گولیاں چلنے کی آواز آنے لگی۔ پروگرام کے مطابق مشہدی نے نیچے کا محاذ سنبھال لیا تھا۔ ہم دونوں تیزی سے زینے کی طرف لپکے' اوپر آنے والی لفٹ نہ جانے کیوں جام ہو گئی تھی۔ زینے میں تیز روشنی والا مرکری بلب لگا ہوا تھا۔ بلب کی روشنی اتنی تیز تھی کہ ہم دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اچانک میری نظر برڈ کے ہاتھ پر پڑی۔ خون کی ایک لکیر اس کی ہتھیلی کی پشت سے پھیلتی ہوئی قطرہ قطرہ نیچے گر رہی تھی۔ میں نے برڈ سے پوچھا۔ "کیا تم زخمی ہوئے ہو' یہ خون کیسا ہے؟"
"یہ۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "وہی پرانا زخم ہے' شاید بھاگ دوڑ میں دوبارہ کھل گیا ہے۔" اس نے رومال سے ہتھیلی کی پشت صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔
نیچے فائرنگ شدت اختیار کر گئی تھی۔ اتنی زیادہ فائرنگ ہمارے پلان میں شامل نہیں تھی۔ بہ قول مشہدی کے نیچے تو نہ ہونے کے برابر مزاحمت ہوتی' پھر یہ فائرنگ کون کر رہا تھا؟

ہم دونوں تیزی سے نیچے کی طرف لپکے۔ اچانک برڈ نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے روک لیا۔ "ٹھہر جاؤ خرم! نیچے نہ جانے کیا صورت حال ہے۔ ہمیں احتیاط کرنا چاہیے۔"
میں بھی اس کی بات سے متفق تھا اس لیے اب ہم بہت احتیاط سے نیچے اترنے لگے۔
پھر ایسا لگا جیسے کئی آدمی فائرنگ کرتے ہوئے اوپر کی طرف سمٹ رہے ہوں۔ یہ صورت حال خاصی پریشان کن تھی۔ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ بھی نہیں تھی اور اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ ہم پلٹ کر اوپر بھاگتے۔ ہمیں تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ آنے والے ہمارے ساتھی ہیں یا محل کے محافظ! پھر مجھے خیال آیا کہ ہمارے ساتھیوں اور محافظوں میں وردی کی وجہ سے

نمایاں فرق ہو گا۔

فائرنگ کرنے والے اچانک ہی سامنے آ گئے۔ ان کا دھیان نیچے کی طرف تھا جہاں سے ان پر جوابی فائرنگ ہو رہی تھی۔ انہوں نے شاید ہمیں دیکھا ہی نہیں تھا یا دیکھا ہو گا تو یہی سمجھے ہوں گے کہ بالائی منزل والے محافظوں میں سے کوئی ہے۔

میں نے ہوا میں برین گن کا برسٹ مارا اور چیخ کر کہا۔ "خبردار! اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا لو ورنہ تم سب کتے کی موت مارے جاؤ گے۔"

ان سب کے جسموں پر وردیاں نہیں تھیں اس لیے مجھے یہ شبہ تو نہیں رہا کہ ہمارے ساتھی ہیں۔ ان سب نے فوراً" ہتھیار پھینک دیئے۔ نیچے والوں نے بھی شاید میری آواز سن لی تھی' کیوں کہ انہوں نے جونہی ہتھیار پھینکے' نیچے سے بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ لوگ بھی تیز رفتاری سے اوپر کی طرف آ رہے تھے۔ ان سب میں ریکا نمایاں تھی۔ محافظوں کو ناک آؤٹ کرنے کا فریضہ ایک دفعہ پھر مجھی کو انجام دینا پڑا ورنہ برڈ سمیت کوئی بھی انہیں زندہ چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ میں قتل عام نہیں چاہتا تھا۔

ان سب کو بے ہوش کر کے ہم نیچے کی طرف بڑھے۔ نیچے مشہدی اور ڈینی کے علاوہ کئی اجنبی چہرے تھے۔ وہ لوگ سونے کے بکس کمرے سے باہر نکال رہے تھے۔ پھر مشہدی نے ان سب کو حکم دیا کہ یہ بکس سب سے اوپر کی منزل پر کھڑے ہوئے ہوائی جہاز میں لوڈ کر دو۔ پھر وہ اس اسٹرانگ روم کی طرف متوجہ ہوا جس میں اربوں ڈالر کے ہیرے جواہرات رکھے ہوئے تھے۔ کمرے کا دروازہ اسٹیل کا بنا ہوا تھا۔ وہ آٹو میٹک دروازہ تھا۔ مشہدی کا ایک آدمی اسے کھولنے کے لیے اس کا میکنزم تلاش کر رہا تھا۔ شاید اس سیکیورٹی نظام کے خالق کو یقین تھا کہ سسٹم کو کوئی ناکارہ نہ کر پائے گا۔ اسی لیے اس نے دروازے کا میکنزم کہیں اور رکھا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر دروازے کا میکنزم تلاش کر لیا گیا۔ اس دوران میں مشہدی کے آدمی سونے کے بکس اوپر کھڑے ہوئے جہاز پر لوڈ کر چکے تھے۔ ایک مرحلہ یہاں بھی تھا۔ دروازہ کھلتے ہی مشہدی کے ایک آدمی نے لکڑی کے گولے میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے اچھل کود کے اپنے جسم کو وارم اپ کیا' پھر اللہ کا نام لے کر گولوں پر کھڑا ہو گیا۔ گولوں پر چلنا تو یوں بھی میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ میں نے گولوں پر کوریڈور کا ایک چکر بھی لگایا' پھر اسی رفتار سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

سامنے ہی وہ سوئچ لگا ہوا تھا جو لگانے والوں کے خیال میں ناقابل تسخیر تھا۔ میں نے جونہی سوئچ آن کیا۔ مشہدی سمیت کئی آدمی اندر آ گئے۔ وہاں موجود سیف اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا' جتنا مشہدی نے بتایا تھا۔ کئی آدمیوں نے مل کر سیف اٹھایا اور اسے اوپر جہاز کی طرف لے چلے۔

تھوڑی دیر بعد میں سونا اور ہیرے جواہرات کا بھرا ہوا سیف' سب کچھ جہاز میں منتقل ہو گیا تو مشہدی نے اپنے آدمیوں کو وہاں سے روانگی کا حکم دے دیا۔ ایک ایک کر کے وہ سب روانہ ہو گئے۔

مشہدی نے ڈینی کو جہاز میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ میں اور برڈ جہاز کی طرف بڑھے تو مشہدی نے روک دیا۔ "تم لوگ بھی دوسروں کی طرح سے روانہ ہو جاؤ۔"

میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" برڈ کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

"مطلب یہ کہ اب تم دونوں بھی روانہ ہو جاؤ اس جہاز میں مزید بوجھ اٹھانے کی گنجائش نہیں ہے۔"

"مگر یہ سب باتیں تو پہلے طے ہو چکی ہیں۔ پہلے تو تم نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔" برڈ نے کہا۔ پھر جہازوں کو مجھ سے بہتر تم نہیں جان سکتے ہو۔ یہ جنگی طیارہ ہے اور ابھی مزید اتنا ہی وزن اٹھا سکتا ہے۔"

"اٹھا سکتا ہو گا۔" مشہدی نے بیزاری سے کہا۔ "مگر اب تم لوگ پیدل جاؤ۔"

ہمارے سب ہتھیار بھی اس نے پہلے ہی جہاز میں رکھوا دیئے تھے۔ مجھے مشہدی کی نیت درست معلوم نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ جہاز اڑائے گا کون؟" برڈ نے پوچھا۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔" مشہدی نے خشک لہجے میں کہا۔ "روئے زمین پر تم واحد پائلٹ نہیں ہو۔ تم شاید یہ نہیں جانتے کہ میں خود بھی لائسنس یافتہ پائلٹ ہوں۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر برڈ نے جلدی سے میرا ہاتھ دبا دیا اور پرسکون لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے' ہم لوگ اس جہاز میں جائیں گے مگر یہ تو بتاؤ کہ ہمیں پہنچنا کہاں ہے؟"

"تم دونوں تہران پہنچو۔" مشہدی نے کہا۔ "وہیں تم لوگوں کو تمہارا حصہ ملے گا' اس کے بعد جہاں دل چاہے چلے جانا' ڈینی میرے ساتھ جائے گا۔ او کے' خدا حافظ' میرے پاس وقت کم ہے۔" وہ جہاز کی طرف مڑا' پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولا۔ "اور سنو' اب نیچے سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا' اسی راستے سے واپس ہونا جس سے آئے ہو۔"

"اور میری بہن! میں اسے ....."

"تم پہلے تہران تو پہنچو۔" مشہدی کے لہجے میں بیزاری تھی۔

پہلے میں نے دھیان نہیں دیا تھا مگر اب مجھے جہاز کے دائیں بائیں دو آدمی دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور انہوں نے ہمیں کور کر رکھا تھا۔

"وہ جا رہا ہے خرم!" برڈ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "اس نے دھوکا دیا ہے ہمیں۔ ہم سے کام لینے کے بعد ہمیں یہاں مرنے کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہے' کچھ کرو خرم!"

"تمہارے پاس کوئی ہتھیار بھی تو نہیں ہے۔" میں نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔

"کام بن سکتا ہے۔" برڈ خوشی سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میری جیکٹ کی آستینوں میں باریک پھل والے تین چار خنجر ہیں۔ وہ خنجر میں نے احتیاط کے طور پر رکھ لیے تھے۔ اب تو میں ان سب کو مزہ چکھادوں گا۔" برڈ نے جھٹکے سے ایک خنجر آستین سے باہر نکال لیا۔ جھٹکا مارتے ہوئے اس کے منہ سے ہلکی سی سسکاری کی آواز ابھری۔ اس نے ہاتھ ہی کو جھٹکا مارا تھا اور اس کا وہی ہاتھ زخمی بھی تھا۔

مشہدی مطمئن تھا کہ ہم دونوں بالکل نہتے ہیں' اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔ شاید اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دی ہو گی کہ ہمارے نزدیک نہ آئیں۔

اندھیرے میں برڈ کی حرکات سکنات سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ پھر اچانک بجلی سی کوندی اور مشہدی کا ایک ساتھی سینہ پکڑے ہوئے دہرا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا آدمی سنبھلتا' برڈ کا خوفناک خنجر اسے بھی چاٹ گیا۔

مشہدی یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے طیارے کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ ہم دونوں نے جھپٹ کر آنے والوں کی رائفلوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کے ساتھ کچھ فاضل راؤنڈز بھی تھے۔ رائفل ہاتھ میں آتے ہی برڈ نے زمین پر لیٹ کر پوزیشن سنبھال لی۔ پھر وہ چیخ کر بولا۔ "مشہدی' کتے! نیچے آ جاؤ فوراً" میں جہاز کو ناکارہ کر دوں گا۔ تیرا منصوبہ دھرا رہ جائے گا۔" برڈ پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔ جہاز کے انجن کے شور میں اس کی آواز بہت مشکل سے سنی جا رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اللہ کرے مشہدی نے برڈ کی آواز سن لی ہو ورنہ وہ واقعی طیارے کو ناکارہ کر دیتا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر حلق کے بل چیخ کر کہا۔ "دیکھو مشہدی' میری بات کو غلط مت سمجھنا۔ میں واقعی جہاز کو ناکارہ کر دوں گا۔ میں دس تک گنتی گنوں گا اگر تم طیارے کا انجن بند کر کے باہر آ گئے تو ٹھیک ہے ورنہ دوسری صورت میں جو کچھ ہو گا' اس کے ذمے دار صرف تم ہو گے۔" پھر اس نے گنتی شروع کر دی۔ "ون۔ ٹو۔ تھری۔ فور۔ فائیو۔ سکس۔ سیون۔"

اچانک طیارے کا انجن بند ہو گیا۔ کاک پٹ کا دروازہ کھلا اور مشہدی غلیظ غلیظ گالیاں بکتا ہوا باہر نکل آیا۔

"اس مردود ڈینی کو بھی باہر بلاؤ۔" برڈ نے بپھر کر کہا' پھر وہ چیخ کر بولا۔ "ڈینی! باہر آ جاؤ میں نہیں جانتا' مشہدی نے تمہیں کتنے پیسوں کی آفر کی ہے مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مجھے اس چکر میں تم نے ہی پھنسایا تھا۔ اب پیسے کے لیے تم نے پرانے تعلقات کی پرواہ نہ کی۔ تمہیں تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر باہر آنا ورنہ ایک دم فائر کر دوں گا۔" برڈ نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

ڈینی لرزتا کانپتا باہر آ گیا۔ وہ فطری طور پر بزدل آدمی تھا' عموماً" غدار اور ڈبل کراس کرنے والے بزدل ہی ہوتے ہیں۔

برڈ نے مجھ سے کہا۔ "ان دونوں کی تلاشی لو خرم! دل تو میرا چاہ رہا ہے کہ ان دونوں کو یہیں چھوڑ جاؤں مگر میں انہیں اذیت دے کر مارنا چاہتا ہوں۔ ایسے لوگوں کا تو میں جانی دشمن ہوں۔"

"اگر تم نے مجھے ذرا سا بھی نقصان پہنچایا تو یہ خزانہ لے کر ایران سے کبھی نکل نہ سکو گے اور خرم کبھی اپنی بہن سے نہ مل سکے گا۔" مشہدی بولا۔

میں نے باری باری دونوں کی تلاشی لی' پھر برڈ کے کہنے پر دونوں کو باندھ دیا۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ شاہ کی سیکیورٹی فورس یا پولیس وہاں نہ پہنچ جائے۔ اس وقت تک یقیناً قم کی پولیس کو محل میں گڑبڑ کا علم ہو گیا ہو گا اور اب تک ناکہ بندی شروع ہو گئی ہو گی۔ میں نے ان دونوں کو جہاز میں سوار کرایا' پھر خود بھی انہی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہیں سونے اور بیش قیمت ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگے ہوئے تھے یہ سوچ کر ہی جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی کہ اربوں ڈالر کی مالیت کا سونا اور جواہرات میرے قبضے میں ہیں۔

برڈ نے جہاز کا انجن اسٹارٹ کیا' اسے محل کی وسیع و عریض چھت پر دوڑایا اور طیارے کو فضا میں بلند کر لیا۔ میں نے مشہدی کو سنانے کو کہا۔ "برڈ نقشہ دیکھ کر طیارے کو سمندر کے اوپر لے چلو۔"

برڈ نے چونک کر مجھے دیکھا تو ان دونوں کی نظر بچا کر میں نے اسے آنکھ مار دی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "سمندر پر کیوں؟"

"میں اس خزانے سے نجات پانا چاہتا ہوں۔ مشہدی سمجھتا ہے کہ دولت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ جب اربوں ڈالر کا خزانہ اس کے سامنے سمندر میں ڈوبے گا تو پھر اسے حاصل کرنے میں سب سے زیادہ محنت بھی تو ہم لوگوں نے کی ہے۔ ان کا اس پر اتنا حق ہے بھی نہیں۔"

برڈ سمجھ گیا' میں مشہدی اور ڈینی کو دھوکا دینا چاہتا ہوں۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے ایسا خزانہ بھلا کس کام کا جسے لے کر ہم یہاں سے نکل نہ سکیں۔ یہ تو یہاں بھی ہمارے لیے پھانسی کا پھندا بن جائے گا۔ اسے سمندر میں پھینکنا ہی بہتر رہے گا۔" یہ کہہ کر اس نے طیارے کو غوطہ دیا پھر سیدھا کر لیا۔

مشہدی کچھ دیر تو خاموشی سے پہلو بدلتا رہا' پھر ہذیانی انداز میں بولا۔ "تم لوگ پاگل ہو گئے ہو! اتنا بڑا خزانہ سمندر میں پھینکنا چاہتے ہو؟"

"ہاں' ہم لوگ پاگل ہی تو ہیں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "ورنہ موت کے اس رسے پر چلنا کس ہوش مند کا کام ہے۔ قدموں کے نیچے بھی موت ہو اور سامنے بھی موت

کھڑی ہو تو اچھے اچھے سورما بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟"

"مگر تم وہ خزانہ ضائع کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"پھر اس کا کیا کریں۔" میں نے سادگی سے پوچھا۔ "کیا ناداروں میں تقسیم کر دیں یا کسی غریب ملک کی حکومت کو گفٹ کر دیں۔"

"یہ تم مجھے دے دو۔" مشہدی نے جلدی سے کہا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا' اس لمحے اس کی بلند و بالا باوقار شخصیت مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میرے سامنے محض ایک عام سا شخص تھا لالچی' بزدل اور خود غرض! میں نے طنز کیا۔ "کیوں بھئی' تمہیں کس خوشی میں دے دوں؟ تم تو معذور و محتاج نہیں ہو۔"

"تم یہ خزانہ مجھے دے دو' میں تمہاری بہن تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"اب میں تمہاری کسی چال میں نہیں آؤں گا۔ سودا اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے کے اصول پر ہو گا۔ اگر تم میری یہ بات مانتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ پھر سمندر۔"

"مجھے منظور ہے۔" مشہدی نے میری بات کاٹ دی' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "پہلے تو اس طیارے کو کسی محفوظ مقام پر اتارو۔"

"مگر اتنا بڑا طیارہ تم چھپاؤ گے کہاں؟"

"اسے تو یونہی چھوڑنا پڑے گا۔ وہاں سے ہم ٹرک میں سامان لاد کر محفوظ مقام کی طرف نکل جائیں گے۔ پھر موقع ملتے ہی ترکی اور وہاں سے یورپ!"

"مگر شہلا.....!"

"ہاں شہلا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ایران چھوڑنے سے پہلے تمہاری بہن تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"ایک بات اور سن لو۔" برڈ نے کہا۔ "خزانے کو ملک سے نکالنا اور ٹھکانے لگانا تمہارا درد سر ہے ہمیں کیش چاہئے' ڈالر برٹش پاؤنڈ میں۔" برڈ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اور اب میرا حصہ دس لاکھ ڈالرز نہیں بلکہ ایک کروڑ ہو گا۔"

"کیش ادا کرنا بہت مشکل ہو گا۔" مشہدی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "خزانے کا سودا ہونے کے بعد ہی تو مجھے رقم ملے گی۔"

"لیکن ہم اتنا انتظار نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے آئندہ چھ ماہ یا ایک سال تک خزانے کا سودا نہ ہو۔ ہم لوگ اس وقت تک کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے؟ ہم اتنے عرصے تمہاری نگرانی بھی نہیں کر سکتے۔ بداعتمادی کی فضا تم نے خود ہی پیدا کی ہے۔ اگر تم ہمیں قتل دینے کی کوشش نہ کرتے تو ہم تم پر اعتبار کرتے ہوئے سودا ہونے کا انتظار بھی کر لیتے مگر اب یہ ناممکن ہے۔"

"مگر فوری طور پر میں دو کروڑ ڈالر کا بندوبست نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے پھر یہ خزانہ ہمارے حوالے کر دو۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے کہ اسے سمندر
پھینکتے ہیں یا اس کی قیمت وصول کرتے ہیں۔"

"ٹھہرو مجھے کچھ سوچنے دو۔" مشہدی نے چیخ کر کہا۔ "تم لوگ بار بار خزانے کو
کرنے کی بات کیوں کر رہے ہو؟"

پھر کچھ دیر تک کوئی بھی کچھ نہ بولا۔

اس خاموشی کو مشہدی ہی نے توڑا۔ اس نے برڈ سے کہا۔ "جونہی جنوبی پہا
دکھائی دیں' نقشہ دیکھ کر طیارے کو نیچے اتار لو۔ پہاڑیوں کے ساتھ ہی ایک متروک
وے ہے۔ کسی زمانے میں وہ رن وے تربیتی طیاروں کے کام آتا تھا۔"

تقریباً دس منٹ بعد برڈ نے طیارے کو اس متروک رن وے پر اتار لیا۔ وہاں
دور تک ویرانی تھی۔

میں نے مشہدی کو تنبیہہ کی کہ کسی قسم کی چالاکی مت دکھانا۔ پہلے سے طے
پروگرام کے مطابق تمہارے ساتھی بھی موجود ہوں گے۔ اگر تم نے گڑبڑ کی کوشش
اپنی جان سے جاؤ گے۔ ہم لوگوں کو تو مرنے جینے کی کوئی پرواہ نہیں۔ پھر میں ڈی
مخاطب ہوا۔ "تم بھی اپنی چونچ بند رکھنا ورنہ تمہارا تو میں وہ حشر کروں گا کہ جو دی
عبرت پکڑے گا۔"

مشہدی ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ طیارہ رکنے کے بعد ہم نے نیچے اترنا چا
مشہدی نے یہ کہہ کر ہمیں روک دیا کہ ابھی اس کے ساتھی خود ہی یہاں پہنچ جائیں
انہوں نے طیارے کو اترتے ہوئے دیکھ لیا ہو گا۔

ہمیں وہاں لینڈ کیے ہوئے مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ دائیں جانب
دو گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس نمودار ہوئیں۔ میں نے لائٹ دیکھ کر اندازہ لگایا کہ ان میں
کار یا جیپ ہے اور دوسرا ٹرک یا بس! تھوڑی دیر بعد تصدیق ہو گئی ان گاڑیوں میں
ویگن جیپ تھی اور دوسرا بڑا سا ایک ٹرک تھا۔ میں نے اس دوران میں مشہدی کو کھ
تھا مگر اسے تاکید کر دی تھی کہ ذرا سی بھی غلط حرکت اس کی موت کا باعث ہو گی
نے اسے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ اپنے ساتھیوں سے فارسی کی بجائے انگلش میں گفتگو
گی۔ ٹرک میں ڈرائیور سمیت چار آدمی تھے قد و قامت اور چہرے مہرے سے وہ چار
کرو لگ رہے تھے۔ انہوں نے مشہدی کو طیارے سے باہر آتا دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور ا
سے وی کا نشان بنایا۔ ویگن میں صرف ایک شخص سوار تھا۔ وہی اسے وہاں تک ڈرا
کے لایا تھا مگر اسے دیکھ کر میں چونک پڑا۔ وہ ایرانی نہیں بلکہ پاکستان یا بھارت کا باشن
اس کے چہرے اور حلیے سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو! مشہ
دیکھ کر اسے خوشی سے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "وکٹری؟"

مشہدی نے اثبات میں سرہلایا اور بولا۔ ”عدنان‘ زیادہ پرجوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی خزانے کو نکالنے کا مرحلہ باقی ہے۔“

”او کے سر!“ اس نے پھر خوشی کا اظہار کیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”اب ان بندوں سے میری جان چھڑائیں۔ اس نے کردوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ساری رات شراب پیتے رہے ہیں اور خوخو کر کے ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے رہے ہیں۔“

وہ کرد یقیناً انگلش سے نابلد تھے۔ اس لیے عدنان اتنی آسانی سے ان کے بندر ہونے کا انکشاف کر دیا تھا۔

”بس اب ان لوگوں کا کام ختم ہو چکا ہے اب یہ سب واپس جائیں گے۔ ان میں سے صرف ڈرائیور رہ جائے گا۔ انہیں تو یہ معلوم نہیں ہے کہ ان بکسوں میں خزانہ ہے۔ تم بھی اپنی زبان بند رکھنا۔“

پھر وہ کردوں سے مخاطب ہو گیا۔

میں نے اسے کہا تھا کہ فارسی میں گفتگو نہیں کرنا ہے مگر ان کردوں کی مجبوری یہ تھی کہ انہیں فارسی اور زیادہ سے زیادہ عربی کے علاوہ کوئی زبان نہیں آتی تھی‘ اس لیے میں نے مشہدی کو کردوں کی [illegible] دے دی تھی مگر اس پر اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ وعدہ خلافی کا نتیجہ اس کی موت کی صورت میں ظاہر ہو گا۔

ان لوگوں نے آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں طیارے کے سارے بکس ٹرک میں منتقل کردیئے۔ میں نے ڈیلی کو ابھی تک نہیں کھولا تھا وہ بدستور بندھا ہوا تھا‘ اور اب مجھے اور برڈ کو انتہائی غلیظ گالیاں دے رہا تھا۔ ایک کرد نے ڈیلی سے متعلق مشہدی سے کچھ پوچھا‘ پھر اسے بوری کی طرح کندھے پر لادا اور ٹرک کے فرش پر پٹخ دیا۔

یہ جانتے بوجھتے کہ یہ جگہ ہمارے لئے اجنبی ہے اور ہم مشہدی کی مدد کے بغیر یہاں سے نکل نہیں سکتے‘ اس نے ہمیں تنہا چھوڑنا گوارا نہ کیا اور ہمارے ساتھ ہی ٹرک میں سوار ہو گیا۔ صبح کا اجالا آہستہ آہستہ پھیلنے لگا تھا۔ ہم سے آگے ویگن جیپ تھی۔ اس میں عدنان کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ہم لوگ تقریباً“ دو ڈھائی گھنٹے تک مین روڈ پر سفر کرتے رہے‘ پھر عدنان نے گاڑی کا رخ کچے میں موڑ دیا۔ کچھ دور چل کر ہم پھر پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ سڑک پہاڑ کے دامن میں تھی اور بل کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔

ہمیں اس ذیلی سڑک پر سفر کرتے ہوئے مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے۔ اچانک فضا جنگی طیاروں کی گھن گرج سے گونج اٹھی۔ وہ تین طیارے تھے۔ ان کی دم پر واضح الفاظ میں ایرانی فضائیہ کے الفاظ تحریر تھے۔ تینوں طیارے زوردار آواز نکالتے ہوئے ہمارے سروں پر سے گزر گئے۔ میں نے دیکھا‘ مشہدی کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے کرد کو ہارن بجانے کا اشارہ کیا تاکہ عدنان کو روکا جا سکے۔ عدنان رک گیا۔ مشہدی نے

چیخ کر کہا۔ "عدنان! فوری طور پر کوئی پناہ گاہ ڈھونڈو ورنہ ہم ایرانی فضائیہ کی نظروں میں آ جائیں گے۔"

عدنان ایک مرتبہ پھر آگے آگے روانہ ہو گیا اور کچھ دور چلنے کے بعد عدنان کی جیپ دائیں طرف کے دشوارگزار راستوں پر مڑگئی۔ جیپ تو اس راستے پر با آسانی مڑگئی مگر دیو قامت ٹرک کا اس پتھریلے اور ٹوٹے پھوٹے راستے پر چلنا کار محال تھا۔ اتنے زبردست قسم کے جھٹکے لگ رہے تھے کہ جوڑ جوڑ ہل کر رہ گیا۔

ٹرک اچھلتا کودتا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں پہاڑوں کے عین درمیان ایک وسیع و عریض قدرتی سائبان تھا۔ اس قدرتی سائبان کے نیچے جیپ بھی آسانی سے چھپ گئی اور کسی حد تک ٹرک بھی۔ اب کم از کم جہاز یا ہیلی کاپٹر کے ذریعے ٹرک نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

ہوائی جہازوں کی خوف ناک گڑگڑاہٹ ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ ہم بھی اس چٹان کے نیچے دبک گئے مشہدی نے فیصلہ کیا کہ ہمیں کم از کم آج یا کل کا دن یہیں گزارنا پڑے گا کیونکہ ایرانی فوج اور فضائیہ نے جہاز دیکھ لیا ہو گا اور اب اس علاقے کے چپے چپے میں ہماری تلاش جاری ہو گی۔

میں نے مشہدی سے کہا۔ "یار' تمہارے پلان میں کئی جگہ زبردست خامیاں تھیں۔ پلاننگ کا یہ حال تھا اور چلے ہیں خزانہ لوٹنے!"

"یہ بحث کا وقت نہیں ہے خرم!" مشہدی نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایرانی فضائیہ اتنی جلدی ہمارا سراغ لگا لے گی۔"

ہم سب اسی قدرتی سائبان کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے نزدیک ہی کرد ٹرک ڈرائیور بیٹھا تھا۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے ڈرائیور کی جیپ سے "بپ۔بپ" کی آواز آ رہی ہو' ایسی آوازیں عموماً" الیکٹرانک رسٹ واچ کے الارم کی ہوتی ہیں۔ ٹرک ڈرائیور کبھی بے چین نظر آ رہا تھا۔ وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے فارسی میں مشہدی سے کچھ کہا' مشہدی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ میرے استفسار پر مشہدی نے بتایا کہ ڈرائیور پیشاب سے فارغ ہونا چاہتا ہے میں بھی بجلی کی سی تیزی سے کھڑا ہو گیا اور ٹرک ڈرائیور کو للکارا "اے واپس آؤ"

میری بات سنی ان سنی کر کے وہ آگے بڑھ گیا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اسے آواز دی۔

وہ نہ رکا تو میں نے ریوالور نکال کر ایک ہوائی فائر کر دیا۔

فائر کی آواز سن کر وہ گھبرا کر رک گیا اور پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "واپس آؤ!"

وہ میرا جملہ سمجھا یا نہیں مگر میرا اشارہ ضرور سمجھ گیا اور گھبرا کر واپس آ گیا۔ میرے

ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس نے بے اختیار ہاتھ بھی اٹھا لیے تھے۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گیا اور کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

میں نے مشہدی سے کہا۔ ”اس سے کہو کہ ہاتھ اٹھائے کھڑا رہے‘ میں اس کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔“

”تم کیوں خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا کر رہے ہو؟“ مشہدی جھنجلا کر بولا۔ ”یہ کرد بہت سرکش ہوتے ہیں‘ ہمارے لیے خواہ مخواہ پریشانی کھڑی کر دے گا۔“ پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”اور تم نے ابھی جو فائر کیا ہے‘ اس کی آواز بھی دور تک سنی گئی ہو گی۔ ایرانی فضائیہ اور انٹیلی جنس ہماری تاک میں ہے۔“

”میں نے تم سے تقریر کرنے کو نہیں کہا تھا۔“ میں بھنا کر بولا۔ ”میں اس ڈرائیور کی تلاشی لینا چاہتا ہوں اور یہ سرکشی تو جب دکھائے گا جب اس قابل رہے گا۔ میں ان سب کو مار کے انہی پہاڑیوں میں پھینک دوں گا۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”اس سے کہو کہ شرافت سے تلاشی دے دے ورنہ میں اس کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

مشہدی نے کرد سے فارسی میں کچھ کہا۔ اس نے کندھے اچکا کر اپنا رخ مخالف سمت میں پھیر لیا۔ میں نے برڈ کو تلاشی لینے کا اشارہ کیا۔ برڈ نے محتاط انداز میں اس کی تلاشی لی اور جلد ہی اس کی جیب سے بھاری سا ایک دیسی ریوالور‘ بڑے پھل کا ایک کمانی دار چاقو اور چھوٹا سا ایک ٹرانسمیٹر برآمد کر لیا۔ پھر میں نے برڈ سے کہا کہ اسے ناک آؤٹ کر دو۔ برڈ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ‘ کھٹکے سے کمانی دار چاقو کھولا اور اس سے پہلے کہ میں اس کا مقصد سمجھتا‘ چاقو کرد ڈرائیور کی پشت میں پیوست کر دیا۔ ڈرائیور کی چیخ بہت بھیانک تھی۔ وہ زمین پر گر کر بری طرح تڑپنے لگا۔ اسے اسی حال میں دیکھ کر اس کے بقیہ ساتھی تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سب ایک ساتھ بول رہے تھے اور مشہدی انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

خطرے کے پیش نظر برڈ نے ایک اونچے ٹیلے پر پوزیشن سنبھال لی تھی اور شانے سے لٹکی ہوئی رائفل اتار کر ان کردوں کو کور کر لیا تھا۔

”میں خود بھی بے مقصد کسی کا خون بہانا نہیں چاہتا تھا۔ برڈ نے میری بات کا غلط مطلب لیا تھا۔ میں اس کرد کو فوری طور پر بے ہوش کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کے بقیہ ساتھیوں کی بھی تلاشی لے سکوں‘ ان سے پوچھ گچھ کر سکوں مگر برڈ کی جلد بازی سے صورت حال بگڑ گئی تھی۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا۔

برڈ نے وہیں سے چیخ کر مشہدی کو حکم دیا۔ ”ان سب کردوں سے کہو کہ ہاتھ سروں پر رکھ کے کھڑے ہو جائیں ورنہ تم جانتے ہو میں رعایت نہیں کرتا۔“ پھر وہ عدنان سے مخاطب ہوا۔ ”اے مسٹر! تم بھی ہاتھ اٹھاؤ۔“

مشھدی نے شگفتہ لہجے میں ان لوگوں سے ہاتھ اٹھانے کو کہا' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔
"خرم! برڈ کو سمجھاؤ' ہمیں بارڈر کراس کرنے کے لیے ان کردوں کی ضرورت پڑے گی۔ یہ لوگ اس علاقے کے کیڑے ہیں اور سرحدی محافظوں کی نظروں میں آئے بغیر بارڈر کراس کرتے رہتے ہیں۔"

"تم اپنی چونچ بند رکھو۔" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "بارڈر کراس کرنا ہو گا تو ہم کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ ہی لیں گے۔ ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ بے شمار لوگ پیسے لے کر یہی کام کرتے ہیں۔"

تینوں کرد ہاتھ سروں پر رکھے' قہر آلود نظروں سے مجھے اور برڈ کو دیکھ رہے تھے۔ سامنے ہی ٹرک ڈرائیور کی لاش پڑی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش مسخ ہو گئے تھے' لاش کے اردگرد خون کا تالاب سا بن گیا تھا اور خون بہت تیزی سے جم رہا تھا۔ میں محتاط انداز میں چلتا ہوا ان تینوں کی پشت پر پہنچا۔ میری توجہ چونکہ انہی تینوں کی طرف تھی اس لیے عدنان نے حرکت کرنے کی کوشش کی۔

"اسی وقت ایک فائر ہوا اور گولی عدنان کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ پھر برڈ کی آواز سنائی دی۔ "یہ صرف وارننگ تھی۔ اب تم نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو کھوپڑی کے پرخچے اڑا دوں گا۔"

عدنان اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ مشھدی رو دینے والے انداز میں بولا۔ "آخر تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں! مسلسل فائرنگ کر رہے ہو۔ تم لوگ چاہتے ہو کہ ہم خزانے سمیت پکڑے جائیں؟"

"اور تم کیا چاہتے ہو کہ ہم ان کردوں کے ہاتھوں مارے جائیں؟" برڈ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ویسے اب دھماکا نہیں ہو گا۔ میں سائیلنسر فٹ کر رہا ہوں۔

ان لوگوں کی تلاشی میں کوئی مشتبہ چیز برآمد نہ ہوئی سوائے چاقوؤں کے۔

پھر میں نے عدنان سے کہا۔ "چلو' تم بھی تلاشی دو۔"

"کہنے کی کیا ضرورت ہے؟" عدنان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تمہارا جنونی ساتھی رائفل لیے بیٹھا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ میں بے بس ہوں ورنہ عام حالات میں کوئی میری تلاش لے لے' اونہہ!" اس نے حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے لاتوں اور گھونسوں سے مار مار کر ڈھیر کر دوں مگر میں نے مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا۔ عدنان یقیناً مجھے مشتعل کرنا چاہتا تھا تاکہ میں اس پر ہاتھ اٹھاؤں اور اسے کچھ کر گزرنے کا موقع مل جائے۔ میں کوئی جواب دیئے بغیر اس کی پشت پر پہنچا اور اس کی تلاشی لے ڈالی۔ اس کی جیبوں سے اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور' پتلے پھل کا دو خنجر' ڈالرز اور پونڈز سے بھرا ہوا ایک پرس اور ایک ٹرانسمیٹر دیکھ کر میں چونک اٹھا

کیونکہ بالکل اسی ساخت کا ٹرانسمیٹر ٹرک ڈرائیور کے پاس سے بھی برآمد ہوا تھا۔ میں نے وہ سب چیزیں اپنی جیبوں میں ٹھونسیں اور پیچھے ہٹ گیا۔ میرے ذہن میں بے شمار سوالات گردش کر رہے تھے۔ میں ان کردوں سے بھی سوالات کرنا چاہتا تھا مگر وہ کم بخت فارسی کے علاوہ کوئی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ یا ممکن ہے وہ یہ ظاہر کر رہے ہوں۔ ہر صورت میں وہ میرے لیے بیکار تھے۔ برڈ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کر لیا اور دوسرے ہی لمحے ریوالور کے دستے سے ان تینوں کردوں کو تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کر دیا۔ میں عدنان سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کردوں کو گرتے دیکھ کر برڈ نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور اتر کر میرے نزدیک آ گیا۔

میں نے عدنان کے چہرے پر زناٹے کا تھپڑ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ "بتاؤ' تم کس کے لیے کام کر رہے ہو۔"

عدنان بوکھلا کر رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے سنبھل کر بولا۔ "تمہارا سوال انتہائی احمقانہ ہے۔ ظاہر ہے مشہدی کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم مشہدی کو بھی ڈبل کراس کر رہے ہو۔ بتاؤ تم کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ ہمارے پاس وقت کم ہے' بتا دو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ تمہاری لاش بھی انہی پہاڑیوں میں گدھوں اور دوسرے جانوروں کی خوراک بنے گی۔"

"میں بتا تو رہا ہوں کہ مشہدی کے...."

"یو باسٹرڈ!" برڈ نے اس کی بات کاٹ دی اور اتنے زور سے اس کے منہ پر گھونسا مارا کہ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ بتاتا ہے یا....."

"صبر سے کام لو برڈ!" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "نہیں بتائے گا تو جان سے جائے گا۔ ہمیں اس سے کیا فرق پڑے گا کہ یہ کس کے لیے کام کر رہا ہے۔ یہ سوچنا تو مشہدی کا کام ہے۔ یہ اسی کا آدمی ہے۔ ہم اپنی انرجی کیوں ضائع کریں۔"

یہ کہہ کر میں نے مشہدی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی تذبذب میں مبتلا تھا۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم لوگوں کو یہ شبہہ کیوں ہے کہ یہ مجھے ڈبل کراس کر رہا ہے؟"

"اس ٹرانسمیٹر کو غور سے دیکھو۔" میں نے عدنان کی جیب سے نکلنے والا ٹرانسمیٹر مشہدی کے حوالے کر دیا۔ کیا تمہارے کسی آدمی کے پاس ایسا ٹرانسمیٹر ہے؟ اور اگر یہ تمہارا ساتھی ہے تو پھر وہ ٹرک ڈرائیور بھی تمہارا ساتھی ہو گا' کیوں کہ ایسا ہی ایک ٹرانسمیٹر اس کی جیب سے بھی برآمد ہوا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ عدنان تمہارا دوست ہے یا دشمن!"

"میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ عدنان کے ٹرانسمیٹر سے "بپ بپ" کی

آواز آنے لگی۔ عدنان جھپٹ کر کھڑا ہوا مگر برڈ کے دوسرے گھونسے میں پھر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ٹرانسمیٹر مشہدی کے ہاتھ سے لے لیا۔ برڈ نے عدنان کے سینے پر رائفل کی نال رکھ دی تھی تاکہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے۔ میں نے ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔ "ہیلو۔ ہیلو۔ ایگل کالنگ۔ ہیلو اے۔ ایگل کالنگ!" ٹرانسمیٹر سے بہت دھیمی آواز آئی۔

"یس ایگل۔ اے ریسیونگ۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اس وقت کہاں ہو' اوور!"

"میں انہی لوگوں کے ساتھ ہوں اور ہم لوگ تیزی سے بارڈر کی طرف جا رہے ہیں' اوور۔"

"بارڈر تک پہنچنے میں تمہیں کتنی دیر لگے گی' اوور!"

"مشکل سے آدھا گھنٹہ اور لگے گا' اوور!" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے ساتھ ڈی نائین بھی تھا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا' اوور؟"

"اس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے' شاید ہارٹ اٹیک ہوا ہے' اوور۔"

"اس کا ٹرانسمیٹر اپنے قبضے میں لے لو۔" پھر بولنے والا چونک کر بولا۔ "مگر تم تو سفر کر رہے ہو؟ کیا تمہارے آس پاس کوئی نہیں ہے؟ اوور۔"

"تمہاری کال ملتے ہی میں فراغت کے بہانے گاڑی روک کر نیچے اتر آیا ہوں' اوور۔"

"ٹھیک ہے' اب بارڈر پر ملاقات ہو گی۔ ہاں مشہدی کے ساتھ کتنے آدمی ہیں' اوور۔"

"اس کے ساتھ نو آدمی ہیں اور دسواں وہ خود ہے۔ اگر ان کردوں کو بھی شامل کرا جائے تو یہ تعداد تیرہ ہو جاتی ہے' اوور۔"

"وہ کرد بے ضرر ہیں۔ مشہدی سے کہو کہ انہیں مزدوری دے کر فارغ کر دے مگر ا کے اپنے آدمیوں کی تعداد ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ ہے۔ تمہارا تو خیال تھا کہ ا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تین آدمی ہوں گے' پھر یہ نو آدمی۔"

"شاید آخری وقت میں مشہدی نے اپنا پروگرام تبدیل کیا ہے۔ ذرا محتاط رہنا۔ یہ کے نو آدمی بہترین فائٹر ہیں' اور جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح بھی ہیں۔ اب شاید تم رابطے کا موقع بھی نہ ملے' اوور۔"

"ٹھیک ہے' میں بندوبست کر لوں گا' اوور اینڈ آل۔"

میں نے بھی ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا اور عدنان کی طرف مڑا۔ اس کا چہرہ دھواں

رہا تھا۔ مشہدی بھی اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ پھر وہ جنونی انداز میں عدنان پر الٹ پڑا۔ "کمینے' غدار۔ تو مجھے ڈبل کراس کرے گا۔ مجھے ... تیری کھال کھینچ لوں گا۔" اس نے جھپٹ کر عدنان کے بال پکڑ لیے اور چیخ کر بولا۔ "کس کے لیے مجھے ڈبل کراس کر رہا ہے؟"

"مشہدی!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ تمہیں کس کے لیے ڈبل کراس کر رہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ تمہیں ڈبل کراس کر رہا ہے۔"

"یہ ریوالور مجھے دو۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے جہنم رسید کروں گا۔" مشہدی نے دانت پیس کر کہا۔

میں نے ریوالور اس کے حوالے کر دیا۔

اس نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا' پھر ایک دم میری طرف گھوم گیا اور چیخ کر بولا۔ "اس سے تو میں نمٹ لوں گا' پہلے تم سے چھٹکارا پا لوں۔" وہ ایک زقند میں میرے سر پر آگیا اور ریوالور کی نالی میری کنپٹی پر رکھ دی۔ "برڈ سے کہو کہ رائفل پھینک دے ورنہ ....."

"وہ جوش میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ میرے پاس بھی ریوالور ہے' اور ریوالور نہ بھی ہوتا تو میں بڑی آسانی سے اس کے قابو میں آنے والا نہیں۔ میں نے برڈ سے کہا کہ رائفل پھینک دو۔ برڈ نے رائفل پھینک دی تو مشہدی خود ہی میری تلاشی لینے لگا۔ یہی اس کی سب سے بڑی بھول تھی۔ وہ ذرا ذہانت سے کام لیتا تو پہلے مجھے بے ہوش کرتا' مگر وہ جوش میں عقل کو بالائے طاق رکھ چکا تھا۔

اس نے جونہی میری جیب میں ہاتھ ڈالا' میں اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھینتا ہوا دور نکل گیا۔ مشہدی کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر مجھ سے کہا۔ "میرے ستارے ہی گردش میں ہیں۔ اب بہتر ہے کہ تم مجھے گولی ہی مار دو۔"

"اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہم تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دیں گے مگر ابھی نہیں۔ پہلے اس خبیث سے نمٹ لوں۔" میں نے عدنان کی طرف اشارہ کیا۔

"اس پر وقت ضائع مت کرو۔" برڈ نے کہا۔ "اسے ختم کر دو اور آگے بڑھو۔" یہ کہہ کر اس نے رائفل اٹھائی اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اس کا رخ عدنان کی طرف کر دیا۔

عدنان بری طرح گڑگڑانے لگا۔ "مجھے مت مارو۔ مجھے مت مارو۔ میرے زندہ رہنے سے تم لوگوں کو فائدہ ہی ہو گا۔ پلیز' مجھے مت مارو۔" وہ بچوں کی طرح آنسو بہانے لگا۔ موت کو سامنے دیکھ کر بڑے بڑے سورماؤں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ وہ تو یوں بھی بزدل سا

ایک آدمی تھا۔

برڈ نے اس کی چیخ و پکار کی پرواہ کئے بغیر اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا' پھر ٹریگر دبانا چاہتا تھا کہ کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا' اور عدنان سے بولا۔ "تمہارے ساتھی وقت کہاں ہوں گے؟"

"وہ اس وقت بارڈر کے نزدیک گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔" عدنان نے جلدی جواب دیا۔

"بارڈر کراس کرنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟" برڈ نے سوال کیا۔

"دوسرا بارڈر پاکستان کا ہے مگر اس کے لیے ہمیں خاصا طویل سفر کرنا پڑے گا' مگر راستہ محفوظ ہو گا' کیوں کہ میرے ساتھی اور ایرانی انٹیلی جنس کے افراد ہمیں ترکی بارڈر پر تلاش کریں گے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم طویل سفر طے کر کے پاکستان بارڈر کی طرف جائیں گے۔"

"فرض کرو ہم پاکستان پہنچ بھی گئے تو وہاں سے نکلیں گے کیسے؟"

"وہاں سے نکلنا کیا مشکل ہے۔ میں وہاں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو نہ صرف وہاں سے کسی اور ملک میں پہنچا دیں گے بلکہ مناسب کمیشن پر سونا اور دوسرے جواہرات کا سودا بھی کرا دیں گے۔" عدنان نے جواب دیا۔

ڈینی اس دوران میں حیرت انگیز طور پر خاموش رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ بھاری بھر سیف کو لادے لادے پھرنے کی بجائے اسے خالی کرا کے یہیں کھائی میں پھینک دیا جائے۔ یہ سوچ کر میں نے برڈ سے کہا۔ "اب چونکہ بازی پلٹ چکی ہے اس لیے تمہارے دوست ڈینی کے خیالات بھی بدل چکے ہوں گے۔ اس بیچارے کو کیوں باندھ رکھا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے برڈ کو آنکھ ماری۔ "کھول دو اسے۔ اس کی طرف سے ہمیں اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

برڈ میرا مطلب سمجھ گیا' مگر ڈینی کو سنانے کے لیے بولا۔ "نہیں خرم! میں اسے نہیں کھولوں گا۔ تم اسے نہیں جانتے۔ یہ سانپ کی سی خصلت رکھتا ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دولت کی خاطر یہ مجھے بھی مرنے کے لیے چھوڑ جائے گا۔ ہم دونوں نے برسوں ایک دوسرے کے ساتھ کام کیا ہے۔ کئی موقعوں پر میں نے اس کی جان بھی بچائی۔ اس کا ڈینی نے یہ صلہ دیا کہ مجھے موت کے منہ میں چھوڑ کر چل دیا۔ تم خود سوچو' قسمت ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو اس وقت ہم کہاں ہوتے!"

"پچھلی باتوں کو بھول جاؤ برڈ!" ڈینی نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ "میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ میں اس مشہدی کی باتوں میں آ گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو پلیز!"

"برڈ میرے کہنے پر اسے معاف کر دو۔" میں نے اسے پھر آنکھ ماری۔

"ٹھیک ہے' تم کہتے ہو تو میں اسے کھول دیتا ہوں۔" برڈ نے بادل نخواستہ کہا اور آگے بڑھ کے ڈینی کو کھولنے لگا۔

"مجھے کچھ پینے کو دو۔" ڈینی نے دوران خون بحال کرنے کے لیے اپنے جسم کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

اس کی بات پر مجھے یاد آیا کہ ہم لوگ بھی کئی گھنٹوں سے بھوکے پیاسے ہیں۔ عدنان نے جلدی سے کہا۔ "گاڑی میں ایک باسکٹ اور سینڈوچز اور کافی کا تھرمس موجود ہے۔ اس کے علاوہ ڈیش بورڈ میں وہسکی کی دو بوتلیں بھی ہیں۔ میں نے احتیاطاً" رکھ لیا تھا یہ سامان؟"

برڈ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ واپسی میں اس کے ہاتھ میں کھانے کی باسکٹ اور بلیک ڈوگ کی ایک بوتل تھی۔ ڈینی نے ندیدوں کی طرح بوتل اس کے ہاتھ سے چھین لی' مگر میں نے اسے روک دیا' اور کہا کہ پہلے کچھ کھالو۔ خالی پیٹ میں نیٹ وسکی اتنا غفیل کر دے گی۔

باسکٹ میں اچھے خاصے سینڈوچز تھے۔ کافی کا بڑا سا ایک تھرمس بھی تھا اور دو مگ بھی موجود تھے۔ میں نے ایک مگ میں کافی انڈیلی اور اس کی مدد سے سینڈوچ حلق سے اتار لیے۔ ڈینی اور برڈ نے ایک ایک سینڈوچ کھایا اور بوتل پر ٹوٹ پڑے۔ ایک سینڈوچ میں نے عدنان کو بھی دیا۔ مشہدی حسرت بھری نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا' یہ شخص اس وقت ایک سینڈوچ کے لیے ہمیں حسرت بھری نظروں سے تک رہا ہے۔ چند گھنٹے پہلے اس کے اشارے پر انواع و اقسام کے کھانوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ مجھے اس پر رحم آگیا اور میں نے ایک سینڈوچ اسے بھی دے دیا۔ پھر ایک مگ میں کافی انڈیل کر اس کی طرف بڑھا دی۔

اب اچھی خاصی دھوپ نکل آئی تھی۔ وہ تینوں کرد ابھی تک بے ہوش تھے۔ میں نے عدنان سے کہا۔ "تم ٹرک کا سامان گاڑی میں منتقل کر دو میں ڈینی اور برڈ کے ساتھ وہ سیف نیچے اتارتا ہوں۔"

"سیف اتارنے کی کیا ضرورت ہے؟" عدنان نے کہا۔

"اگر ہمیں عجلت میں یہاں سے بھاگنا پڑا تو سیف کو دوبارہ لوڈ کرنا مشکل ہو گا۔ اسے ٹرک ہی میں رہنے دو بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں ٹرک ہی میں سفر کرنا چاہیے۔ گاڑی میں وہ سارا سامان آئے گا بھی نہیں۔"

"مگر تم شاید یہ بھول گئے کہ یہ ٹرک ایرانی فضائیہ کی نظروں میں آ چکا ہے۔"

"ایران میں ایسے ٹرک لاکھوں کی تعداد میں ہیں' پھر بھی احتیاطاً موقع ملتے ہی ہم ٹرک تبدیل کر لیں گے' مگر نوشکی تک ہم ٹرک ہی میں سفر کریں تو مناسب ہو گا۔ اس روٹ پر دن رات ٹرک چلتے رہتے ہیں۔ چھوٹی گاڑیاں تو اکا دکا ہی نظر آتی ہیں۔ ہماری گاڑی خواہ مخواہ لوگوں کی نظروں میں آ جائے گی۔"

اس کی بات میں وزن تھا اس لئے میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ڈینی کی حالت اب بہتر تھی۔ وہ پہلے کی طرح چاق و چوبند دکھائی دے رہا تھا' وہسکی پینے کے بعد برڈ بھی ترنگ میں تھا' مگر میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ پہلے سے بھی زیادہ چوکنا ہو گا۔

میں نے ڈینی سے کہا۔ "تم بیکار بیٹھنے کی بجائے اپنا کام شروع کر دو۔ میں جلد از جلد اس بھاری بھرکم سیف سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔"

"اوکے باس!" ڈینی نے خوش دلی سے کہا۔ "میں ابھی سیف کھولے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ٹرک کے اندر داخل ہو گیا۔

مجھے ان بے ہوش کردوں کی بھی فکر تھی۔ وہ ہوش میں آ کر یقیناً ہنگامہ کریں گے۔ میں خواہ مخواہ ان کی جان لینا نہیں چاہتا تھا۔ برڈ پر تو جیسے خون سوار تھا۔ وہ چھوٹتے ہی انہیں گولی مار دیتا۔ پھر خوراک کا بھی مسئلہ تھا۔ اگر ہمیں وہاں ایک دن مزید لگ جاتا تو فاقوں کی نوبت آ جاتی۔ ان بے آب و گیاہ چٹانوں میں تو کوئی ایسا درخت بھی نہیں تھا جس کے پھل کھا کر ہم پیٹ کی آگ بجھاتے۔ میں' مشہدی' اور عدنان کو بھی زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ عدنان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔ مشہدی کے لئے بھی یہ علاقہ اجنبی نہیں تھا' پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ دونوں مقامی زبان سے واقف تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی یعنی میں' برڈ اور ڈینی مقامی زبان نہیں جانتا تھا۔ یہی ہماری سب سے بڑی کمزوری تھی۔ بہت دیر تک اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان کردوں سے کام لوں گا۔ ان میں سے کوئی تو انگلش سمجھتا ہو گا۔ ممکن ہے وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ میں نے برڈ کو اپنے پاس بلایا' اور اس سلسلے میں اس سے بھی مشورہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کرد شاید ہی ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوں' کیوں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کا ایک ہم قوم ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

"میں نے برڈ سے کہا' پھر بھی ایک کوشش کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ ممکن ہے وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو ہی جائیں۔"

"ان کردوں کو ہوش میں لانے کے لئے پانی کی ضرورت تھی۔ میں نے برڈ سے کہا' ہمیں آس پاس کا جائزہ لینا چاہئے' ہو سکتا ہے یہاں کہیں نزدیک ہی کوئی چشمہ ہو۔"

میری بات شاید ڈینی نے بھی سن لی تھی۔ اس نے وہیں سے چیخ کر کہا۔ "ڈرائیور والے کیبن کے اوپری حصے میں پانی کا ٹینک موجود ہے۔ شاید اس میں پانی بھی ہو!"

"برڈ بندر کی سی پھرتی سے ٹرک پر چڑھا' اور تھوڑی دیر میں وہاں سے چیخ کر بولا۔ پانی کا ٹینک بھی لبالب بھرا ہوا ہے۔"

میں نے کافی کے ایک مگ میں پانی لے کر باری باری بیہوش کردوں کے چہرے پر چھینٹے دیئے۔ ان کے سروں پر شاید زیادہ ہی چوٹ لگ گئی تھی۔ وہ لوگ بہ مشکل تمام ہوش میں آئے اور تینوں مشینی انداز میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔

میں نے انگلش میں بہت رک رک کر پوچھا۔ "تم میں سے کوئی انگلش جانتا ہے؟؟"

"لیس آئی نو۔" ان میں سے ایک جلدی سے بولا۔ بٹ ویری لٹل۔"

"او کے او کے۔" میں نے جواب دیا۔ "بس فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔"

پھر میں نے بہت ٹھہر ٹھہر کر اسے بتایا کہ میں' اور برڈ خواہ مخواہ اس بکھیڑے میں پھنس گئے۔ ہم تو ایران گھومنے آئے تھے۔ میری صرف ایک بہن ہے جو اس وقت بہ قول مشہدی کے' اس کے قبضے میں ہے۔ اسی بنیاد پر وہ مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ ٹرک ڈرائیور کو بھی قتل کرنے کا حکم اسی نے دیا تھا۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں تمہیں اتنا انعام دوں گا کہ تم نے خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا۔"

کرد نے ٹوٹی پھوٹی' فارسی آمیز انگلش میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم تینوں مزدور ہیں' ٹرک ڈرائیور نے ہمیں بھاری معاوضہ دینے کا وعدہ کیا تھا ورنہ ہم رات کے اس پہر کبھی اس کے ساتھ نہ آتے۔ اس نے کہا تھا کہ یہ سرکاری کام ہے اس لئے کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ہم اس مصیبت میں پھنس گئے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تم لوگوں نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ ہمیں انعام وغیرہ سے دلچسپی نہیں ہے۔ بس ہمیں یہاں سے جانے دو تو تمہاری مہربانی ہو گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اور میرے ساتھی اپنی زبان بند رکھیں گے۔

اس کی باتیں اس لئے بھی میرے پلے پڑ گئیں کہ اردو میں بھی فارسی کے بے شمار الفاظ استعمال ہوتے ہیں' پھر اسکول کے زمانے میں میں نے تھوڑی بہت فارسی پڑھی بھی تھی۔ برڈ یا ڈینی قیامت تک وہ عجیب و غریب انگلش نہیں سمجھ سکتے تھے۔

"تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے کرد کو جواب دیا۔ "یہ مشہدی اور عدنان بہت بڑے چور ہیں۔ میں تمہیں بلا جواز روکوں گا بھی نہیں۔ میری طرف سے تم لوگ آزاد ہو۔ چاہو تو ابھی چلے جاؤ' مگر میرے لئے یہ علاقہ اجنبی ہے۔ میں صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے نکلنے میں میری مدد کرو۔ میں تمہیں انعام کا لالچ نہیں دے رہا ہوں بلکہ درخواست کر رہا ہوں۔" میں نے حتی الامکان لہجے کو پر اثر بنانے کی کوشش کی تھی۔

"یو مسلم؟" اس نے پوچھا۔

"الحمد للہ۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ترک؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"نو" میں نے نفی میں سرہلایا اور کہا۔ "پاکستانی۔"

وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا اور پرجوش انداز میں بغل گیر ہو گیا اور بولا۔ "تم میرے پاکستانی بھائی ہو' میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔" پھر وہ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف مڑا اور جلدی جلدی ان سے کچھ کہنے لگا۔ شاید انہیں بھی اس نے یہی بتایا ہو گا' کہ یہ ہمارا پاکستانی بھائی ہے۔ وہ دونوں بھی باری باری مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ ان کے کپڑے غلیظ اور بدبودار تھے' مگر جذبوں میں خلوص کی مہک تھی۔ وہ سادہ سے محنت کش تھے' اور ٹرک ڈرائیور کی وجہ سے اس ناگہانی افتادہ میں گھر گئے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچی۔ ورنہ برڈ تو انہیں بھی ٹھکانے لگانے کے درپے تھے۔

برڈ نے حیرت سے بدلی ہوئی صورت حال کو دیکھا۔ اس دوران میں وہ مشہدی اور عدنان دونوں کو باندھ چکا تھا۔

برڈ پہلے تو ہم لوگوں کو حیرت سے دیکھتا رہا پھر مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ "کیا بات ہے خرم!" وہ خوش دلی سے بولا۔ "کیا جادو کی چھڑی پھر دی ہے ان بندروں پر؟"

"یار یہ تو بیچارے سیدھے سادے مزدور ہیں۔ ان کا مشہدی یا عدنان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان میں سے ایک بندر عباس پر مزدوری کرتا رہا ہے اس لئے تھوڑی بہت انگلش بول لیتا ہے۔ میں نے انہیں یہی بتایا ہے کہ مشہدی نے دھوکے سے ہمیں پھنسایا ہے۔ اب یہ ہماری مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

"مگر یار' یہ گلے تو یوں مل رہے تھے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ملے ہوں۔" برڈ نے ہنس کر کہا۔

"یہ میرا نہیں بلکہ میرے ملک کا کمال ہے۔" یہ کہتے ہوئے نہ جانے کیوں میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ میں نے آج تک ملک کے لئے کوئی کام نہیں کیا۔

"تمہارے ملک کا کمال!" برڈ نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں' یہ پاکستان اور پاکستانیوں کو بہت اچھا سمجھتے ہیں اور۔"

ڈینی کے ہیجان خیز قہقہے نے مجھے خاموش کر دیا۔ وہ چیختا ہوا ٹرک سے باہر نکلا' اور پرجوش انداز میں بولا۔ "کام ہو گیا خرم! میں نے سیف کھول لیا۔"

"او نو۔" برڈ نے بے یقینی سے کہا اور ٹرک کی طرف جھپٹا۔

"ابھی تک دنیا میں کوئی ایسا تالا ایجاد نہیں ہوا جسے ڈینی نہ کھول سکے۔" اس کا لہجہ

مرور تھا۔

اس دوران میں برڈ چھلانگ مار کے ٹرک میں گھس گیا' اور دوسرے ہی لمحے وہ چیختا ہوا باہر نکلا۔ "جھوٹ بولتے ہو تم! سیف ابھی تک بند ہے۔"

"ہاں' ابھی میں نے جان بوجھ کر اسے بند کر دیا۔ اس کے نمبر میری کھوپڑی میں محفوظ ہیں۔ پہلے میں تم دونوں سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا معاہدہ؟" برڈ نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔

"میں بھی اس خزانے میں برابر کا حصہ دار ہوں۔" ڈینی نے برڈ کی برہمی کو نظرانداز کرتے ہوئے سکون سے کہا۔ "ہم اس خزانے کے تین برابر حصے کریں گے اور ......"

"نہیں۔" برڈ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں صرف اتنا ہی ملے گا جو تم سے طے ہوا تھا۔ میں تو وہ بھی نہ دیتا کیوں کہ تم نے برسوں کی دوستی کو پل بھر میں فراموش کر دیا۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں تمہیں معاہدے کے مطابق معاوضہ دے رہا ہوں' اور میرے خیال میں وہ رقم بھی کم نہیں ہے۔ ڈینی نے نفی میں سرہلایا۔ "میں برابر کا حصہ لوں گا ورنہ اس سیف اور خزانے کو بھول جاؤ۔ ایک بات سمجھ لو۔ سیف گن میٹل سے تیار کیا گیا ہے اور اسے ڈائنا میٹ سے اڑایا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ خزانہ بھی خاک میں ہو جائے گا جو اس میں محفوظ ہے' بولو کیا کہتے ہو؟"

برڈ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے گھورتا رہا' پھر اچانک اس کے منہ پر اتنا زور دار تھپڑ مارا کہ وہ الٹ کر گر گیا۔ "حرامزادہ' بلیک میل کرے گا ہمیں۔" برڈ نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔ "تیرے تو فرشتے بھی کھولیں گے وہ سیف' اور اب تجھے ایک پائی بھی نہیں ملے گی۔"

ڈینی کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ وہ گہرے گہرے سانس لیتا ہوا بولا۔ "تو شاید بھول گیا کہ میرا نام ڈینی ہے۔ تو ڈاکے کا وہ کیس بھی بھول گیا جس میں ایڈون کی وجہ سے ہم سب پکڑے گئے تھے۔ سیف میں نے کھولا تھا' اور ہیرے بھی میں نے ہی چھپائے تھے۔ پولیس نے تشدد کی انتہا کر دی تھی مگر وہ مجھ سے کچھ اگلوا پائے تھے؟"

"مجھے سب یاد ہے۔" برڈ نے دانت پیس کر کہا۔ "مگر میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔ یہ فکر نہیں کروں گا' کہ تو مرتا ہے یا زندہ رہتا ہے' یا تو سیف کھولے گا' یا پھر تجھے زندگی بھر کے لئے معذور کر کے ہم یہیں چھوڑ جائیں گے۔"

"زیادہ مناسب یہی ہے۔" میں نے ڈینی کو خوف زدہ کرنے کے لئے کہا۔ "اگر یہ سیف کھول دے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے ہاتھ پیر توڑ کر یہیں پھینک دینا۔ ہمارے پاس سونا بھی اتنا ہے کہ اسی سے ہم دونوں کروڑ پتی ہو سکتے ہیں۔"

ڈینی کے چہرے پر پہلی بار مایوسی کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں اربوں ڈالر کے اس خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں؟"

"نہیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہمارے لئے وہ سونا ہی بہت ہے جو اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔" پھر میں برڈ سے مخاطب ہوا۔" اگر یہ پندرہ منٹ کے اندر اندر سیف نہ کھولے تو اس کی بائیں ٹانگ ناکارہ کر دینا۔ رائفل کے ایک ہی فائر سے اس کی ٹانگ کے پرخچے اڑ جائیں گے۔

"میرا لہجہ حد درجے سفاک تھا۔" اگر یہ زندہ رہ جائے تو ٹھیک پندرہ منٹ بعد اس کی دوسری ٹانگ بھی ناکارہ کر دینا۔ پھر باری باری دونوں ہاتھ بھی توڑ دینا مگر اسے مرنے مت دینا۔ جب تک یہ زندہ رہے گا' ہمیں یاد کرتا رہے گا۔"

"اوکے باس۔" برڈ نے ہنس کر کہا اور آستین اوپر سرکا کر کلائی کی گھڑی دیکھنے لگا۔

میں نے ڈینی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی تھی' اور سردی کے باوجود اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ اس نے بھی اضطراری انداز میں ایک دفعہ گھڑی دیکھی' پھر وحشت زدہ انداز میں برڈ کو گھورنے لگا۔ وہ اپنی زبان بند رکھ کر امریکن پولیس کو بلیک میل کر سکتا تھا' ہم نے تو اسے باور کرا دیا تھا کہ اس خزانے سے ہمیں کوئی دلچسپی ہے ہی نہیں۔ اس کی بے چینی اور اضطراب بے جا نہیں تھا۔ ان پہاڑوں میں اس وقت موت کا سا سکوت تھا۔ وہ تینوں کرد بھی خاموش تھے اور صورتحال سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مشہدی' اور عدنان بھی خاموشی اور اضطراب سے باری باری مجھے اور برڈ کو دیکھ رہے تھے۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد برڈ نے شانے سے لٹکی ہوئی رائفل اتاری اور اس کی نالی کا رخ ڈینی کی طرف کر کے جھٹکے سے اسے لوڈ کیا۔ پھر وہ ٹریگر دباتا ہی چاہتا تھا کہ ڈینی اور مشہدی ایک ساتھ چیخ اٹھے۔ "ٹھہرو!"

برڈ نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا' میں نے فائر نہ کرنے کا اشارہ کیا' اور مشہدی سے بولا۔ "تمہیں کیا پریشانی ہے؟ رائفل کا رخ تمہاری طرف نہیں بلکہ ڈینی کی طرف ہے۔"

"اگر تم نے ڈینی کو ہلاک کر دیا تو سیف کبھی نہ کھل سکے گا۔"

"جہنم میں جائے سیف۔" میں غرایا۔ "تمہاری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے اس کے باوجود تمہیں سیف کی فکر ہے۔ اس وقت تو کم از کم کلمہ پڑھ لو۔"

"مشہدی ہذیانی انداز میں ہنسنے لگا۔" ایک لمحے کو مجھے ایسا لگا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ وہ ہنستے ہنستے بولا۔ "میرے ساتھ یہ بلف نہیں چلے گا خرم! مجھے مار کے تم خود بھی یہاں سے زندہ سلامت نہ نکل سکو گے۔ اور تم یہ کیوں بھول گئے کہ تمہاری بہن بھی میرے قبضے میں ہے۔ اگر تم یہاں سے بچ بھی نکلے تو شہلا کو کبھی نہ پا سکو گے۔"

اس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے آگے بڑھ کے اس کی پسلیوں میں

زور دار ٹھوکر رسید کی اور چیخ کر بولا۔ "حرام زادے! مت لے گندی زبان سے میری بہن کا نام۔ وہ کوئی بٹن نہیں ہے جسے تو نے کسی ڈبیا میں چھپا رکھا ہے۔ میں خود اسے تلاش کر لوں گا۔ اب ڈینی سے پہلے تجھے' اور تیرے اس گرگے کو جہنم رسید کروں گا۔" میں نے عدنان کی طرف اشارہ کیا' پھر ڈینی سے مخاطب ہوا۔ "ہاں' تو بولو کیا کہنا چاہ رہے تھے۔"

"میں سیف کھولنے کو تیار ہوں۔" ڈینی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مگر مجھے میرا معاوضہ تو دے دینا۔"

"ایک پیسا نہیں ملے گا تمہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "سیف کھولو گے تو اس کے بدلے تمہاری جان بخشی کر دی جائے گی۔"

ڈینی بوجھل قدموں سے ٹرک کی طرف بڑھ گیا۔ برڈ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

تھوڑی دیر بعد ڈینی ٹرک کے پچھلے حصے سے یوں برآمد ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے برڈ تھا۔ برڈ نے دھکیل کر اسے ٹرک سے باہر پھینک دیا اور مجھ سے بولا۔ "خرم! اوپر آ جاؤ' سیف کھل چکا ہے۔"

مجھے خزانے کی ہوس تو نہیں تھی' مگر تجسس ضرور تھا کہ دیکھوں اس خزانے میں ہے کیا؟ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا' پھر مطمئن ہو کر ٹرک میں داخل ہو گیا۔ سیف کے اندر نظر ڈالی تو میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ اتنے بڑے بڑے اور خوبصورت ہیرے میں نے زندگی میں کبھی دیکھے ہی نہیں تھے' بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ہیرے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ سیف کے ایک خانے میں فش ایکیورم کی طرح کے شیشے کا ایک بکس تھا جس میں پتھروں کی طرح ہیرے بھرے ہوئے تھے۔ سیف کے دوسرے خانے میں شاہی خاندان کے بیش قیمت زیورات تھے اور سب سے نچلے خانے میں کاغذات تھے جو بہت خوبصورت نفیس چرمی فولڈرز میں رکھے ہوئے تھے۔ سیف کے نزدیک ہی مجھے بڑا سا ایک ٹورسٹ بیگ دکھائی دیا۔ ویسا ہی ایک بیگ برڈ کے ہاتھوں میں تھا۔ اس قسم کے بیگ وہ سیاح استعمال کرتے ہیں جو بے سرو سامانی کی حالت میں دنیا کے سفر پر نکلتے ہیں۔ ان بیگ میں سیاحوں کی ضرورت کا ہر سامان ہوتا ہے۔ شاید مشہدی یا عدنان نے احتیاطاً وہ بیگ ٹرک میں رکھوا دیئے ہوں گے۔

برڈ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس کے جی میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ ان تھیلوں میں ہیرے بھرنے لگا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ہیروں کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا ہو۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"یار خرم' میں احتیاطاً یہ کر رہا ہوں۔ نہ جانے آئندہ کیا صورت حال ہو۔ ممکن ہے ہمیں عجلت میں یہاں سے فرار ہونا پڑے۔ یہ میرے کم از کم زاد راہ کے طور پر کام تو

آئیں گے۔" وہ اپنا کام کرتے ہوئے بولا۔

ہیرے وہ آدھے آدھے دونوں تھیلوں میں ڈال چکا تھا۔ اب زیورات کو بھی اسی طرح تقسیم کر رہا تھا۔ کام مکمل کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ "اب دونوں میں سے کوئی ایک سا بیگ تم لے لو۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میری بات غور سے سنو۔" برڈ نے کہا۔ "ہم ڈینی' مشہدی اور عدنان کو سونے کے اس ذخیرے سمیت یہیں چھوڑ جائیں گے۔ ٹرک کی بجائے کسی کار یا جیپ میں سفر کرنا ہمارے لئے ہر طرح مناسب ہے۔"

"مگر یہاں کے راستے!"

"راستوں کے لئے اسی کرد کو ساتھ لے لیں گے جو انگلش سمجھ لیتا ہے' بقیہ دو کو جانے دو۔ وہ اس علاقے کے رہنے والے ہیں اس لئے انہیں زیادہ پریشانی نہیں ہو گی۔"

میں نے برڈ کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ان بے آب و گیا چٹانوں میں تو ہم بھوکے پیاسے ہی مر جاتے۔ میں نے کچھ سوچ کر سیف کے کاغذات والے خانے سے چرمی فولڈر نکالے اور ان میں سے کاغذات نکال کر ٹورسٹ بیگ میں ٹھونس لئے اور نیچے اتر آیا۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا' اور میں دوبارہ ٹرک میں چڑھ گیا۔ سیف کے ساتھ ساتھ ٹرک میں مضبوط لکڑی کے بڑے بڑے گیارہ بکس بھی رکھے تھے۔ وہ بھی مقفل تھے مگر ان کے تالے بھاری ہتھوڑے کی ایک ضرب سے ٹوٹ سکتے تھے۔ تالا نہ بھی ٹوٹا تو بکس کا ڈھکنا ٹوٹ جاتا۔ میں نے تالا توڑنے کے لئے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں' مجھے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی۔ میں یہ کام ان کردوں سے بھی لے سکتا تھا' مگر یہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں سونے کی موجودگی کا علم ہو۔ سونے کا وہ انبار دیکھ کر ممکن ہے ان کی نیت بدل جاتی' اور خواہ مخواہ اپنی جان سے جاتے۔ میرا ارادہ تھا کہ صرف ایک بکس کھولوں اور اسے ان تینوں کردوں میں بانٹ دوں۔

مجھے وہیل کھولنے والا بھاری پانہ نظر آ گیا۔ میں نے اسی کے ذریعے تالا توڑ لیا۔ بکس کھلتے ہی میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ بکس سونے کے کیوبس سے لبالب بھرا ہوا تھا' اور میرا اندازہ تھا کہ اس کی مالیت کم از کم دس لاکھ امریکن ڈالر ہو گی۔ بکس اتنا بھاری تھا کہ ایک آدمی تو اسے اٹھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

میں نے آواز دے کر برڈ کو بلایا' اور اس سے کہا کہ میں یہ سونا ان کردوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔

سونا دیکھ کر برڈ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں۔ اس نے پرخیال انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے' یہ بکس ہم ان کردوں میں تقسیم کر دیں گے اور بقیہ سونا کہیں چھپا دیں

گے۔ زندگی میں کبھی موقع ملا تو ہم میں سے کوئی اسے دوبارہ نکال لے گا۔"

"نگران کردوں کو علم نہ ہو کہ یہ سونے سے بھرے ہوئے بکس ہیں۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اس بکس کا سونا نکال کر ان کے حوالے کر دو اور بکس کو کسی کھائی میں پھینک دو۔"

"مشہدی' عدنان اور ڈینی کا کیا کرنا ہے؟" برڈ نے یوں پوچھا جیسے وہ بھی کوئی سامان ہوا۔

"انہیں ہم یہیں چھوڑ جائیں گے۔ ان کی زندگی ہو گی تو بچ جائیں گے ورنہ یہیں ختم ہو جائیں گے۔" پھر اچانک مجھے اپنے اس سوٹ کیس کا خیال آیا جو میں مشہدی کے تہران والے بنگلے میں چھوڑ آیا تھا۔ میں ایک بار پھر وہاں جانا چاہتا تھا۔ مجھے سوٹ کیس کی فکر نہیں تھی' مگر ایک موہوم سے امید تھی کہ شاید وہاں سے شہلا کا کوئی سراغ مل سکے۔ وہاں کے لوگوں کو اب تک یہ علم نہیں ہوا ہو گا کہ مشہدی ہمارے خلاف ہو گیا ہے۔ محل کی چھت پر جہاز کی پرواز سے قبل جو لوگ برڈ کے ہاتھوں مارے گئے تھے ان کے بارے میں سمجھا گیا ہو گا کہ انہیں شاہ کے محافظوں نے ہلاک کیا ہے۔ میں نے برڈ کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو وہ بھڑک اٹھا۔ "پاگل ہو گئے ہو خرم! تم دوبارہ موت کے منہ میں جانا چاہتے ہو؟ حکومت کو اب تک علم ہو گیا ہو گا کہ اس ڈکیتی میں مشہدی کا ہاتھ ہے۔ مشہدی کا بنگلا اس وقت پولیس کی تحویل میں ہو گا' اور وہاں جتنے بھی افراد موجود ہوں گے ان سب کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہو گا۔ ان لوگوں کو ہمارے بارے میں بھی بتا دیا ہو گا۔ پولیس کے تشدد کے سامنے وہ لوگ بھلا کتنی دیر اپنی زبان بند رکھ سکتے ہیں۔ نہ صرف ہمارے نام پولیس کے علم میں ہوں گے بلکہ حلیئے بھی مشتہر کر دیئے ہوں گے۔ ہمیں پہچاننا تو یوں بھی آسان ہے کہ ہم غیر ملکی ہیں۔" برڈ نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

میں نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ برڈ اس معاملے میں خاصا دور اندیش ثابت ہوا تھا۔

"کہیں تمہیں اس خوبصورت لڑکی رضوانہ کی یاد تو نہیں ستا رہی؟" برڈ نے ہنس کر پوچھا۔ "بڑی قیامت چیز ہے وہ بھی' مگر تمہاری زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہے۔"

"ارے یار لعنت بھیجو اس پر۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "ایسی قیامت کی وجہ سے میں اس عذاب میں پھنسا ہوں۔ مجھے تو صرف اپنی بہن کی فکر ہے۔"

"یار خرم! اتنے عرصے سے میں تمہاری بہن کا تذکرہ سن رہا ہوں۔ آخر یہ قصہ کیا ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھے بتا دو۔" برڈ نے اپنائیت سے کہا۔

میں نے طویل سانس لیا اور اسے مختصراً" اپنے اور شہلا کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں نے گھر کیوں چھوڑا تھا' بس وہی پرانی داستان دہرا دی کہ

والدین کے مرنے کے بعد میں نے شہلا کو ساتھ لیا' اور گھر سے روانہ ہو گیا۔

برڈ بہت محویت سے میری داستان سن رہا تھا۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ پرجوش لہجے میں بولا۔ "تمہاری بہن آج سے میری بھی بہن ہے۔ میں اسے ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کروں گا اور اگر تم پسند کرو گے تو ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ میری داستان بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ تمہارا ایک فیملی بیک گراؤنڈ ہے' باعزت ماں باپ کے بیٹے ہو۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرا باپ کون تھا۔ گیارہ سال کی عمر تک میں ماں کے ساتھ رہا' پھر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میری ماں اچھی عورت نہیں تھی خرم!" برڈ کی آواز بھرا گئی۔ "وہ کسی ہوٹل میں ویٹریس تھی' چاہتی تو اپنی محنت کی کمائی پہ قناعت کر سکتی تھی مگر وہ بہت خوبصورت تھی اس لئے اپنے حسن اور جسم کو کیش کرانے میں کوئی عار نہیں سمجھتی تھی۔" یہ کہتے کہتے برڈ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ماں تو میری بھی پارسا نہیں تھی' مگر مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ برڈ کی طرح اس کا اقرار کرتا۔ میں نے برڈ کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "پرانی باتوں کو بھول جاؤ دوست! ہم اب ایک نئی دنیا تعمیر کریں گے۔ چلو اب اٹھو' یہ سونا ان کردوں میں تقسیم کر دو اور سونے کے بھرے ہوئے صندوق چھپانے کے لئے بھی کوئی جگہ تلاش کرو۔ رات ہونے سے پہلے میں یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔"

برڈ نے ٹرک میں پڑی ہوئی میلی سی چادر پر سونے سے بھرا ہوا وہ صندوق الٹ دیا۔ چشم زدن میں وہاں سونے کا ڈھیر لگ گیا۔ میں نے برڈ سے اس سونے کی تین برابر ڈھیریاں بنانے کو کہا اور خود باہر نکل آیا۔ مشہدی' عدنان اور ڈیفی اسی طرح بندھے پڑے تھے۔ تینوں کرد کچھ فاصلے پر بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

جب میں نے ان کردوں کو وہ سونا دیا تو مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بہت دیر تک وہ سکتے کی سی کیفیت میں سونے کے ان ٹکڑوں کو گھورتے رہے' پھر دیوانہ وار میرے ہاتھ چومنے لگے' میرے پاؤں پکڑنے لگے۔ ان میں سے ایک بری طرح رو رہا تھا مگر یہ خوشی کے آنسو تھے۔ بہت زیادہ خوشی بھی انسان سے برداشت نہیں ہوتی۔

کافی دیر بعد جب ان لوگوں کے اوسان بحال ہوئے تو انہوں نے اسی چادر کے تین حصے لئے اور اپنے اپنے سونے کی پوٹلی بنا لی۔ مشہدی یہ سب کارروائی دیکھ رہا تھا اور ہمیں گالیاں بک رہا تھا۔

وہ اچانک مجھ سے مخاطب ہوا۔ "خرم! یہ برڈ تو ہے ہی ولدالحرام' مجھے تو تو بھی حرام زادہ لگتا ہے' تیری رگوں میں بھی کسی شریف آدمی کا خون نہیں تھا۔ اب تو اگر میں بچ بھی گیا تو تیری بہن کو تیرے حوالے نہیں کروں گا۔ جس دولت کے لئے میں نے اپنی زندگی' اپنا مستقبل داؤ پر لگایا' بے شمار لوگوں کا خون کیا' اسے تو یوں لٹا رہا ہے۔ میں تیری بہن کو

......"

"مشہدی" میں نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی۔ "اب تیری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو تیری کھوپڑی کے پرخچے اڑا دوں گا۔"

مشہدی کے اعصاب شاید جواب دے چکے تھے یا وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ اس نے پھر میری ماں کو گالی دی اور مجھے ولدالحرام کہا۔ میں بھی غصے میں ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ میں نے رائفل اٹھائی اور اس سے پہلے کہ برڈ کچھ سمجھ سکتا۔ میں نے مشہدی کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ دوسرا فائر میں نے عدنان کی کھوپڑی پر کیا۔ فائروں کے دھماکوں اور ان دونوں کرب ناک چیخوں سے ایک لمحے کو وہ پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

مجھ پر اس لمحے خون سوار تھا۔ میرے تیور دیکھ کر ڈینی گڑگڑانے لگا۔ خرم .... دیکھ مجھے .... مت مارنا ...... میں نے تو تمہاری بات .... ماننے سے انکار نہیں کیا۔"

میں نے رائفل کی نالی جھکا لی اور بھاری لہجے میں بولا۔

"تمہارا فیصلہ برڈ کرے گا۔ تم اسی کے دوست تھے نا!"

"برڈ تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں اس کی عادت جانتا ہوں۔ وہ ڈبل کراس کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔" برڈ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ابھی تک محض اس لئے بچے ہوئے تھے تم کہ خرم تمہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے تو میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے رائفل سیدھی کی اور ڈینی کے سینے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہوئی اور پسلیاں توڑتی ہوئی پشت سے نکل گئی۔ اس کی آخری چیخ بہت بھیانک تھی۔ تینوں کرد بھی سہمے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انگلش کہنے والے کرد سے کہا۔ "تم ہمارے ساتھ ٹھہرو' ان دونوں کو جانے دو۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔" پھر میں چونک کر بولا۔ "یار' تم نے اب تک مجھے اپنا نام بھی نہیں بتایا۔"

"آپ نے پوچھا ہی کب تھا؟" اس نے ٹوٹی پھوٹی ہوئی انگلش میں کہا۔ "میرا نام محمد رضا ہے۔"

"ٹھیک ہے' ان دونوں سے کہو کہ اب روانہ ہو جائیں۔"

وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کچھ کہنے لگا۔ وہ دونوں اقرار میں سر ہلاتے رہے' پھر ان دونوں نے اپنی پوٹلیاں اٹھائیں' مجھ سے اور برڈ سے بغل گیر ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد ہم بھی اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ ایک ایک ٹورسٹ بیگ ہم نے

اپنی پشت پر لاد لیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ بیگ کچھ زیادہ ہی بھاری ہے۔ میں نے برڈ کی طرف دیکھا۔

وہ شاید میرا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ میں کیا پوچھنا چاہ رہا ہوں' جلدی سے بولا۔ "میں نے ان بیگز میں بکس میں سے نکلا ہوا کچھ سونا بھی ڈال دیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم وہ گاڑی استعمال کریں جو عدنان لایا تھا۔" برڈ نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"پھر ہم گاڑی کی طرف بڑھے ہی تھے کہ فضا ہیلی کاپٹر کے انجن کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ میں نے گھبرا کر دیکھا' وہاں ایک نہیں بلکہ تین ہیلی کاپٹر تھے۔ ابھی وہ ہم سے خاصے فاصلے پر تھے مگر عین ممکن تھا کہ ہمیں دیکھ لیا گیا ہو۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "برڈ! جلدی کرو۔ شاید ہمیں دیکھ لیا گیا ہے' بھاگو..... ہمیں پیدل ہی بھاگنا ہو گا۔ گاڑی میں تو وہ ہمیں آسانی سے شکار کر لیں گے۔"

○

ہم لوگ اپنے اپنے ٹورسٹ بیگ پیٹھ پر لاد کر کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں دوڑ پڑے۔ غلطی ہم سے یہ ہوئی تھی کہ ہم نے گاڑیاں تو پہاڑ کے قدرتی سائبان تلے چھپا دی تھیں مگر خود کھلے آسمان کے نیچے آ گئے تھے۔ میرے پاس دو ریوالورز تھے' میں نے ایک دور مار رائفل بھی اٹھا لی تھی۔ ایک ایک رائفل رضا اور برڈ کے ہاتھ میں بھی تھی۔

برڈ نے بھاگتے بھاگتے کہا۔ "اس کرد سے پوچھو' یہ رائفل چلا سکتا ہے؟"

رضا نے میرے پوچھنے سے پہلے ہی جواب دیا۔ "ہاں میں رائفل چلا سکتا ہوں۔" شاید وہ برڈ کے جملے کا مفہوم اندازے سے سمجھ گیا تھا۔ "میرا نشانہ اچھا نہیں ہے مگر اتنا برا بھی نہیں ہے۔" رضا نے بھاگتے ہوئے کہا۔

بھاگتے بھاگتے ہمیں چٹانوں میں ایک دراڑ سی دکھائی دی۔ برڈ اس دراڑ کی طرف بڑھا' مگر میں نے اسے روک دیا۔ "اس دراڑ میں تو ہم ہر طرف سے محصور ہو کر جائیں گے۔" مشکل یہ تھی کہ ہیلی کاپٹر میں آنے والوں کو ہماری تعداد کا علم بھی ہو گیا ہو گا۔ انہیں دھوکا بھی نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ہم اس دراڑ کے پاس ایک لمحے کو رکے' پھر آگے کی طرف بھاگ لیے۔

بھاگتے بھاگتے رضا نے کہا۔ "ہمیں بلندی پر جا کر پوزیشن سنبھالنا چاہیے۔"

اس کا مشورہ مناسب تھا بلندی پر رہ کر ہم زیادہ بہتر طریقے سے اپنا دفاع کر سکتے تھے' مگر یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ حملہ آور ہیلی کاپٹروں سے باہر آ کر مقابلہ کرتے۔ اگر وہ ہیلی کاپٹروں سمیت ہمارے سروں پر پہنچ جاتے تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بہت آسانی سے ہمیں شکار کر لیتے۔ پھر بھی موہوم سی امید کے سہارے ہم بلندی کی طرف دوڑنے لگے۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ قدرے بلندی پر ایک قدرتی غار سا بنا ہوا تھا۔ میں نے وہیں پوزیشن سنبھالنے کا فیصلہ کیا' اور اللہ کا نام لے کر اس غار میں داخل ہو گیا۔

وہاں بیٹھنے کے بعد میں نے برڈ سے پوچھا۔ "ہمارے پاس رائفل کے فاضل راؤنڈز کتنے ہیں؟"

"ایمونیشن بہت ہے خرم!" برڈ نے جواب دیا۔ "ان ٹورسٹ بیگز میں صرف ہیرے اور سونا نہیں ہے بلکہ رائفل اور ریوالورز کی گولیاں بھی ہیں۔ میں نے تو ٹرک سے فرسٹ ایڈ باکس کا سامان بھی اپنے بیگ میں ڈال لیا تھا۔ تمہیں شاید اس قسم کے معاملات کا زیادہ تجربہ نہیں ہے' مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے' اسی قسم کی صورت حال سے گزر رہا ہوں۔"

مجھے پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ برڈ اس سے کہیں زیادہ ذہین ہے' جتنا میں اسے سمجھتا تھا۔

اسی وقت بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دیں۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ "گولی چلانے میں پہل مت کرنا۔"

پھر ہم خاموشی سے بیٹھ گئے۔ غار میں اندر کی جانب گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے کہا کہ ہمیں مزید اندر جا کر اندھیرے میں بیٹھنا چاہئے تاکہ آسانی سے ہمیں دیکھا نہ جا سکے۔ رضا نے فوراً ٹوک دیا اور بولا۔ "اس قسم کے غاروں میں بہت گہری گہری کھائیاں بھی ہوتی ہیں۔ اندھیرے میں ہم کسی کھائی میں جا گریں گے۔"

"کیا کہہ رہا ہے یہ؟" برڈ نے سرگوشی کی۔ میں نے رضا کا جملہ دہرا دیا۔ برڈ ہنس کر بولا۔ "یار تم اس کی اسپیشل انگلش کیسے سمجھ لیتے ہو؟"

"دراصل ہماری زبان میں بھی فارسی کے بے شمار الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ جہاں رضا کی انگلش ناکام ہوتی ہے' وہ فارسی کا سہارا لیتا ہے اور میں اندازے سے اس کا مفہوم سمجھ جاتا ہوں۔" میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

اس وقت یہ گفتگو اتنی ضروری نہیں تھی' مگر ہم شاید اعصاب کی کشیدگی کم کرنے کے لئے وہ بے معنی گفتگو کر رہے تھے' کیوں کہ خاموشی سے تو میرے اعصاب چٹخنے لگتے تھے۔ میں کچھ نہ کچھ بولتے رہنا چاہ رہا تھا۔ یہی حال شاید برڈ کا تھا۔ رضا بالکل خاموش تھا۔ یا تو اس کے اعصاب بہت مضبوط تھے' یا پھر اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس نہیں تھا۔

ہیلی کاپٹروں کا شور اب تھم گیا تھا۔ شاید تینوں ہیلی کاپٹر زمین پر اتر چکے تھے۔ جہاں ہم لوگوں نے قیام کیا تھا اس کے سامنے خاصا بڑا کھلا میدان تھا۔ انہیں عدنان' مشہدی اور ڈینی کی لاشیں بھی مل گئی ہوں گی۔ میں غار کے باہر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ سورج تیزی سے ڈھل رہا تھا' اور ارد گرد کی پہاڑیوں پر شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے برڈ سے ٹارچ کے بارے میں پوچھنا فضول ہی سمجھا۔ اگر ٹارچ ہوتی تو وہ اب تک نکال چکا ہو گا۔

اچانک باہر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دے۔ چھوٹے چھوٹے کچھ پتھر نیچے کی طرف لڑھکے' پھر غار کے دہانے پر مجھے تین آدمی دکھائی دیئے ان کے جسموں پر فوجی وردیاں تھیں' اور ہاتھوں میں جدید قسم کی خود کار رائفلیں۔ وہ بہت محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنا سانس تک روک لیا۔ غار میں ایسا سناٹا تھا کہ مجھے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ میری طرح برڈ بھی شاید سانس روکے بیٹھا تھا۔

پھر ان کے پیچھے دو مزید فوجی نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نے فارسی میں کچھ کہہ کر اس غار کی طرف اشارہ کیا جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ ہم لوگ غیر محسوس طریقے پر

مزید اندر کے دہانے کی طرف بڑھے۔ ایک لمحے کو تو مجھے خیال آیا کہ شاید ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ برڈ نے ایک دم رائفل سیدھی کی۔ میں نے ہاتھ رکھ کے اسے روک دیا۔

دونوں فوجی غار کے دہانے سے اندر داخل ہوئے۔ ہم لوگ غار کی دیوار سے بالکل چپک گئے۔ ان میں سے ایک نے اچانک فائر کر دیا۔ دھماکے سے غار گونج کر رہ گیا' مگر ہم تینوں میں سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ گولی کی آواز سن کر دو تین مزید فوجی وہاں پہنچ گئے۔ وہ چیخ چیخ کر فارسی میں کچھ کہہ رہے تھے اور فائر کرنے والا ہنس ہنس کر انہیں جواب دے رہا تھا۔ میں رضا سے بھی کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا' کیوں کہ وہ لوگ میری سرگوشی بھی سن لیتے۔ پھر بقیہ فوجی ادھر ادھر چٹانوں میں بکھر گئے اور وہ دونوں فوجی جو غار میں داخل ہوئے تھے' دہانے پر جم کر بیٹھ گئے۔ وہ بلند آواز میں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے ان کا رخ باہر کی طرف تھا۔ شاید انہیں وہیں بیٹھنے کا حکم ملا تھا۔ یہ صورت حال ہمارے حق میں بہتر نہیں تھی۔

ہم لوگ اسی طرح دم سادھے بیٹھے رہے۔ غار کے دہانے پر بیٹھے ہوئے فوجی بھی شاید باتیں کر کے بور ہو گئے تھے۔ وہ دونوں بھی بالکل خاموش تھے۔ ان کے دوسرے ساتھی نہ جانے ہماری تلاش میں کہاں ٹکریں مار رہے تھے۔ بیٹھے رہنا اب میرے لئے دوبھر ہو گیا تھا۔ میں نے اچانک فیصلہ کر لیا کہ ان فوجیوں کو ٹھکانے لگا کر ان کی وردیاں حاصل کر لی جائیں۔ میں نے ٹٹول کر برڈ کا شانہ ہلایا اور اس کے کان سے لگا کر اسے بتایا کہ ان فوجیوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔ وہ شاید اسی بات کا منتظر تھا' فوراً رضا مندی کا اظہار کر دیا۔ وہ ہم لوگوں سے تقریباً بیس بائیس قدم کے فاصلے پر تھے' مگر یہ فاصلہ عبور کرنا مجھے بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ اگر ذرا سی بھی آہٹ ہو جاتی تو وہ ہمیں بھون کر رکھ دیتے یا ہم ان پر فائر کرتے تو ذرا سی دیر میں وہاں دوسرے فوجی پہنچ جاتے۔ انہیں بہت خاموشی سے ٹھکانے لگانا تھا۔ میں نے رائفل آہستگی سے زمین پر رکھ دی' اور چیتے کی طرح ایک ایک قدم سرکتا ہوا ان فوجیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ برڈ بھی اسی خاموشی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ مختصر سا فاصلہ ہم دونوں نے تقریباً بیس منٹ میں طے کیا۔ وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کے سروں پر موت منڈلا رہی ہے۔ اب ہم ایسی جگہ آ گئے تھے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ اگر ان فوجیوں میں سے کوئی اچانک پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تو ان کی بجائے ہم مارے جاتے۔ برڈ نے اپنا مخصوص خنجر نکال کر داہنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں خالی ہاتھ ہی اپنے حریف کو ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

ہم نے چند لمحے رک کر اپنا سانس درست کیا' پھر ایک ساتھ ان دونوں پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے اپنے حریف کے سر پر کراٹے کا ایک خوفناک وار کیا' مگر یہ بھول گیا کہ اس

کے سر پر ہیلمٹ تھا- میرا ہاتھ جھنجھنا کر رہ گیا- بائیں ہاتھ سے میں نے اس کا منہ دبا لیا تھا- اچانک حملے سے اس کی رائفل چھوٹ کر گر پڑی تھی مگر آدمی جاندار تھا- وہ پلٹ کر مجھ سے لپٹ گیا- میں نے گھٹنا پوری قوت سے اس کے پیٹ میں دے مارا- اس دوران برڈ نے اپنے حریف کو ٹھکانے لگا دیا تھا- میں نے اپنے حریف کی گردن دونوں ہاتھوں میں پکڑی' اور جھٹکے سے اسے مخالف سمت میں گھما دیا- سوکھی لکڑی ٹوٹنے کی سی آواز ابھری تو میں نے پھرتی سے اپنا ایک ہاتھ پھیر کر اس کے منہ پر جما دیا- اس کی آخری چیخ حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی-

ہم دونوں نے پھرتی سے ان کی لاشیں اندر گھسیٹ لیں اور ان کی وردیاں اتارنے لگے-

پانچ منٹ سے بھی کم عرصے میں ان دونوں کی جگہ میں اور برڈ بیٹھے تھے- اندھیرا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا اس لئے ہمارا پہچانا جانا مشکل تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہم دونوں میں سے فارسی کسی کو نہیں آتی تھی-

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے شاید آدھا گھنٹہ ہوا تھا یا ممکن ہے اس سے بھی زیادہ دیر ہو گئی ہو- میں پوری طرح اندھیرا پھیلنے کے انتظار میں تھا اور اس اندھیرے ہی سے فائدہ اٹھا کر نکلنا چاہتا تھا- رضا بھی ہمارے نزدیک ہی آ گیا تھا' مگر وہ کچھ اس انداز میں دیوار سے چپک کر بیٹھا کہ باہر سے نظر نہیں آ سکتا تھا- اس نے بتایا کہ آنے والوں نے ہمیں دیکھا نہیں تھا' بلکہ اپنے اطمینان کے لئے فائر کیا تھا جو خوش قسمتی سے کسی کو نہیں لگا- وہ لوگ ایک فائر کر کے مطمئن ہو گئے تھے' اور اب ہماری گھات میں بیٹھے تھے- ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ موت ان کی گھات میں ہے-

اچانک سامنے سے تین فوجی نمودار ہوئے- درمیان میں جو فوجی تھا وہ عہدے کے لحاظ سے کیپٹن تھا کیوں کہ اس کے شانوں پر تین تین اسٹار لگے ہوئے تھے- اس نے ہماری طرف منہ کر کے تحکمانہ لہجے میں کچھ کہا- میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے- برڈ نے بھی جلدی سے رائفل سیدھی کر لی- اس کی بات کا جواب دینا ضروری تھا-

اچانک میرے نزدیک سے رضا نے فارسی میں اسے جواب دیا-

کیپٹن نے پھر کچھ کہا- جواب میں رضا نے بھی چیخ کر کچھ کہا تو وہ دونوں فوجیوں سمیت لوٹ گیا-

اس کے جانے کے بعد میں نے رضا سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا- رضا نے بتایا کہ وہ پوچھ رہا تھا کہ اب تک تم لوگوں کو تو کوئی نظر نہیں آیا' میں نے جواب دیا' نظر آتا تو میں اسے گرفتار کر چکا ہوتا- اس پر افسر نے میری تعریف کی اور کہا' ممکن ہے آج رات ہمیں ان پہاڑوں میں بھٹکنا پڑے میں نے جواب دیا' میں تو حکم کا پابند ہوں وہ مطمئن ہو کر

لوٹ گیا۔

"ویسے تم نے بہت ذہانت کا مظاہرہ کیا تھا۔" میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے پیشانی پر آیا ہوا پسینا پونچھا۔ سخت سردی کے باوجود مجھے پسینہ آگیا تھا۔

ہلاک ہونے والے فوجیوں کے پاس ٹارچیں بھی تھیں' اور پانی کی بوتلیں بھی۔ مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے بوتل سے منہ لگا کر چند گھونٹ پانی پیا تو میری کچھ جان میں جان آئی۔ شدید بھوک کا احساس بھی ہو رہا تھا مگر وہاں کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اب ہر طرف مکمل تاریکی تھی۔ اچانک وہ پہاڑیاں تیز روشنی میں نہا گئیں۔ ان لوگوں نے شاید سرچ میں لائٹس کا بندوبست کر لیا تھا۔ غور کرنے پر مجھے دور کہیں جنریٹر چلنے کی آواز بھی سنائی دی۔ اس تیز روشنی میں ہم زیادہ دیر چھپے نہیں رہ سکتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہئے۔ میری طرح برڈ بھی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

سامنے سے دو فوجی نمودار ہوئے تو ہم بری طرح چونک اٹھے۔ ان دونوں نے کھانے پینے کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ شاید وہ فرداً فرداً ہر آدمی کو کھانا پہنچا رہے تھے۔ وہ ہمارے سلسلے میں ذرا سی بھی بے پروائی نہیں کرنا چاہتے تھے ورنہ سب لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک جگہ کھانا کھلایا جا سکتا تھا۔ مگر معاملہ شاہی خزانے کا تھا اس لئے وہ حد درجہ محتاط تھے۔ میرے اعصاب ایک مرتبہ پھر کشیدہ ہو گئے۔ ہم لوگ براہ راست روشنی میں نہیں تھے اس لئے آنے والے ہمیں غور سے دیکھے بغیر پہچان نہیں سکتے تھے' لیکن اگر وہ ہم سے کوئی بات کرتے تو بھانڈا پھوٹ جاتا۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے ہمارے نزدیک آ گئے۔ ان میں سے ایک نے ہنس کر کچھ کہا' اور ہمیں رول کی ہوئی ایک ایک روٹی اور کافی کے مگ پکڑا دیئے۔ کافی دینے والا کچھ زیادہ ہی جھک گیا۔ اچانک اس کی نظر برڈ پر پڑی۔ میرا چہرہ مہرہ تو کسی حد تک ایرانیوں کی طرح تھا مگر برڈ تو پہلی ہی نظر میں پہچانا جاتا تھا۔ وہ چونک کر بولا۔ "پھر اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ برڈ نے اسے دبوچ لیا۔ دوسرا فوجی یہ صورتحال دیکھ کر بدحواسی میں واپس بھاگا۔ وہ زور زور سے کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ کافی دینے والا بری طرح مچل رہا تھا' مگر برڈ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ میں نے اضطرابی کیفیت میں اس کی گردن پر وار کیا۔ وہ دوسرے ہی لمحے بے جان ہو گیا۔ ہم عجلت میں پھر اسی غار میں داخل ہو گئے۔ برڈ نے احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ٹارچ روشن کر لی۔ غار بہت اندر تک چلا گیا تھا اور رضا کا کہنا درست تھا۔ کچھ آگے جا کر وہاں ایک گہری کھائی تھی۔ ہم تینوں بہت احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے اس کھائی کے قریب سے گزر گئے۔ ہم لوگوں نے بہت عجلت میں اپنا سامان سمیٹ لیا تھا۔ آگے راستہ صاف تھا۔ ہم نتائج کی پروا کئے بغیر دیوانہ وار آگے ہی

آگے بڑھتے گئے۔ ایک چٹان تھوڑی سی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ہم مزید آگے جانے کی بجائے وہیں بیٹھ گئے۔ برڈ نے ٹارچ بند کر دی تھی اور اب وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ غار کے باہر سے بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اچانک غار کے باہر اتنی تیز روشنی ہوئی کہ ایسا لگا جیسے دن نکل آیا ہو۔ پھر میگا فون پر کوئی کرخت لہجے میں بولا۔ "اب مزاحمت فضول ہے۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ یہ غار تمہاری قبر بن جائے گا۔" بولنے والے نے انگلش کا سہارا لیا تھا۔

ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

میگا فون پر پھر وہی آواز سنائی دی۔ "میں دس تک گنوں گا' اگر تم لوگ باہر نہ آئے تو اس غار کو ڈائنامیٹ سے اڑا دوں گا۔ زندگی چاہتے ہو تو باہر آ جاؤ۔"

زندگی تو خیر باہر بھی نہیں تھی مگر موہوم سی ایک امید تھی کہ ممکن ہے کوئی معجزہ ہو جائے' کسی طرح صورتحال بدل جائے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ انسان یوں آسانی کے ساتھ زندگی سے دستبردار نہیں ہوتا۔

میگا فون والے نے اب گنتی شروع کر دی تھی۔ "ون ...... ٹو ...... تھری ...."

"خرم!" برڈ نے ہیجانی لہجے میں کہا "کیا تم چوہوں کی طرح مرنا پسند کرو گے؟"

"نہیں۔" میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"تو پھر فی الحال خود کو ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔" اس نے جلدی سے کہا "ہمیں آخر وقت تک کوشش تو کرنا چاہیئے۔ وہ لوگ ہمیں فوراً ہی تو گولی نہیں مار دیں گے۔ مقدمہ چلے گا' اس ڈکیتی کی تحقیقات ہو گی۔ ممکن ہے اس دوران میں ہمیں کوئی موقع مل جائے۔" "برڈ مجھ سے زیادہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔"

مجھے رضا کا افسوس تھا۔ وہ غریب خواہ مخواہ اس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

"ایٹ ..... نائن ....." میگا فون چیخ رہا تھا۔

"ہم لوگ آ رہے ہیں۔" برڈ نے چیخ کر کہا اور ٹارچ روشن کر دی۔

ہم لوگ ہاتھ اٹھائے ہوئے غار سے باہر آئے تو تیز روشنی میں چند لمحے تک مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ جب میں دیکھنے کے قابل ہوا تو مجھے چاروں طرف فوجی دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ ایک اشارے پر ہمیں چھلنی کر سکتے تھے۔ دو فوجی محتاط انداز میں آگے بڑھے اور انہوں نے بہت پھرتی اور مہارت سے ہماری تلاشی لے ڈالی۔ انہوں نے ہمارے ٹورسٹ بیگ پہلے ہی زمین پر رکھوا لیے تھے۔ تلاشی کے بعد میرے اور برڈ کے ریوالور بھی ان کے قبضے میں چلے گئے۔ رضا کے پاس صرف ایک رائفل تھی جو وہ غار میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ لوگ برڈ کے پوشیدہ خنجر برآمد نہیں

کر سکے تھے۔ تلاشی کے بعد ہمارے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے اور وہ لوگ ہمیں دھکیلتے ہوئے نیچے کی طرف لے چلے۔ وہ لوگ فارسی میں ہمیں غلیظ گالیاں دے رہے تھے۔ اس دن مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہم سب بھی فارسی کی وہی گالیاں استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے تین ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ان کا بس چلتا تو شاید وہ وہیں ہماری تکا بوٹی کر دیتے' مگر اپنے افسروں کی وجہ سے بے بس تھے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم پھر وہیں کھڑے تھے جہاں سے بھاگے تھے۔ عدنان' ڈینی اور مشہدی وغیرہ کی لاشیں اب تک وہیں پڑی تھیں۔ سامنے والے سطح میدان میں تینوں ہیلی کاپٹر بھی کھڑے ہوئے تھے۔ وہیں ایک طاقتور جنریٹر بھی چل رہا تھا جس کے ذریعے انہوں نے سرچ لائٹس روشن کی تھیں۔ ہیلی کاپٹر میں سے کرنل کے عہدے کا ایک شخص برآمد ہوا تو سارے فوجی ایک دم الرٹ ہو گئے۔ وہ معاملہ اتنا ہی اہم تھا کہ اس کے لئے کرنل ایسا بڑا افسر بہ نفس نفیس وہاں چلا آیا تھا۔

کرنل نے غور سے ہم تینوں کا جائزہ لیا' پھر اپنے ماتحتوں سے فارسی میں کچھ بولا۔ کیپٹن نے نفی میں سر ہلا کر اس کے سوال کا جواب دیا۔ پھر ہمیں دھکیل کر ایک ہیلی کاپٹر کی طرف لے جایا گیا۔ کرنل اپنی جگہ پر کھڑا ہمیں گھور رہا تھا۔ ہمارا ٹرک اور گاڑی بھی اسی جگہ موجود تھی جہاں ہم چھوڑ گئے تھے۔ اچانک ٹرک کے پچھلے حصے سے کسی نے جمپ لگائی اور وہ بالکل میری طرح ہوا میں دائرے بناتا ہوا کرنل کی طرف بڑھا۔ ایک ساتھ کئی رائفلیں گرجیں مگر کودنے والا چھلاوے کی طرح اس کی پشت پر جا پہنچا۔

اس چھلاوے کا چہرہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ گول مٹول جاپانی تھا جس کی قید میں ہم نے دو دن گزارے تھے اور جسے بعد میں بے ہوش کر کے ہم مشہدی کے بنگلے پر لے آئے تھے۔ اس کے بعد ہمیں معلوم نہیں ہوا کہ مشہدی نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ ہم نے معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اس نے ریوالور کرنل کی کن پٹی سے لگا رکھا تھا۔ پھر وہ بلند آواز میں بولا "کرنل! ان لوگوں سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں ورنہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔"

کرنل ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

جاپانی نے اچانک فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ کیپٹن تھا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔ وہ دلخراش انداز میں چیخا اور زمین پر گر کے تڑپنے لگا۔

"ان لوگوں سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں۔" جاپانی نے سخت لہجے میں کہا۔

کرنل نے فارسی میں اپنے ماتحتوں کو مخاطب کیا' دوسرے ہی لمحے ان سب نے ہتھیار پھینک دیئے۔

"ان سے کہو کہ یہ سب زمین پر اوندھے منہ لیٹ جائیں۔" جاپانی نے دوسرا حکم

دیا۔

کرنل نے اس حکم پر بھی بے چوں و چرا عمل کیا اور وہ سب اوندھے منہ لیٹ گئے۔

"خرم! تم ادھر آؤ۔" جاپانی نے مجھے مخاطب کیا۔

میں پھرتی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی پوزیشن دیکھ کر مجھے ہنسی آئی۔ کرنل چونکہ خاصا دراز قد تھا اس لئے جاپانی پنجوں کے بل کھڑا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا۔ بائیں ہاتھ سے اس نے چھوٹا سا ایک خنجر جیب سے نکالا اور میرے ہاتھوں میں بندھی ہوئی رسی کاٹ دی۔

آزاد ہوتے ہی میں برڈ کی طرف دوڑا اور اس کے ہاتھ میں نے کھول دیئے ہم لوگوں نے سب سے پہلے اپنے ٹورسٹ بیگ کندھے پر لادے' رضا کی پوٹلی اس کے حوالے کی اور ایک ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھے۔

"اتنی جلدی مت کرو۔" جاپانی نے مسکرا کر اردو میں کہا "استادوں کے ساتھ استادی۔ احمق! پہلے ان دو ہیلی کاپٹروں کو تو ناکارہ کر دو ورنہ یہ موت کے فرشتے پھر پیچھے لگ جائیں گے۔"

اس کی بات معقول تھی۔ برڈ ماہر پائلٹ تھا۔ اس نے بہت پھرتی سے یکے بعد دیگرے دونوں ہیلی کاپٹر ناکارہ کر دیئے۔

"اس ٹرک اور گاڑی کے چاروں ٹائر بھی فلیٹ کر دو تاکہ کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ رہے۔" جاپانی نے اگلا حکم دیا۔

کرنل منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "یہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ تم لوگ ایران سے نکل نہیں سکو گے۔"

"خاموش رہو۔" جاپانی نے اسے جھڑک دیا۔

میں نے اور برڈ نے فائر کر کے ٹرک اور گاڑی کے چاروں ٹائر برسٹ کر دیئے۔

"اب ان لوگوں کی سب رائفلیں سمیٹ کر ہیلی کاپٹر میں رکھ دو تاکہ بعد میں یہ ہیلی کاپٹر پر فائرنگ نہ کر سکیں۔" جاپانی نے کہا۔

ہم تینوں نے جلدی جلدی تمام رائفلیں سمیٹیں اور انہیں ہیلی کاپٹر میں ڈال دیا۔ پھر جاپانی کی ہدایت پر ہم ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے۔ ہمارے بعد وہ بھی کرنل سمیت ہیلی کاپٹر میں آگیا اور برڈ سے بولا۔ "اب ہیلی کاپٹر لے کر یہاں سے نکل چلو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ماہر پائلٹ ہو۔"

برڈ نے فوراً ہیلی کاپٹر کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

وہ خاصا بہترین اور اعلیٰ قسم کا ہیلی کاپٹر تھا۔ برڈ چشم زدن میں اسے ایک دم بلندی پر پہنچا دیا۔

میں یونہی سر سری انداز میں ٹہلتا ہوا کرنل کے پاس پہنچا اور جھپٹ کر جاپانی کا ریوالور چھین لیا' دوسرے ہی لمحے میری بھرپور کک کرنل کے سینے پر پڑی۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے اس کی کھوپڑی سہلا دی۔ وہ تیورا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

پھر میں نے ایک دم ریوالور کا رخ جاپانی کی طرف کر دیا اور بولا "بزرگ کہتے ہیں کہ دشمن پر کبھی اعتبار مت کرو۔"

جاپانی بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

پھر جاپانی نے طویل سانس لیا اور اکتائے ہوئے لہجے میں بولا "بس تم میں یہی ایک خامی ہے خرم! تم بے صبرے بھی ہو اور جلد باز بھی۔"

"کہتے رہو۔" میں نے کہا "میں سن رہا ہوں۔"

"مجھے غلط مت سمجھو خرم" جاپانی ایک دم سنجیدہ ہو گیا "تم خود ہی سوچو کہ ایسے موقع پر جب ایران کی تمام ایجنسیاں ہمارے پیچھے ہیں' تم اپنے طور پر یہاں سے نکلنا چاہتے ہو۔ مجھے بے شک تم قیدی بنا لو مگر کرنل کو بے ہوش نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہم میں سے کسی کو اندازہ نہیں ہے کہ ہم قم سے کتنی دور ہیں اگر ہم دوبارہ قم پہنچ گئے تو جانتے ہو کیا ہو گا؟ ہمیں وہاں اترتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ راستہ صرف کرنل بتا سکتا تھا تم نے اسے بھی ناکارہ کر دیا۔ ہم زیادہ دیر تک فضا میں بھی نہیں رہ سکتے۔ کچھ ہی دیر میں ایرانی فضائیہ حرکت میں آ جائے گی اور وہ ہمارے ہیلی کاپٹر کو فاختہ کی طرح مار گرائے گی۔"

جاپانی کی باتوں نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا میں جھنجلا کر بولا "پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"مجھے سوچنے دو۔" جاپانی منہ ہی منہ میں بڑبڑایا "اور یہ ریوالور جیب میں رکھو یہ بھی تمہاری بھول ہے کہ مجھے بے بس کر سکتے ہو۔ احمق لڑکے تمہیں وانگ یو نے نہیں بتایا تھا کہ کسی کمراٹیکاز اور جمناسٹ کے اتنے قریب مت جانا۔" پھر غیر متوقع طور پر اس نے گھوم کر اتنی پھرتی سے ریوالور پر ہاتھ ڈالا کہ میں حیران رہ گیا۔ "میں تمہاری کلائی بھی توڑ سکتا تھا' مگر ابھی ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے خرم!" برڈ نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ "فی الحال ہمیں آپس میں نہیں لڑنا چاہئے۔"

"یہیں لینڈ کر لو۔" جاپانی نے ایک جگہ ہموار زمین دیکھ کر اچانک کہا۔

برڈ نے میری طرف دیکھا اور میرا اشارہ پا کر ہیلی کاپٹر کو وہیں اتار لیا۔

"رضا! تمہیں تو راستے کا علم ہو گا؟" میں نے رضا سے پوچھا۔

"میں اس علاقے میں ایک دفعہ ہی آیا ہوں۔ بہرحال کوشش کرتا ہوں۔" رضا نے

جواب دیا۔

"اس کا کیا کریں؟" برڈ نے بے ہوش کرنل کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے یہیں چھوڑ دو" میں نے کالا بیگ اٹھا لیا۔

پھر ہم سب نیچے اتر آئے نیچے اترنے کے بعد رضا بہت غور سے گردوپیش کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے ایک سمت اشارہ کیا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اس طرف مین روڈ ہے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" جاپانی نے غور سے اسی طرف دیکھا۔ پھر نیچے جھک کر زمین سے کان لگا دیئے۔

اس کی اس حرکت پر برڈ بے اختیار ہنسنے لگا۔ "تم کسی پختہ سڑک پر نہیں بلکہ پہاڑی علاقے میں کھڑے ہو۔ یہاں بھلا تمہیں کیا سنائی دے گا۔"

جاپانی بھنا کر بولا۔ "میری حس تمہارے مقابلے میں سو گنا زیادہ ہے سمجھے' یہ حسیات محض ڈاکے ڈالنے سے نہیں بڑھتیں اس لئے محنت کرنا پڑتی ہے۔"

"واقعی!" برڈ نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "ایسی ہی محنت جیسی تم کر رہے ہو؟"

جاپانی نے قہر آلود نگاہوں سے برڈ کو گھورا پھر مجھ سے بولا۔ "سمجھاؤ اس نقب زن کو میں ایسی بات سننے کا عادی نہیں ہوں۔"

"تو مت سنو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "بات کرو گے تو سنو گے بھی۔" پھر میں برڈ سے مخاطب ہوا "چلو برڈ۔" ہم نے رضا کی بتائی ہوئی سمت میں قدم بڑھائے۔

میں نے مڑ کر دیکھا جاپانی بھی تیز تیز قدم اٹھاتا ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

رضا نے چلتے چلتے کہا "میرا اندازہ ہے کہ سامنے والے ان پہاڑوں کے پیچھے کوئی آبادی ہے۔"

"آبادی ہے تو ہمارا اس طرف جانا مناسب نہیں ہے۔" برڈ نے کہا۔

"خطرناک تو ہے' مگر ممکن ہے ہمیں وہاں سے کوئی گاڑی مل جائے۔" رضا نے جواب دیا اور تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔

وہ پہاڑی زیادہ دور نہیں تھی' ہم دس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ وہ پہاڑی سلسلہ زیادہ بلند بھی نہیں تھا۔ ہم لوگ بہت آسانی سے اوپر چڑھ گئے۔ دوسری طرف واقعی کوئی آبادی تھی کچھ فاصلے پر مٹی اور پتھروں کے خستہ حال مکانات موجود تھے۔ مکانوں کی خستہ حالی دیکھ کر مجھے خاصی مایوسی ہوئی وہ لوگ پیٹ کا ایندھن ہی بہ مشکل بھرتے ہوں گے۔ ان کے پاس بھلا گاڑی کیوں ہو گی؟ برڈ کے چہرے پر بھی مایوسی کے تاثرات تھے۔

ہم میں سے کوئی کچھ بولا نہیں۔ سب خاموشی سے اس طرف بڑھتے رہے۔ ہم نے رضا کو آگے رکھا تھا تاکہ وہ لوگوں سے بات کر سکے اب مجھے اس آبادی میں کچھ لوگ بھی

ملتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ بیشتر گھروں کے آگے پتھروں اور گارے سے احاطہ بنا دیا گیا تھا۔ وہاں دنبے اور بھیڑیں بیٹھی تھیں گویا ان لوگوں کا پیشہ گلہ بانی تھا' سامنے ہی کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ وہ سر اٹھا کر حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔ رضا نے بلند آواز میں کچھ کہا' ان میں سے ایک آدمی نے اسی انداز میں اس کا جواب دیا۔ رضا نے مڑ کر مجھے بتایا کہ "میں نے کہا تھا کہ ہم مسافر ہیں' ہماری گاڑی حادثے میں تباہ ہو گئی ہے کیا تم ہماری مدد کرو گے؟ اس نے جواب دیا کہ ہم ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہیں۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "مگر تم لوگ یہ بالکل ظاہر نہ کرنا کہ ہمارے پاس سونا ہے ورنہ یہ لوگ ذرا سی دیر میں ہمارا گلا کاٹ دیں گے۔"

ہم آبادی میں داخل ہوئے تو وہاں بھی لوگ حیرت سے ہمیں گھورنے لگے پھر رضا نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔ اب بھی وہی شخص گفتگو کر رہا تھا جس نے رضا کے جواب میں مدد کرنے کی حامی بھری تھی۔ تھوڑی دیر بعد گفتگو کرنے کے بعد وہ شخص ہمیں لے کر بستی کے ایک گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ رضا نے بتایا کہ یہ شخص اس بستی کا سردار ہے۔ اس سے ذرا ہوشیار رہنا کیوں کہ یہ لالچی بھی ہے۔ وہ شخص پہلی ہی نظر میں مجھے اچھا نہیں لگا ۔ رضا نے بتایا کہ یہ ہماری مدد کرنے پر آمادہ ہے مگر اسے پیسوں کی بھی ضرورت ہے۔

"تم اپنے طور پر طے کر لو کہ وہ کتنی رقم کا خواہش مند ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر ہمارے پاس مقامی کرنسی کہاں ہے پھر اسے سونا بھی نہیں دینا چاہتا۔"

"مقامی کرنسی میرے پاس ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر میں یہاں سے فوراً ہی نا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ شخص ناقابل اعتبار لگتا ہے اس سے پوچھو کہ یہاں سے ہمیں کوئی اری بھی مل سکتی ہے؟"

"میں اس سے پوچھ چکا ہوں۔" رضا نے جواب دیا "یہ کہہ رہا تھا کہ ہفتے دس دن ں ایک ٹرک یہاں آتا ہے وہ یہاں اور آس پاس کی دوسری بستیوں میں پھل اور سبزیاں ا ہے۔"

"اس سے پوچھو کہ وہ ٹرک کب آئے گا؟"

رضا نے میرا سوال فارسی میں دہرایا اور اس کا جواب سن کر بولا۔ "یہ کہہ رہا ہے ر ممکن ہے وہ ٹرک پرسوں آ جائے' ممکن ہے ایک ہفتے بعد آئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ں آ جائے۔"

اس دوران میں ہم شکستہ سے ایک مکان کے دروازے پر جا پہنچے تھے۔ بستی کا سردار ان میں داخل ہو گیا۔ شاید وہ اسی کا گھر تھا۔ اس نے گھر میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ واپس ر اس نے ہم سب کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ مکان کے اندر صرف دو کمرے تھے۔ ایک رے کے فرش پر دبیز قالین پڑا تھا اور دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اس نے

ہمیں کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر ہمارا سامان لینا چاہا مگر میں نے نرمی سے اسے روک دیا۔

ہم تینوں اس نرم و گداز قالین پر بے دم سے ہو کر گر پڑے۔ کمرے میں ایک طرف پتھر کے کوئلے کی انگیٹھی بھی رکھی تھی۔ سردار نے اسے فوراً روشن کیا اور ہمارے لئے قہوہ لے آیا۔

ہم قہوہ پی ہی رہے تھے کہ فضا میں ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ گونجی۔ آواز سن کر میرا۔ دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ برڈ نے چلتے وقت ہیلی کاپٹر کو ناکارہ نہیں کیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی کرنل نے ہیلی کاپٹر کا جائزہ لیا ہو گا۔ پھر وہ ہیلی کاپٹر اڑا کر اس بستی تک پہنچ گیا تھا۔ اسے دو اور دو چار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی ہو گی۔

کوئی احمق بھی یہ بتا سکتا تھا کہ ہیلی کاپٹر سے اترنے کے بعد ہم لوگ کس طرف جا سکتے ہیں۔ میں نے برڈ کی طرف دیکھا' وہ بھی اضطراب میں مبتلا تھا۔ پھر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا "ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہو گا۔"

"ایسا کرو۔" جاپانی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بستی کے سردار کو کچھ رقم دے کر کھانے پینے کا سامان منگا لو۔"

"کھانے پینے کو چھوڑو۔" برڈ نے اضطراب میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا "رائفلیں اور میگزین چیک کرو۔ کھانا تو اسی وقت کھائیں گے جب زندہ رہیں گے۔" اس نے جلدی سے رائفل اتاری' اس کا جائزہ لیا' پھر جلدی جلدی بیگ سے فاضل راؤنڈز نکالنے لگا۔

ہم سب نے اپنی اپنی رائفلیں اور ریوالور لوڈ کر لئے۔ صرف جاپانی ہی نہتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے پہلے مسلح کر دوں پھر اس خیال کو خود ہی مسترد کر دیا۔

بستی کا سردار کمرے میں داخل ہوا تو ہمیں روانگی کے لئے تیار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے جلدی جلدی رضا سے کچھ کہا' رضا نے بہت سرد لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا تو وہ بھی بھڑک گیا اور تیز لہجے میں بولنے لگا۔ رضا نے رائفل سیدھی کر لی اور مجھ سے مخاطب ہوا "یہ منحوس کہہ رہا ہے کہ تم لوگ یہاں سے ابھی نہیں جا سکتے۔"

اس سے کہو کہ ابھی کچھ دن اور زندہ رہ لے ہم لوگ ایسے جنونی ہیں کہ راہ میں آنے والے ہر پتھر کو ٹھوکر سے اڑا دیتے ہیں۔"

رضا نے میری بات دہرا دی۔ میرے جملے سے زیادہ سردار میرے تند و تیز اور سفاک لہجے سے مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے بے بسی سے ایک مرتبہ دروازے کی طرف دیکھا اور بے نیازی سے شانے اچکا کر ہمارا راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں برڈ کو اشارہ کیا کہ سردار کو ناک آؤٹ کر دو۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے برڈ نے اچانک ہاتھ گھمایا اور سردار کٹے ہوئے درخت کی طرح دبیز قالین پر ڈھے گیا۔ سامنے کے

دروازے سے باہر نکلنا مناسب نہیں تھا' میرا اندازہ تھا کہ اس مکان کا عقبی دروازہ بھی ہو گا۔ بیشتر مکان میں مویشیوں کا احاطہ مکان کی پشت پر تھا۔ اس سردار کے مکان کے اگلے حصے میں احاطہ تو نہیں تھا تو ظاہر ہے مکان کی پشت پر ہو گا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو روکنا چاہا' مگر مجھ سے پہلے ہی جاپانی نے انہیں روکا اور مکان کے پچھلے حصے کی طرف چلنے کو کہا۔

جس کمرے میں ہم کھڑے تھے اس کا ایک دروازہ اندرونی جانب ہی کھلتا تھا۔ میں نے وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ بلا سوچے سمجھے میں نے دروازے پر دستک دے دی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کیا کھلا گویا روشنی کا سیلاب امڈ آیا۔ وہ اتنی ہی خوبصورت تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت کی وجہ سے مزید بڑی ہو گئی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر بول نہ سکی۔ اس کی عمر بہ مشکل سولہ سترہ سال رہی ہو گی۔ اس کا قد درمیانہ اور جسم بھرا بھرا تھا۔ جلد اور بالوں کا رنگ سنہرا تھا۔ میں نے اس سے بات کرنا چاہی پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ وہ میری زبان نہیں سمجھے گی۔

میری مشکل رضا نے حل کر دی۔ اس نے آگے بڑھ کر فارسی میں کچھ کہا۔ لڑکی نے لرزتی ہوئی آواز میں اس کی بات کا جواب دیا۔ تھوڑی دیر وہ دونوں آپس میں گفتگو کرتے رہے' پھر رضا نے بتایا کہ لڑکی سردار کی بیٹی ہے۔ اس نے مہمانوں کی آمد کے بارے میں سنا تھا' اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا باپ اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ رات کے وقت ہمیں لوٹ کے یہاں سے نکال دے گا۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنے خاص آدمیوں سے بات بھی کر لی ہے وہ معصوم لڑکی اس زیادتی کے حق میں نہیں تھی' مگر وہ باپ کے سامنے مخالفت کرنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔

"اس سے پوچھو کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ محفوظ بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے پوچھا تھا۔" رضا نے جواب دیا۔ "یہ کہتی ہے کہ یہاں کے تمام راستے بہت دشوار ہیں۔ ہم لوگ ان راستوں پر بھٹک جائیں گے' اور آخر کار سردار کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ جائیں اور سردار کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں۔" جاپانی طنزیہ لہجے میں بولا۔

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔" رضا نے ہنس کر کہا۔

"لڑکی کا مشورہ ہے کہ ہم دو تین دن انہی پہاڑوں میں روپوش رہیں۔ تین دن بعد بستی میں سبزی کا ٹرک آئے گا۔ ہم اس ٹرک کے ذریعے نکل سکتے ہیں۔"

لڑکی کی تجویز سن کر جاپانی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے جلدی سے کہا "مگر ایسی کون سی جگہ ہے جہاں ہم یہاں والوں کی نظر میں آئے بغیر تین دن تک چھپے رہ سکیں؟"

"یہ لڑکی بتا رہی تھی کہ ایسی بہت سی جگہیں ہیں۔ اس کا بچپن انہی پہاڑوں میں

کھیلتے کودتے گزرا ہے۔ اس کی نظروں میں ایسے کئی غار ہیں جہاں ہم ہفتوں چھپے رہ سکتے ہیں۔" رضا نے بتایا۔

"اور اس دوران میں ہم ہوا کھائیں گے۔" جاپانی طنزیہ لہجے میں بولا۔

"بائی دا وے تم ہمارے ساتھ کس خوشی میں ہو؟" میں نے کاٹ دار لہجے میں جاپانی سے کہا۔ "تمہیں بھلا کیا خطرہ ہے؟"

یہ سوال تم نے اس وقت نہیں کیا جب میں نے اپنی جان پر کھیل کر تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو چھڑایا تھا۔ تم یہ بھی بھول رہے ہو کہ شاہی فوج کا وہ کرنل' اور اس کے سپاہی میرے بھی اتنے ہی دشمن ہیں جتنے تمہارے۔"

"ارے یار' تم تو جذباتی ہو گئے۔" میں نے ہنس کر کہا مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اس وقت جاپانی بھی ہماری ہی کشتی کا سوار ہے۔ اس دوران میں رضا مسلسل اس لڑکی سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے ہم سے کہا "خانم تہمینہ ہمیں چھپنے کی جگہ بھی بتائیں گی' اور بعد میں ہمیں اشیائے خوردونوش بھی پہنچائیں گی اگر آپ ان پر اعتماد کرتے ہیں تو چلیں۔"

"ٹھیک ہے چلو۔" میں نے جواب دیا۔ "مکان کی پشت پر بھی ایک دروازہ تھا۔ تہمینہ نے ہمیں اس دروازے سے نکالا' اور دروازہ بند کر کے دوسری طرف آنے کا اشارہ کیا۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم ایک کشادہ غار میں تھے وہ غار ہر لحاظ سے مناسب تھا میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے' اور تہمینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اشیائے خوردونوش۔"

وہ نوٹ لیتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس دی۔ مجھے ایسا لگا جیسے غار میں جلترنگ سے بج اٹھے ہوں۔ پھر وہ جلدی جلدی رضا سے کچھ کہنے لگی' اور ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ برڈ اس صورت حال سے مطمئن نہیں ہے۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے ڈیئر! تم کچھ پریشان ہو؟"

"یار مجھے اس لڑکی پر بھروسا نہیں ہے' مگر لگتا ہے اس کا حسین چہرہ دیکھ کر تم سب کچھ بھلا بیٹھے ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے" میں نے ہنس کر کہا "وہ بلاشبہ بہت حسین ہے مگر اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میرا دماغ بھی ماؤف ہو جائے۔ وہ معصوم سی لڑکی ہے' وہ بھلا ہمیں کیا دھوکا دے گی۔ ہم میں سب سے زیادہ تجربے کار مسٹر....." میں نے رک کر جاپانی کی طرف دیکھا۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ "شکر ہے تم نے میرا نام تو پوچھا ورنہ جاپانی' جاپانی سن کر مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔ میرا نام اوکینو ہے مگر تم مجھے مسٹر او کہہ سکتے ہو۔"

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم میں سب سے زیادہ تجربے کار مسٹر او ہیں۔ انہوں نے

بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پھر اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔"

"خیر دیکھا جائے گا" برڈ نے شانے اچکا کر کہا ویسے میں زندگی بھر ان دونوں کو بھلا نہ پاؤں گا۔ ہم لوگ کتنی دفعہ موت کے منہ سے بچے ہیں' اور کون جانے کہ ابھی بچے ہیں یا انہی پہاڑیوں میں ......"

"برڈ پلیز!" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "مایوسی کی باتیں مت کرو۔ جب تک ہمارے جسموں میں سانس ہے' ہم زندہ ہیں۔ چھوڑو کوئی اور بات کرو اپنا کوئی یادگار واقعہ سناؤ۔"

"یادگار واقعات تو انکل او کے پاس ہوں گے۔" برڈ نے ہنس کر جاپانی کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ کچھ یاد کر کے بولا "یار خرم! تم کہتے ہو کہ وانگ یو نے تمہیں کراٹے اور جمناسٹک کی تربیت دی اور ....."

"جمناسٹک کی اصل تربیت تو مجھے میرے ماما نے دی تھی" میں نے اس کی بات کاٹ دی "وانگ یو نے اس ٹریننگ کو مزید آگے بڑھایا تھا۔"

"اور یہ انکل او' وانگ یو کے ساتھی تھے اس کا مطلب ہے یہ بھی اتنے ہی پرفیکٹ ہوں گے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ان کا شاگرد بن جاؤں۔"

"اب وقت گزر چکا ہے۔ جمناسٹک کی تربیت بہت چھوٹی عمر سے حاصل کرنا پڑتی ہے۔" جاپانی نے سنجیدگی سے کہا "البتہ تم کراٹے سیکھ سکتے ہو مگر خرم سے اچھے فائٹر نہیں بن سکتے۔"

"خرم سے اچھا فائٹر تو میں اب بھی ہوں۔" برڈ نے ہنس کر کہا۔ "اسے آپ لوگوں نے خواہ مخواہ سر پر چڑھا رکھا ہے۔ یقین نہ ہو تو کبھی آزما لینا۔"

ہم اسی طرح ادھر ادھر کی باتوں میں وقت گزارتے رہے۔ بھوک کے مارے میرا برا حال تھا مسٹر او کا تو مجھے علم نہیں مگر میری طرح رضا اور برڈ دونوں کی حالت غیر تھی۔

"خرم! سنجیدگی سے ایک بات بتاؤ گے؟" جاپانی ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"ضرور بتاؤں گا" میں نے جواب دیا مگر خدارا مجھ سے اس مائیکرو فلم اور کاغذات کے بارے میں کچھ مت پوچھنا۔ یہ بات مجھ سے اتنی مرتبہ پوچھی گئی ہے کہ اب تو اس کے تصور ہی سے ڈپریشن ہونے لگا ہے۔"

"چھوڑو تم نے بات ہی ختم کر دی" جاپانی نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"ایک صورت ہو سکتی ہے" میں نے پرخیال انداز میں کہا "تم میری بہن شہلا کو ڈھونڈنے میں میری مدد کرو میں تلاش کر کے کاغذات اور مائیکرو فلم تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ کاغذات وغیرہ تمہارے پاس ہیں" جاپانی تڑپ کر کھڑا ہو گیا "ورنہ تم یہ بات اتنے وثوق سے نہ کرتے۔ کئی ملکوں کے جاسوس' مختلف تنظیمیں اور کرائے

کے غنڈے پچھلے کئی ماہ سے ان کاغذات اور مائیکرو فلم کو پاگلوں کی طرح تلاش کر رہے ہیں' اور تم نے کس آسانی سے کہہ دیا کہ کاغذات ڈھونڈ کر تمہارے حوالے کر دوں گا۔" وہ بولتے بولتے رک کر مجھے گھورتا رہا پھر بولا "سچ سچ بتاؤ خرم! وہ کاغذات اور مائیکرو فلمیں کہاں ہیں؟"

"فار گاڈ سیک!" میں بھنا کر بولا "آخر تم نے بھی وہی سوال کر دیا نا! مجھے علم ہوتا تو بہت پہلے وہ کاغذات دے کر اپنی بہن کو پا لیتا۔"

"چلو یونہی سہی" جاپانی گہرا سانس لے کر بولا "میں شہلا کو تمہارے حوالے کر دوں تو کاغذات مجھے مل جائیں گے؟"

"میں پوری کوشش کروں گا دراصل میرے پاس کچھ کلیوز ہیں کوشش کروں تو اس شخص تک پہنچ سکتا ہوں جس کے پاس کاغذات ہیں۔ میرے خیال میں اب تمہارا شبہ رفع ہو گیا ہو گا؟" میں نے ہنس کر ماحول کی کشیدگی کو کم کرنا چاہا۔

ہمیں اس غار میں چھپے چوتھا دن تھا۔ اس دوران میں تہمینہ ہمیں کھانا پہنچاتی رہی تھی صبح صبح اس نے آ کر بتایا تھا کہ بستی میں فوج کے بہت سے سپاہی اور افسر موجود ہیں۔ وہ تمہی لوگوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ بابا نے انہیں بتایا ہے کہ یہ لوگ کل میرے پاس پہنچے تو تھے' مگر پھر شاید ان لوگوں کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لئے فوراً ہی یہاں سے روانہ ہو گئے۔

پھر ان فوجیوں نے بستی کے ایک ایک گھر کی تلاشی لی تھی اور ایک گھنٹے بعد روانہ ہو گئے تھے۔ تہمینہ کا کہنا تھا کہ فوجی آس پاس کی پہاڑیوں میں ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔

ہم لوگ اس وقت تہمینہ ہی کا انتظار کر رہے تھے وہ آئی تو بہت پرجوش تھی اسی جوش کے عالم میں وہ رضا سے کچھ کہنے لگی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے پھر تہمینہ واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد رضا نے کہا "آپ لوگ روانگی کی تیاری کر لیں۔"

"لیکن' یہاں کوئی خطرہ ہے کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

رضا مسکرا کر بولا "خطرہ نہیں ہے' سبزی اور پھلوں کا ٹرک آج صبح یہاں پہنچا تھا وہ دو گھنٹے بعد واپس جائے گا۔ تہمینہ ہمیں یہی اطلاع دینے آئی تھی۔"

میں بے تابی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ برڈ بھی تشویش زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ رضا کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی میں نے اشارے سے اسے مطمئن رہنے کو کہا پھر رضا سے بولا۔ "مگر وہ ٹرک کس راستے سے جائے گا روڈ کہاں ہے؟"

"وہ ٹرک کہاں جاتا ہے یہاں سے۔" جاپانی نے پوچھا۔

"یہ تو میں نے تہمینہ سے نہیں پوچھا۔ بہرحال وہ ٹرک کی روانگی سے آدھا گھنٹا پہلے یہاں آئے گی اور ہمیں مین روڈ تک پہنچا دے گی۔" رضا نے جواب دیا۔

پھر میں نے جلدی جلدی برڈ کو اس نئی صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی ایک دم سرگرم ہو گیا ہم سب نے بہت پھرتی سے اپنا بھرا ہوا سامان سمیٹا' اور ہر طرح سے تیار ہو کر تہمینہ کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

تہمینہ وعدے کے مطابق پہنچ گئی اس وقت دوپہر کے دو بجے تھے۔ وہ احتیاط کے طور پر ایک پوٹلی میں خشک میوہ باندھ لائی تھی تاکہ کم از کم چوبیس گھنٹے ہم کچھ کھائے بغیر گزارہ کر لیں۔ ہم سب تو تیار بیٹھے تھے۔ اس کے آتے ہی روانہ ہو گئے۔ وہ ہمیں ایک ایسے راستے سے لے کر چل دی جو پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد تہمینہ ایک پہاڑ کی اوٹ میں کود گئی پھر اس نے اشارے سے رضا کو بتایا۔ رضا نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ کچھ کہتے کہتے بے اختیار رونے لگی۔ وہ بار بار عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ ہم سب کو وہیں رکنے کی تاکید کر کے آگے بڑھ گئی۔ رضا نے ایک طویل سانس لیا اور مجھ سے بولا "اب سمجھ میں آیا کہ تہمینہ ہم پہ اتنی مہربان کیوں ہو گئی۔"

"کوئی خاص بات؟" میں نے پوچھا

"کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں' مگر تہمینہ کے لئے خاص ہے۔" رضا افسردہ ہو رہا تھا۔ "دو سال پہلے تہمینہ کا بڑا بھائی ایک حادثے میں مر گیا تھا۔"

"بڑا بھائی!" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں' وہ شکار کے دوران میں گھوڑے سے گر گیا تھا آپ کا قد' جسامت' شکل و صورت حتیٰ کہ بال تک تہمینہ کے بھائی سے مشابہہ ہیں۔ آپ میں اسے اپنے مرحوم بھائی کی جھلک دکھائی دی تو وہ انجام کی پروا کئے بغیر ہماری مدد کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ اس کے لالچی باپ کو اگر علم ہو جائے کہ تہمینہ نے ہم لوگوں کو چھپایا تھا تو وہ کھڑے کھڑے تہمینہ کو گولی سے اڑا دے۔"

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ اب تک بارہا میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ تہمینہ کی مہربانیاں بلاوجہ نہیں ہیں اب اپنے خیالات پر مجھے خود ہی ندامت ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے پہلے بھی متعدد بار نوٹ کیا تھا کہ تہمینہ بہت والہانہ انداز میں مجھے دیکھتی ہے' مگر میں اس کے اس انداز کو بہت غلط مفہوم دے بیٹھا تھا۔

اچانک فضا ٹرک کے انجن کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ ٹرک ابھی کافی دور تھا۔ آواز سے تو یہی اندازہ ہو رہا تھا اسی وقت تہمینہ نے بلند آواز میں کچھ کہا۔ رضا نے اسی انداز میں جواب دیا اور بولا "تیار ہو جائیں۔ تہمینہ ٹرک روکنے جا رہی ہے۔"

میں نے کہا "ہر کام پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت کیا جائے گا۔"

ٹرک کے سال خوردہ انجن کی گڑگڑاہٹ اب بالکل ہمارے سروں پر پہنچ گئی تھی۔ اچانک ٹرک رکنے کی آواز آئی پھر کوئی مقامی زبان میں چیخ کر بولا۔ جواب میں تہمینہ بھی اسی طرح چیخی۔ اسی وقت میں اور برڈ اچھل کر پہاڑی کی اوٹ سے باہر نکلے اور پھرتی سے ٹرک تک پہنچ گئے۔ برڈ نے ٹرک کی پچھلی طرف سے لمبا چکر کاٹا اور ڈرائیور کی بائیں جانب پہنچ گیا میں اس سے پہلے ہی ڈرائیور کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ ڈرائیور اکیلا ہی تھا' میں نے غرا کر ڈرائیور سے کہا' "فوراً نیچے اتر آؤ ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔" میں نے وہ جملہ انگلش میں ادا کیا تھا۔ ڈرائیور انگلش جانتا ہو یا نہ جانتا ہو' اسلحے کی بین الاقوامی زبان خوب سمجھتا تھا۔ اس نے ٹرک کا اگنیشن آف کیا' اور لرزتا ہوا نیچے اتر آیا۔ وہ بری طرح کھسیا رہا تھا۔ دوسری طرف سے ٹرک کا جائزہ لے کر برڈ بھی اب ادھر ہی آگیا تھا اور رضا اور مسٹر او بھی۔

"اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر پسنجر سیٹ پر بٹھا لو ٹرک برڈ چلائے گا۔"

"میرا مشورہ ہے کہ ڈرائیونگ اسی کو کرنے دو۔ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر ہمارا کوئی ساتھی بیٹھ جائے گا تاکہ اس پر نظر رکھ سکے۔ فوج نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہوں گی۔ ہم میں سے کوئی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو فوراً فوج کی نظروں میں آ جائے گا۔ کرنل اب تک ہمارے حلیے بھی ریڈیو پر نشر کرا چکا ہو گا۔ رضا کو ڈرائیور کے ساتھ بٹھا دیتے ہیں اور ہم سب ٹرک کے پچھلے حصے میں بیٹھتے ہیں۔"

جاپانی اور برڈ دونوں نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔

میں نے رضا سے کہا "تم ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھو' اور یہ ذرا بھی گڑبڑ کرے تو بے دریغ گولی مار دینا۔ ڈرائیور کو بھی اچھی طرح سمجھا دو کہ چالاکی کا انجام کیا ہو گا۔"

رضا نے ڈرائیور کو اسٹیرنگ پر بیٹھنے کا حکم دیا' اور اکھڑ لہجے میں اس سے کچھ کہتا رہا۔ ڈرائیور زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا اور بار بار سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ رضا نے شاید اسے میری طرف سے کچھ زیادہ ہی دہشت زدہ کر دیا تھا' پھر ہم لوگ ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف بڑھے تو مجھے اچانک تہمینہ کا خیال آیا۔ وہ معصوم لڑکی انتہائی اداسی کے عالم میں حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اچانک میرا دل بھی بھر آیا' میں نے بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا' اور بھرائی آواز میں بولا۔ "میری بہن! اگر میں زندہ رہا تو ایک مرتبہ پھر تیرے پاس آؤں گا۔ خدا حافظ۔"

تہمینہ سسکتی ہوئی میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ میری بات سمجھی تھی یا نہیں' مگر میرے جذبات کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔ واقعی جذبوں کی کوئی زبان نہیں ہوتی وہ ر ندگی

ہوئی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی- ایک دفعہ تو میرا دل چاہا کہ اسے بھی اپنے ساتھ بٹھا لوں مگر میری زندگی کا تو خود کوئی بھروسہ نہیں تھا' پھر وہ بھی کسی کی عزت تھی- میں نے شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا' اور نرمی سے اسے خود سے علیحدہ کیا- وہ سسکتی ہوئی پیچھے ہٹی' پھر اچانک منہ چھپا کر چٹانوں کی اوٹ میں دوڑتی چلی گئی- میں بھی بوجھل ذہن' اور تھکے تھکے قدموں سے ٹرک میں سوار ہو گیا- میرے سوار ہوتے ہی برڈ نے ٹرک کا پچھلا دروازہ بند کیا' اور اس کی باڈی پر تین دفعہ مخصوص انداز میں ہاتھ مارا- ٹرک اسٹارٹ ہو کر جھٹکے سے آگے بڑھ گیا-

"تم رو رہے ہو خرم؟" برڈ نے حیرت سے مجھے دیکھا- "خیریت تو ہے؟"

"ہاں یار' خیریت ہے-" میں نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا پھر اسے بتایا کہ میں کیوں رو رہا ہوں-

"یار میں بھی کتنا کمینہ ہوں" میری بات سن کر برڈ نے کہا- "میں نے بھی تہمینہ کا والہانہ پن محسوس کر لیا تھا' مگر میں اسے کچھ اور ہی سمجھا-"

"ختم کرو یار"- میں نے بیزاری سے کہا-

"ٹرک ڈرائیور سے یہ تو پوچھ لو کہ وہ کس طرف جا رہا ہے؟" مسٹر او نے کہا-

"رضا ساتھ موجود ہے اس لئے ٹرک ڈرائیور کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتا- اب وہ جہاں بھی جائے ہمیں تو بہرحال کسی شہر تک پہنچنا ہے-"

"چاہے وہ قم ہی کیوں نہ ہو"- مسٹر او نے طنزیہ لہجے میں کہا "ارے یار' تم تو جان کو آ گئے-" میں نے جھنجلا کر کہا- "ہم نے قم سے روانگی کے بعد ڈھائی گھنٹے تک ہوائی جہاز میں سفر کیا تھا- کیا خیال ہے تمہارا! ہم نے اتنی دیر میں کتنا فاصلہ طے کیا ہو گا؟"

"اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا' اس لحاظ سے تو ہم قم سے ہزار بارہ سو کلومیٹر دور ہوں گے-"

"میرا تو خیال ہے کہ ہم تہران کے نزدیک ہیں-" میں نے سوچتے ہوئے کہا- "ظاہر ہے ایران اتنا وسیع و عریض تو نہیں ہے کہ ہوائی جہاز سارا دن چلتا رہے اور اس کی حدود ختم نہ ہوں-"

مسٹر او میری بات کے جواب میں کچھ نہیں بولے-

مختلف جگہوں پر ہمارے ٹرک کو روکا گیا- یہ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ کسی بھی نے ٹرک کے پچھلے حصے کو نہیں کھولا- تقریباً پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے بعد ٹرک ایک مرتبہ پھر ساکت ہو گیا- فوراً ہی دوسری طرف سے رضا نے مخصوص انداز میں دستک دی- اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا سفر ختم ہو گیا- اتنا مجھے اندازہ تھا کہ ہم کسی بارونق اور مصروف سڑک پر کھڑے ہیں- کیوں کہ وہاں گاڑیوں کے انجنوں کا شور اور ہارن گونج رہے تھے- میں نے

ٹرک کا پچھلا دروازہ کھولا' اور محتاط انداز میں باہر جھانکا- میری حیرت کی انتہا نہ رہی' ہم لوگ اس وقت واقعی تہران میں موجود تھے- پھر میں نیچے کود گیا- میرے پیچھے پیچھے مسٹر ا اور برڈ بھی اتر گئے- رضا پہلے ہی نیچے کھڑا تھا- رضا کے ہاتھوں میں ابھی تک ریوالور تھا- میں نے دبی ہوئی آواز میں کہا "اپنا ریوالور چھپاؤ احمق! یہ ویران پہاڑیاں نہیں بلکہ تہران ہے-"

رضا نے جلدی سے اپنا ریوالور پینٹ کی جیب میں ٹھونس لیا- پھر اس نے ٹرک والے سے اکھڑ لہجے میں کچھ کہا- اس نے پھرتی سے ٹرک گیر میں ڈالا اور آگے بڑھ گیا- اس کے جانے کے بعد ہم بھی فٹ پاتھ پر پیدل روانہ ہو گئے- رضا نے مجھے بتایا کہ میں نے اس ٹرک ڈرائیور کو اتنا خوفزدہ کر دیا ہے کہ وہ خواب میں بھی ہمارا نام لیتا ہوا ڈرے گا- میں نے اس سے کہا کہ ہمارے لیڈر نے اب تک ستائیس قتل کئے ہیں اس لئے اٹھائیسواں قتل کرتے ہوئے اسے بالکل افسوس نہیں ہو گا-

"یار' تم نے مجھے اتنا زبردست خونی بنا دیا-" میں نے ہنس کر کہا-

"یہ ضروری تھا-" رضا نے سنجیدگی سے کہا- "ورنہ یہاں سے جاتے ہی وہ سیدھ تھانے جاتا' اور بتاتا کہ اس اس حلیے کے چار مشکوک افراد فلاں جگہ سے میرے ٹرک میں یہاں تک آئے ہیں- ہمارا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا-"

"وہ تو اب بھی یہی کرے گا-" میں نے تشویش سے کہا- مجھے اندازہ نہیں تھا' کہ ہم لوگ براہ راست تہران پہنچ جائیں گے- میرا خیال تھا کہ ہم لوگ کسی چھوٹے موٹے قصبے میں پہنچیں گے- وہاں سے ٹیکسی یا بس کے ذریعے تہران چلے جائیں گے- ٹرک ڈرائیور اگر پولیس کے پاس گیا بھی تو پولیس ہمیں اس قصبے میں اور آس پاس تلاش کرتی رہے گی' مگر اب تو بات ہی دوسری تھی- ٹرک ڈرائیور اگر سیدھا تھانے پہنچا تو ہم کیا کر سکتے تھے-

"وہ ایسا نہیں کرے گا-" رضا نے پریقین انداز میں کہا- "میں نے ٹرک ڈرائیو سے کہا تھا کہ اگر وہ پولیس کے پاس گیا تو ہمارا گینگ اسے تلاش کر کے مار دے گا- ہمار تنظیم بین الاقوامی طور پر کام کرتی ہے' اور پولیس میں بھی ہمارے بہت سے دوست موجو ہیں- یہ اطلاع تو ہمیں فوراً مل جائے گی کہ تم نے پولیس سے رابطہ قائم کیا ہے' پھر ممکن ہے وہی پولیس افسر تمہیں اٹھا کر بند کر دے جس سے تم ہماری رپورٹ کرو گے-"

اس کی بات سن کر میں نے سکون کا طویل سانس لیا- میرے ذہن سے بہت بڑا بو ہٹ گیا تھا- ہم سب کا حلیہ پہلے ہی ہپیوں والا تھا' رہی سہی کسران ٹورسٹ بیگز پوری کر دی تھی جو ہماری پشت پر لدے ہوئے تھے- چلتے چلتے مجھے ایک ریسٹورینٹ نظ آیا- بے اختیار میرے قدم اس طرف اٹھ گئے- ہم سے پہلے بھی وہاں بہت سے غیر مل سیاح موجود تھے' بیشتر کا سامان ان کے ساتھ تھا- میرے پیچھے پیچھے بقیہ لوگ ریسٹورنٹ م

چلے آئے۔ بہت دن سے ہم نے ڈھنگ کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اصولی طور پر تو پہلے ہمیں اپنے حلیے درست کرنا چاہئے تھے۔ شیو بڑھے ہوئے تھے' بال الجھے ہوئے تھے اور کپڑے میلے چیکٹ ہو رہے تھے مگر ہمارے ہی حلیوں کے ٹورسٹ بھی وہاں موجود تھے۔ اس لئے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

سیر ہو کے کھانے کے بعد گرم گرم کافی پی کر تو یوں محسوس ہوا جیسے مجھے دوبارہ زندگی ملی ہو۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ برڈ نے ابھی تک وہسکی کی خواہش نہیں کی تھی۔ واقعی بھوک میں کھانا ہی سب سے بڑا نشہ ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے بھی محض کھانا کھانے سے سرور آگیا تھا۔

"اب ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہمارا آئندہ لائحہ عمل کیا ہونا چاہئے۔" مسٹر او نے کافی کی پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

"فی الحال تو میں جی بھر کے سونا چاہتا ہوں۔" برڈ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "پہلے کسی ہوٹل میں چل کے کمرے لے لیتے ہیں۔"

"اس کے لئے ہمیں اپنا حلیہ درست کرنا پڑے گا۔ اس حلیے میں ہمیں کسی اچھے ہوٹل میں کمرے نہیں ملیں گے۔" میں نے کہا۔

"چلو پھر کسی حمام میں چل کر اپنے حلیے درست کر لیں۔ وہاں سے نکل کر ہم نے ایک سپر اسٹور سے اپنے استعمال کے دو جوڑے کپڑے خریدے۔ مشہدی نے ہمیں خاصی رقم دی تھی جو اب ہمارے کام آ رہی تھی۔

شیو کرنے اور نہانے کے بعد جب میں کپڑے بدل کر باہر نکلا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دوسروں کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ ہوٹل میں جانے سے پہلے مسٹر او نے تجویز پیش کی کہ ہم سب کو ایک ساتھ ہوٹل میں نہیں داخل ہونا چاہئے۔ ایرانی پولیس اور محکمہ خفیہ ہماری تلاش میں ہے۔ ہمیں ہر طرح سے احتیاط کرنا چاہئے۔ ہم سب نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ مجھے رہ رہ کے اس پہ حیرت ہوتی تھی۔ آخر وہ کس امید پر ہمارے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اگر اسے دولت کی خواہش تھی تو اس نے ہم سے خزانہ چھیننے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ اس دوران میں ایسے بہت موقع آئے تھے وہ ہم سے خزانہ چھین سکتا تھا' مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ آخر کیوں؟ دوسری طرف وہ ان دستاویزات اور مائیکرو فلمز کے لئے پریشان تھا۔ ان چیزوں کے ذریعے بھی تو وہ دولت ہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ان سوالات پر بہت غور کیا تھا۔ بہت مغز ماری کی تھی' مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تھا۔ اب وہ خود ہی یہ تجویز پیش کر رہا تھا کہ ہم سب ہوٹل میں ایک دوسرے سے لاتعلق رہیں۔ اس دوران میں ہم اس کی نظروں سے اوجھل بھی ہو سکتے تھے' پھر مجھے ایک خیال یہ بھی آیا کہ اگر اس نے ہمیں پولیس کے حوالے کر دیا تو؟ لیکن میں

نے اس خیال کو بھی مسترد کر دیا۔ ہماری گرفتاری سے اسے فائدہ کی بجائے نقصان ہی ہوتا۔ خیر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں نے سارے خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

ہم نے طے کیا تھا کہ ہالی ڈے ان میں قیام کریں گے۔ برڈ' رضا' اور مسٹراو پہلے ہی علیحدہ علیحدہ روانہ ہو چکے تھے۔ ان کے جانے کے بیس منٹ بعد میں بھی ایک ٹیکسی کے ذریعے ہالی ڈے ان پہنچ گیا۔ وہاں مجھے بہت آسانی سے کمرا مل گیا۔ اس زمانے میں وہاں اتنی سختی نہیں تھی۔ کاؤنٹر کلرک نے خاموشی سے رجسٹر کھول کر اندراج کیا اور چابی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "روم نمبر فور ون ٹو!"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ایک بیرے کے ہمراہ لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چونک کر بولا۔

"یس کم ان!"

دوسرے ہی لمحے رضا مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ "برڈ اسی فلور پر کمرہ نمبر چار سو چھے میں' مسٹراو کمرہ نمبر دو سو سات میں اور میں دو سو نو میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ بس میں یہی اطلاع دینے آیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ لاک کیا' اور نرم گرم بستر میں گھس گیا۔

پھر میں ایسا سویا کہ دوسرے دن دوپہر کی خبر لایا۔ میں شاید اس وقت بھی نہ اٹھتا مگر دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک سے میری نیند کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی وہ ایک بجا رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے برڈ کھڑا تھا۔

"یار کمال ہے' تم تو ایسے سوئے جیسے اب اٹھو گے ہی نہیں۔ میں تین دفعہ چکر لگا کر جا چکا ہوں۔"

"تم کب اٹھے؟" میں نے جماہی لے کر پوچھا۔

"میں بھی تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "تم جلدی سے شاور لے لو' پھر بریک فاسٹ ساتھ ہی کریں گے۔"

"بریک فاسٹ کم لنچ!" میں نے ہنس کر کہا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

"یار خرم! یہ مسٹراو میری سمجھ میں نہیں آیا۔" ناشتے سے فارغ ہو کر برڈ نے کافی پیتے ہوئے کہا۔

"یار سمجھ میں تو میری بھی نہیں آیا' مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ اس سے ہمیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"کیوں بھئی' یہ خوش فہمی کیوں ہے تمہیں۔" برڈ نے کہا۔ "تم وہ دن بھول گئے جب اسی مسٹراو نے تمہارے ساتھ مجھے اور رضوانہ کو بھی اغوا کر لیا تھا۔"

"مجھے سب یاد ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر اب اس کا رویہ بالکل مختلف ہے۔"

"زیادہ خوش گمانی اچھی نہیں ہوتی خرم!" برڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے وانگ یو کے ساتھ اتنا وقت گزارا ہے۔ اس کے باوجود تمہیں لوگوں کو پہچاننے کا تجربہ نہیں ہے۔"

"تم کیا جانو وانگ یو کو؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"تمہاری ہی زبان سے سنا ہے یہ وانگ یو کا تذکرہ۔"

"اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ہمیں مسٹر او سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

برڈ میری بات کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور دوسرے ہی لمحے مسٹر او ور دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ آتے ہی بولا۔ "میں نے کہا بھی تھا کہ ہم لوگ آپس میں نہیں ملیں گے مگر تم لوگ اس کی پروا ہی نہیں کر رہے ہو۔ برڈ صبح سے تین چکر لگا چکا ہے یہاں کے۔ دو دفعہ رضا آیا تھا۔"

"اور اب ایک دفعہ تم خود بھی آ گئے۔" برڈ نے طنز سے کہا۔

"میں تو صرف تم لوگوں کو خطرے سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔ ہوٹل میں محکمہ خفیہ کا ایک افسر موجود ہے۔ صبح سے کئی دفعہ آرمی والے بھی چکر لگا چکے ہیں۔ ابھی تو انہیں شبہ نہیں ہے مگر تم لوگ یونہی ملتے رہے تو ہو جائے گا۔"

"مسٹر او کیا ہم آئندہ ایک دوسرے سے بالکل بات نہ کریں۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" مسٹر او نے کہا۔ "میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اور برڈ ایک ہی فلور پر ہیں اس لئے کسی کی نظروں میں آئے بغیر ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ تمہیں اور رضا کو البتہ زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔" پھر مجھے اچانک اپنا سوٹ کیس یاد آیا۔ جو مشہدی کے بنگلے پر رہ گیا تھا۔ میں نے مسٹر او سے کہا۔ "میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ میرا سوٹ کیس مشہدی کے بنگلے میں رہ گیا تھا۔ ہو سکے تو وہ کسی طرح مجھے لا دو۔ میں خود بھی وہاں جا سکتا ہوں مگر......"

"ٹھیک ہے' میں لا دوں گا' تم تو ادھر کا رخ بھی مت کرنا۔ مجھے وہاں کوئی نہیں پہچانتا۔ تمہیں تو اس بنگلے کا ہر فرد پہچانتا ہے۔ خزانے کی چوری کے ساتھ ہی مشہدی کی تلاش شروع ہو چکی ہو گی۔ ممکن ہے خفیہ پولیس والوں نے مشہدی کے بنگلے کی نگرانی بھی شروع کر دی ہو۔ تم یہاں رہو میں تمہارا سوٹ کیس لے آؤں گا۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں بنگلے کے کون سے کمرے میں مقیم تھا' اور سوٹ کیس کی پہچان کیا ہے۔

مسٹر او یہ کہہ کر چلا گیا کہ آج رات تک تمہیں سوٹ کیس مل جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد برڈ بھی چلا گیا۔ رضا صبح سے ایک دفعہ بھی نہیں آیا۔ میں نے سوچا' ہم

لوگوں نے بھی رضا کو خواہ مخواہ روک رکھا ہے۔ اب اس بیچارے کا کام کیا ہے۔ پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج رضا کو اجازت دے دوں گا کہ وہ جانا چاہے تو چلا جائے۔

میں تھوڑی دیر تو بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا' پھر کپڑے بدل کر برڈ کے کمرے کی طرف گیا' مگر اس کا کمرا لاک تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری طرح برڈ بھی بور ہو رہا تھا۔ وہ اپنا دل بہلانے چلا گیا ہو گا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کیسے بہلاتا ہے اس کا دل بہلنے کا سب سے بہترین ذریعہ جوا تھا۔ جب وہ جوا کھیلتا تھا تو شراب بھی ضرور پیتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ برڈ نشے کی حالت میں تمام رقم ہار جائے۔ ہمارے پاس مقامی کرنسی بہت قلیل مقدار میں تھی۔ کروڑوں کا خزانہ میرے قبضے میں تھا مگر میں اس میں سے سونے کا ایک کیوب یا چھوٹا سا کم قیمت ہیرا بھی نکالنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے رہ رہ کے برڈ پر غصہ آ رہا تھا کہ اس بے سروسامانی کی حالت میں بھی اسے عیاشی سوجھ رہی ہے۔ میں تھوڑی دیر ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر دوبارہ کمرے میں چلا گیا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد برڈ آ گیا۔ وہ سیدھا میرے کمرے میں آیا اسے دیکھتے ہی میں نے پوچھا "کتنی رقم گنوائی؟"

"گنوائی! وہ ہنس کر بولا۔ "آج تو میری قسمت زوروں پر ہے۔ آج میں نے اتنی رقم جیتی ہے کہ اسے سنبھالنا مشکل ہے۔ تم سناؤ کیا حال ہے؟"

"یار میرا خیال ہے کہ اب رضا کو روانہ کر دیا جائے۔ ہم نے خواہ مخواہ روک رکھا ہے اس بیچارے کو۔"

"ہاں' رضا کو روکنا فضول ہے۔" برڈ نے جواب دیا۔ پھر ہم موجودہ حالات پر گفتگو کرنے لگے۔ برڈ نے بتایا کہ ایران کی تمام سرحدوں پر بہت سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ ہمیں فوری طور پر یہ اپنا حلیہ بدل لینا چاہیے۔" یہ کہہ کر اس نے انگلش اور فارسی کے کئی اخبار نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔

میں نے دلچسپی سے ان اخبارات کو دیکھا مگر ایک اخبار کی شہ سرخی پر نظر پڑتے ہی میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ کئی دن پرانا اخبار تھا۔ اس کی شہہ سرخی یہ تھی۔ "قم کے شاہی محل میں زبردست ڈاکا۔ ڈاکو اربوں روپے کا خزانہ لوٹ کر لے گئے۔" خبر خاصی تفصیل سے تھی کہ ڈاکے میں سرکاری اہل کار بھی شریک ہیں۔ یہ کسی بین الاقوامی گروہ کا کام ہے کیوں کہ تمام ڈاکو غیر ملکی تھے اور محل کے محافظ کے مطابق سب ڈاکو سفید فام قوموں سے تعلق رکھتے تھے۔ خیال یہ ہے کہ ان کا تعلق امریکہ سے تھا۔

دوسرے اخبارات میں بھی اسی قسم کی خبر تھی۔ صرف ایک اخبار نے کچھ زیادہ تفصیل شائع کی تھی۔ اس کے مطابق ڈاکوؤں میں سے دو ایشیائی باشندے تھے اور دو یورپین' ان میں سے ایک انڈین' پاکستانی یا ترک تھا۔ اس اخبار نے کرنل کی یادداشت کے

ہمارے ہم سب کے خیالی اسکیچز بھی شائع کیے تھے۔ ان اسکیچز میں رضا اور میں بالکل نہیں پہچانے جا رہے تھے۔ برڈ کا خیالی اسکیچ گھنی مونچھوں کی وجہ سے خاصی حد تک اس سے مل رہا تھا۔ مسٹراد بھی خیالی اسکیچ میں پہچانا جا رہا تھا۔ کسی بھی اخبار میں مشہدی کا نام نہیں تھا۔ ممکن ہے اس کا نام حکومت نے جان بوجھ کر نہ دیا ہو۔ بہرحال وہ ذمے دار سرکاری ملازم تھا۔ اس کا نام دینے میں حکومت کی بھی بدنامی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی تو ہم دونوں ہی چونک اٹھے۔ پھر مسٹراد ر دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ وہ چہرے سے تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ وہ کرسی پر تقریباً ڈھے گیا۔

"کہاں گھوم آئے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ ضروری انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ ہوٹل میں ہمارا گزارہ نہیں ہو گا اس لئے میں نے ایک مکان کا بندوبست کیا ہے۔ وہ مکان پہلے بھی ہمارے پاس تھا' مگر پچھلے مہینے میں نے اسے خالی کر دیا تھا۔"

"تمہارے ساتھی بھی تو ہوں گے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

اس وقت میرے نو ساتھی ایران کے مختلف شہروں میں ہیں۔ تین یہیں تہران میں ہیں' بقیہ کو بھی میں نے یہاں طلب کیا ہے۔ ہم آج رات اس مکان میں شفٹ ہو جائیں گے۔"

"ہم نہیں' صرف تم!" برڈ نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "آئندہ کا پروگرام ہم اپنے طور پر طے کریں گے۔"

"پاگل پن کی باتیں مت کرو۔" مسٹراد جھنجلا گیا۔ "یہ میں تمہارے ہی بھلے کو کہہ رہا ہوں۔"

"ہم اپنا اچھا برا خود سمجھتے ہیں۔" برڈ نے اسے جھڑک دیا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں تم پر بھروسہ نہیں ہے۔"

مسٹراد حیرت سے اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ پھر وہ دل گرفتہ سا ہو کے بولا۔ "تمہیں ابھی تک مجھ پر بھروسا نہیں ہے میں چاہتا تو اب تک تم دونوں کو ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔ مجھے ایسے بہت سے چانس ملے جب میں تم دونوں کو ٹھکانے لگا سکتا تھا' مگر میں نے ایسا نہیں کیا' جانتے ہو کیوں؟ میں خرم کو کھونا نہیں چاہتا نہ جانے کیوں مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے میں چاہتا تو تم لوگ اب تک ایران کے کسی قید خانے میں سزا کے منتظر ہوتے' مگر میں نے یہ بھی نہیں کیا۔ میں کر ہی نہیں سکتا۔ اب تم لوگ مجھ سے الگ ہونا چاہو گے' تو تمہیں میں نہیں روکوں گا' مگر کم از کم میرے خلوص پر شک تو مت کرو۔"

"خلوص' مروت' محبت وغیرہ کے الفاظ ہم زیرِ زمین دنیا کے رہنے والوں کو اپیل نہیں کرتے۔" برڈ نے حقارت سے کہا۔ "ڈینی بھی بہت مخلص تھا میرے ساتھ' مگر پھر کیا ہوا؟"

برڈ کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔
"برڈ۔" میں نے اسے ٹوکا۔ "تمہیں مسٹراو کی توہین نہیں کرنا چاہیے۔"
"تم اگر اس کے ساتھ جانا چاہو ہو تو چلے جاؤ۔" برڈ برہمی سے بولا۔ "مگر پھر میری
اور تمہاری راہیں الگ الگ ہوں گی۔"
مجھے امید نہیں تھی کہ برڈ اتنا شدید رد عمل ظاہر کرے گا۔ میں نے جلدی سے کہا
"تم تو یار' نخرے باز عورتوں کی طرح بات کر رہے ہو۔ میں نے کہا کہ میں جا رہا ہوں۔"
پھر میں نے موضوع بدلنے کو مسٹراو سے کہا۔ "تم نے اخبارات دیکھے؟"
"ہاں" میں دیکھ چکا ہوں۔ مسٹراد آہستہ سے بولا اور اٹھ کھڑا ہوا "تم نے مجھ سے
سوٹ کیس لانے کو کہا ہے' وہ میں آج رات تک تمہیں پہنچا دوں گا۔ میں ہر روز تمہیں
فون کیا کروں گا۔ اگر ہوٹل چھوڑو تو مجھے اطلاع کر دینا۔ میں اب چلتا ہوں۔" اس نے
باری باری ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور شکستہ انداز میں باہر نکل گیا۔
اس کے جانے کے بعد برڈ طنزیہ انداز میں بولا۔ "برا آیا ہمارا ہمدرد' اونہہ ...."
جو باتیں وہ کر رہا تھا ان میں سچائی اس نے کہا۔
اس کی ہر بات درست تھی' مگر میں اس کے باوجود یہ ماننے کو تیار نہیں کہ وہ بغیر
کسی مطلب کے ہمارے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ کچھ دن ٹھہر جاؤ' وقت آنے پر تم بھی قائل ہو
جاؤ گے۔"
"اب تم نے آئندہ کے لئے کیا سوچا ہے؟"
"آج رات اس مسئلے پر تم بھی غور کرو میں بھی کرتا ہوں۔ صبح بات کریں گے۔
تو طے ہے کہ فوری طور پر ہم ایران نہیں چھوڑ سکتے' کیوں کہ ایران کی حکومت نے تمام
بارڈرز سیل کر دیئے ہیں۔ غیر ملکیوں پہ تو بہت سختی کر دی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں
ہوٹل چھوڑ دینا چاہیے۔"
"پھر...... پھر کہاں جائیں گے ہم" میں نے پریشانی سے پوچھا۔
اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور رضا اندر داخل ہوا۔ برڈ نے رضا کو دیکھا ا
ایک دم اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "اس سلسلے میں رضا ہمار
کام آئے گا۔ یہ مقامی ہے اس لئے اس کے دوست وغیرہ تہران یا ایران کے کسی بھی
میں ہوں گے۔ اس کے ذریعے ہم کرائے کا مکان بھی حاصل کر سکیں گے۔"
"گڈ آئیڈیا۔" میں خوش ہو کر بولا۔ "اچھا ہوا' میں نے اب تک رضا کو رخص
نہیں کیا۔"
"تم اس سے بات کرو۔" برڈ نے کہا۔ "دیکھو یہ کیا کہتا ہے؟"
رضا خاموشی سے بیٹھا ہم دونوں کا منہ تک رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ر

ہمیں ایک دفعہ پھر تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"آپ حکم کریں' مجھ سے جو کچھ ہو سکا ضرور کروں گا۔"

"یہاں تمہارے جاننے والے تو ہوں گے! میرا مطلب ہے دوست یا رشتے دار۔"

"یہاں میرا ایک دوست ہے تو۔" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا "آپ کام تو بتائیں۔"

"ہم ہوٹل میں نہیں رہنا چاہتے۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر وہ...."

"میں اس سے بات کروں گا۔" رضا نے جلدی سے کہا۔ "وہ میرا بہت اچھا دوست ہے' انکار تو نہیں کرے گا لیکن غریب آدمی ہے اس لئے شاید آپ کو وہاں تکلیف ہو۔"

"اچھا اسے چھوڑو' تم مکان کا بندبست تو کر سکتے ہو؟"

"ہاں وہ تو خیر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" رضا جلدی سے بولا "مکان کا بندوبست تو میں کل ہی کر لوں گا۔"

"ایک بات کا دھیان رکھنا کہ مکان الگ تھلگ ہو' کسی اچھی آبادی میں ہو تاکہ کسی کی مداخلت کا اندیشہ کم سے کم ہو۔"

"ٹھیک ہے' میں سمجھ گیا۔" رضا نے کہا۔ "میں کل ہی سے مکان کی تلاش شروع کر دیتا ہوں۔ اچھی آبادی میں تو مکان آسانی سے مل جائے گا۔"

پھر میں نے کمرے ہی میں کھانا منگوا لیا۔ کھانا کھانے کے بعد رضا چلا گیا۔ برڈ نے ایک مرتبہ پھر مسٹر او کا موضوع چھیڑ دیا۔ اس کا موضوع چھڑا ہی تھا کہ وہ آ موجود ہوا۔ وہ خاصا پر جوش دکھائی دے رہا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا "میں تمہارا سوٹ کیس لے آیا ہوں۔"

میں چونک کر بولا لے آئے ہو سوٹ کیس سے۔

"اس کے لئے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا' تمہارے لئے میرے پاس ایک خوش خبری بھی ہے۔ اپنے ہمدرد سے اجازت لے لو۔" اس نے برڈ پر طنز کیا۔

"چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ آؤ برڈ۔" میں نے اسے بھی چلنے کی پیش کش کی۔

"تھینک یو۔" اس نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔ "میں یہیں تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

"او کے' میں ایک گھنٹے تک آ جاؤں گا۔" میں نے کہا پھر مسٹر او سے مخاطب ہوا۔

"ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ تو نہیں لگے گا؟"

"ممکن ہے دو گھنٹے لگ جائیں۔ میرا مکان یہاں سے بہت دور ہے۔"

ہوٹل کے باہر سیاہ لیموزین موجود تھی۔ مسٹر او کا ایک ساتھی پہلے ہی اسٹیرنگ وہیل

کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہمارے سوار ہوتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

تقریباً" آدھے گھنٹے کے بعد ہم اسی مکان پر جا پہنچے جہاں مسٹراو نے ہمیں پہلے بھی بند کیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر مسٹراو سیدھا اندرونی کمرے کی جانب چل دیا۔ میں سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اندرونی کمرے کا منظر دیکھ کر میں گنگ سا رہ گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں باوقار سا ایک ایرانی بندھا پڑا تھا اور دوسرے کونے میں رضوانہ پڑی تھی۔ وہیں میرا سوٹ کیس بھی رکھا تھا۔ وہ دونوں بے ہوش تھے۔

میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں مسٹراو کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ "اس لڑکی کو تو میں اس لئے لے آیا کہ شاید تمہیں اس کی ضرورت ہو۔"

"مسٹراو!" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "فضول گفتگو اور حرکتوں سے پرہیز کرو۔ ہمیں اگر کسی کی ضرورت پڑے گی تو خود نمٹ لیں گے۔"

میں نے دیکھا رضوانہ آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہی ہے۔ آنکھ کھلتے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ چونک کر بولی۔ "خرم! ٹھیک تو ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

"مگر میں بالکل ٹھیک نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔ "بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے بلانے کا۔"

"یہ ان کا کمال ہے۔" میں نے مسٹراو کی طرف اشارہ کیا' پھر میں مسٹراو سے مخاطب ہوا۔ "ہاں' وہ خوشخبری کیا ہے جس کے لئے تم مجھے یہاں لائے ہو؟"

"صبر کرو' ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" مسٹراو نے ہنس کر کہا "پہلے ان صاحب کو تو ہوش میں آ جانے دو۔"

"یہ ہوش میں آنے کے بعد بھی تمہارے کسی کام نہیں آئے گا کیونکہ تمہیں فارسی نہیں آتی اور اسے جاپانی زبان نہیں آتی ہو گی۔"

"مگر اسے انگلش بھی آتی ہے اور اردو بھی!" مسٹراو نے جواب دیا۔ "یہ گزشتہ دس بارہ سال سے پاکستان میں ہے اور کل ہی یہاں پہنچا ہے۔"

ایرانی کسمسانے لگا' پھر اس نے آنکھیں کھول دیں پہلے تو وہ صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا' پھر اچانک اٹھنے کی کوشش کی مگر ہاتھ پیر بندھا ہونے کی وجہ سے اٹھ نہیں سکا۔ اس نے نظر اٹھا کر اب تک ہم میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ہماری وہاں موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

"آرام سے پڑے رہو۔" مسٹراو نے سرد لہجے میں کہا۔ اس نے جملہ اردو میں ادا کیا تھا۔

ایرانی چونک کر اسے گھورنے لگا اور بولا "تم مجھے کہاں لے آئے ہو اور کیوں؟

تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ میں کون ہوں۔ اپنی بہتری چاہتے ہو تو مجھے جانے دو ورنہ ایران کی زمین تم پر تنگ ہو جائے گی۔"

"اچھا زیادہ جوش میں مت آؤ۔" مسٹر اد نے اسے ٹوک دیا۔ "تم ایران میں نہیں ہے۔ اب بولو کہاں کی زمین تنگ ہو گی مجھ پہ!"

یہ سن کر ایرانی جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "یہ ایران نہیں تو کون سا ملک ہے؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کون سا ملک ہے۔ تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم ایران میں نہیں ہیں۔ ایک بات اور ذہن نشین کر لو کہ ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ کسی ملک کی سرحدیں اور فاصلے ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ تمہاری تو کوئی حقیقت ہی نہیں ہے ہم تو حکومتوں کے تختے الٹتے ہیں۔" مسٹر اد نے سرد لہجے میں کہا۔ "اس لئے جو کچھ تم سے پوچھا جائے، سچ سچ بتا دینا ورنہ کسی کو تمہاری قبر کا نشان نہ مل سکے گا۔"

"دیکھو مجھ سے اس لہجے میں گفتگو مت کرو۔" ایرانی نے اپنے لہجے کی کپکپاہٹ چھپانے کی کوشش کی۔ "میں ایران کا معزز شہری اور شاہی خاندان کا فرد ہوں۔ اس کے علاوہ میرے پاس پاکستان کی شہریت بھی ہے۔ اگر میں پاکستان میں ہوں، تب بھی تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" ایرانی نے سنبھالا لینے کی کوشش کی مگر اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

مسٹر اد تضحیک آمیز لہجے میں بولا "واقعی تم شاہی خاندان کے فرد ہو؟ ذرا اپنا نام تو بتاؤ!"

"میرا نام علی اکبر اصفہانی ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ رضا شاہ پہلوی ہو۔

"تو مسٹر اصفہانی! تم پاکستان میں بھی نہیں ہو۔" مسٹر اد نے کہا۔ "مشہدی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"کون مشہدی؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

مسٹر اد نے حیرت سے سیٹی بجائی، پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔ "یار تمہیں تو عزت راس ہی نہیں آ رہی تم کیسے معزز شہری ہو میں نے کہا بھی ہے کہ میری ہر بات کا جواب سچ سچ دینا۔" پھر وہ اپنے ایک آدمی سے مخاطب ہوا۔ "معزز مہمان کو ذرا چھت سے لٹکا دو۔"

اس نے یہ جملہ اس انداز میں ادا کیا کہ میرے ساتھ ساتھ رضوانہ کو بھی ہنسی آ گئی۔

مسٹر اد کا ساتھی اسے باندھنے کو آگے بڑھا تو میں نے اسے روک دیا، اور کہا "ٹھہر جاؤ، مسٹر اصفہانی شاہی خاندان کے فرد ہیں انہیں ایک موقع اور دو۔" میں اصفہانی کی طرف مڑ کے بولا۔ "آپ مشہدی کو نہیں جانتے؟"

"جانتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "مگر۔۔۔"
"مشہدی سے تمہارا کیا تعلق ہے۔" مسٹراو نے اس کی بات کاٹ دی۔
"وہ میرا دوست ہے۔" اصفہانی نے طویل سانس لے کر کہا۔
"پاکستان میں تمہاری مصروفیت کیا ہے؟"
"میں وہاں بزنس کرتا ہوں۔"
"کل تم وہاں سے کیا لائے تھے؟" مسٹراو نے ایک اور سوال کیا۔ اصفہانی ہچکچایا تو مسٹراو نے کہا "میں جانتا ہوں' تم کیا لائے تھے' مگر میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

"میں کوئی سمگلر نہیں ہوں' نہ میں کوئی غیر قانونی چیز لے کر آیا ہوں۔"
"چیز تو قانونی ہے' مگر تم اسے غیر قانونی طریقے سے ایران لائے ہو۔" مسٹراو نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
"میں سمجھا نہیں تم کس چیز کی بات کر رہے ہو؟" اصفہانی الجھ کر بولا۔
"تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو اصفہانی۔" مسٹراو کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ کوئی بے جان چیز نہیں ہے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اسے ہمارے حوالے کر دو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں باعزت طریقے سے واپس بھیج دیں گے۔"
اصفہانی نے جلدی سے کہا "وہ مشہدی کی امانت ہے۔ میں اسے مشہدی کے حوالے کر دوں گا' پھر تم جو مرضی آئے کرنا۔"
"اسے مشہدی کے حوالے کرنے کے لیے تمہیں عالم بالا کا سفر کرنا پڑے گا۔ حیران مت ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ مشہدی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اب بولو کیا کہتے ہو؟"
"میں پہلے اس بات کی تصدیق کروں گا۔" اصفہانی نے جواب دیا۔
"تم تصدیق کرتے رہنا۔" مسٹراو نے سخت لہجے میں کہا۔ "مگر لڑکی کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"لڑکی!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "کون لڑکی؟"
"پاکستان سے یہ کسی لڑکی کو ساتھ لایا ہے مجھے یقین ہے کہ وہ لڑکی شہلا کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔"
میرے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مسٹراو جو کچھ کہہ رہا ہے' سچ کہہ رہا ہے۔ میں نے مڑ کے اصفہانی کو دیکھا' پھر چیخ کر بولا "جلدی بتاؤ' کہاں ہے وہ لڑکی؟ یہ تو تمہیں صرف دھمکیاں دے رہا ہے' مگر میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ بتاؤ لڑکی کہاں ہے؟"
"تم کون ہو؟" اصفہانی نے پوچھا۔ "اور تمہارا اس لڑکی سے کیا تعلق ہے؟"

"وہ بدنصیب میری بہن ہے، میری سگی بہن جو مجھ سے کئی برس پہلے بچھڑ گئی تھی۔"
"تم .... خرم ہو؟" اس نے غور سے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں میں ہی خرم ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"میں علیحدگی میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" اصفہانی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
"جو کچھ کہنا ہے ہمارے سامنے کہو۔" مسٹراو نے سخت لہجے میں کہا۔
"مجھے افسوس ہے خرم! میں ان لوگوں کی موجودگی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔" صفہانی نے کہا۔
"تمہارے تو فرشتے بھی بتائیں گے۔" مسٹراو نے دانت پیس کر کہا۔
"تو پھر معلوم کر لو۔" اصفہانی کا لہجہ مضبوط تھا۔ "تم لوگ مجھے جان سے مار دو گے ب بھی میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"
"ابھی نکالتا ہوں تمہارے کس بل۔" مسٹراو نے بھنا کر کہا، پھر اپنے ایک ساتھی سے لہا۔ "اسے چھت سے الٹا لٹکا دو۔"
"یار آخر تمہاری پریشانی کیا ہے؟" میں نے چڑ کر کہا "اگر وہ مجھ سے تنہائی میں بات لرنا چاہتا ہے تو اسے کرنے دو۔"
"آخر ایسی کون سی بات ہے جو یہ ہم سے چھپانا چاہتا ہے؟" مسٹراو بھی چڑ گیا۔
"یہ چھپانا چاہتا ہے، میں تو نہیں چھپاؤں گا۔ میں بعد میں تمہیں بتا دوں گا۔ اب باہر اؤ۔"
اس نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر اپنے آدمیوں کو باہر جانے کی ہدایت کی اور خود بھی ہر نکل گیا۔
"دیکھو خرم!" اصفہانی نے طویل سانس لے کر کہا "گزشتہ ایک سال سے تمہاری بہن یرے پاس ہے۔ ایک سال سے مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے وہ بالکل میری بیٹیوں کی رح ہے۔ وہ بھی تمہیں یاد کر کے روتی رہتی ہے۔"
"مگر اب وہ کہاں ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔
"وہ میرے ساتھ ہی ایران آئی ہے۔ مشہدی کے آدمیوں نے اسے میرے حوالے کیا ا۔ مشہدی میرا بچپن کا دوست تھا اس کے کہنے پر میں نے شہلا کو اپنے پاس رکھ لیا۔ کچھ ن پہلے اسی نے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ شہلا کو لے کر ایران آ جاؤ" اس کا بھائی خرم یں ہے، اور فی الحال پاکستان نہیں جا سکتا۔ میں اسے لے کر یہاں پہنچ گیا۔ غلطی مجھ سے ہوئی کہ مشہدی کی باتوں میں آ کر شہلا کو غیر قانونی طریقے سے یہاں لایا ہوں۔ وہ قانونی ریقے سے آتی تو اس میں کچھ وقت تو لگتا تھا! مشہدی نے فوراً مجھے ایران بلایا تھا۔"
"مبارک ہو خرم!" رضوانہ کی آواز پر میں چونک اٹھا۔ "تمہیں بہت جلد بہن ملنے

والی ہے۔"

میں کمرے میں رضوانہ کی موجودگی کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اس کے بھی ہاتھ پیر بندھے
ہوئے تھے۔ وہ بھلا وہاں سے کیسے جا سکتی تھی۔

"مگر یہ بات تو آپ ان لوگوں کے سامنے بھی بتا سکتے تھے۔ میرے لہجے میں ا
کے لئے خود بہ خود احترام پیدا ہو گیا۔

"یہ لوگ تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔" اصفہانی کی بات نے مجھے چونکا دیا۔
مجھے بے ہوش سمجھ کر آپس میں گفتگو کر رہے تھے، مگر میں نے ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ
سنا ہے جاپانی کے ساتھیوں میں اکثریت یورپین افراد کی ہے، اسی لیے وہ ان سے انگلش
بات کرتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ اب میں دیکھوں گا، خرم میری بات کیسے
نہیں مانتا ہے اگر وہ دستاویزات مجھے نہیں دے گا، تو اپنی بہن سے کبھی نہیں مل سکے
اس نے اس وقت ہوش میں آنے کی اداکاری کی تو اس کے ایک ساتھی نے ریوالور کا دستہ
مار کے مجھے سچ مچ بے ہوش کر دیا۔"

"شہلا، اس وقت کہاں ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ جہاں بھی ہے، محفوظ ہے۔" اصفہانی نے جواب دیا۔ "تم مجھے یہاں سے
میں تمہیں شہلا کے پاس لے چلوں۔"

"اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں ابھی اور اسی
آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں اس کی بندشیں کھولنے لگا۔

"رک جاؤ خرم!" مسٹراد کی آواز سن کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ "یہ اتنا
نہیں ہے میں نے اس کی تمام گفتگو سن لی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تم بھی یہاں
نہیں جا سکتے۔"

"تم۔ تم انتہائی ناقابل اعتبار اور گھٹیا انسان ہو۔" میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
"اس کا مطلب ہے کہ برڈ ٹھیک کہتا تھا کہ تم سانپ کی سی خصلت رکھتے ہو۔ میں ہی
اعتبار کر بیٹھا تھا۔"

"برڈ نے جو کچھ کہا تھا اپنے تجربے کی بناء پر کہا تھا۔ یوں بھی وہ ذہین آدمی
حیرت تو مجھے تم پر ہے تمہیں وانگ یو نے ٹرینڈ کیا ہے، مگر اس کی مکاری ایک فی صد
تمہارے حصے میں نہیں آئی۔"

"آخر تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" میں نے زچ ہو کر کہا۔ "میں نے
بتایا نا کہ میرے پاس نہ وہ دستاویزات ہیں نہ مائیکرو فلمیں!"

"بس تمہاری اسی بات پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔ خیر اگر تمہیں اپنی بہن کی زندگی
ہو گی تو ضرور سچ بولو گے۔" مسٹراد نے کہا۔

اس کی بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ اسے چڑانے کے لیے میں نے قہقہہ لگایا' اور بولا
بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ ابھی تم نے خود سنا ہے کہ شہلا اصفہانی کے پاس ہے۔ اس
باوجود تم اس کی زندگی اور موت کے دعوے کر رہے ہو۔"

"یہ تو لمحوں میں بول اٹھے گا۔" اس نے حقارت سے اصفہانی کو دیکھا۔ "جب اس
جسم کی کھال علیحدہ ہو گی تو اس کی ساری شفقت اور محبت ہوا ہو جائے گی۔"

"آزما کر دیکھ لو۔" اصفہانی نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔ "میں مر جاؤں گا' مگر
کے سوا کسی کو شہلا کا پتا نہیں بتاؤں گا۔"

"دیکھا جائے گا۔" مسٹراو نے ہاتھ اٹھا کر بیزاری سے کہا' پھر اس نے آواز دے کر
ایک ساتھی کو بلایا' اور اس سے کہا "عزت ماب خرم کو بھی باندھ کر الٹا لٹکا دو۔"

پھر وہ مجھ سے بولا "دیکھو خرم! یہاں اچھل کود مت شروع کر دینا' تم اچھی طرح
تے ہو کہ اچھل کود میں میری برابری نہیں کر سکتے' چلو باندھو اسے۔"

اس کا ساتھی میری طرف بڑھا ہی تھا کہ چیخ مار کے اوندھے منہ گر گیا۔ کسی نے اس
بے آواز فائر کیا تھا اور گولی اس کی کھوپڑی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ پھر ایک گونج دار
سنائی دی۔ "بس مسٹراو تمہارا کھیل ختم ہوا۔ اب تم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو
ی کھوپڑی کا بھی یہی حشر ہو گا۔"

وہ آواز سن کر میرا دل مارے خوشی کے بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ وہ برڈ کی آواز تھی۔ اس
حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے میرا تعاقب کیا ہو گا' اور یہاں تک پہنچ گیا ہو گا۔ میں
ی دور اندیشی اور مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں پوائنٹ تھری ایٹ کا
ی اسپیشل تھا جس پر اس نے سائیلنسر لگا رکھا تھا وہ چمڑے کی جیکٹ اور جینز میں ملبوس
پیروں میں لانگ بوٹ تھے۔ برڈ یہ حلیہ عموماً اس وقت اختیار کرتا تھا جب کسی اہم
پر روانہ ہوتا تھا۔ وہ کہتا تھا اس لباس میں نہ جانے کیا بات ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے
میں خون کی جگہ پارہ گردش کر رہا ہو۔ برڈ کے پیچھے رضا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی
ر تھا۔

برڈ نے ابھی تک کسی دوسری طرف نہیں دیکھا تھا' اس کی تمام تر توجہ مسٹراو کی
تھی۔ مسٹراو نے غیر محسوس طریقے سے پیچھے کھسکنے کی کوشش کی تو برڈ سانپ کی طرح
ا۔ "نہیں مسٹراو! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ میں وارننگ بھی نہیں دوں گا'
لاکھ اچھلو کودو مگر میری گولی سے نہیں بچ سکو گے۔ اسی ریوالور سے میں اچھل کود
والے ایک درجن بندر مار چکا ہوں۔ ایک بندر اور سہی۔" پھر وہ رضا سے بولا "یار
مارا جاپانی دوست کام کر کے بہت تھک گیا ہے۔ تم اسے ذرا گہری نیند سلا دو۔"

رضا بھی ہمارے ساتھ رہ کے خاصا ٹرینڈ ہو گیا تھا۔ وہ پھرتی سے مسٹراو کی پشت پر پہنچا اور ریوالور کا دستہ اس کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ اس کی طرف سے بے فکر ہونے کے بعد میں نے برڈ سے کہا "تم مسٹراو کے دوسرے ساتھیوں کی خبر لو میں رضوانہ اور اصفہانی کو کھولتا ہوں۔"

"یہاں اب کوئی نہیں ہے' اس کے دو ساتھی باہر تھے جو باہر ہی بے ہوش پڑے ہیں' ایک یہ پڑا ہوا ہے۔" برڈ نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو مجھے باندھنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیانک انداز میں کھلی ہوئی تھیں اور کھوپڑی ٹوٹنے سے چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ اس کے اردگرد خون کا ایک تالاب سا بن گیا تھا۔ برڈ نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر بولا "اس کے بس یہی تین ساتھی تھے یہاں۔ چلو اب نکلو یہاں سے۔"

"مسٹراو کا کیا کریں؟" میں نے اصفہانی کو کھولتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اسے یہیں چھوڑ دیں!"

"یار' میں اسے بھی ٹھکانے لگا دیتا' مگر میرا دل نہیں مانتا۔ اس نے ہماری جان بچائی تھی اس لیے مجھ سے اس کی جان نہیں لی جاتی۔"

"مگر اسے یوں چھوڑنا بھی تو خطرناک ہے۔ ہم لوگ جب تک ایران میں رہیں گے' یہ ہمیں پریشان کرتا رہے گا۔"

"میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔" اصفہانی نے کہا "میں اسے قتل کے الزام میں گرفتار کروا دیتا ہوں۔ یہ اس سے پیچھا چھڑانے کا بہترین طریقہ ہے۔"

"ہم لوگ آپس کے معاملات میں پولیس کی مداخلت پسند نہیں کرتے ہیں۔" برڈ نے خشک لہجے میں کہا۔

"بھئی' یہ میرا بھی تو معاملہ ہے۔ اس نے مجھے بھی تو اغوا کیا تھا۔ اب میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کر رہا ہوں تو یہ تمہارا آپس کا معاملہ کیسے ہو گیا؟"

"اصفہانی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں برڈ!" میں نے کہا۔ "یہ اسے اپنے طور پر پولیس کے حوالے کر رہے ہیں' اس سے ہمارا کیا تعلق؟"

"مگر میں تو اس علاقے میں بالکل اجنبی ہوں۔" اصفہانی کچھ سوچ کر بولا "پولیس میری باتوں پر آنکھیں بند کر کے عمل نہیں کرے گی۔"

"مسٹراو نے جھوٹ بولا تھا۔" میں ہنس کر بولا "آپ اس وقت ایران ہی میں ہیں اور تہران کے مضافات میں موجود ہیں۔" میں نے رضوانہ کو کھولتے ہوئے کہا۔

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" اصفہانی خوش ہو کر بولا۔ "اسے باندھ کر ڈال دو تاکہ یہ ہوش میں آنے کے بعد یہاں سے فرار نہ ہو جائے' پھر وہ ذرا رک کر بولا "آؤ ذرا باہر کا جائزہ لیں' معلوم تو ہو کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟"

میں اصفہانی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ باہر آ کر بہت دیر تک اطراف کا جائزہ لیتا رہا' پھر کچھ سوچ کر بولا "ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کون سا علاقہ ہے' مگر مین روڈ پر پہنچ کر معلوم ہو جائے گا۔"

وہیں مسٹراو کی ایک گاڑی بھی کھڑی تھی۔ میں نے وہی استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ برڈ' مسٹراو کو باندھ چکا تھا۔ وہ رضوانہ اور رضا باہر آئے تو ہم اسی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اسٹیرنگ رضا کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے ساتھ برڈ بیٹھا تھا۔ ہم لوگ پچھلی سیٹ پر تھے۔

میں نے اصفہانی سے کہا "ہمیں وہاں لے چلیں جہاں اس وقت شہلا موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اصفہانی نے جواب دیا' اور چلتی گاڑی سے باہر دیکھنے لگا۔ پھر ایک چوراہے سے گزرتے ہی وہ چیخ اٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔ ۔ ں سے سیدھے جا کر اگلے چوراہے سے بائیں جانب موڑ لینا' وہاں پولیس اسٹیشن ہے' میں پہلے اس جاپانی کا بندوبست تو کروں۔"

پھر گاڑی میں سناٹا چھا گیا۔ جو شخص اپنے اپنے خیالات میں گم تھا۔ رضا نے اگلے چوراہے سے گاڑی بائیں جانب موڑی تو دائیں جانب کچھ فاصلے پر پولیس اسٹیشن کی عمارت تھی۔ ہمیں گاڑی ہی میں بیٹھے رہنے کی تاکید کر کے اصفہانی اتر کے اندر کی طرف بڑھا۔ برڈ کے اشارے پر رضا بھی پھرتی سے اترا اور اصفہانی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

"مجھے اس پر بھی اعتبار نہیں ہے۔" برڈ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"اب تو کوئی بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا۔" میں نے جواب دیا پھر میں چونک کر بولا "ہمیں گاڑی سے اتر کے کھڑا ہونا چاہیے۔"

"بیٹھے رہو۔" برڈ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "باہر بھی ہمارے لیے اتنا ہی خطرہ ہے گاڑی میں یہ فائدہ تو ہے کہ ہم کسی بھی وقت یہاں سے فرار ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی رضا اس کے ساتھ گیا ہے۔ اس کی موجودگی میں اصفہانی گڑبڑ نہیں کرے گا۔ میں نے اچھی طرح اسے باور کروا دیا ہے کہ ہم بہت خطرناک اور سفاک لوگ ہیں۔"

اسی وقت اصفہانی مجھے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ رضا بھی تھا۔ رضا نے دوبارہ اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ اصفہانی بھی گاڑی میں بیٹھ گیا' اور بولا "اس جاپانی کا مسئلہ تو حل ہوا۔" پھر وہ رضا سے بولا "اب تم گاڑی کو سیدھا لے چلو۔"

پھر وہ وقفے وقفے سے رضا کو راستہ بتاتا رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد گاڑی ایک وسیع و عریض بنگلے کے سامنے جا رکی۔ اصفہانی کی ہدایت پر رضا نے ہارن بجایا تو فوراً ہی اس سیاہ آہنی گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھل گئی اور دربان نما ایک شخص کا چہرہ نمودار ہوا۔ اصفہانی نے بلند آواز میں کہا "روشن! دروازہ کھولو۔ میں ہوں۔"

روشن پھرتی سے اندر گیا اور دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ رضا گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا۔ گاڑی کی آواز سن کر دو افراد برآمدے میں نکل آئے۔ وہ دونوں حلیے سے ملازم لگ رہے تھے۔ انہوں نے جھک کر گاڑی کے اندر جھانکا' پھر اصفہانی کو دیکھ کر ایک دم مستعد نظر آنے لگے۔

"آؤ۔" اصفہانی نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

میں نے برڈ کو دیکھا' وہ بہت بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ میں خود بھی مضطرب تھا مگر اب تو ہم وہاں تک آ ہی گئے تھے۔اصفہانی کے پیچھے پیچھے میں بھی اترا' پھر رضا' رضوانہ اور برڈ بھی اتر آئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم برآمدے میں پہنچے' پھر دائیں جانب ایک طویل کوریڈور میں مڑ گئے۔ کوریڈور کے فرش پر اتنا دبیز قالین تھا کہ میرے پیر دھنسے جا رہے تھے۔ دونوں اطراف میں کمروں کے دروازے تھے۔ ان میں سے بیشتر بند تھے۔

اصفہانی دائیں سمت کے پانچویں کمرے کے آگے رک گیا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ہم لوگ بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے۔

کمرے میں کوئی لڑکی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ دوسری جانب تھا اس لیے مجھے صرف اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔ اس کا قد و قامت اور خوب صورت بال دیکھ کر میرا دل اچھل کے گویا حلق میں آ گیا۔ مجھے بالکل ایسا لگا جیسے امی کھڑی ہوں۔ وہ ہوبہو امی کی تصویر تھی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا' مارے جوش کے سانس پھول گیا تھا اور شدید سردی کے باوجود میرا چہرہ پسینے میں تر ہو گیا تھا۔ عجیب سی بے وزنی اور خالی الذہنی کی کیفیت تھی۔ میں چاہوں بھی تو اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا۔

"شہلا بیٹی!" اصفہانی نے بہت پیار سے اسے پکارا۔ "دیکھو کون آیا ہے!"

وہ آہستہ آہستہ گھومی تو مارے خوشی کے میری چیخ نکل گئی۔ میں شدت جذبات سے چیخ اٹھا۔ "شہلا!"

"کون ہیں آپ؟" اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں حیرانی تھی۔

"میں تیرا بھائی ہوں شہلا ...! میں ... خرم ہوں۔" جذبات کی شدت سے میری آواز رندھ گئی تھی اور الفاظ میرے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔

اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا' ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"خرم!... کون خرم؟"

مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹ گئی ہو۔

"میں تیرا بدنصیب بھائی خرم ہوں شہلا!" شدت جذبات سے میری آواز بھرا گئی۔

شہلا کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور وہ مجھے یوں بہ غور دیکھنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی کا

احساس ہوا۔

"میں تمہیں بتانا بھول گیا مسٹر خرم؟" اصفہانی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "اصل میں شہلا فی الحال نشہ آور ادویات کے زیر اثر ہے۔ میں نے مجبوراً ایسا کیا ہے ورنہ شہلا میرے ساتھ یہاں آنے پر تیار نہیں تھی۔"

"مجھے بتاؤ، تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟" میں بپھر کر بولا۔

"کوئی پریشانی کی بات ......"

"دیکھو مسٹر اصفہانی!" میں نے تند لہجے میں کہا "اگر شہلا کو کچھ ہو گیا تو میں تم میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اپنی ہی کہے جاؤ گے یا میری بھی سنو گے!" اصفہانی بھی جھنجلا گیا۔

شہلا خالی الذہنی کے عالم میں کبھی مجھے دیکھ رہی تھی، اور کبھی اصفہانی کو۔

"سنو خرم!" اصفہانی نے کہا "اس سے قبل شہلا دو مرتبہ تمہارے نام پر دھوکا کھا چکی ہے۔ ایک دفعہ اسے وانگ یو نے تمہارے پاس لے جانے کا وعدہ کیا تھا، اور لایا نہیں تھا، دوسری دفعہ مشہدی کے آدمیوں نے بھی اسے یہی جھانسا دیا اور قید کر دیا۔"

"مگر مسٹر اصفہانی!" برڈ نے اس دوران میں پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ "یہ آپ کو کہاں ملیں؟"

اصفہانی چند لمحے کے لیے سوچتا رہا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دراصل مشہدی نے اسے میرے ہی پاس رکھا تھا۔ میں بھی دو بیٹیوں کا باپ ہوں۔ مشہدی سے میرا صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ میرے ساتھ سکول میں پڑھتا تھا۔ اس دوستی کے ناطے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کچھ دن تک اس کے ایک ماتحت کی بہن کو اپنے ساتھ رکھ لوں۔ بقول اس کے اس کا وہ ماتحت کام کے سلسلے میں بیرون ملک گیا ہوا تھا، اور اس کی بہن تنہا تھی۔ اس نے مجھ سے یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ وہ لڑکی کچھ اب نارمل ہے اس لیے دھیان رکھنا کہ وہ کہیں نکل ہی نہ جائے۔ بعد میں شہلا نے مجھے صحیح صورت حال سے آگاہ کیا تو حقیقت جان کر مجھے مشہدی پر بہت غصہ آیا۔ پھر اچانک مشہدی نے مجھے شہلا سمیت ایران بلا لیا۔ شہلا میرے ساتھ ایران آنے پر راضی نہیں تھی مجبوراً مجھے ایک ایسی دوا کا سہارا لینا پڑا جس میں انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں، بظاہر وہ ٹھیک ٹھاک لگتی ہے مگر دماغ کام نہیں کرتا، مگر یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔" اصفہانی نے تفصیل بتا کر طویل سانس لیا۔

"اس عارضی کیفیت کی کچھ مدت تو ہو گی!" میں نے پوچھا۔

"ہاں، پانچ روز سے ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے اس دوا کا اثر زائل ہونے میں۔ تین دن تو گزر ہی چکے ہیں۔ آئندہ دو روز میں انشاء اللہ شہلا بیٹی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ یوں

بھی اس کے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔"

"یہ آپ نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا؟" میں عالم اضطراب میں ہاتھ مل کر بولا۔ "برسوں سے میں جس بہن کے لیے تڑپ رہا ہوں' وہ ملی بھی تو کس حال میں۔"

"یہی کیا کم ہے کہ تمہیں اپنی بہن ملی تو!" رضوانہ نے مجھے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

وہ رات ہم نے اصفہانی کے بنگلے میں گزاری' میں اور برڈ ایک ہی بیڈ روم میں تھے' رضوانہ شاید شہلا کے کمرے میں تھی۔ رضا بھی کسی دوسرے بیڈ روم میں تھا۔ میں بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند نہیں آئی۔ میں مسلسل شہلا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آخر ایسی کون سی دوا دی تھی اسے اصفہانی نے کہ اس کا ذہن ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ اصفہانی بھی مشہدی کا ساتھی ہے۔ ممکن ہے اسے پہلے ہی مشہدی کی موت کی اطلاع مل گئی ہو۔ شہلا کو تو وہ پاکستان سے لے ہی آیا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اس کے ذریعے مجھے بلیک میل کرے گا۔ پھر میں نے اس خیال کو بھی مسترد کر دیا۔ اصفہانی کو پہلے سے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ مسڑاو اسے اغوا کرے گا اور میں اس تک پہنچوں گا!

سوچ سوچ کر میرا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ میں کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا تو اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کیا تو مجھے برڈ کی آواز سنائی دی۔ "کیا بات ہے خرم! تم سوئے نہیں؟"

"یار مجھے نیند ہی نہیں آئی۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مگر تم کیوں جاگ رہے ہو؟"

"نیند تو مجھے بھی نہیں آئی۔" برڈ جمائی لے کر بولا' پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا "خرم! تمہارا سامان تو محفوظ ہے نا!"

"یار' وہ ہوٹل ہی میں ہے۔" میں نے جواب دیا "مگر تمہیں اچانک سامان کا خیال کیسے آگیا؟"

برڈ اٹھ کر بیٹھ گیا اور دھیمے لہجے میں بولا "دراصل مجھے اصفہانی پر بھروسا نہیں ہے۔"

"کیوں؟" میں چونک اٹھا۔ گویا برڈ بھی اسی انداز میں سوچ رہا تھا۔

"یار' اس کا رویہ کچھ عجیب سا نہیں ہے!" برڈ نے پرخیال انداز میں کہا۔ "آخر اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ شہلا کو محض تم سے ملانے کی خاطر پاکستان سے یہاں لاتا۔"

"تم بھول رہے ہو برڈ! وہ شہلا کو تو مشہدی کی خواہش پر یہاں لایا تھا۔"

"مگر وہ مشہدی کے بنگلے میں کیا کر رہا تھا! مسڑاو نے اسے اور رضوانہ کو وہیں سے تو اغوا کیا تھا' اور یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ مشہدی کی موت کے بعد ایرانی حکومت نے

اس بنگلے کو یوں لاوارث نہیں چھوڑ دیا ہو گا۔ یہ ایرانی حکومت کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے ہم لوگ اب تک ایران کی خفیہ پولیس کی نظروں میں آ گئے ہوں۔"

"یہ سب باتیں تمہیں پہلے بتانا چاہیے تھیں۔" میں جھنجلا کر بولا۔ "پھر اگر ہم پولیس کی نظروں میں آ ہی گئے ہیں تو وہ انتظار کیوں کر رہی ہے' گرفتار کیوں نہیں کرتی!"

"یہ میرا ایک مفروضہ ہے جہاں تک پہلے یہ باتیں کرنے کا تعلق ہے تو مجھے یقین تھا کہ تم میری کوئی بات نہیں سنو گے۔ اصفہانی نے شہلا کا نام لیا تھا' پھر بھلا تم رک سکتے تھے؟"

"مگر تم تو رک سکتے تھے۔" میں نے کہا۔ "تم پیچھے رہ کر کم از کم برے وقت میں کام تو آ سکتے تھے۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ سب مفروضے ہیں' ممکن ہے اصفہانی کی نیت صاف ہو اور وہ شہلا کو واقعی بیٹی سمجھتا ہو۔ بہرحال جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" برڈ ایک مرتبہ پھر لیٹ گیا اور مجھ سے بولا "لائٹ آف کرو اور سو جاؤ۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی اور دوبارہ لیٹ گیا۔

ابھی مجھے لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میرے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے کسی نے آہنی پھاٹک کھولا ہو۔ گو کہ گیٹ وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا مگر رات کے سناٹے میں وہ آواز مجھے سنائی دے گئی۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے کسی گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز گونجی۔

میں جھپٹ کر اٹھ بیٹھا اور بیڈ سے اتر کر کھڑکی کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ برڈ کی سرگوشی گونجی "لائٹ آن مت کرنا خرم!" یہ کہہ کے وہ بھی پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا' وہ آوازیں اس نے بھی سن لی تھیں۔

ہم دونوں لپک کر کھڑکی تک پہنچے اور اس کا پردہ سرکا کر باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ مجھے آنے والے کی صرف ایک ہی جھلک نظر آئی۔ وہ جینز اور چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس تھا۔ پھر وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا پورچ میں پہلے تین گاڑیاں تھیں مگر اب چار نظر آ رہی تھیں۔

میں نے گھوم کر برڈ سے کچھ کہنا چاہا مگر وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اسی وقت برڈ باتھ روم سے برآمد ہوا۔ باتھ روم کے بلب کی روشنی میں اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے بہت تیزی سے کپڑے بدل لیے تھے اور اب وہ سلیپنگ سوٹ کی بجائے جینز اور جیکٹ میں تھا۔

وہ بیڈ پر بیٹھ کے پھرتیلے انداز میں لانگ شوز پہننے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو برڈ؟" میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

"میں ذرا سن گن لے کر ابھی آتا ہوں۔" برڈ نے کہا۔

"میں بھی چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں پھرتی سے باتھ روم میں گھس گیا، پھر کپڑے بدلنے اور جوتے پہننے میں مجھے مشکل سے دو منٹ لگے۔ برڈ نے مجھے وہیں رکنے کو کہا، مگر میں نے اسے تنہا نہیں جانے دیا۔ ہم دونوں کے پاس ریوالور تو تھے مگر وہ رضا کے پاس تھے اس لیے ہم خالی ہاتھ ہی باہر کی طرف بڑھ گئے۔ ہم دونوں کوریڈور کی دیوار سے بالکل چپکے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ آگے جا کر کوریڈور دائیں جانب گھوم گیا تھا۔ ہم اسی طرح آگے بڑھتے رہے۔

ہم سے کچھ فاصلے پر اچانک شعلہ سا لپکا تو ہم ایک دم زمین پر بیٹھ گئے۔ وہاں موجود کوئی شخص سگریٹ پی رہا تھا، پھر ہم دونوں یونہی جھکے جھکے آگے بڑھے۔

وہاں ایک نہیں بلکہ دو آدمی تھے مگران کا رخ دوسری طرف تھا۔ وہ لکڑی کی ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہماری طرف سے بالکل بے خبر تھے، مگر خفیف سی آہٹ بھی انہیں ہماری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ اچانک میرے ہاتھ میں سگریٹ کا خالی پیکٹ آ گیا۔ میں نے کچھ سوچ کر وہ پیکٹ کارپورچ کی طرف اچھال دیا۔ پیکٹ خفیف سی آواز کے ساتھ فرش پر گرا، مگر رات کے سناٹے میں وہ آواز بھی خاصی واضح تھی۔

وہ دونوں چونک کر باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ پھران میں سے ایک اٹھ کر باہر کی طرف چلا گیا۔ میں نے برڈ کا ہاتھ دبا کر مخصوص اشارہ کیا اور بنچ پر بیٹھے ہوئے شخص پر جست لگا دی۔ میری کوشش یہ تھی کہ اس کی آواز نہ نکلنے پائے۔ میرا بایاں ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جم گیا۔ میرا شکار بری طرح کسمسایا مگر میری آہنی گرفت سے نکلنے میں ناکام رہا۔

برڈ بھی حرکت میں آ چکا تھا۔ اس نے باہر جانے والے شخص کو دبوچ لیا اور دوسرے ہی لمحے اس کا شکار بغیر کوئی آواز نکالے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ برڈ نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا ہو گا۔ وہ اپنے شکار کو زندہ چھوڑنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کے برعکس میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ کسی کی جان نہ لوں۔ میرا شکار اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر اب بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ شاید اسے یہ خطرہ تھا کہ میں اسے بھی ہلاک کر دوں گا۔ برڈ جھکا ہوا اپنے شکاری کی تلاشی لے رہا تھا۔ پھر وہ پھرتی سے ہماری طرف لپکا۔ میں نے جلدی سے سرگوشی میں کہا۔ "اسے باہر لے چلو، میں اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئی تھیں اور مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے برڈ کے داہنے ہاتھ میں ریوالور بھی نظر آیا۔ یہ ریوالور یقیناً اس نے اپنے شکار کی جیب سے نکالا تھا۔

میں نے اپنا ہاتھ مضبوطی سے اس شخص کے منہ پر جمائے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے

اس کی گردن پکڑ کے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بلا چون و چرا کیے ہمارے ساتھ لان کے ایک دور افتادہ گوشے میں پہنچ گیا۔

"انگلش بول سکتے ہو؟" میں نے غرا کر پوچھا تو اس نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا دیتا ہوں لیکن اگر تم نے ذرا بھی گڑبڑ کی یا شور مچایا تو تمہاری گردن اپنے ہاتھوں سے توڑ دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

اس نے دو چار گہرے گہرے سانس لیے' پھر فارسی آمیز انگلش میں اٹک اٹک کر بولا۔ "تم لوگ مجھے مارنا مت میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"اگر تم نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تو نہیں ماریں گے ورنہ تمہارے ساتھی کی طرح تمہیں بھی جہنم رسید کر دیں گے۔" برڈ نے سفاک لہجے میں کہا۔

"میں ..... سب کچھ ... سچ سچ بتاؤں ..... گا .... پوچھو کیا ..... پوچھنا ہے؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اصفہانی اصل میں کون ہے؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں" اس نے الجھ کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے اصفہانی کیا کرتا ہے؟"

"وہ بزنس کرتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ابھی یہاں کون آیا ہے؟"

"ابھی! ..... وہ .... مجھے جان سے ... مار دے گا۔ یہ میں .... نہیں بتاؤں گا۔"

"نہیں بتاؤ گے تو ہمارے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔" میں نے کہا "ویسے کسی کو بھی معلوم نہیں ہو گا کہ تم نے ہمیں کچھ بتایا ہے۔"

"میں .... میں بے موت مارا جاؤں گا۔" ایرانی گڑگڑا کر بولا۔

"باموت تم اب بھی نہیں مارے جاؤ گے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "اب جلدی سے بک ڈالو ورنہ میرے ساتھی کو انسان ذبح کرنے کا بہت شوق ہے۔"

یہ سن کر برڈ نے اس کی ٹھوڑی پکڑ لی جیسے واقعی اسے ذبح کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ پھر بھنا کر بولا "خرم! یہ الو کا پٹھا خواہ مخواہ ہمارا وقت برباد کر رہا ہے۔ شاید اسے اپنے ساتھیوں کا انتظار ہے۔"

برڈ کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے یہ تو دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ وہاں مزید پہرے دار بھی ہو سکتے ہیں۔ میں نے جھپٹ کر ایرانی کے بال پکڑ لیے اور اسے زوردار جھٹکا دے کر بولا "بتاؤ' تمہارے مزید کتنے ساتھی ہیں؟"

"باہر تو ہم دو ہی تھے' دو آدمی مین گیٹ پر ہوں گے۔ ان میں سے ایک ہر آدھے

گھنٹے بعد پورے بنگلے کا چکر لگاتا ہے۔"

"اکیلا؟" برڈ نے پوچھا۔

"ہاں ..... نن ..... نہیں ہم دونوں میں سے کوئی ایک اس کے ساتھ ہوتا ہے۔"

میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے اور برڈ سے کہا "اب اگر یہ فوراً ہی نہ بتائے تو اسے ذبح کر کے یہیں پھینک دینا۔ یہ معلومات ہمیں گیٹ کے پہرے داروں سے بھی مل سکتی ہیں۔ میں گیٹ کی طرف جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں ایرانی کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی باڑ کی اوٹ میں وہیں لوٹ آیا۔

ایرانی جلدی جلدی کچھ بتا رہا تھا۔ میں نے سنا' وہ کہہ رہا تھا۔ "ٹھیک ہے' جب مرنا ہی ٹھہرا تو کچھ بتا کے ہی کیوں نہ مروں۔ اصفہانی واقعی شاہی خاندان کا فرد اور ایرانی خفیہ پولیس کا افسر اعلیٰ ہے۔"

اس کی بات سن کر مجھے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینا آ گیا۔ ایک طرف تو اس نے مسٹر او کو گرفتار کر لیا تھا' اور دوسری طرف ہماری تباہی کے بھی سامان کر دیئے تھے۔ شاید وہ ہمیں صرف اس لیے ڈھیل دے رہا تھا کہ ہم سے شاہی خزانہ حاصل کر سکے۔ میں لپک کر برڈ کے پاس پہنچ گیا اور اس ایرانی سے پوچھا "ابھی ابھی جو شخص یہاں آیا ہے' وہ کون ہے؟"

"وہ بھی ساوک کا کوئی عہدے دار ہے۔" ایرانی نے جواب دیا۔

"اس وقت اس بنگلے میں کل کتنے افراد موجود ہیں؟" برڈ نے پوچھا۔

ایرانی تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا' پھر بولا "آنے والے سمیت سات آدمی تھے' مگر اب چھ ہیں' کیوں کہ ایک آدمی ابھی تمہی لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے۔"

"آنے والا کس کمرے میں گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اسٹڈی روم میں گیا ہے' کیوں کہ اصفہانی وہیں ہے۔ کوریڈور میں بائیں طرف آخری کمرے سے پہلے اسٹڈی روم ہے۔"

میں نے برڈ کو مخصوص اشارہ کیا اور دوسرے ہی لمحے ایرانی لان کی گھاس پر ڈھیر ہو گیا۔

پھر ہم دونوں محتاط انداز میں اسٹڈی روم کی طرف بڑھے۔ اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا مگر اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی مگر الفاظ واضح نہیں تھے یا پھر فارسی ہمارے پلے ہی نہیں پڑتی تھی۔ میں نے بہت آہستگی سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا مگر دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دروازہ کس طریقے سے کھلوایا جائے۔

میں اور برڈ اس صورت حال پر غور کر ہی رہے تھے کہ دروازے کے لاک میں چابی

گھومنے کی آواز آئی۔ ہم دونوں دروازے کی دونوں سمتوں میں دیوار سے چپک گئے۔
اچانک دروازہ کھلا اور ایک دراز قد ایرانی باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اصفہانی بھی تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ دراز قد ایرانی مڑا نہیں ورنہ ہمیں دیکھ لیتا۔ جونہی اصفہانی پوری طرح باہر آیا' برڈ نے سخت لہجے میں کہا "رک جاؤ مسٹر اصفہانی' اور حرکت مت کرنا ورنہ کھوپڑی کے پرخچے اڑا دوں گا۔ تم دونوں اپنے ہاتھ سروں پر رکھو اور گھوم جاؤ۔"
برڈ کی آواز سے اصفہانی تو چونکا ہی تھا مگر وہ نووارد بالکل بت بن کر رہ گیا تھا۔ برڈ نے ڈپٹ کر کہا "کیا تم لوگوں نے سنا نہیں میں اپنی بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔"
وہ دونوں سروں پر ہاتھ رکھ کے پھرتی سے ہماری طرف گھوم گئے۔
"ان دونوں کی تلاشی لو خرم!" برڈ نے کہا۔
میں نے پہلے سوئچ بورڈ تلاش کر کے کوریڈور کی لائٹ آن کی پھر محتاط انداز میں اصفہانی کی طرف بڑھا۔ اس نے بغیر کسی مزاحمت کے تلاشی دے دی۔ اس کی جیبوں سے پرس' پرانے کاغذ اور کئی سو کے کرنسی نوٹ برآمد ہوئے۔ یہ نوٹ اس رقم کے علاوہ تھے جو پرس میں تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اس کی جیب سے ریوالور یا پستول برآمد نہیں ہوا تھا۔ اسے برڈ کی طرف دھکیل کر میں دراز قد ایرانی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے دانت پیس کر انگلش میں کہا "یہ حرکت کر کے تم لوگ اپنے حق میں بہت برا کر رہے ہو۔"
میں نے کوئی جواب دیئے بغیر اس کی تلاشی شروع کر دی۔ اس نے جیکٹ کے نیچے بغلی ہولسٹر لگا رکھا تھا۔ میں نے اس کا ریوالور اپنے قبضے میں کیا اور اسے بھی برڈ کی طرف دھکیلنا چاہا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور میری کن پٹی پر وار کرنا چاہا مگر میں ایک دم بیٹھ گیا۔ اسی پھرتی سے اس نے لات چلائی جو میرے دائیں ہاتھ پر پڑی اور ریوالور فرش پہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس نے میرا گلا دبوچنا چاہا' مگر اس کی یہ حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ میں نے گھوم کے بیک کک پوری قوت سے اس کے سر پر دے ماری۔ اس کے حلق سے دبی دبی کراہ برآمد ہوئی اور وہ جھومتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ فرش پر اگر دبیز قالین نہ ہوتا تو اس کے گرنے کا دھماکا دور تک سنائی دیتا۔ میں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کے اسے گھسیٹا' اور اسٹڈی روم میں لے گیا۔ میرے پیچھے پیچھے برڈ بھی اصفہانی کو ہانکتا ہوا لے آیا۔ اصفہانی کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں کبھی مجھے' کبھی برڈ کو تک رہا تھا۔
"دیکھو مسٹر اصفہانی!" میں نے اس سے کہا۔ "اب جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا۔ ہم تمہاری اور اس گینڈے کی گفتگو لفظ بہ لفظ سن چکے ہیں۔ تمہارا ساوک سے کیا تعلق ہے؟"

اصفہانی نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "تم نے سن ہی لیا ہے تو اب کیا چھپانا' میں ساوک کا سربراہ ہوں۔"

"اس کے باوجود تم اتنے بے پرواہ ہو کہ گھر پہ گارڈز تک رکھنا گوارا نہیں کرتے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں یہاں مستقل نہیں رہتا اس لیے گارڈز کا کیا جواز! اس کے باوجود ساوک کے پانچ بہترین آدمی میرے ساتھ ہیں۔ وہ سب اتنے زبردست فائٹر ہیں کہ ایک آدمی دس پر بھاری ہے۔"

"تمہارے بیس آدمی سامنے والے لان میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے دس تو مارے ہی گئے' بقیہ دس کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔"

"بیس آدمی!" اصفہانی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بھئی' تمہارا ایک آدمی دس پر بھاری ہے نا! ہمارے ہاتھوں تمہارا ایک آدمی مارا گیا ہے اور دوسرا بے ہوش پڑا ہے۔ ممکن ہے اب تک مر ہی گیا ہو۔ اس حساب سے بیس آدمی ہوئے کہ نہیں!"

پھر وہ چونک کر بولا۔ "مگر تم نے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کیسے سمجھ لی؟"

"بڑی دیر میں چونکے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "احمق' ہم نے بلف کیا تھا ورنہ ہمیں فارسی کب آتی ہے۔" پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "اب ذرا جلدی سے ہماری روانگی کا بندوبست کر دو۔ ہاں' شہلا بھی ہمارے ساتھ ہی جائے گی۔"

میری بات سن کر اصفہانی نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "تم بھی کم احمق نہیں ہو خرم! اپنی بہن ہی کو پہچاننے میں دھوکا کھا گئے۔ پاگل آدمی وہ شہلا نہیں ہے۔"

"بکواس کرتے ہو تم! میں نے غرا کر کہا "اگر اس سلسلے میں تم نے مجھ سے مذاق کیا تو تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ وہ شہلا نہیں ہے تو پھر کون ہے؟" میری آواز میں شکست خوردگی تھی۔

"وہ لڑکی ہمارے ہی ساتھ کام کرتی ہے۔ اس کا قد' جسم' بال حتیٰ کہ چہرے کے نقوش بھی کچھ کچھ شہلا سے مشابہت رکھتے ہیں۔ میں نے شہلا کو بہت اچھی طرح دیکھا تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک انوکھی تدبیر آئی میں نے سوچا کہ اس لڑکی کے ذریعے تمہیں بہت آسانی سے بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔"

"مگر شہلا کہاں ہے؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"اگر مجھے علم ہوتا تو اسے لے نہ آتا۔" اصفہانی نے طویل سانس لے کر کہا۔

"ہم سے کیا چاہتے تھے تم؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے قبضے میں شاہی خزانہ ہے' وہ ایرانی حکومت کے حوالے کر دو۔" اصفہانی

نے جواب دیا۔ ”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اور تمہارے ساتھی وہ خزانہ لے کر ایران سے نکل جائیں گے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے‘ بہتری اسی میں ہے کہ اسے لوٹا دو۔“

”اگر ہم وہ خزانہ ایرانی حکومت کو لوٹا دیں تو ایران سے نکل جائیں گے۔؟“ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”اصولاً تو تمہیں سزا ملنا چاہیے لیکن اگر تم وہ خزانہ حکومت کے حوالے کر دو تو میں اپنی ذمہ داری پر تمہیں سرحد پار کروا دوں گا۔“

”سنو مسٹر اصفہانی!“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اگر تم شہلا کو میرے حوالے کر دو تو خزانہ میں تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

”حماقت کی باتیں مت کرو خرم!“ اصفہانی جھنجلا گیا۔

.”شہلا بازار میں بکنے والا کوئی کھلونا نہیں ہے کہ تمہیں لا دیا جائے۔ ہمیں تو خود نہیں معلوم کہ شہلا کہاں ہے۔“

”بکو مت!“ میرا ہاتھ اٹھا اور چٹاخ کی زوردار آواز کے ساتھ اصفہانی کے منہ پر پڑا۔ مشہدی نے مجھے اس کی ویڈیو بھی دکھائی تھی‘ اور فون پر بات بھی کرائی تھی اس سے۔ تم کہتے ہو کہ تمہیں معلوم نہیں۔

اصفہانی کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا۔ وہ بھلا اس سلوک کا عادی کب ہو گا۔ پہلے اس کا چہرہ غصے سے مسخ ہوا مگر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا‘ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”مشہدی نے تمہیں بے وقوف بنایا تھا اسے معلوم ہو گیا تھا کہ شہلا تمہاری کمزوری ہے۔ اس نے ویڈیو دکھا کر‘ اور ٹیلی فون پر بات کرا کے تمہارا اعتماد حاصل کر لیا ورنہ اس نے تو کبھی شہلا کو دیکھا بھی نہیں تھا وہ ویڈیو جو تم نے دیکھی تھی۔ وہ مشہدی نے کہیں سے چرائی تھی۔“

میں شکست خوردہ انداز میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ میری حالت اس مسافر کی سی تھی جو صحرا میں سراب کو پانی سمجھ کے اس تک پہنچے‘ اور سراب اس سے اتنے ہی فاصلے پر ہو۔ میرے دل میں مایوسی کی ایک لہر سی اٹھی جو میرے پورے وجود پر چھا گئی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی انجانی منزل کی طرف نکل جاؤں یا ہر چیز کو فنا کر دوں۔ اس وقت اگر برڈ میرے ساتھ نہ ہوتا تو اصفہانی بہت اطمینان سے مجھے قیدی بنا لیتا۔ میں ایسی ہی خود فراموشی کی حالت میں تھا۔

”اٹھو خرم!“ میرے کانوں میں بہت دور سے برڈ کی آواز آ رہی تھی۔ شاید میں سو گیا تھا اور کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر برڈ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ہوش میں آؤ خرم ورنہ ہم سب بے موت مارے جائیں گے۔“ پھر میرے منہ پر زوردار تھپڑ پڑا تو میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ”اٹھو خرم!“ برڈ ایک مرتبہ پھر چیخا۔ میں گھبرا کر کھڑا

ہو گیا۔ کمرے کا منظر وہی تھا۔ دراز قد ایرانی ابھی تک فرش پر ڈھیر تھا اور برڈ اصفہانی پر ریوالور تانے کھڑا تھا۔ میں نے زور سے سر جھٹکا اور برڈ سے پوچھا "مجھے کیا ہوا تھا؟"

"تم خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا تھے۔" برڈ نے جواب دیا۔ "بہرحال اب جلدی کرو، ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"میں بالکل خالی الذہن تھا۔ برڈ نے احساس دلایا تو مجھے یاد آیا کہ اصفہانی سے میں شہلا کے بارے میں پوچھ رہا تھا' اور شہلا یہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے سخت لہجے میں کہا "مسٹر اصفہانی' یہاں سے ہماری روانگی کا بندوبست کرو' ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"اور .... وہ خزانہ!"

"بکو مت" میں نے پوری قوت سے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ "اب اگر تم نے اس سلسلے میں بکواس کی تو اتنی بری طرح ماروں گا کہ مہینوں بستر پر پڑے رہو گے۔"

"بس تو پھر نکل جاؤ یہاں سے۔" اصفہانی بھی بھنا گیا۔ "اگر تم سمجھتے ہو کہ مجھ پر تشدد کر کے تمہارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو وہ بھی کر دیکھو۔ تم تھرڈ ڈگری کے طریقے مجھ سے زیادہ نہیں جانتے ہو گے۔"

"ہم یہاں سے تو خیر نکل جائیں گے۔ میری بجائے برڈ نے جواب دیا۔ "مگر تمہیں جہنم رسید کرنے کے بعد' بس بہت دن جی لیے۔" ریوالور کی بجائے اب برڈ کے ہاتھوں میں تیز دھار والا پتلا خنجر تھا۔ اس قسم کے خنجر ہمیشہ برڈ کے پاس رہتے تھے۔ میں تمہیں گولی نہیں ماروں گا بلکہ ذبح کروں گا' گولی کی آواز تو دور تک سنی جائے گی۔"

میں نے دیکھا کہ وہ دراز قد ایرانی ہوش میں آ کے حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے سنانے کو برڈ سے کہا "ارے یار' اب کر بھی چکو ذبح' تم نے تو ایک آدمی ذبح کرنے میں اتنی دیر لگا دی۔ ابھی تو یہ دوسرا بھی موجود ہے۔"

دراز قد ایرانی پھٹی پھٹی آنکھوں سے برڈ کو دیکھ رہا تھا۔ برڈ نے اسے ہوش میں آتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر اسے یکسر نظر انداز کر دیا۔

میں اس صورت حال سے اکتا گیا تھا۔ میں نے چیخ کر برڈ سے کہا "جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو برڈ! ہم نے پہلے ہی بہت وقت برباد کر دیا ہے۔ اگر یہ بھی منہ بند رکھے" میں نے ایرانی کی طرف اشارہ کیا' تو اسے بھی ذبح کر دینا۔"

برڈ بغیر کچھ کہے اصفہانی کی طرف متوجہ ہو گیا اور اسے گھسیٹ کے باتھ روم میں لے گیا۔

دراز قد ایرانی اٹھ کر بیٹھ چکا تھا مگر اس کے ہاتھ سر پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ دراز قامت ہونے کے باوجود بہت بزدل تھا۔ ذبح ہونے کے تصور ہی سے وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"سنو مسٹر!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام .... میرا نام .... جم .... جمشید ہے۔" وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ منہ سے صحیح الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"مسٹر جمشید! تم ہم لوگوں کو جانتے ہو؟"

"وہ .... جناب .... میں نے اصفہانی صاحب ہی سے سنا تھا کہ آپ لوگ دہشت گرد ہیں اور شاہ کا خزانہ لوٹ چکے ہیں۔"

"اس وقت اس نے تمہیں کسی خاص کام سے بھیجا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اصفہانی نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں شہر کے تمام فائیو اسٹارز اور فور اسٹارز میں پتا کروں کہ حال ہی میں ان کے ہوٹل میں تین غیر ملکی تو نہیں ٹھہرے ہیں۔"

"پھر کیا معلوم ہوا تمہیں؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ کوئی خاص بات نہیں' ہر ہوٹل میں غیر ملکی سیاح ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"دیکھو مسٹر جمشید!" برڈ نے زہریلے لہجے میں کہا "نہ اصفہانی اتنا احمق ہے اور نہ تم' لہٰذا مجھ سے جھوٹ نہیں چلے گا۔ سچ بولو سچ ورنہ میں تمہارے اس پکے پلائے جسم کو جگہ جگہ سے پنکچر کر دوں گا۔ ذرا دوبارہ بتاؤ کہ اصفہانی نے تمہیں کیا حکم دیا تھا اور تم نے کیا معلوم کیا؟"

"میں تو اب تک سچ ہی بولتا رہا ہوں۔ اب تم لوگوں کو یقین نہ آئے تو اس کا کیا علاج!"

برڈ نے ریوالور کی نالی خاصی قوت سے اس کے منہ پر ماری اور سفاک لہجے میں بولا "میں سچی بات سننا چاہتا ہوں' بتانا نہ چاہو تو نہ بتاؤ مگر جھوٹ مت بولو۔ بہادروں کی طرح موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھو یا ہنستے کھیلتے مر جاؤ۔" برڈ نے کچھ توقف کیا' پھر اچانک وہ باریک پھل والا خنجر پھر نکال لیا۔ اب تمہارا بتانا یا نہ بتانا برابر ہے' کیوں کہ میں تمہاری موت کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ برڈ بے رحمی سے بولا اور بائیں ہاتھ سے اس کے بال پکڑ کے پوری قوت سے جھٹکا دیا۔

ایرانی کے حلق سے اذیت میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی اور وہ سہمے ہوئے انداز میں برڈ کو دیکھنے لگا۔ پھر جونہی برڈ کا خنجر والا ہاتھ بلند ہوا' وہ چیخ کر بولا "بتاتا ہوں۔ میں نے تم لوگوں کا سراغ لگا لیا تھا۔ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ تم لوگ کس ..... ہوٹل میں ..... مقیم ہو۔"

برڈ نے اس کے بال چھوڑ دیئے اور بولا "پھر تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"میں اصفہانی کو اطلاع دینے آیا تھا۔ اصفہانی نے مجھ سے کہا تھا کہ تم لوگوں کے ہوٹل کا سراغ مل جائے تو میں تمہارا سامان وہاں سے لے آؤں۔ میں نے سوچا' تمہارا اور کوئی ساتھی وہاں موجود نہ ہو اور میں سامان لینے کی کوشش کروں تو معاملہ بگڑ جائے۔ اسی

لیے میں اصفہانی سے مشورہ کرنے آیا تھا۔ جمشید ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔ موت سامنے ہو تو بڑے بڑے سورما بکری کی طرح ممیانے لگتے ہیں۔

"سامان تمہیں اتنی آسانی سے نہیں مل سکتا تھا۔" برڈ نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"خرم تو عجلت میں وہاں سے مشہدی کے ساتھ چلا گیا تھا' مگر میرے پاس وقت تھا۔"

"یار' اب اس قصے کو ختم کرو۔" میں نے بیزاری کا مظاہرہ کیا۔ "ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہے۔"

"اوکے' اوکے۔" برڈ نے جلدی سے جواب دیا اور اچانک ہاتھ گھمایا۔ اس کی ضرب جمشید کی کھوپڑی پر پڑی اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر ایک مرتبہ پھر ڈھیر ہو گیا۔

"چلو اب یہاں سے نکلو۔" میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"ایک منٹ" برڈ نے یہ کہتے ہوئے جمشید کے سر پر بھی لات رسید کر دی۔ "اب یہ کم از کم دو گھنٹے تک آرام سے پڑے رہیں گے۔" برڈ ہنس کر بولا' اور دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگا۔

باہر دور دور تک سناٹا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے اس بنگلے میں کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو۔ اس سناٹے میں مجھے برڈ کے سانسوں کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ ہم دونوں دیوار سے چپکے ہوئے آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ رضا' رضوانہ اور شہلا سے مشابہت رکھنے والی لڑکی کس کمرے میں ہو گی۔ برڈ بھی الجھا ہوا تھا۔

میں نے برڈ کو روک لیا اور سرگوشی میں کہا "ایسے ہم ان لوگوں کو نہیں ڈھونڈ سکتے۔ کیا ہم سب کمروں کے دروازوں پر دستک دیں گے؟"

"پھر کیا کریں؟" برڈ جھنجلا کر بولا۔

"میرا خیال ہے کہ مین گیٹ کی طرف چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مین گیٹ پر بھی دو آدمی موجود ہیں۔ انہی سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ ہمارے ساتھی کہاں ہیں؟"

"یہ ٹھیک رہے گا۔ آؤ واپس چلیں۔" برڈ نے کہا اور واپسی کے لیے گھوم گیا۔

واپسی میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہم ایک مرتبہ پھر وہیں پہنچ گئے جہاں ہم نے دو محافظوں کو ناک آؤٹ کیا تھا۔ وہ دونوں غیر فطری انداز میں زمین پر پڑے ہوئے تھے' ایک تو برڈ کے ہاتھوں مارا ہی گیا تھا' دوسرا بھی ختم ہو چکا تھا۔

ہم اونچی اونچی باڑ کی اوٹ میں مین گیٹ تک پہنچے۔ گیٹ کے ساتھ ہی محافظوں کے لیے مختصر سا ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ گیٹ کی دونوں طرف ہلکی روشنی والے بلب لگے ہوئے تھے' مگر روشنی بہرحال اتنی تھی کہ ہر چیز بالکل واضح دکھائی دے رہی تھی۔ گیٹ پر کوئی نہیں تھا حالانکہ اصولاً دونوں محافظوں کو گیٹ کے نزدیک ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے دونوں محافظ اندر کمرے میں ہوں۔ میں نے اس طرف بڑھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ

ایک آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ ایسا لگا جیسے کوئی دبے پاؤں چل رہا ہو۔ آواز دوبارہ سنائی دی۔ کسی کے قدموں تلے کوئی سوکھا پتا آ گیا تھا۔ میں سرعت سے زمین پر لیٹ گیا۔ برڈ بھی ایک دم زمین پر گر گیا۔ شاید اس نے بھی آہٹ سن لی تھی یا پھر مجھے دیکھ کے وہ بھی محتاط ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے کان آواز کی طرف لگا دیئے۔

پھر باڑ کی دوسری طرف مجھے ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا مگر اس کا رخ ہماری جانب نہیں تھا۔ ابھی وہ کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کے پیچھے دو مزید ہیولے نمودار ہوئے۔ سب سے آگے جانے والا اب رک کے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر پیچھے والے دونوں افراد بھی اس کے پاس پہنچ گئے۔ آگے والے نے فارسی میں سرگوشی کی تو دونوں سر ہلانے لگے۔ میں بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ گیا۔ کاش مجھے فارسی آتی ہوتی۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ ان لوگوں کو ہماری سرگرمیوں کا علم ہو گیا ہے' کیوں کہ جو محافظ پہلے میرے ہتھے چڑھا تھا اس نے بتایا تھا کہ گیٹ والا ایک گارڈ تھوڑی دیر بعد عمارت کا چکر لگاتا ہے۔ اس نے حسب معمول چکر لگایا ہو گا تو اسے اپنے ساتھیوں کی لاشیں ملی ہوں گی۔ پھر اس نے دوسرے گارڈ کے ساتھ مل کے تیسرے گارڈ کو اطلاع دی ہو گی۔ اس کا مطلب ہے اصفہانی نے ہم سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہاں واقعی پانچ گارڈز تھے مگر میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ممکن ہے وہاں مزید گارڈز بھی ہوں۔ فی الحال تو ان تین سے نمٹنا تھا۔ بقول اصفہانی' ان میں سے ہر آدمی دس پر بھاری تھا اس لیے مزید احتیاط کی ضرورت تھی۔ پہلے دو گارڈز تو بے خبری میں مارے گئے تھے' پھر وہ صرف دو تھے مگر یہاں تو تین آدمی تھے۔ سیدھا سادا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہیں بیٹھے بیٹھے میں تینوں کو گولی مار دیتا مگر دھماکوں کی آواز دور تک سنی جاتی اور ہم دونوں بری طرح پھنس جاتے۔

میں ابھی اس الجھن پر غور ہی کر رہا تھا کہ برڈ نے اپنا پسندیدہ ہتھیار پتلے پھل والا خنجر نکال لیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اس نے خنجر نوک کی طرف پکڑا اور ان میں سے ایک کا نشانہ لے کر پوری قوت سے اچھال دیا۔ خنجر اتنی قوت سے پھینکا گیا تھا کہ گارڈ کی گدی میں دستے تک پیوست ہو گیا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری' اور زمین پر گر کے تڑپنے لگا۔ اس کے ساتھیوں نے لمحے بھر کو حیرت سے اسے دیکھا اور اسے سنبھالنے کی بجائے پھرتی سے ایک سنگی بنچ کی اوٹ میں چلے گئے۔ میں ان کی پھرتی اور معاملہ فہمی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ لوگ واقعی ساوک کے تربیت یافتہ کمانڈوز تھے۔ عام سے پہرے دار ہوتے تو اپنے ساتھی کی خبر گیری کرتے' اور اسی لمحے ہم انہیں چھاپ لیتے' مگر خطرہ محسوس کرتے ہی وہ دونوں چوکنے ہو گئے تھے۔

"تم کسی طرح انہیں اسی طرف الجھائے رکھو۔" میں نے سرگوشی کی۔ "میں پیچھے سے

جاتا ہوں۔"

"ٹھہرو خرم! برڈ بھی سرگوشی میں بولا۔ "اگر ان لوگوں نے فائرنگ شروع کر دی تو ہم لوگ بری طرح پھنس جائیں گے۔ جو کچھ کرنا ہو گا۔ جلدی کرنا ہو گا' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا "تم اندر کی طرف جاؤ اور رضا کو تاکید کر دو کہ وہ تیار ہو کر باہر نکل آئے' وہ رضوانہ کو بھی لے آئے گا۔"

"مگر تم۔"

"میری فکر مت کرو۔ میں ان دونوں سے نمٹ لوں گا۔" برڈ نے میری بات کاٹ دی۔ "جاؤ' وقت بالکل نہیں ہے۔"

میں پیٹ کے بل رینگتا ہوا اندر کی طرف بڑھا۔ میں برڈ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا' مگر اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ کوریڈور میں پہنچ کر میں کھڑا ہو گیا' اور دیوار سے چپک کر آگے بڑھا۔ اسٹڈی روم کے بعد مزید تین کمرے تھے اور تین ہی کمرے مخالف سمت میں تھے۔ آگے جا کر کوریڈور بائیں سمت مڑ گیا تھا۔ اس طرف بھی کئی کمرے ہوں گے۔ گویا مجھے ان سب کمروں پر قسمت آزمائی کرنا تھی۔ شروع کے دو کمرے بالکل خالی تھے۔ تیسرے کمرے کا دروازہ لاک تھا۔ میں نے محتاط انداز میں دروازے پر دستک دی مگر کوئی جواب نہ ملا' دوسری دفعہ دستک دینے کے بعد میں آگے بڑھ گیا۔ سامنے والے تینوں کمرے بھی خالی تھے۔ ان کے دروازے لاک نہیں تھے۔ میں بائیں سمت گھوما تو پہلے ہی کمرے میں مجھے روشنی دکھائی دی۔ کھڑکی کے شیشوں سے روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر آہستہ سے دروازے پر دستک دی' پھر پیچھے ہٹ کے جلدی سے ریوالور نکال لیا۔ خدشہ تھا کہ اس میں کوئی محافظ نہ ہو۔

فوراً ہی دروازہ کھلا اور رضا کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں اندھیرے میں کھڑا تھا اس لیے اسے نظر نہیں آیا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی کی "حیران مت ہو رضا' میں ہوں خرم' فوراً تیار ہو جاؤ۔ ہم ابھی اور اسی وقت نکل رہے ہیں یہاں سے۔"

"اندر آ جایئے۔" رضا نے کہا اور اپنے کپڑے اٹھا کر پھرتی سے باتھ روم میں گھس گیا۔

میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ رضا بہت پھرتی سے تیار ہو گیا۔

"رضوانہ اور شہلا سامنے والے کمرے میں ہیں۔" رضا نے مجھے بتایا۔

میں نے احتیاط کے طور پر کوریڈور میں جھانکا' اور پھر آگے بڑھ کے سامنے والے کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مجھے برڈ کی فکر بھی تھی۔ نہ جانے وہ کس حال میں تھا۔ دوسری دستک میں نے ذرا

زور سے دی۔ فوراً ہی کمرے میں آہٹ ہوئی اور رضوانہ نے آہستہ سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں خرم ہوں' دروازہ کھولو۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں اور رضا کمرے میں گئے اور دروازہ بھیڑ کر لائٹ آن کر دی۔ رضوانہ حیرت زدہ انداز سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ دوسری لڑکی بھی بیڈ پر بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی الجھن تھی۔ میں نے رضوانہ سے کہا "جلدی کرو' ہمیں ابھی روانہ ہونا ہے۔"

"کہاں؟" رضوانہ نے پوچھا "خیریت تو ہے؟"

"سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔" میں جھنجلا گیا۔

"جلدی کرو۔" پھر میں دوسری لڑکی سے بولا "چلو تم بھی اٹھو۔"

"جانا کہاں ہے؟" وہ جلدی سے بولی۔

"اصفہانی نے ہنگامی طور پر ہمیں یہاں سے نکلنے کا حکم دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ جانا کہاں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ہاتھوں سے بال سنوار کر کھڑی ہو گئی' پھر اس نے موٹے اون کا سوئٹر پہن کر کوٹ بھی پہن لیا اور جوتے پہن کر تیار ہو گئی۔ رضوانہ بھی پھرتی سے تیار ہو گئی۔

ہم لوگ باہر نکلنے ہی والے تھے کہ مجھے اپنا وہ سوٹ کیس نظر آ گیا جو مسٹر داؤ' مشہدی کے جنگلے سے لے کر آیا تھا۔ میں نے رضا سے سوٹ کیس اٹھانے کو کہا' پھر سرگوشی میں بولا "شہلا کا خیال رکھنا۔ اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے یا مزاحمت کرے تو اسے بے ہوش کر کے لے چلنا۔ اب میں باہر جا رہا ہوں' تم اسے اور رضوانہ کو لے کر باہر کی طرف آؤ۔"

پھر میں رضوانہ اور اس لڑکی سے مخاطب ہوا۔ تم لوگ بہت محتاط رہنا' ہم لوگ دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ بنگلے کے لان میں موجود ہیں۔ اصفہانی کے گارڈز وہاں موجود ہیں مگر پھر بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بس خاموشی سے رضا کے ساتھ آؤ۔" میں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ رضوانہ اور نقلی شہلا بلند آواز میں گفتگو ہی نہ شروع کر دیں۔

پھر میں لان میں جانے کے لیے سینے اور کہنیوں کے بل کھسکتا ہوا اس طرف بڑھا جہاں برڈ کو چھوڑا تھا۔ برڈ وہاں موجود نہیں تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تو مجھے ایک ڈھیر سا نظر آیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا سا اتر آیا' کیوں کہ وہ کوئی انسانی جسم تھا۔ میں پھرتی سے اس کی طرف بڑھا تاکہ اس کا چہرہ دیکھ سکوں مگر وہ جسم بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور مجھ پر آ پڑا۔ مدھم چاندنی میں لمحے بھر کو خنجر کی چمک لہرائی اور دوسرے ہی لمحے وہ خنجر میرے سینے کی طرف بڑھا۔ میں نے سرگوشی کی "برڈ یہ میں ہوں' خرم!" مجھے حملہ آور کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا' بس خنجر کی وجہ سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا

کہ وہ برڈ ہے۔
برڈ کی گرفت پہلے سے بھی سخت ہو گئی اور وہ خنجر میرے سینے میں اتارنے کی جان توڑ کوشش کرنے لگا۔ فطری طور پر میں نے اس کا خنجر والا ہاتھ بائیں ہاتھ سے روک لیا تھا ورنہ اب تک خنجر میرے سینے کے پار ہو گیا ہوتا۔ اچانک مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ برڈ نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرے اعصاب تن گئے۔ اب تک میں اسے برڈ سمجھ کر ڈھیل دے رہا تھا۔ میں نے پوری قوت صرف کر کے اس کی کلائی مروڑنا چاہی مگر ناکام رہا۔ حملہ آور جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ میں اتنی طاقت لگا کے تو مقابل کی کلائی توڑ سکتا تھا' مگر اس کی کلائی کو موڑنے سے بھی قاصر تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے میری دائیں کلائی پکڑ رکھی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری کلائی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہو۔ میں نے زور لگا کر اس کے پنجے سے نکلنا چاہا' مگر یہ بھی ممکن نہ ہوا۔ میری دونوں ٹانگیں البتہ آزاد تھیں۔ میں نے جسم کو موڑ کر اس کے سر کے پچھلے حصے پر پیر سے زوردار کک لگائی۔ اس کی گرفت قدرے کمزور پڑ گئی۔ دوسری کک میں وہ آگے پیچھے جھولنے لگا۔
اسی وقت کسی نے اسے مجھ پر سے کھینچ لیا' پھر اس کے سر پر کھینچنے والے نے کھڑی ہتھیلی کا وار کیا' اور اسے ایک طرف پھینک کے وہ میری طرف لپکا۔ وہ برڈ تھا۔ اسے دیکھ کر ساری پریشانی جاتی رہی۔ میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔
"بقیہ لوگ کہاں ہیں؟" برڈ نے آہستگی سے پوچھا۔
"آرہے ہیں۔" میں نے جواب دیا' پھر اس سے پوچھا "تم خیریت سے تو ہو؟"
"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" برڈ نے جواب دیا۔ بقیہ باتیں گاڑی میں کریں گے۔ میں گیٹ کھولتا ہوں۔ تم رضا اور رضوانہ کو بلاؤ۔" یہ کہہ کر برڈ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔
میں نے ہلکی سی سیٹی بجائی' دوسرے ہی لمحے رضا میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے دونوں لڑکیاں تھیں۔ میں انہیں لے کر گاڑی تک پہنچا۔ گاڑی لاک نہیں تھی مگر اسٹارٹ کرنے کے لیے تو چابی کی ضرورت تھی۔ برڈ گیٹ کھول کر لوٹ آیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ گاڑی میں چابی موجود نہیں ہے۔
"نو پرابلم۔" برڈ نے کہا۔ "میں سیلف کو ڈائریکٹ کر دیتا ہوں۔" وہ گاڑی کے بونٹ کی طرف بڑھا' پھر اچانک رک گیا' اور منہ سے بولا "یار' ہم لوگ بھی حماقتوں پر حماقتیں کر رہے ہیں۔ ہم جمشید اور اصفہانی کو یونہی چھوڑے جا رہے ہیں۔ اصفہانی ہوش میں آتے ہی ایران کی پوری پولیس فورس کو ہمارے پیچھے لگا دے گا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہم یہاں سے سامان کے لئے سیدھے اپنے ہوٹل جائیں گے۔"
"پھر۔"
"پھر کیا۔" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ "ان دونوں کو ختم کرنا پڑے گا۔" وہ

یوں بولا جیسے انسانوں کی بجائے کاکروچ مارنے کی بات کر رہا ہو۔ میں چابی لے کر ابھی آتا ہوں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا اور تیزی سے اندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

○

تھوڑی دیر بعد ہم کیڈی لاک میں بیٹھے نامعلوم منزل کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ اسٹیرنگ رضا کے ہاتھوں میں تھا اور اس کے ساتھ نقلی شہلا بیٹھی تھی۔ میں' برڈ اور رضوانہ پچھلی سیٹ پر تھے۔

"ہاں اب بتاؤ' تم کیا بتانے والے تھے!" میں نے پوچھا۔ پھر مجھے برڈ کی وہ گفتگو یاد آئی جو اس نے جمشید سے کی تھی۔ میں نے پوچھا "تم یہ بتاؤ' تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ ہمارا سامان محفوظ ہے۔"

"سمجھا کرو یار۔" برڈ ہنس کر بولا "میں اسے چکر دے رہا تھا۔ مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ اصفہانی ہوش میں آ چکا ہے۔ جمشید سے زیادہ تو وہ بات میں نے اصفہانی کو سنانے کے لئے کی تھی۔" پھر وہ ذرا توقف کر کے آہستہ سے بولا "ویسے اب نہ جمشید ہے نہ اصفہانی۔"

میں خاموشی سے باہر اندھیرے میں گھور رہا تھا' پھر برڈ سے بولا۔ "اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"یار خرم! ارادہ تو کسی متعین منزل کا کیا جاتا ہے۔" برڈ تلخی سے بولا "ہمارے تو پیروں تلے زمین ہے نہ سروں پر آسمان۔ ہم بھلا کیا ارادہ کر سکتے ہیں۔ بہرحال جب تک سانس ہے تب تک کسی منزل پر پہنچنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔"

"او بھائی فلاسفر! میں پریشانی کے باوجود ہنسنے لگا۔" میں نے کوئی الجھا ہوا مسئلہ نہیں پوچھا تھا۔ تم نے تو باقاعدہ تقریر کر ڈالی۔"

"میں سوچ رہا ہوں اب کسی نہ کسی طرح ایران سے نکلیں۔ یہ ملک ہمیں راس نہیں آیا۔"

"ملک تو راس نہیں آیا لیکن ہم فی الحال اسے چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ ایران میں سرحدوں کو سیل کر رکھا ہے اور کڑی چھان بین ہو رہی ہے۔ ہم ...."

"او۔ کم آن خرم!" برڈ نے منہ بنا کر کہا۔ "ایران کی سرحد کوئی دو چار فرلانگ کی سڑک نہیں ہے کہ اس کے چپے چپے پر پہرہ بٹھا دیا گیا ہوگا۔ اب بھی ایسی جگہیں ہوں گی جہاں سے نکلا جا سکے اس لئے مایوسی کی ضرورت نہیں۔" پھر وہ رضا سے مخاطب ہوا۔ "پہلے ہوٹل چلو' وہاں سے سامان لے کر ہم تمہارے دوست کے گھر جائیں گے۔" پھر جب تک کسی معقول ٹھکانے کا بندوست نہیں ہو جاتا' ہم وہیں ٹھہرے گے۔ کوشش کرنا کہ جلد از جلد کہیں رہنے کا بندوبست ہو جائے۔"

رضا نے صرف اثبات میں سرہلا نے اکتفا کیا۔ شہلا کی ہم شکل حیرت انگیز طور پر اب تو بالکل خاموش تھی۔ اس نے اب تک یہ نہیں پوچھا تھا کہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟ اچانک رضوانہ بولی۔ "ہم پہ کن لوگوں نے حملہ کیا تھا' اصفہانی اور اس کے گارڈز کہاں ہیں؟"

"وہ بھی بچ کر نکل گئے تھے۔" برڈ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ ہم ایران چھوڑ دیں گے اور۔"

"تم کیا ہمیشہ رہنا چاہتی ہو یہاں؟" برڈ نے پوچھا۔

"لیکن ایسی کیا ایمرجنسی آپڑی ہے کہ ہم یوں چوروں کی طرح بھاگ رہے ہیں؟" رضوانہ جھنجلا کر بولی۔

"رضوانہ!" میں نے تنبیہہ انداز میں کہا "کیا تم خاموش نہیں رہ سکتیں۔"

"آخر ہمیں معلوم تو ہو کہ ہم لوگ جا رہے ہیں؟" شہلا کی ہم شکل نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

برڈ نے گھور کے اسے دیکھا' پھر سخت لہجے میں بولا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ فی الحال ہمیں پناہ کی ضرورت ہے۔" برڈ نے پرسکون انداز میں کہا "ہم سب اتنی عجلت میں وہاں سے روانہ ہوئے تھے کہ اصفہانی سے رابطہ بھی نہ ہوسکا ورنہ اس کے لئے مکانوں کی کیا کمی ؟"

برڈ کی بات سے وہ خاصی پرسکون ہوگئی ورنہ مجھے خدشہ تھا کہ اسے بھی بے ہوش کرنا پڑے گا۔ میری سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا تھا کہ میں اس لڑکی کو ساتھ کیوں لے آیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ شہلا نہیں ہے' پھر آخر اسے ساتھ لگائے پھرنے کا کیا تک تھا۔

رضا اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا' ہم آدھے گھنٹے سے بھی کم عرصے میں اپنے ہوٹل تک پہنچ گئے۔ ہم نے رضا کو وہیں چھوڑا' اور خود ہوٹل کی عمارت میں داخل ہوگئے۔

میں بے پروائی سے چلتا ہوا استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچا' اور بہت بے نیازی سے کمرے کی چابی طلب کی۔ استقبالیہ کلرک نے کمرے کا نمبر سنتے ہی چونک کے مجھے دیکھا' اور ہچکچا کر بولا "سوری سر! کمرے میں جانے سے پہلے آپ کو ایران انٹیلی جنس کے ایک افسر سے ملنا ہوگا۔"

"وھاٹ ڈو یو مین بائی دس؟" میں کاؤنٹر پر ہاتھ مار کر غرایا۔ مہمانوں کے ساتھ یہاں یہ سلوک ہوتا ہے؟"

"آئی ایم ریئلی ویری سوری سر' بٹ آرڈرز۔"

اسی وقت منحوس شکل کا ایک ایرانی لابی میں داخل ہوا' اور کاؤنٹر کلرک سے فارسی میں کچھ بولا- جواب میں اس نے جلدی جلدی کچھ کہا' اور میری طرف اشارہ کر دیا-
"منحوس صورت ایرانی نے سر سے لے کر پاؤں تک بہ غور میرا جائزہ لیا' اور ٹھہر ٹھہر کر انگلش میں بولا "زحمت کی معذرت چاہوں گا- مہربانی فرما کے ذرا اپنا پاسپورٹ مجھے دکھایئے-"
"شیور' شیور' - میں نے کہا پھر ذرا ٹھہر کے بولا-
"پاسپورٹ دیکھنے کے لئے آپ کو تھوڑی سی زحمت مزید کرنا پڑے گی- "پاسپورٹ میرے سوٹ کیس میں ہے' پھر آپ یہاں بیٹھیں میں پاسپورٹ لے کر آتا ہوں-"
چلئے وہیں دیکھ لوں گا- "منحوس صورت والے نے کہا' پھر اپنے کسی ساتھی کو اتنے بھونڈے طریقے سے اشارہ کیا کہ کاؤنٹر کلرک بھی چونک گیا-
میں نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں- پھر غیر محسوس طریقے سے گھورا تو مجھے دو افراد نظر آگئے جو مجھے بہ غور دیکھ رہے تھے- میں بے پروائی سے لفٹ کی جانب روانہ ہوگیا- لفٹ میں بھی ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا- دل تو چاہ رہا تھا کہ اس منحوس کو یہیں ٹھنڈا کر دوں- وہ کم بخت دانت نکال رہا تھا- میں نے بہ مشکل تمام اپنے غصے پر قابو پایا' اور لاتعلقی سے کھڑا ہوگیا-
کمرے میں پہنچ گئے وہ منحوس ایرانی بے تکلفی سے ٹانگیں پھیلا کر صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا "پلیز ذرا جلدی کریں-"
"ابھی لیجئے' میں نے جواب دے کر اچانک ریوالور نکال لیا' اور بولا "یہ ہے میرا پاسپورٹ!"
اس کے منحوس تھوبڑے پر تیمی برسنے لگی- وہ سنبھل کر بولا "اچھا مذاق ہے' مگر میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اس لئے-"
"بکواس بند کرو-" میں نے اسے جھڑک دیا- "اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تمہارے ساتھی مدد کو آجائیں گے تو اس خوش فہمی کو دل سے نکال دو- تمہارے ساتھی اس وقت تک میرے آدمیوں کی گرفت میں ہوں گے- تمہارے افسروں نے تم لوگوں کو قربانی کا بکرا بنایا ہے- تمہیں تو ہماری دہشت کا اندازہ نہیں ہے' مگر انہیں اچھی طرح تھا- "میں نے اسے مرعوب کرنے کو کہا- "میں تمہیں بھی مار کے یہیں چھوڑ جاؤں گا' سمجھے!"
میری باتوں سے وہ بری طرح سہم گیا تھا' اور خوف زدہ انداز میں میرے ریوالور کو دیکھ رہا تھا- اس نے ہکلاتے ہوئے کہا- "تم کیا واقعی مجھے مار' دو گے-"
"ظاہر ہے-" میں نے بے نیازی سے جواب دیا-
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی- میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا-

جونہی میری توجہ دروازے کی طرف ہوئی' منحوس شکل والے نے بندر کی طرح زقند لگائی' اور مجھ پہ آپڑا۔ جھٹکے سے میرا ریوالور دور جاگرا۔ شکل سے وہ سہما ہوا' اور خوفزدہ لگ رہا تھا' مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ بہرحال ایران کی خفیہ پولیس کا تربیت یافتہ شخص تھا۔ وہ جونک کی طرح مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی ہی تھی کہ آنے والا برڈ تھا۔

برڈ نے حیرت سے وہ منظر دیکھا' پھر آگے بڑھ کر اس ایرانی کی گردن دبوچ لی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے برڈ نے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ وہ کینچوے کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس سے فارغ ہو کر برڈ مجھ سے بولا "اس کے دونوں ساتھیوں کو میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اب جلدی سے نکل چلو۔"

"ٹھکانے لگا دیا ہے! میں نے حیرت سے دہرایا کیا اس بھرے پڑے ہوٹل کے لاؤنج میں!"

"وہ دونوں تمہارے پیچھے کمرے تک آئے تھے' اور دروازے کے پاس کھڑے اندر کی سن گن لے رہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔"

"اور ان کی لاشیں؟ میں نے پوچھا۔

"ارے یار' یہاں سے نکلو تو۔" برڈ جھنجلا گیا "کیا ساری باتیں یہیں کھڑے پوچھ لو گے۔ ان دونوں کو میں اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ اب یہ مت پوچھنا کہ بغیر چابی کے کمرا کیسے کھولا۔ اپنا بیگ اٹھاؤ' اور یہاں سے نکل چلو بلکہ بیگ مجھے دے دو۔ مجھ سے کوئی پوچھ گچھ کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔"

"کیوں' آپ شہزادہ علی رضا پہلوی ہیں؟" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میرے پاس امریکن پاسپورٹ ہے' اور میں قانونی طریقے سے یہاں آیا ہوں اور تم جانتے ہو کہ امریکہ پاسپورٹ دیکھ کر ان ایشین کی روح فنا ہوتی ہے۔" پھر اچانک اسے خیال آگیا کہ ایشین تو میں بھی ہوں۔ وہ جلدی سے بولا "خیر اس بحث کو چھوڑو' لاؤ اپنا بیگ مجھے دو۔ میں اپنے کمرے سے بھی بیگ اٹھاؤں گا اور نیچے چلا جاؤں گا۔ پانچ منٹ بعد تم بھی نیچے آجانا' اور چابی کاؤنٹر پر دے کر باہر نکل آنا۔ برڈ بیگ لے کر جلدی سے باہر نکل گیا۔

میں نے کچھ دیر انتظار کیا' پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا ایک جوڑا' ایک تولیہ' شوئنگ کٹ وغیرہ وہیں رہ گئی تھی۔ میں نے اچھی طرح کمرے کا جائزہ لیا۔ ان چیزوں کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی' جو اہم ہوتی۔ منحوس شکل والا ایرانی ابھی تک بے ہوش تھا۔ میں نے کمرا لاک کیا' اور ٹہلتا ہوا نیچے کی طرف چل دیا۔ میں نے کاؤنٹر کلرک کو چابی دی تو اس نے چونک کے مجھے دیکھا شاید اسے توقع تھی کہ وہ ایرانی مجھے گرفتار کرلے گا۔ اس نے مجھ سے کہا کچھ نہیں' خاموشی سے چابی اٹھالی۔ میں اسی انداز میں ٹہلتا ہوا باہر

نکلا- باہر نکلتے ہی میری رفتار تیز ہوگئی- گاڑی وہیں موجود تھی جہاں میں چھوڑ کر گیا تھا' البتہ اسٹیرنگ پر رضا کی بجائے برڈ بیٹھا تھا- میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا "یہ رضا کہاں گیا؟"

وہ بھی اپنا بیگ لینے گیا ہے-"

"یار' وہ کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہو جائے-" میں نے خدشہ ظاہر کیا-

"مجھے صرف تمہاری وجہ سے پریشانی تھی-" برڈ نے جواب دیا- "کیوں کہ تمہارے پاس پاسپورٹ نہیں ہے' تمہیں فارسی بھی نہیں آتی ورنہ تم خود کو مقامی بھی ظاہر کر سکتے تھے- رضا تو یوں بھی ایرانی ہے اس پہ کون شبہ کرے گا-"

اسی وقت ہوٹل کے داخلی دروازے سے رضا نمودار ہوا اس نے اپنی پشت پر ٹورسٹ بیگ اٹھا رکھا تھا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاڑی تک آیا' اور برڈ سے چابی لے کر ڈکی میں سوٹ کیس رکھنے لگا- برڈ اسٹرینگ سیٹ سے اتر کے دوبارہ پیچھے آگیا-

رضا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی آگے بڑھا دی-

پھر شاید گاڑی آدھے گھنٹے تک تیز رفتاری سے چلتی رہی تھی- آدھے گھنٹے بعد رضا نے گاڑی روکی' اور اس کی اگلی پچھلی دونوں نمبر پلیٹیں اتار دیں- ان پلیٹوں کے پیچھے دوسری نمبر پلیٹیں تھیں- وہ دوبارہ اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے بولا "ایران میں ایسی بے شمار گاڑیاں ہیں- اگر ہوٹل سے روانگی کے وقت کسی نے گاڑی کا نمبر نوٹ بھی کیا ہوگا تو اب سر پٹختا رہ جائے گا-"

"احمق آدمی' یہ دوسری نمبر پلیٹ بھی تو انھی کی لگائی ہوئی ہے-" میں نے کہا- "بلکہ یہ گاڑی ہی خطرناک ہے ہمارے لئے-"

"میں وہاں پہنچتے ہی اس گاڑی سے چھٹکارا حاصل کرلوں گا-" پھر وہ ایک موڑ پر مڑتے ہوئے بولا "اس وقت ہم ایران کے نواحی علاقے میں ہیں- اصفہانی کے آدمیوں کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ہم یہاں ہوں گے-"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" نقلی شہلا چونک کو بولی- "کیا ہم اصفہانی صاحب سے ڈر کر بھاگ رہے ہیں-"

"ہاں' بے بی ! اصفہانی ہمارا دشمن ہوگیا ہے "رضا نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا-

"کبھی کبھی اپنے بھی دشمن ہو جاتے ہیں بے بی!" میں نے جلدی سے کہا- "میں ابھی تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دوں گا-"

مزید دس منٹ بعد رضا نے گاڑی ایک طرف روک دی' اور ہم سب کو اترنے کا اشارہ کیا- "یہاں سے ہم پیدل جائیں گے ورنہ خواہ مخواہ محلے والوں کی نظروں میں آجائیں

گے۔"

"اتنی صبح کون سا محلے والا اٹھا بیٹھا ہو گا؟" برڈ نے طنز کیا۔

"یہ امریکہ نہیں ایران ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہاں لوگ صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔" میری بات پر برڈ کچھ سنجیدہ سا ہو گیا۔ میں وہ موضوع بدلنے کو بولا۔ "بہرحال ہم یہاں سے بھی جلد از جلد نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

پہلے رضا اور دونوں لڑکیاں گلی میں داخل ہوئیں' میں اور برڈ گلی کے نکڑ ہی پر کھڑے رہے۔ رضا نے گلی کے آخری سرے پر ایک بوسیدہ سے مکان پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ رضا نے دروازہ کھولنے والے سے جلدی جلدی کچھ کہا۔ اس نے حیرت سے دونوں لڑکیوں کو دیکھا' پھر انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ رضا نے گھوم کر ہم دونوں کو بھی اشارہ کیا۔ ہم تیزی سے اس کے پاس پہنچے۔ رضا نے اپنے دوست سے ہم دونوں کا تعارف کرایا' پھر ہم سے بولا۔ "یہ میرا دوست علی عباس ہے۔"

علی عباس نے آگے بڑھ کر ہم سے مصافحہ کیا اور بولا۔ "آئی اسپیک انگلش بٹ ویری۔ لٹل۔"

"اوکے اوکے۔" برڈ ہنس کر بولا ۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میرے دوست۔"

رضا نے بتایا کہ علی عباس کے مکان میں صرف دو کمرے ہیں۔ یہ فوری طور پر ایک کمرا ہم لوگوں کے لئے خالی کر دے گا۔

اس کا دوست مفلوک الحال تھا۔ مکان کی ایک ایک چیز سے اس کی عسرت اور تنگ دستی ظاہر ہو رہی تھی' مگر اس کا دل غنی تھا۔ اس نے محض دوستی کی خاطر ہمیں سر چھپانے کا ٹھکانا فراہم کر دیا تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ علی عباس کو اتنا مال و دولت دے دوں گا' کہ اس کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ میں نے تشکر آمیز لہجے میں رضا سے کہا۔ "اپنے دوست سے کہہ دو کہ ہم لوگ اس کا یہ احسان کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔ واقعی یہ تمہارا سچا دوست ہے۔"

رضا نے میری بات کا فارسی میں ترجمہ کیا تو علی عباس کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

وہ ہمیں مختصر سے ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں فرش پر بوسیدہ سا ایک قالین بچھا ہوا تھا' اور دیوار کے ساتھ چند تکیے رکھے تھے۔ یہ گویا اس کا ڈرائنگ روم تھا۔ قالین پہ بچوں کے بستے' کتابیں کاپیاں' پنسلیں اور ٹوٹے پھوٹے کھلونے بکھرے ہوئے تھے۔ شاید ہمارے آنے سے پہلے وہاں کوئی بیٹھا تھا۔ علی عباس نے جلدی جلدی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹیں' اور رضا سے کچھ کہنے لگا۔ رضا نے انگلش میں اس کی بات کا ترجمہ کیا۔ وہ کہہ رہا تھا' ابھی کچھ دیر پہلے میری بیوی چھوٹے بچے کے ساتھ یہاں لیٹی تھی۔ اس کمرے کو میں اپنے بیڈ روم کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ گھر کا دوسرا کمرا میری دونوں بیٹیوں کے استعمال

میں ہیں وہ بھی ماشاء اللہ جوان ہیں۔

رضوانہ اور دوسری لڑکی اندر اس کی بیوی کے پاس تھی۔ اندر سے ان لوگوں کے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اور برڈ قالین پر ڈھیر ہوگئے۔ میں نے رضا سے کہا۔ "گاڑی میں سے سامان نکال لاؤ' اور اسے ایسی جگہ پارک کر دو جہاں وہ کسی کی نظروں میں نہ آئے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس گاڑی کو کہیں دور چھوڑ آؤ۔ اگر یہاں وہ پولیس یا کسی دوسرے ادارے کی نظروں میں آگئی تو وہ لوگ ہمیں آس پاس تلاش کریں گے' اور ممکن ہے ہم تک پہنچ ہی جائیں۔"

"ٹھیک ہے' میں گاڑی کہیں دور چھوڑ آتا ہوں۔" رضا نے جواب دیا۔ "بلکہ جا کر اسے تہران کے باہر چھوڑ دیتا ہوں۔"

"مگر بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔" میں نے پیر پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

رضا کے جانے کے بعد علی عباس بھی اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے میں ڈبل روٹی' ابلے ہوئے انڈے اور مکھن لے آیا۔ شاید اس کی بیوی نے بغیر کہے ہمارے لئے ناشتے کا اہتمام کرلیا تھا۔ ٹرے میں گرم گرم چائے بھی موجود تھی۔ اسی وقت سامان سے لدا پھندا رضا بھی لوٹ آیا۔ علی عباس نے ہم سے ناشتا کرنے کو کہا اس نے بتایا کہ دونوں لڑکیاں میری بیوی اور بچیوں کے ساتھ ناشتا کرچکی ہیں۔ ہم نے اصرار کرکے علی عباس کو بھی ناشتے میں شریک کرلیا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے رضا سے کہا۔ "اسے بتا دو کہ ہم ایرانی حکومت کو مطلوب ہیں' اور ہمیں پناہ دینے کی پاداش میں اس پر مصیبت بھی نازل ہوسکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ شریف آدمی اندھیرے میں نہ رہے۔

"لیکن خرم' یہ مناسب نہیں ہوگا۔ علی عباس فوراً ہمیں یہاں سے نکال دے گا۔"

"تو ہم یہاں سے بھی روانہ ہو جائیں گے' مگر اسے بتا ضرور دو۔ تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے' صرف اتنا بتا دو کہ کسی وجہ سے حکومت ایران ہماری مخالف ہوگئی ہے۔ اور اب ساوک سمیت حکومت کی کئی ایجنسیاں ہمارے پیچھے ہیں۔"

رضا نے گہرا سانس لیا' اور علی عباس کو آہستہ آہستہ بتانے لگا۔ میں نے دیکھا' رضا کی بات سن کر علی عباس مسکرانے لگا۔ مجھے شدید حیرت ہوئی۔ اسے تو بالکل سہم جانا چاہئے تھا۔ اس کے برعکس وہ مطمئن انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کچھ کہنا شروع کیا۔ اس نے نہ جانے ایسی کیا بات کہی کہ رضا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

رضا نے آنسو پونچھتے ہوئے ہم سے کہا۔ "علی کہہ رہا ہے کہ یہ ہم لوگوں کو دیکھتے

ہی پہچان گیا تھا- اس نے کہا ہے کہ جب تم میرے دوست ہو تو تمہارے دوست بھی میرے دوست ہیں' اور دوستی نفع نقصان دیکھے بغیر نبھائی جاتی ہے- حکومت مجھے زیادہ سے زیادہ پھانسی ہی پر چڑھا سکتی ہے نا!"

رضا کی بات سن کر میں بے اختیار علی سے لپٹ گیا- تھوڑی دیر پہلے جو کیفیت رضا کی ہوئی تھی' وہی اب میری تھی- برڈ بھی پر تشکر نگاہوں سے علی کو دیکھ رہا تھا- رضا کی طرح میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے-

"اب میں چلتا ہوں-" رضا نے کہا "میں گاڑی کہیں چھوڑ کر دوپہر تک لوٹ آؤں گا-" وہ ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا- اس کے جانے کے بعد علی دیر تک ہمارے ساتھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گفتگو کرتا رہا- میں نے اس سے پوچھا ' آج تم کام پر نہیں گئے؟ اس نے بتایا کہ آج میں نے چھٹی کرلی ہے-

گیارہ بجے کے قریب وہ اٹھ کھڑا ہوا' اور ہم سے تھوڑی دیر کی اجازت چاہی- میں نے سوچا' دوپہر کے کھانے کے لئے اسے کچھ رقم دے دوں' مگر یہ سوچ کر نہ دی کہ علی برا ہی نہ مان جائے- میں نے رضا کی واپسی تک اس ارادے کو ملتوی کردیا- اس کے جانے کے بعد میں اور برڈ لمبی تان کر سوگئے-

میری آنکھ کھلی تو شہلا کا چہرہ میرے سامنے تھا- وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی' میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا' اور بے اختیار اسے آواز دی "شہلا!"

"چلو بہن کا خیال تو آیا-" رضوانہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا- "میں تو سمجھی تھی آپ شہلا کو بالکل بھول گئے ہیں- ویسے میں یہ سمجھ نہیں سکی کہ آپ کس قسم کے انسان ہیں یا تو اپنی بہن کی تلاش ہی کو زندگی کا مقصد بنا لیا تھا یا پھر اب یہ حال ہے کہ بہن سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے-"

"رضوانہ پلیز' مجھے مزید پریشان مت کرو-" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا-

"ارے یہ پریشانیاں تو شروع ہی سے ہمارے ساتھ ہیں ' میں نے مانا کہ ابھی شہلا ذہنی طور پر نارمل نہیں ہے مگر-"

"رضوانہ!" میں نے سخت لہجے میں کہا "یہ شہلا نہیں ہے-"

رضوانہ حیرت زدہ انداز میں کبھی مجھے کبھی اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی ' پھر وہ بولی-

"یہ شہلا نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اور آپ اسے ساتھ کیوں لے آئے؟"

"یہ مشہدی کے ساتھیوں میں سے ہے-" میں نے جواب دیا- "اور میں اس لئے اسے ساتھ لے آیا کہ یہ کم از کم شہلا سے مشابہت تو رکھتی ہے- اس کی صورت دیکھ کر میں اپنے دل کو سکون تو پہنچا سکتا ہوں' شہلا نہ سہی' اس کا دھوکا ہی سہی!" یہ کہتے کہتے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے-

میری بات کا اس لڑکی پہ حیرت انگیز ردعمل ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی' اور میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اپنی بہن کو اتنا چاہتے ہیں کہ صرف اس کی مشابہت دیکھ کر مجھے ساتھ لے آئے۔ میں بہت گھٹیا ہوں۔ میں ایک بھائی کو دھوکا دے رہی تھی۔ مجھے معاف کر دیں' پلیز مجھے معاف کر دیں۔" وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے میری بہن! میں نے کہا۔ "تم تو ان لوگوں کے ہاتھوں خود مجبور تھیں۔"

"مگر جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے' مجھے سکون نہیں ملے گا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں معاف کر دیا' اسی وقت معاف کر دیا تھا جب مجھے یہ علم ہوا تھا کہ تم شہلا نہیں ہو۔" میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میرا نام ملیحہ ہے اور میں گزشتہ تین سال سے اصفہانی کے لئے کام کر رہی ہوں۔"

"تم ایرانی ہو مگر اہل زبان کی طرح اردو بولتی ہو۔ یہ اردو تم نے کہاں سیکھی؟ میں نے پوچھا۔

"میرے والد پاکستانی اور والدہ ایرانی تھیں۔" وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ "میرے والد پاکستان کے بہت بڑے بزنس مین تھے۔ وہ اکثر ایران بھی آتے رہتے تھے۔ بزنس ہی کے سلسلے میں ان کی میری ماموں سے دوستی ہوئی اور میری ماما کی شادی ان سے ہوگئی۔"

"اس لحاظ سے تو تم پاکستانی ہو' تمہیں پاکستان میں ہونا چاہئے تھا۔" رضوانہ نے کہا۔

"بھئی کچھ مجھے بھی تو بتاؤ' تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو؟" برڈ بے چینی سے بولا۔

"سوری۔" میں نے جلدی جلدی برڈ کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا' اور ملیحہ سے کہا۔ "ملیحہ پلیز' انگلش میں گفتگو کرو۔ میرا دوست اردو نہیں سمجھتا۔"

"ہاں میں یہ بتا رہی تھی کہ میرے والد پاکستانی تھے۔" ملیحہ نے انگلش میں کہا۔ "میں کراچی میں پیدا ہوئی' وہیں میں نے پرائمری پاس کی۔ اسی اثناء میں میری ماما' اور پاپا کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے' اور ماما مجھے لے کر ایران آگئیں۔ پھر وہ کبھی پاکستان نہ گئیں' نہ پاپا یہاں آئے۔ ان کے خطوط اب بھی میرے نام آتے ہیں۔"

"مگر تم مشہدی تک کیسے پہنچیں؟" میں نے پوچھا۔

"اعلیٰ تعلیم کے لئے ماموں نے مجھے فرانس بھیج دیا تھا۔ وہیں میری ملاقات نادیہ سے ہوئی تھی۔ وہ انکل اصفہانی کی بھتیجی ہے۔ اسی کے ذریعے میری ملاقات انکل اصفہانی سے ہوئی تھی' پھر جب بوریت سے اکتا کر میں نے جاب کرنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے مجھے

ساوک میں جاب دلا دی۔" ملیحہ نے ایک ہی سانس میں تفصیل بتا ڈالی۔

"تم جانتی ہو ملیحہ، ہم بہت خطرناک لوگ ہیں، اور نہ صرف ساوک بلکہ شاہی انٹیلی جنس بھی ہماری تلاش میں ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" اس نے گردن جھٹک کر پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کو پیچھے کیا تو مجھے بے اختیار شہلا یاد آگئی۔ وہ بھی یونہی جھٹکے سے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتی تھی۔ "میں جانتی ہوں کہ آپ لوگوں کو کئی محکمے تلاش کر رہے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ انکل اصفہانی اب زندہ نہیں ہیں اور۔۔۔"

"یہ بات تم کیسی جانتی ہو؟" برڈ نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔ "ہم نے تو تمہیں کچھ نہیں بتایا۔"

"جس وقت ہم وہاں سے روانہ ہو رہے تھے، اور آپ گاڑی کی چابی لینے کے بہانے اندر آگئے تھے تو میں سمجھ گئی تھی کہ آپ اندر کیوں گئے ہیں۔ آپ کو تو اس وقت شاید اندازہ بھی نہ ہوگا کہ آپ کے ساتھ کوئی عام لڑکی نہیں بلکہ ساوک کی تربیت یافتہ ایجنٹ ہے۔ میں تو محض اس لئے خاموشی سے آپ لوگوں کے ساتھ چلی آئی تھی کہ موقع ملتے ہی آپ کو گرفتار کرا دوں گی، مگر اب شاید میں ایسا نہ کرسکوں۔"

"تم واپس جانا چاہو تو جاسکتی ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"واپس تو میں پہلے بھی جاسکتی تھی۔" شہلا نے جواب دیا۔ "مگر میں واپس جاؤں گی نہیں، آپ کے ساتھ رہوں گی۔"

"حماقت کی باتیں مت کرو۔" میں نے کہا۔ "ہم لوگ تو خود دربدر بھٹک رہے ہیں، کسی بھی وقت گرفتار ہوسکتے ہیں یا مارے جا سکتے ہیں۔ ہماری وجہ سے تم اپنی جان کیوں مصیبت میں ڈال رہی ہو؟"

"میں بھی اب اس ماحول سے فرار چاہتی ہوں۔ اگر میں ایران میں رہی تو کبھی نہ کبھی اس مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔ شاہی خاندان کا ایک فرد مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑگیا ہے۔ اگر میں ایران رہی تو مجھ سے شادی کرکے ہی دم لے گا۔ حکومت اس کی ہے، دولت اس کے پاس ہے اور میری ماما اور ماموں بھی اس کے حق میں ہیں۔"

"تو پھر تمہیں کیا اعتراض ہے۔ اس میں اتنی بہت سی خوبیاں ہیں تو کرلو شادی۔" رضوانہ نے ہنس کر کہا۔

"تم کسی ایسے شخص سے شادی کرلو گی جس کی بیٹیاں جوان ہوں، جس کی عمر پچاس سال سے بھی زیادہ ہو اور وہ محض اس لئے شادی کرنا چاہتا ہے کہ اسے نمائشی بیوی کی ضرورت ہو۔" ملیحہ بھڑک اٹھی۔

"سوری بھئی' مجھے اندازہ نہیں تھا کہ موصوف اتنی زیادہ' خوبیوں' کے مالک ہیں۔" رضوانہ جلدی سے بولی۔

"اسی لیے میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا ہے۔" ملیحہ نے جواب دیا۔ "وہ بوڑھا خبیث یہاں مجھے سکون سے نہیں رہنے دے گا۔"

"تم قانونی طریقے سے بھی پاکستان جا سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

ہاں جاسکتی ہوں مگر ملازمت سے ریزائن کرنے کے بعد' اور ساوک سے ریزائن کرنے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی' اور رضا اندر آگیا۔ وہ بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں اس گاڑی کو تہران کے دوسرے سرے پر چھوڑ آیا ہوں" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "میں نے کوشش کی تھی کہ کہیں سر چھپانے کی جگہ مل جائے' مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی' خیر کل پھر کوشش کروں گا۔"

"مکان کا کیا کرو گے؟" ملیحہ نے پوچھا۔

" جب تک حالات سازگار نہ ہو جائیں' ہم کہیں چھپے رہنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جونہی حالات سازگار ہوئے' ہم ایران سے باہر نکل جائیں گے۔"

"یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔" ملیحہ نے کہا۔ "میں سرحد پار کرنے کا بندوبست کرسکتی ہوں۔" وہ خاموش ہوکر کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ "پاکستان کی نسبت ترکی جانا زیادہ آسان ہے۔ آج کل پاکستان کی سرحد پر زیادہ سختی ہے۔ جانے کو تو پاکستان بھی جاسکتے ہیں مگر پوائنٹ ون پر سنٹ بھی رسک لینے سے کیا فائدہ۔"

"چلو ترکی ہی سہی۔ کم از کم اس بھاگ دوڑ سے تو نجات ملے گی۔" برڈ نے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں کل ہی کوشش کرتی ہوں۔" ملیحہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی رضوانہ بھی اٹھ گئی' اور وہ دونوں اندرونی کمرے میں چلی گئیں۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ رضوانہ اور ملیحہ علی کی بیوی اور بیٹیوں سے گفتگو کیسے کر رہی تھیں' اب وہ حیرت رفع ہوگئی تھی۔ ملیحہ کی تو مادری زبان ہی فارسی تھی۔

"یار خرم!" برڈ پر خیال لہجے میں بولا۔ "کیا خیال ہے' ہمیں اس لڑکی پر اعتبار کرلینا چاہیے؟"

"میرا تو خیال ہے کہ کرلینا چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔

"یار' اس دفعہ تو میرا دل بھی یہی کہہ رہا ہے کہ اس لڑکی پر اعتبار کرلینا چاہیے۔"

"شکر ہے۔" میں نے ہنس کر بولا۔ "کسی بات پر تو تمہارا دل بولا ورنہ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تم' اپنے سائے پر بھی اعتبار نہیں کرتے۔"

"دیکھ لو' میں نے جس پر بھی شبہ ظاہر کیا' وہ بعد میں درست نکلا۔ مسٹر او میں نے

اعتبار نہیں کیا تھا' دیکھ لو بعد میں کیا ہوا۔ اصفہانی پر بھی مجھے اعتبار نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ بھی تمہارے سامنے ہے۔"

"بس بھئی میں نے تم سے تقریر کرنے کو نہیں کہا تھا۔" میں نے ہنس کر کہا ۔"تو طے یہ ہوا کہ ہمیں ملیحہ پر بھروسا کر لینا چاہیے۔"

پھر ہم لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے رضا سے کہا۔ "تم نے ان حالات میں ہمارا بہت ساتھ دیا ہے۔ تم مجھے بہت یاد آؤ گے۔"

"او بھائی' تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے ہم ایران کے بارڈر پر کھڑے ہیں' اور ترکی میں داخل ہونے والے ہیں۔" برڈ نے ہنس کر کہا۔

"ایک بات کہوں خرم صاحب!" رضا نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

"مگر تمہارا گھر بار' والدین' بہن بھائی سبھی تو یہاں ہیں۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں سب یہاں ہیں۔" رضا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مگر آپ جیسا دوست اور بھائی کہاں ملے گا۔" وہ بے تحاشا رونے لگا۔

"ارے ارے' تم تو لڑکیوں کی طرح رونے لگے۔ میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا۔" میں نے اسے بچوں کی طرح بہلایا۔

"ٹھیک ہے بھئی۔" برڈ نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔ "میرا خیال ہے' میں بھی تمہارا دوست ہوں' مگر تمہیں تو صرف خرم سے بچھڑنے کا غم ہے۔"

رضا نے چونک کر اسے دیکھا' پھر بے اختیار اس کے سینے سے لگ گیا۔" ایسی باتیں مت کریں۔ آپ بھی خرم صاحب کی طرح ہیں۔ اصل میں بات انھی نے شروع کی تھی اس لیے میں نے ان سے یہ بات کہی ورنہ۔"

"نہیں یار' اب باتیں مت بناؤ۔ ویسے میں بھی بالکل فیئر ہوں۔" برڈ نے اس کی آنکھ بچا کر مجھے آنکھ ماری۔ "خرم سے تمہارا مذہب کا رشتہ تو ہے نا!"

"پلیز مسٹر برڈ!" رضا گلوگیر لہجے میں بولا۔ "آپ سبھی مجھے بہت یاد آئیں گے۔ آپ لوگوں نے مجھے حالات سے لڑنے کا حوصلہ بخشا ہے' مجھ میں زندگی کی امنگ پیدا کی ہے۔ میں آپ میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

برڈ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا ورنہ تم نے تو ہر ہر قدم پر ہماری اتنی مدد کی ہے کہ ہم چاہیں بھی تو تمہیں اس کا صلہ نہیں دے سکتے۔ تم واقعی ہمیں بہت یاد آؤ گے۔"

رضا ابھی مزید کچھ کہتا' مگر علی کی آمد سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ وہ رات

کھانا لے کر آیا تھا۔ اس کھانے پر بھی اس نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ دوپہر کا کھانا تو ہم نے سونے کی وجہ سے گول کر دیا تھا۔ میں نے رضا سے کہا۔ "یار' اس بیچارے کو کچھ رقم دے دو تاکہ اس پر بوجھ نہ پڑے۔"

"یہ میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی کر چکا ہوں۔" رضا نے جواب دیا۔ "صبح جانے سے پہلے میں نے اسے خاصی معقول رقم دی تھی۔ یہ بیچارہ تو لینے پر راضی نہیں تھا' بہت اصرار کے بعد اس نے وہ رقم قبول کی تھی۔"

کھانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ اس مکان میں صرف دو ہی کمرے تو ہیں۔ علی اور اس کے گھروالے رات کیسے گزاریں گے۔ میں نے رضا سے کہا کہ ملیحہ اور رضوانہ کو یہیں بلا لو۔

"ملیحہ!" رضا نے حیرانی سے دہرایا۔ "کون ملیحہ؟"

"میں نے مختصراً اسے بھی بتا دیا کہ وہ لڑکی شہلا نہیں بلکہ ساوک کی ایک عہدے دار ملیحہ ہے' پھر میں نے اس سے کہا۔ "اس مکان میں صرف دو کمرے ہیں۔ اگر وہ دونوں بھی وہاں رہیں تو علی اور اس کے گھر والوں کو بہت تکلیف ہوگی۔ یہ بیچارہ سوئے گا کہاں؟"

"میرا خیال ہے کہ ہم لڑکیوں کی بجائے علی کو یہاں سلالیں۔ لڑکیاں ایک کمرے میں سو جائیں گی ورنہ یہاں تو وہ سو نہیں سکیں گی۔"

اس کی بات درست تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ تم علی سے کہہ دو کہ وہ یہیں سو جائے۔

علی پہلے تو نہیں مانا۔ وہ سونے کے لئے اپنے کسی دوست کے گھر جانے والا تھا۔ ہمارے اصرار پر وہ رک گیا۔

رضوانہ' ملیحہ اور علی کی بیوی اور بیٹیاں رات گئے تک ہنسی مذاق کرتی رہیں۔ میں بھی دن میں خوب سویا تھا اس لیے نیند نہیں آرہی تھی۔ برڈ بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ رضا اور علی البتہ لیٹتے ہی سوگئے تھے۔

○

دوسری صبح ناشتے کے بعد ملیحہ جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ وہ اپنے کسی انفارمر سے مل کے بارڈر کراس کرنے کی فکر میں تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "ممکن ہے' کچھ پیسے بھی خرچ کرنا پڑیں۔ کیا آپ اس کا بندوبست کرسکتے ہیں۔ فی الحال میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "ہم منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہیں۔"

رضا نے اس کے ساتھ جانا چاہا' مگر ملیحہ نے اسے لے جانے سے انکار کر دیا اور

بولی۔ "ممکن ہے وہ لوگ رضا کو دیکھ کر انکار کر دیں۔ میں تنہا ہی یہ کام کرلوں گی۔"

"میں آپ سے دور رہوں گا۔" رضا نے جلدی سے کہا۔ "کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" برڈ نے کہا۔

"کیا بات ہے' آپ لوگوں کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔" ملیحہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ "اگر ایسا ہے تو آپ میں سے کوئی میرے ساتھ چلے لیکن کام بگڑ گیا تو۔"

"یہ بات نہیں ہے ملیحہ!" میں نے جلدی سے کہا۔" ہم صرف اس وجہ سے رضا کو تمہارے ساتھ بھیج رہے تھے۔ کہ خواتین اس قسم کے لوگوں کو ڈیل نہیں کرسکتیں۔ ہم بار بار یہ بھول جاتے ہیں کہ تم عام لڑکی نہیں ہو۔ ہمیں تم پر اعتماد ہے۔ جاؤ' ہم میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ میرے پاس پاکستانی کرنسی ہے۔ میں وہی تمہیں دے دیتا ہوں۔ تم اسے ایکس چینج بھی کرلینا۔"

"فی الحال رقم کی ضرورت نہیں ہے۔" ملیحہ نے جلدی سے کہا۔ "رقم تو ہم انہیں بارڈر کراس کرتے وقت دیں گے۔" یہ کہہ کر ملیحہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد علی آگیا۔ وہ دیر تک رضا سے باتیں کرتا رہا۔ رضا نے ہمیں بتایا کہ علی نے ہمارے لئے مکان کا بندوبست کرلیا ہے۔ وہ مکان یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ہم لوگ فوری طور پر اسی میں شفٹ ہو جائیں۔

میں بھی خوش ہوگیا۔ وہاں ہم سکون سے سو سکتے تھے۔ یہاں بھی رضا نے ہمیں آرام پہنچانے کی بساط بھر کوشش کی تھی' مگر ذہن پر ایک بوجھ سا تھا کہ ہماری وجہ سے اسے پریشانی تھی۔ میں نے رضا سے کہا۔ "علی سے کہہ دو کہ ہم ابھی اور اسی وقت اس مکان میں شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔"

رضا نے علی سے کہا تو وہ کچھ کہنے کے ساتھ ساتھ زور زور سے نفی میں سرہلانے لگا۔ رضا نے بتایا کہ علی کسی صورت میں راضی نہیں ہے کہ ہم آج وہاں شفٹ ہوں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم کل صبح وہاں شفٹ ہوسکتے ہیں۔

میں اس پرخلوص انسان کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا اس لئے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ میں نے رضا کو یہ ہدایات ضرور کردی کہ علی کو مزید پیسے دے دو!

ہمیں وہاں سوائے کھانے اور سونے کے کوئی کام نہیں تھا۔ ہمیں وہاں ہر طرح کا آرام تھا' مگر باتھ روم کی شدید تکلیف تھی۔ اس مکان میں ایک ہی باتھ روم تھا جس کے لئے ہمیں اندر جانا پڑتا تھا۔ علی نے ہمیں اپنی بیوی اور بیٹیوں سے بھی نہیں ملوایا تھا۔ وہ پردے کا قائل نہیں تھا' نہ ہی اس کی بیٹیاں یا بیوی پردہ کرتی تھیں۔ ایسا اس نے میرے ہی کہنے پر کیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم لیٹے باتیں کر رہے تھے، کہ علی گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا وحشت زدہ چہرہ دیکھ کر میں بھی پریشان ہوگیا اور بولا۔ "کیا بات ہے علی؟" پھر فوراً ہی مجھے اپنے غلطی کا احساس ہوا کہ وہ بیچارہ تو انگریزی سمجھتا ہی نہیں تھا۔

وہ جلدی جلدی رضا کو کچھ بتا رہا تھا۔ رضا بھی بری طرح گھبرا گیا اور مجھ سے بولا۔ "جلدی نکلیں یہاں سے ہم خطرے میں ہیں۔

"کیسا خطرہ؟" میں الجھ کر رہ گیا۔"

"انہوں نے نہ جانے کیسے ہمارا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آپہنچے ہیں اور اب گھر گھر تلاشی لے رہے ہیں۔"

"لیکن کیسے؟" میں جھنجلا گیا۔

"کیوں اور کیسے تو بعد میں سوچیں گے، پہلے یہاں سے تو نکلو۔" برڈ نے کہا اور جلدی جلدی لانگ بوٹ چڑھانے لگا۔

میں نے بھی جلدی سے جوتے پہنے، جیکٹ چڑھائی اور چلنے کے لئے تیار ہوگیا۔ میں نے رضا سے کہا۔ "اپنا سامان علی کے پاس رکھوا دو۔ زندگی رہی تو اسے لے لیں گے۔"

رضا کے کہنے پر علی نے بہت پھرتی سے سامان سمیٹا اور اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ واپس آیا تو حیران پریشان رضوانہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ اس وقت بھی علی اور اس کی بیٹیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

میں نے رضوانہ سے کہا۔ "میرا خیال ہے، تم یہیں رکو۔ تمہارے لئے زیادہ خطرہ نہیں ہے، پھر ملیحہ بھی لوٹ کر یہیں آئے گی۔"

"مگر آپ لوگ کہاں جائیں گے؟"

اس کی بات پر مجھے ہنسی آگئی اور میں تلخ لہجے میں بولا۔ "ہم کبھی یہ سوچ کر نکلے ہیں بلکہ بھاگے ہیں کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ بس جدھر بھی حالات لے جائیں گے، ہم چلے جائیں گے۔" پھر میں علی سے مخاطب ہوا۔ "چلو، ہم تیار ہیں۔"

علی نے کہا۔ "نوت۔ فرام دس سائید.... بیک دور.... بیک دور!"

"چلو پھر بیک ڈور ہی کی طرف چلو۔"

ہم کمرے سے باہر نکلنا ہی چاہتے تھے کہ ایک گرجدار آواز گونجی۔ "خبردار، فرار ہونے کی کوشش مت کرنا ورنہ چھلنی ہو جاؤ گے۔"

میں اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا۔

اچانک شعلہ سا چمکا اور برڈ کا باریک پھل والا خنجر اس آدمی کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ دوسرا حیرت سے اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ میں نے اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔

س کے بعد ہم نے باہر کی طرف جانا چاہا۔

اب دور سے کتوں کے بھونکنے کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ علی عباس ہمیں مکان کے پچھلے حصے کی طرف لے گیا۔ وہ خود بھی بہت گھبرایا ہوا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ مکان کے پچھلے حصے کی طرف باہر جانے کا کوئی راستہ ہوگا مگر وہاں تو سپاٹ دیوار تھی۔ وہ دیوار اتنی اونچی نہیں تھی کہ میں اس پر چڑھ نہ سکتا۔ میں نے ریوالور دوبارہ جیکٹ کی جیب میں اڑسا اور ایک ہی دفعہ میں دیوار پر جا پہنچا۔ وہاں مجھے قدم جمانے میں تھوڑی سی پریشانی اس بھاری بھرکم ٹورسٹ بیگ کی وجہ سے ہوئی تھی جو میری پشت پر لدا ہوا تھا۔ دیوار پہ پہنچ کے میں نے برڈ اور رضا کو دیکھا' وہ دونوں دیوار پر چڑھنے کو تیار تھے۔ رضوانہ کو وہاں چھوڑنے کا فیصلہ پہلے ہی ہوگیا تھا۔

برڈ نے جمپ لگانے کے لئے اپنے جسم کو تولا ہی تھا کہ اچانک ایک فائر ہوا' اور گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ گلی کے نکڑ پر سے کسی نے فائر کیا تھا۔ وہاں ایرانی پولیس کا ایک فرد جدید ساخت کی رائفل لیے کھڑا تھا۔ اس نے میرا نشانہ لے کر دوسرا فائر کرنا چاہا' مگر میں پھرتی کے ساتھ دیوار سے چمٹ گیا۔ یہ حرکت مجھے بہت مہنگی پڑی۔ اچانک جھکنے سے مجھے زبردست جھٹکا لگا اور میں سنبھلتے سنبھلتے بھی کیاری میں گر گیا گرنے سے تو مجھے معمولی سی چوٹ آئی' مگر مجھے اس وقت کسی چوٹ کی پروا نہیں تھی۔ ان مردودوں نے دونوں سروں پر گلی کی ناکا بندی کر رکھی تھی۔ میں زمین پر گرتے ہی قلابازی کھا گیا۔ ورنہ دوسرے سرے کی طرف سے چلائی ہوئی گولی میرے سر کے پرخچے اڑا دیتی۔ قلابازی کھاتے ہوئے میں نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ پھر میں نے اس رائفل بردار کی طرف اندھا دھند فائر جھونک مارا۔ دوسرے ہی لمحے ایک کرب ناک چیخ سنائی دی۔ اسی وقت گلی کی مخالف سمت سے ایک' اور رائفل گرجی۔ اس کے ساتھ ہی ریوالور کا فائر ہوا' اور ایک اور انسانی چیخ فضا میں گونج کر رہ گئی۔ میں نے دیکھا' برڈ دیوار پر بیٹھا فائرنگ کر رہا تھا۔

پھر کتوں کی خوفناک غراہٹیں سن کر میرا خون رگوں میں جمنے لگا۔ انسانوں سے نمٹنا تو ممکن تھا' مگر ان بھیڑیا نما خونخوار کتوں سے بچنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

فائرنگ کی آوازیں سن کر محلے کے لوگ سہمے ہوئے اپنے مکانوں کی کھڑکیوں اور چھتوں کی منڈیروں سے جھانک رہے تھے۔ پھر گلی کی دوسری سمت سے سیاہ رنگ کا ایک خونخوار کتا نمودار ہوا۔ وہ غراتا ہوا خونخوار انداز میں میری طرف بڑھا۔ اس کا خوفناک خونخوار جبڑا اور نوکیلے دانت دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے ریوالور سے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا' اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ برڈ نے اوپر سے فائر کیا' اور کتا اچھل کر ڈھیر ہوگیا۔ اسی وقت مجھے مزید دو کتے دکھائی دیے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنی جگہ سے اچھلا' اور سامنے والا مکان کی چھت پر پہنچ گیا۔ وہ چھت بالکل سپاٹ تھی۔ میں اگر کھڑا ہوتا تو حملہ آوروں کی کوئی گولی میرا کام تمام کرسکتی تھی اس لئے میں پیٹ کے بل لیٹ گیا'

اور بہت سرعت سے زینے کی طرف بڑھا۔ وزنی ٹورسٹ بیگ کی وجہ سے مجھے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ زینے تک پہنچ کے میں پھرتی سے کھڑا ہوا' اور ایک ایک جست میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔

اس زینے کا اختتام ایک لاؤنج پر ہوا۔ لاؤنج میں آرام دہ کرسی پر ایک بوڑھا ایرانی نیم دراز تھا' اور ایک جوان عورت جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی' چار پانچ سال کا ایک خوب صورت بچہ بھی اسی وقت بھاگتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔

میرے قدموں کی آہٹ پر بوڑھے اور عورت نے چونک کر مجھے دیکھا' پھر اپنی اپنی جگہ پر بالکل ساکت ہوگئے۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں میں کوئی انگلش جانتا ہے؟"

ان دونوں نے مشینی انداز میں نفی میں سرہلا دیا مگر ان کی نظریں ابھی تک میرے ریوالور پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا' اور ٹوٹی پھوٹی فارسی میں بولا۔ "میں خطرے میں ہوں۔ یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی محفوظ راستہ ہے؟"

ان دونوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی بات دہرائی تو بوڑھے نے سرہلا کر مایوسی سے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے مگر وہ محفوظ نہیں ہے۔"

ایک تو وہ فارسی بول رہا تھا' پھر اس کے منہ میں دانت نہیں تھے' اور آواز بھی بلغم زدہ تھی اس لئے اس کی باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہی تھی۔ وہ جلدی جلدی نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ میں صرف اتنا ہی سمجھ پایا کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میری وہ کیفیت تھی جو شکاری کتوں میں پھنسے ہوئے خرگوش کی ہوتی ہے۔ اگر برڈ نے ان لوگوں کو فائرنگ کرکے روکا ہوا نہ ہوتا تو اب تک وہ یہاں تک پہنچ گئے ہوتے۔ میں اضطراب میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ عورت نے سمجھ داری کا ثبوت دیا تھا کہ بچے کو بہلا پھسلا کر کمرے میں بھیج دیا تھا۔

پھر وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولی تاکہ اس کی بات میری سمجھ میں آجائے۔ "ہماری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اگر تمہارے دشمنوں نے یہاں تمہیں ڈھونڈ لیا تو بات دیگر ہے ہماری طرف سے مطمئن رہو۔"

"یہاں کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جہاں میں چھپ سکوں؟" میں نے ٹوٹی پھوٹی فارسی میں کہا۔

عورت نے مایوسی سے سرہلایا اور بولی۔ "ایسی کوئی جگہ نہیں ہے؟"

باہر سے فائرنگ شدت اختیار کرگئی تھی۔ شاید برڈ کے ساتھ رضا اور علی بھی فائرنگ میں شریک ہوگئے تھے۔ میری وحشت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اس عورت سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس گاڑی ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سرہلایا۔ ”میرے شوہر کے پاس موٹر بائیک ہے مگر وہ اس وقت ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ”ہمارے پڑوسیوں کے پاس پک اپ ہے۔ وہ ہوٹلوں میں سبزیاں اور پھل سپلائی کرتا ہے۔ وہ اس وقت گھر پر موجود ہوگا۔ وہ عموماً صبح سویرے ہی اپنے کام سے فارغ ہو جاتا ہے۔“

اس کی بات سن کر امید کی ایک کرن نمودار ہوئی مگر وہاں تک پہنچنا مسئلہ تھا۔ میں باہر کا جائزہ بھی نہیں لے سکتا تھا' کیوں کہ علی کے مکان کی طرح اس مکان کی پشت پر بھی کوئی دروازہ نہیں تھا۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں چھت پر جاؤں اور وہاں سے برابر والے مکان تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ مجھے برڈ کی وجہ سے بھی پریشانی تھی۔ نہ جانے وہ کس حال میں تھا۔

میں نے اس عورت اور بوڑھے سے کہا۔ ”میں چھت پر جا رہا ہوں اس لئے آپ لوگ پلیز اندر کمرے میں چلیں۔“ میں ان دونوں کو اندر بند کرکے جانا چاہتا تھا ورنہ میرے ہٹتے ہی وہ دروازہ کھولتے اور پولیس کو بلا لاتے۔

”لیکن کیوں؟“ عورت نے جھنجلا کر کہا۔

”میرے پاس وقت محدود ہے۔“ میں نے اردو آمیز فارسی میں کہا۔ ”جلدی کرو!“ میرا لہجہ سخت ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ریوالور نکال لیا۔

عورت کا چہرہ مارے خوف کے زرد ہوگیا۔ بوڑھا بھی بری طرح کانپنے لگا' اور لرزتا کانپتا اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جھانک کر کمرے میں دیکھا۔ وہ بیڈ روم تھا۔ اس میں اور کوئی دروازہ نہیں تھا۔ بیڈ پر وہی بچہ بیٹھا ہوا رنگین تصویروں والا کوئی میگزین دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو کمرے میں جھانک کر باہر سے کنڈی لگا دی' اور ان لوگوں سے کہہ دیا کہ فی الحال میرا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں اس لئے شور مچانے کی کوشش مت کرنا۔

انہیں بند کرنے کے بعد میں نے اپنے ٹورسٹ بیگ سے مشین پسٹل' اور اس کے کئی میگزین نکالے۔ یہ مشین پسٹل میں نے پہاڑوں سے واپسی کے سفر میں ایرانی کرنل سے چھینا تھا۔ وہ ریوالور میرا پسندیدہ تھا۔ اس کے بھی فاضل راؤنڈز جیکٹ' اور پینٹ کی جیبوں میں بھرنے کے بعد میں ہر طرح سے تیار ہوکر چھت پر پہنچا' اور سینے کے بل رینگتا ہوا برابر والے مکان کی چھت کی طرف بڑھا۔ گلی میں اب بالکل خاموشی تھی۔ کافی فاصلے سے کتوں کے غرانے کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ میں نے سر تھوڑا سا اٹھا کر علی کے مکان کی طرف دیکھا۔ دیوار پر نہ رضا تھا نہ برڈ۔ مجھے وسوسوں نے گھیر لیا۔ کہیں برڈ کو کوئی نقصان تو

نہیں پہنچ گیا؟ کہیں وہ گرفتار تو نہیں ہوگیا۔ اس کے ساتھ علی بھی بے موت مارا گیا ہوگا۔ مجرموں کو پناہ دینا بھی تو سنگین جرم ہے۔ ایرانی پولیس علی کو بھلا کیسے چھوڑ سکتی ہے۔ میرے ذہن میں یہی سوال گردش کر رہے تھے' اور میرا دل ڈوبا جا رہا تھا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ برڈ سے رابطہ کیسے قائم کروں؟ میرا سب جوش و خروش ماند پڑچکا تھا۔ ایک لمحے کو تو میرے دل میں آیا کہ ابھی باہر نکلوں' اور خود کو پولیس کے حوالے کر دوں۔ پھر اچانک مجھے شہلا کا خیال آگیا۔ میرے بعد تو وہ بالکل ہی بے سہارا ہو جاتی' اور بے سہارا لڑکیوں کے ساتھ یہ معاشرہ جو سلوک کرتا ہے' اس کا تصور کرکے میں لرز گیا' اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''نہیں' مجھے زندہ رہنا ہوگا میں آخری سانس تک ان لوگوں کا مقابلہ کروں گا۔'' خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا مطلب تھا عبرت ناک موت! مجھ پر قتل' اغوا' اور ڈکیتی کے اتنے الزام تھے کہ وہ لوگ فوراً مجھے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیتے۔

میں آہستہ آہستہ رینگتا ہوا دوسرے مکان کی طرف بڑھا۔ دونوں مکانوں کے بیچ میں تقریباً نو فٹ بلند دیوار تھی۔ یہ دیوار میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ میں اس پر چڑھا تو باہر سے دیکھ لیا جاؤں گا' مگر میں وہاں بیٹھا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے گردن اٹھا کر ایک مرتبہ پھر ادھر ادھر کا جائزہ لیا' مگر اب وہاں سکوت تھا۔ میں ہمت کرکے اٹھا' اور ایک ہی جست میں دیوار پر جا پہنچا' دوسرے ہی لمحے میں برابر کی چھت پر کود گیا' میں نے کوشش کی تھی کہ کودنے سے آواز پیدا نہ ہو۔ اس مکان کی چھت پر قد آدم باؤنڈری تھی جس کی وجہ سے مجھے باہر سے دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔ یہ مکان نسبتاً بڑا بھی تھا۔ میں نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا' پھر دبے پاؤں زینے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا' یہ بھی غنیمت تھا کہ زینے کا دروازہ بند نہیں تھا' ورنہ خواہ مخواہ مجھے دروازہ توڑنا پڑتا' اور اس کے شور سے نہ صرف مکین بلکہ باہر موجود پولیس والے بھی میری طرف متوجہ ہوسکتے تھے۔

میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا زینے کے ذریعے نیچے پہنچا میرا اندازہ درست نہیں تھا۔ یہ مکان علی اور دیگر مکانوں کے مقابلے میں تین گنا بڑا تھا۔ زینے کا اختتام چھوٹے سے صحن میں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی خاصا بڑا لاؤنج تھا جہاں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ کچن سے کھانے کی اشتہا انگیز مہک اٹھ رہی تھی۔ برتنوں کے گڑبڑ سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کچن میں بھی کوئی موجود ہے۔ اندر کسی کمرے میں تیزی آواز میں ٹیپ ریکارڈ بج رہا تھا اور ایرانی گلوکارہ خانم گوگوش کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔

میں نے احتیاطاً مشین پسٹل نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لیا' اور اچانک لڑکی کے سر پہ جا پہنچا۔ میری موجودگی محسوس کرکے اس نے سر اٹھایا' اور دہشت زدہ ہوکر ایک فلک شگاف

چیخ ماری- وہ اتنا اچانک چیخی تھی کہ میں اسے روک بھی نہیں سکا- اس کی چیخ سن کر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں' اور کمرے' اور کچن سے بہ یک وقت دو مرد اور ایک عورت باہر نکل آئے- مجھے وہاں دیکھ کر وہ تینوں دہشت سے گویا بت بن گئے- میں نے لہجے کو خوف ناک بنا کر کہا- "شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے- ورنہ ....." میں نے یہ جملہ بھی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں ادا کیا تھا- میری اس دھمکی کا ان لوگوں پر وہ اثر نہ ہوا جو ہونا چاہئے تھا- اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ کسی ایسی زبان میں دھمکی بھی کارگر نہیں ہوتی جو آپ کو نہ آتی ہو کیوں کہ اس طرح غصے کی شدت کا اظہار ممکن نہیں ہوتا-
ان مردوں میں ایک ادھیڑ عمر تھا' اور دوسرا نوجوان- عورت بھی ادھیڑ تھی-

ادھیڑ عمر مرد نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "تم کون ہو اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے یہ جملہ انگریزی میں ادا کیا تھا- وہ ذرا توقف کرکے بولا- "گھر میں اس وقت زیادہ کیش نہیں ہے-"

"مجھے تمہارے کیش کی ضرورت نہیں ہے-" میں نے اکھڑے لہجے میں کہا- "پولیس میرے پیچھے ہے' اور میں بہ حفاظت اس علاقے سے نکلنا چاہتا ہوں-" میں نے اچانک آگے بڑھ کر نوجوان کا گریبان پکڑلیا اور مشین پسٹل کی نالی اس کی کن پٹی پر رکھ دی' اور غیر محسوس طریقے پر پیچھے کی طرف کھسک رہا تھا- "خاموشی سے اپنی جگہ کھڑے رہو-" میں نے غرا کر کہا- "ورنہ اس پسٹل کی گولی تمہاری کھوپڑی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کردے گی سمجھے!"

"غلطی ہوگئی میرے بیٹے سے-" مرد لجاجت سے بولا- "اسے معاف کردو' ابھی بچہ ہے-"

میں نے اسے زور سے دیوار کی طرف اچھال دیا- اور .... میں بولا- "اب اس بچے نے کوئی حرکت کی تو میں کوئی رعایت نہیں دوں گا-"

"اب میں سمجھا-" ادھیڑ عمر ایرانی چونک کر بولا- "تم لوگوں پر ابھی پولیس فائرنگ کر رہی تھی- تم بچے کیسے! ان کے ساتھ تو کتے بھی تھے-"

"میری فکر میں دبلے مت ہو-" میں نے زہریلے لہجے میں کہا- "مجھے اس علاقے سے نکالنے کا بندوبست کرو-"

"م---- میں بھلا کیا کرسکتا ہوں- ان لوگوں نے چپے چپے کی ناکا بندی کر رکھی ہوگی---- اور تم ان کی نظروں سے بچ بھی جاؤ تو کتوں سے نہیں بچ سکو گے-"

میں نے آگے بڑھ کے اس کے منہ پر اتنا زور دار تھپڑ مارا کہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا- میں بلاوجہ تشدد کا قائل نہیں ہوں مگر ان لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے یہ ضروری تھا- اس طرح وہ میری بات مان سکتا تھا- تھپڑ کھا کے اس کا چہرہ ذلت اور توہین

کے احساس سے سرخ ہوگیا۔ شرمندگی کی بات بھی تھی۔ جوان بچوں اور بیوی کے سامنے اتنی تذلیل کوئی بھی برداشت نہیں کرتا۔ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "مجھے یہاں سے نکالنا تمہاری ذمے داری ہے' یہ تمہارا دردِ سر ہے کہ مجھے ان لوگوں سے کیسے بچاتے ہو' یہ بات اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو کہ تمہیں یہ کام کرنا ہے میں پکڑا گیا تو جاتے جاتے بھی تم سب کو موت کے گھاٹ اتار جاؤں گا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل بھی نہیں ہے۔ پھانسی تو مجھے ایک ہی دفعہ ہوگی نا! جہاں میں نے اڑتیس قتل کیے ہیں وہاں دو چار اور سہی!"

میری دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ جلدی سے بولا۔ "ٹھہرو مجھے کچھ سوچنے دو۔"

"جو کچھ سوچنا ہے' جلدی سوچو۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "وقت بہت کم ہے کیوں کہ وہ لوگ آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو گھر گھر تلاش کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے مزید فورس طلب کی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ گھر گھر تلاشی شروع ہو تم مجھے یہاں سے نکال دو۔" پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ "ٹیلی فون ہے یہاں؟"

"ہاں اندر ہے۔" ادھیڑ عمر ایرانی نے جواب دیا۔

"چلو' اندر چلو سب۔" میں نے حکم دیا۔

دوسرے لوگ شاید انگریزی نہیں سمجھتے تھے اس لئے ایرانی نے ان سے فارسی میں اندر چلنے کو کہا۔

وہ کمرا ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہیں ایک تپائی پر ٹیلی فون سیٹ موجود تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سیٹ اٹھایا اور اس کا وائر ایک جھٹکے سے توڑ دیا۔ پھر میں نے ٹیلی فون سیٹ کو پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ میری اس حرکت سے وہ لوگ مزید سہم گئے۔ وہ سب صوفوں پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ لڑکی ابھی تک گم صم تھی جس نے مجھے دیکھ کر چیخ ماری تھی۔ وہ وقفے وقفے سے مجھے دیکھ رہی تھی اور بہت بری طرح سہمی ہوئی تھی۔

میں بھی وہیں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں موجود ہر شخص خاموش تھا۔ کمرے میں قبر کا سناٹا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم سب بت بن گئے ہوں۔ ہر آدمی اپنے خیالات میں گم تھا۔ اس منحوس خاموشی کو میں نے ہی توڑا اور کرخت لہجے میں ادھیڑ عمر ایرانی سے مخاطب ہوا۔ "کیا تم قیامت تک یونہی سوچتے رہو گے؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" ایرانی اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "بس میں یہ کرسکتا ہوں کہ تمہیں اپنی پک اپ میں چھپا کر یہاں سے لے جاؤں اگر تم بچ گئے تو یہ تمہاری قسمت۔"

"صرف میری ہی نہیں بلکہ تمہاری بھی قسمت ہے یہ۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں پکڑا گیا تو تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ دھمکی میں نے اس لئے دی تھی کہ وہ جان بوجھ کر پولیس والوں کو متوجہ نہ کرے۔ "ایک بات اور بھی ذہن نشین کرلو۔" میں نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "تمہاری یہ بیٹی میرے ساتھ پک اپ کے پچھلے حصے میں ہوگی۔"

"یہ ---- میری بیٹی نہیں ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "یہ میری دوسری بیوی ہے۔"

"بیوی!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ کم عمر لڑکی تمہاری بیوی ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا' پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ "ٹھیک ہے میرے لئے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ یہ تمہاری بیوی ہے یا بیٹی۔ میں بہرصورت اسے یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ رکھوں گا کسی گڑبڑ کی صورت میں اس کا خاتمہ تو فوری طور پر کر دوں گا۔"

تمہیں میری زبان پر اعتبار نہیں ہے۔" ادھیڑ عمر ایرانی نے احتجاج کیا۔ "آخر اسے پریشان اور دہشت زدہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مجھے تمہاری زبان پر قطعی اعتبار نہیں ہے۔ اس لئے میں تمہاری اس نوخیز بیوی کو یرغمال بنا رہا ہوں۔ اگر تم نے کوئی چالاکی نہیں دکھائی تو میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

"میں نے تمہیں محفوظ مقام پر پہنچا دیا تو تم میری بیوی کو چھوڑ دو گے؟" اس نے رو دینے والے انداز میں پوچھا۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس لڑکی کے حسن سے متاثر ہوکر اسے ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔

"ظاہر ہے' میں اس خاتون کو چھوڑ دوں گا۔ مجھے اس بیچاری سے کیا دشمنی ہے۔ عورتوں کا میں یوں بھی احترام کرتا ہوں۔ اب یہ تو تم پر منحصر ہے کہ اس کا کتنا احترام کراتے ہو۔" میں اسے مطمئن کرنا چاہتا تھا کہ مجھے اس کی بیوی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ورنہ وہ بدک جاتا تو شاید موت کا خوف بھی اسے میری بات ماننے پر آمادہ نہ کرسکتا۔ پھر میں چونک کر بولا۔ "اب چلو گے بھی یا یہیں کھڑے باتیں بناتے رہو گے۔ اور ہاں تمہاری واپسی تک تمہاری پہلی بیوی اور بیٹا یہاں بند رہے گا۔ میں کسی بھی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا۔ میں ان دونوں کو باندھ کر ڈال جاؤں گا تم واپس آکر انہیں کھول دینا۔"

"اور اگر واپس نہ آسکا تو؟" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"تو انہیں کوئی بھی محلے والا کھول دے گا۔ اگر تم واپس نہ آسکے تو پولیس کسی سراغ کی تلاش میں یہاں ضرور آئے گی اس لئے تم بالکل فکر مند نہ ہو اور اب چلنے کی تیاری کرو۔"

"کیا چلنے سے پہلے ایک کپ کافی پینے کی مہلت بھی نہیں دو گے؟ اس نے یوں کہا جیسے اپنی زندگی کی آخری خواہش بیان کر رہا ہو۔

"کافی ضرور پیو اور مجھے بھی پلواؤ-" میں نے ہنس کر کہا- کچھ دیر بعد ہم لوگ پک اپ میں سوار ہو رہے تھے- وہ ڈبل ڈور پک اپ تھی- ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے ایک اور سیٹ تھی پھر پچھلا حصہ لوڈنگ کے لئے استعمال ہوتا تھا- ڈرائیونگ سیٹ پر وہ ادھیڑ عمر ایرانی تھا- اس کی نو عمر بیوی پہلے میری ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی مگر بعد میں اسے میں نے ہی فرنٹ سیٹ پر بھیج دیا تھا کہ پولیس کے افراد مشکوک نہ ہو جائیں- ظاہر ہے--- سیٹ چھوڑ کر وہ پیچھے بیٹھتی تو دیکھنے والے خواہ مخواہ شبے میں مبتلا ہو جاتے- میں دونوں سیٹوں کی درمیانی جگہ میں یوں لیٹ گیا تھا کہ میرا مشین پسٹل ایرانی کی نوجوان بیوی کی پسلیوں سے لگا تھا- مجھے برڈ اور رضا کی خیریت معلوم کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی- میں بھلا کس ذریعے سے ان کی خیریت معلوم کرتا- ایرانی نے میرے جسم کو چھپانے کے لئے مجھ پر گتے کے خالی کارٹن ڈال دیئے تھے- وہ نہ صرف ہوٹلوں میں سبزیاں اور پھل سپلائی کرتا تھا بلکہ ضرورت کی دوسری اشیاء صابن' ٹوتھ پیسٹ' والیں اور ٹن پیک جوسز بھی سپلائی کرتا تھا- پک اپ کے لوڈنگ پورشن میں بھی اس قسم کے کارٹن تھے مگر وہ خالی نہیں تھے- سامان دیکھ کر ہی محسوس ہوتا تھا کہ لوڈنگ پورشن سے جو سامان بچ رہا تھا وہ اس نے سیٹوں پر رکھ دیا تھا-

میں دونوں سیٹوں کے درمیان بری طرح پھنسا ہوا تھا- اور وہ ایرانی بہت آسانی سے مجھے پولیس کے حوالے کرسکتا تھا مگر میں نے بھی طے کرلیا تھا کہ اگر اس نے ایسی کوئی حرکت کی تو میں اسے اور اس کی کم سن بیوی کو فوری طور پر موت کے گھاٹ اتار دوں گا بعد میں جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا-

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے پک اپ اسٹارٹ کر دی- میں نے اسے خوف زدہ کرنے کو ایک مرتبہ پھر کہا- "سنو مسٹر! یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ تمہاری کوئی بھی چالاکی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی- میں تم دونوں کو تو ہلاک کر ہی دوں گا مگر میرے ساتھی تمہارے گھر والوں کو بھی نہیں چھوڑیں گے-"

"پلیز!" وہ ایرانی جھنجلا کر بولا- "میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور اب مجھے یکسوئی سے ڈرائیونگ کرنے دو اور دعا کرو کہ ہم بہ عافیت یہاں سے نکل جائیں-"

میں خاموش ہوگیا مگر میرا مشین پسٹل بدستور اس کی بیوی کے پہلو سے لگا رہا- وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے جونہی گلی کے نکڑ پر پہنچا' ایک کرخت آواز سنائی دی- میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایرانی سے کیا کہا گیا تھا' مگر اس نے جس انداز سے بریک لگائے اس سے اندازا ہوا کہ اسے اترنے کا حکم دیا گیا تھا-

پھر بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور کوئی گاڑی کے نزدیک آکر کرخت لہجے میں بولا- "اپنی شناخت کراؤ-" جملہ فارسی میں ادا کیا گیا تھا' مگر میں اب خاصی فارسی سمجھنے

لگا تھا۔ میں سانس تک روک لیا۔ وہی کرخت آواز پھر گونجی۔ "کہاں جا رہے ہو اور یہ تمہارے ساتھ کون ہے ؟"

"میں اشیائے صرف ہوٹلوں میں سپلائی کرتا ہوں' وہیں جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ میری بیوی ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔"

"بیوی!" باہر سے کسی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ تمہاری بیوی ہے؟"

"جی ہاں یہ میری بیوی ہے۔" ایرانی نے تلخ لہجے میں جواب دیا "آپ ازراہ کرم جلد از جلد اپنا کام کریں اور مجھے اجازت دیں۔" پھر وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا اور بولا۔ "اگر آپ کو گاڑی کی تلاش لینی ہے تو وہ بھی لے لیں کیونکہ میرے پاس وقت محدود ہے۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔" باہر سے وہی کرخت آواز سنائی دی۔ پھر گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی' اوز گاڑی اسٹارٹ ہو کر جھٹکے سے آگے بڑھ گئی میرے حلق سے طویل سانس خارج ہوا' اور میرے کشیدہ اعصاب ایک دم پرسکون ہوگئے۔ سخت سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں تر ہوگیا تھا۔ اس ادھیڑ عمر ایرانی نے واقعی اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اب اگر میدان صاف ہو تو میں سیٹ پر بیٹھ جاؤں ! یہاں تو میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"ابھی نہیں' ابھی ایک چیک پوائنٹ اور ہے۔" اس نے جواب دیا۔" اس علاقے سے باہر جانے والے راستے پر ایک چیک پوسٹ اور ہے ہم وہاں سے گزر جائیں تو تم سیٹ پر آجانا۔"

"پھر ذرا تیز چلو۔" میں نے کہا۔

"پک اپ کی اسپیڈ پہلے ہی بہت تیز ہے۔ اس کے پچھلے حصے میں خاصا لوڈ ہے اس لیے میں اس سے زیادہ تیز نہیں چل سکتا۔" اس نے جواب دیا اور ڈرائیونگ میں مصروف ہوگیا۔

مجھے اس کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر اندازہ تھا کہ وہ بھی شدید ٹینشن میں مبتلا ہو گا۔

مشکل سے دس منٹ بعد ہی اس نے پک اپ کی رفتار کم کردی' پھر اسے رکنے کا حکم ملا۔

میرے اعصاب ایک مرتبہ پھر تن گئے۔ اس مرتبہ بھی وہ سوال و جواب دہرائے گئے جو پچھلی چیک پوسٹ پر ہوئے تھے مگر یہاں کسی نے اس کی کم عمر بیوی پر طنز نہیں کیا۔

"گاڑی کا دروازہ کھلا۔" اور شاید ادھیڑ عمر ایرانی نیچے اتر گیا۔ پھر باہر سے اس کی آواز آئی۔ "آپ خود ہی تلاشی لے لیں جناب۔"

اس وقت کوئی اور گاڑی وہاں آ ٹھہری اس لئے ان لوگوں نے ہماری گاڑی کو جانے کی اجازت دے دی۔

گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور ایک مرتبہ پھر آگے بڑھی اچانک کوئی کتا غرا کر گاڑی کی طرف بڑھا کیوں کہ مجھے اس کی غراہٹ بہت نزدیک سے سنائی دی تھی۔ پھر کسی نے سخت لہجے میں کتے کو پکارا ..... میں نے ایرانی سے کہا۔ "اب وہ لوگ گاڑی روکنے کو کہیں تو روکنا مت۔"

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی روانہ ہوگئی۔

کافی دیر بعد مجھے اس ایرانی کی آواز سنائی دی۔ "اب تم باہر نکل آؤ۔"

"گاڑی روک کر پہلے یہ سامان تو ہٹاؤ" میں جھلا کر بولا۔

اس نے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی' اور میرے اوپر سے سامان کے کارٹن ہٹا دیئے۔ میں کھلی فضا میں نکل آیا' اور گہرے گہرے سانس لیے' اور اس سے پوچھا۔ "تہران یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"تہران تو یہاں سے بہت دور ہے۔ ہم تہران کی مخالف سمت میں سفر کر رہے ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تہران جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ راستے میں جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"کس قسم کی چیکنگ؟" میں نے پوچھا۔

"پولیس کو ان دہشت گردوں کی تلاش ہے جنہوں نے قم سے شاہی خزانہ لوٹا' فوج اور ساوک کے کئی افسران کو قتل کیا' اور ساوک کے ایک اہم عہدے دار کو اغوا کیا۔"

"تمہیں یہ اطلاعات کہاں سے ملیں؟"

"آج کا اخبار انھی دہشت گردوں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے۔ ان میں مقامی بھی ہیں اور غیر ملکی بھی اور---" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا' پھر چونک کر بولا۔ "کہیں--- تم--- انھی دہشت گردوں میں--- سے تو نہیں ہو؟"

میں نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور کہا۔ "تم بھی کیسی عجیب باتیں کر رہے ہو۔ میرا تعلق اگر ان لوگوں سے ہوتا تو میں یوں چوہوں کی طرح تمہارے گھر میں پناہ لیتا۔ وہ لوگ بہت طاقتور ہیں' جبھی تو ساوک اور پولیس انہیں اب تک گرفتار نہیں کر سکی۔ شاہ کا خزانہ لوٹنا کوئی آسان کام ہے!" میں نے یہ جھوٹ اس لئے بولا تھا کہ وہ واپس جاکر میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتا سکے ورنہ یہاں سے لوٹتے ہی وہ پہلا کام یہ کرتا کہ شیخی میں آکر پولیس کو میرے بارے میں بتا دیتا اور پولیس کے ہاتھ میں ایک سراغ آجاتا۔

ہم دوبارہ وہاں سے روانہ ہوئے تو ایرانی کی بیوی پچھلی سیٹ پر تھی اس کی جگہ میں فرنٹ سیٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا "مجھے ایسی جگہ چھوڑ دو جہاں سے مجھے

شیراز کی بس مل سکے۔ میں آج ہر حالت میں شیراز پہنچنا چاہتا ہوں۔" یہ بھی میں نے اسے گمراہ کرنے کو کہا تھا ورنہ میرا ارادہ بندر عباس جانے کا تھا۔

"میں تمہیں بسوں کے اڈے پر چھوڑ دوں گا وہاں سے تمہیں ہر جگہ کی بس آسانی سے مل جائے گی۔ ویسے شیراز کیوں جانا چاہتے ہو تم؟"

"میرے ساتھی وہیں میرا انتظار کریں گے۔"

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اس نے گاڑی روک دی اور مجھ سے کہا۔ "یہاں سے کچھ فاصلے پر بس ٹرمینل ہے۔ میں وہاں جانا نہیں چاہتا ہوں کہ وہاں میرے بہت سے جاننے والے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی تمہیں میرے ساتھ دیکھے۔ میں بعد میں بھی کسی مصیبت میں پڑ سکتا ہوں۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پرس نکالا اور پرس میں جتنے نوٹ تھے سب نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ رقم رکھ لو تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔"

اس کے اپنائیت بھرے انداز اور رویے سے میں شرمندہ ہو گیا' اور میں نے نرمی سے کہا۔ "شکریہ' میرے پاس رقم ہے۔"

"یہ رقم رکھ لو پلیز!" اس نے اصرار کیا۔

میں نے ہاتھ بڑھ کر نوٹ لیے اور ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ "آخر تم مجھے شرمندہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔ میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک تو نہیں کیا۔ تمہاری بیوی اور بیٹے کے سامنے تمہاری توہین کی' گن پوائنٹ پر یہاں لایا' اور قدم قدم پر تمہاری تضحیک کی۔ تم آخر ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

"میں ان باتوں کو بھول گیا ہوں۔ وہ تمہاری مجبوری تھی ورنہ میرا اندازہ ہے کہ تم برے آدمی ہرگز نہیں ہو۔ اپنے انداز و اطوار سے کسی اچھے خاندان کے فرد معلوم ہوتے ہو۔ اس عمر میں اکثر نوجوان بھٹک جاتے ہیں۔ بس میری تم سے یہی التجا ہے کہ خدارا ان راستوں سے لوٹ آؤ۔ ان پر تمہیں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔" وہ یہ باتیں کہتے ہوئے انتہائی جذباتی ہو گیا۔ "میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا بیٹے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں بہت آسانی سے تمہیں پولیس کے حوالے کر سکتا تھا' مگر میں نے ایسا نہیں کیا' بس میری یہ بات یاد رکھنا کہ جس راستوں پر تم چل رہے ہو' اس کا انجام تباہی ہے۔"

"آپ نہیں جانتے کہ میں کتنا مجبور ہوں۔" میں نے پہلی دفعہ اسے احترام سے مخاطب کیا۔ "مجھے ان رستوں پر دھکیلا گیا ہے۔ یہ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر زندگی رہی تو میں ان راہوں کو خود چھوڑ دوں گا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ تمہارا تعلق ترکی یا پاکستان سے ہے بلکہ یقیناً پاکستان سے ہے۔

ترک اتنی اچھی انگریزی نہیں بولتے۔ یہ صلاحیت صرف پاکستانیوں یا ہندوستانیوں میں ہے کہ وہ ہر زبان اہلِ زبان کی طرح بول سکتے ہیں۔"

"یہ بات آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے میں بھارتی بھی تو ہو سکتا ہوں۔"

"اپنی گفتگو سے تم مسلمان لگتے ہو۔ بھارت میں بھی مسلمان ہوتے ہیں، مگر نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ تم پاکستانی ہو۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے محترم! میں پاکستان ہوں۔۔۔ میں آپ کی نصیحتیں یاد رکھوں گا، اور زندگی رہی تو آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔"

"اور اس وقت تک تم ان راستوں کو چھوڑ چکے ہوگے۔" وہ مسکرا کر بولا پھر اس نے جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دیا۔ "اس کارڈ پر میرا ایڈریس بھی ہے، اور فون نمبر بھی۔ اگر کبھی میری ضرورت پڑے تو بلا تکلف مجھے یاد کرلینا۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔

میں نے پرجوش انداز میں اسے اور اس کی بیوی کو خدا حافظ کہا، اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہوگیا جدھر بس ٹرمینل تھا۔ جب تک میں ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا وہ مجھے دیکھتا رہا۔

مجھے ذہنی یکسوئی حاصل ہوئی تو میں گزشتہ حالات و واقعات پر غور کرنے لگا۔

یہ سوال بار بار میرے ذہن میں چبھ رہا تھا کہ آخر ایرانی پولیس کو کیسے علم ہوا کہ ہم لوگ وہاں موجود ہیں! میں جتنا اس سوال پر غور کر رہا تھا، اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ رہ رہ کر میرا شبہ اس لڑکی کی طرف جا رہا تھا جس پر میں نے شہلا کی ہم شکل سمجھ کر اعتماد کر لیا تھا۔ وہ ساوک کی عہدیدار تھی۔ میں دل میں اس خوش فہمی کو جگہ دے بیٹھا تھا کہ وہ ہمارے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتائے گی مگر ذہن ابھی تک اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔

خیر ہوگا کچھ میں نے ان خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا پھر مجھے، رضا، برڈ، علی اور رضوانہ کا خیال آیا، نہ جانے وہ لوگ کس حال میں تھے۔ برڈ وغیرہ گرفتار ہوگئے تھے یا میری طرح وہ لوگ بھی وہاں سے نکلنے میں کامیاب رہے تھے، مجھے اپنی خودغرضی پر شرمندگی بھی ہوئی مجھے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر یوں فرار نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ان لوگوں نے میرے لیے قدم قدم پر جان کی بازی لگائی تھی، جب وہ مصیبت میں تھے تو میں انہیں چھوڑ کر بھاگ لیا تھا۔ پھر میں نے دل کو تسلی دی کہ برڈ آسانی سے گرفتار ہونے والوں میں سے نہیں ہے۔

وہ ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آیا ہوگا اور ظاہر ہے رضا بھی اس کے ساتھ تھا۔ رہا علی تو اس نے یہ کہہ دیا ہوگا کہ یہ لوگ زبردستی میرے گھر میں گھس آئے تھے۔ میں بھلا کیا کر سکتا تھا۔ رضوانہ تو یوں بھی ان لوگوں میں گھل مل گئی تھی اس پر تو کسی نے توجہ بھی نہیں دی

ہوگی۔ کاش ایسا ہی ہوا ہو۔ یہ سب میرے مفروضے تھے۔ صورتحال اس کے برعکس بھی ہوسکتی تھی، مگر اب بھلا میں کیا کرسکتا تھا۔ برڈ نے مجھے اس مکان میں جو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اسے موقع ملے گا تو اس لوگوں سے ضرور پوچھ گچھ کرے گا۔ وہ اسے بتائیں گے کہ میں چھت کے ذریعے برابر والے مکان میں چلا گیا تھا۔ کاش میں نے اس مہربان ایرانی کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہوتا مگر اب وقت گزر چکا تھا اس لئے دماغ کھپانا فضول تھا۔

○

میں اپنی سوچوں میں اتنا محو تھا کہ میں سڑک کے بیچ میں آگیا تھا۔ ہوش تو مجھے اس وقت آیا جب پشت پر کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ گاڑی کا ڈرائیور مجھے برا بھلا کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سامنے ہی بس اسٹینڈ تھا۔ وہاں بہت سی بسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ میری طرح بہت سے غیر ملکی سیاح کمر پر ٹورسٹ بیگ لادے بس اسٹینڈ پر موجود تھے اس لئے کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔ میں نے بندر عباس جانے کا فیصلہ تو کرلیا تھا مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں بندر عباس کیوں جاؤں ؟ میں نے رضا سے سرسری طور پر سنا تھا کہ وہاں سے بوٹ کے ذریعے ایران سے باہر نکلنا ممکن ہے، مگر یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب میرا ایسی کسی پارٹی سے رابطہ ہوتا۔ یہی سوچتا ہوا میں بکنگ آفس تک پہنچ گیا، اور بندر عباس کا ٹکٹ لے کر بس میں جا بیٹھا۔ بس چلنے میں ابھی دیر تھی۔ کچھ دیر بعد میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک غیر ملکی لڑکی آ بیٹھی۔ وہ خاصی حسین لڑکی تھی، مگر الجھے ہوئے بدرونق بالوں اور میلے کپڑوں کی وجہ سے وہ انتہائی بری لگ رہی تھی۔ اس کے لباس سے سڑانڈ اٹھ رہی تھی۔ لگتا تھا کئی برس سے اس نے پانی کی شکل نہیں دیکھی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھی تو بدبو کا ایک بھبکا سا میرے دماغ پر چڑھ گیا۔ میں نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور ہٹ کر بیٹھ گیا۔ لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرائی تو اس کے گندے دانت دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگی۔ اگر وہ صاف ستھرے لباس میں ہوتی تو مجھے اس کے ساتھ بیٹھ کر خوشی ہوتی، مگر اب تو مجھے وحشت ہو رہی تھی۔

لڑکی نے انگریزی میں کہا۔ ”اکیلے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”تم اٹالین ہو؟“ اس نے میرا شانہ ہلا کر پوچھا۔

”نہیں میں ٹمبک ٹو سے آیا ہوں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگی اور بولی۔ ”مذاق بھی کر لیتے ہو!“ پھر وہ ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔ ”اگر تم نے میری بات کا برا مانا ہو تو میں معافی چاہتی ہوں۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ تمہیں ڈسٹرب کروں۔“

"تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟" میں نے اخلاقاً" پوچھا۔
"میرا تعلق! وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ میرا تعلق ہر ملک سے ہے اور کسی سے بھی نہیں ہے۔"
"گڈ۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہارے پاس کس ملک کا پاسپورٹ ہے؟"
میرے سوال پر وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ "تم...... تم ہپی تو نہیں لگتے۔"
"یہ تم نے کیسے کہہ دیا۔" میں نے ہنس کر پوچھا۔
"کوئی ہپی کبھی اس قسم کے سوالات نہیں کرتا۔"
"ٹھیک کہتی ہو۔" میں مسکرا کر بولا۔ "میں ہپی ہوں بھی نہیں، مگر اس لحاظ سے تو تم بھی ہپی نہیں ہو، کیونکہ تم نہ بھی تو چھوٹتے ہی مجھے اٹالین کہا تھا۔"
لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ "ذہین بھی ہو اور...... خوب صورت بھی۔"
"خوبصورت تو تم بھی بہت ہو۔" میں نے کہا۔
"واقعی۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "مجھ سے دوستی کر لو پلیز میں بالکل تنہا ہوں۔"
اس کی بات پر میں گھبرا گیا، اور جلدی سے بولا۔ "تم نے جانے کہاں جا رہی ہو۔ میری منزل کوئی اور ہے میں بھلا ......"
"میری کوئی منزل نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں تو سکون کی تلاش میں نکلی ہوں۔ جہاں تم جاؤ گے، وہی میری منزل ہو گی۔"
"مگر میں سکون کی تلاش میں نہیں نکلا۔"
میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میرا وقت اتنا فالتو ہے بھی نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم ایشیائیوں کے پیٹ ابھی اتنے نہیں بھرے کہ ہم کام دھندے چھوڑ کر سکون کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں۔"
"اوہو، تم ایشیائی ہو۔" وہ چہک کر بولی۔ "مگر ایشیائی لگتے نہیں ہو۔"
میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جہاں ابھی ابھی پولیس کی ایک گاڑی آ کر رکی تھی۔ میرے ذہن میں ایک دم خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میرا دل چاہا میں وہاں سے اٹھ کر بھاگ جاؤں مگر اس وقت تک ایک پولیس آفیسر بس میں داخل ہو چکا تھا، اور وہ ایک مسافر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی توجہ خاص طور پر غیر ملکی سیاحوں پر تھی۔ وہ ہر غیر ملکی کا پاسپورٹ چیک کر رہا تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ اگر مجھے اہل زبان کی طرح فارسی آتی ہوتی تو میں بہت آسانی سے خود کو ایرانی ظاہر کر سکتا تھا، مگر مجھے فارسی نہیں آتی تھی۔ جیسے ہی اس آفیسر کو

میرے غیر ملکی ہونے کا علم ہوتا' وہ میرا پاسپورٹ طلب کرتا۔ میں پاسپورٹ اسے کہاں سے دکھاتا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا' میاں خرم! بہت دن جی لئے اب تمہارا وقت پورا ہو گیا ہے گرفتاری کے بعد یقیناً تمہاری تلاشی ہو گی' اور پولیس والوں کے ہاتھ وہ ہیرے لگ جائیں گے' پھر پھانسی کا پھندا تمہارا مقدر ہو گا۔

اب وہ پولیس آفیسر ہماری سیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مشین پسٹل تھام لیا میں نے سوچ لیا تھا کہ گرفتار ہونے سے پہلے ایک آخری کوشش اور کروں گا' چاہے مجھے اس کے لئے کئی قتل کرنا پڑیں میں یوں آسانی سے گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

پولیس آفیسر میرے سر پر پہنچ گیا اور رسمی انداز میں مسکرا کر بولا۔ "یس مسٹر' یور پاسپورٹ؟"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنی جیبیں یوں ٹٹولنے لگا جیسے پاسپورٹ تلاش کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے پاسپورٹ کوئی سکہ تو تھا نہیں جسے یوں ڈھونڈا جاتا۔ جیبوں سے فارغ ہو کر میں نے پاسپورٹ بیگ میں تلاش کرنا شروع کیا۔ مگر ظاہر ہے پاسپورٹ ہوتا تو ملتا بھی۔ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شاید میرا پاسپورٹ کہیں گم ہو گیا ہے۔ مجھے اپنے سفارت خانے سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔"

"آپ پلیز میرے ساتھ آئیں۔" آفیسر نے خشک لہجے میں کہا۔ "آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟"

"ایڈی' کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" میرے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی منہ بنا کر بولی۔ "تمہاری یادداشت اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہے تم کہہ رہے تھے نا کہ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔ تم نے شرط بھی لگائی تھی۔ میں شرط جیت چکی ہوں۔ تمہارا پاسپورٹ میرے پاس ہے۔"

"تمہارے پاس۔" میں نے حیرت سے اسے گھورا۔

"ہاں' میرے پاس!" وہ چہک کر بولی۔

"میں صرف اس لئے خاموش تھی کہ تمہاری یادداشت کا امتحان لے سکوں اور شرط جیت سکوں۔ لاؤ نکالو سو ڈالر۔"

"میڈم!" آفیسر نے جھلا کر کہا۔ "آپ شرط کی رقم بعد میں وصول کیجئے گا پہلے پاسپورٹ دکھا دیں۔"

لڑکی نے گھور کر آفیسر کی طرف دیکھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اپنے بیگ کھول کر دو پاسپورٹ نکال لئے۔ میں حیرت سے گنگ ہو کر رہ گیا۔ میں سمجھ رہا تھا لڑکی ایل ایس ڈی یا مارفیا کے نشے میں اول فول بک رہی ہے' مگر اس کے ہاتھ میں واقع دو

پاسپورٹ تھے۔ وہ امریکن پاسپورٹ تھے۔ ان کی ایک جھلک دیکھتے ہی آفیسر نرم پڑ گیا۔ اس زمانے میں امریکہ گویا۔ ایران کا ان داتا تھا۔ آفیسر نے دونوں پاسپورٹ لے کر ان پر سرسری سی نظر ڈالی اور لڑکی کو واپس کرتے ہوئے بولا۔ ”سوری میڈم! میری کوئی بات بری لگی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔“

لڑکی خوش دلی سے مسکرائی اور پاسپورٹ لے کر دوبارہ اپنے بیگ میں رکھ لئے۔

”مسٹر!“ آفیسر جاتے جاتے مجھ سے بولا۔ ”اب آپ یاد رکھئے گا آپ کا پاسپورٹ ان کے پاس ہے، تھینک یو۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

میں حیرت کے جھٹکے سے ابھی تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ مجھے لڑکی کی دیدہ دلیری، اور ایرانی آفیسر کی حماقت بلکہ اندھے پن پر حیرت تھی۔ وہ اس پاسپورٹ اور لڑکی کی جارحانہ انداز سے اتنا مرعوب ہو گیا تھا کہ اس نے پاسپورٹ کی تصویر پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔

وہ جونہی بس سے نیچے اترا میں نے لڑکی سے پوچھا۔ ”تم نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا۔ اگر وہ آفیسر......“

”شی!“ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”ابھی اس موضوع پر کوئی بات مت کرو۔ وہ دوبارہ بھی آ سکتا ہے۔ بس کو چلنے دو۔“

میں خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ آفیسر کسی اور بس کی طرف بڑھ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بس روانہ ہوئی تو میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

”اب تو تمہیں میری دوستی پر اعتراض نہیں ہے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا؟“ میں بھی سرگوشی میں بولا۔

”اس لئے کہ میں تنہا ہوں۔ وہ لوگ تمہیں اپنے ساتھ لے جاتے تو میں ایک مرتبہ پھر تنہا ہو جاتی۔“

”تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہو گئی۔“

”یہ تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکی۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی۔ ”میں نے سوچا وہ لوگ تمہیں لے جائیں گے، پھر تم اپنے سفارت خانہ سے رابطہ قائم کرو گے۔ وہاں سے تمہیں پاسپورٹ جاری کیا جائے گا، تب کہیں جا کر تمہاری گلو خلاصی ہو گی۔ پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ میرے پاس ایک فالتو پاسپورٹ موجود ہے اس لئے میں نے وہ ڈراما کر لیا۔“

”اور تمہارے پاس وہ فالتو پاسپورٹ کیوں ہے؟“ کوشش کے باوجود میں اپنے لہجے کے طنز پر قابو نہ پا سکا۔ ”کیا تم پاسپورٹ کا کاروبار کرتی ہو؟“

لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی۔ "یہ پاسپورٹ ایڈی کا ہے۔ وہ تہران میں مجھ سے بچھڑ گیا۔ میں نے کئی دن اس کا انتظار کیا' مگر وہ نہ آیا تو میں اکیلی ہی نکل پڑی۔"

"اسے تم نے تلاش کیا؟ پولیس میں رپورٹ درج کرائی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی۔ وہ مجھے استنبول میں ملا تھا۔ پھر وہ میرے ساتھ ہی ایران آیا' اور یہاں آ کر گم ہو گیا۔ اپنا پاسپورٹ اور بریف کیس وہ میرے پاس چھوڑ گیا تھا۔"

"ممکن ہے اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو؟" میں نے کہا۔ "ممکن ہے کہ وہ ......"

"فار گاڈ سیک۔" وہ جھنجلا کر بولی۔ "تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے۔ حادثہ پیش آ گیا ہو تو بھلا میں کیا کر سکتی ہوں۔ وہ سفارت خانے سے دوسرا پاسپورٹ حاصل کر لے گا۔"

"مجھے ذرا وہ پاسپورٹ دکھاؤ۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے آگے بھی چیکنگ ہو۔ اب تم نے جھوٹ بول ہی دیا ہے تو یہی سہی۔"

"مگر ایک شرط پر!" وہ میری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ "تم جہاں بھی جا رہے ہو مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔"

"او کے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر تم میرے ساتھ رہ کر پچھتاؤ گی۔"

اس نے بیگ کھول کر پاسپورٹ نکالا اور میرے حوالے کر دیا۔ میں نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ وہ پاسپورٹ کسی ایڈون چارلس کا تھا۔ اس کی عمر بائیس سال تھی' آنکھیں نیلی' اور بال براؤن تھے۔ چہرے پر میری طرح گھنی مونچھیں تھی' اور چہرے کی ساخت بھی میری طرح تھی۔ ایڈون کا قد چھ فٹ دو انچ اور وزن ایک سو اسی پونڈ تھا۔ گویا وہ قد میں مجھ سے ایک انچ بڑا اور وزن میں بھی کچھ پونڈ زیادہ تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے سوچا' اگر میں یہ پاسپورٹ اس لڑکی سے لے لوں تو میرا بنیادی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آنکھیں نیلی کرنے کے لئے میں کانٹیکٹ لینس استعمال کر سکتا تھا۔ بال براؤن کرنا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مونچھوں کی تراش خراش بھی ایڈی کی طرح ہو سکتی تھی یا پھر میں ایڈی کی تصویر کی جگہ اپنی تصویر بھی لگا سکتا تھا۔ وہ لڑکی تو میرے لئے فرشتہ رحمت بن کر آئی تھی۔

"کیا تم پاسپورٹ کو آنکھوں کے ذریعے پینا چاہتے ہو؟" لڑکی نے مجھے چونکا دیا۔

"میں ایڈی کا پتا' اور دوسری تفصیلات ذہن نشین کر رہا تھا۔" میں نے جواب دیا پھر ہنس کر بولا۔ "میں بھی کتنا عجیب آدمی ہوں۔ میں نے اب تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔ اب یہ مت کہنا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔"

"میرا نام کلارا ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "سٹی گن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا ہے میں نے۔ اور اب دنیا کے سفر پر نکلی ہوں۔"

"کیا .... کیا .... کیا ہے تم نے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ڈاکٹریٹ کیا ہے۔" وہ بولی۔ "کوئی چوری نہیں کی ہے جو تم اتنے حیران ہو۔" اب ذرا اپنا تعارف بھی تو کراؤ۔

"میرا تعارف!" میں مسکرا کر بولا۔ "میرا نام ایڈون چارلس ہے اور میں ...."

کلارا کے بے ساختہ قہقہے نے مجھے خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ "تم مجھے بھی ایرانی امیگریشن یا پولیس آفیسر سمجھ رہے ہو۔ ہماری بلی اور......."

"میں تو ریہرسل کر رہا تھا۔" میں ہنس کر بولا۔ "میرا نام خرم ہے۔ پاکستان سے تعلق ہے اور دنیا گھومنے نہیں نکلا ہوں۔ میں نے ڈاکٹریٹ بھی نہیں کی ہے۔"

وہ ایک مرتبہ پھر ہنسنے لگی۔ "تم باتیں بہت دلچسپ کرتے ہو۔"

پھر راستے بھر وہ میرا دماغ چاٹتی رہی۔ اگر اس نے میری مدد نہ کی ہوتی تو شاید میں اسے بری طرح جھڑک دیتا' یا پھر اپنی سیٹ ہی تبدیل کر لیتا مگر اس نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا تھا کہ میں اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

خدا خدا کر کے ہماری بس بندر عباس پہنچی۔ وہاں سے ہم ٹیکسی کے ذریعے معقول سے ایک ہوٹل میں پہنچے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں غیرقانونی طور پر ایران کا باڈر کراس کروں گا' مگر اب پاسپورٹ حاصل کرنے کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اس پاسپورٹ پر پاکستان چلا جاؤں گا' پھر یہ سوچ کر میرا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا کہ میں قانونی طور بھی پاکستان گیا تو میرے سامان کی چیکنگ ضرور ہو گی' اور جونہی میرے پاس سے ہیرے برآمد ہو گے کسٹم کے حکام مجھے دھر لیں گے۔ پھر نہ صرف اسمگلنگ بلکہ غیر قانونی آمد کے الزام میں بھی مجھ پر مقدمہ چلے گا۔ یہ ساری باتیں سوچ کر میں نے قانونی طور پر پاکستان جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ مجھے کوئی اور ہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔

میں چاہتا تھا کہ اپنا حلیہ پاسپورٹ کے مطابق بدلوں تاکہ ایران میں فوری طور پر میرے لئے کوئی خطرہ نہ رہے۔ کلارا سائے کی طرح میرے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ میں باہر جانے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اپنا حلیہ بدل رہا ہوں۔ ایک دکان سے میں نے نیلے رنگ کے لینس لئے' بالوں کا رنگ بدلنے کے لئے ہائیڈروجن پر آکسائیڈ خریدی' اور کچھ اور چیزیں خرید کر واپس چل دیا۔ پھر ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک دکان دیکھ کر میں نے اپنے اور کلارا کے لئے کئی جوڑے خریدے اس کے علاوہ کاسمیٹکس کا سامان بھی کلارا کے لئے خریدا اور واپس ہوٹل پہنچ گیا۔

میں نے کلارا اسے کہا۔ "میری ایک بات مانو گی؟"

"کہو" وہ بہت اپنائیت سے بولی۔ "تم نے تو میرے لئے اچھی خاصی شاپنگ کر ڈالی۔ ایڈی میں اور تم میں یہی فرق ہے وہ میرے ساتھ کھانا بھی کھاتا تھا تو صرف اپنا بل ادا کرتا تھا۔ مجھے اپنے حصے کی رقم خود ادا کرنا پڑتی تھی۔ تم نے نہ صرف ہوٹل کے کمرے کا کرایہ دیا' بلکہ میرے لئے ڈھیروں شاپنگ بھی کی۔ پاکستانی واقع بہت فراخ دل ہوتے ہیں۔ ایک کیا' میں تمہاری ہزار باتیں بھی مان لوں گی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم صاف ستھری رہو۔ تم اچھی خاصی حسین ہو' مگر تم نے خود اپنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔"

"اتنی سی بات۔" وہ چہک کر بولی۔ "یہ کون سا ایسا مشکل کام ہے۔ میں ابھی اپنا حلیہ بدل لوں گی' پہلے تم میرا ایک کام کرو۔"

وہ اپنا بیگ کھولتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے بیگ سے سرنج' اور کسی انجکشن کی شیشی نکالی اور بولی۔ "ذرا مجھے یہ انجکشن لگا دو۔"

"یہ ...... کیا ہے یہ؟" میں چونک کر بولا۔ "مجھے انجکشن لگانا نہیں آتا۔ تمہیں اگر کوئی تکلیف ہے تو میرے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس چلو۔ وہ تمہیں انجکشن بھی لگا دے گا۔"

"تم تو بالکل احمق ہو۔ بے وقوف' یہ پتھوڈین کا انجکشن ہے کوئی بھی ڈاکٹر مجھے یہ انجکشن نہیں لگائے گا۔"

" پیتھوڈین!" مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ "تو کیا تم نشے کی عادی ہو؟"

"نہیں' یونہی شوقیہ لگواتی ہوں انجکشن۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "جلدی لگاؤ' میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔"

"سوری کلارا!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں نے آج تک کبھی کسی کو انجکشن نہیں لگایا' پھر تم تو آئی وی لگواؤ گی۔ یہ بہت خطرناک کام ہے۔"

"لیواٹ" وہ بیزاری سے بولی۔ "میں خود ہی لگا لوں گی۔" اس نے اپنے بازو پر رومال باندھتے ہوئے کہا۔ انجکشن وہ پہلے ہی تیار کر چکی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے انجکشن کی سوئی اپنے بازو میں گھونپی اور انجکشن لگانے لگی۔

انجکشن لگتے ہی اس کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا اس نے ترنگ میں لہراتے ہوئے انجکشن کی وائل اور سرنج دوبارہ بیگ میں رکھی اور کپڑے اٹھا کر لہراتی ہوئی سی باتھ روم کی طرف بڑھی۔ میں حیرت سے اپنی کھوپڑی سہلانے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کلارا کو نشے کی اس لعنت سے بھی نجات دلاؤں گا۔

پھر میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے بالوں کو بلیچ کیا' مونچھوں کو بلیچ کرنے کے بعد انہیں ایڈی کے انداز میں تراشا' پاسپورٹ سامنے رکھ کر ایڈی کا ہیر اسٹائل

بنایا اور کانٹیکٹ لینز لگا کر خود کو آئینے میں دیکھا تو اچھل پڑا۔ میری شکل ایڈی کی تصویر سے اتنی مشابہہ ہو گئی تھی کہ میں خود بھی دھوکا کھا گیا۔

اس وقت کلارا باتھ روم سے نکلی تو بری طرح چونک اٹھی۔ "ایڈی' تم......." پھر خود ہی ہنس کر بولی۔ "ونڈر فل خرم' تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ حیرت انگیز......."

"تم ڈر کیوں گئیں۔ اگر واقعی ایڈی ہوتا تو تمہیں کیا نقصان پہنچاتا؟"

"چھوڑو اس کے ذکر کو۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "دیکھو میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

میں نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ نکھری نکھری بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ پھول کی طرح تروتازہ لگ رہا تھا' آنکھوں میں گلابی ڈورے تھے اور گلابی اسکرٹ اور بلاؤز میں اس کا پرکشش جسم قیامت ڈھا رہا تھا۔ وہ پراشتیاق نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم واقعی بہت حسین ہو۔"

میری بات سن کر وہ والہانہ انداز میں میری طرف لپکی تو میں نے اسے روک دیا اور ہنس کر بولا۔ مگر......."

"مگر کیا۔" وہ بجھ سی گئی۔

"مگر یہ کہ تم جتنی حسین نظر آ رہی ہو' اس سے کہیں زیادہ حسین ہو۔"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

میں جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا۔

میں نہا دھو کر باہر نکلا تو وہ روم سروس سے کافی منگا چکی تھی۔ کافی کے ساتھ سینڈوچز بھی تھے۔ میں صبح سے بھوکا تھا اس لئے منٹوں میں ساری سینڈوچز ہڑپ کر گیا۔ گرم گرم کافی پینے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔ میں دن بھر کا تھکا ہوا تھا' اور اب رات ہو رہی تھی۔ اس وقت کافی کی بجائے کلارا کو کھانا منگانا چاہئے تھا' مگر وہ تو انجکشن کے ذریعے اپنی خوراک لے چکی تھی۔ نشے کی عادی لوگ یوں بھی برائے نام کھاتے ہیں۔ کلارا کو شاید حال ہی میں یہ لت لگی تھی اس لئے اس کا جسم ابھی اس کے اثرات سے محفوظ تھا۔ میں جانتا تھا کہ چند ہی مہینوں میں اس کا جسم بالکل کھوکھلا ہو جائے گا اور چہرے کا سارا حسن غارت ہو کر رہ جائے گا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ' مہذب معاشرے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے باوجود نشے کی لعنت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا "کلارا ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہیں مانو گی۔"

"دیکھو خرم! ہم اب دوست ہیں اس لئے کوئی بات کہنے سے پہلے یہ تمہید مت باندھا کرو۔ جو کچھ کہنا ہو' بلا جھجک کہہ دو۔"

"تم نشہ کیوں کرتی ہو؟" میں نے کہا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”میں نشہ کیوں کرتی ہوں!“ اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ نشے سے مجھے سکون ملتا ہے۔ میں آج تک ذہنی سکون اور سچی خوشی کو ترس رہی ہوں۔ مجھے یاد نہیں کہ میری ماں نے کبھی مجھے پیار کیا ہو۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ میرا باپ امریکہ کا بہت بڑا بزنس مین ہے۔ میری ماں نے مشکل سے اس کے ساتھ چار برس گزارے، پھر ان دونوں میں علیحدہ ہو گئی۔ ماں نے اس کے بعد لوٹ کر میری خبر بھی نہ لی۔ اسے شاید یاد بھی نہیں ہو گا کہ اس کی کوئی بیٹی بھی تھی۔ جب وہ میرے باپ کے ساتھ تھی، اس وقت بھی وہ اپنی مصروفیات میں اتنی مگن تھی کہ دو دن میری خبر نہیں لیتی تھی۔ میں نے آیا کی گود میں پرورش پائی۔ دنیا کی ہر چیز میرے پاس تھی، مگر میں ماں باپ کے پیار سے محروم تھی۔ بڑی ہوئی تو باپ نے مجھے ہوسٹل بھیج دیا۔ امریکن لڑکیوں کی طرح میرے مزاج میں آوارگی نہیں تھی۔ میں نے پڑھائی میں دل لگایا کہ شاید اسی طرح مجھے سکون مل سکے۔ میں نے انتہائی کم عمر میں ڈاکٹریٹ کر لیا۔ مجھے ملازمت کی ضرورت نہیں تھی، مگر خود کو مصروف رکھنے کے لئے میں نے ملازمت کر لی۔ اس دوران میری ملاقات ہیری سے ہوئی۔ وہ بھی میری ہی فرم میں سیلز آفیسر تھا۔ پہلے اس سے دوستی ہوئی، پھر یہ دوستی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ دن میری زندگی کے یادگار اور حسین دن ہیں۔ میں ہیری کو بے تحاشا چاہتی تھی۔ میری طرح وہ بھی احساس محرومی کا شکار تھا۔ بس فرق صرف یہ تھا کہ میں ایک دولت مند باپ کی بیٹی تھی اور ہیری غریب تھا۔ میں نے اپنے باپ سے شادی کی بات کی تو وہ مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ میں تمہاری شادی کسی قیمت پر اس مفلس اور کنگال سے نہیں کروں گا۔ میں نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا کہ میں ہیری سے شادی ضرور کروں گی۔“

”پھر...... تم نے اس سے شادی کی؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے باپ کی مخالفت مول لے کر اس سے شادی کی، مگر یہ شادی بہ مشکل دو ماہ ہی چلی تھی۔ شادی کے بعد میرے باپ نے مجھے معاف کر دیا تھا۔ اس نے ہیری کو اپنے کاروبار میں شریک کر لیا۔ ہیری کے پاس دولت آئی تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے۔ اس کی بہت سی گرل فرینڈز پیدا ہو گئیں۔ وہ مسلسل مجھے نظر انداز کرتا رہا۔ بالآخر ایک دن میں نے اس سے طلاق لے لی۔ اس کے بعد امریکہ میں میرا دل نہیں لگا اور میں سکون کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔“

”بہت افسوس ہوا تمہاری کہانی سن کر۔“ میں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ”مگر یہ نشے کی لت تمہیں کیسے لگی؟“

”اٹلی میں میری ملاقات جوزف سے ہوئی۔ اس نے مجھے اس نشے سے روشناس کرایا۔ نشے کا انجکشن لگتے ہی مجھے عجیب طرح کی خوشی کا احساس ہوتا ہے ہر طرف رنگ

ہی رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ میرا وجود ہلکا پھلکا سا ہو جاتا ہے اور بے وزنی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں بادلوں کے دوش پر سوار ہوں۔"

"تم کب سے نشہ کر رہی ہو؟"

"ابھی مجھے نشہ کرتے ہوئے دو مہینے بھی نہیں ہوئے۔" "ابھی تم اسے چھوڑ بھی سکتی ہو۔" میں نے کہا "کچھ وقت گزرنے کے بعد تو نشہ کا زہر تمہارے خون میں سرایت کر جائے گا اور تمہارا ایک ایک سانس نشے کا مرہون منت ہو گا۔"

"میں جانتی ہوں۔" اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میں جانتی ہوں کہ یہ نشہ مجھے کھوکھلا کر دے گا اور ایک دن نشے کی حالت میں میری موت واقع ہو جائے گی۔"

"اس کے باوجود یہ زہر تم اپنی رگوں میں اتار رہی ہو۔ یہ تو خودکشی ہے کلارا!"

"جب زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ ہو تو جینے کا فائدہ بھی کیا۔ میرے ملک کی ہر لڑکی اسی بے مقصدیت کا شکار ہے۔ ان کی اکثریت گمراہی اور آلودگی میں فرار ڈھونڈتی ہے' مگر میں نے تو ہمیشہ اس سے نفرت کی' میری زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد ہیری تھا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کلارا کہ دوسروں کی بے وفائی کی سزا خود کو دی جائے۔" میں نے بہت اپنائیت سے کہا۔ "میری بات مانو کلارا! نشے کی لعنت سے نجات حاصل کر لو۔"

"تم اگر اتنے خلوص سے کہو گے تو میں دنیا بھی چھوڑ سکتی ہوں۔" اس نے والہانہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو ایک سہارے کی ضرورت ہے خرم! کیا ...... تم میرا سہارا بن سکتے ہو؟"

"اور اگر وہ ایڈی آگیا تو؟"

"لعنت بھیجو ایڈی پر۔" وہ جھلائی۔ "اس سے میرا اتنا ہی تعلق تھا جتنا بس یا ٹرین میں ایک ساتھ سفر کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ کوئی اور تعلق ہوتا تو اس کی گمشدگی پر میں یوں لاتعلق نہ رہتی۔ بتاؤ' میرا سہارا بنو گے؟" اس نے امید بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ "تم بھی سوچ رہے ہو گے کہ عجیب لڑکی ہے' پہلی ہی ملاقات میں گلے کا ہار بنی جا رہی ہے مگر میں ہر معاملے میں بہت صاف گو' اور جلد باز ہوں۔ تم پہلی ہی نظر میں مجھے اچھے لگے تو میں نے اس کا اظہار کر دیا۔"

"تمہیں میرے متعلق تفصیل سے معلوم ہو گا تو شاید تم ایک لمحے بھی میرا ساتھ گوارا نہ کرو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں خرم' تم اتنے برے نہیں ہو سکتے۔" اس نے بے یقینی سے کہا۔ "میں نہیں

مان سکتی۔"

"میں اس سے ابھی کچھ زیادہ ہی برا ہوں۔ میرے پہلو میں موت چلتی ہے۔ ایران کی تمام خفیہ ایجنسیاں میری تلاش میں ہیں' اور میں مسلسل بھاگ رہا ہوں۔ میرے نزدیک جو بھی آیا' وہ بے موت مارا گیا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ایک عذاب سے نکل کر دوسرے بڑے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ۔"

"مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لئے ایسا جھوٹ مت بولو جو مجھ سے ہضم نہ ہو سکے۔" اس نے زخمی لہجے میں کہا۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے کلارا' اگر تم گزشتہ ایک ہفتے کے اخبارات دیکھو گی تو تمہیں میری بات کا یقین آ جائے گا۔"

"وہشت گرد اتنے معصوم تو نہیں ہوتے۔" اس نے بے یقینی سے مجھے گھورا۔

"میں تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتائے دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پھر سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔"

پھر میں نے اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

میری باتیں سن کر وہ حیرت سے گنگ رہ گئی۔ کافی دیر تک تو اس سے کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔ پھر وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "تم واقعی بہت باہمت ہو خرم' اتنی سی عمر میں تم اتنے بڑے بڑے اور بھیانک تجربوں سے گزر چکے ہو۔ میں تو تمہیں کھلنڈرا سا کوئی لڑکا سمجھی تھی جو تفریح کی غرض سے نکلا ہو مگر تم تو۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر گہرا سانس لیا۔

"اب تم بتاؤ میں نے کیا غلط کہا تھا۔ میرا ہر سانس مستعار ہے کہ نہیں؟ ممکن ہے اب تک کوئی گولی مجھے چاٹ چکی ہوتی مگر شاید ابھی میری زندگی باقی ہے۔ مجھے اپنی بہن سے ملنے کی آس نہ ہوتی تو شاید مجھے خود بھی زندہ رہنے کی خواہش نہ ہوتی۔"

"میری ایک بات مانو گے خرم!" کلارا نے بہت اپنائیت سے کہا۔

"کلارا تم نے مجھے اپنا دوست کہا ہے۔ دوستی میں یہ تمہید کیسی؟" میں نے اس کا کہا ہوا جملہ دوہرایا۔

وہ بے اختیار ہنسنے لگی اور بولی۔ "میں تمہید اس لئے باندھ رہی ہوں کہ تم مانو گے نہیں۔"

"تم کہو تو" میں نے کہا۔

"کیا ہم دونوں مل کر شہلا کو تلاش نہیں کر سکتے۔ دیکھو انکار مت کرنا۔ یوں میری زندگی کا بھی ایک مقصد ہو جائے گا۔"

"کلارا میں ایک مفرور مجرم' قاتل' ڈاکو اور لٹیرا ہوں۔ غیر قانونی طور پر ایران میں

داخل ہوا ہوں۔ قدم قدم پر موت میری گھات میں ہے' اور تم میرے ساتھ رہنے کی خواہش کر رہی ہو؟"

"ہاں۔" کلارا نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ میں جانتی ہوں۔ تم ایسے نہیں ہ تمہیں زبردستی اس صورتحال میں دھکیل دیا گیا ہے۔ دیکھو پلیز انکار مت کرنا۔"

"میں انکار صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ ...."

"کسی لئے نہیں۔" کلارا نے میری بات کاٹ دی۔ "میں ہر قسم کی صورتحال کو فیس کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"او کے' تم مصیبت میں گرفتار ہونا ہی چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ نیند کے مارے میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ دنیا بھر کی بھاگ دوڑ اور ذہنی کشیدگی نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کمرے میں ایک ہی ڈبل بیڈ تھا۔ اس پر دو جہازی سائز کمبل بھی تھے۔ میں نے ایک تکیہ اور کمبل اٹھایا اور قالین لیٹ گیا۔ کلارا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا' پھر بولی۔ "یہ کیا خرم! تم فرش سوؤ گے اس سردی میں؟"

"فرش پر دبیز قالین ہے اور کمرے میں ہیٹر بھی آن ہے۔" میں نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔ "سردی ہے کہاں!"

"مگر بیڈ پر لیٹنے میں کیا قباحت ہے؟" اس نے منہ بنا کر پوچھا۔

"میں تمہارے ساتھ اس بیڈ پر نہیں لیٹ سکتا۔"

"او' میں سمجھی۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ تم مسلما بھی ہو۔"

"آئندہ یہ بات مت بھولنا۔" میں نے کہا اور کمبل تان لیا۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پ تھوڑا سا سرکایا تو کمرا روشنی سے بھر گیا۔ میری کلائی کی گھڑی میں صبح کے آٹھ بج ر تھے۔ کلارا ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے کمبل اور تکیہ بیڈ پر رکھا اور ایکسر شروع کر دی۔ شروع سے میرا معمول تھا کہ میں صبح کو کم از کم ایک گھنٹا ایکسرسائز ک تھا۔ پہلے ماما اور بعد میں وانگ یو نے ہمیشہ صبح کی ایکسرسائز پر زور دیا تھا۔ میں نے ک عرصے بعد ایکسرسائز کی تھی۔ اس لئے مجھے کچھ زیادہ ہی مزہ آ رہا تھا۔ مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب کلارا اٹھ کر میرے نزدیک آ بیٹھی۔ اس وقت میں انتہائی مشکل مشق کر رہا تھ میں بالکل سیدھا کھڑا تھا اور کمر کو خم دیئے بغیر اپنا چہرہ بار بار گھٹنوں تک لے جا رہا تھا۔ میں نے سر گھٹنوں میں دے کر خود کو تھوڑی دیر تک اسی پوزیشن میں رکھا۔ اسی وقت

پیچھے سے تیز قسم کی آواز سنائی۔ "ڈانٹ موو!"

میں بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور فوراً ہی میری نظر کلارا پر نہ پڑ گئی ہوتی تو اس کی گردن ٹوٹ چکی ہوتی۔ اپنے وار کو روکنے کے چکر میں میں کرسی سے ٹکرا گیا۔

کلارا حیرت سے مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "کلارا! آئندہ مجھ سے ایسا مذاق مت کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔ ابھی اگر میرا ہاتھ تمہاری گردن پر پڑ جاتا تو؟"

"سوری خرم!" وہ شرمندگی سے بولی۔ "میں تمہیں چونکانا چاہتی تھی۔"

ناشتے کے بعد میں نے کلارا سے کہا۔ "میں اب اس ملک سے تنگ آ گیا ہوں اور یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں اس سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔"

"چلو' میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" کلارا نے جواب دیا "ہم کسی ٹریول ایجنٹ سے بات کرتے ہیں۔ ممکن ہے وہی کوئی طریقہ بتا دے۔"

"وہ سیدھا جیل کا راستہ دکھائے گا۔" میں ہنس کر بولا۔ "ایک طریقہ یہ ہے کہ میں ایڈی کے پاسپورٹ پر باہر نکلنے کی کوشش کروں۔"

"ایسا اندھیر بھی نہیں ہے۔" کلارا نے جواب دیا۔ "اس پاسپورٹ سے ہم عام پولیس کو تو بے وقوف بنا سکتے ہیں مگر امیگریشن والے بہت تیز ہوتے ہیں۔ ہم پاسپورٹ کی تصویر بدل سکتے ہیں مگر اس کے لئے بھی بہت مہارت کی ضرورت ہے اور پروفیشنلز ہی یہ کام کر سکتے ہیں' پھر سب سے بڑا خطرہ ایڈی کی طرف سے ہے۔" اگر اس نے سفارت خانے میں پاسپورٹ گم ہونے کی رپورٹ کر دی ہو گی تو اس گمشدہ پاسپورٹ کا نمبر امیگریشن پولیس کے پاس بھی ہو گا۔ پاسپورٹ دیکھتے ہی وہ تمہیں دھر لیں گے۔" کلارا نے بات مکمل کر کے گہرا سانس لیا۔ لے دے کر ٹریول ایجنٹ ہی رہ جاتے ہیں۔ ہم ان سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاسپورٹ گم ہو گئے ہیں اور ہم کسی مصلحت کی بنا پر اپنے سفارت خانے سے رابطہ نہیں کر سکتے' اور فوری طور پر ایران سے نکلنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ صرف رقم سے غرض رکھتے ہیں' فالتو بات نہیں کرتے۔"

"چلو' پھر کسی ٹریول ایجنسی میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور جیکٹ پہننے لگا میں نے بغلی ہولسٹر میں مشین پسٹل لگایا تو کلارا بولی۔ "تم تو سی آئی اے کے کسی ایجنٹ کی طرح مسلح رہتے ہو۔"

"رہنا پڑتا ہے۔" میں نے جیکٹ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔ "میری زندگی کسی ایجنٹ سے مختلف تو نہیں۔"

میں اور کلارا ایک ساتھ باہر نکلے اور ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ ہمیں کسی معقول ٹریول ایجنٹ کے پاس لے چلو۔

"کچھ بھیجنا ہے صاحب یا منگوانا ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔ کلارا کی قہر آلود نظریں دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد ہم ایک ٹریول ایجنٹ کے آفس میں بیٹھے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ پاکستانیوں کی طرح ایرانی بھی سفید چمڑی سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ کلارا کی وجہ سے وہاں ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مینجر نے ہاتھ ملاتے ہوئے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ "لیس مادام' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ایک چھوٹے سے معاملے میں مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔" کلارا نے بڑی ادا سے کہا۔ "ہمارے پاسپورٹ کہیں مس پلیس ہو گئے ہیں اور ہمیں فوری طور پر ایران چھوڑنا ہے۔ آپ اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟"

مینجر نے غور سے کلارا کی طرف دیکھا' پھر اس کی نظریں مجھ سے ٹکرائیں اور وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "میڈم! میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے سفارت خانے سے رابطہ کریں۔ میں تو صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ آپ "قانونی" طور پر دنیا کے کسی بھی حصے میں جانا چاہیں تو آپ کے آرام دہ سفر کا بندوبست کر دوں۔"

پھر اس نے انٹر کام پر اپنے کسی ماتحت کو کمرے میں طلب کیا اور اس سے بولا۔ "مسٹر سالومن! ان لوگوں کے پاسپورٹ کہیں مس پلیس ہو گئے ہیں۔ آپ انہیں آسان **پروسیجر** بتا دیں تاکہ یہ جلد از جلد اس پریشانی سے نجات پا سکیں۔" پھر وہ ہم سے مخاطب ہوا۔ "سوری' میں اس سلسلے میں مزید آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"آپ لوگ میرے ساتھ آئیں۔" سالومن نے ہمیں مخاطب کیا۔

ہم وہاں سے اٹھ کر سالومن کے آفس میں جا پہنچے۔ اس نے بہت احترام سے ہمیں کرسیاں پیش کیں' پھر انٹر کام پر کافی کا آرڈر دینے کے بعد بولا۔ "آپ لوگوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ طویل عرصے بعد اپنے ہم وطنوں سے ملنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ میں اگر غلطی نہیں کر رہا تو آپ کا تعلق اسٹیٹس سے ہے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے مسٹر سائن!" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہم واقعی اسٹیٹس سے آئے ہیں۔ یہ جان کر ہمیں بھی خوشی ہوئی کہ آپ ہمارے ہم وطن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ضرور ہماری مدد کریں گے۔"

"میں آوٹ آف دا وے جا کر آپ کی مدد کروں گا۔ آپ بتائیں تو کہ پرابلم کیا ہے؟"

"پرابلم صرف یہ ہے کہ ہمارے پاسپورٹ گم ہو گئے ہیں اور ہمیں فوری طور پر ایران چھوڑنا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ لوگ کسی وجہ سے سفارت خانے سے

رابطہ نہیں کرنا چاہتے' اور اب غیر قانونی طور پر ایران کا بارڈر کراس کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بات ہے نا؟"

"یہی سمجھ لو۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "وہ کم بخت خطرناک حد تک ذہین تھا اور مجھے اس کی ذہانت سے خوف آ رہا تھا۔"

"کام تو آپ کا ہو جائے گا' مگر اس میں کافی خرچہ ہو جائے گا۔ دیکھئے میں خود تو یہ کام کروں گا نہیں۔ کچھ لوگوں سے میرے رابطے ہیں۔ میں انہی سے آپ کو ملوا دوں گا۔ میں عموماً ایسے غیر قانونی کاموں میں دونوں طرف سے بھاری کمیشن وصول کرتا ہوں مگر آپ لوگ چونکہ میرے ہم وطن ہیں اس لئے میں اپنا کمیشن چھوڑ دوں گا۔"

"اندازاً کتنا خرچ ہو جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک لاکھ تومان!" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"ایک لاکھ تومان!" میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "یہ زیادہ نہیں ہے۔"

"نو سر!" سالومن نے جواب دیا۔ "میں نے اس میں اپنا کمیشن شامل نہیں کیا ہے ورنہ ایک کی جگہ آپ کو ڈیڑھ لاکھ دینا پڑتے جو شخص یہ کام کرتا ہے' وہ ایک لاکھ سے کم نہیں لیتا۔"

"اور وہ کب تک ہمیں بارڈر کراس کرا دے گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کہاں جانا چاہیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"ہمیں فوری طور پر ایران چھوڑنا ہے اور بس! وہ ہمیں کہیں سے بھی بارڈر کراس کرا دے۔"

"ٹھیک ہے میں اس سے بات کر کے آپ کو جواب دوں گا۔ آپ لوگ اپنا ایڈریس یہاں چھوڑ دیں' میں خود ہی آپ سے رابطہ کر لوں گا۔" ہم جانے کے لئے اٹھے تو وہ بولا۔ "آپ لوگ ایسا کریں کہ آدھی رقم بھی ڈپازٹ کر دیں۔"

"پوری رقم کام ہونے کے بعد ملے گی۔ فوری طور پر تو میں ایک تومان بھی دینے کو تیار نہیں ہوں۔" مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔

"سوری سر!" سالومن نے سرد لہجے میں کہا۔ "بغیر ایڈوانس کے وہ شخص کوئی کام نہیں کرتا۔"

"نہیں کرتا ہے تو رہنے دو۔ ہم کسی اور سے بات کر لیں گے۔" میں کلارا سے مخاطب ہوا۔ "چلو کلارا۔"

کلارا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالومن جلدی سے بولا۔ "سر یہ تو بتا دیں کہ آپ ٹھہرے ہوئے کہاں ہیں۔ ممکن ہے وہ شخص بغیر ایڈوانس کے کام کرنے پر رضا مند ہو جائے؟"

"تم اس شخص سے معلوم کر لو۔ میں بعد میں خود ہی تم سے رابطہ کر لوں گا۔"
سالومن ہمارے ساتھ باہر تک آیا اور بولا۔ "ویسے اس آفر پر آپ غور ضرور کیجئے گا۔ پورے ملک میں اتنا فیئر کام کرنے والا کوئی اور نہیں ہے۔"
"مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگا۔" باہر نکلنے کے بعد کلارا نے مجھ سے کہا۔
"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ یہ شخص مجھے انتہائی مکار اور چالباز لگ رہا تھا۔ اسی لئے میں نے اسے ایڈوانس رقم دینے سے گریز کیا۔ اگر وہ رقم ہضم کر جاتا تو ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ البتہ میں اس کا حلیہ ضرور بگاڑ دیتا۔"
"پھر اب کیا سوچا ہے؟" کلارا نے مجھ سے پوچھا۔
"کسی اور ایجنسی میں چلتے ہیں۔"
"خرم! میرا ایک مشورہ ہے۔ اس قسم کے رابطے زیر زمین دنیا میں ہوتے ہیں۔ ہمیں کسی طرح وہاں تک رسائی حاصل کرنا چاہئے۔"
"ان معاملات میں برڈ ماہر تھا۔" مجھے اچانک برڈ کا خیال آگیا۔ وہ نہ جانے کہاں تھا زندہ بھی تھا یا ....." میں اس سے آگے نہیں سوچ سکا۔
اس دن ہم بے نیل و مراد ہوٹل لوٹ آئے۔ وہاں جتنی دیر لگ رہی تھی، مجھے اتنی ہی گھٹن ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی پرندہ ہوں، جسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ ایران میرے لئے پنجرہ ہی تو ہو کر رہ گیا تھا۔
ہوٹل پہنچ کر ہم نے لنچ کیا، اور کلارا آرام کرنے کے لئے لیٹ گئی۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ رات کے بعد اس نے میتھوڈین کا انجکشن نہیں لیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے ہی اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔
میں تھوڑی دیر بیٹھا ایک رسالے کی ورق گردانی کرتا رہا، پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں یونہی ٹہلتا ہوا ہوٹل کے ریکریشن ہال میں جا نکلا۔ وہاں مختلف انڈور گیمز ہو رہے تھے۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید وہاں جوا ہو رہا ہے مگر وہاں جوا نہیں ہو رہا تھا کیوں کہ وہاں کسی بھی ٹیبل پر مجھے رقم یا چپس دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں ایک گوشے میں خالی میز دیکھ کر اس پر جا بیٹھا۔ فوراً ہی ہوٹل کا ایک ویٹر وہاں نمودار ہوا اور فارسی آلود انگلش میں بولا۔ "یس سر، کیا خدمت کروں آپ کی؟"
میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور اس سے پوچھا۔ "میں یہاں اجنبی ہوں۔ کوئی ایسا گائیڈ مل سکتا ہے جو انگلش روانی سے بول سکتا ہو اور اس شہر کے ہر علاقے سے واقف ہو؟"
"وائی ناٹ سر!" بیرے نے مستعدی سے جواب دیا۔ "کیا وہ آدمی آپ کو ابھی چاہئے؟"

"ہاں' ابھی فوراً مل جائے تو اچھا ہے۔" وہ سر جھکا کر جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔ "دو کپ گرما گرم کافی بھی لے آنا۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک لمبے تڑنگے شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ میں نے بیرے کے ساتھ آنے والے آدمی کا جائزہ لیا۔ وہ مضبوط ہاتھ پیروں کا مالک تھا۔ اس نے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے تھے اور جینز اور جیکٹ میں ملبوس تھا' چہرے پر معصومیت تھی' مگر آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ اس کی گھنی مونچھیں اس کے سرخ و سفید چہرے پر خوب چمک رہی تھی' عمر میرے اندازے کے مطابق چوبیں' پچیس برس رہی ہو گی۔

بیرے نے کافی کی ٹرے ٹیبل پر رکھی اور مجھ سے بولا۔ "سر' یہ شہریار ہے' اس شہر بلکہ اس ملک کے چپے چپے سے واقف ہے۔ یہ آپ کو پورے ایران کی سیر کرا دے گا۔ بقیہ معاملات آپ خود طے کر لیں۔"

شہریار نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑا دیا۔ میں نے اس سے مصافحہ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ غیر معمولی طور پر طاقتور ہے۔

"مجھے خ ...... ایڈون کہتے ہیں۔" میں اپنا اصلی نام بتاتے رہ گیا۔ "بیٹھ جاؤ مسٹر شہریار!"

"تھینک یو سر!" اس نے گھمبیر لہجے میں کہا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں یہاں کی قابل ذکر جگہیں دیکھنا چاہتا ہوں' خاص طور پر یہاں کے نائٹ کلب اور کیسینو۔"

"یہاں صرف دو اچھے نائٹ کلب ہیں۔" شہریار نے جواب دیا۔ "کیسینو البتہ کئی ہیں کیونکہ اس شہر میں غیر ملکی سیاح کثرت سے آتے ہیں۔ وہ کیسینو ان کی جیبیں خالی کرانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔" پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "سر! کیا آپ بھی کیسینو میں قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہیں؟"

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ میں تم پر کتنا اعتبار کر سکتا ہوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی اور پر اعتماد لہجے میں بولا۔ "جتنا اعتبار آپ اپنی ذات پر کرتے ہیں سر' اتنا ہی اعتبار مجھ پر کر سکتے ہیں۔ میں اپنا سر کٹوا دوں گا مگر آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔"

"اور تمہارا معاوضہ کیا ہو گا۔" میں نے پوچھا۔ "دراصل میں ہر بات پہلے سے کلیئر کرنے کا عادی ہوں۔"

"میں روزانہ کے حساب سے معاوضہ لیتا ہوں اور وہ اتنا زیادہ نہیں ہے کہ آپ کو ادائیگی میں کسی قسم کی دشواری ہو۔ بعض اوقات لوگ رات کو بھی میری ضرورت محسوس

کرتے ہیں۔ اس صورت میں میرا معاوضہ ڈبل ہوتا ہے اور کھانا بھی میرے کلائنٹ کے ذمے ہوتا ہے۔"

"کیا تم رات کو بھی لوگوں کو گھماتے پھراتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔ "یس سر!" اس نے جواب دیا۔ "میں گائیڈ کے ساتھ ساتھ بہت اچھا باڈی گارڈ بھی ہوں۔ غیر ملکی اکثر ان علاقوں میں لٹ جاتے ہیں اسی لئے لوگ ایسے گائیڈز کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کی حفاظت بھی کر سکیں۔"

"مجھے اگرچہ اپنی حفاظت کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں، مگر اس کے باوجود میں تمہیں چوبیس گھنٹے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں اسی ہوٹل کے کمرا نمبر دو سو سولہ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔" پھر میں نے اس سے کہا۔ "اب میری بات غور سے سنو مسٹر شہریار! اگر میرا کام کر سکو تو ٹھیک ہے ورنہ اس بات کو بھول جانا۔"

"آپ حکم تو کریں سر!" شہریار نے مودب لہجے میں کہا۔

"تم کسی ایسے آدمی کو جانتے ہو جو مجھے بارڈر کراس کرا دے۔"

میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "میں ایسے ایک آدمی کو جانتا تو ہوں مگر وہ معاوضہ بہت طلب کرتا ہے۔"

"کتنا زیادہ؟" میں نے پوچھا۔

"بیس ہزار تومان۔" اس نے جواب دیا۔

"بیس ہزار تومان پر ہیڈ!" میں نے تصدیق چاہی۔ "ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔"

"آپ کب جانا پسند کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

"آج ہی۔" میں نے جواب دیا۔ "ہاں، میری بیوی بھی میرے ساتھ ہے۔"

"نو پرابلم!" شہریار نے جواب دیا۔ "وہ شخص خالص کاروباری ہے۔ بیس ہزار تومان کے حساب سے وہ دو کیا بیس افراد کو بھی بارڈر کراس کرا سکتا ہے مگر رقم وہ ایڈوانس لیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم ابھی اس سے ملاقات کرا دو میری۔"

"ابھی تو نہیں۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "میں رات کو نو بجے کے بعد اسے یہیں لے آؤں گا۔"

"او کے مسٹر شہریار۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اگر میں کمرے میں نہ ملوں تو اسی جگہ میرا انتظار کرنا۔" یہ کہہ کر میں جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو سو تومان کے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

اس نے وہ نوٹ شکریے کے ساتھ لے لئے اور مجھ سے بولا۔ "ابھی آپ کہیں گھومنا پسند کریں گے؟"

"نہیں، فی الحال میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ تم بھی رات نو بجے کے بعد آ جانا۔"

اسے رخصت کرنے کے بعد میں کمرے میں پہنچا تو کلارا بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خفگی سے بولی۔ "کہاں چلے گئے تھے خرم! میں گزشتہ آدھے گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"کام بن گیا کلارا!" میں پرجوش لہجے میں بولا۔ "ہم آج کسی وقت ایران سے نکل جائیں گے۔"

کلارا بھی جوش میں کھڑی ہوئی تو کپ کی کافی چھلک کر اس کے کپڑوں پر گر گئی۔ اس کی پروا کیے بغیر وہ بھی پرجوش لہجے میں بولی۔ "گڈ نیوز خرم! کوئی ایجنٹ مل گیا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا، پھر اس سے بولا۔ "تم ایسا کرنا کلارا کہ تم دو چار دن بعد وہیں پہنچ جانا، جہاں وہ ایجنٹ مجھے پہنچائے گا۔"

"نیور!" کلارا پیر پٹخ کر بولی۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"مجھے نہ جانے کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ تم یہ رسک کیوں مول لیتی ہو۔ میں جہاں بھی جاؤں گا، وہاں پہنچتے ہی تمہیں انفارم کر دوں گا۔ تم پہلی فلائٹ سے وہیں چلی آنا۔"

"نہیں خرم نہیں۔" کلارا جذباتی ہو گئی۔ "میں نے کہا نا کہ میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔"

"کلارا کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تم سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ بری طرح مچل کر بولی۔ "اگر تم مجھے ساتھ نہ لے گئے تو میں اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گی۔" اس نے کسی جلے تن بیوی کی طرح کہا۔

"او کے، او کے۔" میں مسکرا کر بولا۔ "اگر تم مصیبتیں برداشت کر کے خوش ہوتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ تو میں تمہاری ہی وجہ سے کہہ رہا تھا۔ نہ جانے اس غیر قانونی سفر میں کتنی مشکلات پیش آئیں گی، ممکن ہے ہمیں پیدل بھی سفر کرنا پڑے، ممکن ہے ہمیں کئی روز بھوکا بھی رہنا پڑے۔ اگر تم یہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہو تو ضرور چلو۔"

اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ دستک جس جارحانہ انداز میں دی گئی تھی اس سے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ میں نے محتاط انداز میں کہا۔ "یس کم ان۔"

"دوسرے ہی لمحے دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے لمبی نال والے خوفناک ریوالور تھے۔ ان میں سے ایک کا سر گنجا تھا، دوسرے کے

سر پر ملاحوں کی طرح چھوٹے چھوٹے بال تھے اور ان کے تیور خطرناک تھے۔"
گنجے سر والا کرخت لہجے میں بولا۔ "حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ....
اس نے اچانک بے آواز فائر کر دیا۔ کلارا کی چیخ نے مجھے پاگل کر دیا۔"
میں نے وحشت زدہ انداز میں کلارا کی طرف دیکھا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہ زخمی نہیں ہوئی تھی' خوف کی وجہ سے چیخی تھی۔ میں کرخت لہجے میں بولا۔ "کون ہو تم لوگ؟" میں نے یہ جملہ خالص امریکن اسٹائل میں ادا کیا تھا۔
"تمہیں کوئی سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔" گنجے نے اسی لہجے میں جواب دیا۔
"آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" میں جھنجلا کر بولا۔ "میں نے اس سے پہلے تم لوگوں کو دیکھا بھی نہیں ہے۔"
"زیادہ باتیں مت بناؤ۔" گنجا سرد لہجے میں بولا۔ "خاموشی سے دیوار کی طرف گھوم جاؤ اور کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ اس دفعہ واقعی تمہاری بیوی ماری جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ بے ڈھنگے پن' سے ہنسا "ہم صرف تمہاری تلاشی لینا چاہتے ہیں' ہری اپ۔" اس نے ریوالور لہرا کر دیوار کی طرف اشارہ کیا۔
"جو کچھ یہ مانگ رہے ہیں' انہیں دے دو۔" کلارا لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔
"گڈ!" گنجا ہنس کر بولا۔ "تمہاری بیوی زیادہ عقلمند ہے۔"
میں خاموشی سے دیوار کی طرف گھوم گیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ لوگ مجھے ذرا سا موقع دے دیں' پھر میں ان کے سارے کس بل نکال دوں گا۔
"کمرے کی تلاشی لینے سے پہلے ان دونوں کی تلاشی لو۔" گنجے نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔
گویا وہ خود ہی موت کے منہ میں جانا چاہ رہا تھا۔ اس کو اندازہ بھی نہیں ہو گا کہ میری تلاشی لینے کا مطلب ہے موت کو گلے لگانا۔ میں اپنی جگہ پر ساکت کھڑا ہو گیا' اور قدموں کی خفیف سی آہٹ پر کان لگا دیئے۔ کمرے میں اگر قالین نہ ہوتا تو شاید آہٹ خاصی واضح ہوتی۔ میں آنے والے کا ایک ایک قدم گن رہا تھا۔ وہ میری طرف آنے کی بجائے کلارا کی طرف بڑھ گیا۔ کلارا کی تلاشی لینے کے بعد اس شخص نے اسے باتھ روم میں دھکیل دیا۔ میں خود بھی یہی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح کلارا کمرے سے چلی جائے ورنہ اب جو اچھل کود شروع ہونے والی تھی' اس میں کلارا کو نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔
تلاشی لینے والا جونہی میرے نزدیک آیا' میں نے بجلی کی طرح تڑپ کے اس کی گردن دبوچی اور اسی برق رفتاری سے اسے لے کر فرش پر گر گیا۔ اگر مجھے ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو گنجے کی چلائی ہوئی گولی میری کھوپڑی توڑ دیتی۔ میں نے جھٹکے سے تلاشی لینے والے کا ریوالور چھینا' اور اس کی کن پٹی پر دے مارا۔ وہ میرے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ گنجا

فائر کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ اس کی چلائی ہوئی گولی اس کے ساتھی کے بھی لگ سکتی تھی۔ حملہ آور کو بے ہوش کرنے کے بعد میں فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا گنجے کی طرف بڑھا۔

وہ چیخ کر بولا۔ "رک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔"

پھر میں لیٹے ہی لیٹے اچھلا اور گنجے کے منہ پر لات رسید کر دی۔ میری دوسری لات اس کے ریوالور پر پڑی اور ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکا' مگر اب میں اسے کوئی رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے اس کی پشت پر پوری طاقت سے لات ماری۔ وہ گویا اڑتا ہوا دروازے کی طرف چلا۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا اور شہریار اندر داخل ہوا۔ گنجا اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا' مگر کم بخت بلا کا سخت جان تھا۔ گرتے ہی وہ اٹھا اور اتنی پھرتی سے چاقو نکالا کہ میں دل ہی دل میں اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے چاہا کہ بڑھ کے اسے پھر دبوچ لوں' مگر شہریار نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کے کلائی کو زور دار جھٹکا دیا۔ چٹاخ کی آواز گونجی' چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا' اور اس کا ہاتھ بے جان سا ہو کر پہلو میں لٹک گیا۔ مجھے گنجے کی قوت برداشت پر رشک آیا۔ شہریار نے اس کی کلائی کا جوڑ ہلا دیا تھا' مگر اس کے حلق سے ہلکی سی سسکی بھی برآمد نہ ہوئی تھی۔

شہریار نے اچانک ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ گنجے کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ "ختم کرو یہ تماشا' اور اپنے اس مردے کو اٹھا کر لے جاؤ ورنہ میں تم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

گنجے نے اپنے ساتھی کو اٹھانے کی کوشش کی' مگر کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ اس کا ایک ہاتھ تو بالکل ناکارہ ہو گیا تھا۔

شہریار نے آگے بڑھ کے اسے اٹھانا چاہا' اور پھر کچھ سوچ کر رک گیا اور بولا۔ "اسے ہوش میں لاؤ' یہ اپنے قدموں سے چل کر جائے تو بہتر ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سر آپ ذرا اس کا خیال رکھیں' میں اسے ہوش میں لاتا ہوں۔"

وہ ریوالور جیب میں رکھ کر بے ہوش آدمی پر جھک گیا' اسے ہلا جلا کر دیکھا' پھر جگ سے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹا مارا۔ ذرا سی کوشش کے بعد وہ جھرجھری لے کر بیدار ہو گیا۔

"اب تم دونوں یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور اپنے باس سے کہہ دینا کہ ان لوگوں کے ساتھ شہریار بھی ہے۔ اس سے یہ بھی کہنا کہ آئندہ اگر اس نے میرے کسی کلائنٹ پر ہاتھ ڈالا تو میں بالکل رعایت نہیں کروں گا۔"

"ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم بھی ان کے ساتھ ہو۔" گنجے نے کہا' پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ویسے انہیں کسی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" وہ دونوں باہر نکل گئے۔

کلارا اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

"میں نے ان دونوں کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔" شہریار نے کہا۔ "ان لوگوں کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ صرف غیر ملکیوں کو ڈبل کراس کرتے ہیں بلکہ انہیں لوٹ بھی لیتے ہیں۔"

"یہ لوگ ہیں کون؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نہیں جانتے کہ یہ لوگ کون ہیں؟" شہریار نے حیرت سے پوچھا۔ "میرا خیال تھا کہ آپ انہیں پہچانتے ہوں گے۔ آپ نے مجھ سے پہلے کسی اور سے بارڈر کراس کرانے کی بات کی تھی؟"

"ہاں ایک آدمی سے کی تو تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ اسی کے آدمی ہیں۔" شہریار نے جواب دیا۔ "اس کے کسی آدمی نے یہاں تک پیچھا کر کے آپ کا ٹھکانہ دیکھ لیا ہو گا' پھر اس نے ان دونوں کو بھیج دیا کہ آپ لوگوں کو لوٹ لیں۔"

"مجھے لوٹنا اتنا آسان نہیں ہے شہریار!" میں نے کہا۔ "اگر تم نہ بھی آتے تو میں ان سے نمٹ لیتا۔"

"وہ تو خیر آپ نمٹ ہی چکے تھے۔ شہریار مسکرا کر بولا۔ "لگتا ہے فائٹنگ کا خاصا تجربہ ہے آپ کو! جس انداز میں آپ لڑ رہے تھے' اسے دیکھ کر تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ میں نے صرف ایک ہی جھلک دیکھی تھی اسی سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کو کسی باڈی گارڈ کی ضرورت نہیں۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب میں چلتا ہوں نو بجے پھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

"یہ وہی ایجنٹ تھا جو ہمیں بارڈر کراس کرائے گا؟" کلارا نے باتھ روم سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

"یہ پروفیشنل گائیڈ اور باڈی گارڈ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ایجنٹ سے تو نو بجے ملاقات ہو گی۔ ملاقات اسی کے توسط سے ہو گی۔ ویسے یہ آدمی بہت کام کا ہے۔"

"محتاط رہنے کی ضرورت ہے خرم!" کلارا نے کہا۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ بھی ہمیں لوٹنے کی کوشش نہیں کرے گا۔" پھر وہ چونک کر بولی۔ "خرم! ہمیں ایک بات کا تو دھیان ہی نہیں رہا۔ ابھی تم نے جن لوگوں کی

پٹائی کی ہے، ان کا باس اگر پولیس کے پاس چلا گیا تو ہم بہت آسانی سے پھنس جائیں گے۔"

"ہم نہیں صرف میں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"مذاق مت کرو خرم!" کلارا جھنجلا گئی۔ "میری بات پر سنجیدگی سے غور کرو۔"

"مجھے ان لوگوں کا بہت زیادہ تجربہ ہے۔" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ اگر شہریار درمیان میں نہ ہوتا تو ممکن تھا وہ لوگ پولیس کو ملوث کرتے۔"

"پھر بھی ہمیں اپنے طور پر احتیاط کرنا چاہئے۔" کلارا نے کہا۔

"او کے۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "اگر تم کہتی ہو تو کمرا بدل لیتے ہیں۔"

"میرے خیال میں یہ ہوٹل ہی چھوڑ دو۔" کلارا نے کہا۔ "وہ ایجنٹ تو رات کو نو بجے آئے گا۔ اس سے یہیں آکر ملاقات کی جا سکتی ہے۔"

"تم نے مجھے بھی وہم میں مبتلا کر دیا۔" میں نے کہا۔

"چلو پھر یہ ہوٹل ہی چھوڑ دیتے ہیں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا "تم سامان باندھو، میں کمرے کا بل دے کر آتا ہوں۔"

دوسرا ہوٹل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم وہاں منتقل ہو گئے۔ ہوٹل چھوڑتے وقت میں بہت محتاط تھا کہ کہیں کوئی ہمارا پیچھا نہ کرے، پھر میں اور کلارا باتوں میں ایسے مصروف ہوئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ پھر کلارا ہی کو خیال آیا۔ وہ چونک کر بولی۔ "ٹائم کیا ہوا ہے خرم؟ اس ایجنٹ سے بھی ملنا تھا تمہیں!"

میں نے جلدی سے رسٹ واچ پر نظر ڈالی، ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ میں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

"زیادہ دیر نہ لگا دینا۔" کلارا نے کہا۔ "یا پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

"تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکوں گا، ممکن ہے وہ ایجنٹ میرے ساتھ یہیں آ جائے۔" میں جیکٹ پہن کر باہر نکل گیا۔

اس ہوٹل کا فاصلہ وہاں سے زیادہ نہیں تھا۔ میں پیدل ہی اس طرف روانہ ہو گیا اور اس وقت نو بجنے میں تین منٹ تھے جب میں وہاں پہنچا۔ شہریار وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور سیدھا میری طرف بڑھتا آیا۔ اس کے ساتھ کرخت چہرے والا ایک ایرانی بھی موجود تھا۔ رسمی باتوں کے بعد وہ مجھ سے بولا۔ "مسٹر خرم! شہریار نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بارڈر کراس کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کہاں جانا پسند کریں گے؟"

"جہاں بھی آسانی سے پہنچ سکوں۔"

"آپ اس وقت آغا مبارک کے سامنے بیٹھے ہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "اور آغا

مبارک کے لئے آپ کو کہیں بھی پہنچانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں پاکستان جانا چاہوں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"نو پرابلم۔" اس نے فارسی زدہ انگلش میں کہا۔ "میں آپ کو پاکستان پہنچا دوں گا مگر اس کے لئے تیس ہزار تومان ہوں گے' رقم میں ایڈوانس لیتا ہوں۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا تو شہریار نے کہا۔ "مگر آغا میں نے تو بیس ہزار تومان کی بات کی تھی۔"

"تم نے غلط نہیں کہا تھا' مگر اس وقت سرحدیں سیل ہیں' بارڈر کراس کرنا خاصا مشکل ہے۔ خاص طور پر غیر ملکیوں کے لئے تو بہت مسئلہ ہے۔ اگر کوئی ایرانی ہوتا تو شاید اتنی پریشانی نہ ہوتی۔"

"ٹھیک ہے' میں تمہیں تیس ہزار تومان دوں گا مگر آج ہی بارڈر کراس کرنا چاہوں گا۔"

"میں خود بھی یہی کہنے والا تھا۔" آغا مبارک نے کہا۔

"اگر آپ نے آج بارڈر کراس نہیں کیا تو پھر آئندہ بہتر گھنٹے تک موقع نہیں ملے گا۔ بارڈر پر میرے کچھ دوست ہیں۔ ان کی ڈیوٹی کل صبح سات بجے ختم ہو جائے گی' پھر کم از کم بہتر گھنٹے بعد وہ دوبارہ ڈیوٹی پر آئیں گے۔" پھر وہ ذرا دیر رک کر بولا۔ "مسٹر خرم' آپ رقم لائے ہیں۔"

"اس کے لئے آپ کو میرے ہوٹل تک چلنا ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔

○

رات تاریک اور سرد تھی۔ چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ اس لئے چاندنی بھی نہیں تھی۔ ایک طرح سے یہ میرے حق میں سود مند تھا۔ میں اور کلارا' آغا مبارک کے ساتھ ایک شیورلیٹ میں سوار تھے اور گاڑی طوفانی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ شہریار ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ کلارا کو آغا مبارک پر بھروسا نہیں تھا' مگر اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ وہ نہ جانے ہمیں کہاں سے بارڈر کراس کرانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی اسے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا کہ جو بھی ہو گا سامنے آ جائے گا۔ اس لئے پہلے سے فکر کیا کرنا۔ آغا مبارک بہت ماہر ڈرائیور تھا۔ گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی' مگر وہ بہت اطمینان سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کا اسٹائل دیکھ کر مجھے برڈ یاد آ گیا وہ بھی بالکل اسی انداز میں ڈرائیونگ کرتا تھا۔ دکھ کی لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نہ جانے برڈ اور رضا کس حال میں ہوں گے؟ رضوانہ کہاں ہو گی؟ وہ لوگ زندہ ہوں گے یا نہیں۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ میں محض اپنی جان بچانے کی خاطر ایسے دوستوں کو چھوڑ آیا تھا۔ جنہوں نے قدم قدم پر

میری خاطر جان کی بازی لگائی تھی۔ مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے یوں نہیں آنا چاہئے تھا' ان لوگوں کو مصیبت میں چھوڑ کر فرار نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں انتہائی خود غرض اور گھٹیا انسان ہوں۔ وہ لوگ کیا سوچتے ہوں گے کہ خرم یوں بزدلوں کی طرح اپنی جان بچا کر بھاگ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو خرم!" کلارا نے مجھے چونکا دیا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کو مشکل میں چھوڑ کر مجھے فرار نہیں ہونا چاہئے تھا۔"

"یہ سوچ سوچ کر اپنی جان ہلکان مت کرو۔" کلارا نے کہا۔ "جو ہونا تھا ہو گیا۔ اگر تم وہاں سے نہ نکلتے تو بری طرح پھنس جاتے۔ ممکن ہے تمہارے ساتھ وہاں سے بہ خیروعافیت نکل گئے ہوں۔"

"خدا کرے تمہارا خیال درست ہو۔" میں نے کہا۔ "مگر وہاں سے نکلنا بہت مشکل تھا۔"

کلارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش باہر اندھیرے میں گھورتی رہی۔

"آئندہ آدھے گھنٹے میں ہم ساحل تک پہنچ جائیں گے۔" آغا مبارک نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "وہاں پہنچتے ہی آپ جنوب کی طرف جایئے گا۔ تقریباً" ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد آپ کو دو مقامی باشندے ملیں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا' اندھیری رات کے مسافر اکثر تاریک راہوں میں بھٹک جاتے ہیں' جواب میں آپ کو کہنا ہو گا۔ حوصلہ بلند ہو تو تاریکی میں بھی منزل کا نشان مل جاتا ہے۔" وہ بولتے بولتے رکا پھر بولا۔ "یہ شناختی جملے ہیں' انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔"

"وہ لوگ یہ جملہ کس زبان میں ادا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"انگلش میں۔" آغا مبارک نے جواب دیا۔ "کیوں کہ پاکستانی عموماً انگلش سمجھتے ہیں۔"

ایک جگہ آغا مبارک نے گاڑی روک دی اور ہمیں اترنے کا اشارہ کیا۔

"بقیہ سفر آپ کو بوٹ کے ذریعے طے کرنا ہو گا۔ وہ بوٹ آپ کو پاکستان کے کسی ساحل تک پہنچا دے گی۔"

"ساحل تک؟" میں نے پوچھا۔

"پسنی یا گوادر تک وہاں سے کراچی پہنچنے میں آپ کو دقت پیش نہیں آئے گی۔" پھر اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

اس سے الوداعی مصافحہ کر کے میں اور کلارا جنوب کی طرف چلنے لگے۔ وہ ساحلی علاقہ تھا' اور سمندر کی مخصوص نم آلود ہوا ہمارے جسموں سے ٹکرا رہی تھی۔

تقریباً ایک میل چلنے کے بعد ایک ٹیلے کی آڑ سے دو آدمی بھوتوں کی طرح برآمد ہوئے اور ان میں سے ایک بولا۔ "اندھیری راتوں کے مسافر اکثر تاریک راہوں میں بھٹک جاتے ہیں۔"

"حوصلہ بلند ہو تو تاریکی میں بھی منزل کا نشان مل جاتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"سیدھے چلے آئیں۔" اس آدمی نے کہا۔

میں نزدیک پہنچا تو اس نے رسمی طور پر مصافحہ کیا' پھر وہ کلارا کی طرف بڑھا' مگر یہ معلوم ہوتے ہی کہ وہ عورت ہے' جھک کر رک گیا۔ پھر وہ دونوں خاموشی سے آگے بڑھنے لگے۔ ہمارا رخ اب سمندر کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے سمندر دکھائی دیا۔ کچھ فاصلے پر درمیانے سائز کی ایک بوٹ بھی لنگر انداز تھی۔ بوٹ کے نزدیک پہنچ کر ان لوگوں نے ہمیں بوٹ پر سوار ہونے کا اشارہ کیا اور ہمارے بعد خود بھی سوار ہو گئے۔

بوٹ کھلے سمندر میں پہنچی تو ان میں سے ایک ہمارے لئے کافی' اور سینڈوچز لے آیا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ ٹرے لے لی۔ ہم نے سینڈوچز کھا کر گرم گرم کافی پی تو مزہ آ گیا۔ پیٹ بھرا تو مجھے نیند آنے لگی۔ کلارا بھی اونگھ رہی تھی۔ پھر نہ جانے کب میں گہری نیند سو گیا۔

○

اس کے بعد

?

جوالا مکھی

کے دوسرے حصے

کا مطالعہ کریں

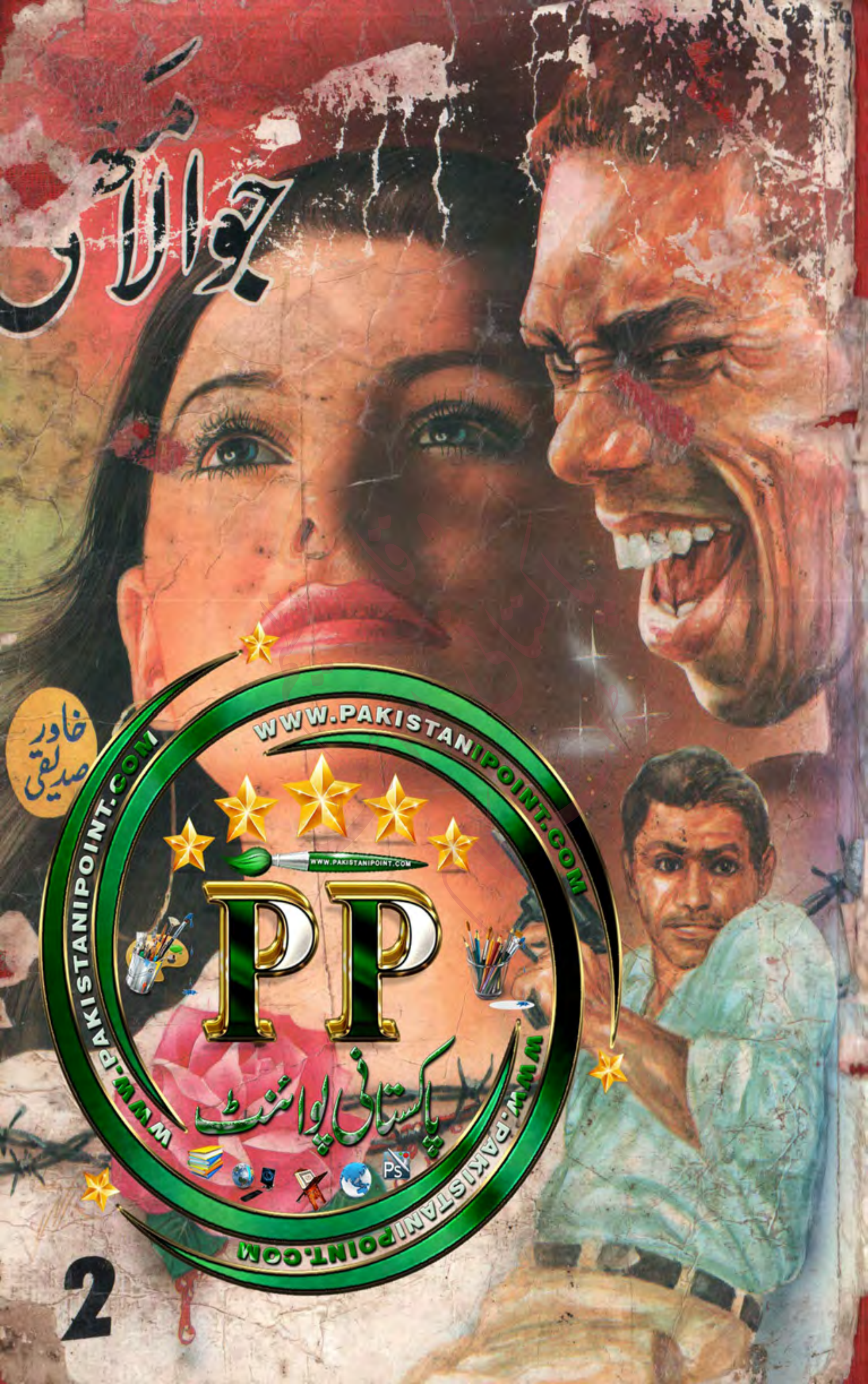

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PP
پاکستانی پوائنٹ

ایک کفن بردوش نوجوان کی داستان لہورنگ، موت
جس کے ہم رکاب تھی۔

جوالا مکھی

2

خاور صدیقی

مکتبہ القریش، سرکلر روڈ، اُردو بازار لاہور ۲، فون ۷۲۲۴۶۶۵

کسی نے زور سے میرا شانہ ہلایا تو میری آنکھ کھل گئی۔ افق پر صبح کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ ہوا بہت ٹھنڈی اور نم آلود تھی۔ سردی کی وجہ سے میرا جسم اکڑ گیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ کلارا ابھی تک سو رہی تھی۔ مجھے انہی میں سے ایک آدمی نے بیدار کیا تھا اس نے مجھے کہا۔ "دس منٹ بعد ہم لنگر ڈال دیں گے۔ آپ لوگ تیار ہو جائیں۔ اور میم صاحب کو بھی جگا لیں۔"

"یہ کون سی جگہ ہے"۔ میں نے پوچھا۔

"یہ گوادر کا علاقہ ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ کافی وغیرہ پی کر تیار ہو جائیں۔ میں آپ کو سمجھا دوں گا کہ کس طرف جانا ہے۔"

میں نے کلارا کو جگایا تو معلوم ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ وہ اٹھ تو گئی مگر اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دو قدم بھی نہ چل سکے گی۔ وہی آدمی کافی اور سینڈوچ لے کر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "تمھارے پاس بخار یا سر درد کی ٹیبلیٹ ہوگی؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد کئی ٹیبلٹس لے آیا۔ اس وقت بوٹ کنارے سے جا لگی۔ میں نے کلارا کو ٹیبلیٹ کھلا کر کافی پلائی خود بھی جلدی جلدی کافی پی اور اپنا سامان سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم لوگ نیچے اترے تو ان دونوں میں سے ایک بولا۔ "آپ لوگ بالکل ناک کی سیدھ میں جائیے۔ تقریباً دس منٹ تک چلنے کے بعد آپ ایک سڑک تک پہنچ جائیں گے۔ وہاں ایک پک اپ ملے گی' وہ آپ کو بس اسٹینڈ تک چھوڑ دے گی۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "بہتر ہے کہ آپ لوگ مقامی لباس میں سفر کریں ورنہ خواہ مخواہ دوسروں کی نظروں میں آئیں گے۔"

"مگر مجھے مقامی لباس کہاں سے ملے گا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا بندوبست پک اپ کا ڈرائیور کر دے گا۔ اپنی مسز کو برقع پہنا دیں تو بہتر ہے۔"

اس سے رخصت ہو کر ہم پختہ سڑک تک پہنچے تو وہاں واقعی ایک پک اپ موجود تھی۔ اب اچھا خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔ پک اپ کا ڈرائیور ہمیں دیکھ کر تیر کی طرح ہماری طرف آیا اور ٹوٹی پھوٹی فارسی میں بولا۔ "آپ کو میری مدد کی ضرورت تو نہیں؟"

میں نے فوراً اس کا جائزہ لیا وہ درمیانی عمر اور اکہرے بدن کا مالک تھا چہرے مہرے

سے بلوچ لگ رہا تھا۔ میں نے اردو میں کہا۔ ”مجھے واقعی مدد کی ضرورت ہے۔“

وہ اچھل پڑا اور ہنس کر بولا ۔ ”ارے صاحب‘ آپ پاکستانی ہے؟“

”ہاں‘ پاکستانی ہوں“۔ میں نے جواب دیا‘ پھر اس سے کہا۔ ”مجھے قمیض شلوار کے دو جوڑے چاہئیں مردانہ اور زنانہ ۔“

”مل جائے گا صاب“ وہ دانت نکال کر بولا۔

ہمیں پک اپ میں بٹھا کر اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ ہمیں لے کر وہ ایک آبادی میں پہنچا اور ایک جگہ رک کر اس نے ہمیں اترنے کا اشارہ کیا۔ ”یہ ہم لوگ کا گھر ہے صاب۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”ہم آپ کو اپنا اور اپنا بیوی کا کپڑا دے گا ---- آؤ اندر آ جاؤ۔“

وہ کپڑے خاصے پرانے تھے مگر صاف ستھرے تھے۔ میں نے کلارا کو کپڑے بدلنے کو کہا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کا بخار ابھی تک نہیں اترا تھا‘ ٹیبلٹ کھانے سے اس کی حالت وقتی طور پر سدھر گئی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ لباس بدلنا بہت ضروری ہے ورنہ ہم لوگوں کی نظروں میں آ جائیں گے۔

ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے تو ہمارے حلیے یکسر بدل چکے تھے۔ میں شلوار قمیض میں ملبوس تھا ۔ ڈرائیور نے مجھے اپنی چپل بھی دے دی تھی۔ وہ میرے پیروں میں خاصی تنگ تھی مگر کام بن گیا تھا۔ کلارا بھی بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس نے گول ٹوپی والا برقع بھی اوڑھ رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب وہ پیدل چلے گی تو بری طرح ٹھوکریں کھائے گی اور مجھے گالیاں دے گی۔ ڈرائیور کی بیوی نے اسے کوئی دوائی پلا دی تھی اور اب حیرت انگیز طور پر اس کا بخار اتر گیا تھا۔

ہم بس اسٹینڈ پر پہنچے تو خاصا دن چڑھ چکا تھا۔ وہاں پرانے ماڈل کی تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک میر پور خاص جا رہی تھی ہمیں اس میں سوار ہونا تھا۔ میرے پاس پاکستانی کرنسی نہیں تھی البتہ کچھ ڈالرز موجود تھے۔ میں نے پک اپ ڈرائیور کو سو ڈالر کا نوٹ دیا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہر چند کہ اس زمانے میں ڈالر اتنا مہنگا نہیں تھا مگر پھر بھی سو ڈالر اس کی توقع سے بہت زیادہ تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے کراچی یا حیدر آباد پہنچنے کے لئے مزید پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”مجھے پاکستانی کرنسی کی ضرورت ہے کیا اس کا بندوبست ہو سکتا ہے؟“

”بالکل ہو سکتا ہے صاب۔“ وہ دانت نکال کر بولا۔ ”تھوڑا پیسہ چاہئے تو ہم لوگ بھی دے سکتا ہے‘ زیادہ چاہئے تو اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا‘ آپ حکم کرو۔“

میں نے جیب میں سے ایک ہزار تومان نکالے اور ڈرائیور کی طرف بڑھا دیے۔

”آپ لوگ ادھر ہی انتظار کرو‘ ہم ابھی آتا ہے۔“ اس نے کہا اور پک اپ سے اتر کر

ایک طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نمودار ہوا تو اس کے ہاتھ میں پاکستانی کرنسی تھی۔ میں نے رقم گنے بغیر جیب میں رکھ لی۔

"اب جلدی کرو صاب۔ لاری جانے والا ہے۔" اس نے کہا۔

میں اور کلارا نیچے اترے تو میں نے کلارا سے کہا۔ "میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ' ذرا سنبھل کر چلنا"۔

"میرا ہاتھ پکڑ لو ورنہ میں یہ ٹینٹ اتار کر پھینک دوں گی۔" کلارا جلے بھنے لہجے میں بولی۔

"یہاں عورت کا ہاتھ پکڑ کر چلنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "اب تم میرے پیچھے چلی آؤ ذرا سا فاصلہ ہے بس تک۔"

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی بس تک پہنچ گئی۔ بس تھوڑی دیر بعد وہاں سے راونہ ہو گئی۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر بوڑھا سا ایک بلوچ بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر جب میری طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ بھی خاموش ہو گیا۔

بس راستے میں کئی جگہ رکی اور جب ہم میرپور خاص پہنچے تو رات ہو چکی تھی ۔ دن بھر بس میں بیٹھے بیٹھے میں بری طرح تھک گیا تھا مگر اب حیدر آباد پہنچ کر ہی آرام کرانا چاہتا تھا۔ ہم میرپور خاص کے بس اسٹینڈ پر اترے تو کئی تانگے والے ہماری طرف لپکے۔ کلارا کا بخار دوبارہ تیز ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ حیدر آباد روانگی سے پہلے کسی ڈاکٹر سے کلارا کے لیے دوا لے لوں۔ یوں بھی وہاں حیدر آباد جانے والی کوئی بس نہیں تھی۔ مجھے ٹرین کے لیے سفر کرنا پڑتا۔ میں نے تانگے سے کہا "پہلے مجھے کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔"

تانگے والے نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا شاید اسے میری اردو پر حیرت ہوئی تھی' پھر بولا۔ "بیٹھو سائیں' ڈاکٹر صاحب اٹھنے ہی والے ہوں گے۔"

"ہم لوگ کراچی جانا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا ہمیں اس وقت کوئی ٹرین مل جائے گی۔؟"

"بالکل ملے گی سائیں۔" تانگے والے نے جواب دیا۔ "مگر ابھی تو اس میں بہت دیر ہے۔"

ڈاکٹر سے دوا لے کر میں نے ایک ہوٹل سے تنوری روٹیاں اور ایک پلیٹ سالن لیا اور تانگے کی سیٹ ہی پر بیٹھ کے کھا لیا۔ کھانا کھاتے ہوئے کلارا کی آنکھوں اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا اور وہ سوں سوں کر کے کھا رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو گئے تو میں نے تانگے والے سے چائے بھی منگوالی' پھر ہم لوگ اسٹیشن روانہ ہو گئے۔

خلاف توقع ٹرین میں سیٹیں بھی مل گئیں۔ میں سیٹ پر آرام سے نیم دراز ہو کے گزشتہ واقعات پر غور کرنے لگا۔ میں ایک مرتبہ پھر اندھیرے میں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شہلا کی تلاش کہاں سے شروع کروں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کراچی میں ہے یا لاہور میں یا پاکستان سے باہر ہے' بس ایک امید کے سہارے کراچی جا رہا تھا کہ ممکن ہے وہاں اس کا کوئی سراغ مل جائے۔ گو کہ اس کا امکان ایک فی صد سے بھی کم تھا مگر میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر سوچا' جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہاں مجھے وانگ یو کے ان دشمنوں سے بھی واسطہ پڑ سکتا تھا جو میرے خون کے پیاسے تھے۔ وہ دشمن بہرحال ایرانی پولیس' فوج اور ساوک کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔ مجھے اطمینان تھا کہ اب میں ان سے باآسانی نمٹ سکوں گا۔ اپنا ملک پھر اپنا ملک ہوتا ہے۔ یہاں نہ مجھے آدمی کا خوف تھا اور نہ حکومت کی کسی اور ایجنسی کا' نہ زبان کا کوئی مسئلہ تھا۔

چلتے چلتے گاڑی کو جھٹکا لگا تو میں چونک اٹھا۔ انجن شاید لائن تبدیل کر رہا تھا۔ کلارا بے خبر سو رہی تھی۔ دو دن کے بخار اور بے آرامی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ گزشتہ تین چار دن سے اس نے پیتھوڈین کا انجکشن بھی نہیں لیا تھا' ممکن ہے اس کا بھی ہینگ اوور ہو۔

گاڑی حیدر آباد پہنچی تو رات کا پچھلا پہر ہونے کے باوجود اسٹیشن پر خوب رونق تھی۔ ہماری بوگی میں ساری سیٹیں ریزرو تھیں اس لیے وہاں کوئی مسافر نہیں آیا۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ اب ہم خطرے کی حدود سے نکل چکے ہیں اس لیے ہمیں لباس تبدیل کر لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے بیگ سے اپنے کپڑے نکالے اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ کلارا گہری نیند میں تھی اس لیے میں نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر میں نے اپنا بیگ سر کے نیچے رکھا اور سونے کے ارادے سے آنکھیں موند لیں۔ اس حالت میں مجھے نہ جانے کب نیند آ گئی۔

میری آنکھیں کھلی تو گاڑی پوری رفتار سے دوڑی جا رہی تھی۔ سامنے والی سیٹ پر کلارا بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اب وہ بوسیدہ سی شلوار قمیض کی بجائے جینز اور جیکٹ میں ملبوس تھی۔ میں انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔

"ہیلو" کلارا نے ہنس کر کہا۔

میں نے مسکرا کر ہیلو کہا' پھر اس سے پوچھا۔ "اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔؟"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں ۔ رات والی دوا کی ایک خوراک باقی تھی۔ میں نے ابھی وہ بھی پی لی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور اس سے کہا۔ "اب رہنے دو ہم کراچی پہنچنے والے ہیں' وہیں پہنچ کر ناشتا کریں گے۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ذرا منہ ہاتھ دھو لوں۔" میں نے

باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

کراچی پہنچ کر مجھے عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا ۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب میں برسوں پہلے اسی اسٹیشن پر اترا تھا۔ پھر مجھے ماما ملے تھے۔ ماما یاد آئے تو بے اختیار ذکیہ باجی بھی یاد آ گئیں، بیچاری نوجوانی ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہو خرم؟" کلارا نے مجھے چونکا دیا۔

"اوں ---- کچھ بھی نہیں۔" میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ہم لوگ اسٹیشن کی عمارت کے باہر کھڑے تھے۔

میں نے ایک ٹیکسی روکی اور اس سے انٹرکان چلنے کو کہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب زیادہ دن ہوٹل میں نہیں رہوں گا بلکہ چھوٹا سا کوئی مکان خرید لوں گا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے کلارا سے مکان خریدنے کا تذکرہ کیا تو وہ بولی۔ "خرم تم میرے ساتھ اسٹیٹس کیوں نہیں چلتے"

"نہیں کلارا۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اپنا وطن نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ تم اپنا وطن چھوڑ دو۔" کلارا نے منہ چلا کر کہا۔" میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم ایک دفعہ میرے ساتھ اسٹیٹس چلو۔ میں تمہیں ڈیڈی سے ملوانا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں۔ کہ ہماری ---- شادی میں وہ بھی شریک ہوں۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تمہاری شادی؟ کب ہو رہی ہے تمھاری شادی اور کس کی شامت آئی ہے کہ وہ تم سے شادی کر رہا ہے؟"

"ہے ایک شخص۔" وہ شوخی سے بولی۔

"شاید اس کا ذہنی توازن درست نہیں ہوگا۔" میں نے اسے چھیڑا۔ "یا پھر اس کی آئی سائٹ بہت ویک ہوگی جو تم جیسی لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔"

"اس کی آئی سائٹ بالکل ٹھیک ہے مگر وہ عقل کا اندھا ہے۔" کلارا نے بھی اس لہجے میں جواب دیا۔

"اللہ اس عقل کے اندھے پر رحم کرے۔" میں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

"میری بات کو ٹالو مت خرم!" کلارا جھنجلا کر بولی۔ بتاؤ میرے ساتھ چلو گے یا نہیں؟"

"نہیں۔" میں بھی سنجیدہ ہوگیا۔" تم خود سوچو، میں ابھی کیسے جا سکتا ہوں۔ جب تک میں شہلا کو تلاش نہ کرلوں گا۔ کہیں نہیں جاؤں گا۔" ارے تو میں نے کب کہا ہے کہ تم ابھی فورا" میرے ساتھ چلو۔" کلارا نے کہا۔ "مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ پہلے ہم شہلا کو تلاش کریں گے پھر کچھ اور سوچیں گے۔"

شام کو میں نے کلارا سے کہا۔ "میں مکان کے سلسلے میں اسٹیٹ ایجنٹ سے ملنے جا رہا

ہوں۔ تم کہیں جانا مت۔"

"میں یہاں کیا کروں گی؟" کلارا نے جواب دیا "میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" اس نے اپنے لباس پر سرسری نظر ڈالی' پھر بولی۔ "چلو' میں تیار ہوں۔"

کمرا لاک کر کے میں اور کلارا لفٹ کی طرف بڑھے۔ اسی وقت لفٹ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے جو لڑکی برآمد ہوئی اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ تہمینہ تھی جو نقلی شہلا بنی تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اس سے کہا۔ "ہیلو تہمینہ!"

"ہیلو۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ "یہاں کب پہنچے؟"

"تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ ہم کبھی ایران سے باہر نہیں نکل سکتے۔" میری آواز خاصی بلند تھی۔

"فار گاڈ سیک خرم!" وہ ارد گرد کا جائزہ لے کر بولی۔

ضروری ہے کہ یہیں تماشا بنا جائے! یہ باتیں ہم کمرے میں بیٹھ کر بھی کر سکتے ہیں۔"

"بالکل کر سکتے ہیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا' پھر مجھے کلارا کا خیال آیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے تہمینہ کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "تہمینہ یہ میری دوست کلارا ہیں' ڈاکٹر کلارا' ان کا تعلق امریکا سے ہے۔" پھر میں تہمینہ کی طرف اشارہ کر کے کلارا سے بولا۔ "یہ مس تہمینہ ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ ہماری دوست ہیں مگر اصل میں یہ ساوک کی ایک بڑی عہدے دار ہیں۔"

"آئیے' میرے کمرے میں چلیں۔" تہمینہ نے ہونٹ کر بھینچ کر کہا۔

اس کا کمرا بھی اس فلور پر تھا۔ میں اور کلارا اس کے کمرے میں چلے گئے۔

"ہاں' اب بتاؤ۔" میں نے صوفہ پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد کہا۔ "تم نے ایسی حرکت کیوں کی! کیوں پولیس کو ہمارے پیچھے لگایا۔"

تہمینہ کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔" خرم صاحب! آپ کی اس بات سے مجھے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ آپ مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں؟"

"میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہارے سوا اور کون ہمارے بارے میں پولیس کو بتا سکتا ہے؟"

"آپ شاید بھول گئے کہ جب پولیس اور ساوک نے اس علاقے پر چھاپہ مارا تھا تو ان کے ساتھ کتے بھی تھے۔"

"تو پھر؟" میں نے پوچھا۔ "کیا کتوں نے بتا دیا؟"

"جی ہاں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ ہوٹل چھوڑ کر علی عباس کے گھر منتقل ہوئے تھے تو اپنے پہنے ہوئے کپڑے وہیں چھوڑ گئے تھے۔ پھر پولس کو

اپنے کسی ذریعے سے معلوم ہوا کہ ساوک کی جو گاڑی تہران میں پائی گئی ہے وہ اس علاقے میں کھڑی کی گئی جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ پولیس نے سراغرساں کتوں کو آپ کے کپڑے سنگھائے' پھر وہ اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں وہ گاڑی دیکھی گئی تھی۔ یہ بات تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ سراغ رساں کتا کسی محدود علاقے میں کوئی مخصوص بو شناخت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

"مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہو رہا ہے کہ واقعی ایسا ہوا بھی ہوگا۔ یہ تو تمہارا بیان ہے اور کہنے کو تم کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔" میرا لہجہ بدستور سرد تھا۔

"چلیے میری باتوں پر اعتبار نہ کریں مگر آپ کے ساتھی تو جھوٹ نہیں بولیں گے۔" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

"ان بیچاروں کو کیسے علم ہو سکتا ہے کہ اصل بات کیا ہے۔ خدا کرے کہ وہ خیریت سے ہوں۔" تہمینہ نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا "وہ سب لوگ خیریت سے ہیں"

میں اضطراب کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ "کہاں ہیں وہ لوگ؟" میں نے تہمینہ کو جھنجوڑ ڈالا۔

"وہ کراچی میں ہیں۔" تہمینہ نے جواب دیا' پھر دکھی لہجے میں بولی۔ خرم صاحب' کسی پر شبہ کرنے سے پہلے اچھی طرح تصدیق کر لینا چاہیے کہ جو کچھ ہم سمجھ رہے ہیں' واقعی ایسا ہے؟" اس کی آواز بھر گئی۔ "میں تو آپ کو بالکل اپنا بھائی سمجھ بیٹھی تھی۔ آپ نے بھی تو کہا تھا کہ آپ مجھے شہلا سمجھ رہے ہیں' پھر۔ پھر آپ نے مجھ پر شبہ کیوں کیا۔ کیوں مجھے اپنی ہی نظروں میں ذلیل کر دیا۔" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"تہمینہ پلیز!" اس کے رونے سے میں بھی گھبرا گیا۔ "آئی ایم سوری۔ مگر میں جس قسم کے حالات کا شکار ہوں' ان میں کوئی بھی آدمی ذہنی طور پر نارمل نہیں رہ سکتا۔"

"تم لوگ انگلش میں بات نہیں کر سکتے۔" کلارا بیزار ہو کر بولی۔ "یہ بات تو اینیکٹس کے بھی خلاف ہے۔" وہ منہ بنا کر کھڑی ہو گئی۔ "میں کمرے میں جا رہی ہو۔"

"پلیز!" تہمینہ روتے روتے مسکرا دی۔ "سوری' ہمیں بالکل خیال نہیں رہا۔" میں بھی کلارا کے منہ پھیلانے پر ہنسنے لگا۔ تہمینہ مجھ سے بولی "خرم بھائی! آپ مت ہنسیں' میں آپ سے ناراض ہوں۔"

"گڈ۔" میں خوش دلی سے مسکرایا۔ "یہ بھی اچھا ہوا کہ تم نے بھائی کہہ کر کلارا کی غلط فہمی دور کر دی ورنہ یہ تو کچھ اور سمجھ رہی ہوگی' کیوں کلارا!" میں نے کلارا کو مخاطب کیا۔

"وڈیو پلیز شٹ اپ؟" کلارا جھینپ کر بولی۔

تم نے بتایا نہیں کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟" میں نے تہمینہ سے پوچھا۔

"وہ لوگ کینٹ اسٹیشن کے نزدیک درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں مقیم ہیں۔"

"چلو مجھے ان کے پاس لے چلو" میں نے جلدی سے کہا۔

"چلئے، ویسے میں ابھی انہیں کی طرف سے آئی ہوں۔" تھوڑی دیر بعد ہم لوگ اس ہوٹل کے سامنے ٹیکسی سے اترے جس میں میرے ساتھی مقیم تھے۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ مجھے شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ میں ساتھیوں کا سامنا کیسے کروں گا۔ میں تو انہیں موت کے منہ میں چھوڑ کر فرار ہوگیا تھا۔ ہم زینے کے ذریعے فرسٹ فلور پر پہنچے، پھر ایک کمرے کے سامنے رک کر تہمینہ نے دستک دی۔

"لیس کم ان۔" اندر سے برڈ کی آواز سنائی دی۔

میں نے دروازہ کھولا اور دیوانہ وار کمرے میں داخل ہوگیا۔

سامنے ہی کرسی پر برڈ بیٹھا تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور خوشی سے لرزتی آواز میں بولا۔ "خرم!"

میں اس سے لپٹ گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم ٹھیک تو ہو میرے دوست؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" برڈ نے جواب دیا اور آہستگی سے علیحدہ ہو گیا۔ "تم یہاں تک کیسے پہنچے؟" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "ارے پاگل آدمی، تم رو رہے ہو؟"

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔" میں نے جواب دیا، پھر اس سے بولا۔ "تم بتاؤ تم یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"سب کچھ بتاؤں گا، ذرا دم تو لو۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "یہ خاتون کون ہے؟" اس کا اشارہ کلارا کی طرف تھا۔

"یہ میری دوست کلارا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسی کی وجہ سے میں یہاں تک پہنچا ہوں۔" پھر میں کلارا سے مخاطب ہوا۔ "کلارا یہ میرا دوست برڈ ہے۔ یہ ----"

"بس کافی ہے۔" کلارا ہنس کر بولی۔ "برڈ کے بارے میں تم نے اتنی دفعہ بتایا ہے کہ میں تو اس سے جلنے لگی تھی۔"

ہم سب ہنسنے لگے۔ برڈ تہمینہ سے بولا۔ "اگر تم مائنڈ نہ کرو تو رضا اور رضوانہ کو بھی بلا لو مگر ان لوگوں کو کچھ بتانا مت۔"

تہمینہ بغیر کچھ کہے خاموشی سے باہر چلی گئی۔

"یار، ہم لوگ خواہ مخواہ اس لڑکی پر شبہہ کر رہے تھے۔" تہمینہ کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

"ہاں مگر اس کے سامنے ایسی کوئی بات کرنا مت۔ اس بیچاری نے جان پر کھیل کے ہمیں وہاں سے نکالا تھا" برڈ نے کہا۔

"تمہارا یہ کہنا فضول ہے۔" کلارا ہنس کر بولی۔ "ہمارے ہیرو صاحب بہت جذباتی ہیں۔ یہ پہلے ہی اس کا پوسٹ مارٹم کر چکے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ برڈ جواب میں کچھ کہتا' دروازے پر دستک ہوئی۔ برڈ نے سرگوشی میں کہا "خرم! تم ذرا باتھ ردم میں چھپ جاؤ۔" میں انہیں سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ میں جھپٹ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ برڈ نے بلند آواز میں کہا۔ "یس"

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی' پھر رضا کی آواز سنائی دی۔ "کوئی خاص بات ہے برڈ! تہمینہ بہت گھبرائی ہوئی آئی تھی۔"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔" برڈ نے جواب دیا۔" یہ مس کلارا ہیں' ایران کے محکمے ساوک کی اعلی عہدیدار۔ انہیں بہ طور خاص امریکا سے بلوایا گیا ہے یہ تم سے اور رضوانہ سے ملنا چاہ رہی تھیں۔" پھر وہ ذرا رک کر بولا۔ "مس کلارا یہ رضا ہے' اور وہ بلیو کپڑوں والی رضوانہ ہے مگر کسی نے آپ کو بہت غلط انفارمیشن دی ہے۔ ہمارا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جنہوں نے شاہ کا خزانہ لوٹا ہے۔"

"مسٹر برڈ' آپ چونکہ میرے ہم وطن ہیں اس لیے میں آپ کے ساتھ تو رعایت کروں گی مگر ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گی۔"

"تھینک یو مس کلارا" برڈ نے ہنس کر کہا اگر آپ مجھے چھوڑنے کا وعدہ کریں تو میں آپ کو ان کا کچھ چٹھا بتا دوں گا۔ یہ سب لوگ پروفیشنل دہشت گرد ہیں۔ میں تو خود ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

"تم لوگ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔" کلارا نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ کم بخت بھی کمال کی اداکاری کر رہی تھی۔ "اس ہوٹل کو چاروں طرف سے پولیس نے گھیر رکھا ہے۔"

"پولیس ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے میڈم!" رضا تلخ لہجے میں بولا۔ "افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ اب تک میں جسے اپنا دوست اپنا بھائی سمجھ رہا تھا وہ غدار ہے۔" پھر وہ سخت لہجے میں بولا۔ "ہمارے یہاں غدار کی سزا موت ہے۔ مجھے مرنا تو یوں بھی ہے پھر میں اسے ٹھکانے لگا کر کیوں نہ مروں۔"

"فائر مت کرنا رضا۔ "برڈ گھبرا کر بولا۔

میں وحشت زدہ انداز میں باہر نکلا آیا وہ ڈراما سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ رضا سے کچھ بعید نہ تھا۔ وہ برڈ کو ہلاک بھی کر سکتا تھا۔ میں نے چیخ کر اسے پکارا۔ "رضا!"

"وہ چونک کر میری طرف مڑا۔ اس کا منہ مارے حیرت کے کھلا رہ گیا تھا۔ رضوانہ بھی حیرت زدہ انداز میں مجھے گھور رہی تھی۔

"خرم صاحب' آپ اور یہاں! "رضا نے کہا اور دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ خیرت سے ہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکتے ہوئے بولا۔" مجھے ہر وقت آپ ہی کا خیال رہتا تھا۔" وہ مجھ سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا آپ کو یہ لے کر

آئی ہیں؟"

"ہاں' یہی مجھے لائی ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے گرفتاری کا کوئی افسوس نہیں ہے۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "مگر یہ برڈ---- یہ ---- ہمارا دشمن ہو گیا ہے' مجھے اس کی بات پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ برڈ کلارا اور تہمینہ بھی زور سے ہنسنے لگے۔

رضا نے پہلے حیرت سے ہمیں دیکھا' پھر شاید وہ سمجھ گیا کہ ان لوگوں کو بے وقوف بنایا گیا ہے۔ وہ برڈ پر پل پڑا اور اس کی پیٹھ پر کئی گھونسے جڑ دیے۔ ساتھ ساتھ وہ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔ "کمینے آدمی' آئندہ میرے ساتھ ایسا بھیانک مذاق مت کرنا۔ میں اگر فائر کر دیتا تو----"

"تو کیا----" رضوانہ تپے ہوئے لہجے میں بولی۔ "خرم اور یہ امریکن حسینہ ان کی کھوپڑی کے ٹکڑے چن رہے ہوتے۔ ویسے برڈ تمہارے ساتھ ہونا تو یہی چاہئے تھا۔" پھر وہ کلارا سے مخاطب ہوئی اور خاتون' معاف کیجئے گا آپ کب سے ہمارے ساتھ اتنی فری ہو گئیں!"

"جب سے خرم مجھے ملا ہے۔" کلارا ہنس کر بولی' پھر رضا سے کہنے لگی۔ "سوری مسٹر رضا' میں آپ کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"اچھا ان باتوں کو چھوڑو" میں نے کہا۔ "تم لوگ یہ بتاؤ کہ ایران سے نکلے کیسے؟"

یار' پہلے کھانا نہ کھا لیا جائے' برڈ نے کہا۔

"ایسا کرو' تم سب لوگ ہمارے ہوٹل چلو۔" میں نے کہا۔ "بلکہ اپنا سامان بھی لے چلو۔ وہیں چل کر اطمینان سے بات کریں گے۔ اس ہوٹل کا دروازہ تو تھوڑی دیر بعد بند ہو جائے گا۔ ہم لوگ جائیں گے تو خواہ مخواہ چوکیدار کی نظروں میں آئیں گے۔"

"چلو پھر وہیں چلتے ہیں۔" برڈ نے کہا۔

• پھر وہ سب ساتھ ہی انٹرکان آگئے۔ تہمینہ تو پہلے ہی وہاں مقیم تھی۔ ایک کمرا برڈ اور رضا نے اور دوسرا کمرا رضوانہ نے لے لیا۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد برڈ نے کہا۔ "جب تم وہاں ایک مکان میں گھس گئے تو میں نے پولیس والوں پر زبردست فارنگ کی تاکہ تم محفوظ رہو۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ گھر گھر تلاشی کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ہم لوگوں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ آخری دم تک ان کا مقابلہ کریں گے اور گرفتار ہونے کی بجائے مر جانا پسند کریں گے۔ اسی وقت نہ جانے کیسے تہمینہ وہاں پہنچ گئی۔"

"میں نے بتایا تو تھا کہ میں ساوک کی اعلیٰ عہدیدار کی حیثیت سے وہاں پہنچی تھی۔ فائرنگ کی آواز سن کر مجھے دور ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے ساتھی خطرے میں ہیں۔

میں نے ان لوگوں کو اپنا کارڈ دکھایا تو وہ مجھے روکنے کی جرات نہ کر سکے ورنہ اس وقت تو وہ پڑیا کے بچے کو بھی اندر نہیں جانے دے رہے تھے۔"

"تو یہ تہمینہ اپنی گاڑی سمیت وہاں پہنچ گئی۔" برڈ نے کہنا شروع کیا۔ "اس نے علی عباس کو سمجھایا کہ میں تمہیں اور تمہارے بیوی بچوں کو باندھ کر ڈال دیتی ہوں تاکہ تم پر کوئی عتاب نہ نازل ہو تم بعد میں کہہ سکتے ہو کہ ان لوگوں نے گن پوائنٹ پر میرے گھر میں پناہ لی تھی۔ ہم لوگ انہیں وہاں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے مگر تہمینہ نے ہمیں مطمئن کر دیا کہ ہم لوگوں کو محفوظ مقام تک پہنچانے کے بعد یہ تمہاری تلاش میں دوبارہ وہاں آئے گی۔ تہمینہ اپنے ساتھ بڑی سی ایک کار بھی لے کر آئی تھی۔ وہ شاید بیوک تھی۔ اس کی ڈکی خاصی کشادہ تھی۔ میں اور رضا دونوں اس کی ڈکی میں چھپ گئے۔ رضوانہ البتہ تہمینہ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر تھی۔ پھر یہ خاصی تیز رفتاری سے باہر نکل گئیں۔ ایک حفاظتی چوکی پر تہمینہ کو روکا گیا مگر اس کا کارڈ دیکھتے ہی اسے جانے کی اجازت مل گئی۔ تہمینہ ایک ایجنٹ سے بارڈر کراس کرانے کی بات کر کے آئی تھی۔ اس نے ہمیں اسی ایجنٹ کے پاس پہنچا دیا اور دوبارہ تمہاری تلاش میں وہاں پہنچ گئی۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ تم کس مکان میں غائب ہوئے تھے کئی گھنٹے بعد یہ پریشان حال واپس آئی اور بتایا کہ اس علاقے میں کوئی نہیں مان رہا ہے کہ تم اس کے گھر میں داخل ہوئے تھے مگر وہاں تھے بھی نہیں، کیوں کہ پولیس والوں نے اس علاقے کے ایک ایک گھر کی تلاشی لی تھی۔ ہمیں اتنا اطمینان تھا کہ تم اس علاقے سے نکل گئے ہو۔ پھر میری تجویز پر یہ سب لوگ قانونی طور پر کراچی پہنچے میں نے سارا سامان لے کر اس ایجنٹ کے ساتھ باڈر کراس کیا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ میں خزانہ پاکستان میں اپنے ساتھیوں کے حوالے کر کے واپس ایران آؤں گا اور تمہیں تلاش کروں گا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ سامان ان لوگوں کے حوالے کرنے کے بعد میں نے دوبارہ اسی طریقے سے بارڈر کراس کیا اور پھر اس علاقے میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے علی سے معلوم ہوا کہ اس کے محلے کا ایک آدمی تمہیں وہاں سے نکال کر لے گیا ہے۔ میں نے تمہیں تہران میں تلاش کیا، پھر مایوس ہو کر کراچی پہنچ گیا۔ اتنا مجھے اطمینان تھا کہ تم جہاں بھی ہو گے خیریت سے ہو گے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ خزانے کا بندوبست کرنے کے بعد میں اور تہمینہ ایک مرتبہ پھر ایران جائیں گے۔ ہم نے ابھی یہ پروگرام بنایا ہی تھا کہ تم خود یہاں پہنچ گئے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم دونوں مجھے تلاش کرلینا۔"

"وہ تو خیر ہم کرلیں گے مگر تم بتاؤ تم یہاں تک کیسے پہنچے؟" برڈ نے کہا۔

"میں نے جواب میں اسے شروع سے لے کر آخر تک تفصیل سے ہر بات بتا دی۔"

"گڈ۔" ساری بات سننے کے بعد برڈ نے کہا، پھر کلارا سے مخاطب ہوا۔ "مس کلارا

آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔"

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔" کلارا نے کہا۔ "میں اس وقت نشے کی ترنگ میں تھی۔ اس کو تو شاید اندازہ بھی نہ ہوگا کہ پیسھوڈین کا نشہ کتنا زبردست نشہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر پیسھوڈین کا انجکشن کسی چوہے کو لگا دیا جائے تو وہ بھی للکار کے کہے گا' کہاں گئی یہ حرامزادی بلی! میں تو پھر انسان ہوں اور اگر میں نے اس پولیس والے کے سامنے جھوٹ بول دیا تو کون سا کمال کیا۔"

"جھوٹ تو تم اب بھی بول رہی ہو۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "تم اس وقت نشے میں تو نہیں تھیں۔"

برڈ نے چونک کر کہا۔ "اوہو' ساڑھے تین بج گئے ہیں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔"

وہ خود بھی اٹھتے ہوئے بولا۔ "یار دل تو نہیں چاہ رہا مگر میرا خیال ہے کہ کچھ دیر سو ہی لیں۔" یہ کہہ کر وہ بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کلارا سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بھی تہمینہ یا رضوانہ کے کمرے میں شفٹ ہو جاؤ۔"

اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور بولی۔ "کیوں یہاں کیا ہے؟

"کچھ دن میں بھی بے فکری سے سونا چاہتا ہوں۔ تم اتنی زور سے خراٹے لیتی ہو کہ میں ساری رات ڈرتا رہتا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"بکو مت" وہ جھنپ کر بولی۔ "میں رات میں سوتی ہی کب ہوں۔ نشہ نہ ملنے سے میرے اندر ایسی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے کہ سونا تو دور کی بات ہے ' میں سکون سے لیٹ بھی نہیں سکتی۔" کلارا سنجیدہ ہو گئی۔

"سوری کلارا! میرا یہ مقصد نہیں تھا۔" تمہیں اگر بہت زیادہ تکلیف ہے تو کسی ڈاکٹر کو دکھا دوں گا۔

"نہیں خرم! کلارا نے کہا۔ "میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ میری ول پاور کیسی ہے۔ اب تو میری طبعیت خاصی بہتر ہے ورنہ ابتدائی دو دن تو مجھ پر قیامت بن کر گزرے تھے۔ میں نے تمہیں احساس نہ ہونے دیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ دو چار دن کی اور بات ہے ' پھر مجھے بالکل احساس بھی نہیں ہوگا۔"

"اس میں شک نہیں کہ تم زبردست قوت ارادی کی مالک ہو۔" میں نے توصیفی انداز میں کہا۔ "پیسھوڈین کا نشہ بہت ہی ظالم نشہ ہوتا ہے۔ مجھے خود تو اس کا تجربہ نہیں ہے مگر میں نے اس نشے کے عادی لوگوں کو دیکھا ہے۔ وہ ایک انجکشن کے لیے کسی کا خون بھی کر سکتے ہیں۔"

"میرے ڈیڈی نے بہت کوشش کی کہ میں نشہ ترک کر دوں' دو دفعہ میرا علاج بھی

لرایا گیا مگر جب تک نشے کا عادی خود نہ چاہے' کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اسپتال سے باہر نکلتے
ی وہ پہلے سے زیادہ شدت سے نشہ کرنے لگتے ہیں۔"
"خیر مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری بات مان لی۔" میں نے تکیہ اور کمبل اٹھائے اور
تکیہ قالین پر رکھ کر ڈھیر ہو گیا۔

○

" صبح میری آنکھ خود بہ خود کھل گئی۔ میں معمول کے مطابق ایکسرسائز میں مصروف ہو
گیا۔ کلارا شاید باتھ روم میں گئی۔ میں ایکسرسائز میں مصروف تھا کہ کلارا باتھ روم سے نکل
آئی اور بولی۔ "خرم 'جلدی سے ہاتھ منہ دھولو" میں ناشتا منگوا رہی ہوں۔ نہ جانے مجھے اتنی
بھوک کیوں لگنے لگی ہے۔"
"فکریں اور پریشانیاں جو ختم ہو گئی ہیں۔" برڈ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
میں جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا' باہر نکلا تو تقریباً سبھی لوگ موجود تھے۔ ان
لوگوں نے ناشتا بھی منگایا تھا' بس میرا انتظار ہو رہا تھا۔
ناشتے سے فارغ ہو کر برڈ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہاں ٹھہرنے کی بجائے کوئی مکان
لے لیا جائے۔"
"خیال تو میرا بھی یہی ہے مگر کلارا۔۔۔"
"میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم مکان مت لو۔" کلارا جلدی سے بولی۔ "میں نے تو
صرف یہ کہا تھا کہ میرے ساتھ ایک دفعہ اسٹیٹس چلو۔"
"پھر ایسا کرتے ہیں کہ آج ہی کسی اسٹیٹ ایجنٹ سے رابطہ کرتے ہیں۔" برڈ نے کہا۔
مجھے اچانک خیال آیا کہ رضوانہ موجود نہیں ہے۔ میں نے برڈ سے پوچھا۔ "یہ رضوانہ
کہاں گئی۔"
"رضوانہ صرف ایک دو گھنٹے کے لیے آتی ہے ۔ وہ اپنے گھر میں رہتی ہے۔" برڈ کی
بجائے تہمینہ نے جواب دیا۔ "رات باتوں میں بہت دیر ہو گئی تھی اسلیے وہ یہیں ٹھہر گئی تھی
صبح صبح وہ اپنے گھر چلی گئی۔"
"تم لوگ یہیں ٹھہرو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اور برڈ مکان کا بندوبست کر
کے آتے ہیں۔"
"جی نہیں' میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" کلارا بچوں کی طرح منہ بنا کر بولی۔
"تم تو خیر چلو گی ہی۔" میں نے جواب دیا۔ "پھر اردو میں بڑبڑایا۔" اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم
فرمائے۔" پھر اچانک مجھے رقم کا خیال آیا ۔ میں نے برڈ سے کہا۔ "مگر یار' پہلے تو ان ہیروں
کو ٹھکانے لگانا پڑے گا۔"

"سب ہیروں کو نہیں، برڈ نے کہا" بات معقول تھی۔ میں نے اپنے بیگ میں سے چار چھوٹے چھوٹے ہیرے نکالے اور بیگ الماری میں بند کر کے چلنے کو تیار ہو گیا۔

"یار تم بھی اس بیگ کو ہوٹل کے لاکر میں رکھوا دو۔" برڈ نے کہا۔

میں نے بیگ رضا کے حوالے کیا اور کہا کہ بیگ کی بجائے صرف ہیرے اور سونا پیک کر کے لاکر میں رکھوا دو میں سونا فروخت کر کے بھی رقم حاصل کر سکتا تھا مگر میں ہیروں کی قدو قیمت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

پھر میں، کلارا اور برد ایک ٹیکسی میں صدر کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ ابتدا شاہراہ عراق کی مارکیٹ سے کروں گا۔ ہیرے کلارا کے پاس تھے۔ وہاں کی بیشتر دکانیں ابھی تک بند تھیں۔

ہم جس دکان میں داخل ہوئے، وہاں ابھی جھاڑ پونچھ ہی ہو رہی تھی، مالک البتہ فارغ بیٹھا ہوا تھا ہمیں دیکھتے ہی وہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر ہماری طرف بڑھا۔ "یس میڈم، کیا لینا پسند فرمائیں گی۔" اس نے کلارا سے پوچھا۔ گنجا دکاندار شاید کلارا کی سفید چمڑی سے مرعوب ہو گیا تھا۔

کلارا شوکیس پر جھک گئی، اور ایک بریسلٹ کی طرف اشارہ کر کے بولی "دس ون" دوکاندار نے جھٹ وہ بریسلٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا، بلاشبہ وہ انتہائی خوبصورت بریسلٹ تھا۔

کلارا نے اس کی قیمت پوچھی، وزن کرایا اور دکان والے سے اس کی رسید بنانے کو کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کلارا کیا کرنا چاہ رہی ہے۔ دکان والا رسید بنا لایا۔ کلارا نے اپنے پرس میں سے رقم نکال کر اسے ادائیگی کی اور دھیمے لہجے میں بولی۔ "میرے پاس کچھ ہیرے ہیں۔ میں انہیں فروخت کرنا چاہتی ہوں۔ یہاں کوئی دکان ایسی بھی ہے جو مجھ سے دو ہیرے خرید لے۔"

"کیلی!"

میں نے بہت اسٹائل سے کلارا کو پکارا۔" میں نے جان بوجھ کر اس کا اصلی نام نہیں لیا تھا؟"

"آف کورس ڈارلنگ؟" وہ بالکل بیوی والے انداز سے بولی۔

"ڈونٹ وری میڈم!" دکان والا جلدی سے بولا۔" دکھائیے دو ہیرے۔ ممکن ہے میں ہی خرید لوں۔"

کلارا نے بیگ کھول کر خوب صورت سی مخمل ڈبیا برآمد کی اور اسے کھول کر شوکیس پر رکھ دیا۔ نہ جانے اس نے کس وقت دو ہیرے ڈبیا میں منتقل کر دیئے تھے۔

دکان والے نے مہنگے فائنگ گلاس اٹھایا اور غور سے ہیروں کا جائزہ لینے لگا۔ میری اور

برڈ کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ہیرے دیکھ کر لمحے بھر کو اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ پھر وہ نارمل ہوگیا۔ وہ خاصا گھاگ جیولر تھا ہمارے سامنے بے تابی ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔

خوب اچھی طرح ہیروں کا جائزہ لینے کے بعد وہ بولا۔ "آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے میڈم؟"

"آپ ڈیمانڈ کو چھوڑیں۔" کلارا نے کہا۔ "قیمت لگائیں ان ہیروں کی۔"

"دیکھئے ابھی تو یہ بھی کنفرم نہیں ہوا کہ میں ہی یہ ہیرے خرید رہا ہوں۔"

تو پھر جلدی کنفرم کریں۔" کلارا نے کہا۔ "بات بنتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم کسی اور سے بات کریں۔"

"میں ان ہیروں کے پچاس ہزار دوں گا۔" دوکان والا جلدی سے بولا۔

"نو" کلارا سر جھٹک کر بولی۔" وہ ہیرے ہیں سر' کوئی کانچ کے ٹکڑے نہیں ہیں جن کے آپ پچاس ہزار لگا رہے ہیں۔" کلارا نے ہیروں کی ڈبیا اٹھائی اور اسے پرس میں رکھنے ہی والی تھی کہ دکان دار بول اٹھا۔ "میں ان کے ساٹھ ہزار دے سکتا ہوں۔"

ہم نے اس کی آفر نظر انداز کرتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"میری طرف سے آخری آفر ایک لاکھ روپے کی ہے۔"

"نو" کلارا نے مختصر جواب دیا۔

"میڈم' کچھ آپ بھی تو فرمائیں آپ کا کیا اندازہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" کلارا نے جواب دیا۔" دراصل یہ ہیرے مجھے ورثے میں ملے ہیں۔ میرا بھلا کیا اندازہ ہو گا۔"

"چلئے سوا لاکھ میں یہ ہیرے مجھے دے دیں۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔" دیکھئے میڈم' اب ضد مت کیجئے گا۔ اس سے زیادہ آپ کو کوئی نہیں دے گا۔"

"تھینک یو۔" کلارا نے سرد مہری سے جواب دیا اور باہر کی طرف قدم بڑھادیے۔

باہر نکل کر میں نے برڈ سے کہا۔" کیا خیال ہے' ہم وہ ہیرے اس دکان والے کو فروخت نہ کر دیں؟"

"نہیں۔" برڈ نے مجھے ٹوک دیا۔ "پہلے ہم ان ہیروں کی قیمت تو معلوم کر لیں۔"

ہاں یار' ممکن ہے ان ہیروں کی قیمت ہمارے اندزے سے کہیں زیادہ ہو۔ "میں نے جواب دیا۔

پھر ہم لوگ ایک اور دکان میں داخل ہو گئے۔ یہ دکان پہلے کی نسبت خاصی بڑی تھی۔ کاؤنٹر کے ایک گوشے میں دو فون تھے ۔ ہمیں دیکھ کر ایک سیلز مین ہماری طرف بڑھا اور مودب لہجے میں بولا۔ "یس پلیز۔"

کلارا نے دکان کے مالک کے بارے میں پوچھا۔ دکان کے دوسرے سرے پر مالک بھی

موجود تھا۔ اپنا تذکرہ سن کر وہ ہماری طرف متوجہ ہوگیا۔ اور کلارا سے بولا۔ ”جی فرمایئے ' میں اس دکان کا مالک ہوں۔“ وہ خاصا پڑھا لکھا شخص تھا اور روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔

”میں ایک پرابلم میں ہوں۔“ کلارا نے کہا۔ ”میرے ٹریولرز چیک گم ہو گئے ہیں اور پیسوں کی شدید ضرورت ہے۔ میرے پاس ہیرے ہیں۔ مین انہیں فروخت کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں ہیرے وغیرہ خریدتا تو نہیں ہوں مگر آپ چونکہ بہت پریشان ہیں اس لیے لے لوں گا۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”دکھایئے 'کیسے ہیرے ہیں۔“

کلارا نے اپنے پرس میں سے ہیروں کی مخملی ڈبیا نکالی اور کاؤنٹر پر رکھ دی۔ جیولر نے اسے دیکھا تو آنکھوں میں حیرت کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں ۔ پھر اس نے نگینہ فائنگ گلاس سے ہیروں کا جائزہ لیا اور کلارا سے بولا۔ ”یہ خاصے قیمتی ہیرے ہیں انھیں آپ فروخت نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔“ ”یہ بات میں بھی جانتی ہوں۔“ کلارا نے جواب دیا۔ ”مگر مجبوری ہی ایسی ہے۔“

دوکان دار ایک مرتبہ پھر ہیروں کے جائزے میں مصروف ہو گیا۔

اسی وقت دوکان میں ایک نوجوان لڑکا داخل ہوا لڑکے نے اچٹتی ہوئی ایک نظر ہم لوگوں پر ڈالی' پھر مالک سے بولا۔ ”سیٹھ نے کہا ہے ان ہیروں کی قیمت زیادہ مت لگایئے گا۔“ اس کی بات سن کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہ لوگ کلارا اور برڈ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی غیرملکی سمجھ رہے تھے۔

”کیوں؟“ سیٹھ نے پوچھا۔

”ابھی یہ لوگ دوکان پر بھی آئے تھے۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”آپ سیٹھ سے خود ہی بات کرلیں۔“

مالک نے ”ایکسیوزمی“ کہہ کر فون پر نمبر ڈائل کیے' پھر بولا۔ ”ہاں الیس سیٹھ 'کیا بات ہے؟---- اچھا ---- مال تو اے ون ہے---- ہاں' کتنے ---- نہیں یار' یہ تو بہت کم ہیں---- اچھا ---- میں دیکھتا ہوں۔“

وہ فون بند کر کے مڑا تو لڑکا جانے لگا۔ میں نے لڑکے کا راستہ روک لیا اور تپے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اپنے سیٹھ سے کہہ دینا کہ کاروبار کرنے کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔“

”آ---- آپ اردو ----“ لڑکا ہکلا کر رہ گیا۔

”تمہیں اتنی حیرانی کیوں ہے۔“ میں نے اسے جھڑک دیا۔ ”مجھے اردو اس لیے آتی ہے کہ میں یہیں کا رہنے والا ہوں' غیرملکی نہیں ہوں سمجھے!“ لڑکا لپک کے دکان سے باہر نکل گیا۔ میں سیٹھ سے مخاطب ہوا۔ ”سیٹھ صاحب! مجھے امید ہے کہ آپ اس بے ایمان کی باتوں میں نہیں آئے ہوں گے جو جیولر کا روپ دھارے بیٹھا ہے اپنی حرکتوں سے آپ

والوں کو بدنام کر رہا ہے۔"
سیٹھ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ "پھر کچھ سوچ کر وہ کلارا کی طرف مڑ گیا اور بولا۔ "میڈم ان ہیروں کے میں دو لاکھ دے سکتا ہوں۔ اگر آپ کو منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ معذرت۔"
"اوکے۔" کلارا نے طویل سانس لیا۔ "مجھے یہ قیمت منظور ہے۔ مجھے کیش چاہئے' چھوٹے نوٹوں کی شکل میں۔"
بڑ نے آنکھ کے اشارے سے یہ قیمت قبول کر لینے کی تلقین کی تھی۔
ہم لوگ وہاں سے آدھے گھنٹے بعد نکلے تو دو لاکھ روپے ہمارے ہو چکے تھے۔
"یار اگر چھوٹے چھوٹے ہیروں کی کم سے کم قیمت دو لاکھ روپے بھی ہو تو ہم سبھی بیٹھے بٹھائے کروڑ پتی بن گئے۔" بڑ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
"یار مگر اصل مسئلہ تو ان ہیروں کی فروخت کا ہے۔" میں نے کہا۔
"اس کا بھی کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔" بڑ نے جواب دیا۔
ہم نے ٹیکسی لی اور ڈیفنس سوسائٹی جا پہنچے۔ میں اس علاقے کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ وہ علاقہ پسند آیا۔ ایک تو وہاں سکون بہت تھا' دوسرے وہاں کے لوگ دوسروں کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ ہمارے پاس اتنی رقم تو نہیں تھی کہ وہاں کوئی مکان خرید سکتے۔ میں نے مکان کرائے پر لینے کا فیصلہ کیا۔ ڈیفنس فیز فائیو میں ہمیں بہترین قسم کا بنگلا مل گیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ نے تمام کاروائی مکمل کرنے کے بعد اس روز بنگلے کی چابی ہمارے حوالے کر دی۔ بنگلے میں ضرورت کا سامان بھی موجود تھا۔
دوسرے ہی دن ہم ہوٹل سے بنگلے میں شفٹ ہو گئے۔ کلارا بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ اور تہمینہ بنگلے کی صفائی میں مصروف تھیں۔ جو سامان بنگلے میں نہیں تھا' وہ کلارا بازار سے خرید لائی تھی۔
ہم پرسکون ہو کر بیٹھے تو مجھے شہلا کا خیال آیا۔ شہلا کے تذکرے پر تہمینہ کہنے لگی۔ "یہاں کراچی میں بھی مشہدی کا دوست موجود ہے۔ ممکن ہے وہ شہلا کے بارے میں کچھ بتا سکے۔"
"اتنی اہم بات تم اب بتا رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "ہمیں تو فوراً اس ایرانی سے رابطہ کرنا چاہیے۔"
"میرے ذہن میں تو تھا۔" تہمینہ نے جواب دیا۔ "مگر ضروری نہیں ہے کہ وہ کچھ جانتا ہی ہو۔"
"ممکن ہے اس سے ہمیں کوئی سراغ مل جائے۔" بڑ نے جواب دیا' پھر اس نے پوچھا۔ "وہ ایرانی کہاں رہتا ہے؟"

"وہ کلفٹن کے علاقے میں رہتا ہے۔"

"ہم آج ہی اس سے مل لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ یہاں پاکستان میں کیا کر رہا ہے؟

"بزنس کر رہا ہے۔" تہمینہ نے جواب دیا۔" وہ برسوں سے یہاں مقیم ہے۔ اب تو اس کے پاس یہاں کی شہرت بھی ہے۔"

"تم ایڈریس بتاؤ۔" برڈ نے کہا۔

"میں آپ لوگوں کو وہاں پہنچا سکتی ہوں' زبانی ایڈریس بتانا مشکل ہے۔"

ہم لوگ فورا اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ شخص اس وقت گھر پر ہی ہو گا۔ میں برڈ اور تہمینہ ٹیکسی کی تلاش میں کافی دور تک پیدل چلتے رہے۔ اسی وقت میں نے طے کر لیا کہ کل ہی مناسب کوئی گاڑی بھی خرید لوں گا۔ مین روڈ پر ہمیں ٹیکسی مل گئی۔

تہمینہ کی ہدایت پر ٹیکسی عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے سیدھی نکل گئی۔ سڑک کی دونوں طرف وسیع و عریض بنگلے تھے۔ تقریبا وہ ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد تہمینہ نے ایک بنگلہ کے سامنے ٹیکسی رکوا دی۔ گیٹ پر آغا ایم یو قزلباش کی نیم پلیٹ تھی۔

"یہ آغا ایم قزلباش وہی شخص ہے؟" میں نے تہمینہ سے تصدیق چاہی۔

اس نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کال بیل کے سوئچ پر انگلی رکھ دی۔ دور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی ور تھوڑی دیر بعد مین گیٹ کی ذیلی کھڑکی میں سے ایک شخص نے باہر جھانکا۔ تہمینہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ہمیں آغا صاحب سے ملنا ہے۔"

"تشریف لائیے۔" اس نے پھرتی سے گیٹ کھول دیا۔ وہ حلیے سے ملازم لگ رہا تھا اور مقامی ہی تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں دربان ہو گا' ملازمین ہوں گے مگر مسکین سے اس ملازم کو دیکھ کر آغا صاحب کا امیج وہ نہیں رہا تھا۔ وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر آغا صاحب کو اطلاع دینے اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں بھی مجھے سادگی ہی نظر آئی۔ ہلکے رنگوں کے پردے تھے' پرانا کارپٹ تھا' دیوار پر شاہ ایران اور ملکہ فرح کی بڑی سی ایک تصویر تھی' شوکیس میں بہت سے کپ اور ٹرافیاں سجی تھیں۔

قدموں کی آہٹ سن کے میں نے دروازے کی طرف نظریں اٹھائیں ۔ وہاں ادھیڑ عمر کا ایک ایرانی کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ الجھے ہوئے انداز میں ہمیں دیکھ رہاتھا' شاید پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا' مہذب انداز میں اسے سلام کیا' پھر بولا ۔ "آغا صاحب آپ ہی ہیں؟" میں نے یہ سوال اردو میں کیا تھا۔ وہ برسوں سے یہاں مقیم تھا اس لیے اسے اردو ضرور آتی ہوگی۔

"جی ہاں میں ہی آغا ہوں، فرمائیے کیسے زحمت کی؟"
میں نے تہمینہ کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کیے شاہ اور ملکہ کو گھور رہی تھی۔
میری آواز پر وہ مڑی تو آغا حیرت سے اچھل پڑا۔
"تہمینہ، تم کب آئیں؟"
"میں کل ہی یہاں پہنچی ہوں۔" تہمینہ نے جواب دیا، پھر اس نے میرا تعارف کرایا۔
"بہن کی تلاش ہے!" آغا صاحب منہ ہی منہ میں بڑبڑائے "کیا ان کی بہن کہیں گم ہو گئی ہے؟ مگر میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"
"شاید آپ میری مدد کر سکیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اسے مشہدی نے کہیں چھپا دیا ہے۔"
"مشہدی نے چھپا دیا ہے؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ "کون مشہدی؟"
"آپ کا دوست مشہدی، ایرانی محکمہ خفیہ کا اعلیٰ عہدیدار!" میں نے جواب دیا۔
"میری ملاقات تو اس سے گزشتہ سال ہوئی تھی۔" پھر وہ چونک کر بولے۔ "مگر مشہدی کا تو انتقال ہو گیا۔"
"مشہدی کا انتقال ہوا ہے، اسکے ساتھیوں کا نہیں۔" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔
"تو پھر میں کیا کروں۔" آغا صاحب بھی جھنجلا گئے۔
"انکل پلیز۔" تہمینہ نے جلدی سے کہا۔ "اگر آپ کو شہلا کے بارے میں کچھ علم ہے تو ہمیں بتا دیں۔ خرم صاحب اپنی بہن کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔"
"دیکھو تہمینہ!" انہوں نے کہا۔ "تم تو جانتی ہو کہ میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ مجھے اگر ان کی بہن کے بارے میں کوئی اطلاع ملی تو ضرور بتاؤں گا۔"
"ایسے ایک آدمی کو بھی نہیں جانتے جو مشہدی کے زیادہ قریب رہا ہو؟" تہمینہ نے پوچھا۔
"ایسے ایک آدمی کو جانتا ہوں۔" آغا صاحب ذہن پر زور دے کر بولے۔ "مگر وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس سے الجھ مت جانا۔"
"آپ ایک دفعہ اس کا ایڈریس بتا دیں۔" میں نے کہا۔
"میں اس کا ایڈریس بھی بتا دوں گا مگر اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ایڈریس میں نے تمہیں دیا ہے ورنہ وہ میرا بھی دشمن ہو جائے گا۔"
"نہیں معلوم ہو گا۔" تہمینہ جلدی سے بولی۔ "لیکن انکل آپ اس سے اتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟"

"بات خوف زدہ ہونے کی نہیں ہے۔" آغا صاحب مسکرائے۔ "ہر شریف آدمی اپنی عزت جانے کے خیال سے ڈرتا ہے۔" پھر وہ چونک کر بولے۔ "میں بھی اتنا احمق ہوں کہ ابھی تک تمہیں چائے بھی نہیں پلائی۔"

"چائے کا تکلف نہ کریں" میں جلدی سے بولا۔ "ہمیں صرف اس کا پتا بتا دیں آغا صاحب نے اس کا پتا لکھ کر دے دیا۔ وہ محمد علی سوسائٹی کے علاقے میں رہتا تھا۔ ہم وہاں سے اٹھ کر محمد علی سوسائٹی روانہ ہوگئے۔ فی الحال میں صرف اس کا ٹھکانہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کافی مشکل سے ٹیکسی ملی۔ اسی ٹیکسی میں ہم نے محمد علی سوسائٹی کا ایک چکر لگایا۔ وہ شخص جس بنگلے میں رہتا تھا۔ اس کے گیٹ پر علی اکبر شاہ پور کی نیم پلیٹ لگی تھی' باؤنڈری وال خاصی بلند تھی اور اس پر خاردار تار لگے ہوئے تھے۔ جگہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد ہم گھر لوٹ آئے۔

○

کلارا بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "مجھے اکیلا چھوڑ کر کہا غائب ہو جاتے ہو! میں بور ہو گئی۔"

"رضا کہاں گیا؟" میں نے پوچھا۔

"تم لوگوں کے پیچھے پیچھے وہ بھی نکلا تھا' بتا کر نہیں گیا کہ کہاں جا رہا ہے۔" کلارا نے کہا۔ "میں نے گھر کی سیٹنگ کر دی ہے' سینڈوچز بھی بنا لیے ہیں' بھوک لگی ہو تو کھانا لاؤں؟"

دروازے پر کسی گاڑی کے آنے کی آواز آئی' پھر رضا چابی گھماتا ہوا داخل ہوا اور ہنس کر بولا۔ "میں نے گاڑی خریدی ہے۔ سواری کا مسئلہ روز بہ روز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس علاقے میں بغیر گاڑی کے گزارا مشکل ہے۔"

"یہ تم نے ڈھنگ کا کام کیا ہے۔" برڈ مسکرا کر بولا' پھر سوچ کر کہنے لگا۔ "یہ رضوانہ کہاں غائب ہے؟"

"رضوانہ اپنے گھر میں ہوگی۔ وہ کل صبح یہاں آئے گی۔"

"رضا نے بہت اچھی گاڑی خریدی تھی۔ وہ جدید ماڈل کی مزدا سکس ٹو سکس تھی۔ میں تو اسی وقت مشہدی کے ساتھی سے ملنا چاہتا تھا مگر برڈ نے مجھے روک دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم صبح چلیں۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ کافی دیر تک چہل قدمی کرتے رہے۔ پھر ہم رات گئے تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں نے رضا سے کہا۔ "رضا' تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم گھر لوٹ جاؤ۔"

رضا نے افسردگی سے مجھے دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھ سے اکتا گئے ہیں شاید؟“

یہ بات نہیں ہے رضا!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں تو چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو مگر تمہارا بھی ایک گھر ہے‘ بہن بھائی ہیں‘ والدہ ہیں۔ کیا ان لوگوں کا تم پر حق نہیں ہے؟ میں اتنا خود غرض نہیں ہوں رضا کہ اپنی وجہ سے ان لوگوں پر ظلم ہونے دوں۔“

”کیسا ظلم خرم صاحب۔“ رضا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ” ظلم تو اب تک مجھ پر ہوتا رہا تھا۔ میں نے تو کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا! میں سمجھا نہیں۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرا کر بولا۔

”نہیں رضا‘ مجھ سے جھوٹ مت بولو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟“

”اس نے طویل سانس لیا اور بولا۔ ”میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ میرے بہن بھائی اور والدہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں ایک ماہ کا تھا جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ والد نے دوسری شادی کر لی اور ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی سوتیلی ماں کے حوالے کر دیا گیا۔ بعد کی داستان وہی روایتی ہے۔ اس کی اہم بات یہ ہے کہ میں جس لڑکی کو پسند کرتا تھا‘ اسے میرا سوتیلا بھائی لے اڑا۔ اس دن کے بعد سے میں نے ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ دیا۔“ پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”میں کافی عرصے سے پاکستان آنا چاہ رہا تھا۔ آپ کی وجہ سے یہ موقع بھی مل گیا‘ جانتے ہیں کیوں؟“ اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”یہاں میرا سوتیلا بھائی اور وہ لڑکی ہے جو کل تک میری محبت کا دم بھرتی تھی۔ میں ان دونوں کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ----“ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

”تمہارے حالات جان کر افسوس ہوا رضا۔“ میں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ”میری ایک بات مانو گے۔؟“

”آپ کو بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟“ رضا نے کہا۔ ”آپ تو صرف مجھے حکم دیں۔“

”میں صرف درخواست کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے سوتیلے بھائی کو معاف کر دو۔“

”معاف کردوں؟“ رضا نے تڑپ کر کہا۔ ”مگر اس نے میری محبت پر ڈاکا ڈالا ہے۔“

”یہ تو تمہاری خوش فہمی ہے کہ وہ لڑکی تمہاری محبت تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اسے اگر تم سے محبت ہوتی تو وہ تمہارے سوتیلے بھائی کے ساتھ بھاگتی‘ کبھی نہیں لیکن اسے تم سے محبت ہی نہیں تھی۔ ایک ایسی لڑکی خاطر تم قتل کرنے جا رہے ہو!“

رضا کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ وہ کافی دیر تک کچھ نہ بولا۔ کمرے میں گہرا سناٹا طاری تھا۔ پھر رضا نے طویل سانس لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ آپ کی بات درست ہے کہ مجھے اس لڑکی کی خاطر اپنے ہاتھ خون میں نہیں رنگنا چاہئیں۔"

"پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔" میں نے کہا۔

"میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔" رضا مسکرا کر بولا۔

"اور آئندہ مجھ سے جھوٹ بھی نہیں بولو گے۔ آخر تمہیں یہ جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا تھی کہ تمہارے گھر والے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے؟"

"دراصل اس وقت میں نے آپ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ تہران جا کر کوئی کاروبار کر لوں گا۔ وہ جھوٹ بھی میں نے اسی لیے بولا تھا کہ آپ مجھے روکیں تو میرے پاس جانے کا جواز ہو۔"

اچھا، اب میں سمجھا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "گویا تم ہم سے جان چھڑانا چاہتے تھے!"

"رضا جھینپ کر بولا۔" یہ تو بالکل ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ لوگوں سے مجھے اتنی محبت ملے گی۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے وہ خاصا جذباتی ہو گیا۔

"یار ہم سے کوئی نہیں پوچھتا کہ تم مر گئے یا زندہ ہو؟" برڈ نے برا ماننے کی اداکاری کی۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں مسکرایا۔ "مجھے نظر آ رہا ہے کہ تمہارا انتقال ہو چکا ہے۔" "ہوا تو نہیں ہے البتہ عنقریب ہو جائے گا اگر میں مزید اس خشک ماحول میں رہا۔ یار اب تو ہم کراچی میں ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ کراچی بین الاقوامی اہمیت کا شہر ہے اور یہاں۔۔۔۔"

"نائٹ کلبس بھی ہیں اور کیسینو بھی۔" میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ "میں نے تمہیں روکا تو نہیں۔ جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔" میں نے کلائی کی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ "ابھی ساڑھے گیارہ ہی تو بجے ہیں۔"

"میں اکیلا تو نہیں جاؤں گا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" برڈ نے کہا۔

"مجھے ساتھ لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ کلارا بھی جائے گی، تو پھر تہمینہ اور رضا نے کیا قصور کیا ہے۔"

"آپ لوگ جائیں۔" رضا ہنس کر بولا۔ "میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی آرام کے موڈ میں ہوں۔" تہمینہ نے کہا۔ "مگر میں آرام کے موڈ میں نہیں ہوں۔" کلارا ہنس کر بولی۔ "تمہیں اکیلا جانے بھی نہیں دوں گی۔"

"ابے یار، یہ لونڈیا تو میری جان کو آ گئی ہے۔" میں اردو میں بولا۔

میری بات صرف تہمینہ کے پلے پڑی۔ وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔
کلارا نے گھور کر مجھے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں
اس زمانے میں نائٹ کلبس اور کینو پر پابندی نہیں لگی تھی۔ کراچی کے کئی نائٹ کلب تو رات بھر کھلے رہتے تھے۔

○

ہم تینوں روما شبانہ پہنچ گئے۔ وہاں کوئی غیر ملکی رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی برڈ نے بار کا رخ کیا۔ کلارا بھی وہاں جانا چاہتی تھی مگر میں نے اسے روکدیا۔ میں نے ایک الگ تھلگ ٹیبل پر بیٹھ کر کافی کا آرڈر دیا ہی تھا کہ ایک شخص کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ بھی حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں کراچی آکر وانگ یو کے دشمنوں کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھا تھا۔ انہی میں سے ایک شخص نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ میں نے سرجھٹک کر سوچا کہ جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ پھر میں کلارا سے باتیں کرنے لگا مگر میرا دھیان اسی شخص کی طرف تھا۔

وہ گھٹے ہوئے جسم اور کرخت چہرے کا مالک تھا' شکل سے ذار ایسٹ کے کسی ملک کا باشندہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت تنہا ہی تھا مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کیوں کہ اسی وقت ایک اور شخص ہال میں داخل ہوا۔ اس کا تعلق بھی کوریا یا جاپان سے تھا۔ وہ پست قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا' سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے جو آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ پہلے آدمی نے پست قد سے کچھ کہا تو اس نے فوراً گھور کے مجھے دیکھا' پھر دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ برڈ ناجانے کہاں رہ گیا تھا۔ مجھے بے چینی سے اس کا انتظار تھا۔

"کہاں کھوئے ہوئے ہو خرم!" کلارا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کلارا!" تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

"تم ہوش میں تو ہو؟" کلارا آنکھیں نکال کر بولی۔ "میں کیوں چلی جاؤں۔"

"میں خطرے میں ہوں کلارا!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"خطرے میں؟" کلارا بری طرح الجھ گئی۔

"ہاں کلارا!" میں نے جواب دیا۔ "ممکن ہے کچھ دیر بعد یہاں دھما چوکڑی شروع ہو جائے۔"

"پھر تو میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔" کلارا بچوں کی طرح منہ پھلا کر بولی۔

"چلو پھر میں چلتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "برڈ خود ہی گھر پہنچ جائے گا۔"

میں نے بیرے کو بلا کر بل ادا کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے گھوم کر دیکھا تو دونوں اپنی جگہ پر نہیں تھے' شاید بار میں تھے۔ موقع غنیمت

تھا اس لیے میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ میرا ارادہ تھا کہ کلارا کو گھر چھوڑ کر دوبارہ وہاں آؤں گا۔ مجھے برڈ کی بھی فکر تھی۔ اتنی رات کو تو اسے ٹیکسی بھی نہ ملتی۔ میں ارد گرد کا جائزہ لیتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

اچانک وہ دونوں کھڑی ہوئی ایک کار کے پیچھے سے نمودار ہوئے۔ پست قد شخص ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔

"خاموشی سے اس گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" اس کے ہاتھ میں لمبی نال کا ریوالور تھا۔

میں خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ کلارا سہمے ہوئے انداز میں ریوالور بردار کو گھور رہی تھی۔

"تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے۔" پست قد سانپ کی طرح پھنکا کر بولا۔ "اچھل کود کرو گے تو یہ چڑیا ہمارے ہاتھوں ماری جائے گی۔" اس نے ریوالور کا رخ کلارا کی طرف کر دیا۔

میں بغیر کچھ کہے ان کی گاڑی میں جا بیٹھا۔ میرے ساتھ کلارا بھی سوار ہو گئی۔ میں ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کلارا اور پست قد پچھلی سیٹ پر تھے۔ پھر پیچھے والے نے سیاہ رنگ کا ایک کپڑا نکالا اور میری آنکھوں پر باندھ دیا۔

پٹی بندھتے ہی میں اندھیروں میں گھر گیا۔ گاڑی کسی نامعلوم سمت کی طرف جا رہی تھی اور میں رہ رہ کر خود کو ملامت کر رہا تھا کہ مجھے اتنا غیر محتاط نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میرے مقدر میں شاید وطن کی مٹی ہے جبھی تو میری موت مجھے کھینچ کر کراچی لے آئی تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کلارا کی بے ساختہ قسم کی چیخ نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں بوکھلا کر مڑا اور آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھولنا چاہی۔ اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سر پہ پڑنے والی ضرب خاصی خطرناک تھی۔ پھر میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

○

میں نے پٹی کھولنے کی کوشش کی تو کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ گرفت خاصی سخت تھی۔ میں نے بھنا کر دوسرا ہاتھ اس کی کلائی پر ڈالا اور دوسرے ہی لمحے مجھے چٹاخ کی مخصوص آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی تیز قسم کی ایک چیخ گاڑی میں گونج کر رہ گئی۔ میں ڈرائیور پر گرا۔ میں نے ایک ہاتھ سے آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی ہٹائی اور دوسرے ہاتھ سے ڈرائیور کی گردن دبوچنا چاہی مگر وہ کم بخت چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر باہر جا گرا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے باہر چھلانگ لگا دی۔ اسی وقت گاڑی کا دروازہ کھلا اور وہ آدمی باہر آ گرا جس کی میں نے کلائی توڑ دی تھی۔ دوسرے ہی لمحے کلارا بھی گاڑی سے باہر آ گئی۔

ڈرائیور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے اچانک کلارا پر ریوالور تان لیا۔

"کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔" جاپانی نے سرد لہجے میں کہا "سیدھی طرح میرے ساتھ چلو۔"

کلارا ہکا بکا کھڑی کبھی مجھے دیکھ رہی تھی' کبھی اس جاپانی کو۔

اچانک وہ جاپانی آگے بڑھا اور ریوالور کلارا کے پہلو سے لگاتے ہوئے بولا۔ "تم نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو اس خوب صورت چڑیا کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دوں گا۔"

"ارے یار' ایسا کرو بھی تو۔" میں چہک کر بولا۔ "اگر تم نے اسے خاموش کر دیا تو یہ مجھ پر احسان ہو گا' بہت بولتی ہے کم بخت۔" گفتگو چونکہ جاپانی زبان میں ہو رہی تھی اس لیے کلارا ہونقوں کی طرح میرا منہ تک رہی تھی۔ غنیمت تھا کہ اسے جاپانی نہیں آتی تھی۔

"بہت چہک رہے ہو۔" وہ بھنا کر بولا۔ "چلو گاڑی میں بیٹھو۔"

"اے یار' تمہاری زبان ہے یا یا۔۔۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے گھورا۔ "کبھی کہتے ہو حرکت مت کرنا' کبھی کہتے ہو گاڑی میں بیٹھو' پہلے فیصلہ کر لو کہ مجھے کرنا کیا ہے۔" میں نے اسے چڑایا۔ میں اسے اشتعال دلانا چاہتا تھا تاکہ وہ اشتعال میں کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے۔

جاپانی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ سانپ کی طرح پھنکار کر بولا۔ "اب اگر تم ایک منٹ کے اندر اندر گاڑی میں نہ بیٹھے تو میں تو دونوں کو ٹھکانے لگا دوں گا۔"

"یار' تف ہے مجھ پر! یعنی مجھ پر یہ وقت بھی آنا تھا۔ تم سا گول مٹول' آلو نما شخص مجھ کو قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ ابے گھامڑ تجھے کسی نے بتایا نہیں کہ میرا نام خرم ہے' میں تو خود موت کا ہرکارہ ہوں۔" پھر میں نے حقارت سے اس کے ریوالور کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ کھلونے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اگر یقین نہیں ہے تو فائر کر کے دیکھ لے۔ جہاں تک اس لڑکی کا تعلق ہے تو میری طرف سے تم اسے دس دفعہ مار دو۔ میں تو خود اس سے تنگ آ گیا ہوں۔" میں چاہتا تھا کہ وہ کلارا کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دے۔ میں جان بوجھ کر بات کو طول دے رہا تھا' امکان تھا کہ شاید برڈ وہاں آ پہنچے۔

اچانک کوئی سرد سی چیز میری گردن سے ٹکرائی' پھر کوئی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "بس اب بکواس بند کرو خرم اور شرافت سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جاپانی بھی مجھے باتوں میں الجھائے ہوئے تھا تاکہ اس کا ساتھی وہاں پہنچ جائے۔

میں نے آہستہ سے گردن گھمانے کی کوشش کی تو پشت کی طرف سے مجھے وہی بھرائی ہوئی آوزا سنائی دی۔ "نہیں مسٹر خرم! پیچھے مڑ کر مت دیکھنا!"

"ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے۔" میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

"تم ایسے نہیں مانو گے۔" پشت سے وہی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"پھر میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی" آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے سے ناچنے لگے۔ میں نے جو آخری آواز سنی' وہ کلارا کی بے ساختہ چیخ تھی' پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

میری آنکھ کھلی تو میرا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون سی جگہ تھی۔ میں نے گردن گھمانے کی کوشش کی تو سر میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ میں نے سر کے دکھتے ہوئے حصے پر ہاتھ پھیرا تو مجھے چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ میرا سر پھٹ گیا تھا۔ زخم کے اطراف میں خون جم گیا تھا۔ میں تکلیف کی پروا کیے بغیر آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھا۔ میرے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں میرے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کسی کی خواب گاہ تھی۔ پیاس کے مارے میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر جگ اور گلاس تو موجود تھا مگر پانی نہیں تھا۔ کمرے میں ایک طرف چھوٹا دروازہ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ باتھ روم کا دروازہ ہے۔ میں گرتا پڑتا اٹھا تو مجھے زور کا چکر آیا۔ میں نے گھبرا کر دیوار کا سہارا لیا اور چند لمحے تک اپنی سانس درست کرتا رہا۔ اسی وقت میری نظر بیڈ کے تکیے پر پڑی۔ تکیے پر بھی خون کا بڑا سا دھبا تھا۔ چادر پر بھی خون لگا ہوا تھا۔ میں نے سوچا' میرا اتنا زیادہ خون بہہ گیا! اسی لیے تو مجھے اتنی نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ میں دوبارہ بیڈ پر ڈھے گیا۔

اسی وقت لاک میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا' بہت خاموشی سے دروازے تک آیا تھا ورنہ مجھے اس کے قدموں کی آہٹ ضرور سنائی دیتی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آگیا۔ وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ شکل سے مشرق بعید کے کسی ملک کا باشندہ لگا رہا تھا۔ اس نے سیاہ پینٹ اور ہاف آستین کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا جسم کسرتی تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ بالکل نہتا تھا۔ یا تو وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہی نہیں تھا یا پھر اسے یقین تھا کہ وہ مجھے زیر کر لے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ کوئی بھی مجھے زیر کر سکتا تھا۔

آنے والے نے حیرت سے مجھے دیکھا' پھر اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ وہ تعجب سے بولا۔

''تمہیں ہوش آگیا؟''

میں نے اسے صرف گھورنے پر اکتفا کیا۔ میں بول کر اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اچانک اس کی نظر تکیے پر پڑی خون میں تر تھا' پھر اس نے میرے سر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اوہو! تم تو بہت زیادہ زخمی ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے اس نے دروازہ بھی بند نہیں کیا۔

میرے جی میں آئی کہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل جاؤں مگر پھر سوچ کر ہی رہ گیا۔ مجھے میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ دروازے تک جا سکتا۔ یونہی گم صم بیٹھا خلاؤں میں تکتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہی شخص ایک اور آدمی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ نووارد نے ڈاکٹروں والا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ پہلے آنے والے نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیکھو خرم! پلیز کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا ورنہ خواہ مخواہ تمہیں تکلیف ہوگی۔ یہ ڈاکٹر اجمل ہیں' بہت اچھے ڈاکٹر ہیں یہ ۔ تمہیں ابھی آرام آ جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے ریوالور بھی نکال لیا۔

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر اجمل نے آگے بڑھ کر میرے سر کے زخم کا جائزہ لیا' پھر بیگ سے کاٹن نکال کر زخم صاف کرنے لگا۔ اس نے بہت احتیاط سے زخم صاف کیا اور بولا۔ "زخم خاصا گہرا ہے' ٹانکے لگانا پڑیں گے' بال بھی کاٹنا ہوں گے۔"

میں نے اس بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔

ڈاکٹر نے بیگ سے بلیڈ نکالا اور بہت مہارت سے میرے سر کے زخمی حصے کے بال صاف کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد کام سے فارغ ہو کر ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن دیا اور مختلف قسم کی ٹیبلٹس کھلائیں پھر اس نے پہلے آنے والے شخص سے کہا "مسٹر شائی فو! انھیں گرما گرم کافی پلا دو۔ میں نے انہیں دوا بھی دے دی ہے۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے' صبح تک یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ ویسے ان کا خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے' ممکن ہے انہیں بلڈ بھی دینا پڑے۔"

"ممکن ہے کا کیا مطلب ہے؟" شائی فو! نے ناگواری سے کہا۔ "صبح تک اسے بالکل نارمل ہونا چاہیے ورنہ باس ہمارے ساتھ ساتھ تمہیں بھی جہنم رسید کر دے گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ دونوں کس کے متعلق بات کر رہے ہیں۔ مجھے وہ سب کچھ کسی خواب کا منظر لگ رہا تھا' دھندلا سا اور غیر واضح۔ ان دونوں کی آوازیں بھی بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں' یوں جیسے وہ دونوں کنویں سے بول رہے ہوں۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور متلی کی سی کیفیت تھی۔

اچانک مجھے زبردست قسم کی ابکائی آئی تو ڈاکٹر جاتے جاتے پلٹ پڑا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا ۔ "انہیں وومٹنگ نہیں ہونا چاہیے۔ سر کی چوٹ میں یہ خطرناک ہوتی ہے۔" اس نے عجلت میں اپنا بیگ کھولا اور ڈسپوزایبل سرنج نکال کر انجکشن تیار کرنے لگا۔

"اسے کچھ ہونا نہیں چاہیے ڈاکٹر۔" شائی فو اضطرابی کیفیت میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "ورنہ ہم سب بے موت مارے جائیں گے۔"

"میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر کو بھی غصہ آ گیا۔ "یہ آدمی اتنا ہی اہم ہے تو اسے جانوروں کی طرح مارا کیوں تھا؟"

"اس مردود پینسو کا کام ہے یہ۔" شائی فو منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

ڈاکٹر نے میرے بازو میں ایک اور انجکشن گھونپ دیا اور بولا۔ "فورا بلڈ کا بندوبست کرو۔ میں ان کا بلڈ نکال کر دے رہا ہوں کراس میچ کے لیے۔"

میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جب سب کچھ دیکھ رہا تھا' سن رہا تھا مگر ملنے جلنے کی سکت نہیں تھی' ہاتھ پاؤں بے جان سے ہو گئے تھے سر کی تکلیف نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔

رات بھر مجھے بلڈ لگا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے بلڈ کے تین بیگ خالی ہو چکے تھے۔ رات میں نے سوتے جاگتے گزاری تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ میں رات میں سویا زیادہ ہوں کیونکہ صبح کو میں بالکل فریش تھا۔ اب صرف سر کے زخم میں تکلیف تھی۔ ویسے میں ہر طرح سے چاق و چوبند تھا۔ یہ بات میں ابھی ان لوگوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں انہیں بے خبری میں مارنا چاہتا تھا۔ اپنی حالت کا جائزہ لینے کی غرض سے میں نے باتھ روم جانے کی خواہش کی۔

شائی فو نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو اس نے اجازت دے دی۔ شائی فو نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور مجھے باتھ روم کی طرف لے چلا۔ میں اس کے سہارے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا باتھ روم کی طرف گیا اور اندر سے باتھ روم کا دروازہ لاک کرنے کے بعد میں نے تیزی سے اپنے جسم کو حرکت دی' جلدی جلدی چند مخصوص قسم کی ایکسرسائزز کیں تو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ میری توانائی واپس آ چکی ہے۔ اب میں پھر وہی پہلے والا خرم تھا' چاق و چابند اور پھرتیلا۔ میرے سر میں چوٹ نہ ہوتی تو میں سر کے بل بھی ضرور کھڑا ہوتا۔ ایکسرسائز کے ذریعے خود کو وارم اپ کرنے کے بعد میں نے منہ ہاتھ دھویا اور باہر نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کسی نے باتھ روم کا دروازہ تھپ تھپایا' پھر شائی فو کی آواز سنائی دی "خرم! خیریت تو ہے؟"

"میں بالکل خیریت سے ہوں' بس منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلتا ہوں۔" میں نے نقاہت زدہ آواز بنانے کی کوشش کی' پھر ان لوگوں کو دکھانے کے لئے لڑکھڑاتا ہوا باتھ روم سے باہر نکلا۔ شائی فو اور ڈاکٹر کے علاوہ وہی شخص کمرے میں موجود تھا جس نے مجھے زخمی کیا تھا۔ میں شاید نہ پہچانتا مگر شائی فو نے اسے پینسو کہہ کر مخاطب کیا تو مجھے علم ہوا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے زخمی کیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی گردن دبوچوں اور اس وقت

تک دباتا رہوں جب تک وہ مر ہی نہ جائے۔ وہ درمیانے قد اور بھینے ایسے گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا' سر گنجا اور جلد کی رنگت بالکل سیاہ تھی۔ چہرے سے وہ مجھے مقامی ہی لگ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

ڈاکٹر نے مجھے آرام سے لیٹنے کی تاکید کی اور میرا بلڈ پریشر چیک کرنے لگا۔ پنٹو اور شائی فو دونوں محتاط انداز میں کھڑے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میری ذرا سی غلط حرکت پر وہ بھڑک کر ریوالور نکال لیں گے۔ میں ان میں سے ایک کے جانے کا منتظر تھا۔ ایک آدمی پر قابو پانا آسان تھا۔ ڈاکٹر بے چارہ تو یوں بھی بے ضرر تھا۔

"بلڈ پریشر تو تقریباً نارمل ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اب انہیں صرف کمزوری ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ انجکشن تیار کرنے لگا۔

اس دوران میں ایک شخص ناشتا لے آیا تھا۔ ابلے ہوئے انڈے' مکھن' فریش اورنج اور ایپل جوس اور دودھ۔ میں نے اطمینان سے ناشتا کیا۔ جوس اور دودھ پینے کے بعد مجھے مزید توانائی کا احساس ہوا مگر اس وقت بھی کمرے میں پنٹو اور شائی فو دونوں موجود تھے۔ ممکن تھا کہ میں نتائج کی پروا کیے بغیر ہی ان دونوں سے الجھ پڑتا کہ وہی شخص نمودار ہوا جو ناشتا لے کر آیا تھا۔ اس نے شائی فو کو باس کے آنے کی اطلاع دی۔ شائی فو بہت عجلت میں کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی پنٹو نے ریوالور نکال لیا اور اکھڑ لہجے میں بولا۔ "اگر بھاگنے کا ارادہ ہے تو ابھی اس پر عمل مت کرنا ورنہ اس دفعہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکے گا۔" اس نے ریوالور اور انگلیوں میں گھمایا۔ "تیرے چہرے سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تو کچھ کرنے والا ہے۔"

مارے غصے کے میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے بھنا کر کہا۔ "ریوالور ہاتھ میں لے کر تو لڑکیاں بھی شیر ہو جاتی ہیں۔ تجھے اتنا زعم ہے تو ریوالور پھینک کر بات کر۔ میں بھی دیکھوں کہ تو کتنا بڑا سورما ہے۔"

"ریوالور کے بغیر بھی بات کروں گا مگر ابھی نہیں۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "ابھی تو مردوں سے بدتر ہے۔ اس حالت میں تجھے زیر کر کے مزہ نہیں آئے گا۔ ویسے تیری یہ حسرت کبھی نہ کبھی ضرور پوری کروں گا۔"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ شائی فو آ گیا اور مجھ سے بولا۔ "چلو خرم! تمہیں باس نے بلایا ہے"۔

میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے مجھے آگے چلنے کو کہا۔ شائی فو اور پنٹو میرے پیچھے چل رہے تھے۔ طویل کوریڈر طے کرنے کے بعد ہم باس کے کمرے میں پہنچے۔ باس کو دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ ایسا لگا کہ جیسے میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہو مگر کہاں دیکھا تھا؟ یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھی مشرق بعید ہی کے کسی ملک کا باشندہ

تھا۔اس کا چہرہ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھا' بھنویں بھی برائے نام تھیں اور چہرے سے وہ بالکل ابلے ہوئے آلو سا لگ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا اور بولا۔ "ویلکم مسٹر خرم! مجھے امید ہے کہ تمہیں یہاں بالکل تکلیف نہیں ہوئی ہوگی!"

"اگر کھوپڑی ٹوٹنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تو یقیناً مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

میری بات سن کر اس نے استفسار طلب نظروں سے شائی فو کو گھورا۔ وہ گڑبڑا کر بولا۔ "باس اسے قابو کرنے کے لیے پنٹو نے اس کے سر پر ضرب لگائی تھی۔"

"سوری مسٹر خرم! باس نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں تکلیف اٹھانا پڑی۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ پلیز بیٹھ جاؤ۔ ہم دوستانہ فضا میں گفتگو کریں گے۔" پھر وہ اپنے آدمیوں سے مخاطب ہوا۔ "تم لوگ باہر جاؤ۔"

میں آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ باس کمرے میں ٹہلتا رہا۔ تھوڑی دیر تک کھڑا رہنے سے مجھے چکر سے آنے لگے تھے۔ میری خوش فہمی دور ہو گئی تھی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بیٹھنے کے بعد میری حالت معمول پر آئی۔

"تم آخر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"پہلے مجھے ایک بات کا جواب دو۔" باس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر کہا۔ "تم وانگ یو کا کتنا احترام کرتے تھے؟"

"کرتا تھا نہیں بلکہ اب بھی کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ میرے لیے باپ کی طرح محترم ہیں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں اندزاہ لگانا چاہتا ہوں کہ تمہاری نظروں میں میری کیا حیثیت ہے؟ میں وانگ یو کا سب سے قریبی دوست ہوں۔ ہم دونوں برسوں ایک ساتھ رہے ہیں۔"

"تم سے پہلے بھی ایک شخص وانگ یو کا دوست ہونے کا دعویٰ کر چکا ہے مگر اس نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا' پھر میں کیسے یقین کروں کہ وانگ یو کا دوست میرا بھی دوست ہوگا؟"

"تمہیں کیسے یقین دلایا جا سکتا ہے؟" باس نے جلدی سے پوچھا۔

"تم نے جس اندزا سے مجھے بلایا ہے' وہ کوئی دوستانہ انداز نہیں ہے۔" میرا لہجہ سرد ہو گیا۔

میں نے ان کمبختوں کو تاکید کر دی تھی کہ تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس کے باجود اگر تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے تو اس نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی ہے اور اس کا انجام تم بہت جلد دیکھ لو گے۔"

"میں ایک صورت میں تمہاری بات پر یقین کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم میری

بہن شہلا کی تلاش میں میری مدد کرو۔" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ "اور بغیر کسی شرط کے۔"
"مجھے منظور ہے۔" باس نے کہا۔
"اور مجھ سے کبھی وانگ یو کی ان دستاویزات اور مائیکرو فلمز کا مطالبہ نہیں کرو گے جن کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ میرے پاس ہیں' حالانکہ وہ چیزیں سرے سے میرے پاس ہیں ہی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیا' اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔
وہ پرسکون لہجے میں بولا۔ "مجھے ان دستاویزات یا مائیکرو فلمز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' گو مجھے یقین ہے وہ چیزیں تمہاری ہی تحویل میں ہیں مگر میری طرف سے کبھی ان کا مطالبہ نہیں ہوگا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"
میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں سچائی کی جھلک موجود تھی۔ "پھر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے حیرانی سے اسے گھورا۔
"تمہارا سوال معقول ہے۔" باس مسکرا کر بولا۔ "اس مادی دور میں کوئی کسی سے خواہ مخواہ رشتہ نہیں جوڑتا' دوستی نہیں نبھاتا۔ میرا بھی کوئی مطلب ہے مگر میں زبردستی کام لینے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر تم راضی ہوئے تو کام کراؤں گا' تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں ہو گی۔"
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور شائی فو سمیت کمرے میں داخل ہوا۔
باس نے کرخت لہجے میں پنٹو سے کہا۔ کیا میں نے واضح طور پر ہدایت نہیں دی تھی' کہ خرم کو تکلیف نہیں پہنچنا چاہیئے؟ پھر تو نے خرم کو زخمی کیوں کیا؟
"زخمی ہوئے بغیر یہ کبھی قابو میں نہ آتا باس" پنٹو سہم کر بولا۔
"کس الو کے پٹھے نے کہا تھا کہ اسے قابو کرو۔ "میں نے صرف یہ کہا تھا کہ خرم کو یہاں لے آؤ۔"
"غلطی ہو گئی باس!" پنٹو کھسیایا۔
"اور تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں غلطی کبھی معاف نہیں کرتا۔"
"باس پلیز مجھے ایک موقع اور دے دیں۔" پنٹو اچانک باس کے قدموں میں گر پڑا۔
"میں وعدہ کرتا ہوں کہ ----"
اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیوں کہ باس نے اس کے سینے پر اتنی زور دار لات ماری کہ وہ اچھل کر دور جا گرا اور ذبح کیے ہوئے مرغ کی طرح تڑپنے لگا۔ پھر اس نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے باس نے سرد لہجے میں شائی فو سے کہا۔ "اسے یہاں سے لے جاؤ اور اگر یہ مر نہ ہو تو اس کی مشکل آسان کردو۔"
"آپ کی اس کک سے کوئی بچ سکتا ہے باس! شائی فو نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"بکو مت!" باس نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ "فضول گفتگو سے پرہیز کیا کرو' اٹھاؤ اسے۔"

شائی فو نے جھک کر پنٹو کو اٹھا لیا ایسا لگ رہا تھا کہ اگر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر ہو گئی تو باس اسے بھی جہنم رسید کر دے گا۔ وہ اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد باس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولا۔ "شائی فو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ میری اس بھرپور کک کے بعد زندہ بچنا محال ہے۔"

"یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کمال تو یہ ہے کہ مقابل بھی اتنا ہی طاقت ور ہو اور اسے لڑتے ہوئے ناک آؤٹ کیا جائے۔"

ایک لمحے کو باس کا چہرہ تمتما کر رہ گیا۔ شاید اسے مری بات بہت بری لگی تھی' پھر وہ سنبھل کر بولا۔ "حکم عدولی کرنے والوں کو میں کبھی معاف نہیں کرتا۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ تم آخر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے دوبارہ اسے کریدنا چاہا۔

"پہلے میں تمہاری بہن کو تلاش کروں گا تاکہ تمہیں میری نیک نیتی کا یقین آ جائے۔ اس کے بعد ہی کوئی بات ہو گی۔"

"کیا میں خود کو تمہارا قیدی سمجھوں؟" میں نے پھر طنز کیا۔

"میں نے تم کو اپنا دوست سمجھا ہے خرم!" باس نے شکایت بھرے انداز میں کہا۔ "تم میرے قیدی کیسے ہو سکتے ہو؟ ہاں ایک بات کا خیال رکھنا اپنا ٹھکانہ تبدیل کرنے سے پہلے مجھے اطلاع ضرور کرنا۔" یہ کہتے ہوئے وہ میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ "میں تمہاری بہن کی تلاش آج ہی سے بلکہ ابھی سے شروع کرا دیتا ہوں۔"

"تو پھر میں جاؤں۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"بہتر یہ ہے کہ تم اپنے کسی ساتھی کو یہاں بلا لو' اکیلے نہ جاؤ تو بہتر ہے۔" "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں خود ہی چلا جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔

"اوکے گڈ بائے مسٹر خرم!" باس نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ "اب دوبارہ اس وقت ملاقات ہو گی جب تمہاری بہن کا سراغ مل جائے گا۔"

○

میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ تیز تیز چلنے سے میرے سر میں دھمک ہو رہی تھی۔ سڑک پر آ کر میں نے ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ نہ جانے کس مصلحت کے پیش نظر باس نے مجھے اپنی گاڑی میں گھر نہیں بھجوایا تھا۔ میں نے غور سے اس علاقے کا جائزہ لیا۔ نہ جانے وہ کون سا علاقہ تھا میں نے ذہن پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کراچی کے بے شمار

علاقے ایسے تھے جو میں نے بالکل نہیں دیکھے تھے۔ اچانک مجھے ایک ٹیکسی نظر آ گئی' ڈرائیور نے ڈیفنس چلنے کو کہا تو وہ حیرت سے تکنے لگا اور بولا۔ "کیوں مذاق کرتے ہیں صاحب؟ آپ ڈیفنس ہی میں کھڑے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ "میرا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ مجھے ڈیفنس ہی جانا ہے۔ اگر تم راضی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں کوئی اور ٹیکسی دیکھتا ہوں۔"

"نہیں صاحب۔" ٹیکسی ڈرائیور جلدی سے بولا۔ "میں آپ کو ضرور لے جاؤں گا۔ آپ زخمی بھی ہیں۔"

میں گھر پہنچا تو ہر شخص پریشان تھا۔ خاص طور کلارا بہت زیادہ پریشان تھی۔ ان سب نے مجھے گھیر لیا برڈ نے کہا۔ "اگر تو ہم سے اتنا ہی بیزار ہو گیا ہے تو یونہی کہہ دے ہم خود ہی چلے جائیں گے۔"

"ارے یار میری بات بھی تو سنو۔" میں نے جھنجھلا کر کہا' پھر بلا کم و کاست انہیں اپنی داستان سنا دی۔

"یار ' ان لوگوں کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟" برڈ پر خیال انداز میں بولا۔" بہرحال تم آرام کرو' اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔"

میں خود بھی آرام کرنا چاہ رہا تھا مجھے امید نہیں تھی کہ ان لوگوں سے اتنی جلدی گلو خاصی مل جائے گی۔ برڈ کی بات سنتے ہی میں جھپٹ کر اٹھا تو مجھے زور سے چکر آیا۔ مگر میں نے ان لوگوں کو محسوس نہ ہونے دیا اور تیزی سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

مجھے بالکل نارمل ہونے میں پندرہ دن لگے گئے۔ اس دوران میں میرے ہر ساتھی نے میرا بڑا خیال رکھا۔ کلارا نے تو مجھے بستر سے قدم نہ اتارنے دیا۔ مجھے ضرورت نہیں تھی اس کے باوجود کلارا میری پٹی سے لگی رہی۔ میں کروٹ بھی بدلتا تو وہ لپک کر میرے نزدیک پہنچ جاتی۔ صحت یاب ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ شہلا کو اپنے طور پر تلاش کروں گا اور اس کا آغاز ناظم آباد سے کروں گا کیوں کہ وہ شخص ناظم آباد میں ہی رہتا تھا جو شہلا کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

میرا رخ ایک مرتبہ پھر ناظم آباد کی طرف تھا۔ میرے ساتھ برڈ اور کلارا دونوں ہی تھے۔ میں نے ناظم آباد پہنچ کر گاڑی ایک محفوظ جگہ پارک کی اور گاڑی سے اترنا چاہ رہا تھا کہ میری گاڑی کے برابر میں ایک مرسڈیز آکر رکی اور اس میں سے باس نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر میں بھی گاڑی سے باہر آگیا۔ باس مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "میں نے کہا تھا ناکہ تم سے دوسری ملاقات اس وقت ہوگی جب میرے پاس شہلا کا کوئی سراغ ہوگا۔"

"واقعی؟" میں چیخ کر بولا۔ "جلدی بتاؤ کہاں ہے شہلا؟" "چلو گھر چلو' وہیں چل کر بات

کریں گے۔" باس نے کہا۔

"کون سے گھر کی بات کر رہے ہیں آپ؟" برڈ نے پہلی مرتبہ منہ کھولا۔ وہ نہ جانے کس وقت گاڑی سے اتر کر میرے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں اس گھر کی بات کر رہا ہوں جہاں آپ لوگ مقیم ہیں۔"

"اپنے گھر لے جانے میں کیا قباحت تھی آپ کو؟" کلارا نے بھی گفتگو میں حصہ لینا ضروری سمجھا۔

"کوئی قباحت نہیں ہے۔" باس نے سرد لہجے میں کہا۔ "مگر شاید خرم وہاں جانا پسند نہ کرے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پھر ہم آگے پیچھے اسی بنگلے پر پہنچے جہاں میں پہلے بھی رہ چکا تھا۔ کال بیل کے جواب میں شائی فو نے گیٹ کھولا۔ باس اپنی گاڑی اندر لے گیا۔ برڈ نے اندر جانے کی بجائے وہیں ایک طرف گاڑی پارک کر دی۔ ہم تینوں گاڑی سے اتر کر اندر داخل ہوئے۔ مجھے دیکھ کر شائی فو خوش دلی سے مسکرایا اور لپک کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔

"سر' باس کا حکم ہے کہ کوئی شخص مسلح ہو کر اندر نہیں جائے گا۔ آپ لوگوں کے پاس کوئی ہتھیار ہے تو خود ہی نکال کر رکھ دیں۔"

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ برڈ بھی معنی خیز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا' پھر اس نے آنکھ کے اشارے سے ریوالور پھینکنے کو کہا۔ میں نے خاموشی سے اپنے دونوں ریوالور نکال کر شائی فو کو دے دیے۔ برڈ کے پاس ایک ہی ریوالور تھا' اس نے بھی وہ شائی فو کے حوالے کر دیا۔ کلارا کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

پھر ہم شائی فو کی رہنمائی میں اندر پہنچے۔ میں نے شائی فو کے اشارے پر جونہی ہال کمرے میں داخل ہوا' اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ برڈ بھی ساکت تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ کمرے میں باس کے ساتھ ایک شخص اور موجود تھا۔ میں اور برڈ اسے ہزاروں میں شناخت کر سکتے تھے۔ وہ کوئی اور نہیں مسٹر او تھا۔ وہی مسٹر او جسے ہم نے ایرانی خفیہ محکمے ساوک کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بہت طنزیہ انداز میں ہمیں گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے میرا مضحکہ اڑا رہا ہو۔ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔ "ہیلو مسٹر خرم! کیا حال ہے؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور بھنا کر باس کی طرف گھوما۔ "یہ ہے تمہاری دوستی؟ میں تو شروع ہی سے تم پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ آخر تم لوگ دوستی کا نام کیوں بدنام کرتے ہو؟"

"کسی بھی معاملے میں اتنی عجلت مناسب نہیں ہوتی خرم!" باس نے گونج دار آواز میں

کہا "ذرا صبر و سکون سے میری بات سنو۔"

"اب کیا رہ گیا ہے سننے کو!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ میرا دشمن تمہارے ساتھ موجود ہے۔"

"کیا تم اپنی بہن سے ملنا نہیں چاہتے؟" باس نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔

بہن کے تذکرے پر میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "گویا اب تم بھی بلیک میل کرو گے!"

"میں تمہیں کیوں بلیک میل کروں گا اور کیسے کروں گا؟" باس نے حیرت سے کہا۔

میں ان پے در پے دھچکوں سے اتنا اکتا گیا تھا کہ اچانک ہی میں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ میں نے مسٹر او کو مخاطب کیا۔ "سنو مسٹر! اگر شہلا کو مجھ سے ملوا سکتے ہو تو ملوا دو۔ اس کے عوض ــــــ"

"خرم!" باس چیخ کر بولا "فضول باتوں سے پرہیز کرو۔" اس کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔

شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ شہلا کے عوض میں اسے وانگ یو کی دستاویزات اور مائیکرو فلمز دینے کی بات کرنے والا ہوں۔

"ہاں مسٹر او۔" برڈ نے کہا "اس کے عوض ہم تمہیں اتنی دولت دیں گے کہ تم نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔"

"تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے صرف وانگ یو کے سامان سے دلچسپی ہے۔" مسٹر او نے کہا۔

"اور وہی ہمارے پاس نہیں ہے۔" برڈ نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے شہلا کو بھول جاؤ۔"

اس کی بات پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی تو میں نے کہا۔ "یار، تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے شہلا تمہاری تحویل میں ہے۔"

"نہیں ہے تو کل تک آ جائے گی۔ مسٹر او نے پر یقین لہجے میں کہا۔

"اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔" برڈ نے ہنس کر کہا۔

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ شہلا کس کی تحویل میں ہے۔" باس نے کہا، پھر چونک کر مسٹر او سے بولا۔ "تم نے اپنی تسلی کر لی! اب یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں خرم کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ "تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے خرم کسی بکری کے بچے کا نام ہے۔" میرا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔

"زیادہ اونچا اڑنے کی کوشش مت کرو خرم!" مسٹر او تپے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اگر یہ

مجھے اجازت دے دیں تو میں تمہیں بکری کے بچے ہی کی طرح ہانکتا ہوا لے جاؤں۔"

"میں تمہیں اجازت دے رہا ہوں کہ اٹھاؤ اور مجھے لے جاؤ۔"

مسٹر او نے بھنا کر باس کی طرف دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مسٹر او غصے میں اپنی ہی بوٹیاں نوچنے لگے گا۔

میں نے اسے چڑانے کو کہا۔ "بار بار باس کی طرف مت دیکھو۔ باس کیا تمہارا سرپرست ہے جو تمہیں اس کی اجازت کی ضرورت ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھ سے خوف زدہ ہو۔ اس سے پہلے بھی تو تم مجھے آزما چکے ہو۔"

"اسے لگام دو اکونو!" اس نے دہاڑ کر باس کو مخاطب کیا۔

"خرم پلیز خاموش ہو جاؤ۔" باس نے کہا۔

"میں نے اس سے پہلے خرم کو نقصان اس لیے نہیں پہنچایا کہ میں اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا لیکن اب میں اس کا خیال نہیں کروں گا۔ اگر یہ کچھ دن مزید زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس سے کہو کہ اپنی زبان بند رکھے ورنہ میں تمہارا بھی خیال نہیں کروں گا۔" مسٹر او کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔

"سنو! مسٹر!" باس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "تم ماضی میں میرے دوست رہ چکے ہو۔ اسی وجہ سے میں نے تمہارے ساتھ تعاون کیا اور تمہیں خرم سے ملا دیا۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں چلا جانا چاہیے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم خرم کو میرے ساتھ نہیں بھیجو گے؟" مسٹر او نے سخت لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے۔" باس نے جواب دیا۔ "میں خرم کو کسی بھی قیمت پر تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔ اب ختم کرو اس موضوع کو!"

"تم کیا کہتے ہو خرم؟" مسٹر او نے کہا۔ "میرے ساتھ چلو گے یا نہیں؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" مسٹر او نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم شہلا سے نہیں ملنا چاہتے۔"

"یہ بات بھی بہت پرانی ہو چکی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "شہلا کے نام پر مجھے بار بار بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ شہلا میرے قبضے میں ہے۔" مسٹر او نے کہا۔

"کہتے رہو۔" میں نے بیزاری سے کندھے اچکائے۔ اب تو جب تک میں شہلا سے خود نہیں مل لوں گا، مجھے یقین نہیں آئے گا۔"

"سنو خرم!" مسٹر او جاتے جاتے بولا۔ "اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تم سے

خوف زدہ ہوں۔ میں جب چاہوں تمہیں اٹھوالوں۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے۔ تم لوگ نہیں چاہتے ہو نہ سہی!" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

"معاف کرنا خرم!" باس ندامت سے بولا۔ "میں نے صرف مسٹر او کی وجہ سے تم لوگوں کے ہتھیار رکھوائے تھے میں اسے بھی غیر مسلح کر چکا تھا۔ وہ تمہارے پاس ہتھیار دیکھتا تو برا مانتا۔" باس حسب عادت کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ "مگر تم لوگوں کو بہت زبردست احتیاط کی ضرورت ہے۔ مسٹر او بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"مجھ سے زیادہ خطرناک نہیں ہوگا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"دیکھو میں باتوں میں بالکل بھول گیا ہم نے شہلا کا سراغ لگا لیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" میں نے سرتعش لہجے میں پوچھا۔ میرا دل اچانک زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ "تمہیں معلوم تھا تو تم اتنی دیر سے خاموش کیوں تھے؟"

"میں اسی لیے تمہیں گھر لایا تھا۔ یہاں غیر متوقع طور پر مسٹر او سے سامنا ہوگیا۔ کئی دن پہلے اس سے ملاقات ہوئی تھی تو تمہارا ذکر آگیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ خرم سے ضرور ملواؤں گا۔ اس زمانے میں تم زخمی تھے اس لیے میں نے تمہیں نہیں چھیڑا۔"

"ایک بات ہے۔" برڈ نے اچانک دخل اندازی کی۔ "اگر مسٹر او کو معلوم ہوگیا کہ شہلا کہاں ہے تو وہ اسے اغوا کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔"

"بات تو درست ہے تمہاری۔" باس فکر مندی سے بولا' پھر اس نے شائی فو کو طلب کیا اور اس سے کہا "تم اپنے ساتھ کچھ آدمی لے کر فوراً جاؤ اور اس لڑکی کو یہاں لے آؤ۔" شائی فو جانے لگا تو باس نے کہا "سنو' اگر مقابلہ کرنا پڑے تو گھبرانا مت اور کسی قسم کی رعایت بھی نہ کرنا۔"

"ٹھہرو' میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

شائی فو جاتے جاتے رک گیا۔ اس نے سوالیہ انداز میں باس کی طرف دیکھا۔

"باس پلیز! مجھے اس کے ساتھ جانے دو۔" میں نے خوشامد کی۔

"چلو پھر میں بھی چلتا ہوں۔" باس نے اچانک ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں جاتا تو بھلا برڈ کیسے رہ جاتا۔ وہ تو مجھ سے بھی پہلے جانے کو تیار تھا۔ میں نے کلارا کو واپس گھر بھیجنا چاہا مگر وہ جھاڑ کا کانٹا ہو کر لپٹ گئی۔ یوں اسے بھی ساتھ لینا پڑا۔

اتنے زیادہ لوگ دیکھ کر باس نے گاڑی کی بجائے کوسٹر دین استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسٹیرنگ شائی فو کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ ہماری وین اب کورنگی کے صنعتی علاقے سے گزر رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ شہلا وہیں کسی کوارٹر میں مقیم

ہوگی۔

مگر اس وقت میرے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے جب شائی فو نے کوسٹر کسی فیکٹری کے سامنے روکی۔ فوراً ہی دربان نما ایک شخص نے ذیلی کھڑکی سے جھانکا' پھر شائی فو کو دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔

"ہم سب گاڑی سے اترنے کے بعد ایک ایک کر کے اندر کی طرف بڑھے۔ سب سے آگے باس تھا۔ شائی فو اور اس کے آدمی باہر ہی رک گئے تھے۔ وہ کوئی متروک ٹیکسٹائل مل تھی۔ کمرے سے ہم ایک وسیع و عریض ہال میں نکلے جہاں اب بھی کچھ ناکارہ مشینیں موجود تھیں۔ اس ہال کے بعد چھوٹی سی ایک راہداری تھی' پھر کچھ کمرے تھے۔

انہی میں سے ایک کمرے کی طرف میں لپکا۔ اس کا دروازہ جوپٹ کھلا ہوا تھا۔

"کھیل بگڑ گیا۔ باس کمرے میں داخل ہو کر بڑبڑایا۔ وہ لوگ شہلا کو یہاں سے لے گئے۔"

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں نے دیوانہ وار کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کمرے میں دو تین کرسیاں "اور ایک بیڈ موجود تھا۔ بیڈ پر ایک زنانہ دوپٹا بھی موجود تھا۔ میں نے وہ دوپٹا اٹھالیا اور اسے چوم کر دل ہی دل میں عہد کیا کہ یا تو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر شہلا کو ان لوگوں کے چنگل سے چھڑا لوں گا یا ان سب کو جہنم رسید کر کے اپنی جان بھی دے دوں گا۔

میں نے باس سے پوچھا۔ "وہ لوگ شہلا کو کہاں لے گئے ہوں گے۔ بہر حال آؤ دیکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

ہم سب بہت ہی مایوس مایوس لوٹ آئے۔ باس خود بھی بہت فکر مند تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے دو تین جگہ فون کیا' پھر مجھ سے بولا۔ "خرم شہلا مسٹر او کے قبضے میں ہے۔ اس مردود نے وہی پرانی شرط رکھی ہے کہ وانگ یو کی دستاویزات اور مائیکرو فلمز سے شہلا کا تبادلہ کر لو۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ خرم کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں مگر اس کی ایک ہی رٹ ہے کہ ـــــ"

"وہ چیزیں میرے پاس ہیں۔" برڈ نے اچانک کہا۔ مسٹر او سے کہو' وہ دو گھنٹے کے اندر اندر شہلا کو یہاں لے آئے۔ میں وہ تمام چیزیں اس کے حوالے کر دوں گا۔"

میرا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

برڈ نے میرا شانہ تھپ تھپایا اور بولا "چلو خرم' دو گھنٹے بعد آ کر شہلا کو لے جائیں گے۔"

ہم لوگ جلد ہی دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اپنی گاڑی میں جا بیٹھے۔ اسٹیئرنگ کلارا نے سنبھال لیا۔ پھر اس نے ایسی طوفانی انداز میں ڈرائیونگ کی کہ میں حیران رہ گیا۔ میں نے

اسے پہلی دفعہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اس کی خوف ناک ڈرائیونگ کی تعریف کی تو اس نے رفتار مزید بڑھاتے ہوئے انکشاف کیا کہ میں کئی دفعہ موٹر سائیکل اور کار ریس میں حصہ لے چکی ہوں۔

"لاؤ خرم 'کہاں ہیں وہ دستاویزات اور مائیکرو فلم؟"

"تو کیا تم واقعی انہیں مسٹراو کے حوالے کر دو گے؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ میں نے کب کہا۔" برڈ نے کہا "میں ان چیزوں کی نقل تیار کروں گا تاکہ پہلی نظر میں مسٹراو دھوکا کھا جائے۔"

"وہ اتنا احمق نہیں ہے برڈ۔" میں نے کہا۔ "وہ پہلی فرصت میں ان چیزوں کا جائزہ لے گا اور ہمارا فراڈ کھل جائے گا۔"

"کھل جانے دو۔" برڈ نے اطمینان سے کہا "ہمارا مقصد شہلا کو حاصل کرنا ہے۔ شہلا وہاں موجود ہوگی' بس اصل مسئلہ اسے وہاں سے نکالنا ہے۔"

"یہی تو اصل مسئلہ ہے" میں نے جواب میں دیا۔

"تو پرابلم!" برڈ نے ہنس کر کہا۔ "بس ایک دفعہ شہلا ہمیں مل جائے' پھر دیکھیں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "خرم! تم جا کر وہ چیزیں لے آؤ۔ جب تک میں کمانڈو ایکشن کی تیاری کرتا ہوں۔"

اسٹیئرنگ ایک مرتبہ پھر کلارا کے ہاتھ میں تھا۔ ہمیں جانے اور آنے میں مشکل سے چالیس منٹ لگے۔ ہم تیس منٹ میں بھی لوٹ سکتے تھے مگر میں نے ہی کلارا کو گاڑی زیادہ تیز نہ چلانے دی۔ میرے تمام ساتھی تیار بیٹھے تھے۔ برڈ اور رضا ہر طرح سے مسلح تھے۔ تہمینہ اور رضوانہ بھی تیار تھیں۔

○

برڈ نے تمام "چیزیں" مجھ سے لے کر دیکھیں۔ دستاویزات بڑے سے ایک خالی لفافے میں تھیں اور مائیکرو فلمز چمڑے کے ایک چھوٹے سے کیس میں۔ برڈ نے ایک دوسرا کیس نکالا' پرانا کیس خالی کیا اور اس کی فلمیں نئے کیس میں ڈال کر میرے حوالے کر دیا' پھر ویسا ہی ایک خالی لفافہ لیا' اس میں پرانا اخبار رکھ کر اسے سیل بند کر دیا۔

پھر ہم سب دو گاڑیوں میں روانہ ہو گئے۔ دوسری گاڑی چند روز پہلے رضا لے کر آیا تھا۔ مطلوبہ بنگلے سے کافی فاصلے پر ہم نے اپنی گاڑیاں چھوڑ دیں اور پیدل ہی بنگلے کی طرف روانہ ہوگئے۔ برڈ نے ان سب کو باہر رہنے کی تاکید کی تھی۔ اندر صرف ہم لوگوں کو داخل ہونا تھا۔ اصلی دستاویزات اور مائیکرو فلمیں میں نے اپنی گاڑی میں ہی چھپا دی تھیں۔

ہم بنگلے میں داخل ہوئے تو پورچ میں شائی فو موجود تھا مگر اس مرتبہ ہم تلاشی دینے

کے موڈ میں نہیں تھے۔ اس نے تلاشی لینے پر اصرار بھی نہیں کیا۔

ہال کمرے میں مسٹر او اور باس موجود تھا۔ وہ دونوں ہمیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مسٹر او نے بے ساختہ کہا۔ "لے آئے وہ دستاویزات؟" جی ہاں' لے آیا۔ "میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"لاؤ وہ میرے حوالے کر دو۔"

"تمہارے ہی حوالے کروں گا مگر شہلا کہاں ہے؟ شہلا کو بلاؤ اور اس ہاتھ دے' اس ہاتھ لے' کے مصداق یہ دستاویزات لے جاؤ اور شہلا کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"بہت ضدی ہو تم لوگ!" مسٹر او نے خوش دلی سے کہا۔

دستاویزات دیکھتے ہی وہ بے انتہا خوش ہو گیا تھا' خوشی اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھ کر رقص شروع کر دے۔ میں جانتا تھا کہ اس کی یہ خوشی عارضی ہے۔ جب اسے حقیقت کا علم ہو گا تو وہ پاگل ہو جائے گا مگر مجھے یہ اطمینان تھا کہ یہاں اس کے زیادہ ساتھی موجود نہیں ہیں' اس لیے وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ کسی سے کہنے کی بجائے خود ہی شہلا کو بلانے اندر دوڑ گیا تھا۔

فوراً ہی وہ لوٹا تو اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جو سر جھکائے چل رہی تھی۔

اسے دیکھا تو بے اختیار میرے دل نے کہا' یہی شہلا ہے۔

"لاؤ وہ دستاویزات میرے حوالے کرو۔" مسٹر او نے کہا۔ "اور شہلا کو سنبھالو۔"

"شہلا! میں نے بے تابی سے اسے آواز دی۔

لڑکی نے اچانک سر اٹھایا تو میں سناٹے میں آ گیا۔ وہ شہلا نہیں تھی۔

"دھوکا۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو میں دھوکا کھا جاؤں گا!"

مسٹر او آہستہ آہستہ پیچھے کھسک رہا تھا۔ وہ کمرے سے بھاگ نکلنے کے چکر میں تھا۔ اس کا ارادہ بھانپ کے میں نے ایک چھلانگ لگائی اور اسے دبوچ لیا۔

"شہلا کہاں ہے؟" میں نے اس کی گردن پر دباؤ ڈالا۔ دیکھو' اگر آج مجھے شہلا نہ ملی تو میں اس شہر کو خون میں نہلا دوں گا۔ میں صرف تین تک گنوں گا۔ اگر تم نے مجھے شہلا کے بارے میں نہ بتایا تو تمہاری گردن توڑ دوں گا۔" میرا لہجہ اتنا سرد اور سفاک تھا کہ مسٹر او جیسا آدمی بھی سہم کر رہ گیا۔ میں نے پشت سے اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی اور گنتی شروع کر دی۔" ون---- اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھایا۔ "ٹو ----" میں نے پوری قوت سے اس کی گردن تھام لی' بس اب مجھے زوردار جھٹکا دینے کی ضرورت تھی' پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتا۔

تھری کہنے ہی والا تھا کہ مسٹر او گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "شہلا اس بنگلے کے ایک کمرے میں موجود ہے۔"

"کس کمرے میں؟" میں نے اس گردن پر دباؤ کچھ کم کر دیا۔

باس اس دوران میں بالکل خاموشی سے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ مسٹر او کی بات سن کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ مسٹر او نے کہا۔ "جلدی کرو خرم! باس شہلا کو وہاں سے نکالنے گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے" وہ شہلا کو لے کر یہیں آئے گا۔"

"وہ یہاں نہیں آئے گا۔" مسٹر او نے مایوسی سے کہا۔

"وہ تم لوگوں کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ میں تمہیں ساری بات بتا دوں گا مگر یہ وقت بحث کا نہیں ہے۔"

اس کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی برڈ کمرے سے نکل گیا۔

"تم خود جاؤ خرم! مسٹر او نے زور دے کر کہا۔" وہ برڈ کے قابو میں نہیں آئے گا۔"

میں عجب شش و پنج میں پڑ گیا تھا اور فیصلہ نہیں کر رہا تھا کہ مسٹر او کو چھوڑ کر باس کے پیچھے جاؤں یا یہیں رک کر برڈ کا انتظار کروں۔

"میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' پھر اچانک مسٹر او کو ناک آؤٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاکہ اس کی وجہ سے مزید کوئی پریشانی کھڑی نہ ہو۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ کر اچانک کن پٹیاں پکڑ لیں۔ میں نے کن پٹی پر دباؤ ڈالا تو مسٹر او بے ہوش ہو کر میرے ہاتھوں پر جھول گیا۔

میں پھرتی سے باہر نکل آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرف جاؤں۔ اس کوریڈور میں آمنے سامنے تین تین کمروں کے دروازے تھے۔

اچانک ایک کرب آمیز چیخ وہاں گھٹ کر رہ گئی۔

○

میں دیوانہ وار اس کمرے کی طرف لپکا جہاں سے چیخ کی آواز آتی محسوس ہوئی تھی۔
چیخ ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ اس دفعہ آواز واضح طور پر دائیں طرف کے تیسرے کمرے سے آئی تھی۔ میں بلی کی طرح دبے پاؤں' اس طرف بڑھا اور دیوار کے ساتھ چپک کر کمرے میں جھانکنا چاہا۔ اسی وقت گردن سے کوئی سخت اور سرد سی چیز ٹکرائی اور کوئی سخت لہجے میں بولا "لیس مسٹر خرم! زیادہ اچھل کود کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
وہ آزاد شائی فو کی تھی۔ گویا مسٹر او کی تمام باتیں درست تھیں۔ باس مجھے ڈبل کراس کر رہا تھا۔ لیکن وہ وقت باس کی گھٹیا اور غیر اخلاقی حرکات پر غور کرنے کا نہیں تھا۔
میں اچانک بیٹھ گیا' نہ صرف بیٹھا بلکہ بیٹھتے بیٹھتے بیک کک گھمادی جو شائی فو کے پیٹ میں لگی اور جھٹکے سے اس کا ریوالور ہاتھ سے نکل گیا۔ ریوالور گرتے ہی اس نے مجھ پہ چھلانگ لگائی اور میری بجائے سامنے والی دیوار سے ٹکرایا۔ ٹکرانے سے اس کے سر میں اچھی خاصی چوٹ لگی تھی مگر وہ دوسرے ہی لمحے سنبھل گیا اور فرش پر بیٹھے ہی بیٹھے اس نے زور سے لات گھمائی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا وار خالی گیا۔ اگر میں فوراً ہی اپنا چہرہ بچا نہ لیتا تو اس کی زور دار کک سے میری جبڑا ضرور ٹوٹ جاتا۔ وہ کم بخت بلا کا فائٹر تھا۔ اتنی مدت بعد مجھے لڑنے میں مزہ آ رہا تھا مگر اس سے زیادہ لطف اندوز ہونے کا وقت نہیں تھا۔ وہ کسی طرح میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا' الٹا میں زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے برڈ کی بھی فکر تھی۔ وہ بیچارہ نہ جانے کہاں الجھا ہوا تھا۔ اچانک شائی فو میری بیک کک کی زد میں آ گیا۔ وہ میرا سب سے خوف ناک وار تھا۔ لات اس کے منہ پر پڑی۔ میں لٹو کی طرح گھوم گیا۔ میری دوسری کک نے اسے زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے گرنے کے بعد میں نے احتیاط کے طور پر اس کی کن پٹی پر جچا تلا ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر میں ایک مرتبہ پھر کمرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہاں اب بالکل سناٹا تھا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکال کر محتاط اندزا میں ' ارد گرد کا جائزہ لیا' کمرے میں بالکل سناٹا تھا۔ ایک کونے میں کوئی گٹھڑی بنا ہوا پڑا تھا۔ میں لپک کر اس کے نزدیک پہنچا۔ وہ آدمی میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اس کے سینے میں دل کے مقام پر باریک پھل والا ایک خنجر دستے تک پیوست تھا۔ خنجر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ برڈ کا شکار ہے مگر برڈ خود کہاں تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا

اور خنجر کا دستہ رومال سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ مرنے والے کا جسم ابھی تک گرم تھا۔ خنجر نکلتے ہی اس کے سینے سے خون کی موٹی سی دھار بہہ نکلی۔ میں نے خنجر اسی کے کپڑوں سے صاف کیا اور احتیاط سے اپنی پنڈلی پر باندھ لیا۔

اچانک میری نظر کمرے کے دائیں کونے پر پڑی۔ وہاں فرش میں مجھے چوکور خلا نظر آیا۔ نزدیک جانے پر معلوم ہوا کہ کسی تہہ خانے کا راستہ ہے۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا' پھر اس خلا میں اتر گیا۔ اندر سیڑھیاں تھیں۔ میں ان سیڑھیوں کے ذریعے نیچے پہنچا۔ نیچے بھی بالکل ویسا ہی ایک کوریڈور تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ بہ یک وقت دو آدمی مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ میں نے چشم زدن میں انہیں ناک آوٹ کر دیا۔ اسکے بعد میں پھر تذبذب میں پڑ گیا کہ اب کس طرف جاؤں۔ وقت بہت کم تھا۔ مجھے مسٹر او کی طرف سے بھی خطرہ تھا کہ وہ کہیں ہوش میں نہ آ جائے۔ آخر میں نے ہر کمرے کا جائزہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی ارادے سے میں نے سب سے پہلے کمرے کا دروازہ دھکیلا' دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اس میں سوائے کاٹھ کباڑ کے کچھ نہ تھا۔ دوسرا کمرا بھی خالی تھا۔ میں تیسرے کمرے کا دروازہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ میرے کانوں میں باس کی آواز آئی۔ "اسے باندھ کر یہیں ڈال دیں۔ اس کے بعد خرم کی خبر بھی لینا ہے۔"

"میں نے کی ہول میں سے جھانکا' اندر باس اور اس کے دو ساتھیوں نے برڈ پر ریوالور تان رکھے تھے' پھر ان میں سے ایک آدمی رسی لے کر برڈ کو باندھنے لگا۔ اس نے برڈ کو نہایت مضبوطی سے باندھ کر کونے میں ڈال دیا' پھر وہ تینوں دروازے کی طرف بڑھے۔ میں دیوار سے بالکل چپک کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے باس باہر نکلا' پھر اس کے دونوں ساتھی باہر آئے۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر سیدھے نکلتے چلے گئے۔ ان کے نکلتے ہی میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر برڈ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں نے پھرتی سے خنجر نکالا اور آناً" فاناً" برڈ کی رسیاں کاٹ دیں۔ آزاد ہوتے ہی وہ جلدی سے بولا۔ "جلدی کرو خرم' یہاں سے نکلو ورنہ ہم چوہے دان میں پھنس کر رہ جائیں گے۔"

"مگر شہلا کہاں ہے؟" میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"شہلا!---- ہاں---- وہ باتھ روم میں ہے۔ باس نے اسے باندھ کر باتھ روم میں ڈال دیا تھا۔" اس نے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا جہاں مجھے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ باتھ روم کا دروازہ تھا۔

میں لپک کر اس دروازے تک پہنچا۔ میرے ساتھ ساتھ برڈ بھی تھا۔ باتھ روم کے وسط میں کوئی لڑکی اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ اور لمبے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے جھپٹ کر اسے سیدھا کیا۔ لمحے بھر کو مجھے ایسا لگا جیسے امی میرے سامنے

ہوں' ویسی ہی ستواں ناک' ویسی ہی سرخ و سفید رنگت اور روشن پیشانی! میں نے پہلے اس کے ہاتھ اور پاؤں کھولے' پھر آہستہ آہستہ اسے آوازیں دیں۔ "شہلا آنکھیں کھول گڑیا۔ شہلا!"

"خرم ' فی الحال یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ شہلا کو بعد میں بھی ہوش آ سکتا ہے۔" برڈ نے عالم اضطراب میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

میں نے شہلا کو کندھے پر اٹھایا اور برڈ کے ساتھ باہر نکل آیا۔ برڈ نے مجھ سے وہیں ٹھہرنے کو کہا اور خود صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ میں شہلا کو لے کر کاٹھ کباڑ والے کمرے میں چھپ گیا۔ وہاں ٹوٹا پھوٹا ایک صوفہ سیٹ بھی پڑا تھا میں نے وہیں شہلا کو لٹا دیا۔

شہلا کو لٹانے کے بعد میں کمرے سے باہر آیا تو مجھے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر برڈ دکھائی دیا۔ وہ مجھے اوپر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس نے اشاروں میں بتایا کہ شہلا کو لے کر آؤ۔ میں پھر کمرے میں چلا گیا۔ شہلا ابھی تک ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ اسے کندھے پر اٹھا کر میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں نے احتیاط کے طور پر ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ مجھ سے آگے برڈ تھا۔ وہ چیتے کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھا' تہ خانے کے دروازے میں سے باہر جھانکا' پھر آہستگی سے اوپر چڑھ گیا۔ میں بھی شہلا سمیت اوپر آ گیا۔ مجھے باس کی یہ خاموشی بہت غیر فطری لگ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے باس اور اس کے ساتھی میری گھات میں بیٹھے ہوں۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ جو بھی میری راہ میں مزاحم ہوا' اسے دیکھتے ہی گولی مار دوں گا۔ مجھے شہلا کی طرف سے بہت پریشانی تھی۔ اسے لے کر میں تیزی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح مین گیٹ تک پہنچ جاؤں۔ ہم دونوں دیوار سے چپکے ہوئے ' پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بڑھ رہے تھے' یوں چند گز کا فاصلہ انتہائی طویل ہو گیا تھا۔

برڈ چلتے چلتے رک گیا۔ کوریڈور کے اختتام پر باہر کی طرف کار پورچ تھا۔ وہاں ہمارے لیے زیادہ خطرہ تھا کیوں کہ وہاں ہم بالکل غیر محفوظ تھے۔ پورچ میں اب بھی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ برڈ نے کہا۔ "میں ان میں سے کوئی گاڑی نکالتا ہوں۔"

"مگر ان کی چابی!" میں نے کہا۔

"نو پرابلم!" برڈ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کی رنگ نکال لیا۔" میرے پاس ماسٹر کی ہے۔"

میں دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ برڈ نے پہلی ہی گاڑی کے دروازے پر ماسٹر کی آزمائی دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پچھلا دروازہ کھولا اور مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے تیزی سے شہلا کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر

لٹایا‘ پھر خود گھوم کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تو برڈ نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ چھ سلنڈروں والی شیور لیٹ اسپکس تھی۔ دوسری کوشش میں اس کا انجن غرایا اور وہ جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ نہ اس وقت مجھے لالی یاد آئی نہ مسٹراو۔ میں نے شہلا کو لے کر جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

عمارت کا مین گیٹ بند تھا۔ جب ہم وہاں داخل ہوئے تھے تو وہاں دو گارڈ موجود تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ گاڑی دیکھ کر کہیں چھپ گئے ہوں گے۔ وہ خاصا مضبوط لوہے کا گیٹ تھا ورنہ میں گاڑی کو دھکے سے اسے توڑ دیتا۔ برڈ نے فکر مندی سے گیٹ کی طرف دیکھا‘ پھر وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تو پہلے ہی تھا۔ میں نے اپنا مشین پسٹل بھی نکال لیا اور فائر کرنے کو بالکل تیار ہو گیا۔ برڈ آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف بڑھا اور آہستگی سے گیٹ کے دونوں پٹ کھول دیے۔ مجھے شدید حیرت ہوئی کیوں کہ اس وقت بھی کسی نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی‘ کہیں سے فائر نہیں ہوا۔ برڈ کے چہرے پر بھی الجھن کے آثار تھے۔ وہ لپک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ اس طرف تھا جہاں ہم نے اپنی گاڑی چھوڑی تھیں۔ عمارت کے گیٹ سے باہر نکلتے وقت مجھے ایسے لگا تھا جیسے کسی نے چیخ کر میرا نام لیا ہو۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔

کچھ دور آنے کے بعد برڈ نے مجھ سے کہا۔ ”یار‘ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی نے چیخ کر تمہیں پکارا ہو۔“

”میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔“ وہ آواز تم نے بھی سنی تھی؟“ میں نے پوچھا گویا وہ میرا وہم نہیں تھا۔

”ممکن ہے وہ ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی ہو؟“ برڈ نے کیال ظاہر کیا۔

میں اپنے ساتھیوں کو تو بھول ہی گیا تھا۔ اس نے یاد دلایا تو مجھے بھی احساس ہو کہ مجھے آواز دینے والا کوئی ساتھی ہی ہو گا۔

اس وقت تک ہم اپنی گاڑیوں کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے اتر کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اچانک کلارا میرے سامنے آگئی۔ وہ وہاں کچھ فاصلے پر ایک پلیا کی آڑ میں بیٹھی تھی۔

”باقی افراد کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں نہیں ملے۔؟“ کلارا نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ ”وہ لوگ مکان کے اندر ہی تو گئے تھے۔“

”مکان کے اندر!“ میں نے الجھ کر پوچھا۔ ”رضا‘ تہمینہ اور رضوانہ مکان کے اندر گئے ہیں“

"رضوانہ باہر ہی تھی۔ وہ مین گیٹ کے آس پاس موجود ہوگی۔ رضا اور تہمینہ اندر گئے ہیں"

میں نے برڈ کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھ سے کہا "آپ یہاں ٹھہریں' میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں۔"

"نہیں تم یہیں ٹھہرو میں اندر جاؤں گا۔"

اسی وقت مجھے کوئی عورت دکھائی دی۔ وہ دوڑتی ہوئی ہماری ہی طرف آ رہی تھی' نزدیک پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ رضوانہ ہے۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "میں نے آپ کو اتنی آوازیں دیں مگر آپ نے گاڑی نہ روکی۔"

"اچھا تو وہ تم تھیں! میری بجائے برڈ نے جواب دیا۔ اصل میں اس وقت ہم اتنے پریشان تھے کہ تمہاری آواز پر دھیان نہ دے سکے۔" برڈ نے کہا پھر اس نے پوچھا" باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ تو ابھی بنگلے کے اندر ہی ہیں۔ تمہیں آتا دیکھ کر میں سمجھی کہ باقی لوگ بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔"

ان لوگوں کو وہیں چھوڑ کر میں اور برڈ ایک مرتبہ پھر اس بنگلے کی طرف بڑھے۔ میں نے شہلا کو اپنی گاڑی میں منتقل کر دیا تھا اور کلارا اور رضوانہ سے کہہ دیا تھا کہ کسی بھی قسم کی گڑبڑ میں تم لوگ وہاں سے نکل جانا۔ کوئی راستے میں آئے اسے بے دھڑک گولی مار دینا۔ ایک ایک ریوالور ان کے پاس بھی تھا۔

ہم لوگ دوبارہ بنگلے پر پہنچے تو گیٹ ابھی تک چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ برڈ نے بنگلے کے باہر ہی گاڑی روک دی' پھر ہم لوگ اندر داخل ہونے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ مجھے رضا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے تہمینہ بھی تھی۔ اور سب سے آخر میں مسٹر او۔ اس منحوس کو دیکھ کر مجھے ایک دم غصہ آگیا۔ میں اور برڈ گیٹ کے باہر ان لوگوں کا انتظار کرتے رہے۔ سب سے پہلے رضا باہر نکلا۔

اس کی نظر جونہی مجھ پر پڑی' وہ بے ساختہ مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔ "آپ خیریت سے تو ہیں خرم صاحب!"

میں بالکل ٹھیک ہوں' تم مجھے زخمی لگ رہے ہو۔" میں نے فکرمندی سے کہا۔

"ارے' یہ تو معمولی سی خراشیں ہیں' ٹھیک ہوجائیں گی۔"

تہمینہ مجھے دیکھ کر مسکرائی پھر بولی "ہم لوگ آپ کو اندر تلاش کر رہے ہیں اور آپ یہاں کھڑے ہیں۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی "شہلا کہاں ہے؟"

"شہلا بھی ہمارے ساتھ ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"ہیلو خرم!" مسٹراو نے خوش دلی سے کہا۔ "بہت خود غرض ہو' مجھے چھوڑ کر نکلے جا رہے ہو۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا! کیا تمہیں بھی ڈھو کر لے جاؤں؟"
"مسٹراو نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے۔" تہمینہ نے جلدی سے کہا۔ "ایک موقع پر رضا تو ان کے قابو میں آ ہی گیا تھا۔ اگر مسٹراو نہ ہوتے تو شاید آپ کو ہم لوگوں کی لاشیں ہی ملتیں۔"
"میں آپ کا بہت احسان مند ہوں مسٹراو!" میرے لہجے میں ابھی تک طنز تھا۔" کبھی موقع ملا تو آپ کا یہ احسان اتارنے کی کوشش کروں گا۔"
"میرا یہ احسان تو تم ابھی اتار سکتے ہو۔" مسٹراو نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم وہ مائیکرو فلم اور دستاویزات میرے حوالے کر دو۔"
مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "یار' وہی مرغے کی ایک ٹانگ! میرے پاس کوئی دستاویز ہے نہ مائیکرو فلم' وہ تو میں نے تم لوگوں کو بے وقوف بنایا تھا شہلا کی بازیابی کے لئے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یقین نہیں آتا تو خاکی رنگ کا وہ لفافہ دیکھ لینا۔ وہ تمہیں مل جائے گا۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس میں نہ.....
"وہ لفافہ میں دیکھ چکا ہوں۔" مسٹراو نے سرد لہجے میں کہا۔
"بس تو پھر تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس میں ہر چیز جعلی ہے۔ میں اگر جھوٹ نہ بولتا تو تم لوگ بھی شہلا کو میرے حوالے نہ کرتے۔"
میری بات سن کر مسٹراو کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ اس نے خواتین کی موجودگی کی پروا کئے بغیر مجھے انتہائی غلیظ قسم کی گالی دی اور چیخ کر بولا "یاد رکھ خرم! اگر وہ دستاویزات مجھے نہ ملیں تو نہ تو زندہ رہے گا' نہ شہلا!"
"اب تیری ناپاک زبان پر میری بہن کا نام بھی آیا تو میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں تجھے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں تو کتنے پانی میں ہے۔" پھر میں دوسرے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "چلو گاڑی میں بیٹھو!"
وہ سب جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ دونوں لڑکیاں اور رضا پچھلی سیٹ پر تھے۔ برڈ حسب معمول اسٹیئرنگ پر۔ میں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو مسٹراو چیخ کر بولا "خرم! اب تک میں تجھے طرح دیتا آیا تھا۔ تجھے بچہ سمجھ کر رعایت دیتا آیا تھا مگر تو نے ڈبل کراس کر کے مجھے صحیح معنوں میں اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ اب میں تجھے بتاؤں گا کہ دشمنی کیا ہوتی ہے۔ تو سمجھ رہا ہے کہ شہلا تیرے ہاتھ آ گئی تو تو نے دنیا فتح کر لی۔ ارے شہلا کو دوبارہ اغوا کرنا تو میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اور یاد رکھ! اب اگر شہلا میرے قبضے میں آ گئی تو میں اس کے

ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ.....“

برڈ نے اچانک گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ میں نے برڈ سے کہا ”گاڑی روکو میں اس سانپ کا سر ابھی کچل دوں تاکہ یہ بعد میں میرے لئے مسائل پیدا نہ کرے۔“

”لعنت بھیجو اس پر۔“ برڈ نے جواب دیا۔ یہ ہمارے لئے کیا مسائل پیدا کرے گا۔ ہم اس سے پہلے بھی اسے آزما چکے ہیں۔ کیا تم اس سے خوف زدہ ہو؟“ برڈ نے کہا۔

میں طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”میں اور اس سے خوف زدہ! میں تو صرف اس کے بڑبولے پن کا جواب دینا چاہتا تھا۔ خیر تمہاری بات بھی صحیح ہے۔ دیکھ لیا جائے گا اسے بھی۔“ پھر میں رضا سے مخاطب ہوا۔ ”تم بتاؤ رضا‘ تم اندر کیسے پہنچے؟“

”جب آپ کو اندر گئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تو مجھے فکر ہوئی‘ تہمینہ بھی بہت فکرمند تھی۔ ہم دونوں نے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اندر کس بہانے جاؤں۔ آخر تہمینہ نے ایک منصوبہ بنایا۔ خواتین کے ساتھ یوں بھی ہر جگہ رعایت ہوتی ہے۔ یہ سیدھی گیٹ پر پہنچ گئی اور ہنس ہنس کر گارڈ سے باتیں کرنے لگی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ تہمینہ بھی مارشل آرٹ کی ماہر ہے۔“

مجھے واقعی حیرت ہوئی۔ میں نے گھوم کر تہمینہ کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولی۔ میں ماہر تو نہیں‘ بس اپنا کام نکال لیتی ہوں۔“

”اچھا اب باقی باتیں گھر پہنچ کر!“ برڈ نے کہا۔

اس کے کہنے پر میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہم اپنی گاڑیوں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس گاڑی کو وہیں چھوڑ کر ہم لوگ اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔ شہلا بھی ہوش میں آ گئی تھی مگر وہ کلارا کی گاڑی میں تھی۔

ہم لوگ گھر پہنچے تو گاڑی سے اترتے ہی شہلا میرے سینے سے لپٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اب کیوں روتی ہے گڑیا! رونے کا وقت تو کب کا گزر چکا۔ اب تو تیرے ہنسنے کی باری ہے۔“

”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں بھیا!“ شہلا میرے سینے سے لگی لگی بولی۔

کلارا نے آہستگی سے اسے مجھ سے علیحدہ کیا اور اپنائیت بھرے لہجے میں بولی۔ ”تم اندر تو چلو‘ کیا ساری رات یہیں کھڑی روتی رہو گی۔ دیکھو تمہارے بھیا بھی رونے کی تیاری کر رہے ہیں۔“ اس نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

”بھابی‘ آپ کے ہوتے ہوئے بھیا کے روئیں دشمن!“ شہلا روتے روتے ہنس دی۔

”بھابی!“ میں اور برڈ ایک ساتھ بولے۔ ”یہ..... یہ تمہاری بھابی ہیں؟“ میں نے حیرت

سے کہا۔ "یہ فیصلہ تم نے کب کیا؟"

"تو کیا..... یہ میری بھابی نہیں ہیں؟" شہلا نے معصومیت سے پوچھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی بکھر گئی تھی۔

"تم سے کس نے کہا کہ یہ تمہاری بھابی ہیں؟" میں نے اندر کی طرف قدم بڑھائے۔ "ابھی تمہارے بھائی پر اتنا برا وقت نہیں پڑا ہے شہلا!" میں نے کلارا کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔

"بلکہ اس سے بھی برا وقت آگیا ہے ان کا!" کلارا نے دانت پیس کر کہا۔ "میرا خیال ہے تم فون کر کے ایمبولینس پہلے ہی بلا لو۔"

"بلکہ تھانے میں بھی فون کر دو۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے اسپتال کی بجائے مجھے مردہ خانے جانا پڑے۔"

کلارا نے جھنجھلا کر میری پیٹھ پر دھم سے ایک گھونسا مارا اور منہ پھلا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

شہلا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ "اس پر آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ میری بھابی نہیں ہیں۔" وہ کلارا کی وجہ سے انگلش میں بات کر رہی تھی۔

"یار بات تو ٹھیک ہے۔" برڈ نے کہا۔ "کلارا کی حرکتیں تو بھابیوں والی ہی ہیں۔ اب تو مجھے بھی شبہ ہونے لگا ہے کہ یہ ہماری بھابی ہے۔"

"یار تمہاری بات سن کر تو مجھے شبے کی بجائے یقین ہو رہا ہے کہ یہ میری بھابی ہے۔" میں نے مسکین سے لہجے میں کہا اور جلدی سے جھک گیا ورنہ کلارا کا پھینکا ہوا ماربل کا بھاری ایش ٹرے میری کھوپڑی توڑ دیتا۔ ایش ٹرے دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرا۔

"اب تم نے مزید بکواس کی تو میں ابھی اور اسی وقت چلی جاؤں گی۔"

"کہاں؟" میں نے چہک کر پوچھا۔ "کیا امریکہ!" میری بات پر سب لوگ ہنسنے لگے۔ شہلا نے کہا۔ "بس بھیا! اگر آپ نے اب بھابی کو چھیڑا تو میں بھی بھابی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"میرا خیال ہے کہ پہلے کھانا کھا لیا جائے۔" کلارا نے کہا۔ "میں نے کھانا لگا دیا ہے۔ باقی باتیں کھانے کے بعد کریں گے۔"

ہم سب وہاں سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئے۔ شہلا یوں بھاگ بھاگ کر کام کر رہی تھی جیسے وہ میزبان ہو اور ہم سب مہمان! کھانے کے بعد ہم سب ایک مرتبہ پھر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

کافی دیر تک ہم میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ آخر اس خاموشی کو برڈ کی آواز نے توڑا۔ وہ شہلا سے مخاطب تھا۔ "اب تم بتاؤ' کہاں کہاں رہیں اور ان لوگوں کے پاس کہاں سے

پہنچیں؟"

شہلا خاموش ہو کر خلا میں گھورنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی یادوں کو جمع کر رہی ہو۔ پھر وہ دھیمے لہجے میں بولنے لگی۔

○

مجھے ابھی تک یاد ہے۔ مجھے بہت تیز بخار تھا اور بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ چاچا جی کے پاس ایک صراحی تھی۔ جو صاحب ٹرین میں ملے تھے میں انہیں چاچا جی ہی کہتی تھی۔ تو میں بتا رہی تھی کہ چاچا جی کے پاس پانی کی ایک صراحی تھی۔ آخرکار وہ ختم ہو گئی مگر میری پیاس نہ بجھی۔ میں نے بھیا سے پھر پانی مانگا۔ گاڑی اگلے اسٹیشن پر رکی تو بھیا صراحی لے کر نیچے اتر گئے۔ انجن نے روانگی کے لئے ہارن بجایا تو میں مضطرب ہو کر اٹھ بیٹھی کیوں کہ بھیا اس وقت تک نہیں لوٹے تھے۔ چاچا جی نے مجھے تسلی دی کہ گھبراؤ مت' تمہارا بھائی ضرور آ جائے گا۔ پھر وہ کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگے۔ میں بھی کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ ہماری بوگی سے کافی فاصلے پر پانی کا نل تھا۔ بھیا وہاں سے صراحی بھر کے گاڑی کی طرف آ رہے تھے۔

"اچانک ٹرین نے دوسرا ہارن بجایا اور آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ میں پوری قوت سے چیخی۔ "خرم بھیا!"

"مجھے نہیں معلوم کہ میری آواز ان تک پہنچی یا نہیں مگر وہ ٹرین کو چلتا دیکھ کر تیزی سے بھاگنے لگے۔ مجھے آج بھی وہ منظر یاد ہے' ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ اس منظر کی ایک ایک بات میرے ذہن پر نقش ہے۔ مگر اس وقت بخار سے میری حالت تباہ تھی اور میری عمر بھی بہت کم تھی مگر کچھ منظر' کچھ جملے اور کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہیں۔

میں نے دیکھا' بھیا جان پہ کھیل کے بھاگے آ رہے تھے۔ پانی سے بھری ہوئی صراحی کی وجہ سے انہیں بھاگنے میں دقت ہو رہی تھی مگر وہ بھاگ رہے تھے۔ ان کے بھاگنے کی رفتار ٹرین سے زیادہ تھی اس لئے لحہ بہ لحہ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک بھیا لڑکھڑائے اور زمین پر گر پڑے۔ صراحی ٹوٹ گئی اور اس کا سارا پانی بہہ گیا۔ بھیا بہت پیچھے رہ گئے تھے مگر میں کھڑکی میں لٹکی انہیں آوازیں دے رہی تھی۔ بھیا ایک مرتبہ پھر اٹھ کر ٹرین کے پیچھے بھاگے مگر اب ٹرین کی رفتار بہت تیز ہو چکی تھی۔ میں چیخ چیخ کر رونے لگی۔ "میں بھیا کے پاس جاؤں گی۔ بھیا کے پاس جاؤں گی۔"

چاچا جی مجھے مختلف طریقے سے بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈبے میں موجود ایک اور صاحب نے کہا۔ "یہ بچی کیوں رو رہی ہے جناب!"

"یہ.....دراصل.....اس کا بھائی.....میرا مطلب ہے یونہی خواہ مخواہ ضد کر رہی تھی....."

"کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ صاحب اٹھ کر میرے نزدیک آ گئے۔ "کس کی بچی ہے یہ؟"

"یہ میری..... بچی ہے..... آ..... آپ کو کیا پریشانی ہے؟"

"بیٹی..... کیا نام ہے آپ کا؟" ان صاحب نے بہت پیار سے مجھے مخاطب کیا۔

"شہلا!" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"آپ کے ابو کا نام کیا ہے؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"ابو کا نام!..... ابو کا نام..... بیرسٹر صاحب!" مجھے ابو کا وہی نام یاد آ گیا جس سے وہ مشہور تھے۔

"سچ سچ بتایئے جناب' یہ بچی کون ہے؟" وہ صاحب سخت لہجے میں چاچا جی سے بولے۔

"اگر یہ آپ کی بچی ہے تو کیا آپ بیرسٹر ہیں؟"

"یہ میری..... بھتیجی ہے۔" چاچا جی سٹپٹا کر بولے۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنا ڈر کیوں رہے ہیں۔

ان صاحب نے جیب سے کوئی کارڈ نکالا ور چاچا جی کو دیکھا کر بولے۔ "میں خفیہ پولیس کا افسر ہوں اود میرا نام اکبر ہے' اس لئے اب مجھ سے جھوٹ مت بولنا سمجھے!"

"جی ہاں' سمجھ گیا' بالکل سمجھ گیا۔" چاچا جی پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ "سچی بات یہ ہے کہ اس لڑکی سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ بچی اپنے بھائی کے ساتھ کراچی جا رہی ہے۔"

"بھائی کے ساتھ!" اکبر صاحب نے حیرت سے دہرایا۔ "کہاں ہے اس کا بھائی؟"

"وہ پچھلے اسٹیشن پر پانی لینے اترا تھا کہ ٹرین چل پڑی۔" چاچا جی نے آہستہ سے کہا۔

"اور آپ آرام سے بیٹھے رہے۔ آپ نے گاڑی کیوں نہیں رکوائی؟"

"وہ دراصل..... میں..... میرا خیال تھا کہ..... وہ اگلے اسٹیشن پر پہنچ جائے گا۔"

"بکواس کرتے ہو۔" اکبر صاحب نے چاچا جی کو ڈانٹ کر کہا۔ "تم نہیں چاہتے تھے کہ اس لڑکی کا بھائی اسے اپنے ساتھ لے جائے اس لئے کہ تم خود اس لڑکی کو لے جانا چاہتے تھے۔"

"یہ بات..... نہیں ہے جناب..... میں....."

"یہی بات ہے۔" اکبر صاحب درشت لہجے میں بولے۔ "ورنہ اگر تم زنجیر کھینچ لیتے تو اس کا بھائی آسانی سے گاڑی میں سوار ہو جاتا۔" اکبر صاحب بولتے بولتے خاموش ہو گئے کیوں کہ ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "کوئی اسٹیشن آ رہا ہے۔ میں یہاں گاڑی رکواؤں گا اور پچھلے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر سے رابطہ کروں گا۔ تمہیں بھی میرے ساتھ ہی اترنا ہو گا۔"

"میں تو بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ یہاں اتر گیا تو میں ایک دن لیٹ ہو جاؤں گا۔ میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔" چاچا جی رو دینے والے انداز میں بولے۔

"تمہارا خیال ہے کہ تم ایک دن لیٹ ہو گے! میں تو تمہیں اس کے بھائی کے ملنے سے پہلے نہیں چھوڑوں گا۔"

"میری نوکری جاتی رہے گی۔" چاچا جی گھبرا کر بولے۔ "ابھی مجھے جانے دیں۔ میں اپنا ایڈریس دے دیتا ہوں۔ بعد میں جب آپ کہیں گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو!" اکبر صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کوئی چور یہ کہے کہ حضور' آپ یہ مال مسروقہ سنبھالیں اور میرا پتہ لکھ لیں۔ میں خود ہی حاضر ہو جاؤں گا تو تمہارا کیا خیال ہے' میں اس کی بات مان لوں گا؟"

"مگر میں چور تو نہیں ہوں۔" چاچا جی نے کمزور لہجے میں احتجاج کیا۔ "میں ایک عزت دار شہری ہوں اور....."

"بس!" اکبر صاحب نے ان کی بات کاٹ دی۔ "تم چور ہو یا نہیں' میرے ساتھ اتر رہے ہو!" ان کا لہجہ اچانک سخت ہو گیا۔

اس دوران میں گاڑی اوسط درجے کے ایک اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔

"اپنا سامان اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔"

چاچا جی نے اپنا تھرمس' اخبار اور ٹفن سمیٹا اور چلنے کو تیار ہو گئے۔ اکبر صاحب نے بھی چھوٹا سا ایک سوٹ کیس اٹھا لیا اور ہم گاڑی سے اتر گئے۔

اکبر صاحب ہمیں لے کر سیدھے اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں پہنچے اور مختصراً اسے صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پچھلے اسٹیشن کے ایس ایم سے رابطہ قائم کریں اس سے کہیں کہ وہ اس لڑکے کو بس کے ذریعے یہاں بھیج دے۔ ہم اس کا یہاں انتظار کر رہے ہیں۔" اکبر صاحب اپنا شناختی کارڈ پہلے ہی اسٹیشن ماسٹر کو دکھا چکے تھے ورنہ ممکن ہے وہ اکبر صاحب کو خاطر میں نہ لاتا۔

اسٹیشن ماسٹر نے فوراً پچھلے اسٹیشن سے رابطہ کیا اور اس سے کہا کہ آپ کے اسٹیشن پر اس گاڑی کو ایک پسنجر رہ گیا ہے..... کیا..... حلیہ۔" پھر وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا کر بولا۔ "اس لڑکے کا حلیہ کیا ہے؟"

"اس کی عمر دس گیارہ سال ہو گی۔" چاچا جی نے جلدی سے جواب دیا۔ صحت مند جسم' سرخ و سفید رنگت اور بڑی بڑی ذہین آنکھیں۔ نیلی جینز اور اسی کی ہم رنگ جیکٹ میں ملبوس ہے۔"

ہم پیغام دے کر باہر نکلے تو چاچا جی نے ایک مرتبہ پھر جانے کی اجازت چاہی۔

اکبر صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا۔ "جانے دوں' یہ بھی خوب کہی۔" اکبر صاحب کا

لہجہ طعن آمیز تھا۔ "ابھی تو تمہیں کچھ دن لاک اپ میں رکھوں گا۔"

"مگر میرا قصور تو بتا دیں۔" چاچا جی نے اضطراب آمیز انداز میں کہا۔

"تمہارا قصور..... تمہارا سب سے بڑا جرم تو مجرمانہ غفلت ہے۔ آخر تم نے گاڑی رکوائی کیوں نہیں..... اس کا کیا مطلب لوں میں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" چاچا جی نے جواب دیا۔ "بس اس وقت میرا دماغ کچھ ماؤف سا ہو گیا تھا۔ میں نے تو ان بچوں کے ساتھ بھلائی کی تھی۔"

"ان کے ساتھ بھلائی تو یہ ہوتی کہ تم انہیں ریلوے پولیس کی تحویل میں دے دیتے۔ تمہیں یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ دس گیارہ سال کا ایک بچہ اس معصوم بچی کو لے کر کہاں جا رہا ہے۔ ابھی ہم لوگ اتنے ایڈوانس نہیں ہوئے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو اکیلا اتنے لمبے سفر پر بھیج دیں۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ بچے' بڑوں کی مرضی کے خلاف سفر کر رہے ہیں۔ جرم اور کیسا ہوتا ہے۔ چلو میرے ساتھ۔" اکبر صاحب نے اسٹیشن سے باہر قدم بڑھایا۔

"کہاں جا رہے ہیں جناب؟" چاچا جی سہم کر بولے۔

"پھانسی نہیں چڑھا رہا ہوں تمہیں۔ میں ذرا چائے پیوں گا اور بچی کو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔"

چاچا جی ہمارے ساتھ یوں چل رہے تھے جیسے گھسٹ رہے ہوں۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر اکبر صاحب نے ایک تانگے والے سے بات کی' پھر ہم لوگ تانگے میں بیٹھ گئے۔ تانگے والے نے ہمیں ایک ڈاکٹر کے کلینک پر اتار دیا۔ کلینک مریضوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مگر اکبر صاحب کے کارڈ میں نہ جانے کیسا جادو تھا کہ اسے دیکھتے ہی کمپونڈر نے سب سے پہلے ہمیں اندر بھیج دیا۔ ڈاکٹر نے میرا تفصیلی معائنہ کیا' پھر اکبر صاحب سے بولا۔ "بہت احتیاط کی ضرورت ہے جناب! بچی کو ٹائی فائیڈ بھی ہو سکتا ہے۔ میں دوائیں لکھے دے رہا ہوں۔ اسے پابندی سے استعمال کرایئے گا۔"

"ڈاکٹر صاحب! میں سفر میں ہوں۔" اکبر صاحب نے کہا۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو تمام دوائیں بازار ہی کی لکھ دیں تاکہ ہمیں لینے میں آسانی رہے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے' بہرحال ایک خوراک تو آپ یہیں لے لیں۔ انجکشن بھی لگے گا۔"

ڈاکٹر سے فارغ ہونے کے بعد اکبر صاحب نے میڈیکل اسٹور سے دوائیں خریدیں اور گھٹیا سے ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔

میں نے چائے کے ساتھ بسکٹ کھائے تو مجھے بھیا بہت یاد آئے۔ یہ ان کے پسندیدہ بسکٹ تھے۔

ہم دوبارہ اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ پچھلے اسٹیشن سے بھیا کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ میں بلک بلک کر رونے لگی۔ اکبر صاحب نے مجھے یہ کہہ کر بہلایا کہ تمہارے بھیا ہم سے پہلے کراچی پہنچ چکے ہوں گے یا کل کسی وقت پہنچ جائیں گے۔ وقتی طور پر میں ان کے جھوٹ سے بہل گئی۔

ہم اس اسٹیشن پر ایک دن مزید ٹھہرے کہ مبادا بھیا کی خیریت معلوم ہو جائے مگر دوسرے دن بھی کوئی اطلاع نہیں ملی۔

"اس کا مطلب ہے تمہارے بھیا کراچی پہنچ گئے۔" اکبر صاحب منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

"تو پھر چلئے کراچی! میں نے مچل کر کہا۔

"بھئی کراچی ہی تو چلیں گے یہاں سے۔ گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں۔ گاڑی آئے تو اس میں چڑھیں گے نا!

○

خدا خدا کر کے ہم لوگ کراچی پہنچے' اکبر صاحب نے وہاں بھی بھیا کو پوچھا مگر کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ چاچا جی سائے کی طرح ہمارے ساتھ تھے۔ اکبر صاحب نے انہیں اتنا خوف زدہ کر دیا تھا کہ وہ نڈھال ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بیچارے بھاگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ اکبر صاحب نے انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔ اس وقت چاچا جی' اکبر صاحب سے زیادہ اس گولی سے خوف زدہ تھے جو اکبر صاحب انہیں مارنے والے تھے۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر اکبر صاحب نے ٹیکسی کی اور اس سے گلشن اقبال چلنے کو کہا۔ چاچا جی خاموشی سے پچھلی سیٹ پر ڈھے گئے۔ وہ بار بار یہی بڑبڑا رہے تھے۔ "بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے' بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔ نیکی کر کے دریا میں ڈال دینا چاہئے۔"

"اس کا مطلب ہے' میں بھی تمہارے ساتھ بھلائی نہ کروں!" اکبر صاحب نے ان کی بڑبڑاہٹ کے جواب میں کہا۔

"آپ تو میرے ساتھ مسلسل بھلائی کر رہے ہیں۔ اس نیکی کا اجر تو آپ کو اللہ تعالیٰ دے گا۔"

"نیکی کر کے تو دریا میں ڈالنا چاہئے بھائی میرے۔" اکبر صاحب زور سے ہنسے۔ "یہی تو کہہ رہے تھے تم کہ نیکی کر کے دریا میں ڈال دینا چاہئے۔ گویا میں تمہیں دریا میں ڈال دوں۔"

اسی دوران ٹیکسی گلشن اقبال پہنچ گئی۔ اکبر صاحب ٹیکسی ڈرائیور کو پتہ بتا رہے تھے۔

ایک بنگلے کے آگے انہوں نے ٹیکسی رکوا دی۔

وہ خاصا وسیع و عریض بنگلہ تھا' بالکل ہمارے لاہور والے بنگلے کی طرح۔ خوبصورت سی ایک عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیرت سے بولی۔ "یہ کون ہے؟"

"یہ شہلا ہے۔" اکبر صاحب نے صوفے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "اس کا بھائی اس سے بچھڑ گیا ہے۔" پھر انہوں نے مختصراً اس عورت کو میرے بارے میں بتا دیا۔

اس دوران میں چاچا جی سہمے سہمے بیٹھے رہے تھے۔ اکبر صاحب کی بات ختم ہوئی تو وہ کھنکار کر بولے۔ "اب میں جاؤں جناب؟"

اکبر صاحب شاید انہیں بھول ہی گئے تھے۔ وہ چونک کر بولے۔ "نہیں' ابھی تو تم سے تفتیش ہو گی۔ ابھی سے کیسے جا سکتے ہو۔"

چاچا جی لرزتی ہوئی آواز میں بولے۔ "میری بیوی اور بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ابھی مجھے جانے دیں' میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب آپ بلائیں گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

اکبر صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میں نے کہا۔ "انہیں جانے دیں انکل! انہوں نے تھوڑی گم کیا ہے بھیا کو۔ انہیں ملنا ہو گا تو مل جائیں گے۔"

اکبر صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا' پھر چاچا جی سے بولے۔ "میں تمہیں چھوڑتا نہیں مگر اس بچی کے کہنے سے چھوڑ رہا ہوں۔ ہاں اپنے گھر اور دفتر کا پتہ لکھوا دو تاکہ ضرورت پڑے تو تمہیں بلوایا جا سکے۔"

چاچا جی نے جلدی جلدی پتہ لکھوایا اور اکبر صاحب کی اجازت ملتے ہی یوں سر پر پاؤں رکھ کے بھاگے کہ اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوئی تو اکبر صاحب دوبارہ روک لیں گے۔

ان کے جانے کے بعد اکبر صاحب نے مجھ سے کہا۔ "شہلا بیٹی! جب تک تمہارا بھائی نہیں مل جاتا تم یہیں رہو گی۔"

وہ خوب صورت سی عورت اکبر صاحب کی بیوی تھی۔ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا اس لئے وہ دونوں میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ میں اکبر صاحب کو انکل اور ان کی بیوی کو آنٹی کہنے لگی۔ اکبر صاحب نے بھیا کو ڈھونڈنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر ناکام رہے۔ میں کبھی کبھی بھیا کو یاد کر کے رونے لگتی تو آنٹی مجھے بچوں کی طرح بہلاتیں انہوں نے مجھے ڈھیروں کھلونے لا دیئے تھے۔ اتنے کھلونے تو مجھے امی نے بھی نہیں دلوائے تھے۔ میں زیادہ روتی اور ضد کرتی تو انکل اور آنٹی مجھے گاڑی میں بیٹھا کر گھمانے نکل جاتے۔ یوں میں بہل جاتی۔

آخر چھ مہینے بعد انکل بھی بھیا کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ وہ پولیس میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے طور پر بھیا کو تلاش کیا بلکہ اس سلسلے میں پولیس

ے بھی مدد لی اور لاہور سے کراچی تک کا پورا علاقہ چھان مارا مگر بھیا نہ ملے۔ اس کے باوجود انہوں نے میرے سامنے مایوسی کا اظہار نہ کیا۔ مجھ سے تو وہ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ میں تمہارے بھیا کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ انشاء اللہ وہ جلد ہی مل جائے گا مگر ایک دن میں نے انہیں آنٹی سے یہ کہتے سن لیا کہ میرا خیال ہے خرم اب زندہ نہیں ہے یا پھر وہ بردہ فروشوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے ورنہ مجھے ضرور مل جاتا۔

میں نے بس اتفاق سے یہ بات سن لی تھی۔ یہ سن کر میں زور زور سے رونے لگی۔ میری آواز سن کر انکل اور آنٹی گھبرائے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔ انکل نے مجھ سے پوچھا۔ "شہلا بیٹی! کیا ہوا؟"

"میں بھیا کے پاس جاؤں گی۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بیٹے' تمہارے انکل بھیا کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ جیسے ہی ملے گا....."

"نہیں' جھوٹ بول رہی ہیں آپ۔" میں نے آنٹی کی بات کاٹ دی۔ "انکل تو کہہ رہے تھے کہ بھیا زندہ نہیں ہیں۔"

انکل نے آنٹی کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے۔ پھر انہوں نے آگے بڑھ کے مجھے گود میں اٹھا لیا اور چمکارتے ہوئے بولے۔ "شہلا بیٹا! انسان کو معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنا چاہئے۔ میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بس تو اتنا سمجھ لے کہ اگر تیرا بھائی زندہ ہے تو میں ایک نہ ایک دن اسے ڈھونڈ نکالوں گا مگر ایک شرط پر!"

"کون سی شرط انکل!" میں نے روتے روتے پوچھا۔

"شرط بس یہی ہے کہ تم آئندہ اچھی بچی بن جاؤ گی۔ روؤگی نہیں' ضد نہیں کرو گی اور اسکول جایا کرو گی۔"

"ٹھیک ہے انکل!" میں نے جواب دیا۔ "میں آئندہ بالکل ضد نہیں کروں گی' اسکول بھی جاؤں گی۔ پھر تو آپ میرے بھیا کو ڈھونڈ لائیں گے؟"

"ہاں بیٹا' ہم تمہارے بھیا کو ضرور ڈھونڈیں گے۔"

اس دن کے بعد میں نے واقعی ضد نہیں کی۔ بس انکل سے پوچھتی رہتی تھی کہ بھیا ملے! اور انکل ہر بار ایک ہی جواب دیتے تھے۔ "تمہارے بھیا کی تلاش جاری ہے۔"

انہوں نے مجھے اعلیٰ درجے کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ پڑھنے کا مجھے یوں بھی بہت شوق تھا اس لئے میں بہت محنت اور لگن سے پڑھنے لگی۔

ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گئی۔ چاچا جی وہاں سے جاتے ہی بیوی بچوں سمیت کہیں غائب ہو گئے۔ یہ بات مجھے انکل ہی نے بتائی تھی۔ آنٹی کا خیال تھا کہ بھیا کی گمشدگی میں چاچا جی کا ہاتھ تھا مگر انکل یہ بات نہیں مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے اس شخص کے دفتر والوں سے معلوم کیا تھا۔ وہ شریف آدمی تھا' بس پولیس سے ڈر کے فرار ہو گیا ہے۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ بہ ظاہر میں بھیا کا ذکر نہیں کرتی تھی مگر تنہائی میں انہیں یاد کر کے گھنٹوں روتی رہتی تھی۔ پھر وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ احساس ہی نہ ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے میٹرک پاس کر لیا۔ انکل نے مجھے شہر کے ایک بہترین کالج میں ایڈمیشن دلا دیا۔

○

یہ شاید عید کے دن کی بات ہے۔ انکل نماز پڑھ کے آفس چلے گئے تھے۔ ضروری کام ہوتا تھا تو وہ عید کی چھٹی بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ جاتے ہوئے آنٹی سے کہہ گئے تھے کہ دوپہر کا کھانا میں گھر ہی پہ کھاؤں گا۔

تقریباً گیارہ بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ میری ہیلو کے جواب میں کوئی گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "ہو از اسپیکنگ؟"

"ہوم ڈو یو وانٹ؟" (آپ کو کس سے بات کرنا ہے۔) میں نے پوچھا۔ اس کی گفتگو سے ایسا لگ رہا تھا کہ نہ اسے اردو آتی ہے' اور نہ صحیح طرح انگلش آتی ہے۔

"آئی..... وانت مسز اکبر۔" اس نے رک رک کر کہا۔ وہ "ٹ" کو "ت" بول رہا تھا۔

"وہ تو گھر پہ نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"اس کی موت!" دوسری طرف سے شاید دانت پیس کر کہا گیا۔ "اسے بتا دینا کہ چیانگ لی سے ٹکرانے کا انجام بہت خوفناک ہوتا ہے۔"

"مگر تم ہو کون؟" مجھے بھی یک بہ یک غصہ آگیا۔ "سیدھی طرح بات کرو ورنہ بند کر دو فون۔ یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا!" میں اس قسم کے فون پہلے بھی اٹینڈ کر چکی تھی اس لئے بجائے خوف زدہ ہونے کے مجھے غصہ آ رہا تھا۔ "اسے دھمکی مت سمجھو۔" وہ غرا کر بولا۔ "میں موت کا دیوتا ہوں۔ اکبر کے پورے خاندان کو تباہ کر دوں گا۔"

"اچھا موت کے دیوتا صاحب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اب تم اپنی ٹیں ٹیں بند کرو۔ انکل آئیں گے تو انہیں بتا دوں گی۔"

"ضرور بتا دینا۔" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے بھی طویل سانس لے کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ آنٹی بہ غور مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے جونہی ریسیور رکھا وہ گھبرا کو بلیں۔ "کون تھا بیٹی؟"

"پتہ نہیں کون پاگل تھا۔ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔"

"کون دھمکیاں دے رہا تھا بیٹی؟" انکل نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی پاگل اتھا انکل!" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "کہہ رہا تھا کہ میں موت کا دیوتا ہوں

اور تمہارے پورے خاندان کو تباہ کر دوں گا۔"

"اور کیا کہہ رہا تھا وہ؟" انکل ایک دم پریشان ہو گئے۔ "اس نے اپنا کوئی نام بھی بتایا؟" وہ بیٹھتے بیٹھتے پھر کھڑے ہو گئے۔

"نام....." میں نے ذہن پر زور دیا۔ "ہاں' شاید چیانگ چی بتا رہا تھا اپنا نام۔"

"چیانگ چی نہیں' چیانگ لی۔" انکل نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "تو گویا چیانگ لی کو خبر ہو ہی گئی۔"

"کون چیانگ لی؟" انکل کے گھبرانے پر آنٹی بھی گھبرا گئیں۔

"ایک بین الاقوامی مجرم ہے۔" انکل نے جواب دیا۔ "پچھلے دو برس سے یہ انٹرپول کی لسٹ پر ہے اور اب یہ منحوس یہاں پہنچ گیا ہے۔"

"مگر اس کی آپ سے کیا دشمنی ہے؟" آنٹی کی گھبراہٹ وحشت میں بدل گئی۔

"مجھ سے کیا دشمنی!" انکل نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "بھئی' پولیس کے ایک آفیسر کی مجرم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر اس نے میرا نام اس لئے لیا کہ اس کے ایک ساتھی کو دو دن پہلے میں نے ہی گرفتار کیا ہے۔ اس کے قبضے میں خاصی اہم نوعیت کی دستاویزات اور مائیکرو فلمز ہیں۔ وہ کم بخت قبول نہیں کر رہا ہے کہ یہ چیزیں اس نے کہاں چھپائی ہیں مگر میں بھی اسے بولنے پر مجبور کر دوں گا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر آنٹی سے بولے۔ "تم ایسا کرو شہلا کو لے کر کچھ دن کے لئے پاکستان سے باہر چلی جاؤ۔"

"نہیں انکل!" آنٹی کی بجائے میں نے جواب دیا۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"ضد مت کرو بیٹا' وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔" انکل نے کہا۔

"خطرناک لوگ ہیں تو ہوا کریں۔" میں نے جواب دیا۔

پھر انکل دیر تک مجھے اور آنٹی کو قائل کرتے رہے کہ ہمیں کچھ دن کے لئے چلے جانا چاہئے مگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی رضامند نہ ہوا۔ اسی وقت دفتر سے ان کا بلاوا آ گیا اور وہ ہمیں محتاط رہنے کی تاکید کر کے چلے گئے۔ انہوں نے گھر پہ گارڈز کا بھی اضافہ کر دیا تھا اور دونوں چوکیداروں کو رائفلیں بھی دے دی تھیں۔ ان کی پریشانی میں عید کا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا تھا۔

انکل خاصی رات گئے لوٹے تو بہت خوش اور مطمئن تھے۔ میں اور آنٹی ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی بتایا کہ چیانگ لی کے ساتھی نے زبان کھول دی ہے۔

"تو کیا آپ نے وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمیں برآمد کر لی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اسی میں تو اتنی دیر لگی۔" انکل نے مسکرا کر کہا۔ "یہ چیزیں صبح میں افسران بالا کے حوالے کروں گا۔" انہوں نے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا پھر ہنس کر بولے۔ "صبح تک

مجھے جاگ کر ان چیزوں کی حفاظت کرنا پڑے گی۔ تم اگر چلی جاتیں تو اچھا ہوتا' خیر دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

آنٹی نے کھانا لگا دیا۔ اس وقت تک ہم دونوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ ہم لوگوں نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ باہر سے زوردار فائرنگ اور چیخوں کی آواز آئی۔ انکل چونک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ کسی بھی وقت غیر مسلح نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے ریوالور نکالا اور باہر کی طرف لپکے مگر دوسرے ہی لمحے اچھل کے دوبارہ کمرے میں آگرے۔ ان کے پیچھے پیچھے چھوٹے قد اور گھٹے ہوئے جسم کا ایک شخص کمرے میں آگیا۔ اس اچانک افتاد پر میں گنگ سی ہو گئی۔

انکل نے چیخ کر کہا۔ "سلمیٰ' شہلا! زمین پر لیٹ جاؤ۔"

میں نے آنٹی کو گھسیٹا اور پھرتی سے قالین پر لیٹ گئی۔ انکل نے اچانک پستہ قد پر فائر کر دیا۔ شاید اسی لئے انہوں نے ہمیں زمین پر لیٹنے کا حکم دیا تھا کہ ہم فائرنگ کی زد میں نہ آ جائیں۔ مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ پستہ قد گویا ہوا میں اڑتا ہوا دوسری طرف چلا گیا اور انکل کی چلائی ہوئی گولی سامنے والی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ انکل نے جھنجلا کر یکے بعد دیگرے اس پر مزید دو فائر کئے مگر وہ دونوں بار اچھل اچھل کر صاف بچ گیا۔ باہر سے ابھی تک فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ باہر یقینی طور پر اس پستہ قد کے ساتھی بھی تھے۔ انکل نے پھر اس پر فائر کئے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر ان کا ریوالور خالی ہو گیا۔

یہ دیکھ کر پستہ قد آگے بڑھا اور انکل کا گریبان پکڑ کر اٹھا لیا' پھر وہ سانپ کی طرح پھنکار کر بولا۔ "مسٹر اکبر! اپنی بیوی اور بیٹی کی خیر چاہتے ہو تو وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز میرے حوالے کر دو جو تم ابھی لے کر آئے ہو۔"

انکل نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں وہ چیزیں گھر نہیں لایا۔"

"بکو مت۔" پستہ قد دہاڑا۔ "تم وہاں سے سیدھے گھر آئے ہو۔ مجھ سے ذرا سی چوک ہو گئی ورنہ میں تمہیں وہاں سے نکلنے نہ دیتا۔ میں اسی وقت سے تمہارے تعاقب میں ہوں۔ سیدھی طرح وہ چیزیں میرے حوالے کر دو ورنہ....."

"ورنہ کیا؟" انکل نے سخت لہجے میں کہا اور کن اکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

"تم سمجھ رہے ہو کہ تم باتوں میں لگا کر میرا وقت برباد کرو گے اور کوئی تمہاری مدد کو آ جائے گا۔" پستہ قد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس خوش فہمی کو دل سے نکال دو۔ باہر بھی میرے آدمی موجود ہیں۔ اب جلدی سے وہ چیزیں میرے حوالے کر دو ورنہ میں تمہاری بیٹی کو لے جاؤں گا۔"

"میں نے بتایا تو ہے کہ وہ چیزیں یہاں نہیں ہیں۔"

جواب میں پستہ قد نے انکل کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ ان کا ہونٹ پھٹ گیا

اور وہ لڑکھڑا کر رہ گئے پھر اس نے چیخ کر کسی کو آواز دی۔ "نارمن!"

دوسرے ہی لمحے کمرے میں لمبا تڑنگا ایک شخص داخل ہوا۔ آنے والا یا تو امریکن تھا یا پھر جرمن۔ اس کے برعکس پستہ قد کا تعلق مشرق بعید کے کسی ملک سے تھا۔ نارمن نے مودبانہ انداز میں کہا۔ "یس باس!"

"مکان کی تلاشی لو۔ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز یہیں کہیں ہوں گی۔ اس کے بیڈ روم سے شروع کرو۔" پستہ قد نے نارمن کو حکم دیا۔

نارمن نے ایک نظر مجھ پر ڈالی' پھر "اوکے باس" کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اچانک انکل نے پستہ قد پر حملہ کر دیا۔ تابڑ توڑ ان کے دو گھونسے پستہ قد کے پیٹ پہ لگے تو وہ کراہتا ہوا فرش پر گر گیا۔ انکل بھاری تن و توش کے مالک تھے اور خاصے پھرتیلے بھی تھے۔ مجھے امید تھی کہ اب وہ پستہ قد کو اٹھنے نہیں دیں گے۔ وہ اوندھے منہ فرش پہ پڑا تھا۔ انکل نے آگے بڑھ کر اس کا کالر پکڑنا چاہا مگر وہ چھپکلی کی طرح ان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل گیا۔ پھر وہ اسپرنگ کی طرح اچھلا اور دونوں لاتیں انکل کے سینے پر مارتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

اسی وقت نارمن کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں وہی بریف کیس تھا جو تھوڑی دیر پہلے انکل لے کر آئے تھے۔ وہ پستہ قد سے بولا۔ "باس! یہ بریف کیس تو سامنے ہی رکھا تھا۔"

بریف کیس دیکھ کر انکل ایک مرتبہ پھر نارمن کی طرف جھپٹے مگر اس خبیث نے بریف کیس پستہ قد کی طرف اچھالتے ہوئے انکل کے پیٹ میں اتنی زور سے لات ماری کہ وہ کراہ کر فرش پر گر گئے۔

اچانک باہر کچھ گاڑیاں رکنے اور فائرنگ کی آواز آئی۔ باہر شاید پولیس آ گئی تھی۔ پستہ قد نے نارمن کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا پھر خود کسی چھلاوے کی طرح اڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اس کے پیچھے نارمن بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر ابھی تک زوردار فائرنگ ہو رہی تھی۔ انکل ابھی تک اوندھے منہ فرش پر پڑے تھے۔ میں جھپٹ کر ان کے پاس پہنچی۔ ان کے چہرے پر کرب کے آثار تھے اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ میں نے سہارا دے کر انہیں صوفے پر بٹھا دیا اس دوران میں آنٹی ان کے لئے پانی لے آئیں۔ انکل نے پورا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا اور نحیف لہجے میں بولے۔ "ان بدبختوں نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ خیر' میں بھی انہیں چھوڑوں گا نہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "شہلا ذرا فون مجھے دو۔"

میں نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر انہیں دیا۔ انکل نے فون کا ریسیور کان سے لگایا تو جھنجلا کر بولے۔ "ربش! الو کے پٹھوں نے ٹیلی فون کا تار بھی کاٹ دیا ہے۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ باہر فائرنگ نہیں ہو رہی۔ پھر کوئی بلند آواز میں بولا۔ "تم لوگ خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔" بولنے والا میگافون استعمال کر رہا تھا۔ اس نے دوسری مرتبہ یہی اعلان انگلش میں کیا مگر جواب میں کوئی آواز سنائی نہ دی۔

تھوڑی دیر بعد بھاری بوٹوں کی آواز کوریڈور میں گونجی' پھر کمرے میں ایک انسپکٹر داخل ہوا۔ اس نے انکل کو سیلوٹ کیا اور بولا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں سر؟"

"میری فکر چھوڑو۔" انکل نے جواب دیا۔ "یہ بتاؤ کتنے آدمی گرفتار کئے؟"

"گرفتار تو کوئی نہیں ہو سکا سر!" انسپکٹر نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "وہ لوگ البتہ اپنے تین ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ گئے ہیں۔"

"حیرت ہے۔" انکل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ سب پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہو گئے اور تم کیسی ڈھٹائی سے کہہ رہے ہو کہ کوئی گرفتار نہیں ہوا۔ کیا وہ لوگ دھواں بن کے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔" انکل چیخ کر بولے۔

"سر' وہ لوگ آپ کے مکان سے باہر نکلنے کی بجائے ساتھ والے مکان میں کود گئے' دو تین بنگلے اسی طرح پھاندنے کے بعد وہ باہر نکل گئے۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے ساری توجہ آپ کے بنگلے پر مرکوز رکھی۔ آئی ایم سوری سر کہ وہ لوگ....."

"انسپکٹر!" انکل دہاڑ کر بولے۔ "تمہیں کس نے مشورہ دیا تھا کہ تم پولیس میں مروس کرو۔ تمہاری یہ ذرا سی غلطی مجھے بہت مہنگی پڑی ہے۔ جاؤ انہیں تلاش کرو گیٹ لاسٹ!"

انسپکٹر سیلوٹ کر کے پھرتی سے باہر نکل گیا۔

انکل اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگے۔ اچانک انہیں کچھ خیال آ گیا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رکے اور آنٹی سے بولے۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ کچھ دن کے لئے کہیں چلی جاؤ مگر تم نہ مانیں۔"

"آج ہی تو آپ نے کہا تھا۔" آنٹی نے آہستہ سے کہا۔ جب انکل غصے میں ہوتے تھے تو وہ بیچاری بالکل سہم جاتی تھیں۔ "میں کیا ایک دم چل دیتی۔ پہلے تو مجھے پاسپورٹ پر ویزہ لگوانا ہو گا' تیاری کرنا پڑے گی۔ اچانک کیسے چلی جاتی۔"

انکل کو شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ نرم لہجے میں بولے۔ "دراصل میں اس وقت اتنا پریشان ہوں کہ میرا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔ بہرحال تم کل پہلی فرصت میں جانے کی تیاری کر لو۔ ویزے تو میں دو گھنٹے میں لگوا دوں گا جاؤ اب تم لوگ سو جاؤ۔"

میں خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ رہ رہ کر مجھے اسی پستہ قد کا خیال آ رہا تھا۔ عجیب چھلاوا قسم کا شخص تھا۔ اتنا پھرتیلا آدمی اس سے قبل میں نے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے تو اس کے انسان ہونے ہی میں شبہ تھا۔ مجھے انکل کی ناکامی کا

صدمہ بھی تھا اس سے پہلے کبھی میں نے انہیں اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

○

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں خوب روشنی تھی حالانکہ میں لائٹ آف کر کے سوئی تھی۔ میں نے اٹھنا چاہا۔ اسی وقت میری نظر ایک اجنبی پر پڑی۔ میں بری طرح چونک اٹھی۔ پستہ قد کی طرح وہ بھی مشرق بعید کے کسی ملک کا باشندہ تھا' غالباً جاپانی تھا۔ بجائے خوف زدہ ہونے کے مجھے غصہ آ گیا۔ "اب کیا چاہتے ہو؟" میں بھنا کر بولی۔
"میرے ساتھ چلو۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "شور کرو گی تو خواہ مخواہ تمہارا باپ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔"
اس کی آواز سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی سی ایک لہر دوڑ گئی یہ وہی تھا جس نے فون پر اپنا تعارف موت کے دیوتا کی حیثیت سے کرایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
"تم..... تم اندر کیسے آئے؟"
"دروازے سے۔" وہ اپنی گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "چیانگ لی دیواروں میں بھی اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ بس اب چل دو۔" یہ کہہ کر وہ اچانک جھپٹا اور اس نے میری دونوں کن پٹیاں دبا دیں۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔
مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور کھڑکیوں پر بھاری پردے پڑے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی' ساتھ ہی اٹیچ باتھ بھی تھا۔ میں نے گھوم پھر کے کمرے کا جائزہ لیا' کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر دیکھے مگر ان پہ مضبوط گرل لگی ہوئی تھی پھر میں نے جھنجلا کر بری طرح دروازہ پیٹ ڈالا۔
فوراً باہر قدموں کی آواز ابھری اور کی ہول میں چابی گھومنے کی آواز آئی پھر آہستہ سے دروازہ کھل گیا' کھولنے والی ایک لڑکی تھی۔ اس کا تعلق بھی مشرق بعید ہی کے کسی ملک سے تھا۔ میں نے جھنجلا کر سوچا' یہ میں کس عذاب میں گھر گئی۔ لڑکی نے بہت ادب سے پوچھا۔
"یس میڈم!"
"میڈم کی بچی!" میں بھنا کر بولی۔ "مجھے یہاں کیوں قید کیا گیا ہے؟"
"یہ تو آپ باس سے پوچھیں۔" اس نے جواب دیا۔
"پھر باس ہی کو یہاں بھیجو۔" میں نے چیخ کر کہا۔
"باس ابھی موجود نہیں ہیں۔ وہ جیسے ہی آئے' انہیں اطلاع دے دوں گی۔ آپ کو اور کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" میں دہاڑ کر بولی۔ "میرے انکل تم میں سے کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔"

وہ لڑکی الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ جاتے ہوئے وہ دروازہ لاک کرنا نہیں بھولی تھی۔

مجھے الجھن ہو رہی تھی کہ آخر یہ چیانگ لی اب مجھے یہاں کیوں لے آیا ہے؟ دستاویزات اور مائیکرو فلمز تو اسے مل ہی گئی ھیں۔ مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ میں یونہی بلا مقصد کمرے میں ٹہلتی رہی' تھک گئی تو بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وال کلاک اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجا رہی تھی۔ وہ منحوس چیانگ لی مجھے یہاں بند کر کے خود نہ جانے کہاں جا مرا تھا۔ میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو مارے خوف کے رو رو کے مر جاتی۔ مگر انکل نے میری تربیت بہت محنت سے کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں خوف زدہ ہونے کی بجائے الجھن میں مبتلا تھی۔ مجھے انکل کی طرف سے پریشانی تھی۔ انہیں میری غیر موجودگی کی اطلاع ملی ہو گی تو ان کا کیا حال ہوا ہو گا۔ وہ مجھے بالکل سگی بیٹی کی طرح چاہتے تھے۔ میرے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جاتا تو پریشان ہو جاتے تھے۔ یہی حال آنٹی کا تھا۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں کے لاڈ پیار نے مجھے خاصا مغرور اور خود پسند بنا دیا تھا۔ میں رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ رات کے ہنگامے اور نیند نہ پوری ہونے کی وجہ سے میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ یہی سب سوچتے سوچتے مجھے ایک مرتبہ پھر اونگھ آ گئی۔

○

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو وہی جاپانی لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ بولی۔ "میڈم! باس واپس آ گئے ہیں۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔"

میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا جو دس بجا رہی تھی۔ میں بغیر کچھ کہے اٹھی اور باتھ روم میں جا کر جلدی جلدی منہ پر دو چار چھپکے مارے' یونہی ہاتھ سے بال درست کئے اور اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ جاپانی لڑکی طویل کوریڈور عبور کر کے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کمرا ڈائننگ روم تھا۔ وہاں خاصی بڑی ڈائننگ ٹیبل رکھی تھی' کم از کم بارہ کرسیاں تھیں مگر سوائے ایک کے سب کرسیاں خالی تھیں ایک کرسی پر وہی منحوس چیانگ لی بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"مسٹر چیانگ لی۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "تم نے آخر مجھے کیوں قید کیا ہے یہاں؟"

"ایک غلط فہمی کی بناء پر بے بی!" وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔

"کیسی غلط فہمی!" میں نے گھور کے اسے دیکھا۔ تمہیں وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز چاہئے تھیں نا! جب تمہارے آدمی وہ چیزیں لے آئے تو پھر تم مجھے یہاں کیوں لائے؟"

"وہ چیزیں میرے آدمی نہیں لائے بے بی!" چیانگ لی گہرا سانس لے کر بولا۔ "انہیں میرا دشمن وانگ یو لے گیا۔"

"وانگ یو؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں وانگ یو۔ وہ بھی میری طرح کورین ہے۔ جسامت بھی میری ہی طرح ہے' بس اس کا سر انڈے کی طرح شفاف ہے۔"

"ہاں' ہاں وہی تھا۔" میں نے بے اختیار کہا۔

"وہ میرا بدترین دشمن ہے مگر کم بخت بہت خوف ناک فائٹر ہے' بجلی کی سی تیزی سے حرکت کرتا ہے۔"

"بالکل وہی۔" میں نے کہا۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ پستہ قد کیسا برق کی طرح کوند رہا تھا۔

"میں نے پہلے تمہارے باپ سے ان کاغذات کے بارے میں پوچھا۔" چیانگ لی نے کہا۔ "پھر اس کے انکار پر میں نے اسے بے ہوش کر دیا اور تمہیں یہاں لے آیا تاکہ تمہارے باپ کو بلیک میل کر سکوں۔ میں نے بعد میں اپنے ذرائع سے معلوم کیا تو تمہارے باپ کی بات درست نکلی۔" چیانگ لی سانس لینے کو رکا پھر بولا۔ "سوری بے بی' میں غلط فہمی میں تمہیں لے آیا۔ کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔"

"مجھے بالکل تکلیف نہیں ہوئی" میں نے جلدی سے کہا۔ میرا ذہن اچانک ہلا پھلکا ہو گیا تھا۔ "بس تم مجھے واپس بھجوا دو۔ گھر والے میرے لئے پریشان ہوں گے۔"

"تم ناشتہ تو کرو۔" اس نے ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ "گھر بھی بھجوا دوں گا۔"

میں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگی۔ چیانگ لی بھی میرے ساتھ شریک ہو گیا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کافی پیتے ہوئے اسے پھر یاد دلایا۔ "مسٹر چیانگ لی۔ پلیز مجھے میرے گھر بھجوا دو۔"

"گھر بھی بھجوا دوں گا لیکن ابھی نہیں۔" وہ مکروہ انداز میں مسکرایا۔

میں چونک کر کھڑی ہو گئی۔ "وہاٹ ڈو یو مین" (کیا مطلب ہے تمہارا؟)

"میرا یہی مطلب ہے۔" وہ ایک مرتبہ پھر خباثت سے ہنسا۔" میں نے تمہارے باپ سے کہہ دیا ہے کہ وہ....."

"شٹ اپ!" میں نے بھنا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے ابھی اور اسی وقت میرے گھر بھجواؤ۔"

"ابھی تم نہیں جا سکتیں۔" چیانگ لی سرد لہجے میں بولا۔ "میں نے تمہارے باپ سے کہہ دیا ہے کہ جب تک مجھے وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز نہیں مل جاتیں' آپ کی بیٹی ہماری مہمان رہے گی۔"

"تمہیں میں نے بتایا تو ہے کہ وہ چیزیں اب ہمارے پاس نہیں ہیں۔" میں دانت پیس

کر بولی۔

"میں جانتا ہوں۔" چیانگ لی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "لیکن اگر میرے ساتھ ساتھ پولیس بھی ان چیزوں کو تلاش کرے گی تو مجھے بہت آسانی ہو گی۔ پولیس کے وسائل کہیں زیادہ ہیں۔ اب آیا تمہاری سمجھ میں!؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں کہتی بھی کیا' بس خاموشی سے اسے گھورتی رہی۔

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔" چیانگ لی پھر گویا ہوا۔ "بس یہاں سے نکلنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ کام ہوتے ہی تمہیں باعزت' طریقے سے واپس چھوڑ آؤں گا۔" یہ کہہ کر چیانگ لی اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب تم آرام کرو۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہہ دینا۔"

مجھے وہاں گھر کا سا آرام تھا۔ بس پریشانی تھی تو یہی کہ میں چیانگ لی کی قیدی تھی۔ چیانگ لی ہی کی زبانی مجھے علم ہوا کہ میری تلاش میں انکل نے پورے شہر کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ چیانگ لی نے نہ جانے مجھے کہاں قید کیا تھا کہ اب تک انکل وہاں نہ پہنچ سکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ انکل جلد یا بہ دیر مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔ انہیں دیر شاید اس لئے ہو رہی تھی کہ ان کی توجہ دو محاذوں پر بٹ گئی تھی۔ میرے ساتھ ساتھ انہیں وانگ یو کی بھی تلاش ہو گی۔ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز پولیس کے لئے بھی تو اہم تھیں۔

مجھے چیانگ لی کی "قید" میں پندرہ دن ہو چکے تھے یا ممکن ہے زیادہ دن ہو گئے ہوں کیوں کہ میں نے وقت کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب میں بات بے بات غصہ بھی نہیں کرتی تھی۔ اپنی ہی توانائی ضائع کرنے والی بات تھی۔ وہ جاپانی لڑکی جو میری خدمت پر مامور تھی' مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئی تھی۔ وہ گھنٹوں میرے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ شاید چیانگ لی نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ مجھے بور نہ ہونے دے۔ چیانگ لی خود تو دو دو دن غائب رہتا تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ چیانگ لی اور اس جاپانی لڑکی کے علاوہ وہاں مزید کتنے آدمی تھے۔

اس دن رات کے کھانے کے بعد میں دیر تک ٹی وی دیکھتی رہی۔ این میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اس کا نام تو خاصا مشکل تھا اس لئے اپنی آسانی کے لئے میں اسے این کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ میں نے این سے کافی لانے کو کہا اور دوبارہ ٹی وی دیکھنے لگی۔ ٹی وی پر انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز فلم چل رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد این کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میں بری طرح اچھل پڑی۔ وہ وانگ یو تھا' وہی گنجا' پستہ قد جو انکل سے دستاویزات اور مائیکرو فلمز لے گیا تھا۔ میں اچھل

کر کھڑی ہو گئی۔ این کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں' حالانکہ وہ خاصی نڈر لڑکی تھی۔ این کے ہاتھوں میں ٹرے تھی جس پر کافی سے بھرے ہوئے دو کپ رکھے تھے۔

مجھ دیکھ کر وانگ یو نرم لہجے میں بولا۔ "چلو بے بی' میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"تم ہو کون؟" میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اتنی جلدی مجھے بھول گئیں۔ وانگ یو نے مایوسی سے سر ہلایا جیسے اسے اس بات سے شدید صدمہ پہنچا ہو' ریوالور اپنی انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔ "بے بی! یہ مصیبت تم پہ میری وجہ سے آئی ہے اس لئے میں تمہیں گھر پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"واہ!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "چور اچکے کب سے اتنے بااصول ہو گئے!؟"

ایک لمحے کو وانگ یو کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا مگر اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔ اس دوران میں این نے ٹرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ وانگ یو کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ اچانک بجلی کی سی تیزی سے گھومی اور حلق سے کاراٹے کی مخصوص آواز نکالتے ہوئے وانگ یو پر جھپٹ پڑی۔

وانگ یو اس حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا اسی لئے مار کھا گیا۔ این کی ایک کک اس کے جبڑے پر پڑی اور دوسری اس کی کلائی پر۔ اس کا ریوالور چھوٹ کر دور جا گرا ور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ منہ پر پڑنے والی کک واقعی بہت خطرناک تھی۔ میرا خیال تھا کہ وانگ یو اب جھوم کے فرش پہ ڈھیر ہو جائے گا۔ این نے دوبارہ اس کی پیشانی اور سینے پر فلائنگ کک مارنا چاہی مگر اب وانگ یو سنبھل چکا تھا۔ وہ ذرا سا جھکا اور این کی ٹانگ گھٹنے کے پاس سے پکڑ لی۔ وہ غیر متوازن ہو کر فرش پر گری اور وانگ یو نے اس کی دوسری ٹانگ پر اپنا پیر رکھ دیا۔ این بری طرح تڑپنے لگی۔

وانگ یو نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں چاہوں تو تیری دونوں ٹانگیں جسم سے علیحدہ کر دوں مگر میں عورتوں کی جان لینے کا قائل نہیں ہوں۔ تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کی' مجھ پہ' وانگ یو پر۔ تیرے لئے یہی سزا کافی ہے کہ تو بقیہ عمر معذوری کی حالت میں گزارے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی کارروائی کرتا' میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ "مسٹر واچنگ یو پلیز! پلیز اسے معاف کر دیں۔"

"یہ معاف کئے جانے کے قابل ہے تو نہیں مگر تمہارے کہنے سے اسے چھوڑ دیتا ہوں۔" وانگ یو نے لات مار کے این کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ 'چلو بے بی' میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"اور اگر میں تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟"

"تو میں تمہیں زبردستی لے جاؤں گا۔"

اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' اس پر عمل بھی کر گزرے گا۔ یوں بھی میں چیانگ لی کی قید میں تھی' پھر وانگ یو کا تو کوئی مطالبہ بھی نہیں تھا کیوں کہ وہ منحوس دستاویزات اور مائیکرو فلمز اسی کے پاس تھیں۔ میں نے اچانک اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ "چلو' تم کہتے ہو تو یونہی سہی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے بھی میں قیدی ہوں۔ چیانگ لی کی نہ سہی' تمہاری سہی۔"

این نے حیرت سے مجھے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے نہ جانے کا اشارہ کیا۔

"زیادہ آنکھیں مت مٹکا!" وانگ یو کرخت لہجے میں بولا "ورنہ تیری دونوں آنکھیں پھوڑ دوں گا۔"

میں وانگ یو کے ساتھ باہر نکلی تو اس کے تین ساتھی ہم سے آ ملے۔ کوریڈور میں چیانگ لی کے دو آدمی غیر فطری انداز میں پڑے تھے۔ گیٹ کے پاس بھی دو آدمی ڈھیر تھے۔ باہر پرانے ماڈل کی ڈاج موجود تھی۔ میں گاڑی میں سوار ہوئی تو وانگ یو نے میری آنکھوں پر سیاہ رنگ کی پٹی باندھ دی۔ میں اس پر احتجاج کرنا چاہتی تھی' پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔ کار کا انجن غرایا اور وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد گاڑی بری طرح ہچکولے کھانے لگی۔ شاید اب وہ کچے راستے میں چل رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد اس سفر کا اختتام ہوا تو مجھے نیچے اتار لیا گیا اور کوئی شخص میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر کی طرف لے چلا۔ پھر مجھ سے پٹی کھولنے کو کہا گیا۔

وہ کوئی آراستہ خواب گاہ تھی۔ مجھے وہاں تک وانگ یو ہی لایا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "سوری بے بی! فی الحال تمہاری خدمت کے لئے ہمارے پاس کوئی عورت نہیں ہے' کل تک انشاء اللہ یہ بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

"کیا" میں بھپر کر بولی۔ "تم نے تو کہا تھا کہ تم مجھے میرے گھر چھوڑو گے!"

"کہاں ہے تمہارا گھر؟" وانگ یو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "وہ گھر تو تمہارا نہیں ہے۔"

"میں سمجھی نہیں' تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں الجھ کر بولی۔

"میری ایک بات کا جواب دو۔" وانگ یو نے کہا۔ "تمہارا کوئی بھائی بھی ہے؟"

اس کی بات پر میں بری طرح چونک اٹھی۔ "تم..... تم کیا جانو میرے بھائی کو؟"

"میرا اندازہ ہے بے بی کہ تم خرم کی بہن ہو۔"

میں تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ "ہاں ہاں' میں خرم کی بہن ہوں مگر میں نے اسے برسوں سے نہیں دیکھا۔ کیا..... کیا..... تم اسے جانتے ہو..... تمہیں کیسے..... معلوم ہوا کہ میں خرم کی بہن ہوں؟" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آنکھیں' پیشانی اور بات کرنے کا انداز بالکل خرم جیسا ہے۔ مجھے چیانگ لی

کے گھر ہی میں شبہ ہوا تھا کہ تم خرم کی بہن ہو۔"
مگر تم نے بتایا نہیں کہ خرم بھیا ہیں کہاں؟"
"وہ میرے ہی ساتھ ہی ہے۔" وانگ یو نے جواب دیا۔ "فی الحال تو وہ بہت مصروف ہے۔ تربیت مکمل ہوتے ہی میں اس سے تمہاری ملاقات کراؤں گا۔"

"تم..... تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟" میں خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی "بھیا خیریت سے تو ہیں..... وہ..... تم تک کیسے پہنچے!....."

"وہ بالکل خیریت سے ہے۔" وانگ یو نے جواب دیا۔ "فی الحال میں اتنا کر سکتا ہوں کہ خرم کی ایک تازہ تصویر تم تک پہنچا دوں۔ دیکھتا ہوں تم اسے پہچانتی بھی ہو یا نہیں۔"

"میں انہیں ایک لاکھ آدمیوں کے بیچ میں بھی پہچان لوں گی..... مگر..... وہ یہاں کیوں نہیں..... آ سکتے..... تم ان سے صرف اتنا کہہ دینا کہ..... شہلا نے بلایا ہے..... وہ ضرور یہاں آ جائیں گے۔"

"وہ اس وقت تربیت کے آخری مراحل میں ہے۔ اگر فوری طور پہ اس نے تربیت چھوڑ دی تو ساری محنت اکارت ہو جائے گی۔ تم کچھ دن صبر کر لو' آخر اتنے برس صبر ہی تو کیا ہے۔" پھر وہ ہنس کر بولا "مجھے امید ہے کہ اب تم یہاں سے جانے کی بات نہیں کرو گی۔"

"نہیں کروں گی۔" میں نے جلدی سے جواب دیا' پھر چونک کر بولی۔ "کہیں یہ تمہاری کوئی چال تو نہیں۔"

"مجھ پہ یقین کرو بے بی!" وانگ یو نے کہا۔ "شاید تم خرم کی تصویر دیکھ کر میری بات پہ یقین کر سکو۔" پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں چلتا ہوں' کل کسی وقت آؤں گا۔ ایک ملازم کمرے کے باہر ہی موجود رہے گا۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو اس سے کہہ دینا۔" یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گیا۔

مجھے ابھی تک وانگ یو کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ کیا واقعی بھیا اس کے ساتھ تھے یا وہ مجھے بہلا رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ کبھی مجھے اس کی بات سچ لگتی تھی اور میں تصور ہی تصور میں بھیا کو دیکھنے لگتی تھی مگر عجیب بات تھی کہ میں جب بھی بھیا کا تصور کرتی تھی وہ مجھے دس گیارہ برس کے چھوٹے سے لڑکے دکھائی دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مجھ سے بچھڑے تھے تو اتنے ہی بڑے تھے۔ ساری رات میں انہی خیالوں میں کھوئی رہی۔ وہ رات میں نے سوتے جاگتے گزاری۔

دوسرے دن وانگ یو بھیا کی تصویر لے آیا۔ اس نے ایک چالاکی کی تھی کہ مجھے آزمانے کی خاطر بھیا کی تصویر کئی تصویروں میں ملا دی تھی اور مجھ سے کہا تھا کہ ان میں سے اپنے بھیا کو پہچانو۔ سب تصویروں میں بھیا ہی کی عمر کے لڑکے تھے۔ آخر ایک تصویر دیکھ کر

میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ وہ بالکل ویسے کے ویسے تھے' وہی آنکھیں' وہی پیشانی' وہی الجھے الجھے بال! میں نے وہی تصویر علیحدہ کرلی اور وانگ یو سے کہا "یہی میرے بھیا ہیں۔"

وانگ یو خوش ہو کر بولا۔ "تم نے بالکل صحیح پہچانا۔ یہی خرم ہے۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "اب تو تمہیں میری بات کا یقین آ گیا ہو گا۔ بس تم کچھ دن مزید صبر کر لو۔ ٹریننگ سے فارغ ہوتے ہی میں خرم کو یہاں لے آؤں گا۔ وہ بھی دن رات تمہیں یاد کرتا ہے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "ہاں وہ تمہارے لئے ایک ملازمہ بھی لے آیا ہوں میں۔ وہ لڑکی تھائی ہی ہے۔ اب میں کچھ دن بعد آؤں گا۔ بہت سے ضروری کام التواء میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہاں ایک بات اور' چیانگ لی پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کر رہا ہے اس لئے گھر سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔" یہ کہہ کر وانگ یو چلا گیا۔

○

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام وقار عظیم

تقریباً" دو مہینے بھیا سے ملنے کی حسرت میں گزر گئے۔ وانگ یو ہر بار یہی کہہ دیتا تھا کہ بس چند دن صبر کر لو۔

اس دن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وانگ یو سے دو ٹوک بات کروں گی۔ اگر اس نے اب بھی مجھے بھیا سے نہ ملوایا تو یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گی۔ اب تو انکل بھی بھیا کا سراغ لگا سکتے تھے۔

وانگ یو عموماً" رات کو نو بجے کے بعد آیا کرتا تھا۔ میں نے بجے سے اس کا انتظار کر رہی تھی' پھر دس بج گئے مگر وانگ یو نہ آیا۔ جب بارہ بجے تو میں اس کی طرف سے مایوس ہو کر سونے کے لئے لیٹ گئی۔

عموماً" میں سات بجے تک بیدار ہو جاتی تھی۔ اس دن مجھے ملازمہ نے پانچ ہی بجے اٹھا دیا۔ میں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہے؟"

"نارمن آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ کوئی اہم پیغام لے کر آیا ہے۔"

"کہاں ہے نارمن؟" میں نے نائٹ گاؤن پہنتے ہوئے پوچھا۔

"نارمن' وانگ یو کا خاص آدمی تھا۔ وہ امریکن تھا اور خاصا دلچسپ آدمی تھا۔ وانگ یو کے ساتھ اکثر وہ بھی میرے کمرے میں آ جاتا تھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ خرم میرا بھائی ہے۔

وہ ڈرائنگ روم میں اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "خیریت تو ہے نارمن' تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"خیریت نہیں ہے بے بی!" وانگ یو کی طرح وہ بھی مجھے بے بی کہتا تھا۔ "تم چلنے کی تیاری کرو۔"

"لیکن کہاں؟" میں الجھ کر بولی۔ "اور کیوں تیاری کروں چلنے کی؟"

"چیانگ لی کے آدمیوں نے کل رات کو وانگ یو کے بنگلے پر حملہ کیا تھا۔ وانگ یو اس حملے میں مارا گیا اور تمہارا بھائی خرم وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز لے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ چیانگ لی کے آدمی اس کے پیچھے ہیں۔"

"کیا..... وا..... وانگ یو مارا گیا؟" میں نے سرگوشی کی۔ مجھے اس کی موت پر افسوس

ہوا تھا۔

"ہاں ہاں، اب جلدی کرو۔" نارمن جھنجلا کر بولا۔ "ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ چیانگ لی کے آدمی وانگ یو کے بنگلے تک پہنچ سکتے ہیں تو یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

میں بغیر کچھ کہے اپنے کمرے میں گئی اور وہی سوٹ پہن لیا جس میں یہاں آئی تھی۔ وانگ یو کے دیئے ہوئے کپڑے اور جوتے میں نے وہیں چھوڑ دیئے اور دس منٹ سے بھی کم وقت میں تیار ہو کر نارمن کے ساتھ نکل گئی۔ باہر نارمن کی ٹوسیٹر موجود تھی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ خرم بھیا دستاویزات وغیرہ لے کر وہاں سے نکل گئے ہیں؟"

"وانگ یو کے قتل کے بعد ہی میں وہاں پہنچا تھا۔ اس وقت تک پولیس وہاں نہیں پہنچی تھی۔ وانگ یو کے کمرے میں اور باہر کوریڈور میں کئی لاشیں پڑی تھیں۔ وہ سب کے سب زبردست فائٹر تھے۔ صرف خرم ہی انہیں ٹھکانے لگا سکتا ہے۔" نارمن بولتے بولتے رکا، پھر ذرا توقف کے بعد بولا "پھر یہ کہ خرم وہاں سے غائب ہے۔ آخر اسے فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز وہی لے گیا۔"

"تو اب خرم بھیا سے میری ملاقات نہیں ہو سکتی!" میرے لہجے میں مایوسیوں کا دکھ تھا۔

"نہیں، اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔" نارمن نے مجھے تسلی دی۔ "خرم جلد یا بہ دیر ہم سے رابطہ ضرور کرے گا۔"

"تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو میں کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں ہوں۔" نارمن نے جواب دیا۔ "ان لوگوں کی توجہ جونہی خرم سے ہٹی، وہ چن چن کر وانگ یو کے آدمیوں کو ہلاک کریں گے۔"

"اور وانگ یو کے آدمی موم کے بنے ہوئے ہیں کہ ہلاک ہو جائیں گے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بات یہ نہیں ہے۔" نارمن ناگواری سے بولا۔ "وانگ یو کی موت کے بعد ہم لوگ بکھر گئے ہیں اور ہمارے بیشتر ساتھی مایوس اور شکستہ دل ہیں۔ ایسے لوگوں کو شکار کرنا مسئلہ نہیں ہوتا۔"

پھر میں کافی دیر تک کچھ نہ بولی۔ نارمن شاید میری باتوں کا برا مان گیا تھا اس لئے وہ بھی خاموش تھا۔ پھر اس خاموشی کو میں نے ہی توڑا "تم نے بتایا نہیں کہ اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"میرا ایک ایرانی دوست ہے، فی الحال تو میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔" نارمن نے جواب دیا۔

"ممکن ہے بھیا اور تمہارے دوسرے ساتھی بھی وہیں ہوں گے۔"

"وہ ایرانی ہمارے گینگ کا نہیں بلکہ صرف میرا دوست ہے۔" نارمن ہنس کر بولا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ اس کا تعلق زیر زمین دنیا سے ہے مگر وہ میرا ذاتی دوست ہے' کاروباری نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد نارمن کی ٹوسیٹر ڈیفنس کے ایک بنگلے پر جا کر رک گئی۔ ہارن کے جواب میں فوراً ہی دربارن نمودار ہوا۔

نارمن کو دیکھتے ہی اس نے گیٹ کھول دیا۔ نارمن نے ٹوسیٹر پورچ میں جا کر روک دی۔ برآمدے میں درمیانے قد اور ورزشی جسم کے ایک ادھیڑ عمر ایرانی نے ہمارا استقبال کیا۔

"شہلا' یہ جمشید شیرازی ہے۔" نارمن نے اس کا تعارف کرایا' پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ایرانی سے بولا۔ "یہ میری دوست شہلا ہے۔"

"پھر ان امریکنوں اور کورین سے آپ کا کیا تعلق ہے؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

مجھے اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ نارمن نے اسے اپنا دوست کہا تھا اور وہ مجھ سے بہت طنزیہ انداز میں پوچھ رہا تھا کہ اس "امریکن" سے میرا کیا تعلق؟ طنز سے زیادہ اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "جو ایک ایرانی اور امریکن کا ہو سکتا ہے۔"

"یار جمشی!" نارمن نے ہنس کر کہا۔ "میرے سامنے تو تمہیں انگلش میں بات کرنا چاہیے۔"

"سوری نارمن!" جمشید نے جلدی سے کہا۔ "چلو اندر چلو۔"

پھر نارمن نے اسے وانگ یو کی ہلاکت کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتا دیا کہ جن اہم دستاویزات اور مائیکرو فلمز کی وجہ سے وانگ یو قتل ہوا ہے' وہ محفوظ ہیں۔

"وہ میٹر کہاں ہے؟" جمشید چونک کر بولا۔

"ان چیزوں کو خرم نکال لے گیا ہے۔" نارمن نے کہا۔

"یار تو پھر وہ محفوظ کہاں ہیں؟" جمشید مضطرب ہو کے بولا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے بھی ان منحوس کاغذات سے کوئی دلچسپی ہو۔ "یہ خرم وہی لڑکا ہے نا جسے وانگ یو نے "ناقابل تسخیر" بتایا ہے۔ اگر یہ وہی ہے تو پھر ان کاغذات سے ہاتھ دھو رکھو۔ اب وہ تمہارے قابو میں نہیں آئے گا۔"

"ارے نہیں یار" نارمن ہنس کر بولا۔ "خرم ایسا بدنیت نہیں ہے۔" پھر وہ توقف کے بعد بولا۔ "اور یہ بھی سن لو کہ خرم شہلا کا بھائی ہے۔"

"بھائی!" جمشید نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

"بالکل سگا بھائی۔" نارمن نے جواب دیا۔
"میرے خیال میں تم لوگ فریش ہو جاؤ' پھر ناشتہ کرتے ہیں۔" پھر جمشید مجھ سے مخاطب ہوا۔ "خانم شہلا! آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ بالکل تکلف نہ کریں۔ خرم میرا بھی بہت اچھا دوست ہے۔ اس کی بہن میری بہن ہے۔"
اس نے مجھے میرا کمرہ دکھایا اور آرام کرنے کی تاکید کر کے چلا گیا۔ مجھے رہ رہ کر جمشید کی منافقت پر غصہ آ رہا تھا۔ پہلے وہ بھیا کی طرف سے بدگمان تھا مگر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ میرے بھائی ہیں تو اس کا رویہ فوراً بدل گیا۔ مجھے وہ عیار شخص ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔
میں نہا دھو کر تازہ دم ہوئی تو دیر تک جمشید یا نارمن کے انتظار میں بیٹھی رہی' مگر وہ دونوں ہی شاید مجھے بھول گئے تھے۔ اس کمرے میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور یونہی ٹہلتی ہوئی کوریڈور میں نکل آئی۔ ایک کمرے کی کھلی کھڑکی سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اپنا نام سن کر چونک اٹھی۔ وہ واضح طور پر جمشید کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یار نارمن! ان دستاویزات اور مائیکرو فلمز کے لئے ہمیں شہلا کو یہیں روکنا ہو گا۔ اس کی وجہ سے ہم خرم سے سودے بازی کر سکیں گے ورنہ وہ یوں تو قابو میں نہیں آئے گا۔"
"یار مگر ہم اسے یہاں روکیں گے کیسے؟" نارمن الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اور اگر خرم نے سودے بازی کرنے کی بجائے یہاں دھاوا بول دیا تو اس سے کون نمٹے گا! میں نے شہلا کے سامنے جھوٹ بولا تھا کہ خرم میرا دوست ہے۔ ہم دونوں وانگ یو کے ساتھ کام ضرور کرتے رہے ہیں مگر آج تک خرم سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔"
"پھر تم شہلا کو اپنے ساتھ کیوں لائے ہو؟" جمشید کا لہجہ تیز ہو گیا۔
"خرم بہت کام کا آدمی ہے۔ میں شہلا کو یہی سوچ کر لایا تھا کہ ممکن ہے کسی مرحلے پر اس کے ذریعے خرم سے تعلقات خوشگوار ہو سکیں۔ وہ کم از کم میرا احسان مند تو ہو گا۔"
"تو بس یہی وہ مرحلہ ہے جب اس کی بہن ہمارے کام آ سکتی ہے۔"
پھر کمرے میں آہٹ گونجی تو میں پھرتی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ شاید وہ دونوں کمرے سے باہر آ رہے تھے۔
میرا اندازہ درست نکلا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں میرے کمرے میں موجود تھے۔ مجھے ان دونوں کی شکلیں زہر لگ رہی تھیں۔ جمشید نے عیاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خانم شہلا! آیئے ناشتہ تیار ہے۔"
نفرت کی شدید لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی مگر میں نے خود پر قابو پا لیا۔
ناشتے کی میز پر میں نے نارمن سے کہا۔ "مجھے انکل اکبر کے پاس بھجوا دو۔ میں ان کے

پاس زیادہ محفوظ رہوں گی۔"

"انکل اکبر!" جمشید نے استفسار طلب نظروں سے نارمن کو دیکھا۔

"ہاں' ڈی آئی جی کرائمز اکبر علی شہلا کے انکل ہیں۔" نارمن نے وضاحت کی۔

"چلی جانا خانم!" جمشید نے چاپلوسی کا مظاہرہ کیا۔ "کچھ دن ہمیں بھی میزبانی کا موقع دو کل کو تمہارا بھائی یہ نہ کہے کہ تم لوگوں نے میری بہن کی خاطر نہیں کی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "آپ لوگ پلیز مجھے گھر چھوڑ دیں۔"

فی الوقت تو یہ ممکن نہیں خانم!" جمشید نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "میں خود بھی جا سکتی ہوں گھر!"

"ایسی غلطی بھی مت کرنا خانم!" جمشید کا لہجہ سرد تھا۔ "میرا چوکیدار پاگل قسم کا آدمی ہے۔ وہ بالکل لحاظ نہیں کرے گا کہ تم خرم کی بہن ہو' پھر میرے خونخوار کتے چشم زدن میں اجنبیوں کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں' چاروں گرے ہاؤنڈز ہیں اور تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ گرے ہاؤنڈز کتنی خوف ناک اور خونخوار نسل ہے۔"

"میں یہاں کتوں کی اقسام پر بحث کرنے نہیں آئی ہوں۔" میں بھنا کر بولی۔ "میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" میں نارمن کی طرف مڑی۔ "اس لئے لائے تھے تم مجھے یہاں۔ میرے ذریعے میرے بھائی سے سودے بازی کرو گے؟"

"شہلا پلیز' مجھے غلط مت سمجھو۔" نارمن جلدی سے بولا۔ "میں تمہارا دشمن نہیں ہمدرد ہوں۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اس کی ضمانت میں لیتا ہوں۔"

"کیا خوب ہمدردی ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "بس مجھے واپس جانا ہے۔"

"شہلا پلیز ضد مت کرو۔" نارمن نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد تمہیں خود تمہارے گھر چھوڑ کر آؤں گا' بس ایک دفعہ خرم سے رابطہ ہو جائے۔"

میں نے بہت شور مچایا مگر ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نارمن تو شاید مان جاتا مگر جمشید اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ عیار اور لالچی تھا۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں بھی عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ پہلے وہ چیانگ لی مجھے اغوا کر لایا' پھر وانگ یو صاحب میرے ہمدرد بن کر نمودار ہوئے اور خود مارے گئے' پھر یہ نارمن آ گیا اور اب میں اس منحوس جمشید کی قید میں تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگتی تھی کہ کاش بھیا کو کسی طرح علم ہو جائے کہ میں کہاں قید ہوں تو مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور ان لوگوں کی خبر لیں گے۔

ایک ہفتے بعد جمشید نے یہ اطلاع دے کر مجھے مایوس کر دیا کہ بھیا ایران میں ہیں اور جمشید کے ایک ساتھی مشہدی کی قید میں ہیں۔ اس کے بعد کے واقعات کا کچھ علم تو آپ کو بھی ہے۔ کافی دن تک میں جمشید کی قید میں رہی' پھر کسی طرح چیانگ لی کو معلوم ہو گیا کہ

میں وہاں قید ہوں۔ ایک رات اس نے جمشید کے بنگلے پر حملہ کیا اور مجھے وہاں سے نکال لایا۔ اس حملے میں نارمن اور جمشید دونوں مارے گئے۔ چیانگ لی نے مجھے اپنے ایک ساتھی کی تحویل میں دیا جسے سب لوگ باس کہتے تھے۔ اسی کا ایک ساتھی مسٹر او بھی تھا۔ مجھے باس کی تحویل میں دے کر چیانگ لی کسی اور چکر میں بیرون ملک چلا گیا۔ پھر آپ لوگ مجھے وہاں سے نکال لائے۔

○

شہلا بولتے بولتے تھک گئی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی' کمرے میں بوجھل سناٹا تھا۔ صرف شہلا کے سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کافی دیر تک کوئی بھی کچھ نہ بولا۔ آخر اس گھمبیر خاموشی کو برڈ کی آواز نے توڑا۔ "چیانگ لی کب تک واپس آئے گا؟" اس نے شہلا سے پوچھا۔

"میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اب وہ پہلی فرصت میں پاکستان آئے گا۔ اب تک اس بات کی تصدیق نہیں ہوئی تھی کہ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمیں بھیا کے پاس ہیں۔ اب مسٹر او اس بات کی تصدیق کر دے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "بھیا ان خونی کاغذات سے جان چھڑا کیوں نہیں لیتے۔ دے دیں وہ کاغذات ان لوگوں کو تاکہ ہم سکون سے جی سکیں۔"

"وہ کاغذات قومی اہمیت کے حامل ہیں گڑیا!" میں نے جواب دیا۔ "حکومت کی امانت ہیں۔ اگر خدانخواستہ وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئے تو نہ صرف پاکستان کو بلکہ پورے اسلامی بلاک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ میں انہیں محکمہ خارجہ کے کسی ذمے دار افسر کے حوالے کروں گا۔"

"تو پھر اس سلسلے میں انکل اکبر سے بات کریں۔ میری نظر میں ان سے زیادہ ذمے دار کوئی اور نہیں ہے۔" شہلا نے کہا۔

"ہاں' یہی کرنا پڑے گا۔" میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

"یار خرم! ان کاغذات کو گھر میں رکھنا مناسب نہیں ہے۔" برڈ نے تشویش زدہ انداز میں کہا۔ "اگر خدانخواستہ دشمن یہاں تک پہنچ گئے تو خاصی پریشانی ہو جائے گی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ انہیں جلد از جلد اکبر صاحب کے حوالے کر دوں۔"

"مناسب خیال ہے۔" برڈ نے کہا تو کلارا اور تہمینہ نے بھی اس کی تائید کی۔

"چلو بھئی ابھی چلتے ہیں۔" برڈ نے کہا۔

"ابھی صبح کے چار بجے ہیں۔ اس وقت اکبر صاحب کو بے آرام کرنا مناسب نہیں ہے۔ دو چار گھنٹے بعد چلے جانا۔" کلارا نے کہا۔

"اس وقت چلنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" شہلا نے کہا۔ "انکل سے تکلف کیسا؟ یوں بھی وہ علی الصباح بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ وہ بالکل پریشان نہیں ہوں گے۔ ہم صبح کا ناشتہ انہی کے ساتھ کریں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ پہلے ایک کپ گرما گرم کافی نہ پی لیں۔" برڈ نے مسکرا کر رضوانہ کی طرف دیکھا۔

"اس گھر کی مالکہ اب کلارا ہے یا پھر شہلا۔" رضوانہ نے آنکھیں نچا کر کہا۔ "کافی کی فرمائش بھی انہی سے کرو۔"

"ہاں' میں بنا دیتی ہوں کافی۔" شہلا اٹھتے ہوئے بولی۔

"چلو' میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" تہمینہ نے کہا۔ پھر وہ دونوں اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئیں۔

ساری رات اور دن کا بیشتر حصہ میں نے جاگتے گزارا تھا مگر تھکن کا نام و نشان نہیں تھا۔ شاید شہلا کے ملنے کی خوشی میں میری تھکن جاتی رہی تھی۔ میں نے سوچا' جب تک شہلا کافی لے کر آئے' میں نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤں۔

میں باتھ روم سے نکلا تو کافی کی مسحور کن مہک نے میرا استقبال کیا۔ شہلا نے واقعی بہت اچھی کافی بنائی تھی۔ تہمینہ جلدی جلدی سینڈو چز بنا لائی تھی اور اب وہ دونوں ہم لوگوں کی خاطر کر رہی تھیں۔ تہمینہ حیرت انگیز طور پر شہلا سے مشابہت رکھتی تھی صرف چہرے میں فرق تھا ورنہ اس کی جسامت' قد و قامت' چال ڈھال' سبھی کچھ شہلا کی طرح تھا۔

کافی پیتے پیتے پانچ بج گئے۔ پھر ہم لوگ روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ برڈ میرے ساتھ چلنا چاہتا تھا مگر گھر کی حفاظت کے خیال سے میں نے اسے وہیں رکنے کی تاکید کی۔ البتہ رضا کو میں نے ساتھ لے لیا۔ تہمینہ بھی میرے کہنے پر گھر ہی میں رک گئی۔ اسے میں نے اس خیال سے گھر میں چھوڑ دیا کہ ضرورت پڑنے پر وہ برڈ کی خاصی مدد کر سکتی تھی۔ کلارا ضد کر کے ہمارے ساتھ ہی چل رہی تھی۔ اسٹیرنگ میرے ہاتھ میں تھا اور کلارا میرے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر رضا اور شہلا تھے۔

میں جونہی مین روڈ پر نکلا' ایک گاڑی زن سے ہمارے برابر سے گزر گئی۔ میں نے یونہی عقب نما آئینے پر نظر دوڑائی تو چونک اٹھا۔ ہمارے برابر سے گزرنے والی گاڑی یوٹرن لے رہی تھی۔ سڑک اس وقت بالکل سنسان تھی' صبح کا وقت تھا مگر ابھی تک اندھیرا تھا۔ میں نے لیمپ پوسٹ کی روشنی میں دیکھا' وہ سیاہ رنگ کی مرسڈیز تھی اور اب تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ میں نے اچانک رفتار بڑھا دی اور رضا سے کہا۔ "ایک گاڑی ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ تم بالکل تیار رہو۔ ممکن ہے ابھی فائرنگ شروع ہو جائے۔"

ہماری گاڑی کا انجن بہت طاقت ور تھا مگر اس کے باوجود مرسڈیز سے اس کا کیا مقابلہ۔

میں گاڑی بہت اسپیڈ میں چلا رہا تھا مگر مرسڈیز رفتہ رفتہ فاصلہ کم کر رہی تھی۔ میں نے سوچا' ممکن ہے یہ میرا وہم ہو اور مرسڈیز ہمارے تعاقب میں نہ ہو۔ دوسرے ہی لمحے میری خوش فہمی دور ہو گئی کیوں کہ مرسڈیز سے بے آواز فائر ہوا تھا اور گولی گاڑی کی چھت سے رگڑ کھاتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں نے بھی غیرارادی طور پر اپنا ریوالور نکال لیا۔

"اسٹیرنگ مجھے دو خرم!" کلارا چیخ کر بولی۔ "تم دونوں طرف توجہ نہ دے سکو گے۔"

"اب اتنا وقت نہیں ہے کہ میں گاڑی روک کر اسٹیرنگ سیٹ خالی کروں۔" میں نے جواب دیا۔ "اتنی دیر میں وہ لوگ سر پر پہنچ جائیں گے۔ کاغذات کی موجودگی میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔"

"وہ تو یوں بھی ہمارے سر پر پہنچ جائیں گے۔ "کلارا نے کہا۔ "روکو گاڑی' اتنی دیر تک رضا ان لوگوں کو نزدیک نہیں آنے دے گا۔"

میں نے اللہ کا نام لے کر گاڑی روک دی اور برق رفتاری سے الٹی قلا بازی کھا کر پچھلی سیٹ پر گیا۔ میرے ہٹتے ہی کلارا نے اسی تیزی سے اسٹیرنگ سنبھالا اور جب میں قلا بازی کھا کر دوبارہ فرنٹ سیٹ پر پہنچا تو کلارا جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا چکی تھی۔ اس تمام کارروائی میں بہ مشکل چند سیکنڈ لگے تھے۔

اس دوران میں مرسڈیز بالکل ہمارے سر پر پہنچ گئی تھی۔ ہم اس وقت تک پل کراس کر کے گورا قبرستان کے سگنل تک پہنچ گئے تھے۔ شارع فیصل پر ٹریفک چل رہی تھی۔ پھر کلارا نے ایسی خوف ناک حرکت کی کہ میں دھماکے کے لئے ذہنی طور پر بالکل تیار ہو گیا۔ شارع فیصل پر دائیں طرف سے ایک کار بہت برق رفتاری سے آ رہی تھی۔ اس کی پرواہ کئے بغیر کلارا ایک دم شارع فیصل پر آ گئی۔ دائیں جانب سے آنے والی کار نے اچانک بریک لگائی۔ متوقع تصادم کے خوف سے میں نے سانس روک لی مگر کلارا نے اتنی برق رفتاری سے گاڑی ایئرپورٹ کی سمت موڑ لی کہ اس کے دائیں طرف کے دونوں پہیے زمین سے اٹھ گئے۔ دوسری کار والے نے چیخ کر کچھ کہا۔ یقینی طور پر اس نے شہلا کو گالی دی ہو گی مگر اس دوران ہم کافی آگے نکل چکے تھے۔ میں نے گھوم کر دیکھا' مرسڈیز بھی طوفانی رفتار سے ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کا ڈرائیور بھی خاصا مشاق تھا۔ میں نے چیخ کر کلارا سے کہا کہ گاڑی بائیں طرف موڑ لو۔ پھر سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کی ٹرننگ آتے ہی کلارا نے اسٹیرنگ بائیں طرف گھما دیا۔ اس سے آگے چوراہا تھا اور اس کے ساتھ ہی علامہ آئی آئی قاضی ہال تھا۔ وہاں سڑک کافی چوڑی ہو گئی تھی۔ فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ چند گاڑیاں کھڑی تھیں۔

میں نے کلارا سے کہا کہ انہی گاڑیوں کے ساتھ اپنی گاڑی پارک کر کے انجن بند کر دو۔ دوسرے ہی لمحے کلارا نے اپنی گاڑی انہی گاڑیوں کے بیچ میں روکی اور پھرتی سے انجن

اور لائٹس بند کر دیں۔ پھر ہم لوگ اس حد تک جھک گئے کہ باہر سے کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ گاڑی روکتے ہی کلارا نے بھی اپنی جینز سے ریوالور نکال لیا۔ رضا نے اچانک اپنے طور پر فیصلہ کیا اور دروازہ کھول کر باہر رینگ گیا۔ اس نے خاصی حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ ہم لوگ اگر خدانخواستہ گاڑی میں پھنس جاتے تو وہ باہر سے ہماری مدد کر سکتا تھا۔ اس تمام کارروائی میں مشکل سے ایک منٹ لگا ہو گا۔ میں نے عقب نما آئینہ اس زاویے میں گھما لیا تھا کہ سیٹ پر لیٹ کر بھی مجھے کم از کم مرسڈیز کی لائٹس اس میں نظر آ سکی تھیں۔

رضا کے اترتے ہی چوراہے پر مرسڈیز نمودار ہوئی۔ اس وقت اس کی رفتار بہت کم تھی۔ ڈرائیور شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہماری گاڑی کس طرف گئی ہے۔ پھر اچانک مرسڈیز بائیں طرف مڑی اور تیز رفتاری سے روانہ ہو گئی۔ اپنے خیال میں ڈرائیور نے بہت درست اندازہ لگایا تھا۔ وہی سمت ایسی تھی جدھر جا کر ہم اتنی جلدی نظروں سے اوجھل ہو سکتے تھے۔ ہماری گاڑی اگر سیدھی جاتی تو اسے دکھائی دے جاتی۔

ان کے جاتے ہی رضا دوبارہ گاڑی میں سوار ہو گیا۔ میں نے کلارا سے کہا کہ گاڑی اسی طرف واپس لے چلو جہاں سے ہم آئے ہیں۔ کلارا نے بغیر کچھ کہے انجن اسٹارٹ کیا' ٹریفک قوانین کی پروا کئے بغیر وہیں سے یوٹرن لے کر گاڑی واپسی کے راستے پر ڈال دی۔

"میرا خیال ہے کہ گھر جانے کی بجائے ہم اجالا ہونے تک کچھ وقت کہیں اور گزاریں دیں۔" رضا نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

"نہیں' میرا خیال ہے کہ ہم وقت ضائع کئے بغیر اکبر صاحب کی طرف چلیں۔" پھر میں نے کلارا سے کہا۔ "مین روڈ سے بائیں طرف موڑ لینا۔ یہاں سے ہم ڈرگ روڈ تک جائیں گے' پھر وہاں سے ہم راشد منہاس روڈ پر نکلیں گے اور نیپا چورنگی سے ہوتے ہوئے اکبر صاحب کے گھر چلیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اکبر صاحب کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں ہو گا۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" شہلا نے کہا۔ "گلشن چورنگی سے بائیں طرف بلاک فائیو ہے۔ اکبر صاحب کا بنگلہ اسی طرف ہے۔"

ہم اکبر صاحب کے بنگلے کے سامنے رکے تو صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ سڑک پر دودھ اور اخبار والے جا رہے تھے۔

میں نے کال بیل دبائی تو فوراً ہی پولیس کے ایک کانسٹیبل نے ذیلی کھڑکی کھول کے باہر جھانکا۔ وہ شاید نیا آدمی تھا اور شہلا کو پہچانتا نہیں تھا۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ "کس سے ملنا ہے؟"

"ہمیں اکبر صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے گھور کر مجھے دیکھا' پھر شہلا اور کلارا پر نظر ڈالی اور بولا۔ "اتنی صبح صبح صاحب

کسی سے نہیں ملتے۔"

"تم کیا نئے آئے ہو ڈیوٹی پر؟" شہلا نے کہا۔ "ان سے کہو کہ شہلا آئی ہے۔"

"شہلا!" کانسٹیبل چونک کر بولا۔ "صاحب کی بیٹی!"

"ہاں' صاحب کی بیٹی!" شہلا نے منہ بنا کر کہا۔ میں نے غور کیا کہ کانسٹیبل سے بات کرتے ہوئے شہلا کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا تھا' آواز خواہ مخواہ رعب دار ہو گئی تھی۔

کانسٹیبل تیزی سے اسی مختصر سے کمرے میں گھس گیا جو گیٹ کے ساتھ ہی واقع تھا۔ شاید وہ انٹرکام پر اکبر صاحب کو اطلاع دے رہا تھا۔ پھر فوراً ہی وہ واپس آیا اور بولا۔ "آیئے چھوٹی بی بی' آپ اندر آ جایئے۔ صاحب بھی آ رہے ہیں۔"

کانسٹیبل نے ہم میں سے کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میں نے بھی اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اکبر صاحب کے آنے پر تو ہمیں اندر جانا ہی تھا۔ گیٹ کی ذیلی کھڑکی البتہ کھلی ہوئی تھی۔ اس میں سے بنگلے کا لان برآمدہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پھر میں نے باوقار سے ایک صاحب کو دیکھا۔ وہ دیوانہ وار بھاگتے ہوئے گیٹ کی طرف آ رہے تھے۔ وہ جونہی نزدیک آئے' شہلا دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ صاحب بھی بچوں کی طرح رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "تو کہاں چلی گئی تھی بیٹی؟ تو ٹھیک تو ہے نا!"

"میں بالکل ٹھیک ہوں انکل!" شہلا نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔

"یہاں کیوں کھڑی ہے؟ اندر چل' تیری آنٹی کی حالت بہت خراب ہے۔ جب سے تو گئی ہے' وہ ہر وقت روتی رہتی ہیں۔" پھر ان کی نظر کھلے ہوئے گیٹ سے ہم لوگوں پر پڑی تو وہ چونک اٹھے اور شہلا کو چھوڑ کر سخت لہجے بولے۔ "کون ہو تم اور یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

"انکل' یہ میرے بھائی خرم ہیں۔" شہلا نے جلدی سے کہا۔

"خرم!" انہوں نے حیرت سے دہرایا۔ اور میرے گلے لگ کر دھاڑیں مار کے رونے لگے۔ "اندر آ جاؤ بیٹا' باہر کیوں رک گئے؟" پھر وہ رضا اور کلارا کی طرف دیکھ کر بولے۔ "غالباً یہ لوگ بھی تمہارے ساتھ ہیں' آ جاؤ بھئی تم لوگ بھی آ جاؤ۔" ہم اندر داخل ہوئے تو اکبر صاحب مجھ سے بولے۔ "معاف کرنا بیٹا! میں نے تم سے سخت لہجے میں بات کی مگر حالات ایسے ہیں کہ میں اپنے سائے پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں میں نے آپ کی بات کا برا نہیں مانا۔"

"آنٹی کیسی ہیں انکل؟" شہلا نے پوچھا۔

"ان کی طبیعت بہت خراب ہے بیٹی۔" انکل نے جواب دیا۔ "گزشتہ رات بھی وہ ایک

لمحے کے لئے نہیں سوئیں، تمام وقت تمہیں یاد کرتی رہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کی آنکھ لگی ہے۔" وہ باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

ہم لوگ ابھی اطمینان سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ باوقار سی ایک خاتون حیران و پریشان ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں اور "میری بچی!" کہہ کر شہلا سے لپٹ گئیں۔

وہ یوں زار و قطار رو رہی تھیں جیسے ان آنسوؤں میں شہلا کو بھگو دیں گی۔ شہلا بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس موقع پر مجھے امی یاد آ گئیں۔ میرے دل سے بے اختیار ہوک سی اٹھی کہ کاش ہماری ماں بھی اتنی ہی مقدس اور محبت کرنے والی ہوتیں، کاش! وہ پاکیزہ اطوار کی مالک ہوتی تو ہم یوں در بدر نہ ہوتے۔ امی کا خیال آیا تو میرے منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔

"چلو بھئی، پہلے ناشتہ کر لو، پھر باتیں کریں گے۔" اکبر صاحب نے کہا۔

ہم سب وہاں سے اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھے۔

ناشتے کے بعد میں نے اکبر صاحب سے کہا۔ "اکبر صاحب! آپ کی ایک امانت میرے پاس ہے، میں اسے لوٹانے آیا ہوں۔"

"میری امانت!" اکبر صاحب نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں، آپ کی امانت!" یہ کہہ کر میں نے خاکی رنگ کا وہ لفافہ اکبر صاحب کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے بھئی؟" انہوں نے الجھ کر کہا، پھر چونک کر بولے۔ "اور یہ تم مجھے اکبر صاحب کس خوشی میں کہہ رہے ہو۔ اس سے غیریت کی بو آ رہی ہے۔ شہلا کی طرح تم بھی مجھے انکل کہو بیٹا!" یہ کہتے ہوئے انہوں نے خاکی لفافہ میرے ہاتھ سے لے لیا، پھر بے خیالی میں لفافہ کھولا تو چونک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کاغذات کو شاید وہ خوب اچھی طرح پہچانتے تھے، جبھی تو ایک نظر میں پہچان گئے اور خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولے۔ "یہ..... یہ........ کہاں سے ملے؟..... تمہیں!" مارے خوشی کے ان کے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔ "یہ..... ارے مائیکرو فلم بھی ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے بیٹے!" انہوں نے پرجوش انداز میں مجھے سینے سے لگا لیا۔ "تم نے بتایا نہیں کہ یہ چیزیں تمہیں کہاں سے ملیں؟" انہوں نے پھر پوچھا۔

"یہ چیزیں مجھے وانگ یو سے ملی تھیں انکل!" میں نے جواب دیا۔ "ان کی حفاظت کرنے میں البتہ مجھے دانتوں پسینہ آ گیا۔" پھر میں نے مختصراً انہیں ساری داستان سنا دی۔

"تم نے بہت بڑا کام کیا ہے بیٹا!" انکل نے جوش میں آ کر مجھے ایک بار پھر گلے لگا لیا۔ "میں تمہیں حکومت سے انعام دلواؤں گا۔"

"میں نے ان کاغذات کی حفاظت کسی انعام کے لالچ میں نہیں کی ہے انکل!" میں نے

جواب دیا۔ "بس یہ اہم دستاویزات ذمے دار ہاتھوں تک پہنچ گئیں' یہی میرا سب سے بڑا انعام ہے۔"

"جیتے رہو بیٹے' مجھے تم سے یہی توقع تھی۔" انکل نے کہا' پھر انہیں نہ جانے کیا خیال آیا' وہ کلارا کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے بولے۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

ان کے اچانک سوال پر میں گڑبڑا گیا۔

"یہ بھیا کی محسن ہیں۔" شہلا جلدی سے بولی۔ "ان دستاویزات اور مائیکرو فلمز کی حفاظت میں انہوں نے بھی بھیا کی مدد کی ہے۔" پھر شہلا نے رضا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی بھیا کے ساتھی ہیں۔ ان سب نے بھیا کے لئے جان کی بازی لگائی ہے۔ انہی لوگوں نے تو مجھے ان لوگوں کی قید سے رہائی دلائی ہے۔"

"ارے بھئی' تم نے تو تقریر شروع کر دی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے انکل سے کہا۔ "میری ذمے داری پوری ہو گئی۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ارے بھئی ایسی بھی کیا جلدی ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ تم سب یہیں شفٹ ہو جاؤ۔"

"آپ کی شفقت اور محبت کا بہت شکریہ۔ وہ گھر بھی تو آپ ہی کا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "پھر میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ بھی کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔ کئی گروہ میرے پیچھے ہیں۔"

"اس صورت میں تو تمہارا یہاں شفٹ ہونا بہت ضروری ہے۔" انکل نے جواب دیا۔ "میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ تمہاری حفاظت اب میری ہی نہیں بلکہ حکومت پاکستان کی ذمے داری ہے۔"

آپ کا بہت شکریہ انکل!" میں نے ادب سے جواب دیا۔ "میں اور میرے ساتھی اپنی حفاظت خود کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا!" انکل نے طویل سانس لے کر کہا۔ "مگر میری ایک درخواست ہے اگر مناسب سمجھو تو شہلا کو یہیں رہنے دو۔"

"آپ حکم دے سکتے ہیں انکل!" میں نے جواب دیا۔ "شہلا آپ کی بیٹی ہے۔ وہ آپ ہی کے پاس رہے گی۔ میں آپ کی بیٹی کو آپ سے جدا نہیں کروں گا' مجھے ملنا ہو گا تو میں خود ہی یہاں آ جایا کروں گا۔ یوں بھی یہ یہاں زیادہ محفوظ ہے۔ میں تو خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔" پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب میں اجازت چاہوں گا۔ ممکن ہوا تو شام کو حاضر ہو جاؤں گا۔"

○

واپسی کے سفر میں بھی اسٹیرنگ سیٹ پر کلارا تھی۔ میں وہ کاغذات انکل کے حوالے کر کے بہت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اب میری زندگی کا مقصد ختم ہو گیا ہو۔ شہلا مجھے مل چکی تھی' کاغذات میں انکل کے حوالے کر چکا تھا۔ اب مجھے کرنا ہی کیا تھا؟ ساری ہنگامہ خیزی' ساری بھاگ دوڑ' تمام معرکہ آرائی یک لخت ختم ہو گئی تھی۔

جونہی کلارا نے گیٹ کے سامنے گاڑی روکی۔ میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے کا احساس دلایا۔ گو حالات بالکل نارمل تھے مگر میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی وجہ وہ سرخ مزدا تھی جو بنگلے سے کچھ فاصلے پر پارک کی گئی تھی۔ آخر اسے وہاں پارک کرنے کا کیا جواز تھا؟ اگر وہ کسی بنگلے والے کی ملکیت تھی تو اسے بنگلے کے پورچ میں یا کم از کم بنگلے کے آگے پارک ہونا چاہئے تھا' مگر وہ تو کچھ اس ڈھب سے پارک کی گئی تھی' ہمارے اور پڑوس کے بنگلے کے درمیان میں تھی۔ اگرچہ یہ معمولی بات تھی اور کوئی بھی بے پرواہ نوجوان یہ حرکت کر سکتا تھا مگر اس کے باوجود میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

کلارا بہت غور سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ شانے اچکا کر اترنے لگی تو میں نے اسے روک دیا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ "خیریت تو ہے خرم!"

"ہاں' خیریت ہے۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ "مگر مجھے خدشہ ہے کہ اندر کوئی ہماری گھات میں بیٹھا ہے۔"

"تم بہت وہمی ہو گئے ہو۔" کلارا ہنس کر بولی۔ "مگر اس میں قصور تمہارا بھی نہیں ہے۔ تم ایسے حالات سے گزر رہے ہو کہ تمہیں وہمی ہونا ہی چاہئے تھا۔"

"بات وہم کی نہیں ہے کلارا۔" میں نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میری چھٹی حس ایسے موقعوں پر بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی چھٹی حس مجھے خطرے کا احساس دلا رہی ہے' پھر اگر میں تھوڑی سی احتیاط کر لوں تو کیا نقصان ہے؟"

"کر لو احتیاط۔" کلارا منہ بنا کر بولی۔ "تمہیں تو جیمز بانڈ بننے کا خبط ہو گیا ہے۔"

"تم گاڑی یہاں سے کچھ فاصلے پر پارک کرو۔" میں نے کلارا سے کہا۔ "بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس سرخ مزدا کے قریب ہی پارک کرو اور گاڑی میں ہی بیٹھو۔" میں نے کلارا سے کہا۔ "اور رضا تم یہاں گیٹ کے پاس ٹھہرو۔ میں بنگلے کی پشت سے اندر داخل ہوتا ہوں۔" میں نے رضا سے کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔

گاڑی سے اتر کر میرے شبہات کی مزید تصدیق ہوئی۔ گیٹ کے سامنے کی زمین نرم تھی۔ اس پر کم از کم دو مختلف گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات تھے۔ میری گاڑی کے ٹائر ان نشانات سے بالکل مختلف تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ کم از کم دو گاڑیاں وہاں ضرور آئی تھیں۔ پھر میں نے ان نشانات کا بہ غور جائزہ لیا اور سرخ مزدا کے نزدیک جا کر اس کے ٹائروں کو غور سے دیکھا تو میرے شبے کی مزید تصدیق ہو گئی۔ مزدا کے ٹائر ان نشانات سے مل رہے

تھے۔

میں جھک کر ٹائروں کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک اور غیر متوقع واقعہ ہوا۔ مزدا کا دروازہ اچانک کھلا اور پھرتی سے ایک شخص باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا خوف ناک ریوالور تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی کارروائی کرتا' میں اپنی جگہ سے اچھلا اور اسے ساتھ لئے ہوئے زمین پر جا گرا۔ اس پر جھپٹتے ہوئے میں نے اس کی دائیں کلائی مضبوطی سے پکڑ لی تھی۔ وہ زمین پر گرا تو ریوالور جھٹکے سے دور جا گرا۔ وہ علاقہ بالکل سنسان تھا مگر کسی بھی وقت کوئی گاڑی وہاں آ سکتی تھی یا اپنے بنگلے سے کوئی شخص بھی باہر نکل سکتا تھا۔ وہ شور مچا کے دوسروں کو اکٹھا بھی کر سکتا تھا۔ میری کوشش یہی تھی کہ جلد از جلد اپنے شکار کو اس طرح قابو میں کروں کہ وہ بے ہوش بھی نہ ہونے پائے۔

اس وقت کلارا نے حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور وہ گاڑی لے کر وہیں آ گئی۔ میں نے کرخت لہجے میں اپنے شکار کو حکم دیا۔ "زیادہ اچھل کود مت کرو ورنہ تمہاری گردن توڑ دوں گا۔ چلو خاموشی سے گاڑی میں بیٹھو۔"

اس نے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی تو میں نے اتنے زور سے اس کے منہ پر ہاتھ مارا کہ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے۔ "خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور اس کی گردن دبوچ لی۔

اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا' پھر خاموشی سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس دوران میں رضا بھی اس کا ریوالور اٹھا کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ میرے اشارے پر وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب پچھلی سیٹ پر میرا شکار میرے اور رضا کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ کلارا نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"کس نے بھیجا ہے تمہیں یہاں؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"میں اسے نہیں جانتا' مجھے تو سعید لایا تھا۔" اس نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کون سعید؟" میں نے پوچھا۔ "اور وہ تمہیں یہاں کیوں لایا تھا؟"

"وہ میرا دوست ہے۔ وہ اکثر چھوٹے موٹے کام مجھ سے کراتا رہتا ہے اور اس کا معقول معاوضہ دیتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ گویا وہ کوئی کرائے کا بدمعاش تھا۔

"تم یہاں کس کے انتظار میں کھڑے تھے؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"میں سعید کے انتظار میں تھا۔ وہ بنگلے کے اندر ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں۔ اس کے کچھ ساتھی تھوڑی دیر پہلے اس بنگلے سے کسی لڑکی کو لے گئے ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ "کس لڑکی کو لے گئے ہیں؟" مگر پھر مجھے خود ہی اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ

وہ کس لڑکی کو لے گئے ہیں۔ بنگلے میں تہمینہ تھی یا رضوانہ۔ وہ لوگ نہ جانے کس لڑکی کو لے گئے تھے۔ پھر مجھے برڈ کا خیال آیا۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہو گا۔ میں نے کلارا سے گاڑی واپس گھمانے کو کہا اور اپنے قیدی سے پوچھا۔ "بنگلے میں کیا فائرنگ بھی ہوئی تھی؟"

"میں تو باہر تھا اس لئے یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر میرا خیال ہے کہ فائرنگ نہیں ہوئی تھی کیوں کہ آواز باہر ضرور آتی۔" پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ "ہاں' اگر سائلنسر والے ریوالورز استعمال ہوئے ہوں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

سوال و جواب سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا شکار زیادہ پختہ نہیں تھا یا پھر وہ بالکل ہی غیر متعلق تھا اور محض معاوضے کے لالچ میں حملہ آروں کے ساتھ آگیا تھا۔ جب اس کی جان پر بنی تو اس نے بلا چون و چرا سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"سعید کس کے لئے کام کرتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "میں نہیں جانتا۔" اس نے جواب دیا۔ "اسے جب بھی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ مجھ سے چھوٹے موٹے کام لیتا رہتا ہے۔ آج بھی وہ یہ کہہ کر مجھے لایا تھا کہ مجھے ڈرائیونگ کرنا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ چوری کی نیت سے آیا ہے مگر جب اس کے ساتھی ایک لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ اس کا ساتھ نہیں دوں گا۔" پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ "مجھے جو کچھ معلوم تھا' میں نے آپ کو سچ سچ بتا دیا ہے۔ اس پر یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔"

"جب تک سعید گرفتار نہیں ہو جاتا' اس وقت تک تم ہماری حراست میں رہو گے۔ ہم سے تعاون کرنے میں تمہارا فائدہ ہے' اسمارٹ بننے کی کوشش کی تو جان سے جاؤ گے۔" میرا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔

کلارا نے بنگلے سے کچھ فاصلے پر گاری روک دی۔ گاڑی رکتے ہی میں نے قیدی کو ناک آؤٹ کر دیا۔ پھر میں نے کلارا سے کہا کہ "تم سرخ مزدا کے نزدیک گاڑی پارک کرو اور رضا گیٹ کو کور کرے گا۔ میں بنگلے کی پشت پر جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں گاڑی سے اترا اور بنگلے کی عقبی گلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ نہ جانے وہ مردود تہمینہ یا رضوانہ میں سے کسے اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ پریشانی مجھے برڈ کی طرف سے تھی۔ ظاہر ہے' وہ لوگ اسے زخمی یا قتل کیے بغیر کسی لڑکی کو نہیں لے جاسکتے تھے۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ بنگلے میں تہمینہ اور رضوانہ کے علاوہ لالی بھی تھی۔ ممکن ہے انہوں نے لالی ہی کو اغوا کیا ہو' یہی سوچتا ہوا میں بنگلے کی عقبی دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں ایک دروازہ بھی تھا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ باؤنڈری وال تقریباً" دس فٹ اونچی رہی ہوگی۔ اس پر چڑھنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے ذرا ٹھہر کر اردگرد کا جائزہ لیا' پھر اللہ کا نام لے کر ایک ہی جست میں دیوار پر پہنچ گیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر محتاط انداز میں اندرونی حصے کا جائزہ لیا' وہاں

بالکل سناٹا تھا۔ وہ تینوں تو تصور بھی نہیں کرسکتے ہوں گے کہ کوئی عقبی حصے سے بھی بنگلے میں داخل ہوسکتا ہے۔ میں بلی کی سی پھرتی سے اندر کود گیا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ کودنے سے زیادہ آواز نہ پیدا ہو۔ کودتے ہی میں زمین سے چپک گیا اور تھوڑی دیر تک سن گن لیتا رہا۔

اندر حسب سابق سناٹے کا راج تھا۔ پھر میں آہستہ آہستہ کچن کی طرف بڑھا۔ کچن کا ایک دروازہ بنگلے کی پشت پر کھلتا تھا۔ وہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا مگر خوش قسمتی سے کچن کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس پر باریک جالی لگی ہوئی تھی۔ میں نے پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال کے چشم زدن میں جالی کاٹ دی اور پھرتی سے اندر کود گیا۔

کچن سے باہر کوریڈور میں کوئی شخص کھڑا تھا۔ اس کا رخ مین گیٹ کی طرف تھا اور وہ گیٹ ہی پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں اگر تھوڑی سی بے احتیاطی سے کام لیتا تو شاید وہ مجھے دیکھ لیتا۔ یہ تو غنیمت تھا کہ میں کوریڈور میں ایک دم نہیں نکلا تھا۔ میں دبے قدموں اس کی طرف بڑھا۔ میں اس پر چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ وہ بالکل آخری لمحے میں میری طرف گھوم گیا۔ شاید اس کی چھٹی حس نے اسے خطرے سے آگاہ کردیا تھا۔ مجھے اپنے سر پر دیکھ کے وہ اتنا حیران ہوا کہ لمحوں تک ساکت کھڑا رہا۔ پھر حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے جست لگائی اور اسے دبوچ لیا۔ میری بائیں ہتھیلی سختی سے اس کے منہ پر جمی ہوئی تھی' دائیں ہاتھ سے میں نے اس کی گردن دبوچ رکھی تھی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے میں نے اس کی گردن پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ بری طرح تڑپا' پھر ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ میں نے آہستگی سے اسے فرش پر لٹا دیا۔ وہ اب ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکتا تھا۔ احتیاط کے طور پر میں نے گھسیٹ کر اسے کچن میں ڈال دیا اور جلدی جلدی اس کی تلاشی لے ڈالی۔ اس کی جیب سے پوائنٹ تھری ٹو کا ایک پسٹل' ڈھائی ہزار روپے اور مختلف وزیٹنگ کارڈ برآمد ہوئے۔ وہ سب چیزیں میں نے اپنے قبضے میں کیں اور دبے پاؤں کچن سے باہر نکل آیا۔

ڈرائنگ روم سے کسی کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اب مجھے اندر کی آوازیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

کوئی کرخت لہجے میں بولا۔ "اب تک تو ان لوگوں کو آجانا چاہیے تھا۔"

"یار میری سمجھ میں نہیں آتا آخر ہم لوگ مزید کتنا انتظار کریں۔" دوسری آواز اکتائی ہوئی سی تھی۔ "ہم نے خرم کی بہن کو اغوا کر ہی لیا ہے' اب وہ خود ہی دوڑا ہوا آئے گا۔"

"لیکن اس وقت وہ پوری طرح چوکنا ہوگا۔ ابھی اگر ہم نے بے خبری میں اسے چھاپ

لیا تو وہ بہت آسانی سے ہمارے قابو میں آجائے گا۔"

میں نے ریوالور نکال کے ہاتھ میں لیا اور اچانک کمرے میں داخل ہوگیا۔ پھر میں گرج کر بولا۔ "اپنے ہاتھ سروں پر رکھو اور دیوار کی طرف مڑ جاؤ۔"

ان دونوں نے مشینی انداز میں ہاتھ سروں پر رکھے اور تیزی سے دیوار کی طرف مڑ گئے۔ انہیں تو حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ ان کے مڑتے ہی میری نظر برڈ پر پڑ گئی۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ غیر فطری انداز میں فرش پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اور سر کے پاس کافی مقدار میں خون جما ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ان لمبیثوں نے برڈ کو مار دیا تھا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "نہیں۔" پھر میں دیوانہ وار برڈ کی طرف لپکا۔

"میں ان لوگوں کی طرف سے بالکل بے پروا ہو گیا تھا جنہیں میں نے دیوار کی طرف منہ کرنے کا حکوم دیا تھا۔ میری خود فراموشی سے انہیں موقع مل گیا اور وہ دونوں اچانک مجھ پر جھپٹ پڑے۔ میں اس افتاد کے لئے ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھا اس لئے بے خبری میں مارا گیا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ فرش پہ ڈھیر ہو گئے۔ ان میں سے ایک گینڈے کی طرح طاقت ور تھا۔ اس نے مضبوطی سے میری دونوں کلائیاں تھام لیں اور گھٹی گھٹی آواز میں اپنے ساتھی سے بولا۔ "اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کو کوئی رسی لے آؤ۔"

یہ کہہ کے وہ میرے سینے پہ کچھ اس انداز سے سوار ہوا کہ اس کا ایک مگدر نما گھٹنا میرے گلے پر آ ٹکا۔ میں ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کرتا تو خود ہی نقصان میں رہتا۔ اس کا دوسرا ساتھی ابھی تک رسی تلاش کر رہا تھا۔

"جلدی کرو بے وقوف!" گینڈے نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"ابھی سے مایوس ہو گئے مائی ڈیئر!" اس کے وزنی جسم کے نیچے دبا ہونے کے باوجود میں نے چہکنے کی کوشش کی۔ "ابھی تو فرشتہ اجل کے آنے میں کچھ دیر ہے۔"

"فکر مت کرو۔" گینڈا طنزیہ انداز میں بولا۔ "سب سے پہلے تمہی کو فرشتہ اجل کے حوالے کیا جائے گا۔"

"خیر دیکھا جائے گا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی گرفت بھی کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں نے اچانک اپنی دونوں کلائیوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے نہ صرف میرے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے بلکہ میں نے ان کی گردن بھی دبوچ لی۔ اسے شاید اندازہ نہیں تھا کہ میرا ردعمل اتنا شدید ہو گا۔ اگر اسے اندازہ ہوتا تو وہ پہلی فرصت میں مجھے ناک آؤٹ کر دیتا' پھر ہاتھ پیر باندھتا رہتا۔

میں نے اس کی گردن پکڑ کے خاصی قوت سے اسے جھٹکا دیا۔ وہ بائیں طرف لڑھک گیا۔ پھر میں اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر گلا دبنے سے اس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ میرے ہاتھ ہی پکڑ سکتا۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں۔ اس کا ساتھی اتنا احمق تھا کہ رسی کی تلاش میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ یا پھر اسے اپنے ساتھی کی قوت پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے "گینڈے" کی مدد ضروری نہیں سمجھی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی رہا ہو مگر اس وقت صورت حال میرے حق میں تھی۔ اگر اس کا ساتھی واپس آ جاتا تو میرے لئے بہت مشکل ہو جاتی۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے شکار کی گردن چھوڑ دی اور اچانک اس کی کنپٹی پر وار کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ مر گیا یا صرف بے ہوش ہوا ہے کیوں کہ اس کا ساتھی وہاں پہنچ گیا تھا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے مزید حیران ہونے کا موقع نہیں دیا اور ایک دم اچھل کر اسے دبوچ لیا۔ اس اچانک افتاد پر اس کے حلق سے لایعنی آوازیں نکلیں، مگر اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اسے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ وہ بلا چوں و چرا کئے دیوار کی طرف مڑ گیا۔ شاید وہ اپنے گینڈے نما ساتھی کے انجام سے دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے اس کی تلاشی لی، پھر اس کی لائی ہوئی رسی سے اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے۔ اسے فرش پہ ڈالنے کے بعد میں نے احتیاطاً "گینڈے" کے بھی ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے۔ ان دونوں سے فارغ ہو کر میں برڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی مگر وہاں بالکل خاموشی تھی مگر جب میں نے دل کی دھڑکن سننے کو اس کے سینے سے کان لگایا تو خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کا دل بہت خفیف انداز میں دھڑک رہا تھا۔ گویا برڈ ابھی زندہ تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے شدید مایوسی ہوئی۔ وہ اس وقت تو زندہ تھا مگر مزید کچھ دیر طبی امداد نہ ملتی تو مر سکتا تھا۔ میں نے سوچا، ان لوگوں کو رضا اور کلارا کے حوالے کر کے میں برڈ کو فوری طور پر اسپتال لے جاؤں گا۔ یہی سوچ کر میں باہر کی طرف لپکا مگر عجلت میں کسی سے ٹکرا گیا۔ میں اپنی پریشانی میں حملہ آوروں کے تیسرے ساتھی کو بھول گیا تھا جسے میں نے سب سے پہلے ناک آؤٹ کیا تھا۔ اسے نہ جانے کب ہوش آ گیا تھا اور وہ اندر ہی کی طرف آ رہا تھا۔

مجھ سے ٹکرانے کے بعد وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹا اور مجھ پر چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کا سب جوش و ولولہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑا اور اسے بھی کمرے میں گھسیٹ لیا۔ پھر میں نے رسی کے بقیہ ٹکڑے سے اس کے ہاتھ پاؤں بھی جکڑ دیئے۔ ان لوگوں کی طرف سے فارغ ہو کر میں برآمدے میں نکلا اور رضا کو آواز دی۔ رضا میرے اشارے کا منتظر ہی تھا، وہ فوراً ہی اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جو باہر گاڑی میں ملا تھا۔ اسے میں نے ایک بیڈ روم میں

بند کر دیا اور رضا سے کہا۔ "تم ان لوگوں کا دھیان رکھنا' میں برڈ کو لے کر اسپتال جا رہا ہوں۔ ان بدبختوں نے اسے شدید زخمی کر دیا ہے' حرام زادے شہلا کے دھوکے میں تہمینہ کو لے گئے ہیں۔" یہ کہہ کے میں نے پھرتی سے برڈ کو ہاتھوں پر اٹھایا اور باہر کی طرف دوڑا۔ رضا بھی میرے پیچھے ہی دوڑا چلا آیا۔ بیرونی گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے رضا سے کہا۔ "میں کلارا کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ بس تم محتاط رہنا۔"

میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو مجھے دیکھ کر کلارا گاڑی سے باہر نکل آئی۔ اس نے گھبرا کے پوچھا۔ "کیا ہوا برڈ کو؟"

"گھبراؤ مت' یہ معمولی سا زخمی ہو گیا ہے۔ ہم اسے لے کر اسپتال چل رہے ہیں۔" میں نے برڈ کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹاتے ہوئے کہا۔

"اور..... وہ لوگ کسے لے گئے ہیں؟

"وہ تہمینہ کو لے گئے ہیں مگر پلیز ذرا جلدی کرو۔ یہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔" میں جھنجلا گیا۔

"سوری خرم!" کلارا نے کہا اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

جناح اسپتال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کلارا چند منٹ میں جناح اسپتال پہنچ گئی۔

برڈ کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ وہاں "ایمرجنسی" میں خاصا رش تھا۔ اگر کلارا ساتھ نہ ہوتی یا برڈ سفید فام نہ ہوتا تو شاید اسپتال کے برآمدے ہی میں ایڑھیاں رگڑ کر مرجاتا مگر کلارا کے شور مچانے پر ڈاکٹر فوراً" ہی برڈ کو اندر لے گئے۔

آدھے گھنٹے بعد مجھے معلوم ہوا کہ برڈ کو طبی امداد دے دی گئی ہے مگر اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ مجھے گھر کی فکر بھی تھی۔ نہ جانے وہاں کیا صورت حال ہو۔ یہ بھی خدشہ تھا کہ جو لوگ تہمینہ کو لے گئے تھے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لئے وہاں دوبارہ حملہ نہ کیا ہو۔ پھر مجھے تہمینہ کی بھی فکر تھی۔ وہ بیچاری نہ جانے کہاں ہو گی اور کس حال میں ہو گی۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کلارا نے مجھ سے کہا۔ "خرم! تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ برڈ کی دیکھ بھال میں کر لوں گی۔"

"تھینک یو کلارا۔" میں نے کہا۔ "مجھے واقعی رضا کی طرف سے پریشانی ہے۔ کوئی خاص بات ہو تو گھر فون کر دینا۔ ویسے میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔" میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ "ہاں گاڑی تم اپنے پاس رکھو' ممکن ہے تمہیں گاڑی کی ضرورت ہے۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔"

میں واپس پہنچا تو صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی' فرق بس یہ تھا کہ دونوں حملہ آور ہوش میں تھے' ان کا چوتھا ساتھی وہاں نہیں تھا۔ اسے میں نے ایک بیڈ روم

میں بند کر دیا تھا۔ رضا نے احتیاطاً تینوں کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا اور خود ذرا فاصلے پر ریوالور لئے ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے رضا سے پوچھا۔ ''ان لوگوں نے کچھ بتایا؟''

''ابھی میں نے ان سے پوچھ گچھ نہیں کی ہے۔ میں آپ کی واپسی کا منتظر تھا۔''

میں نے آگے بڑھ کے گینڈے نما شخص کے منہ سے کپڑا نکال لیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں نے یونہی اندازے سے کہا۔ ''تمہار نام سعید ہے؟''

''ہاں' میرا ہی نام سعید ہے۔'' اس نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

''تمہیں یہاں کس نے بھیجا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھا۔

''کسی نے بھی نہیں۔'' اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ ''میں خود ہی آیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے' ابھی تم میں دم خم ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''مگر فکر مت کرو۔ میں ابھی تمہاری ساری اکڑ نکال دوں گا۔ جلدی بتاؤ' کس نے بھیجا تھا تمہیں؟''

''میرا خیال ہے' میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں آپ کو!''

''دیکھو' میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''مجھے سختی پر مجبور مت کرو اور جو کچھ پوچھ رہا ہوں' صاف صاف بتا دو۔''

''وقت تو آپ میرا ضائع کر رہے ہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں' میں فالتو آدمی ہوں کیا!''

''نہیں' تم وی آئی پی ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ ''بتاتے ہو یا ابھی تمہارا خاتمہ کر دوں!''

''مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا۔'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ ''مارنا چاہتے ہو تو مار دو۔''

میں نے پیر ہٹایا اور اسے بالوں سے پکڑ کے بٹھا دیا۔

''مارنے سے پہلے ایک گلاس پانی ضرور پلا دو اور ہو سکے تو ایک سگریٹ بھی دے دو'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''تمہیں پانی بھی پلاؤں گا اور سگریٹ بھی!'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میرے سوال کا جواب دے دو۔''

''چلو' یونہی سہی۔'' اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

میں نے رضا سے پانی کا گلاس اور سگریٹ لانے کو کہا۔ اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لئے رضا ہی نے اسے پانی پلایا اور سگریٹ سلگا کے اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔ جب وہ دو تین گہرے گہرے کش لے چکا تو میں نے پوچھا۔ ''بتاؤ' تمہیں یہاں کس نے بھیجا تھا؟''

"کسی نے بھی نہیں۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

میں نے بپھر کے اس کے ہونٹوں سے سگریٹ نکالا اور بائیں ہاتھ سے اس کے بال پکڑ کے اچانک سگریٹ اس کے کان میں رگڑ دیا۔ اس کے منہ سے کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی اور اس نے اپنا سر جھٹکنے کی کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ اس کے بال میری مٹھی میں تھے۔ تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔

میں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ "بتاؤ' تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟" اس کے ساتھ ہی میں نے رضا کو نیا سگریٹ سلگانے کا اشارہ کیا۔

سعید نے پھر نفی میں سرہلایا۔ اس مرتبہ وہ زبان سے کچھ نہیں بولا تھا۔

میں نے رضا سے جلتا ہوا سگریٹ لیا اور وہ اچانک پھر اس کے کان میں مسل دیا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ سگریٹ اس مرتبہ زیادہ اندر تک جائے۔

وہ بھیانک انداز میں چیخ اور مجھے غلیظ گالیاں دینے لگا۔

"بتاؤ ورنہ اس مرتبہ میں تمہارے دوسرے کان میں سگریٹ بجھاؤں گا۔" میرے اشارے پر رضا نے مجھے نیا سگریٹ سلگا کے دے دیا۔

سعید نے خوف زدہ نظروں سے سگریٹ کو دیکھا' پھر بولا۔ "بتاتا ہوں' مجھے ذرا سانس تو لینے دو۔"

میں نے نزدیکی تپائی پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا جسے اس نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پھر میں اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ میں نے اس دوران میں سگریٹ کے دو تین گہرے کش لگا لئے تھے۔

سعید کی نظریں سگریٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

"مجھے..... مجھے..... سیٹھ سراج نے بھیجا تھا۔" سعید نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"کون سیٹھ سراج؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ میری یادداشت میں کسی سیٹھ سراج کا نام محفوظ نہیں تھا۔

"تم سیٹھ سراج کو نہیں جانتے!" سعید نے حیرت سے کہا۔ "سیٹھ سراج زیر زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ ہے۔ پولیس' تھانے' کچہری ہر جگہ اس کے آدمی موجود ہیں۔ اس کا نام لے کر میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ تم اگر مجھے چھوڑ بھی دو تو سیٹھ اب مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سیٹھ کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے وہ؟" میں الجھ کر بولا۔

"میں زیادہ تو نہیں جانتا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کسی غیر ملکی پارٹی نے سیٹھ کی خدمات حاصل کی ہیں۔ سیٹھ سراج نے اس لئے آپ کی بہن کو اغواء کرایا ہے تاکہ وہ دستاویزات

اور مائیکرو فلمز پھر اس کے پاس پہنچ جائیں۔"

"پہلے میں تمہاری ایک ایک بات کی تصدیق کروں گا۔ اس وقت تک تم میرے مہمان رہو گے۔ یاد رکھو! اگر سیٹھ سراج کے متعلق تمہاری اطلاع جھوٹی نکلی تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں گولی ماروں گا۔" میں نے جیب سے پین نکال کے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا اور اس سے کہا۔ "مجھے سیٹھ سراج کا پتہ لکھواؤ۔"

"وہ تو بہت مشہور آدمی ہے۔ تم یہاں کے کسی بھی ٹیکسی والے سے کہو گے وہ تمہیں سیدھا سیٹھ سراج کے بنگلے پر پہنچا دے گا۔" وہ سانس لینے کو رکا' پھر بولا۔ "ویسے اس کا ایڈریس بھی لکھ لو احتیاطاً"۔" اس نے مجھے جو ایڈریس لکھوایا' وہ محمد علی سوسائٹی کا تھا۔

میں نے ایڈریس کا پرچہ جیب میں رکھا اور رضا سے کہا۔ "ان تینوں کو بالائی منزل پر لے جاؤ۔"

"تم ہمیں قید میں کیوں رکھنا چاہتے ہو؟" سعید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نے بتایا تو ہے کہ تمہاری بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کے لئے! پھر مجھے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ تہمینہ کہاں ہے؟"

"تہمینہ!" سعید نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں' تہمینہ وہ لڑکی ہے جسے سیٹھ کے آدمی اغواء کر کے لے گئے ہیں۔"

"اچھا' تم اپنی بہن کی بات کر رہے ہو؟" سعید نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے مختصر جواب دیا۔ میں نے اسے یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ تہمینہ میری بہن نہیں ہے۔ پھر اچانک میں نے سعید سے پوچھا۔ "وہ لوگ تہمینہ کو کہاں لے گئے ہیں؟"

"اگر مجھے اپنے زندہ رہنے کا یقین ہوتا تو میں کبھی اس سوال کا جواب نہ دیتا۔" سعید نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "مگر اب تم سے بچ بھی گیا تو سیٹھ کے آدمی مجھے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ وہ لوگ تہمینہ کو یا تو لانڈھی لے گئے ہوں گے یا پھر میمن گوٹھ کے نزدیک ایک فارم پر!"

"ٹھیک ہے' میں معلوم کر لوں گا۔" میں نے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اگر یہ صورت حال ہے تو پھر تمہارا باہر جانا مناسب نہیں ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ تعاون کیا تو کم از کم مجھ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" پھر میں نے رضا سے کہا۔ "ان تینوں کو اوپر لے جاؤ اور میری واپسی تک ان کی نگرانی کرو۔"

"مگر...... آپ اکیلے......"

"ہاں" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں اکیلا جاؤں گا۔ ابھی میں صرف معلومات کے لئے جا رہا ہوں۔ وہاں زیادہ لوگوں کی بھیڑ مناسب نہیں ہو گی۔ تم ان لوگوں کو اوپر لے جاؤ۔" پھر مجھے ان کے چوتھے ساتھی کا خیال آیا۔ وہ بیچارہ بھی ہمارے ساتھ بہت تعاون کر رہا

تھا۔ میں نے رضا سے کہا۔ "ہاں' تمہارے بیڈ روم میں ان کا ایک اور ساتھی بند ہے۔ وہ بیچارہ زخمی بھی ہے۔ اس کی مرہم پٹی بھی کر دینا اور کوئی پین کلر دے دینا۔ شاید اس کے کئی دانت بھی ٹوٹ گئے ہیں۔"

رضا کو ہدایات دینے کے بعد میں باہر نکلا تو میرا رخ ایک مرتبہ پھر اسپتال کی طرف تھا۔
میں اسپتال پہنچا تو کلارا بے تابی سے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ تیر کی طرح میری طرف آئی۔

"اب کیسا ہے برڈ؟" میں نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔

"اس کی حالت ابھی خطرے میں ہے۔" کلارا نے جواب دیا۔ "ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ اگر اسے آئندہ دو گھنٹے تک ہوش نہ آیا تو اس کا بچنا معجزہ ہی ہو گا۔"

"پریشان مت ہو۔" میں نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دینے کی خاطر کہا۔ "انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تہمینہ کا کوئی سراغ ملا؟" کلارا نے اچانک چونک کر پوچھا۔

"ہاں' ملا تو ہے۔" میں نے طویل سانس لیا۔

"اور رضوانہ "تم بس برڈ کا دھیان رکھنا۔ میں تہمینہ کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

"تم اکیلے ہی جاؤ گے!" کلارا نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں بھئی' میرے ساتھ رضا بھی ہو گا....."

"مجھ سے جھوٹ مت بولو خرم!" کلارا منہ بنا کر بولی۔ "میں جانتی ہوں' اس وقت رضا تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ تم کچھ دیر انتظار نہیں کر سکتے! وہ لوگ تہمینہ کو لے گئے ہیں تو ان کا کوئی مقصد بھی ہو گا۔ وہ جلد یا بہ دیر تم سے رابطہ ضرور کریں گے۔ آخر وہ کچھ تو ڈیمانڈ کریں گے نا!" کلارا نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "اس سے پہلے وہ تہمینہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ وہ لوگ آج کسی وقت رابطہ ضرور کریں گے۔"

کلارا کی بات میں وزن تھا۔ ظاہر ہے انہوں نے تہمینہ کو اغواء کیا تھا تو وہ اس سے کچھ فائدہ بھی اٹھانا چاہتے ہوں گے۔ واقعی مجھے اس وقت تک انتظار کرنا چاہیئے تھا۔ مجھے پہلے ان باتوں کو ترجیح دینا چاہیئے تھی جو فوری توجہ چاہتی تھیں۔ سرفہرست مسئلہ برڈ کا تھا' پھر رضوانہ اور لالی غائب تھی۔ مجھے ان کی طرف سے بھی فکر تھی۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ سعید کے ساتھی میرے گھر پہ دھاوا نہ بول دیں۔ ان کا ایک خاص آدمی بھی تو میرے قبضے میں تھا
تمہارا
پیہ تین تو شاید مہرے تھے جنہیں پیسے کے لئے آگے بڑھایا گیا تھا۔ یہی سب
نے کلارا سے کہا۔ "ٹھیک ہے' میں اس وقت تک انتظار کروں گا جب تک چھوٹے موٹے کام
طرف سے کوئی مطالبہ نہیں ہوتا۔" مگر مجھے یقین تھا کہ ان کا صرف ایک
مینہ کے عوض دستاویزات اور مائیکرو فلمز کی حصول یابی! "میں اب چلتا

ہوش آئے' مجھے فون کر دینا۔ میں گھر ہی پہ ہوں۔"

گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ رضا نے تینوں قیدیوں کو بالائی منزل میں شفٹ کر دیا ہے۔ میں نے اس سے رضوانہ اور لالی کے بارے میں پوچھا تو وہ بھی فکرمند ہو گیا۔ "خرم صاحب! میں خود بھی ان دونوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔ وہ کسی کو بھی کچھ بتا کر نہیں گئیں۔ ممکن ہے وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔"

"سعید کے تینوں ساتھی علیحدہ علیحدہ بند ہیں نا!"

"جی ہاں' میں نے انہیں علیحدہ کمروں میں بند کیا ہے۔"

"چلو اوپر!" میں ان تینوں سے بھی معلومات حاصل کر لوں۔ ممکن ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

میں اور رضا ایک قیدی کے کمرے میں پہنچے تو وہ مجھے دیکھ کر سہم گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے کرسی پر آرام سے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ رضا میری کرسی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

دیکھئے ..... میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"جتنا پوچھا جائے' اتنا ہی جواب دو۔" رضا نے کرخت لہجے میں کہا۔ "تمہارا نام پوچھا ہے باس نے!" رضا نے اچانک مجھے باس بنا دیا۔

"میرا نام اکرم ہے جی!" اس نے جلدی سے کہا۔

"ان لوگوں کے ساتھ کب سے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے آج ہی لائے تھے۔" وہ بولا۔

"تم کام کیا کرتے ہو؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔" وہ تھوک نگل کر بولا۔ "میں چھوٹے موٹے غیر قانونی کام کرتا رہتا ہوں مگر کسی کو اغواء کرنے کے متعلق سوچا بھی نہیں۔"

"تمہیں کون لایا تھا؟" اگلا سوال رضا نے کیا۔

"مجھے اور تاجے کو سعید لایا تھا جناب!" اس نے جواب دیا۔ "سعید نے کہا تھا کہ ایک معمولی سا کام ہے۔ اس کے بدلے میں تم لوگوں کو ہزار ہزار روپے ملیں گے۔ پیسوں کے لالچ میں ہم اس کے ساتھ چلے آئے۔"

اوپر لے جاؤ "تاجا کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مگر..... کو بھی آپ لوگوں نے پکڑ لیا ہے جی' وہی جس کے نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی پر

"ہاں" میں ہے۔"

کے لئے جا رہا ہوں اکہ ان کے ایک ساتھی کے چہرے پر ایسا ہی نشان دیکھا تھا۔

جاؤ۔" پھر مجھے ان کے لئے کام کرتے ہو نا!" میں کچھ سوچ کر بولا۔

"اب مجھے شرمندہ مت کریں۔ میں....."

"میں تم پر طنز نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "سنجیدگی سے پوچھی ہے یہ بات!"

"دیکھئے جی! میں آج کے بعد ایسے کسی کام میں ہاتھ نہیں دالوں گا۔"

"ڈرو مت اکرم!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے کام کرو معاوضہ ان لوگوں سے دگنا دوں گا۔" پھر میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ "اچھی طرح سوچ لو میں دو گھنٹے بعد پھر آؤں گا۔" میں اسے حیرت زدہ چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

رضا نے کمرہ لاک کیا' پھر وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔

اس کمرے میں وہ شخص تھا جس کا نام اکرم نے تاجا بتایا تھا۔ اس نے مجھے اور رضا کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ آدمی خاصا بے خوف اور جی دار ہے۔ وہ نکلتے ہوئے قد' مضبوط ہاتھ پیروں اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ نچلے ہونٹ سے لے کر ٹھوڑی تک زخم کے نشان نے اس کے چہرے کو مزید کرخت بنا دیا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہا تھا۔ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ "تاجا تمہارا نام ہے؟"

"ہاں' میں تاجا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"ان لوگوں سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کن لوگوں سے؟" اس کا لہجہ سخت تھا۔

رضا نے آگے بڑھ کے اس کے منہ پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ چٹاخ کی آواز سے پورا کمرہ گونج کر رہ گیا۔ تاجا بھی لڑکھڑا گیا تھا۔

"بات کرتے وقت یہ ذہن میں رکھنا کہ تم باس سے مخاطب ہو۔" رضا نے درشت لہجے میں کہا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے باس بنا دیا تھا لہٰذا مجھے باس والی حرکتیں کرنا تھیں۔ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور اس کا چہرہ اوپر اٹھا کر بولا۔ "اگر اب مسخرہ پن کیا تو زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

شاید میرا لہجہ اتنا سفاک تھا کہ پہلی مرتبہ مجھے اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دکھائی دیں۔ میں نے اس کے بالوں کو زوردار جھٹکا دیا اور پوچھا۔ "بتاؤ ان لوگوں سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"ان لوگوں سے میرا بس اتنا ہی تعلق ہے کہ سعید کبھی کبھی مجھ سے چھوٹے موٹے کام لے لیتا ہے۔"

"کیسے کام!" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "اغواء' قتل' ڈکیتی!"

”نہ جی نہ۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ کسی کڑی کو اٹھائیں گے یا کسی بندے کو پھڑکا دیں گے۔ سعید نے تو مجھے کہا تھا کہ ایک بندے کو ذرا تڑیاں مارنی ہیں۔ اس کے لئے اس نے ہزار روپے دیئے تھے۔“

”بے دقوف کے بچے!“ میں دانت پیس کر بولا۔ ”اگر ہماری جگہ یہاں پولیس پہنچ جاتی تو تم تو رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے۔ وہ لوگ تمہیں مصیبت میں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔“

”پولیس کی خیر ہے جی!“ وہ بولا۔ ”پولیس کا بہت وڈا افسر سعید کا چاچا ہے۔ سعید کی وجہ ہی سے ہم لوگ یہاں آئے تھے ورنہ کبھی نہ آتے۔“

”اچھا اس پولیس افسر کا نام بتاؤ جو سعید کا چاچا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے پولیس کے ایک ایسے افسر کا نام بتایا جو خاصے کلیدی عہدے پر فائز تھا۔ میں نے اس سے بھی یہی کہا کہ میں معاوضہ دے کر کام لینا چاہتا ہوں تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔

”دیکھو تاجے! مجھے ڈبل کراس کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ نقصان میں رہو گے۔“

پھر میں رضا کے ساتھ نیچے آ گیا۔ تمینہ کو اغواء کرنے والوں نے اب تک کوئی رابطہ نہیں قائم کیا تھا۔ میں سوائے انتظار کے فی الحال کیا کر سکتا تھا۔

اچانک کال بیل بج اٹھی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے رضا کو گیٹ پر جانے کا اشارہ کیا اور خود ریوالور نکال کے کھڑا ہو گیا۔

○

دوسرے ہی لمحے شہلا وحشت زدہ سی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ میرے سینے سے لگ کے بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کے یوں رونے پر میں بھی گھبرا گیا۔ میں نے جگ سے پانی گلاس میں لے کر اس کے منہ سے لگایا اور بولا۔ ”کیا ہوا شہلا؟ کچھ بتا تو سہی۔“

”بھیا..... وہ..... ان لوگوں نے..... انکل.....“

”جلدی بولو' کیا ہوا انکل کو؟“ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

”ان لوگوں نے انکل اور..... آنٹی..... کو مار دیا..... مار دیا بھیا..... ان لوگوں نے انہیں..... مار دیا۔“

”کن لوگوں نے مار دیا؟“ میں نے چیخ کر پوچھا۔ ”کیوں مار دیا؟“

”وہ..... انکل..... سے..... مائیکرو فلمز اور وہ کاغذات مانگ رہے..... تھے۔“

”آگے بتاؤ' کیا ہوا؟“ میں نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا۔

پھر شہلا نے روتے' سسکتے جو کچھ بتایا' اس کا لب لباب یہ تھا کہ کئی آدمی اچانک بنگلا میں داخل ہوئے۔ پہلے انہوں نے دونوں گارڈز کو ہلاک کیا' پھر وہ اندر آئے۔ اس دوران

میں ایک نوکر نے مزاحمت کی تو اس پہ گولی چلا دی۔ پھر وہ اکبر صاحب تک پہنچ گئے۔ انہوں نے وہ منحوس دستاویزات اور مائیکرو فلمز ابھی تک اعلیٰ حکام کے حوالے نہیں کی تھیں۔ شاید وہ ان دستاویزات میں پوشیدہ کوڈ کو ڈی کوڈ کرنے میں مصروف تھے۔ حملہ آوروں کو بہت آسانی سے وہ تمام چیزیں مل گئیں جن کے لئے میں نے جان کی بازی لگائی تھی۔ نہ صرف میں نے بلکہ میرے تمام ساتھیوں نے اپنی زندگیاں داؤ پر لگائی تھیں۔ انہی منحوس کاغذات کی وجہ سے برڈ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ان کاغذات کے ساتھ تو نحوست کا ایک نہ ختم ہونے والا ہولناک سلسلہ چل رہا تھا۔ اس کی وجہ سے وانگ یو ایسا ذہین اور قیمتی آدمی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا' مس چیکو ماری گئی' ایران میں قتل و غارت گری ہوئی۔ انہی کاغذات کی حفاظت کرتے ہوئے میں نے نہ جانے کتنے انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ اب ان منحوس کاغذات نے مزید کچھ انسانی جانوں کی بھینٹ لے لی تھی۔ شہلا نے اسٹور میں چھپ کر جان بچائی۔ ویسے حملہ آوروں کو صرف ان چیزوں کو تلاش تھی اس لئے انہوں نے شہلا کو ڈھونڈا بھی نہیں ورنہ بہت آسانی سے اسے بھی موت کی نیند سلا دیتے۔ ان کے جاتے ہی شہلا افتاں و خیزاں مجھ تک پہنچی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ لوگ تہمینہ کو بھی چھوڑ دیں گے۔

اس خبر سے مارے صدمے کے میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ میری ساری محنت' سب قربانیاں رائیگاں چلی گئی تھیں۔ میرا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا۔ شہلا کی سسکیاں بھی اب تھم گئی تھیں اور کمرے کا سناٹا روح میں اترا جا رہا تھا لیکن کمرے میں جتنا سناٹا تھا' میرے اندر اتنا ہی شور تھا' خیالات کا ایک رست خیز تھا جو میرے وجود سے نکلنے کو بے چین تھا۔

میں نے شہلا سے پوچھا۔ "حملہ آوروں میں سے کسی کو پہچانتی ہو تم؟"

شہلا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اچانک دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ رضا بھی چیتے کی طرح چوکنا دکھائی دینے لگا۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ دستک کا انداز بتا رہا تھا کہ آنے والے یا تو دشمن ہیں یا پولیس کے لوگ! پولیس والے عموماً کال بیل کی بجائے دروازہ پیٹنا پسند کرتے ہیں۔ رضا دروازے کے پاس گیا اور بلند آواز میں بولا۔ "کون ہے؟"

"پولیس" باہر سے کرخت آواز آئی۔ "دروازہ کھولو۔"

رضا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر کے اشارے سے دروازہ کھولنے کو کہا۔
اچانک کئی پولیس والے بندوقیں تانے ہوئے دھڑ دھڑ کرتے اندر گھس آئے۔ ان کے پیچھے ایک اے ایس آئی تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”تم لوگ اپنے ہاتھ سروں پر رکھو اور دیواروں کی طرف مڑ جاؤ۔“
”لیکن کیوں؟“ میں نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ”تم لوگ یوں منہ اٹھا کے گھر میں داخل کیسے ہوئے؟“
”چپ کر اوئے کسے قنون داں دا پتر!“ اے ایس آئی نے ”فصاحت و بلاغت“ کا مظاہرہ کیا۔ ”چل اوئے کڑیے۔“ اس نے شہلا کو مخاطب کیا۔ ”تو بھی سر پہ ہاتھ رکھ اور منہ دیوار کی طرف کر۔“
اس جاہل شخص سے بحث کرنا فضول تھا۔ میں سر پہ ہاتھ رکھ کے دیوار کی طرف مڑ گیا۔ رضا دوسری طرف تھا۔ ایک کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر میری تلاشی لی اور میری جیب سے ریوالور، پرس وغیرہ برآمد کر لیا۔ پھر وہ اپنے افسر کی طرح کرخت لہجے میں بولا۔ ”اوئے لسنس بھی ہے ایس ریوالور دا؟“
یہی سوال رضا سے بھی کیا گیا۔ پھر اے ایس آئی کی آواز آئی۔ ”کڑی نو چھڈ دیو۔ اس ویلے ہمارے ساتھ لیڈی پولیس نہیں ہے، سدھے ہو جاؤ اوئے۔“ آخری جملہ شاید اس نے مجھ سے کہا تھا مگر میں یونہی کھڑا رہا۔
”او باؤ ٹیررا!“ اس نے پھر کہا اور میرا کندھا تھپ تھپایا۔ ”اوئے تم سے کہہ رہا ہوں۔ یار تو تو نئی دلہنوں کی طرح شرما رہا ہے۔“
میں سیدھا ہوا تو انہوں نے رضا کو بھی سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دیا۔
”محمد خان!“ اس نے ایک کانسٹیبل کو آواز دی۔ ”ہتھکڑی لگاؤ ان تینوں کو۔“
”مگر کیوں؟“ مجھے غصہ آگیا۔
”زیادہ اگر مگر مت کرو۔“ اے ایس آئی کے لہجے میں رعونت تھی۔ ”تھانے پہنچ کر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“
جس کا نام محمد خان تھا وہ گویا کسی اکھاڑے سے اٹھ کر آگیا تھا۔ اس نے شاید صرف

اتنا کیا تھا کہ لنگوٹ پہ پولیس کی وردی چڑھا لی تھی۔ ہر زاویے سے وہ مجھے کسی پہلوان کا پٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ ممکن ہے وہ پہلوان الو بھی رہا ہو کیوں کہ ہتھکڑی کے نام پر اس نے یوں اے ایس آئی کو دیکھا جیسے اس نے جلیبیوں کی فرمائش کی ہو۔ پھر وہ اپنا کدو ایسا سر ہلا کر بولا۔ "ہتھکڑی تو سر ایک ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے' وہ ہتھکڑی اسے لگا دو۔" اے ایس آئی نے میری طرف اشارہ کیا۔

اسی وقت کمرے میں ایک اور شخص داخل ہوا۔ اس کے جسم پر انسپکٹر کی وردی تھی۔ اس نے شہلا کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "بیٹا تم یہاں کیسے آئیں؟"

اسے شہلا نے جلدی سے سلام کیا' پھر بولی۔ "یہ میرے بھائی ہیں خرم! میں انہی کے پاس آئی تھی۔"

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "تمہیں شاید علم نہیں کہ اسی نے تمہارے والد اور والدہ کو قتل کیا ہے۔" انسپکٹر کا اشارہ میری طرف تھا۔ "یہ ہی وہاں سے مائیکرو فلمیں اور دستاویز لے کر آیا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل؟" شہلا نے حیرت زدہ ہو کے کہا۔ "بھیا نے تو وہ چیزیں وہاں پہنچائی تھیں۔ آپ انہی پر الزام لگا رہے ہیں!"

"حقیقت یہی ہے بیٹا!" انسپکٹر نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "جائے واردات پر خرم کو کئی افراد نے دیکھا ہے۔ وہ اکبر صاحب ان کی بیگم کے قتل کے بھی عینی شاہد ہیں۔"

اس دوران میں پہلوان نما کانسٹیبل نے مجھے ہتھکڑی لگا دی تھی۔ انسپکٹر نے بنگلے کی تلاشی کا حکم دے دیا۔ میں جانتا تھا' ابھی مجھ پہ قتل کے ساتھ ساتھ اغواء اور حبس بے جا کے الزامات بھی عائد ہونے والے ہیں۔ پھر وہی ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس کے کانسٹیبل سعید اور اس کے تینوں ساتھیوں سمیت نمودار ہوئے اور انسپکٹر سے بولے۔ "سر! یہ لوگ اوپر کے کمروں میں بند تھے۔"

انسپکٹر نے فاتحانہ انداز میں پہلے شہلا کو پھر مجھے دیکھا اور بولا۔

"اب بولئے مسٹر خرم! ان افراد کی یہاں موجودگی کا کیا جواز ہے؟"

"ان لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "ان کے ساتھیوں نے میری ایک ساتھی لڑکی کو اغواء کر لیا ہے۔ ان لوگوں نے میرے ایک دوست پر بھی قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہے اور زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔"

"کہاں کی اڑا رہے ہو!" انسپکٹر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں تمہاری سب کہانیاں سنوں گا اور تھانے چل کر۔" پھر اس نے اے ایس آئی کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو لے کر تھانے پہنچو۔ جاتے جاتے وہ شہلا سے بولا۔ "بیٹا' تم فی الحال اپنے گھر جاؤ۔ پولیس کو تمہارے بیان کی بھی ضرورت ہو گی۔"

شہلا میرے نزدیک ہی کھڑی تھی۔ میں نے سرگوشی میں اس سے کہا۔ ”تم کلارا کے پاس جناح اسپتال چلی جانا۔ اسے صورت حال سے آگاہ کر دو۔“ پھر میں اور رضا خاموشی سے پولیس وین کی طرف بڑھ گئے۔ حیرت مجھے اس بات کی تھی کہ پولیس کی تلاشی کے دوران میں وہ ہیرے اور سونا برآمد نہیں ہوا جو ہم ایران سے لائے تھے۔ میں فوری طور پر رضا سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ پولیس والے ہر بات سن لیتے۔ میں اپنے طور پہ سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ وہ لوگ نہ جانے ہمیں کس تھانے میں لے جا رہے تھے کیوں کہ ہمیں سفر کرتے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اگر وہ ڈیفنس کے تھانے لے جاتے تو اتنی دیر نہ لگتی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں نے چونکہ مجھے اکبر صاحب اور ان کی بیگم کے قتل کا الزام لگایا ہے اس لئے مجھے اور رضا کو گلشن اقبال لے جایا جا رہا ہے۔

جب گاڑی روک کر ہمیں اتارا گیا تو میرا خیال صحیح ثابت ہوا۔ وہ لوگ ہمیں گلشن اقبال ہی لائے تھے۔ انہوں نے فوری طور پر مجھے اور رضا کو لاک اپ میں بند کر دیا۔ موقع پاتے ہی میں نے رضا سے پوچھا۔ ”تلاشی کے دوران میں وہ ہیرے اور سونا برآمد نہیں ہوا۔ اسے تم لوگوں نے کہاں رکھا ہے؟؟“

”اسے کلارا اور برڈ نے کہیں چھپایا ہے۔ یہ تو مجھے بھی علم نہیں ہے کہ کہاں چھپایا ہے۔“ رضا نے جواب دیا۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ اگر شاہ کا خزانہ برآمد ہو جاتا تو حکومت پہلی فرصت میں ہمیں ایران کے حوالے کر دیتی۔ پھر ہمارے حصے میں سزائے موت کے سوا کچھ بھی نہ آتا۔ ایرانی حکومت تو ان بین الاقوامی دہشت گردوں کی تلاش میں تھی جنہوں نے اس کے تمام خفیہ محکموں اور ایجنسیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر شاہ کا خزانہ نہ صرف لوٹ لیا تھا بلکہ اسے ایران سے نکالنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔

دو گھنٹے کے اندر اندر ہماری کوٹھری میں پانچ ملزمان مزید آئے تو کوٹھری میں حبس ہو گیا۔ سیلن زدہ سی وہ کوٹھری تو ہم دو افراد ہی کے لئے ناکافی تھی۔ اس حبس اور ناگوار بو میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ رضا بھی بہت پریشان تھا۔ شاید وہ بھی پہلی دفعہ اس قسم کے حالات کا شکار ہوا تھا۔ بہرحال وقت کا کام تو گزرنا ہے، سو گزرتا رہا۔ وہاں موجود کئی ملزمان نے مجھ سے اور رضا سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر ہمارے سرد رویے کی وجہ سے انہیں مایوسی ہوئی۔

رات کے شاید گیارہ بجے تھے جب ایک کانسٹیبل نے آ کے خبر سنائی کہ خرم کو طلب کیا گیا ہے۔ پھر اس نے مجھے ہتھکڑی لگائی اور لاک اپ سے باہر نکال کر ایک کمرے کی طرف لے چلا۔ اس کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف ایک کرسی تھی یا کونے میں ایک پلنگ کھڑا ہوا تھا۔ اس واحد کرسی پر وہی اے ایس آئی براجمان تھا جو مجھے گرفتار کر کے لایا تھا۔ مجھے

دیکھ کر وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "آیئے، شہزادہ خرم صاحب! کہئے حوالات میں کوئی تکلیف تو
نہیں ہوئی آپ کو؟"

"میری تکلیف کی بات چھوڑو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میرا ساتھی غیر ملکی ہے۔
اسے جانے دو ورنہ اس کا سفارت خانہ ایک قیامت کھڑی کر دے گا۔" میں نے رضا کے غیر
ملکی ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہا۔

اے ایس آئی چونک کر مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔ "یہ بات تم نے یا اس نے ہمیں پہلے
کیوں نہیں بتائی!؟"

"تم لوگوں نے اس کا موقع ہی کب دیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ میں اس کی گھبراہٹ
سے محظوظ ہو رہا تھا۔ یہ سنتے ہی کہ میرے ساتھی کا تعلق کسی دوسرے ملک سے ہے، اس
کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

اس نے فوراً ہی گھبراہٹ پر قابو پا لیا اور بولا۔ "کس ملک سے تعلق ہے اس کا؟"

"یہ تم اسی سے پوچھو تو بہتر ہے۔" میں نے جواب دیا مگر یہ جواب مجھے مہنگا پڑا۔

اس نے اٹھ کر اچانک میرے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میرا سر چکرانے لگا۔ پھر
اس نے چیخ کر کسی سے کہا۔ "اس کے ساتھ جو دوسرا آدمی گرفتار ہوا ہے، اسے بھی لے
آؤ۔"

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ رضا کو بھی وہاں لے آئے۔

اے ایس آئی نے رضا سے پوچھا۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم غیر ملکی ہو!
کس ملک سے تعلق ہے تمہارا؟"

اس سے پہلے کہ رضا کوئی جواب دیتا، میں نے کہا۔ "اس بیچارے کو اردو کب آتی
ہے۔ یہ تمہارے سوالوں کا جواب کیسے دے سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اے ایس
آئی کی نظر بچا کر رضا کو آنکھ ماری۔

اے ایس آئی جھنجلا گیا، پھر اپنی محدود انگریزی میں اٹک اٹک کر بولا۔ "یو..... فرام.....
وچ کنٹری؟"

اس کی بے بسی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی پر مجھے ہنسی آ گئی۔ رضا نے سنجیدگی سے جواب
دیا۔ "آئی ایم فرام ایران۔"

میں جانتا تھا کہ اے ایس آئی ہزار کوشش کے باوجود رضا سے سوال جواب نہیں کر
سکے گا۔ اس کے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے یوں بھی وہ مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے بے بسی
سے ہاتھ ملے، پھر محمد خان سے کہا۔ "اس بندے کو آفس میں بٹھاؤ۔ اس سے صاحب خود
تفتیش کرے گا۔" پھر وہ رضا کے جانے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہاں اوئے، اب تم
بتاؤ کہ تم نے اکبر صاحب کو قتل کیوں کیا؟"

"میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔" میں نے اعتماد سے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ "ابھی بتاؤ گے..... فکر مت کرو۔"

"تم جو کچھ پوچھو گے' اگر مجھے معلوم ہوا تو ضرور بتاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"محمد خان!" اس نے میری بات نظرانداز کر کے آواز لگائی۔

دوسرے ہی لمحے محمد خان دروازے میں نمودار ہوا۔ اس وقت وہ واقعی پہلوان لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر سینڈو کٹ بنیان اور دھوتی تھی۔ اس کا پیٹ خاصا بڑا تھا' لگ رہا تھا جیسے اس نے بنیان کے نیچے کوئی فٹ بال چھپا رکھی ہو۔

"اسے میں تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔" اے ایس آئی محمد خان سے بولا۔ "ایک گھنٹے بعد مجھے رپورٹ چاہئے۔"

"ایک گھنٹہ تو بہت ہے سر جی!" محمد خان نے ہنس کر کہا۔ "میں پندرہ بیس منٹ میں آپ کو رپورٹ کرتا ہوں۔"

O

اے ایس آئی کمرے سے باہر چلا گیا تو محمد خان نے یوں مجھے دیکھا جیسے پرائمری اسکول کا کوئی سخت گیر ٹیچر کسی شرارتی بچے کو دیکھتا ہے۔ پھر وہ کوئے ایسی کرخت آواز میں بولا۔

"میرا اصول ہے جناب عالی کہ ایک دفعہ شرافت سے پوچھتا ہوں۔ اسے آپ آخری موقع بھی کہہ سکتے ہیں۔ لوگ ایویں رولا پاتے ہیں کہ پولس تشدد کرتی ہے۔ بھئی سیدھی بات ہے۔ تشدد کا موقع تو آپ ہی لوگ دیتے ہیں نا! اگر سیدھے طریقے سے بتا دیں تو ہمیں کیا ضرورت ہے مارنے پیٹنے کی۔" وہ بولتے بولتے رکا اور میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اپنی اس گفتگو کی داد چاہتا ہو۔ "اب بتاؤ تم نے اکبر صاحب کو قتل کیوں کیا؟"

"میں بتا چکا ہوں کہ میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔" میں نے جواب دیا۔

محمد خان نے مایوسی سے سر ہلایا جیسے اسے میرے جواب سے صدمہ پہنچا ہو' پھر اس نے اچانک میرے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میں لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے وزنی گرز میرے منہ پر کھینچ مارا ہو۔ اس کے ایک ہی تھپڑ سے میرے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور زبان خون کا ذائقہ محسوس کر رہی تھی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنے بھرپور تھپڑ کے بعد بے ہوش ہو جاتا مگر وانگ یو کی تربیت نے مجھے سخت جان بنا دیا تھا۔ اس لئے میں اپنے پیروں پہ کھڑا تھا۔ یوں بھی اس کا وہ تھپڑ غیر متوقع نہیں تھا۔ انسان ذہنی طور پر کسی بات کے لئے تیار ہو تو اتنا متاثر نہیں ہوتا۔ پھر اس نے میرا گریبان پکڑا اور مجھے کمرے کے وسط میں گھسیٹ لیا۔ میرے سر پہ ایک رسی جھول رہی تھی۔ اس نے رسی کا سرا پکڑ کے گھسیٹ لیا۔ چھت کے ایک ہک میں ایک چرخی لگی تھی۔ وہ رسی اسی چرخی سے

گزر کے آئی تھی۔ پھر اس نے اس رسی کے سرے سے میرے دونوں پاؤں باندھے اور دوسری طرف جا کر اچانک رسی کا دوسرا سرا کھینچ لیا۔ میرے جسم کو زبردست جھٹکا لگا اور میں اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے میری ٹانگیں بلند ہوئیں اور میں چمگادڑ کی طرح الٹا جھولنے لگا۔ رسی کا دوسرا سرا ایک دیوار گیر ہک میں اٹکا کر محمد خان پھر کمرے کے وسط میں آ گیا۔

"اب بولو، کیا کہتے ہو؟" اس نے کوے ایسی آواز میں پوچھا۔

میں اسے چڑانے کی خاطر ہنسنے لگا اور بولا۔ "تم کیا سمجھتے ہو، اس طرح میں تمہارے کہنے کے مطابق بیان دے دوں گا۔ الٹا لٹکنا تو میری ایکسرسائز کا ایک حصہ ہے۔"

اس نے بھنا کر ہاتھ چلایا مگر اب میں چوکنا تھا۔ میں اسی تیزی سے پیچھے کی طرف جھول گیا۔ اس نے دوبارہ میرے چہرے پر تھپڑ مارنا چاہا مگر اس دفعہ بھی اس کی حسرت دل میں رہ گئی۔ پھر تو گویا اس پر جنون سوار ہو گیا۔ وہ پینترے بدل بدل کر مجھ پر وار کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ ہانپنے لگا۔ اسے مزید زچ کرنے کی خاطر میں نے الٹے لٹکے اپنے جسم کو تولا اور اوپر کی طرف اٹھتا چلا گیا۔ پھر میں نے جسم کو کمانی کی طرح موڑ کے رسی کو پیروں کے پاس سے تھام لیا۔ اب میں محمد خان کی پہنچ سے دور تھا۔ وہ بھنا کر رسی کے دوسرے سرے کی طرف لپکا تاکہ اسے کھول کر مجھے گرا دے مگر میں جانتا تھا کہ اس کا اگلا قدم یہی ہو گا اس لئے میں نے جسم کو تھوڑا سا اوپر اٹھا کر چھت کا ہک پکڑ لیا۔ محمد خان نے اچانک رسی کا دوسرا سرا ڈھیلا کر دیا۔ میرے پیر رسی میں بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ تیزی سے نیچے چلے گئے مگر میں چونکہ ہک میں لٹکا ہوا تھا اس لئے نیچے نہیں گرا۔ اب میرے پاؤں زمین کی طرف چلے گئے تھے اور میں چھت کا ہک پکڑے ہوئے سیدھا لٹکا ہوا تھا۔ پھر میں نے اپنے جسم کو تولا اور فرش پہ کود گیا۔

محمد خان حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا، پھر وہ دانت پیس کر بولا۔ "لوئے کسے باندر کی اولاد! تو اس سے پہلے سرکس میں کام تو نہیں کرتا تھا؟"

"ہاں یہ سوال کچھ مناسب ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاں، میں پہلے سرکس میں کام کرتا تھا۔ تم کہو تو مزید کچھ کرتب دکھاؤں۔ مثلاً میں لوہے کے گولے منہ سے نکال سکتا ہوں، چھت پہ الٹا چل سکتا ہوں، پانی میں آگ لگا سکتا ہوں اور تمہیں مکھی بنا سکتا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کہو تو بنا دوں تمہیں مکھی!" اس دوران میں غیر محسوس طریقے پر میں اپنے پیر کھول چکا تھا۔

محمد خان میری باتیں سن کر پہلے تو حیرت سے مجھے دیکھتا رہا، پھر چیخ کر بولا۔ "بکواس بند کر اور سیدھی طرح میرے سوالوں کے جواب دے۔"

"ارے یار، تو پوچھو نا!" میں نے بھی اسی کے لہجے میں چیخ کر کہا۔ "تم نے تو آدھے

گھنٹے سے بھی کم وقت میں رپورٹ دینے کا دعویٰ کیا تھا مگر اب تو ایک گھنٹہ ہونے والا ہے۔ تمہارا افسر کیا سوچے گا۔"

میری طنز پہ اس نے پھر ہاتھ گھمایا مگر میں پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے بپھر کر کونے میں رکھا ہوا لمبا سا بید اٹھا لیا۔ میں نے اسے چڑانے کو کہا۔ "یار' میں تو تمہیں بہت جان دار سمجھتا تھا مگر تم تو بالکل ہی گئے گزرے ہو۔ میرا خیال تھا کہ تم اکیلے ہی مجھ سے سب کچھ اگلوا لو گے مگر....."

اس نے ایک دم مجھ پر بید سے وار کیا۔ میں اچھل کر کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا۔ اس نے پھر آگے بڑھ کر مجھ پہ وار کیا مگر میں الٹی قلا بازی کھا کے اس سے بچ گیا۔ ذرا سی دیر میں وہ ہانپنے لگا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی بے بسی تھی' سانس بری طرح اکھڑا ہوا تھا اور وہ مجھے غلیظ گالیاں بک رہا تھا۔

اچانک کمرے میں اے ایس آئی داخل ہوا۔ وہ کمرے کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گیا' پھر محمد خان سے بولا۔ "اس نے کچھ اقرار کیا؟"

"یہ باندر کا بچہ تو ہاتھ ہی نہیں آتا چودھری صاحب!" محمد خان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "یہ پہلے کسی سرکس میں کام کرتا تھا۔"

"محمد خان! میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم اس کی زندگی کے حالات معلوم کرو۔ مجھے یہ بتاؤ' اس نے قتل کا اقرار کیا ہے یا نہیں!" اے ایس آئی جھنجلا کر بولا۔

"نہیں۔" محمد خان نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اے ایس آئی پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔ "میں خود نمٹ لوں گا اس سے' خواہ مخواہ دو گھنٹے ضائع کر دیئے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم اپنے اس غیر ملکی ساتھی کو کب سے جانتے ہو؟" اس کا اشارہ غالباً رضا کی طرف تھا۔

"کون سا غیر ملکی ساتھی؟" میں نے پوچھا۔ "میرے کئی دوست غیر ملکی ہیں۔"

اے ایس آئی نے پہلے غیر ملکوں اور ان کے رہنے والوں سے اپنے ناقابل اشاعت تعلقات کا انکشاف کیا' پھر دانت پیس کر بولا۔ "اوئے' میں اس بندے کی بات کر رہا ہوں جسے تمہارے ساتھ گرفتار کیا ہے۔"

"اچھا وہ ایرانی۔" میں ہنس کر بولا۔ "جب سے وہ پاکستان آیا ہے' اسی وقت سے دوستی ہے۔"

اچانک ایک کانسٹیبل کمرے میں داخل ہوا اور اے ایس آئی سے بولا۔ "ڈی آئی جی صاحب تشریف لائے ہیں سر جی! وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔"

ڈی آئی جی کا نام سن کر اے ایس آئی یوں دہشت زدہ ہو کے بھاگا جیسے اسے موت

کے فرشتے نے طلب کیا ہو۔ چند منٹ بعد وہی کانسٹیبل پھر کمرے میں آیا اور مجھ سے بولا۔ "چلو، تمہیں بھی صاحب نے بلایا ہے۔" پھر اس نے آگے بڑھ کے مجھے ہتھکڑی لگا دی اور اسی حالت میں مجھے لے کر آفس کی طرف بڑھا۔

وہ ایس ایچ او کا دفتر تھا۔ ایس ایچ او کی کرسی پر باوقار سا ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ وردی کی بجائے سوٹ میں تھا اور ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ کمرے میں رضا بھی موجود تھا مگر وہ معزز آدمی کی طرح کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ڈی آئی جی نے سر ہلایا اور بولا۔ "مسٹر خرم! ہمیں افسوس ہے کہ پولیس نے تمہارے ساتھ تمہارے اس ایرانی دوست کو بھی گرفتار کر لیا۔ اب یہ دھمکی دے رہا ہے کہ میں اپنے سفارت خانے سے بات کروں گا۔"

"میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اسے رہا کرنے کو تیار ہیں مگر ایک شرط پر؟" ڈی آئی جے نے کہا۔

"کیسی شرط؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کہ تمہارا دوست اس واقعے کو بھول جائے۔"

"اس سلسلے میں بھلا میں کیا کر سکتا ہوں، صرف اسے سمجھا ہی سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ آپ اسے سمجھائیں۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہوں گا۔"

میرے کہنے پر ڈی آئی جی نے اے ایس آئی کو حکم دیا کہ انہیں بات کرنے کا موقع دو۔ اے ایس آئی ہم دونوں کو برابر والے کمرے میں لے گیا۔ تنہا ہوتے ہی میں نے رضا سے کہا۔ "تم یہاں سے سیدھے کلارا کے پاس جانا اور اس سے کہنا کہ وہ فوری طور پر روپوش ہو جائے۔ وہ اگر پولیس کے ہتھے چڑھ گئی تو یہ لوگ اگلی پچھلی ساری کسر نکال لیں گے۔"

"مگر کیوں؟" رضا نے پوچھا۔

"تم شاید بھول گئے کہ کلارا غیر قانونی طور پر پاکستان میں داخل ہوئی ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔ اس کی گرفتاری کے لئے تو یہی الزام کافی ہے۔ بس تم اس سے کہنا کہ جب تک میں باہر نہ آ جاؤں، اس وقت تک چھپی رہے۔ بڑی کی دیکھ بھال تم کر لینا، شہلا کا بھی دھیان رکھنا اور مجھ سے ملنے کے لئے آتے رہنا۔" اے ایس آئی کو آتے دیکھ کر میں نے انگریزی میں کہا۔ "رضا پلیز، میری خاطر مان جاؤ۔ اگر تمہاری شکایت وزارت خارجہ تک پہنچ گئی تو کئی افراد کی نوکریاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" رضا نے طویل سانس لے کر کہا۔ اُس نے بھی اے ایس آئی کو سنانے

کے لئے انگلش کا سہارا لیا تھا۔ "تم کہتے ہو تو میں اس واقعہ کو بالکل بھول جاؤں گا۔"

"چلو' پھر اپنے فیصلے سے ڈی آئی جی صاحب کو بھی آگاہ کر دو۔" میں نے کہا۔

پھر اے ایس آئی ہمیں ایک مرتبہ پھر ڈی آئی جی صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ رضا نے کہہ دیا ہے کہ وہ اس واقعے کو بالکل بھول جائے گا مگر یہ چاہتا ہے کہ جب تک میں یہاں موجود ہوں' اسے مجھ سے ملاقات کا موقع دیا جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈی آئی جی صاحب نے کہا' پھر ایس ایچ او سے مخاطب ہوا۔ "یہ رضا صاحب جب بھی یہاں آئیں' انہیں خرم سے ملوا دینا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "صبح خرم کو مجسٹریٹ کے سامنے ضرور پیش کر دینا۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوا تو مجبوراً سبھی کو کھڑا ہونا پڑا۔ "اوکے' میں اب چلتا ہوں۔" پھر وہ رضا سے مخاطب ہوا۔ "آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

اس کے جانے کے بعد رضا بھی چلا گیا۔ ان لوگوں نے مجھے ایک مرتبہ پھر لاک اپ میں بند کر دیا مگر اس دفعہ وہ لاک اپ نہیں تھا جس میں انہوں نے پہلے مجھے رکھا تھا بلکہ یہ تھانے ہی کا ایک کمرہ تھا جس سے وہ لوگ لاک اپ کا کام لے رہے تھے۔ یہ اس لاک اپ کے مقابلے میں زیادہ غلیظ اور زیادہ سلین زدہ تھا۔ یہاں مچھروں کی بھی بہتات تھی اور کھٹمل بھی کثرت سے تھے۔

رات کیسے گزری' مجھے کچھ احساس نہیں۔ بس کسی نہ کسی طرح گزر ہی گئی۔ کھٹمل دیواروں کے سوراخوں سے قطار در قطار نکل رہے تھے' فرش پر رینگ رہے تھے' چھت سے ٹپک رہے تھے۔ پھر مچھروں نے کاٹ کاٹ کر برا حال کر دیا تھا۔

صبح تقریباً آٹھ بجے مجھے بد رنگ' پانی ایسی چائے اور سوکھے ہوئے دو رس دیئے گئے۔ میں نے وہ چیزیں ایک طرف رکھ دیں۔ پھر مجھے لاک اپ سے نکال کر گاڑی میں سوار کیا گیا۔ اس وقت بھی میرے ہاتھ میں ہتھکڑی پڑی ہوئی تھی۔

میرے ساتھ گاڑی کے پچھلے حصے میں دو مسلح محافظ موجود تھے۔ پھر وہ گاڑی تیز رفتاری سے روانہ ہو گئی۔ حسن اسکوائر کا راؤنڈ اباؤٹ کراس کرنے کے بعد گاڑی سبزی منڈی پہنچی تو پچھلی گاڑی کو دیکھ میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہ سفید رنگ کی فورڈ ویگن تھی' ماڈل زیادہ پرانا نہیں تھا۔ چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اسے کلارا ڈرائیو کر رہی تھی۔ ممکن ہے وہ شروع ہی سے میرے پیچھے رہی ہو۔ میرے اعصاب تن گئے اور مجھے [illegible] ہونے لگا کہ کلارا جذبات میں آ کر کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔ میں اس کی طر[illegible] گریز کر رہا تھا۔

پولیس وین نیو ٹاؤن سے ہوتی ہوئی جیل روڈ کے راؤنڈ ابا[illegible] پہنچی' اور وہاں سے اسلامیہ کالج کی طرف مڑ گئی۔

اچانک پولیس وین کے بریک چرچرائے' دھچکے سے میں اور میرے ساتھ بیٹھے ہوئے

دونوں مسلح کانسٹیبل وین کے اگلے حصے سے ٹکرا گئے۔ اسی لمحے زوردار دھماکہ ہوا' لوہے سے لوہا ٹکرانے اور رگڑنے کی آوازیں سنائی دیں اور پولیس وین کا اگلا حصہ اچھل کر سڑک کے درمیانی فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ پرانی سی ایک جیپ اچانک ہی بائیں طرف کی ایک ذیلی سڑک سے نکل کر پولیس وین سے ٹکرا گئی تھی۔ کلارا نے بھی فورڈ کو ہنگامی بریک لگائے اور فورڈ' پولیس وین سے رگڑ کھاتی ہوئی رک گئی۔ فوراً ہی فورڈ کے پچھلے دروازے کھلے اور دو آدمی برق رفتاری سے اتر کے پولیس وین کے پچھلے حصے میں گھس آئے۔ وہ دونوں ریوالوروں سے مسلح تھے۔ حواس باختہ کانسٹیبل ابھی حادثے کے اثرات سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ آنے والوں نے برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں کے سروں پر ریوالور کے دستے مار دیئے۔ وہ دونوں جہاں بیٹھے تھے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ گاڑی کے گرد ہجوم ہو گیا تھا۔ شاید وین کا ڈرائیور زخمی ہو گیا تھا' ممکن ہے اس کے ساتھ بیٹھا ہوا اے ایس آئی بھی زخمی ہو گیا ہو اس لئے لوگوں کی تمام تر توجہ وین کے اگلے حصے کی طرف تھی۔ آنے والوں نے دونوں کانسٹیبلوں کو اس انداز میں سیٹوں پر بٹھا دیا' گویا بیٹھے بیٹھے انہیں اونگھ آ گئی ہو۔ پھر انہوں نے میری ہتھکڑی کی زنجیر ایک کانسٹیبل کی بیلٹ سے نکالی اور بجلی کی سی تیزی سے مجھے ساتھ لے کر نیچے اتر گئے۔ میری ہتھکڑی چھپانے کو ان میں سے ایک نے میرے دائیں ہاتھ اور شانے پر اجرک ڈال دی تھی۔ وہ دونوں مجھے لے کر پھرتی سے وین کی طرف بڑھے اور دوسرے ہی لمحے کلارا نے وین آگے بڑھا دی۔

سڑک پہ اب خاصا ہجوم ہو گیا تھا اس لئے کلارا کو گاڑی وہاں سے نکالنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ میں نے یونہی سرسری انداز میں وین کے اگلے حصے کی طرف دیکھا' جیپ کی ٹکر لگنے سے پولیس وین کا ڈرائیور واقعی شدید زخمی ہو گیا تھا' اے ایس آئی بھی زخمی تھا مگر اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس کھٹارا جیپ میں کوئی موجود نہیں تھا۔ ممکن ہے جیپ کا ڈرائیور فرار ہو گیا ہو یا ممکن ہے وہیں مجمع میں کھڑا ہو کے دوسروں کے ساتھ خود کو گالیاں دے رہا ہو۔ اگر یہ منصوبہ کلارا نے بنایا تھا تو واقعی بہت ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ بالاخر فورڈ کو راستہ مل ہی گیا اور وہاں سے نکلتے ہی کلارا نے پوری رفتار سے فورڈ کو بھگانا شروع کر دیا۔

میں نے اس دوران میں اس سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی مضبوطی سے دانت پر دانت جمائے ڈرائیونگ کرتی رہی۔ اس نے آگے سے گاڑی شاہراہ قائدین کی طرف موڑ دی۔ پھر اس نے روڈ پر تھوڑی دیر چلنے کے بعد کلارا نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کلارا کی طرف دیکھا اس نے کوئی بات کئے بغیر پرس اٹھایا اور اس میں سے کچھ بڑے نوٹ نکال لئے اور اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "حسب وعدہ کام کرنے کی فیس۔"

ان میں سے ایک نے کلارا سے نوٹ لے لئے' پھر وہ دونوں کلارا کو سلام کر کے گاڑی

سے اتر گئے۔ ان کے اترتے ہی کلارا نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"یہ تم نے کیا حماقت کی؟" میں نے کلارا سے پوچھا۔

"کیسی حماقت؟" وہ ونڈا سکرین پہ نظریں جمائے ہوئے بولی۔

"یہی جو ابھی آپ نے فرمائی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "پولیس وین کو روکنے کا وہ طریقہ بھی بہت بھونڈا اور خطرناک تھا۔ فرض کرو اگر تصادم شدید ہوتا تو....."

"فرض کرنے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے" کلارا نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "مگر میں نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ جیپ کو وین سے بس ذرا ٹچ کر دینا' اتنا کہ پولیس وین میں ڈینٹ پڑ جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ پولیس وین میں سوار آفیسر بکتا جھکتا نیچے اترتا' اسی وقت مجھے اور میرے ساتھیوں کو موقع مل جاتا ہے۔"

"ویسے' تمہارے یہ ساتھی کہاں سے پیدا ہو گئے؟ میرا خیال ہے کہ تم پہلی دفعہ پاکستان آئی ہو!" میں نے ہنس کر کہا۔

"جیب میں نوٹ ہوں تو دنیا کے ہر خطے میں ایسے ساتھی مل جاتے ہیں۔ یہ سب کرائے کے لوگ تھے۔" کلارا نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "جب رضا نے مجھے بتایا کہ کل صبح تمہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا تو میں نے بہت عجلت میں یہ منصوبہ بنایا تھا۔" کلارا مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ "تمہیں تجسس ہو گا کہ اتنی جلدی کرائے کے ان لوگوں کا بندوبست کیسے ہوا؟ یہ میں تمہیں فرصت سے بتاؤں گی۔"

"اس بات کو چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ برڈ کا کیا حال ہے۔"

"ہاں۔" جیسے کلارا کو کچھ یاد آ گیا۔ "برڈ کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔" پھر اس نے اچانک فورڈ کی رفتار انتہائی تیز کر دی۔

میں نے ہنس کر کہا۔ "برڈ کی حالت تو خطرے سے باہر ہے مگر میری حالت اس وقت ضرور خطرے میں ہے۔ تم اگر اسی طرح خوف ناک انداز میں ڈرائیونگ کرتی رہیں تو....."

"تم شاید بھول گئے کہ اب تم پولیس کی حراست سے بھاگے ہوئے مفرور ملزم ہو اور مجھے شبہ ہے کہ ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔" اس کی بات پر میں چونک اٹھا اور مڑ کر پیچھے دیکھنا چاہتا تھا کہ کلارا نے مجھے ٹوک دیا۔ "پیچھے مڑ کر مت دیکھنا ورنہ انہیں علم ہو جائے گا کہ ہم اس تعاقب سے واقف ہو چکے ہیں۔"

"کیا وہ کوئی پولیس کی گاڑی ہے؟" میں نے غیر محسوس طریقے پر اپنا رخ بدلا۔

"گاڑی تو پولیس کی نہیں ہے مگر اس میں پولیس کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔" پھر اس نے گاڑی اچانک دائیں طرف کی ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ "مگر وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ کس سے پالا پڑا تھا۔" وہ بولتے بولتے رکی' پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں ہتھکڑی لگی ہوئی ہے۔ اگر ہم اس گاڑی سے فوری طور پر چھٹکارہ بھی پا لیں تو تم خواہ مخواہ

لوگوں کی نظروں میں آ جاؤ گے۔" اس نے پھر ایک موڑ مڑتے ہوئے کہا۔

"میرا ہتھکڑی والا ہاتھ چادر میں چھپا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "تم موقع دیکھ کر کہیں روک لو ہم ٹیکسی میں روانہ ہو جائیں گے۔"

"شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔" کلارا نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس گاڑی کو ڈاج دینے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ ممکن ہے' یہ میرا وہم ہی رہا ہو اور محض اتفاقیہ طور پر وہ گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی ہو۔"

"بہرحال' تم اس گاڑی سے چھٹکارا پاؤ۔"

"ظاہر ہے' یہ گاڑی تو چھوڑنا ہی پڑے گی کیوں کہ یہ بھی چوری کی گاڑی ہے۔"

اس کے اس انکشاف پر میں اسے گھور کر رہ گیا۔ مجھے ایک دم غصہ آ گیا تھا کہ ایک تو اس نے مجھے پولیس کی حراست سے چھڑایا تھا' پھر چوری کی گاڑی میں لئے گھوم رہی تھی۔ اگر اس کی خوف ناک ڈرائیونگ کو دیکھ کر ٹریفک کا کوئی سارجنٹ ہمارے پیچھے لگ جاتا تو ساری محنت پر پانی پھر جاتا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہارا بھی جواب نہیں ہے۔ اتنی دیر سے چوری کی گاڑی میں لئے پھر رہی ہو۔ اگر ابھی تمہارا چالان ہو جاتا تو؟"

کون کرے گا چلان؟" وہ بے نیازی سے بولی۔ ٹریفک کا کوئی سارجنٹ مجھ سے زیادہ تیز نہیں چل سکتا۔ وہ مجھ تک پہنچے گا تو چالان کرے گا نا!"

"اچھا اب گاڑی روکو اور کوئی ٹیکسی پکڑو۔" میں نے بھنا کر کہا۔

"ارے تو ناراض کیوں ہوتے ہو؟" وہ منہ بنا کر بولی۔ "میری نیکی کا خوب صلہ دے رہے ہو۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس وقت ہم سولجر بازار کے علاقے میں تھے۔ ایک جگہ موقع دیکھ کر کلارا نے فورڈ پارک کر دی۔ میں نے اس سے کہا کہ تم کوئی ٹیکسی پکڑ لو۔ میں بعد میں نیچے اتروں گا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ گاڑی سے اترتے ہی کلارا کو ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ اس نے آواز دے کر اس کو روک لیا' پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر وہیں سے اس نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ہتھکڑی والے ہاتھ کو بہت احتیاط سے چادر میں لپیٹا یوں جیسے وہ ہاتھ بری طرح زخمی ہو' پھر میں محتاط انداز میں فورڈ سے اتر آیا۔

کلارا کی ہدایت پر ٹیکسی مختلف راستوں سے گزر کے ایئرپورٹ پہنچ گئی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا ہتھکڑی والا ہاتھ احتیاط سے چادر میں لپیٹا اور نیچے اتر آیا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر کلارا بے نیازی سے فلائٹ انکوائری کی طرف بڑھ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرنا کیا چاہ رہی ہے۔ میرے فرار کے بعد پولیس نے ایئرپورٹ' ریلوے اسٹیشنوں اور کراچی سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی ہو گی اور وہ احمق لڑکی خود ہی ان کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنسنے چلی آئی تھی۔ میں ٹیکسی میں اس سے کھل کے بات

بھی نہیں کر سکتا تھا' اب وہ عجیب و غریب قسم کی مصروفیات میں تھی۔ مجھے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ جب اسے اس قسم کے حالات کا کوئی تجربہ نہیں تھا تو وہ کیوں عقل کل بنی ہوئی تھی۔

انکوائری سے کچھ معلومات حاصل کر کے وہ پھر میری طرف آئی۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ "تم آخر کرنا کیا چاہ رہی ہو؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"میں تمہیں لے کراچی سے باہر نکلنا چاہتی ہوں۔" اس نے بھولپن سے جواب دیا۔

"احمق ہو تم!" میرا پارہ چڑھ گیا۔ "اس وقت پولیس ایک ایک مسافر کو چیک کر رہی ہو گی۔ تم پہلے مجھ سے تو مشورہ کر لیتیں۔"

"اس بات پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا۔" کلارا منہ پھلا کر بولی۔

"اب نکلو یہاں سے ورنہ میرے ساتھ تم بھی دھر لی جاؤ گی۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "کسی ملزم کو....." میرا جملہ ادھورا رہ گیا کیوں کہ اسی وقت پولیس کی دو گاڑیاں آگے پیچھے آ کر رکی تھیں۔

"خرم!" کلارا نے ہیجانی انداز میں میرا شانہ دبایا۔ "پولیس۔"

"خود پر قابو رکھو احمق!" میں نے سختی سے اسے جھڑک دیا۔ "یوں جذباتی ہو گئیں تو وہ سب سے پہلے تمہاری خبر لیں گے۔ ان کی طرف دیکھو بھی مت۔"

"یہاں سے بھاگو خرم!" وہ سرگوشی میں بولی۔

"خاموشی سے کھڑی رہو" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

پھر میں غیر محسوس طریقے پر پارکنگ ایریا کی طرف بڑھنے لگا۔ پولیس آفیسر گاڑیوں سے اتر کر لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے۔

پارکنگ ایریا سے گزر کے میں ان دکانوں کی پشت پر پہنچ گیا جو پارکنگ ایریا کے سامنے واقع تھیں۔ وہاں بھی کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کے ایک ٹیکسی والے سے بات کی۔ "مجھے لی مارکیٹ جانا ہے۔"

اس نے بھرپور انداز میں میرا جائزہ لیا' پھر بولا۔ "ڈیڑھ سو روپے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں نے کلارا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا' پھر خود بھی بیٹھ گیا۔ "چلو۔"

ڈرائیور نے کلارا کو گھورا' پھر مشکوک انداز میں مجھے دیکھا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

ہم لوگ بہ عافیت لی مارکیٹ پہنچ گئے۔ یہاں آنے کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ بس میں ایئرپورٹ سے نکلنا چاہتا تھا۔ یہاں البتہ میں کندھے اور ہاتھ پر چادر ڈالے مشکوک نظر نہیں آ رہا تھا کیوں کہ بیشتر لوگوں کے کندھوں پر چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ کلارا البتہ وہاں نمایاں تھی۔ اس علاقے میں وہی غیر ملکی جاتے تھے جنہیں کسی قسم کے نشے کی طلب ہوتی تھی۔ میں جلد از جلد ہتھکڑی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کسی

خرادیے سے ہتھکڑی کٹوا دوں مگر اس میں خطرہ تھا۔ ممکن ہے وہ ہتھکڑی کاٹنے سے پہلے پولیس کو اطلاع دے دیتا' ممکن ہے پولیس کا کوئی اہل کار اپنے طور پر مجھے ہتھکڑی کٹواتے ہوئے دیکھ لیتا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ ہتھکڑی کاٹنے کا سامان لے کر خود ہی اسے کاٹنے کی جگہ تلاش کروں۔ میں نے کلارا سے کچھ پیسے لئے اور اسے ایک جگہ کھڑا کر کے ہارڈویئر کی دکان سے چھینی' ہتھوڑی' لوہا کاٹنے کا بلیڈ اور ریتی لے کر آ گیا۔ اب مجھے ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں بیٹھ کر میں ہتھکڑی کاٹ سکوں۔ میں کھڑا ہوا یہی سوچ رہا تھا کہ ایسی جگہ مجھے کہاں مل سکتی ہے۔ کلارا خاموشی سے میرے ساتھ کھڑی تھی۔

اچانک شلوار قمیض میں ملبوس کالا سا ایک شخص ہمارے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ کلارا بھی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس شخص نے سرگوشی میں کہا۔ "ہشیش وانٹ" اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مفہوم ادا کر دیا تھا۔ وہ کلارا کو نشے کی عادی سمجھ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ کلارا جواب دیتی۔ میں نے کہا۔ "ہاں چاہئے مگر مال اے ون ہونا چاہئے۔"

"ارے تم لوگ کون ہے؟" اس نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

"ہم لوگ کا فکر نئیں کرو۔" میں بھی اسی کے انداز میں بولا۔ "مال کا بات کرو مال کا!"

"مال تو یہ بھی اچھا ہے ڑے۔" اس نے کلارا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اڑے او۔" میں نے اسے ٹوکا۔ "یہ مال کو چھوڑو۔"

"آؤ ہمارے ساتھ۔" وہ ایک دم مڑ گیا۔

○

میں اور کلارا بھی اس کے پیچھے چل دیئے۔ ہارڈویئر سے خریدے ہوئے سامان کا تھیلا کلارا کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس سے وہ سامان لینے کی کوشش کی تو لمحے بھر کے لئے میرے دائیں ہاتھ سے چادر ہٹ گئی۔ عین اس وقت وہ شخص مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ ہتھکڑی کی جھلک دیکھتے ہی وہ چونک اٹھا' پھر مسکرا کر بولا۔ "اڑے تم تو بہت پھنکار (فنکار) ہے ڑے۔ ڈرو نئیں' ہم بھی اچھا آدمی نئیں ہے۔ اسی لائن کا آدمی ہے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ مڑ کے بھاگ جاؤں مگر اس گنجان آبادی میں بھلا کتنی دور بھاگ سکتا تھا' پھر کلارا کا مسئلہ بھی تھا۔ وہ میرے ساتھ کیسے بھاگتی اور بھاگتی تو تماشا بنتا۔ میں تن بتقدیر ہو کے اسی کے پیچھے چلتا رہا۔ وہ شخص اب ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں گھس گیا تھا۔ میں اور کلارا خاموشی سے اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ کلارا تو سہم کر رہ گئی تھی۔ ہمارا رہنما ہنس کر بولا۔ "اڑے تم لوگ کا تو بولتی بند ہو

گیا۔ ڈرو نئیں بابا' میر محمد یاروں کا یار ہے۔"

"اگر ڈرتا تو یوں تمہارے ساتھ نہ چلتا نہ رہتا۔" میں نے جواب دیا۔ میں گھبراہٹ میں یہ بھی بھول گیا کہ اس سے قبل میں اس سے اسی کے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

چلتے چلتے میر محمد ایک مقفل دروازے کے سامنے رک گیا' پھر اس نے جیب سے چابی نکال کے تالا کھولا پھر مجھے اور کلارا کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اب اپنے آپ و حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا کہ جو ہو گا' دیکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر میں کلارا کے ساتھ اس تنگ و تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔ ہمارے پیچھے میر محمد بھی اندر داخل ہوا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر بلب کا سوئچ آن کر دیا۔ کمرے میں مٹیالی سی روشنی پھیل گئی۔ وہاں فرش پہ ایک طرف میلی سی' پھٹی پرانی دری بچھی تھی اور دیوار کے ساتھ میلے میلے دو گاؤن تکیے رکھے تھے۔ فرش پہ ایک طرف تام چینی کی چائے دانی اور کپ رکھے تھے۔ وہاں ایک دیوار گیر الماری بھی تھی جس کے پٹ نہیں تھے۔ اسی الماری کے ایک خانے سے میر محمد نے دھلی ہوئی ایک چادر نکال کر میلی دری پر بچھائی اور مجھ سے بولا۔ "بیٹھو ڑے' آرام سے بیٹھو۔ ہم لوگ کو اپنا دوست سمجھو۔" میں اور کلارا خاموشی سے فرش پر بیٹھ گئے تو میر محمد بولا۔ "ابھی تم لوگ ادھر بیٹھو' ہم چائے لے کر آتا ہے۔"

"چائے کو چھوڑو' ہمیں....."

"اڑے پروا نئیں کرو۔ ہم لوگ جانتا ہے' تم مال نئیں لے گا' مت لیو مگر ہم پہ شک نئیں کرو۔"

"میں تم پر شک نہیں کر رہا ہوں میر محمد مگر....."

"اڑے پہلے چائے تو پیو' پھر ہم اس ہتھکڑی کا بھی بست و بند کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

میں عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میر محمد جان کا عذاب بن گیا تھا۔ اب تو ہم پوری طرح اس کے رحم و کرم پر تھے اور وہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ میں وقت گزاری کے لئے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ دیوار پر محمد علی کلے کے مختلف پوز چسپاں تھے۔ اس کے ساتھ ہی مشہور فلمی ہیروئنوں کی تصویریں بھی تھیں۔ ایک طرف فریم میں ایک گروپ فوٹو لگا ہوا تھا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر ایک اور دروازہ تھا جو بند تھا۔

میر محمد نے لوٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ایک چینک تھی۔ اس نے فرش پر رکھے ہوئے گندے کپ اٹھائے اور انہیں لے کر دھونے کے لئے کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں نے جیسے تیسے چائے ختم کی کیوں کہ وہ چائے اتنی میٹھی تھی کہ میرے ہونٹ چپکے جا رہے تھے۔ کلارا بھی چائے پیتے ہوئے برے برے منہ بنا رہی تھی۔ ہم لوگ چائے پی

چکے تو میر محمد نے کہا کہ میں ہتھکڑی کاٹنے کا سامان لے کر آتا ہوں۔ جب میں نے اسے یہ بتایا کہ سامان میں لے آیا ہوں تو وہ اسی وقت میری ہتھکڑی کاٹنے بیٹھ گیا۔

وہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ میر محمد ایسے مضبوط شخص نے بھی ہتھکڑی کاٹنے میں ایک گھنٹہ لگا دیا۔ کلارا تو شاید کئی دن لگا دیتی۔ بہرحال گھنٹے بھر کی محنت کے بعد میر محمد ہتھکڑی کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہتھکڑی کٹتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا اور میر محمد سے بولا۔ "تمہاری بہت مہربانی بھائی۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ اگر تم برا نہ مانو تو کچھ پیسے.....؟"

"کیسا بات کرتا ہے راجہ!" میر محمد نے میری بات کاٹ دی۔ "ہم نے تم لوگ کو دوست بولا ہے' پھر پیسہ کس بات کا!"

"اچھا' پھر ہمیں اجازت دو۔"

"اتنا جلدی نئیں کرو۔" میر محمد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اسی وقت دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور کوئی چیخ کر بولا۔ "میر محمد!"

"اڑے' صبر کرو ڑے!" میر محمد نے بھی اسی انداز میں جواب دیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

میں کسی متوقع خطرے کے پیش نظر گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً" کٹی ہوئی ہتھکڑی کی زنجیر اٹھا لی تاکہ کسی خطرے کی صورت میں اسے بہ طور ہتھیار استعمال کر سکوں۔ کلارا کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور وہ سہمے ہوئے انداز میں دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اڑے' پروا نئیں کرو' اندر آ جاؤ۔" میر محمد نے کہا' پھر وہ وہیں سے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "فکر کا کوئی بات نئیں ہے واجہ! یہ بھی اپنا یار ہے۔"

دوسرے ہی لمحے جو شخص کمرے میں داخل ہوا اسے دیکھ کر بے اختیار میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ آنے والا ان دونوں میں سے ایک تھا جنھوں نے مجھے پولیس وین سے فورڈ میں سوار کرایا تھا۔ وہ بھی ہم دونوں کو دیکھ کر چونک اٹھا' پھر میر محمد سے بولا۔ "اڑے' ان لوگ کو کوئی تکلیف نئیں دینا۔ یہ اپنا بھی یار ہے۔" پھر اس نے مختصراً میر محمد کو بتایا کہ ان لوگوں نے کیسے مجھے پولیس کی حراست سے چھڑایا۔

اسے دیکھ کر میرا خوف جاتا رہا کیوں کہ وہ آدمی بہرحال قابل اعتبار تھا' پھر وہ بھی میرے جرم میں برابر کا شریک تھا اس لئے مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یوں بھی مجھے اس قسم کے لوگوں کا تجربہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے جرائم پیشہ لوگ زبان کے دھنی ہوتے ہیں۔ اگر ان پر اعتبار کیا جائے تو شاذ و نادر ہی کسی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔

میں نے کلارا سے پوچھا۔ "اس وقت تمہارے پرس میں کتنے پیسے ہیں؟"

"تقریباً پندرہ سولہ ہزار ہوں گے۔"

"واجہ ابھی پیسوں کا فکر نئیں کرو۔" "آنے والے نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا۔ گویا وہ انگلش بھی سمجھتا تھا۔ "میم صاحب نے پہلے ہی ہم لوگ کو بہت پیسہ دیا ہے۔ ابھی تو واجہ تم ہمارا مہمان ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں دراصل ایک گاڑی کی شدید ضرورت ہے۔ میں اسی لئے پیسوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"دس بارہ ہزار میں اچھا گاڑی مل جائے گا۔" میر محمد نے کہا۔ "یہ قادر بخش گاڑی کا بندوبست کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے قادر بخش سے کہا۔ "ہمیں کوئی گاڑی لا دو۔"

"اتنا پیسہ کیوں خرچ کرتا ہے واجہ!" قادر بخش نے کہا۔ "ہم کرائے کا گاڑی لے آئے گا۔ مرضی ہوئے تو خود چلانا' مرضی ہوئے تو ہم لوگ کو بھی ساتھ رکھنا۔"

مجھے اس کی یہ تجویز پسند آئی۔ مجھے اسی جیسے کسی آدمی کی ضرورت بھی تھی۔ میں نے فوراً کہا کہ میں تمہیں بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔

ہم لوگ قادر بخش کے ساتھ وہاں سے فوراً ہی نکلنا چاہتے تھے مگر میر محمد نے اصرار کر کے ہمیں روک لیا۔ وہ ہمیں کھانا کھلائے بغیر جانے نہیں دے رہا تھا۔

ہم وہاں سے کھانا کھا کے نکلے تو سہ پہر کے تین بجے تھے۔ میں نے مقامی بلوچوں کی طرح سر پر چار خانے کا ایک رومال ڈال لیا تھا۔ اس سے میرا آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ قادر بخش نے مجھے بتایا کہ وہ اس وقت ہمیں بھٹ آئی لینڈ لے جا رہا ہے۔ وہیں اس کا گھر تھا اور وہ خاصا محفوظ علاقہ تھا۔

ہم بھٹ آئی لینڈ پہنچ کر سکون سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ نو عمر سا ایک لڑکا ہانپتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ "استاد..... وہ..... پولیس....."

"کیا بکواس کرتا ہے ڑے!" قادر بخش گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"اڑے' کیا پولیس نہیں جانتا کہ یہ میر غلام حسین کا ڈیرہ ہے! قادر بخش تلخ لہجے میں بولا' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم پھکر (فکر) نئیں کرو واجہ' ہم دیکھتا ہے کہ وہ بدذات لوگ ادھر کیوں آیا ہے؟"

"قادر بخش!" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "کوئی ہتھیار ہو تو مجھے دے دو' میں بالکل نہتا ہوں۔ ایسے میں اگر....."

"تم ادھر آرام سے بیٹھو واجہ!" اس نے جواب دیا۔ "تم تک پہنچنے کے لئے ان لوگ کو پہلے ہم کو ختم کرنا پڑے گا۔" پھر وہ جاتے جاتے بولا۔ "ابھی جب تک ہم نہ آؤں دروازہ نہیں کھولنا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ بولٹ کر دیا۔ کلارا کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اتنا تو سمجھ ہی گئی تھی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کیا ہوا خرم! کیا یہاں بھی پولیس پہنچ گئی؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہاں پولیس آئی ہے؟" میں اس کے سوال پر حیران رہ گیا۔

"وہ لڑکا آیا تھا اس نے آتے ہی پولیس کا نام لیا تھا اور قادر بخش ایک دم پریشان ہو گیا تھا۔ اسی سے مجھے اندازہ ہوا کہ پولیس یہاں آئی ہے۔" کلارا نے جواب دیا۔

"ہاں' پولیس آئی تو ہے مگر گھبراؤ مت' قادر بخش ان لوگوں کو ٹال دے گا۔" میں نے اسے تسلی دینا چاہی۔

"مگر خرم!" کلارا الجھ کر بولی۔ "پولیس یہاں تک پہنچی کیسے؟ ہم نے تو کہیں بھی کوئی سراغ نہیں چھوڑا ہے۔ پھر یہاں کی پولیس اتنی مستعد بھی نہیں ہے کہ....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر پرخیال لہجے میں بولی "خرم! کہیں میر محمد نے تو....."

"نہیں کلارا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔" یہ بلوچ بات کے دھنی ہوتے ہیں۔ میر محمد کو اگر یہ سب کچھ کرنا ہوتا تو وہ بہت پہلے کر دیتا۔ اسے بھلا اتنا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر اس میں اس کا فائدہ بھی کیا ہے۔ نہیں کلارا' میں یہ بات نہیں مان سکتا۔"

"مگر خرم' یہ تو سوچو کہ صرف دو ہی آدمی جانتے ہیں کہ ہم یہاں ہیں' قادر بخش یا میر محمد۔ قادر بخش ہمارے ساتھ ہے' اب میر محمد ہی باقی رہ جاتا ہے۔"

"اچھا' پلیز' تھوڑی دیر خاموش رہو اور مجھے سوچنے دو۔" میں نے کلارا کو جھڑک دیا۔ اس کی باتوں سے میرے ذہن میں بھی شبہات سر اٹھا رہے تھے کہ ممکن ہے میر محمد ہی نے مخبری کر دی ہو مگر ذہن اس بات کو ماننے پر آمادہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔

مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اس کمرے میں دو کھڑکیاں بھی تھیں مگر دونوں بند تھیں' پہلے میں نے سوچا کہ کوئی کھڑکی کھول کر باہر کا جائزہ لوں مگر پھر اپنے اس ارادے سے باز رہا کہ مبادا اس سے کوئی گڑبڑ ہو جائے۔ کلارا بھی خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرے جھڑکنے سے اس کا منہ بن گیا ہے۔ مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ اسے جھڑک دیا۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی' باہر سے البتہ کچھ مبہم قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں نے کشیدگی کم کرنے کو کلارا سے کہا۔ "کلارا! تم برا مان گئیں میری بات کا؟"

اس نے شکایتی نظروں سے میری طرف دیکھا' پھر کوئی جواب دیئے بغیر سر جھکا لیا۔

"کلارا!" میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ "دیکھو ہم کیسے غیر یقینی حالات سے دوچار ہیں' کچھ بھروسہ نہیں کہ ابھی پولیس مجھے گرفتار کر لے یا بغیر کچھ پوچھے مجھے گولی مار دے۔ تم

ایسے موقع پر بھی منہ پھلائے بیٹھی ہو!"

کلارا تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ "خرم پلیز، ایسی باتیں مت کرو۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ "تم کیا سمجھتے ہو، تمہارے بغیر میں زندہ رہ سکتی ہوں؟"

"حیرت ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم تو نہ پاکستانی فلمیں دیکھتی ہو، نہ انڈین، پھر یہ ڈائیلاگ کہاں سے سیکھے؟" میں ماحول کی کشیدگی کم کرنے کو خواہ مخواہ بکواس کئے جا رہا تھا۔

کلارا جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا، پھر دبے پاؤں دروازے کے پاس جا کر بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اڑے کون ہے ڑے؟"

"میں ہوں، قادر بخش!" باہر سے قادر بخش کی مانوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے سکون کا طویل سانس لیا۔

قادر بخش اندر آیا تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا قادر بخش، پولیس کیوں آئی تھی؟"

قادر بخش نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا اور بولا۔ واجہ، وہ کسی اور کے پیچھے آئی تھی۔ یہ میر غلام حسین کا ڈیرہ ہے اس لئے پولیس والا اس علاقے میں نہیں آیا بلکہ کافی دور رک گیا تھا۔ اڑے واجہ، ان کا ہمت ہی نہیں ہے اس علاقے میں آنے کا۔ وہ لوگ ہم سے پوچھا کہ ادھر کوئی آیا تو نہیں ہے۔ ہم بولا، اڑے ادھر تو لوگ آتا جاتا رہتا ہے تم لوگ کو کس کا تلاش ہے؟ وہ لوگ بولا، ایک آدمی پولیس سے بچ کے ادھر آیا ہے، اس نے کوئی بینک ڈکیتی کیا ہے۔ اس کا دو ساتھی پولیس نے مار دیا۔ وہ بچ گیا۔ ہم بولا، ادھر کوئی نہیں آیا ہے۔" قادر بخش نے ایک ہی سانس میں پوری تفصیل بتا دی۔

"مگر تمہیں اتنی دیر کہاں لگی؟" میں نے پوچھا۔

"اڑے واجہ ابھی کیا بولے۔" قادر بخش ہنس کر بولا۔ "وہ بدبخت ادھر ہی ہے۔"

"کون بدبخت؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اڑے اوئی، جس کا پیچھے پولیس ادھر آیا ہے۔ اس کا پاؤں میں گولی لگا ہے۔ ہم اس کو سیدو کے حوالے کیا ہے۔ سیدو بہت اچھا مرہم پٹی کرتا ہے۔ پھر وہ کچھ سوچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔" واجہ باتوں میں ہم بالکل بھول گیا۔ ہم کو تو ابھی ایک بہت ضروری کام سے جانا تھا۔ وہ کام بھی آج ہی ہونا ہے۔ استاد غلامو آئے گا تو ناراض ہوئے گا۔ تم لوگ ابھی کوئی فکر نہیں کرنا۔ ادھر سب اپنا آدمی ہے۔"

"مگر قادر بخش، اگر خدانخواستہ تمہاری غیر موجودگی میں گڑبڑ ہو گئی تو؟" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے کم از کم کوئی ریوالور تو دے دو۔"

"واجہ، ریوالور بھی مل جائے گا مگر غلامو استاد کے آنے کے بعد۔ ہم کریم خان کو تم

لوگ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ جب تک ہم واپس آؤں گا' وہ ادھر تمہارے پاس رہے گا۔'
یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

○

اس کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ میں نے اطمینان سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کمرے میں بھی فرنیچر کے نام پر کوئی چیز نہیں تھی۔ کمرے میں وال ٹو وال خاصا دبیز قسم کا کارپٹ تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ ڈبل بیڈ والا اسپرنگ سیٹ پڑا ہوا تھا اور اس پہ دو تین گاؤ تکیے رکھے تھے۔ پھر دیوار کے ساتھ ساتھ فوم کی کئی گدیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ایک آتش دان بھی تھا۔ اس پر لائن سے بہت سی ٹرافیاں سجی ہوئی تھیں۔ کمرے کی ایک دیوار پر کسی بلوچ کی خاصی بڑی رنگین تصویر آویزاں تھی۔

میں کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دروازے پر ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی۔ اس مرتبہ میں نے دروازہ بولٹ نہیں کیا تھا۔ میں نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں کریم خان۔"

باہر سے ایک اجنبی آواز آئی۔ مجھے یاد آ گیا کہ قادر بخش نے بھی کسی کریم خان کا تذکرہ کیا تھا۔ میں نے کہا۔ "دروازہ کھلا ہے' اندر آ جاؤ۔"

دوسرے ہی لمحے لمبا تڑنگا اور مضبوط ہاتھ پیروں کا ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیض پہن رکھی تھی' رنگت سرخ و سفید تھی اور بالوں کا رنگ براؤن تھا۔ چہرے مہرے سے وہ ملک کے شمالی علاقے کا باشندہ لگتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا' پھر جلدی جلدی پشتو میں کچھ بولنے لگا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے پشتو نہیں آتی تو وہ خاصا مایوس ہوا اور بولا۔ "آپ کے چہرے اور رنگ و روپ سے مجھے دھوکہ ہوا کہ آپ کا تعلق بھی سرحد سے ہے۔"

"کیا حرج ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم سمجھ لو کہ میرا تعلق سرحد سے ہے۔" پھر میں نے ہنس کے کہا۔ "مگر ایک بات میرے لئے بھی حیرت انگیز ہے۔ تمہاری' اردو بہت صاف اور بامحاورہ ہے۔"

"بچپن سے کراچی میں ہوں صاحب! اس نے بھی ہنس کر جواب دیا۔ پھر کلارا کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ کی مسز بور ہو رہی ہیں۔ آپ کہیں تو میں انگلش میں بھی بات کر سکتا ہوں۔"

"مزید حیرت انگیز! میں اچھل پڑا۔ "پھر انگلش میں بولا۔ "جب تم پڑھے لکھے ہو تو پھر یہاں کیوں پڑے ہوئے ہو؟"

میرا سوال انگلش میں تھا اس لئے کلارا بھی چونک کر ہمیں دیکھنے لگی۔ کریم خان

کر بولا۔ "آپ کو یہ جان کر بھی حیرت ہو گی کہ میں نے صرف پرائمری تک تعلیم حاصل کی ہے۔"

"پھر یہ انگلش..... میں نے پوچھا۔

"یہ بھی عجیب بنات ہے۔" کریم خان فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ "ہمارے یہاں جسے انگلش نہیں آتی' اسے جاہل مطلق سمجھا جاتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو۔ اور مجھ سا جاہل اگر انگلش بولنے لگے تو لوگ خواہ مخواہ اس کی عزت کرنے لگتے ہیں' اس سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ یہ ہماری قوم کا کتنا بڑا المیہ ہے۔"

"ارے' تم تو فلاسفر بھی ہو۔ کلارا مسکرا کر بولی۔

"بات فلسفے کی نہیں ہے میڈم!" کریم خان نے رواں انگلش میں کہا۔ "میں تو اپنی قوم کے مزاج کی بات کر رہا ہوں' بے شمار مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے انگلش بول کر بڑے بڑے کام کرائے ہیں۔ پولیس کے چھوٹے موٹے اہل کار تو انگلش سن کر سہم جاتے ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ ہماری قوم کی کمزوری ہے اور اس سے مجھ ایسے بے شمار لوگ ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

مجھے اس کی باتوں سے سو فی صد اتفاق تھا۔ آزادی ملنے کے چالیس سال بعد بھی ہم ذہنی طور پر غلام تھے۔ میں نے جان بوجھ کر موضوع تبدیل کر دیا اور کریم خان سے کہا۔

"میں نے یہاں میر غلام حسین کا نام سنا ہے۔ مجھے یہ تو بتاؤ کہ یہ میر غلام حسین ہے کون؟"

"آپ میر غلام حسین کو نہیں جانتے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "میر غلام حسین سمندروں کا بادشاہ ہے۔ سمندر کی لہریں بھی اس کی اجازت کے بغیر اس علاقے میں داخل نہیں ہو سکتیں۔" اس نے عقیدت و احترام سے کہا۔ "اسے ہم لوگ استاد غلامو کہتے ہیں۔ وہ ہمارا سب کچھ ہے۔ میں نے ہوش سنبھال کے اسی کو دیکھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ماں باپ کون ہیں' میرا آبائی گھر کہاں ہے۔ میں تو بس استاد غلامو کو جانتا ہوں۔ نہ صرف سمندر پر اس کی حکمرانی ہے بلکہ کراچی کی زیر زمین دنیا بھی اس کے نام سے کانپتی ہے۔ سونے کا بھاؤ اس کی اجازت سے مقرر ہوتا ہے' پولیس کے بڑے بڑے افسروں کے تبادلے اور تقرریاں بھی اسی کی مرضی سے ہوتی ہیں۔"

کلارا حیرت سے منہ کھولے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ پھر وہ پرخیال انداز میں بولی۔

"تو کیا میر غلام حسین کوئی بہت بڑا سیاسی لیڈر ہے؟"

"سیاسی لیڈر!" کریم خان کے لہجے میں حقارت تھی۔ "بڑے بڑے سیاسی لیڈر استاد غلامو کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں اور اس کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگے رہتے ہیں۔ استاد کا سیاست سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے مگر ہر حکومت میں اس کے کچھ خاص آدمی ضرور ہوتے ہیں۔"

"یار، تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے ہم مغلوں کے عہد میں زندہ ہیں، یا پھر یہ عثمانی ترکوں کا عہد ہے جس میں ایک بحری قزاق خیرالدین بہار بر بروسا نے اپنا ذاتی بحری بیڑہ تیار کر لیا تھا اور اس کے علاقے سے گزرنے والا ہر غیر ملکی جہاز اسے خراج دیئے بغیر گزر نہیں سکتا تھا۔ یہ بیسویں صدی ہے میرے بھائی۔ کوئی عقل کی بات کرو۔"

کریم خان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دکھائی دیئے، پھر وہ پرجوش لہجے میں بولا۔

"آپ کو مشکل ہی سے ان باتوں پر یقین آئے گا مگر حقیقت یہی ہے کہ میر غلام حسین اس دور کا خیرالدین بار بروسا ہے۔ اس کا کوئی ذاتی بحری بیڑہ نہیں ہے مگر اس میں اتنی قوت ہے کہ اسے بحری بیڑے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"چھوڑو یار، کوئی اور بات کرو۔" میں اکتا کر بولا۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے اتنی اچھی انگلش کہاں سے سیکھی؟"

"استاد، غلامو کا ایک بزنس پارٹنر ہے الفرڈ، میں نے دس سال اس کے ساتھ گزارے ہیں۔ اس کے ساتھ رہ کے میں نے انگلش سیکھی ہے۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا جب استاد غلامو نے مجھے اس کے حوالے کر دیا تھا۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "باتوں میں مجھے چائے کا دھیان تو رہا ہی نہیں۔ میں ابھی آپ کے لئے چائے لے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے طویل سانس لیا اور کلارا سے بولا۔ "کلارا ڈیئر! اگر کریم خان کی بتائی ہوئی باتیں ففٹی پرسنٹ بھی درست ہیں تو ہم ایک نئی مصیبت سے دوچار ہونے والے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" کلارا الجھ کر بولی۔

"ظاہر ہے، ان کا استاد غلامو بھی مجھ سے انہی دستاویزات اور مائیکرو فلمز کا مطالبہ کرے گا اور اب تو وہ چیزیں میرے پاس ہیں بھی نہیں۔"

"مگر وہ بھلا کیوں مطالبہ کرنے لگا؟ کلارا بدستور الجھی ہوئی تھی۔

"کبھی اپنی اس خوبصورت کھوپڑی کو بھی تکلیف دے لیا کرو۔" میں نے اسے چھیڑنے کو کہا۔ "جن چیزوں کی حکومتوں کو طلب ہے، ان کی طلب استاد غلامو کو کیوں نہیں ہو گی۔ وہ بھی تو اس بات سے باخبر ہو گا۔ اگر وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کریم خان نے بتایا ہے تو پھر یقیناً وہ مجھ سے ان چیزوں کا مطالبہ کرے گا۔"

"مگر قادر بخش..... کیا وہ ہم لوگوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دے گا؟" کلارا نے کہا۔

"قادر بخش!" مجھے اس کی بات پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "قادر بخش تو ایک معمولی مہرہ ہے۔ وہ بھلا کیا کر سکے گا وہ تو غلام حسین کے آگے دم بھی نہیں مار سکے گا۔"

"تم وقت سے پہلے ہی تصویر کا تاریک پہلو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہو خرم!" کلارا نے منہ بنا کر کہا۔ "ممکن ہے یہ سب کچھ نہ ہو۔" اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ان باتوں سے خود کو بہلا رہی ہے۔

"خیر' اب پریشان مت ہو۔" میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ "جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"پہلے تو اپنی باتوں سے دہشت زدہ کرتے ہو پھر کہتے ہو کہ پریشان مت ہو۔" کلارا منہ بنا کر بولی۔

وہ مزید کچھ کہتی کہ' کریم خان ایک ٹرے میں چائے کے لوازمات لے کر آ گیا۔ ٹرے میں چائے کے علاوہ سموسے' پھل' پیٹس اور دیگر چیزیں بھی وافر مقدار میں موجود تھیں۔ ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ قادر بخش بھی آ گیا۔ اس نے آتے ہی بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے استاد غلامو سے ٹیلی فون پر میری بات ہوئی ہے۔ وہ آج رات کراچی پہنچ رہا ہے اور آج ہی تم سے ملنے پر آمادہ بھی ہو گیا ہے۔

"یار' میں اتنی اہم شخصیت' تو نہیں ہوں کہ تمہارا استاد مجھے آج ہی ملاقات کا شرف بخش رہا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "ہو سکے تو مجھے یہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔ میں بھلا استاد غلامو سے مل کر کیا کروں گا؟"

"واجہ' خوش قسمت ہے تم۔" قادر بخش نے ہنس کر کہا۔ "ورنہ استاد سے ملنا ہر ایک مقدر میں نہیں ہوتا۔ بڑا بڑا سیٹھ لوگ اس سے ملنے کے لئے مہینہ مہینہ انتظار کرتا ہے۔"

"مجھ پر یہاں ایک ایک لمحہ بھاری ہے قادر بخش۔" میں نے بہ مشکل اپنی جھلاہٹ پر قابو پا لیا۔ "میرا جگری دوست زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور لاوارثوں کی طرح اسپتال میں پڑا ہے۔ میرا ایک ساتھی نہ جانے کہاں بھٹک رہا ہو گا۔ میری بہن خدا معلوم کس حال میں ہو گی اور میری دو ساتھی لڑکیاں کئی دن سے غائب ہیں' وہ بیچاریاں زندہ بھی ہیں یا....."

"سب ٹھیک ہو جائے واجہ!" قادر بخش نے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم ایک دفعہ استاد سے مل لو' پھر دیکھنا' وہ تمہارے لئے کیا کرتا ہے۔"

اس سے بحث کرنا فضول تھا۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں میری کسی بات پر وہ مشتعل نہ ہو جائے اور میں وقتی پناہ گاہ سے بھی جاؤں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "استاد کس وقت پہنچ رہا ہے کراچی؟"

"آج ہی پہنچ جائے گا۔ ہو سکتا ہے' وہ پہنچ بھی گیا ہو۔ تم لوگ رات کا کھانا اس کے ساتھ کھائے گا۔ یار تم لوگ کا بھی کیا قسمت ہے۔ استاد غلامو کے ساتھ کھانا....."

تم نے اسے میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم لوگ نے تو صرف اتنا بتایا تھا کہ تم پولیس سے بچ کر ہمارے پاس پہنچا ہے۔ استاد غلامو نے باقی بات میں خود بتایا۔ وہ ملک میں نہیں ہے مگر اسے ہر بات کا خبر دیتا ہے واجہ!"

پھر وہ بھی بہت دیر تک استاد غلامو کے گن گاتا رہا۔ اس کی اس بات نے مجھے فکر مند کر دیا تھا کہ استاد غلامو مجھے پہلے سے جانتا ہے۔ اسے یقینی طور پر یہ علم بھی ہو گا کہ میرے پاس وہ اہم دستاویزات ہیں۔

باتوں میں آٹھ بج گئے۔ میں نے قادر بخش سے پوچھا کہ استاد غلامو کب پہنچے گا یہاں؟ میری بات پر قادر بخش یوں ہنسا جیسے میں نے کوئی بہت احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "استاد' یہاں آئے گا' اس کھنڈر میں' واجہ تم بھی بچوں والا بات کرتا ہے۔ اڑے یار' ابھی ہم تم لوگ کو لے کر استاد کے بنگلے پر جائے گا۔ کلفٹن میں اس کا بہت بڑا بنگلہ ہے۔"

نو بجے قادر بخش نے مجھ سے اور کلارا سے چلنے کو کہا۔ باہر کھٹارا سی گاڑی موجود تھی جس میں ہم لی مارکیٹ سے یہاں پہنچے تھے۔

گاڑی میں بٹھا کر قادر بخش نے چمڑے کے چشمہ مجھے اور کلارا کو دیں اور خجالت آمیز لہجے میں بولا۔ "کوئی غلط بات مت سوچنا واجہ' یہ پٹیاں آنکھوں پر باندھ لو۔ استاد کا حکم ہے کہ تم لوگ کو آنکھیں بند کر کے یہاں لایا جائے۔"

میں نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ پٹی لے کر آنکھوں پر باندھ لی۔ اس پٹی کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ کوشش کے باوجود اس کے گوشے میں بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر گاڑی چل پڑی اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مختلف سڑکوں پر دوڑنے کے بعد وہ ایک جگہ رک گئی۔ میں آنکھوں کا کام بھی کانوں سے لے رہا تھا۔ قادر بخش نے مجھے گمراہ کرنے کے لئے جھوٹ بولا تھا۔ نہ جانے اس میں بھی قادر بخش کی کوئی مصلحت تھی یا ایسا کرنے کا اسے حکم ملا تھا۔

اس نے مخصوص انداز میں تین دفعہ گاڑی کا ہارن بجایا' پھر میرے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے بھاری آہنی گیٹ کھولا گیا ہو۔ کار ایک مرتبہ پھر حرکت میں آئی اور تھوڑی دیر چل کر پھر رک گئی۔

"اڑے یار' ابھی تم لوگ اپنا آنکھیں کھول لیو۔" اس نے کہا۔

○

ہم لوگ گاڑی سے اترے تو کتوں کی خوف ناک غراہٹوں نے استقبال کیا۔ کتے شاید بندھے ہوئے تھے ورنہ یوں اور دور سے غرانے کی بجائے ہم پر حملہ آور ہو جاتے۔ میں نے سرسری طور پر اس جگہ کا جائزہ لیا۔ اس وقت ہم کار پورچ میں کھڑے تھے۔ اس سے پہلے

پورچ میں سفید رنگ کی چمچماتی ہوئی ایک مرسڈیز بینز بھی موجود تھی۔ برآمدے میں مضبوط جسموں کے دو چاق و چوبند افراد کھڑے تھے۔ ان کے شانوں سے سیون ایم ایم کی رائفلیں جھول رہی تھیں۔ ان کے چہرے انتہائی کرخت تھے اور ان کے انداز سے ہی لگ رہا تھا کہ ان کا ذریعہ معاش شریفانہ نہیں ہے۔ قادر بخش نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا ریوالور نکالا اور ان میں سے ایک کی طرف بڑھا دیا۔ دوسرے نے نہایت باریک بینی سے قادر بخش کی جامہ تلاشی لی، پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

"کوئی ہتھیار ہے تو خاموشی سے خود ہی ہمارے حوالے کر دو۔" ایک گارڈ کرخت لہجے میں بولا۔ اس کی دائیں آنکھ انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھی اور آنکھ کے نچلے حصے میں خاصا گہرا نیل پڑا ہوا تھا۔

سرخ آنکھ والے نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، پھر بہت تفصیل سے میری جامہ تلاشی لے ڈالی۔ میری جیب میں سوائے رومال اور پرس کے کچھ بھی نہیں تھا۔ تلاشی لینے کے بعد اس نے وہ دونوں چیزیں میرے حوالے کر دیں۔

پھر وہ دونوں کلارا کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان دونوں کی آنکھیں کلارا کے حسن بلا خیز سے شاید چندھیا کر رہ گئی تھیں۔ سرخ آنکھ والے کے انداز میں مجھے خاص طور پر عامیانہ اور گھٹیا پن محسوس ہوا۔ ان دونوں کی پر ہوس نظریں دیکھ کر میرا خون کھول گیا۔ جب وہ دونوں تلاشی لینے کلارا کی طرف بڑھے تو میں بول اٹھا۔ "ٹھہرو، تم لوگ اس کی تلاشی نہیں لے سکتے۔ اس کی تلاشی کوئی عورت ہی لے گی۔"

وہ دونوں جھٹکے سے رک گئے اور خشمگیں نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

قادر بخش جلدی سے بولا۔ "یہ استاد کا گارڈ ہے واجہ، تم کچھ خیال مت کرو۔"

"یہ استاد کے گارڈ ہوں یا شاگرد کے۔" میں نے براہ راست ان دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ مگر کلارا کی تلاشی یہ نہیں لیں گے۔"

"اڑے تم اتنا ہی غیرت والا ہے تو اس کو ادھر لایا ہی کیوں؟"

ان میں سے ایک اکھڑ لہجے میں بولا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تماشا بھی ہوتا ہے۔" پھر میں قادر بخش سے مخاطب ہوا۔ "انہیں بتاؤ کے کلارا کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے اور اس کی ذات سے تمہارے استاد غلامو کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"اڑے اس کا بات چھوڑو۔" سرخ آنکھوں والا کرخت لہجے میں بولا۔ "ہم اس چھوکری کا تلاشی ضرور لے گا۔

"میں قادر بخش کی طرف مڑا۔ "چلو قادر بخش، میں استاد غلامو سے پھر بھی مل لوں گا۔"

"اڑے او تیس مار خان کا اولاد!" ایک گارڈ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "استاد جس کو ٹیم دیتا ہے اس سے پھر ملتا ضرور ہے۔ اب وہ بندہ استاد سے زندہ ملے یا مردہ! یہ کہہ کر اس نے شانے سے رائفل اتار لی۔

"بات مت بڑھاؤ واجہ!" قادر بخش خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "ابھی مٹی ڈالو اور....."

"مٹی تو میں ضرور ڈالوں گا قادر بخش۔" میں نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔ میری کھوپڑی اسو قت بالکل الٹ ہو گئی تھی۔ پھر میں رائفل والے سے مخاطب ہوا۔ ان کھلونوں سے تو بچے بھی شیر ہو جاتے ہیں۔ تو اگر واقعی استاد غلامو کا گارڈ ہے تو اس کھولنے پر بھروسہ کیوں کر رہا ہے۔ اسے ایک طرف رکھوا دے پھر دیکھوں تو کتنا بڑا سورما ہے۔"

میری بات سن کر شاید اس کی کھوپڑی بھی الٹ گئی۔ اسے ایسی گفتگو کی عادت کب ہو گی۔ اس نے جھٹکے سے رائفل ایک طرف پھینک دی اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح میری طرف بڑھا۔ وہ تن و توش میں مجھ سے گنا نہیں تو ڈیوڑھا ضرور تھا' اور اس بات میں تو شبے کی گنجائش ہی نہیں تھی' کہ وہ لڑنے بھڑنے کے فن میں طاق تھا۔ ظاہر ہے استاد غلامو کا جو خاکہ میرے ذہن میں تھا اس کے حساب سے اس کے گارڈ کو بھی ناقابل تسخیر ہونا چاہئے تھا وہ میری طرف بڑھا تو میں پوری طرح ہوشیار تھا۔ قادر بخش اور کلارا مسلسل کچھ بول رہے تھے' مگر میں اس وقت پوری طرح گارڈ کی طرف متوجہ تھا اس لئے میری سمجھ میں ان دونوں کی کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ گارڈ نے اچانک جھپٹا مار کے میرے سر کے بال پکڑنا چاہے مگر میں پوری طرح چوکنا تھا اس لئے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے نیچے جھک کر اچانک اس کی بڑھی ہوئی کلائی تھام لی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کسی فولاد کی موٹی راڈ پر ہاتھ ڈال دیا ہو۔ بلاشبہ اس کی کلائی کسی فولادی راڈ کی طرح مضبوط تھی۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنی کلائی چھڑانا چاہی مگر وہ وانگ یو کا خاص داؤ تھا۔ میں نے اپنے پورے جسم کی قوت اپنی دائیں کلائی میں منتقل کر دی تھی۔ میں نے اس کی کلائی جوڑ کے پاس سے پکڑی تھی۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں مجھے حیرت نظر آئی۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنی اس کلائی کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ شاید اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ زور آزمائی کی صورت میں اس کی کلائی کا جوڑ نکل جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ذرا دم لے کر دوبارہ اپنی کلائی آزاد کرانے کی کوشش کرے گا اسی لئے

میری پوری توجہ اس کی کلائی پر تھی۔ میرے اندازے کے برعکس اس نے بائیں ہاتھ سے میری گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ غیر ارادی طور پر ہی تھوڑا سا جھک گیا اس کا وہ وار بھی خالی گیا۔ پھر تو گویا اس پر جنون سوار ہو گیا۔ وہ بھنا کر بولا۔ ”اڑے‘ مچھر کا اولاد‘ تم دو چار داؤ پیچ سیکھ کر جانو سے مقابلہ کرے گا۔ اڑے‘ تم جیسا چھوکرا لوگ تو ہمارا ایک تھپڑ برداشت نہیں کر سکتا۔ اڑے‘ ہم ابھی تم لوگ کو فنا کر دے گا۔“

میں جواب میں کچھ بھی نہیں بولا۔ یہ بھی وانگ یو کی ہدایت تھی کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے جتنا بول سکتے ہو بولو‘ اپنے حریف کو مشتعل کرو مگر جب ایک دفعہ زور آزمائی شروع ہو جائے تو باتیں کرنے کی بجائے پوری توجہ حریف کی حرکات و سکنات پر رکھو۔

بولتے بولتے اس نے اچانک‘ بالکل غیر متوقع طور پر مجھ پر چھلانگ لگائی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آس پاس کی کوئی دیوار آکر مجھ پر آگری ہو۔ وہ لمحوں میں مجھ پر چھا گیا۔ اس کا بھاری تن و توش مجھے پیسے دے رہا تھا اور لحہ بہ لحہ میرا سانس اکھڑ رہا تھا۔ اس نے مجھے ہلنے تک کی مہلت نہیں دی۔ اگر استاد غلامو نے اسے اپنا گارڈ منتخب کیا تھا تو غلط نہیں کیا تھا۔ وہ بے پناہ طاقت ور تھا۔ اس کے مقابلے میں ایک تو میں آؤٹ آف پریکٹس تھا‘ پھر کافی دنوں سے مجھے ایکسرسائز کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ رہی سہی کسر پولیس کی حراست میں پوری ہو گئی تھی۔ مجھے اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی مگر میں بھی اتنی آسانی سے مرنے کو تیار نہیں تھا۔

جانو نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”اڑے ابھی اس چھوکری کا تلاشی لیو۔ یہ اپنی آنکھ سے دیکھے کہ اس کا تلاشی ہوا یا نہیں‘ اس کے بعد ہم اس کو خلاص کر دے گا۔“

”جانو!“ قادر بخش چیخ کر بولا۔ ”اڑے تم جانتا ہے‘ یہ استاد کا مہمان ہے۔ استاد تم لوگ کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”نہیں چھوڑے۔“ جانو دانت پیس کر بولا۔

میرے دونوں ہاتھ جانو کی آہنی گرفت میں تھے اور اس کا چہرہ مجھ سے اتنی دور تھا کہ میں اس پر ٹکر بھی نہیں مار سکتا تھا۔ میں نے اسے تاؤ دلانے کو کہا۔ ”یار‘ ایسے تو تم ایک ہفتہ پڑے رہو گے‘ جب بھی میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”اڑے‘ ہم ان ہاتھوں سے تمہارا گلا دباؤں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے بھنا کے میرے ہاتھ چھوڑے اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانے لگا۔

یہی اس کی سب سے بڑی بھول تھی۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں نے پوری قوت سے اس کی کن پٹی پر وار کیا۔ اس کی گرفت‘ اچانک کمزور پڑ گئی۔ میں نے اسی قوت سے دوسرا

وار کیا اور پوری طاقت سے اسے اچھال دیا۔ وہ دھپ کی آواز کے ساتھ دوسری طرف گرا۔ میں نے اٹھ کے اس کی کھوپڑی پر بھرپور ٹھوکر ماری۔ اس کے باوجود وہ ہوش میں تھا۔ دوسری ٹھوکر میں نے اس کے پہلو میں ماری' پھر جھک کے اس کی کھوپڑی پر اتنا زوردار گھونسا مارا کہ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

دوسرا گارڈ حیرت اور خوف سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی مگر اب میں اسے بھی رعایت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے وہیں سے ایک زقند لگائی اور اس کے سینے پر اتنی بھرپور کک ماری کہ میرے کانوں میں سوکھی لکڑی چٹخنے کی سی آواز آئی۔ دوسرا گارڈ کھڑے کھڑے آگے پیچھے جھوما' پھر کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر آ رہا۔ وہ دونوں زندگی کی قید سے نجات پا چکے تھے۔

اچانک بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور کئی آدمی رائفلیں تانے میرے سامنے آ گئے۔ میں نے تھکے تھکے انداز میں ان لوگوں کی طرف دیکھا اور بے بسی سے ہاتھ اٹھا دیئے۔ رائفل برداروں میں سے ایک آگے بڑھ کر ان دونوں گارڈز کا جائزہ لینے لگا جو میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

"یہ..... یہ استاد غلامو کا مہمان ہے۔" قادر بخش کے لہجے میں دہشت تھی۔

"فکر مت کرو' ہم اسی استاد غلامو ہی کے پاس لے جائیں گے۔" لاشوں کا جائزہ لینے والے نے کہا' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب ہاتھ سر پر رکھ کر ہمارے آگے آگے چلو' لڑکی!" اس نے کلارا کو مخاطب کیا۔ "تم بھی ہاتھ سر پر رکھو اور آگے بڑھو۔"

کلارا کچھ سمجھی تو نہیں ہو گی مگر مجھے ہاتھ سر پر رکھے دیکھ کر خود بھی سر پر ہاتھ رکھ کے چلنے لگی۔ وہ سب گویا ہم لوگوں کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اگر ان کی مرضی کے خلاف ذرا سی بھی حرکت ہوئی تو وہ بے دریغ گولی مار دیں گے۔ میری وجہ سے قادر بخش کی پوزیشن بھی خراب ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ تو سر پہ نہیں رکھے تھے مگر بہت سہما ہوا تھا۔ کلارا کا رنگ بھی ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ شاید اسے یقین تھا کہ اب ہماری موت یقینی ہے۔ یقین تو مجھے بھی تھا کہ جب استاد غلامو کو اپنے دو آدمیوں کی موت کی اطلاع ملے گی تو وہ پہلی فرصت میں مجھے گولی مارنے کا حکم دے دے گا۔ مجھے اپنی موت کی تو زیادہ فکر نہیں تھی۔ مجھے تو کلارا کی فکر تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ استاد غلامو کا رویہ عورتوں کے معاملے میں کیا ہے۔ ممکن ہے وہ کلارا کے حسن پر فریفتہ ہو جاتا۔ مجھے قادر بخش کا بھی افسوس تھا۔ میں اسی کے توسط سے وہاں گیا تھا۔ میری وجہ سے اس کی برسوں کی بنی ہوئی ساکھ مٹی ملنے والی تھی۔

رائفل برداروں کے نرغے میں ہم ایک وسیع ہال میں پہنچے۔ ہال میں چاروں طرف قیمتی صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے۔ دروازے کے عین سامنے صوفے پر ادھیڑ عمر کا ایک باوقار

سا شخص بیٹھا تھا۔ اس کے بال برف کی طرح سفید تھے مگر چہرہ نوجوانوں کی طرح تر و تازہ تھا۔ اس کا جسم بھی کسرتی تھا۔ اس نے سفید رنگ کا باریک کرتا پہن رکھا تھا' شلوار بھی سفید تھی' پیروں میں طلائی کام والے سلیم شاہی جوتے تھے اور دائیں ہاتھ کی انگلی میں بڑے سے ہیرے والی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اس کے صوفے کے ساتھ بائیں ہاتھ پر خونخوار قسم کا بلنڈ ہاؤنڈ بیٹھا تھا۔ کتے نے مجھے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر باوقار شخص نے کتے کے سر پر تھپکی دے کر اسے دوبارہ بٹھا دیا۔ اس کے صوفے کے بالکل پیچھے دو رائفل بردار کھڑے تھے۔ میں اس باوقار شخص کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہی میر غلام حسین ڈاکنگ آف اوشین یا استاد غلامو ہے۔

اس نے پہلے مجھے اور کلارا کو پھر رائفل برداروں کو دیکھا اور گونج دار آواز میں بولا۔ "کیا تماشا ہے یہ؟"

"استاد' اس نے شیرو اور جانو کو ہلاک کر دیا ہے۔" ایک رائفل بردار نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کیا؟" استاد غلامو حیرت سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ گرے باؤنڈ بھی غراتا ہوا کھڑا ہو گیا جو اس کے بائیں ہاتھ پہ قالین پر بیٹھا تھا۔

"ڈنگو! اس نے کتے کو ڈانٹا تو وہ ایک مرتبہ پھر قالین پر بیٹھ گیا' پھر وہ رائفل بردار سے مخاطب ہوا۔ "خالق! تم کہہ رہے ہو کہ اس نے شیرو اور جانو کو ہلاک کر دیا' اس نے؟"

"میں خود بھی حیران ہوں استاد! خالق نے کہا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے ان کی لاشیں دیکھی ہیں۔"

"ویری اسٹرینج! وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ پھر مجھ سے بولا۔ "تم ہو کون اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میرا نام خرم ہے میر صاحب!" میں نے جواب دیا۔ "اور میں قادر بخش کے ساتھ ہی آیا ہوں۔"

"خرم! اس نے پرخیال انداز میں دہرایا پھر گویا پہلی دفعہ اس کی نظر قادر بخش پر پڑی۔ "قادر یہ تو ہمارا مہمان تھا' پھر یہ سب کیسے ہوا؟ تم نے شیرو اور جانو کو روکا کیوں نہیں؟"

جواب میں قادر بخش نے سہمے ہوئے انداز میں استاد کو پوری بات تفصیل سے بتا دی اور بولا۔ "میں نے ان لوگوں کو بتا دیا تھا کہ خرم آپ کا مہمان ہے۔ آپ پسند نہیں کریں گے کہ مہمان کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے مگر جانو نے کہا میں اسے جان سے مار کے دم لوں گا' چاہے استاد مجھے قتل کر دے۔"

"خالق!" استاد نے اس رائفل بردار کو مخاطب کیا جو شاید بقیہ رائفل برداروں کا انچارج تھا۔ "کیا میں نے یہ حکم نہیں دیا کہ ڈیوٹی کے دوران میں کسی کو نشہ کرنے کی

اجازت نہیں ہے۔"

"یہ بات سبھی جانتے ہیں استاد!" خالق نے آہستہ سے جواب دیا۔

"پھر جانو اور شیرو نے نشہ کیوں کیا؟"

"وہ نشے میں نہیں تھے استاد! خالق نے جلدی سے جواب دیا۔

"وہ نشے میں تھے یا نہیں' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ یہاں کے گارڈز کا چارج تمہارے پاس ہے اس لئے ذمے داری بھی تم پر ہے' انہوں نے یہ حرکت کی ہی کیوں؟" استاد کا پارہ آہستہ آہستہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اور اس وقت تم کہاں مرے ہوئے تھے جب وہ دونوں خرم کی جان لینا چاہتے تھے؟"

خالق نے کوئی جواب نہ دیا' خاموشی سے نظریں جھکائے کھڑا رہا۔

"میری بات کا جواب دو۔" استاد نے دہاڑ کر کہا۔

خالق کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے کہلاتے ہوئے کہا۔ "میں..... میں..... ت..... تاش کھیلنے..... بیٹھ گیا..... تھا۔"

"غفلت کی سزا جانتے ہو؟" استاد نے کرخت لہجے میں کہا۔ "تمہاری غفلت کی وجہ سے میرے دو بہترین آدمی مارے گئے۔"

"مجھے..... مجھے معاف کر دیں استاد..... صرف..... ایک دفعہ معاف..... کر دیں۔ میں....."

"معافی کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے۔" استاد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تمہارے سامنے دو راستے ہیں' یا تو شیرو اور جانو کے قاتل کو اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے لگا دو یا پھر الگو..... اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بتاؤ پہلی شرط منظور ہے یا دوسری؟"

خالق نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے پہلی شرط منظور ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر استاد غلامو پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے اشارے پر دوسرے تمام رائفل بردار ایک طرف سمٹ گئے۔

خالق مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنی بقاء کی جنگ لڑے گا اور ہارنے کی صورت میں اپنی زندگی ہی ہار جائے گا۔ میں نے کلارا کی طرف دیکھا' اس کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ فکرمند قادر مل بھی تھا مگر اس کے چہرے پر زیادہ تردد کے آثار نہیں تھے۔ شاید اسے یقین تھا کہ خالق میرا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ خود مجھے البتہ اندازہ نہیں تھا کہ مجھے کتنی محنت کرنا پڑے گی۔ میں اسے شکست دے بھی پاؤں گا یا نہیں۔ خالق ان تمام گارڈز کا انچارج تھا۔ اس میں کوئی ایسی خوبی ہو گی جس کی وجہ سے اسے انچارج بنایا گیا تھا۔

خالق نے اچانک اپنی قمیض اتار پھینکی۔ اب اس کے جسم پر صرف ایک چست جینز تھی۔

بلاشبہ اس نے باڈی بلڈنگ میں خاصی محنت کی تھی۔ اگر اتنی ہی محنت فائٹنگ میں کی ہو گی تو اسے زیر کرنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔

ہم دونوں وسیع و عریض ہال کے وسط میں آ گئے مجھے رہ رہ کر قادر بخش پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ اس نے اچھا مہمان بنایا تھا مجھے میر غلام حسین کا اور خوب ڈنر کھلایا تھا مجھے میزبان نے۔ خالق نے اچانک کئی فٹ اچھل کر میرے سینے پر فلائنگ کک ماری۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی پھرتی اور سرعت سے حملہ کرے گا۔ میں بے خیالی میں مار کھا گیا اور کک لگتے ہی فرش پر گر کے کئی فٹ تک لڑھکتا چلا گیا۔ میرے سینے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے پھرتی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر خالق مجھ سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس کی چلائی ہوئی لات میرے پہلو میں لگی اور میں بائیں پہلو کے بل گر پڑا۔ اگلی مرتبہ خالق نے میرے سر پر لات مارنا چاہی مگر میں تیزی سے قلا بازی کھا گیا۔ وہ پھر میری طرف لپکا مگر میں نے ایک مرتبہ بندر کی طرح زقند بھری اور الٹی قلا بازی کھا کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ پھر اسے زچ کرنے کے لئے میں نے دائرے کی شکل میں اچھلنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ میں موقع ملتے ہی اس کیک کمر پر ہلکی سی ایک لات بھی جڑ دیتا تھا۔ میں تقریباً دس منٹ تک اس کے ساتھ وہی چوہے بلی کا کھیل کھیلتا رہا' پھر میں خود ہی اس کھیل سے اکتا گیا اور ایک طرف کھڑا ہو کر اس کے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر وہ جونہی میری طرف بڑھا' میں نے اچھل کے اس کی گردن میں اپنی دونوں ٹانگوں سے سیزر لاک لگا دیا اور اس کی گردن ٹانگوں میں دبوچے ہوئے فرش پر گر گیا۔ اس نے جھٹکے سے گردن چھڑانے کی کوشش کی مگر اب میں کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے ٹانگوں کی گرفت مضبوط کر کے اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا' چٹاخ کی آواز آئی اور خالق کے منہ سے اذیت ناک کراہ بلند ہوئی میں اسے چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں جانتا تھا کہ اب کھیل ختم ہو چکا ہے۔ وہ دو تین دفعہ تڑپا' پھر ساکت ہو گیا۔

اچانک میر غلام حسین اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے تمام گارڈز ایک دم چوکس نظر آنے لگے۔ ان سب نے میرے اوپر بندوقیں تان لیں۔ اس کا کتا بھی غرا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے زیر لب کلمہ پڑھا کیوں کہ میر غلام حسین کسی بھی وقت فائرنگ کا حکم دے سکتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے نزدیک آیا اور میری پشت پر تھپکی دے کر بولا۔ "ویل ڈن مسٹر خرم ویل ڈن' تمہاری جتنی تعریفیں سنی تھیں اس سے بڑھ کر پایا۔ اگر حکومتیں اور ان کے خونخوار ایجنٹ تم سے عاجز ہیں تو واقعی انہیں ہونا چاہئے کیوں کہ تم معمولی آدمی نہیں ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم جیسا جی دار اور ذہین شخص میرے ساتھ آ ملا ہے۔"

یہ اس کی خوش فہمی تھی کہ میں اس کے ساتھ آ ملا تھا۔ مجھے تو حالات نے اس تک پہنچا دیا تھا۔ میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ "میر صاحب' یہ محض اتفاق ہے کہ قسمت مجھے آپ تک لے آئی ہے ورنہ میں.....؟"

"یہ حالات ہی ہوتے ہیں مائی ڈیئر! اس نے میری بات کاٹ دی۔ "اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میرے نہایت قریبی لوگ مجھے میر صاحب' یا غلام حسین صاحب کہہ کر مخاطب کریں۔ میں اپنے لوگوں کے لئے غلامو ہوں' استاد غلامو!" اس نے مربیانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اسی نام سے کیا تھا اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی اصل بھول جاتے ہیں۔

"سوری سر!" میں نے جرات سے کہا۔ "آپ کی شخصیت اتنی باوقار اور بارعب ہے کہ آپ کو استاد غلامو کہنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں آپ سے ماضی میں نہیں' حال میں ملا ہوں۔"

"تمہاری یہ بات بھی مجھے پسند آئی ہے۔" میر غلام حسین مسکرا کر بولا۔ "پھر اسے کچھ خیال آیا اور وہ چونک کر بولا۔ "اس ہنگامے میں مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ میں نے تمہیں ڈنر پر بلایا تھا۔ آؤ چلے کھانا کھا لیں' میری بھوک بھی چمک گئی ہے اور ظاہر ہے اس دھما چوکڑی کے بعد تمہارا کھانا بھی ہضم ہو گیا ہو گا۔ وہ موت کے اس خونی کھیل کو دھما چوکڑی کہہ رہا تھا۔ گویا میں نے اب تک ایکسرسائز کی ہو۔

پھر میں' کلارا اور قادر بخش اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچے۔

کھانے کے دوران میں اس نے کلارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے تمہاری یہ گرل فرینڈ واقعی اسی قابل ہے کہ اس کے لئے جان کی بازی لگا دی جائے۔"

میرے ذہن میں کہیں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "یہ صرف میری گرل فرینڈ ہی نہیں ہے بلکہ میں جلد ہی اس سے شادی بھی کرنے والا ہوں۔"

میری بات سن کر میر غلام حسین نے بلند و بانگ قہقہہ لگایا اور بولا۔ "وضاحت کی ضرورت نہیں ہے' مائی ڈیئر! میں خود تمہاری شادی کراؤں گا اس سے۔"

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ بالاخر میر غلام حسین اصل موضوع پر آ ہی گیا۔

"خرم! اب تم کم از کم مجھے بتا دو کہ تم نے وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمیں کہاں چھپائی ہیں؟"

○

میں سناٹے میں رہ گیا گویا اب میری غلام حسین کی بناوٹی دوستی' دشمنی میں تبدیلی ہونے والی تھی۔ میں نے سنبھل کر کہا۔ "میر صاحب! آپ تو بہت باخبر ہیں' مجھ سے زیادہ آپ

کے علم میں یہ بات ہو گی کہ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز اب کہاں ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہر محکمے میں آپ کے لوگ موجود ہیں۔ آپ انہی سے تصدیق کریں تو بہتر ہے۔"

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔ پھر وہ پرخیال لہجے میں بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز اب تمہارے پاس نہیں ہیں یا وہ چیزیں حکومت کے پاس بھی نہیں پہنچیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انہیں درمیان میں سے اڑا لیا گیا۔"

میں بری طرح چونک اٹھا۔ "حکومت کے پاس نہیں پہنچیں؟ مگر میں نے وہ تمام چیزیں اپنے ہاتھوں سے اکبر صاحب کے حوالے کی تھیں۔"

"پھر اکبر صاحب اور ان کی بیوی کو قتل کر دیا گیا تھا۔" میر غلام حسین نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "ظاہر اکبر صاحب نے اس وقت تک وہ چیزیں حکومتی کی تحویل میں نہیں دی ہوں گی۔ قاتل وہ چیزیں وہاں سے لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میں بہت اونچائی سے نیچے کی طرف گر رہا ہوں۔ پہلے مجھے صرف شبہ تھا کہ وہ اہم دستاویزات دشمنوں کے ہاتھ لگ گئی ہوں گی مگر میر غلام حسین نے تو اس کی ایک طرح سے تصدیق کر دی تھی۔ میں نے ان چیزوں کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کی تھی۔ نہ جانے کتنے آدمی ان کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ دشمنوں نے کئی دفعہ ان کے عوض شہلا کی سودے بازی کرنا چاہی مگر میں نے اپنی بہن پر بھی ان اہم دستاویزات کو ترجیح دی۔ انہی کی حفاظت کرتے ہوئے اکبر صاحب اور ان کی بیگم اپنی جان سے گئے۔ اعلیٰ دستاویزات کے چکر میں برڈ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو کر اسپتال میں پڑا تھا۔ رضا' تہمینہ اور رضوانہ کا کوئی پتہ نہیں تھا اور میرے بنگلے کو پولیس نے سیل کر دیا تھا۔ ان سب مصیبتوں اور پریشانیوں کے بعد بھی مجھے کیا ملا مایوسی اور ناکامی۔

میر غلام حسین بہت غور سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "خرم! تم تو بہت بہادر نوجوان ہو تمہاری آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔"

اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میر صاحب' یہ تو اپنی محنت کے رائیگاں جانے کے آنسو ہیں۔ میں نے لمحہ لمحہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان دستاویزات کی حفاظت کی ہے' میں نے ان کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ میں بہت برا آدمی ہوں میر صاحب! مگر مجھے اپنے وطن سے بھی محبت ہے۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ اگر وہ دستاویزات دشمنوں کے ہاتھ لگ گئیں تو نہ صرف پاکستان بلکہ پورا عالم اسلام ناقابل یقین بحران میں مبتلا ہو جائے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں؟ میں عالم اضطراب میں ٹہلنے لگا۔

"سنو خرم! میر غلام حسین نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "مجھے یاد نہیں کہ پچھلے تیس سال

میں میں نے کوئی اچھا کام کیا ہو۔ جوے کے اڈے' اسمگلنگ' ہنگامے' چور بازاری' ذخیرہ اندوزی' قانون شکن عناصر کی پشت پناہی' غرض کوئی ایسا غیر قانونی دھندا نہیں ہے جو میں نے نہ کیا ہو مگر مجھے نفرت ہے منشیات فروشی سے' مجھے نفرت ہے ان لوگوں سے جو اپنے ملک کے خلاف دشمنوں سے ساز باز کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک کی اہم دستاویزات دشمنوں کے ہاتھ بیچنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنی ماں کی چادر سے کھینچ کر اسے سرعام نیلام کر دے۔ مجھے تم پر فخر ہے خرم اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ دو دن کے اندر اندر یہ معلوم کر لوں گا کہ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز کس کے قبضے میں ہیں۔ ممکن ہے اس عرصے میں وہ چیزیں میں حاصل ہی کر لوں لیکن اگر اس دوران میں حاصل نہ کر سکا تو جب تک انہیں حاصل نہ کر لوں گا' چین سے نہیں بیٹھوں گا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "میں چاہوں گا کہ اب تم میرے ساتھ ہی رہو۔"

"مگر میر صاحب' میری بہن' میرا دوست اور وہ دوسری لڑکیاں....."

"تم ان کی فکر مت کرو۔" میر غلام حسین نے میری بات کاٹ دی۔ "میں کل ہی تمہاری بہن کو یہاں بلوا لیتا ہوں۔ تمہارے دوست کو بھی خصوصی وارڈ میں منتقل کرا دوں گا اور اگر ڈاکٹروں نے اجازت دی تو اسے بھی یہیں لے آئیں گے۔"

پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولے۔ "رہا تمہارے ساتھیوں کا مسئلہ تو انہیں بھی تلاش کر لیا جائے گا۔ میں ان کے لئے اخباروں میں اشتہارات چھپوا دوں گا۔ تم کسی قسم کی فکر مت کرو۔"

"ایک بات پوچھوں؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ برا نہ مانیں تو!"

"پوچھو' ضرور پوچھو۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے بھی مجھ سے ان دستاویزات اور مائیکرو فلمز کا مطالبہ کیا تھا۔ آپ کو ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں جانتا ہوں کہ تمہارے پیچھے کئی ملکوں کی خفیہ ایجنسیاں لگی ہوئی ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ ان دستاویزات کی حفاظت اب میں کروں گا۔ تمہارے پاس ہمت بھی ہے اور تمہارے بازوؤں میں طاقت بھی لیکن میرے وسائل تم سے کہیں زیادہ ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ مضبوط سے مضبوط انسان بھی حالات سے مات کھا جاتا ہے۔ بلاشک و شبہ تم محب وطن ہو اور اب تک ان چیزوں کی حفاظت کرتے رہے ہو مگر اس ملک پر میرا بھی تو کچھ حق ہے۔ میں تمہارا بوجھ خود اٹھانا چاہتا تھا۔ تم نے میری نیت پر شبہ کیا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی شبہ کرتا۔ مجھے امید ہے کہ اب تم میرے جواب سے مطمئن ہو گئے ہو۔"

"آپ پہلے سے تصدیق تو کر لیں کہ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز میرے پاس....."

"خرم! انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اب مزید مجھے شرمندہ مت کرو۔ مجھے انسانوں کو

پرکھنا آتا ہے۔ پھر تمہارے آنسوؤں نے خود ہی تمہاری ہر بات کی تصدیق کر دی۔ تم ایسے جری اور بہادر نوجوان کسی بہت بڑے سانحے ہی پر آنسو بہاتے ہیں۔ مردوں کے یہ آنسو بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ ان کی گواہی سے بڑھ کر اور کیا گواہی ہو سکتی ہے۔" پھر انہوں نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "اب تم آرام کرو۔ قادر بخش تمہیں' تمہارے کمرے میں پہنچا دے گا۔ مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ اب صبح ملاقات ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

میں ان کے جانے کے بعد دیر تک ان کی شخصیت کے تضاد پر غور کرتا رہا۔ کیسا عجیب شخص تھا' زیر زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ کنگ آف اوشین' اسمگلر' ذخیرہ اندوز اور ایسا محب وطن کہ عقل حیران رہ جائے۔ میں نہ جانے کتنی کتنی دیر تک یونہی بیٹھا رہتا کہ کلارا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کیا میر صاحب نے کوئی منتر پھونک دیا ہے کہ تمہیں سکتہ ہو گیا ہے۔"

"اوں.....!" میں نے چونک کر کہا' پھر قادر بخش سے بولا۔ "مجھے ذرا میرا کمرہ دکھا دو۔"

ہم قادر بخش کی رہنمائی میں سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو کلارا منہ بنا کر بولی۔ "تم لوگ اردو میں نہ جانے کیا بات چیت کرتے رہتے ہو' کبھی روتے ہو' کبھی ہنستے ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"اس کا ایک ہی حل ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم بھی اردو سیکھ لو۔ آخر ایک نہ ایک دن تو تمہیں اردو سیکھنا ہی پڑے گی۔"

"اردو تو خیر سیکھ لوں گی مگر جب تک مجھے اردو نہ آئے' تم انگلش میں گفتگو نہیں کر سکتے!" وہ جھلا کر بولی۔

"کر سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ہر آدمی کو انگلش بھی تو نہیں آتی۔ یا پھر یہ کیا جائے کہ پہلے اس آدمی کو انگلش سکھائی جائے جس سے تمہارے سامنے گفتگو کرنا ہو۔"

کلارا نے جھنجلا کر ہاتھ گھمایا۔ میں پھرتی سے بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ دھم سے قادر بخش کی پشت پر پڑا۔ وہ گھبرا کر پلٹا تو کلارا شرمندہ سی ہو گئی۔ میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ صورت حال سمجھ میں آئی تو قادر بخش کو بھی ہنسی آ گئی۔ ہم دونوں کے قہقہوں سے کلارا منہ جھینپ گئی۔

قادر بخش نے مجھے ایک آراستہ بیڈ روم میں پہنچا دیا' پھر مجھ سے بولا۔ "میم صاحب سے بولا واجہ کو وہ بھی اپنے لئے کوئی کمرہ پسند کر لے۔"

میں نے کلارا کو سنانے کی خاطر انگریزی میں کہا۔ "میڈم کو ساتھ لے جا کر بیڈ روم دکھا دو۔ انہیں جو کمرہ بھی پسند آئے' وہ انہیں دے دینا۔ مجھے تو یہ کمرہ پسند آگیا ہے۔"

"اے' کیا مطلب ہے تمہارا؟" کلارا نے آنکھیں نکالیں میں اس اجنبی ماحول میں اکیلی نہیں سوؤں گی' سمجھے۔"

"تو پھر قادر بخش کو اپنے ساتھ....."

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی کلارا نے جھپٹ کر تکیہ اٹھایا اور پوری قوت سے میرے منہ پر کھینچ مارا۔ یہ اور بات ہے کہ زد میں اس دفعہ بھی قادر بخش ہی آیا۔ میں نے ہنستے ہوئے قادر بخش سے کہا کہ تم جاؤ۔ خواہ مخواہ اس پاگل لڑکی کے ہاتھوں میں خرچ ہو جاؤ گے۔ یہ یہیں رہے گی۔ مجھے ضرورت پڑی تو کوئی اور کمرہ دیکھ لوں گا۔"

صبح ناشتے پر میر صاحب نے مجھے کئی اہم خبریں سنائیں۔ پہلی تو یہ کہ ابھی تھوڑی دیر میں شہلا یہاں آنے والی ہے۔ دوسری اہم خبر یہ تھی کہ بڑو کی حالت اب بہت بہتر تھی اور ڈاکٹر نے اس شرط پر اسے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی کہ کوئی نرس ہمہ وقت گھر پر بھی اس کی دیکھ بھال کرے۔ ایک بری خبر یہ تھی کہ میرے فرار کے بعد پولیس نے رضا کو ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لیا تھا مگر میر صاحب نے تسلی دی تھی کہ آج کل ہی میں اس کی ضمانت ہو جائے گی۔ اب رضوانہ اور تہمینہ کا مسئلہ باقی تھا۔ مجھے امید تھی کہ جلدی ان کا بھی سراغ مل جائے گا۔ اس دن میں واقعی بہت خوش تھا۔ بس ایک خلش تھی کہ نہ جانے وہ دستاویزات اور مائیکرو فلم کن لوگوں کے قبضے میں ہیں۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ کہیں ان چیزوں کا سودا نہ ہو گیا ہو۔ اگر سودا ہو گیا تھا تو انہیں دوبارہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

دوپہر تک شہلا اور بڑو دونوں وہاں پہنچ گئے۔ وہ بنگلہ کلفٹن میں نہیں بلکہ نارتھ ناظم آباد میں تھا اور قادر بخش نے جان بوجھ کر مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ اسی دن یہ انکشاف بھی ہوا کہ قادر بخش اور اس کے ساتھی نے میر صاحب کے کہنے پر ہی کلارا کی مدد کی تھی۔ میر صاحب مجھے پولیس کی تحویل سے نکالنا چاہتے تھے۔ اگر کلارا ان لوگوں سے رابطہ قائم نہ کرتی تو پھر وہ کوئی اور راستہ اختیار کرتے۔

شہلا دیر تک میرے گلے لگی روتی رہی۔ اسے اکبر صاحب اور ان کی بیگم کی موت کا بہت صدمہ تھا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! آخر خوشیاں ہمیں راس کیوں نہیں آتیں؟ ہماری خوشیوں کو کس کی نظر لگ جاتی ہے؟ برسوں بعد آپ ملے تھے تو میں سمجھی تھی کہ اب میں ہر پل' ہر لمحہ سکھ سے رہوں گی مگر....."

"ہاں گڑیا! میری آواز بھرا گئی۔ میں ہوں ہی ایسا تیرہ بخت کہ تیری خوشیوں کو بھی کھا گیا۔ تیری خوشیوں کو میری نظر لگی ہے گڑیا! میرا گلا رندھ گیا۔

"ایسا مت کہیں بھیا!" شہلا سسک اٹھی۔ اب آپ ہی کے سہارے تو میں زندہ ہوں۔

"شہلا! جیسے اندھیرا ہمیشہ نہیں رہتا' اسی طرح غم کی سیاہ رات بھی بالآخر ختم ہو جاتی

ہے۔ تو نے تو زندگی بہت عیش سے، بہت آرام سے گزاری ہے بیٹا! میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مجھے دیکھ، میں لمحہ لمحہ مرا ہوں اور لمحہ لمحہ جیا ہوں۔ میں نے اب تک کی زندگی کا تمام سفر کانٹوں پر طے کیا ہے، میں انگاروں پر چلا ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ دکھوں کے یہ بادل ایک نہ ایک دن چھٹ جائیں گے۔ تو کیوں غم کرتی ہے گڑیا، تیرے سر پر تو میں موجود ہوں۔ میری محرومی کا احساس کر کہ میرے سر پر تو سائبان بھی نہیں ہے۔" شدت جذبات سے میری آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

"غلط کہتے ہو تم! اچانک میر غلام حسین کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ نہ جانے کب کمرے میں آ گئے تھے۔ "تمہارے سر پر سائباں بھی ہے اور پیروں تلے زمین بھی، کیا تم نے اب تک مجھے اپنا نہیں سمجھا خرم! ان کے لہجے میں دکھ تھا۔

"آپ نے تو مجھے بہت سہارا دیا ہے۔ میں آپ کا احسان مند ہوں کہ....."

"او شٹ اپ! انہوں نے پیار بھرے انداز میں جھڑک دیا۔ آئندہ میرے سامنے احسان مند، شکرگزار، قسم کے الفاظ مت بولنا۔ "پھر وہ موضوع بدلنے کو بولے۔ "جاؤ تمہارا دوست تمہیں بلا رہا ہے۔ دو گھڑی اس کے پاس بھی بیٹھو۔ ان کا اشارہ برڈ کی طرف تھا۔

"میں اب تک اس کے پاس تو بیٹھا تھا۔" یہ کہہ کر میں برڈ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

برڈ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ زخموں نے گویا اس کے جسم سے ساری توانائی نچوڑ لی تھی مگر مجھے امید تھی کہ ایک مہینے کے اندر اندر وہ دوبارہ پہلے والا تندرست و توانا برڈ نظر آئے گا۔ اسپتال کے گھٹے گھٹے ماحول اور گھر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ برڈ نے غور سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ "کیا بات ہے خرم! تم کچھ پریشان ہو؟"

"یار، میں رضا کی وجہ سے پریشان ہوں۔" میں نے بات بنائی۔ "وہ بیچارہ میری وجہ سے زیر عتاب آ گیا ہے۔"

"میر صاحب بتا رہے تھے کہ کل تک اس کی ضمانت ہو جائے گی، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"یار، ایک پریشانی ہو تو بتاؤں۔ تہمینہ اور رضوانہ کی بھی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گی۔

"تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ تہمینہ ساوک کی تربیت یافتہ ایجنٹ ہے۔ وہ اس قسم کے معاملات سے نمٹنا خوب جانتی ہے اور رضوانہ بھی کوئی گھریلو لڑکی نہیں تھی، مگر نہ جانے کیوں اس کے بغیر میں خود کو ادھورا سمجھتا تھا۔ اگر برڈ صحت مند ہوتا تو ہم اب تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہتے۔

برڈ کی دیکھ بھال کے لئے میر صاحب نے ایک طرحدار قسم کی اینگلو پاکستانی نرس کا

بندوبست کر دیا تھا۔ وہ نرس سے زیادہ کسی کاسمیٹکس کی ماڈل لگتی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ہمہ وقت مسکراہٹ رقص کرتی رہتی تھی مگر برڈ کو ان حالات میں اس نرس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

شام کو میر صاحب آئے تو وہ بہت فکر مند تھے۔ وہ واکنگ چیئر پر بیٹھے خیالوں میں گم تھے۔ جب وہ دیر تک خاموش رہے تو میں نے ہی خاموشی کو توڑا۔ "آپ بہت فکر مند ہیں' خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے خرم بیٹا! انہوں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز یہاں سے باہر نکل چکی ہیں۔"

"باہر نکل چکی ہیں!"

میں مضطرب ہو کے کھڑا ہو گیا۔ "کہاں نکل چکی ہیں؟"

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز یہاں سے ہانگ کانگ لے جائی گئی ہیں اور پریشانی کی بات یہ ہے کہ اسی مہینے میں ان کا سودا بھی ہو جائے گا۔ دیر صرف اس لئے ہو رہی ہے کہ لے جانے والا مختلف ممالک سے ان کی سودے بازی کر رہا ہے۔ جو ملک سب سے زیادہ بولی لگائے گا' وہ دستاویزات اس کے حوالے کر دی جائیں گی۔"

"اسے روکیں میر صاحب..... اسے روکیں..... ورنہ......" میں نے بے بسی سے کہا۔

"میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی ساری دولت دے کر بھی وہ چیزیں حاصل کر لیتا مگر خریدار کوئی فرد نہیں' حکومتیں ہیں اور حکومتوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ مجھے خطرہ یہ ہے کہ اسرائیل اس سلسلے میں سب سے زیادہ بولی لگائے گا کیوں کہ سب سے زیادہ اسی کا مفاد وابستہ ہے۔ دوسرے نمبر پر انڈیا ہے۔ وہ بھی بڑھ چڑھ کر بولی لگائے گا۔ امریکہ درپردہ اسرائیل کی مدد کرے گا اور سوویت یونین انڈیا کی۔"

"بولی کوئی بھی لگائے مگر نقصان ہمیں ہو گا۔" میں نے بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور یہ نقصان ایسا ناقابل تلافی ہو گا کہ پھر برسوں تک ہم سنبھل نہ سکیں گے۔ کیا حکومت پاکستان کو اس کا اندازہ نہیں ہے؟" میں نے میر صاحب سے یوں پوچھا جیسے وہ حکومت پاکستان کے کوئی ذمے دار اہل کار ہوں۔

"حکومت کو بھی یقیناً اندازہ ہو گا اور وہ اپنے طور پر کوششیں بھی کر رہی ہو گی۔"

"میر صاحب! میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں ہانگ کانگ جاؤں گا۔"

"تم؟" میر صاحب نے' حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تم بھلا کیا کر سکو گے؟"

یوں ان دستاویزات کی بولی تو نہیں لگا سکتا مگر انہیں دشمنوں سے چھیننے کی کوشش تو کر سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"حقیقت پسندی سے کام لو خرم!" میر صاحب نے کہا۔ "وہاں کئی ملکوں کے خوف ناک

سیکرٹ ایجنٹ ہوں گے۔ ان کے درمیان سے وہ دستاویزات لانا ایسا ہی ہے جیسے کسی شیر کی کھچار سے اس کا نوزائیدہ بچہ اٹھانا۔"

"میں ان سب کی موجودگی میں ایسا نہیں کروں گا۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ "بولی بالاخر کسی کے حق میں تو چھوٹے گی' ظاہر ہے پھر میرے مقابلے پر وہ تنہا شخص ہو گا۔ اس سے نمٹنا زیادہ آسان ہو گا۔"

میر صاحب میری بات سن کر یوں مسکرائے جیسے کسی بچے نے انتہائی احمقانہ بات کر دی ہو۔ پھر وہ طویل سانس لے کر بولے۔ "یہ کسی پراپرٹی کی سودے بازی نہیں ہے خرم جو یوں آسانی سے وہ کاغذات چھین لو گے۔ نہ سودے بازی کرنے والا ان کاغذات کو اپنی جیب میں رکھ کر گھومے گا' پھر یہ کہ تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ تنہا ہی ہو گا۔ فرض کرو اگر سودا اسرائیل کے حق میں طے ہوتا ہے تو کیا صرف ایک ہی شخص ان کاغذات اور مائیکرو فلمز کی وصولی کا ذمے دار ہو گا' نہیں بلکہ اس کے پیچھے پوری موساد ہو گی۔ تم نے تو صرف موساد کا نام ہی سنا ہے' میں اس کی سفاکیوں کے متعلق بہت زیادہ جانتا ہوں۔ اس کے سیکرٹ ایجنٹ دنیا کے سفاک ترین اور چالاک ترین ایجنٹ ہیں۔ وہ جدید ہتھیاروں اور سائنسی آلات سے لیس ہیں اور....."

"میر صاحب پلیز! میں نے انہیں ٹوک دیا۔ "اگر اسرائیل کے ایجنٹ سفاک ہیں "را" کے مکار ہیں اور سی آئی اے کے چاق و چوبند ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تماشا دیکھتے رہیں' محض یہ سوچ کر کہ وہ بہت ظالم ہیں۔ اگر ان کا مقابلہ کیا جائے گا تو بھی وہ ظلم کریں گے اور مقابلہ نہیں کیا جائے گا تو بھی وہ مکاری سے باز نہیں آئیں گے۔ تنہا ہی دونوں صورتوں میں مقدر ہے تو پھر مقابلہ کر کے کیوں نہ مرا جائے۔"

میر صاحب خوش دلی سے مسکرائے۔ "میں تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتا تھا۔ میں صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ تم خطرناک حالات دیکھ کر مصلحت کا شکار تو نہیں ہو جاؤ گے۔ ہانگ کانگ جانے کی تیاری کرو۔ میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا اور بولے تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ تم ایک مفرور ملزم ہو' تمہارا ملک سے باہر نکلنا ایک مسئلہ ہے مگر تم شاید یہ بھول گئے کہ اپنے ملک کی حد تک میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اور اپنا ہی ملک کیا دنیا کے بیشتر ممالک میں میرے آدمی موجود ہیں۔ تمہیں پاسپورٹ اور ڈالرز کل ہی مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ میں ہانگ کانگ کے کچھ ایسے لوگوں کے بھی ایڈریس تمہیں دے دوں گا جو مشکل وقت میں ہر طرح سے تمہاری مدد کریں گے۔ وہاں نہ تمہیں کوئی مالی مسئلہ ہو گا' نہ افرادی قوت کی کمی ہو گی۔ میں یہاں سے بھی اپنے بہترین آدمی تمہارے ساتھ بھیجوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ شیرا اور جانو ضائع ہو گئے ورنہ ان میں سے ایک آدمی پندرہ پر بھاری تھا۔"

"آپ صرف مجھے ہانگ کانگ کے ایڈریس دے دیجئے گا۔ میں ضرورت محسوس کروں گا تو ان پتوں پر رابطہ کر لوں گا۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ میں پسند نہیں کرتا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" میر صاحب نے شانے اچکا کر کہا' پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "ہانگ کانگ میں تمہیں ہر قسم کا اسلحہ مل جائے گا۔ جرمن لیوگر اور اسرائیل کی بنی ہوئی رائفل اوزی خاصے تباہ کن ہتھیار ہیں۔ ان ہتھیاروں کے علاوہ تمہیں وہاں بہت کچھ ملے گا بلکہ ممکن ہوا تو میں بھی تمہارے ساتھ ہانگ کانگ چلوں گا۔"

"آپ کہاں زحمت کریں گے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں وہاں کی زیر زمین دنیا کے ایک ایک چپے سے واقف ہوں۔ ممکن ہے انہیں میں سے کوئی فرد ہمارے کام کا نکل آئے۔"

ان کی بات ایک طرح سے معقول تھی۔ ان کی ساری زندگی اسی قسم کے دھندوں میں گزری تھی۔ وہ وہاں رہ کر زیادہ بہتر طریقے سے میری مدد کر سکتے تھے۔ میں نے یہی سوچ کر انہیں ساتھ لے جانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

"ہاں" میر صاحب چونک کر بولے۔ "تمہاری ساتھی لڑکی تہمینہ کا سراغ مل گیا ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ اسے کچھ لوگوں نے شہلا کے دھوکے میں اغواء کیا تھا۔ اب انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ وہ شہلا نہیں ہے مگر اس کے باوجود وہ اس کے ذریعے تم سے سودے بازی کرنا چاہتے ہیں۔ ان بے وقوفوں کو یہ بھی علم نہیں ہے کہ دوسری پارٹی وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمیں لے کر یہاں سے رفوچکر ہو چکی ہے۔"

"پھر تہمینہ....."

"وہ آج رات کسی وقت یہاں پہنچ جائے گی۔ میں نے اپنے ایک آدمی مراد کو تہمینہ کی بازیابی کا فرض سونپا ہے۔ وہ آج رات کسی وقت وہاں چھاپا مارے گا اور تہمینہ کو نکال لائے گا۔"

میں میر صاحب کے کمرے سے نکلا تو مسلسل اسی مسئلے پر غور کر رہا تھا کہ ہانگ کانگ میں کیا حکمت عملی اختیار کروں گا' کوریڈور میں برڈ نرس کے سہارے چہل قدمی کر رہا تھا اس کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔ اسے چلتا پھرتا دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے ازراہ مذاق برڈ سے کہا۔ "یار' اب تم بالکل ہٹے کٹے ہو' تمہیں اس نرم و نازک خاتون کا سہارا لیتے شرم نہیں آتی۔"

"تم کیوں جلتے ہو؟" برڈ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "مجھے موقع ملا ہے تو دو گھڑی ان زلفوں کے سائے میں آرام کرنے دو۔"

اس کے جواب پر نرس جھینپ کر رہ گئی اور خفت مٹانے کو بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ آپ جان بوجھ کر بیمار بنے ہوئے ہیں۔"

"بالکل!" برڈ ڈھٹائی سے بولا۔ "جب تک تم یہاں ہو میں ٹھیک ہونے سے رہا۔"

"اچھا مذاق چھوڑو۔" میں نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کام کی بات سنو' میں کل ہانگ کانگ جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟" برڈ چلتے چلتے رک گیا۔

"یار' لمبی بات ہے تفصیل سے بتاؤں گا۔" میں نے غیر محسوس طریقے سے نرس کی طرف اشارہ کیا گویا اس کی موجودگی میں بتانا نہیں چاہ رہا۔

برڈ بے چین ہو گیا۔ "یار' اشارہ تو دو' آخر ایسا کون سا کام آ پڑا؟"

"کام تو وہی پرانا ہے۔ جس سامان کی اب تک ہم نے حفاظت کی تھی' وہ ہمارے ہاتھ سے نکل کر ہانگ کانگ پہنچ گیا ہے۔"

"تم..... تم اکیلے جا رہے ہو ہانگ کانگ؟" برڈ نے پوچھا۔

"نہیں یار' اور لوگ بھی ہیں' پھر ہانگ کانگ میں بھی میر صاحب کے بہت سے دوست ہیں۔ میں اکیلا کب ہوں۔"

"میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔" برڈ نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"ان نازک سہاروں کے بل بوتے پر۔" اسے چڑایا۔ "پہلے ذرا دم پکڑو' پھر جانے کی بات کرنا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو مجھے۔" برڈ کو سچ مچ غصہ آ گیا۔ "یہ تو میں جان بوجھ کر ذرا دل جلا رہا تھا۔" اس نے اچانک نرس کو دھکیل دیا۔ "دیکھو میں چل سکتا ہوں' بغیر کسی سہارے کے کہو تو تمہیں بھی اٹھا لوں کندھے پر!" وہ جوش میں کافی دور تک بغیر کسی سہارے کے چلا گیا۔ تھوڑی بہت کمزوری ضرور ہے جو ہانگ کانگ کے خوبصورت ماحول میں جاتی رہے گی۔ یوں بھی یہ تھوبڑا دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔" اس نے نرس کی طرف اشارہ کیا۔

نرس کا پارہ بھی ایک دم چڑھ گیا۔ "آپ لوگ اگر مجھے معاوضہ دیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یوں میری توہین کریں گے' مجھے دھکے دیں گے۔ اگر میری ضرورت نہیں ہے تو میرا حساب کر دیں میں ابھی اور اسی وقت جانا چاہتی ہوں۔ میں آپ کی گھریلو ملازمہ نہیں ہوں' سمجھے آپ!"

"سوری سسٹر!" میں نے جلدی سے کہا۔ "برڈ کافی عرصے سے بیمار ہے۔ بیڈ ریسٹ کرتے کرتے اکتا گیا ہے۔ آپ تو نرس ہیں مریضوں کی نفسیات سمجھتی ہیں۔ آدمی عرصے تک بیڈ پر پڑا رہے تو یوں بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے' پلیز اس کی طرف سے میں معافی چاہتا ہوں۔" میں نے خوشامد کی۔

"میں مریضوں کی نفسیات سمجھتی ہوں اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ اب انہیں میری ضرورت نہیں ہے۔ چڑچڑا مریض صرف نرس ہی سے الٹی سیدھی بات نہیں کرتا ہے بلکہ ہر شخص کو جلی کٹی سناتا ہے میں نے نہیں دیکھا کہ کبھی انہوں نے آپ کے ساتھ بھی جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا ہو۔ یہ کیسا چڑچڑا پن ہے۔ پلیز میرا حساب کر دیں اور مجھے جانے دیں۔ دیکھئے آپ کے دوست بغیر کسی سہارے کے کھڑے ہیں۔"

"ٹھیک ہے آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں آپ کو روکوں گا نہیں۔ ضرورت پڑی تو کسی اور نرس کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں ابھی آپ کا حساب کتاب کیۓ دیتا ہوں۔" مجھے بھی غصہ آ گیا۔

پھر میں نے اسی وقت اس نرس کو چلتا کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ برڈ اپنے کمرے میں ہلکی پھلکی ایکسر سائز میں مصروف ہے۔

"سنو برڈ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس وقت تو تم اگر باب بیک لینڈ کو بھی چیلنج کر دو، تب بھی میں تمہیں لے کر نہیں جاؤں گا۔"

"میں تمہارے ساتھ کسی ریسلنگ کے رنگ میں اترنے نہیں جا رہا ہوں کہ ورلڈ چیمپئن باب بیک لینڈ کو چیلنج کروں گا۔" برڈ نے جواب دیا۔

"کچھ بھی ہو، تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ تم میرے ساتھ ہانگ کانگ جا سکو۔ میں وہاں دشمنوں سے لڑنے کی بجائے تمہیں کہاں سنبھالتا پھروں گا؟"

"دیکھو خرم!" برڈ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "میں ہر قیمت پر تمہارے ساتھ جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں جو فیصلہ ایک بار کر لوں، اسے پھر بدلتا نہیں ہوں۔ ہانگ کانگ میں میرے کچھ دوست ہیں۔ وہ بھی ہمارے بہت کام آئیں گے۔"

"میں اس سلسلے میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔" میں نے اسے ٹالنا چاہا۔ "اگر میر صاحب راضی ہو گئے تو میں تمہیں ضرور اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

○

میرا پاسپورٹ بننے میں ایک کی بجائے تین دن لگ گئے۔ اسی دوران میں برڈ حیرت انگیز طور پر سنبھل گیا۔ اگر اسے کوئی تکلیف تھی بھی تو وہ ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح میر صاحب کو بھی راضی کر لیا کہ وہ میرے ساتھ ہانگ کانگ جائے گا۔

جس رات ہماری روانگی تھی، اسی رات مراد نے تہمینہ کی بازیابی کے لئے چھاپہ مارا اور تہمینہ کو وہاں سے نکال لایا۔ اسے دیر اس لئے ہوئی تھی کہ ان لوگوں نے تہمینہ کو دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا۔ تہمینہ کی حالت بہت خراب تھی، جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا اور وہ چہرے سے برسوں کی مریضہ لگ رہی تھی۔ اس کی ذہنی حالت بھی نارمل نہیں تھی۔ وہ کبھی ہنسنے

لگتی تھی اور کبھی رونے لگتی تھی۔ یہ مشکل تمام میں نے اسے یقین دلایا کہ اب وہ دشمنور
کی قید میں نہیں ہے بلکہ اپنوں کے درمیان ہے۔

جب اس کی ذہنی حالت نارمل ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "تہمینہ، تم سے وہ لوگ
کیا چاہتے تھے اور تمہیں اغواء کس طرح کیا تھا؟"

اس نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "وہ شاید پانچ آدمی تھے۔ ان میں سے
دو نے مجھے قابو کیا، بقیہ تین برڈ پر پل پڑے۔ انہوں نے برڈ کو مار دیا۔"

"برڈ زندہ ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ابھی تم نے اسے دیکھا نہیں یہاں!"

"پھر وہ لوگ مجھے ایک غیر آباد، کھنڈر میں لے گئے۔ وہ مجھے شہلا سمجھ رہے تھے۔ میں
نے سوچا، جب یہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں تو پھر رہیں۔ پھر وہاں نہ جانے کہاں سے رضوانہ
آگئی۔

میں چونک اٹھا "رضوانہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟"

"شاید وہ اغواء کرنے والوں کا پیچھا کرتی ہوئیں وہاں پہنچی تھی۔ انہوں نے ہوش کی
بجائے جوش سے کام لیا اور بجائے اس کے کہ تم لوگوں کو اطلاع دیتیں، اس نے خود ہی مجھے
رہا کرانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں رضوانہ کو ان لوگوں نے گولی مار دی۔" تہمینہ بلک
بلک کر رونے لگی۔

"ان لوگوں نے رضوانہ کو مار دیا!" میں چیخ اٹھا۔

"رضوانہ نے میری آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔" تہمینہ نے
سسکتے ہوئے کہا۔ یہ کہہ کر تہمینہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

میں نے سہارا دے کر اسے پانی پلایا اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ٹرانکولائزر دے کر
سلا دیا۔

ہم سب اس کی داستان سننے میں اتنے محو تھے کہ ہمیں رضا کی آمد کا احساس ہی نہ
ہوا۔ اس نے بھی رضوانہ کی موت کا واقعہ تفصیل سے سن لیا تھا۔ مجھے اس کی موجودگی
احساس ہوا تو اس وقت ہوا جب وہ بلک بلک کر رو دیا۔

میں نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ اس کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔

جب اسے معلوم ہوا کہ میں اور برڈ ہانگ کانگ جا رہے ہیں تو وہ بھی جانے کو مچل گیا
میں نے اسے سمجھایا کہ تمہارا یہاں رہنا بہت ضروری ہے بلکہ تم یہاں کی بجائے ڈیفنس
والے بنگلے میں رہو تو زیادہ بہتر ہے۔ وہاں کروڑوں بلکہ اربوں روپے کا خزانہ دفن ہے، اس
اس کی بھی تو دیکھ بھال کرنا ہے۔ ہم جلدی لوٹ آئیں گے۔ پھر یہاں تہمینہ بھی ہے، اسے
بھی تمہاری ضرورت ہے۔ شہلا کو بھی سہارے کی ضرورت ہے۔ تم یہاں رہ کر بھی ہماری
مدد ہی کرو گے۔"

ہانگ کانگ روانگی سے پہلے میر صاحب نے ایک مرتبہ پھر تفصیل سے وہاں کے متعلق بتایا' دو تین ایسے پتے بھی دیئے جو کسی ناگہانی آفت میں میرے کام آ سکتے تھے مگر سب سے بڑی ناگہانی آفت تو وہ کلارا تھی جسے میں کراچی ہی میں چھوڑنا چاہ رہا تھا۔ وہ کسی طور کراچی میں رکنے پر آمادہ نہیں تھی' پھر برڈ تھا۔ وہ بھی ابھی پوری طرح صحت مند نہیں تھا مگر میرے ساتھ جانے پر بہ ضد تھا۔

میر صاحب مجھے جتنی دیر ہانگ کانگ کی تفصیلات سے آگاہ کرتے رہے' کلارا بے چینی سے سنتی رہی۔ شاید اس سے خاموشی ضبط نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ میں سب سمجھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اس کی بے چینی اور اضطراب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب تو سب کچھ تفصیل سے سمجھ گئے ہو گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟" میر صاحب نے اپنی بات ختم کر کے کہا۔

"ابھی انہوں نے تمہیں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہاں ایک پین لے کر جاؤ یا دو' بلاٹنگ پیپر پر پوائنٹس نوٹ کرو یا کلپ بورڈ پر' اسکیل لے جاؤ یا اس کے بغیر ہی کام چل جائے گا' پرچہ حل کرنے سے پہلے اسے دو تین بار غور سے پڑھو یا ملتے ہی پیپر حل کرنا شروع کر دو۔" کلارا نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

اس کے اس انداز پر نہ صرف برڈ بلکہ میر صاحب بھی ہنسنے لگے۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔ "کلارا! تم سمجھتی ہو کہ مجھے انگلش نہیں آتی ہے۔ مائی ڈیئر' میری عمر کا بیشتر حصہ یورپ میں گزرا ہے۔"

"انکل' میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ اتنا اگر آپ کسی طوطے کو بھی رٹاتے تو وہ بھی رٹ لیتا۔"

"تمہیں اندازہ نہیں ہے کلارا' وہاں کیسے کیسے سفاک لوگ جمع ہوں گے۔ اسی لئے میں خرم کو بار بار ان خطرات سے آگاہ کر رہا ہوں۔" اسی وقت ان کا فون آ گیا اور وہ کمرے سے اٹھ کر چلے گئے۔

"آخر وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے خرم؟" کلارا نے منہ بنا کر کہا۔ "کیا ان دستاویزات اور مائیکرو فلمز کو تم بیچنا چاہتے ہو؟ کتنے پیسے ملیں گے تمہیں!..... بتاؤ تمہیں کتنی رقم کی ضرورت ہے؟ میرا باپ ارب پتی ہے۔ میں.....

"کلارا!" میں اتنی زور سے چیخا کہ وہ سہم کر کھڑی ہو گئی۔ "آئندہ ایسی گھٹیا بات نہ کرنا۔ تمہیں تو شاید اندازہ بھی نہ ہو کہ میرے پاس کتنی دولت ہے۔ اگر بات دولت ہی کی ہوتی تو اب تک میں ان چیزوں کے دام کھرے کر لیتا مگر کبھی کسی بیٹے کو ماں کا سودا کرتے دیکھا ہے' اس کی چادر نیلام کرتے دیکھا ہے؟ شاید تم نے دیکھا ہو گا کیوں کہ تم جس مادر پدر

معاشرے کی پیداوار ہو وہاں رشتوں کے تقدس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہاں ماں اور بیٹی کی بھی رقابت چلتی ہے' آپ سمیں اور باپ بیٹے بھی ایک ہی لڑکی کے لئے ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں مگر یہ پاکستان ہے۔ ہم لوگ بہت غریب ہیں' بہت خود غرض اور کمینے ہیں' بہت بددیانت ہیں' جھوٹے ہیں' ہم میں ہر عیب ہے مگراس کے باوجود چند رشتے ایسے ہیں جن کے لئے ہم جان لے بھی سکتے ہیں اور دے بھی سکتے ہیں۔"

میں جوش میں نہ جانے کب تک بولتا رہتا کہ کلارا کی سسکیوں نے مجھے چونکا دیا۔ وہ پہلے تو سسک سسک کر روئی' پھریوں بلک کر روئی کہ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ روتے روتے اس نے اچانک سر اٹھایا پھر جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور جھنجوڑ کر بولی۔ "خرم! تم اب تک مجھے نہیں سمجھ پائے' اب تک تم مجھے اسی معاشرے کی ایک بے راہ لڑکی سمجھتے ہو۔ جس نے تمہاری خاطر اپنا وطن چھوڑا' اربوں کی جائیداد کی پروا نہیں کی۔ حتیٰ کہ نشہ بھی چھوڑ دیا۔ تمہاری خاطر خرم' صرف تمہاری خاطر! اور تم..... تم..... مجھے طعنہ دے رہے ہو کہ..... کہ....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر میرا گریبان تار تار کر ڈالا۔ اب اگر تم نے ایسی کوئی بات کی خرم تو میں خود بھی مر جاؤں گی اور تمہیں بھی مار دوں گی سمجھے!" اس کے لہجے میں وحشت تھی۔

"سوری کلارا!" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "مگر تمہیں بھی میری ایک بات ماننا ہو گی۔" میں نے اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھ کے اسے صوفے پر بٹھا دیا اور کہا۔ "بولو' مانو گی میری بات؟"

"اب تک تمہاری باتیں ہی تو مانتی آ رہی ہوں۔" کلارا اب خاصی نارمل ہو چکی تھی۔

"پھر وعدہ کرو کہ میرے ساتھ ہانگ کانگ جانے کی ضد نہیں کرو گی!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا' پھر ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ "چلو' میں نہیں جاؤں گی مگر میری بھی ایک شرط ہے' تم روزانہ مجھے فون کرو گے۔"

"وعدہ تو یوں نہیں کر سکتا کہ ابھی مجھے خود بھی وہاں کے حالات کا علم نہیں ہے۔ البتہ یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ جب بھی موقع ملا' تمہیں ضرور فون کروں گا' ایگریڈ؟"

"اوکے!" اس نے ہنس کر کہا۔

پھر میں برڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ "جی' آپ فرمائیں' آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" میں نے لہجے کو جان بوجھ کر شوخ بنا لیا تھا۔

"مجھے جو کچھ فرمانا تھا' فرما چکا ہوں۔" برڈ نے منہ بنا کر کہا۔

"گویا' مجھے آپ کا مردہ بھی ڈھونڈنا پڑے گا۔" میں ہنس کر بولا۔ "ان حالات میں' میں آپ کی حفاظت کروں گا یا اپنی؟"

"آپ فکرمند نہ ہوں۔" برڈ سنجیدہ ہو گیا۔ "برڈ آج تک کسی پر بوجھ نہیں بنا۔ میں اگر واقعی مردے میں تبدیل ہو جاؤں تو تم بے شک میری لاش وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ جانا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "یار' میں تو مذاق کر رہا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری موت کی صورت میں تمہیں وہیں کہیں چھوڑ دوں گا' نہیں میرے دوست۔ مجھے یقین ہے کہ میں اگر مر گیا تو تم بھی ایسا نہ کر سکو گے۔ مذاق کی باتوں کو اتنا سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں ہے؟"

"سنجیدہ تو تم لے رہے ہو۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ میں کسی بھی طرح تمہارے اوپر بوجھ نہیں بنوں گا' نہ میری وجہ سے تمہیں رکاوٹ محسوس ہو گی۔ پھر تم مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ کیوں نہیں ہو؟"

"اچھا یار چلو' میں صرف اس لئے کہہ رہا تھا کہ ابھی تمہاری کمزوری باقی ہے' نہیں مانتے تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور جہاں تک بوجھ کا تعلق ہے تو میں بھلا اس قابل کہاں ہوں؟ تم تو عادی ہو اس نرم و نازک نرس کے سہارے کے۔ میرے وجود میں وہ مہک اور جسم میں وہ گداز کہاں ہے؟"

"او بھائی گداز!" میر صاحب نے میری بات کاٹ دی۔ وہ نہ جانے کب کمرے میں آ گئے تھے۔ "بس اب تم روانگی کی تیاری کرو۔"

"میں تو تیار ہوں مگر اب یہ برڈ بھی میرے ساتھ جا رہا ہے' اس کے ویزے میں کم از کم ایک دن تو لگے گا ہی۔"

میری بات سن کر برڈ مسکرایا۔ "برڈ کوئی کام کچا نہیں کرتا۔ میں نے کئی دن پہلے اپنے پاسپورٹ پر ہانگ کانگ کا ویزہ لگوا لیا تھا۔ فارن ایکسچینج کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔ میرا تو سوٹ کیس بھی تیار ہے۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"تمہیں یقین تھا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ ضرور لے جاؤں گا؟"

"مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ تم میری بات نہیں ٹالو گے۔ اگر تم انکار کر بھی دیتے تو میں اپنے طور پہ چلا جاتا۔"

"بہرحال' تمہاری سب تیاری مکمل ہے تو پھر چلو۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں رضا بہت حسرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "خرم صاحب' میں....."

"نہیں رضا!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تمہارا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔ یہاں شہلا ہے' تہمینہ ہے اور سب سے اہم وہ....."

"یہ خود بھی اتنا ناسمجھ نہیں ہے خرم!" برڈ نے اس ڈر سے مجھے جملہ پورا نہ کرنے دیا کہ کہیں میں خزانے کا تذکرہ نہ کر بیٹھوں۔

میں واقعی خزانے کا تذکرہ کرنے والا تھا جسے ان لوگوں نے ڈیفنس والے بنگلے میں کہیں چھپایا تھا۔

روانگی سے پہلے میں شہلا سے ملا تو مجھ سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں اس مہم سے زندہ لوٹ بھی سکوں گا یا نہیں مگر میں نے شہلا کو اس مہم کی ہولناکی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ بس میں نے اس کے سرپہ ہاتھ پھیرا اور جلدی سے واپس مڑ گیا مبادا وہ میری آنکھوں میں چھلک آنے والے آنسو نہ دیکھ لے۔ وہ تو میرے ساتھ ایئرپورٹ بھی جانا چاہ رہی تھی مگر میر صاحب نے سختی سے منع کر دیا کہ خرم کے ساتھ ایئرپورٹ کوئی نہیں جائے گا۔ میر صاحب نے محض چند گھنٹوں میں میرا جو پاسپورٹ بنوایا تھا اس میں میرا نام شہباز خان تھا اور انہوں نے برڈ کو ہدایت کی تھی کہ اب وہ مجھے اسی نئے نام سے مخاطب کرے۔

○

ہم لوگ بہ خیر و عافیت ہانگ کانگ پہنچ گئے۔ برڈ کی چستی و توانائی حیرت انگیز طور پر بہت تیزی سے لوٹ رہی تھی۔ اب یا تو یہ بدلی ہوئی آب و ہوا اور ماحول کا اثر تھا یا پھر عرصے سے بستر پر پڑے پڑے اس کے جسم کے عضلات ناکارہ ہو گئے تھے۔ اسے صحت مند دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ میر صاحب نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ ہانگ کانگ پہنچ کر وہاں کے اومنی ہوٹل میں قیام کرنا۔ اس کا مالک بھی میر صاحب کا دوست تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیور کو اومنی ہوٹل چلنے کی ہدایت کی اور آنکھیں موند لیں۔ مجھے تھکن تو نہیں ہوئی تھی مگر میں انہماک سے آئندہ لائحہ عمل پر غور کرنا چاہتا تھا۔ برڈ اس سے پہلے بھی ہانگ کانگ آ چکا تھا اس لئے وہ نہایت دلچسپی سے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے باہر کے نظاروں میں دلچسپی لیتے دیکھا اور ایک مرتبہ پھر آنکھیں موند لیں۔

"ہے، تم اس طرف کہاں جا رہے ہو؟" برڈ کی کرخت آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ڈرائیور سے مخاطب تھا۔ "اے مسٹر' سنا نہیں تم نے؟" برڈ نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

مگر ڈرائیور شاید انگلش سے بالکل نابلد تھا۔ یا پھر وہ جان بوجھ کر برڈ کی بات سنی ان سنی کر رہا تھا۔

برڈ نے اچانک اس کی گردن دبوچ لی اور طیش کے عالم میں بولا۔ "اسٹاپ اٹ' باسٹرڈ! تم بہرے تو نہیں ہو! میں پہلی دفعہ ہانگ کانگ نہیں آیا ہوں اور جانتا ہوں کہ یہاں کا ہر ٹیکسی ڈرائیور اتنی انگلش تو جانتا ہے کہ پسنجر کا مافی الضمیر سمجھ لے۔ "روکو گاڑی ورنہ گردن توڑ دوں گا۔"

"توڑ دو۔" ڈرائیور نے بہت اطمینان سے رواں انگلش میں جواب دیا۔ "میری گردن ٹوٹی تو تم بھی ٹوٹ جاؤ گے۔ چلو کرو کوشش!"

"تم آخر ہم سے چاہتے کیا ہو؟" میں نے دوسری حکمت عملی اختیار کی۔ "ہم تمہارے ملک میں پردیسی ہیں' مہمان ہیں تمہارے' کیا مہمانوں کو یونہی پریشان کیا جاتا ہے؟"

"اب تم نے ڈھنگ کا سوال کیا ہے میں چاہتا کیا ہوں؟" ڈرائیور پہلی دفعہ مسکرایا۔ "فکر مت کرو' میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ بس کچھ دیر خاموشی سے

بیٹھو۔"

میں نے جلدی سے برڈ کا گھٹنا دبا دیا ورنہ وہ تو اس کی گردن مروڑنے کے مکمل موڈ میں تھا۔

اب شاید ہانگ کانگ کے مضافات شروع ہو گئے تھے۔ انہیں مضافات کہنا تو مشکل ہے کیوں کہ وہاں آبادی زیادہ اور جگہ بہ کم ہے۔ بڑے بڑے میدان اور پارک تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شہر بھر میں کئی کئی منزلہ بلند عمارتیں اور عمارتوں کے اس جنگل میں ہر ملک اور ہر قوم کا فرد نظر آتا ہے۔ وہاں چینیوں کی اکثریت ہے۔ وہاں کا زیادہ کاروبار چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرے نمبر پر انگریز ہیں جنہیں ان کے آقاؤں نے برسوں پہلے وہاں آباد کیا تھا۔ میں نے اس علاقے کو مضافات اس لئے کہا کہ وہاں سر بہ فلک عمارتیں نہیں تھیں بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت سے بنگلے بنے ہوئے تھے' یہاں بھی جگہ کی شدید قلت تھی مگر نہ جانے کیا سوچ کر وہاں کے مکینوں نے کثیرالمرلہ عمارات نہیں بنائی تھیں۔ وہ شاید وہاں کا پوش علاقہ تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک بنگلے کے سامنے ٹیکسی روک کر مخصوص انداز میں ہارن بجایا۔ دوسرے ہی لمحے بنگلے سے دو زرد رو چینی برآمد ہوئے اور ٹیکسی کی دونوں اطراف میں کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک کرخت لہجے میں بولا۔ "نیچے آ جاؤ تم دونوں!"

اس کی آواز میں تو خیر ایسا دبدبہ نہیں تھا مگر اس کے ہاتھ میں جو مشین پسٹل تھا وہ کسی بھی وقت چل سکتا تھا اس لئے ہم دونوں خاموشی سے نیچے اتر آئے۔ مشین پسٹل والے چینی نے ہمیں اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

میں نے برڈ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں پرسکون رہنے کو کہا اور ہم دونوں اندر کی طرف بڑھ گئے۔ مشین پسٹل والے کے دوسرے ساتھی اور ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارے بیگ اٹھا لئے تھے۔ انہی لوگوں کی رہنمائی میں ہم نے بجری کی ایک روش طے کی اور سیڑھیاں چڑھ کے برآمدے میں داخل ہو گئے۔ پھر ہمیں ایک کمرے میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔

وہ کمرہ کیا تھا' بڑا سا ایک ہال تھا' وال ٹو وال نہایت دبیز قسم کا قالین تھا اور کمرے کا فرنیچر بھی انتہائی بیش قیمت تھا۔ انہی میں سے ایک بیش قیمت صوفے پر ادھیڑ عمر کا ایک چینی بیٹھا تھا۔ اس کا سر انڈے کے چھلکے کی طرح شفاف تھا' وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا مگر اس کے باوجود پائپ پیتا ہوا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بندر کو ٹرینڈ کر کے اس کے ہاتھ میں بیش قیمت پائپ تھما دیا جائے۔

اس نے کاہلی سے ہم دونوں کا جائزہ لیا' پھر استفسار طلب نظروں سے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور جلدی سے بولا۔ "ہر کام بہت بہترین طریقے سے ہوا ہے باس۔" وہ باس سے بھی انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ وہاں ہونے والی گفتگو مجھے

اور برڈ کو سنانا چاہتے تھے۔

"ان دونوں سے کچھ پوچھا؟" اس بندر نما چینی نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں ڈرائیور سے پوچھا۔

"ابھی اس کا موقع ہی کہاں ملا ہے باس!" ڈرائیور کی انگلش نسبتاً بہتر تھی۔

"تو اب پوچھو۔" اس نے کاہلی سے پائپ کو ایش ٹرے میں جھٹکتے ہوئے کہا۔

حیرت مجھے یہ تھی کہ آخر وہ ہم سے کیا پوچھنا چاہ رہے تھے اور کیوں؟ وہ لوگ میرے لئے بالکل اجنبی تھے۔ کبھی وانگ یو یا مسٹر او کے سلسلے میں بھی ان سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ پھر وہ آخر مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے تھے؟

ڈرائیور آگے بڑھا اور یوں ہم دونوں کا جائزہ لینے لگا جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ پہلے کس سے سوالات کی ابتداء کرے؟ تھا تو وہ بھی چینی، مگر عام چینیوں کے برعکس اس کا جسم گٹھا ہوا تھا اور اپنے ہر ہر انداز سے وہ یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ ہالی وڈ کی کسی ایکشن فلم کا بدمعاش ہو۔ اس کی ساری بدمعاشی کا دار و مدار اس مشین پسٹل پر تھا جو اس کے ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔ آخر میں نے ہی اس خاموشی کو توڑا اور بیزاری سے بولا۔ "اب پوچھ بھی لو جو کچھ پوچھنا ہے۔ یوں شرمانے سے کام نہیں چلے گا۔"

وہ ایک قدم اور آگے بڑھ آیا۔ اب وہ میرے ہاتھ کی پہنچ میں تھا۔ اس کی اس حرکت سے تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میرے متعلق کچھ نہیں جانتا ورنہ کم از کم پانچ چھ فٹ دور رہ کر بات کرتا۔ اس نے بہت اسٹائل سے مشین پسٹل کو اپنی انگلیوں میں دائرے کی شکل میں گردش دی اور لہجے کو گھمبیر بنا کے بولا۔ "براؤن شوگر کا اسٹف کہاں چھپایا ہے تم لوگوں نے؟"

"براؤن شوگر!" مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ "یار، ہمارے ملک میں تو آج کل وہائٹ شوگر کی بھی شارٹیج ہے، تم براؤ شوگر کی بات کر رہے ہو۔"

"ابھی سب مسخرہ پن بھول جاؤ گے۔ میں پہلے پہل نرمی برتنے کا عادی ہوں۔"

"او بھائی! تم مجھے سمجھ کیا رہے ہو؟ میں کوئی منشیات کا اسمگلر نہیں ہوں۔ پاکستانی سیاح ہوں اور یہاں چند دن ستانے آیا ہوں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے براؤن اور وہائٹ شوگر سے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔"

میری بات پہ صوفے پر بیٹھا ہوا بندر نما باس چونک اٹھا اور یک لخت اس کی کاہلی رخصت ہو گئی۔ وہ جھپٹ کر کھڑا ہوا اور جناتی انگلش اور چینی میں کچھ بولا جس کا لب لباب تھا کہ اپنے پاسپورٹ دکھاؤ۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو ڈرائیور جھپٹ کر آگے بڑھا اور بولا۔ "حرکت مت کرنا، اپنے ہاتھ اٹھا لو، پاسپورٹ میں خود نکال لوں گا۔"

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ میں نے اسرائیہ لہجے میں کہا۔ "یار' صرف پاسپورٹ ہی نکالنا ورنہ ہانگ کانگ کے ٹیکسی ڈرائیوروں کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے اس معاملے میں۔"

اس نے میرے کوٹ کی اندرونی جیب سے پاسپورٹ نکال لیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر اس کے اندراجات پڑھنے لگا۔ "شہباز خان' سن آف دلاور خان' قد چھ فٹ ایک انچ' وزن دو سو دس پونڈ' آنکھوں کا رنگ بھورا' بالوں کی رنگت بھی براؤن۔ شناختی علامت پیشانی پر چوٹ کا نشان' تاریخ پیدائش....."

"الو کا پٹھا!" بندر نما باس گرج کر بولا۔ "کیا تجھے نام پڑھ کے اندازہ نہیں ہوا کہ تو غلط آدمی کو لے آیا ہے۔ "تم لوگ آنکھیں کھلی رکھ کے تو کام نہیں کرتے۔ مجھے شہباز خان نہیں بلکہ محمد اکبر چاہئے' پھر اس کا حلیہ دیکھ۔ کیا اکبر اتنا ہی لمبا اور مضبوط جسم کا مالک ہے کیا اس کے بال براؤن ہیں' کیا اس کی رنگت اتنی ہی سرخ و سفید ہے؟"

"مگر باس بال براؤن کئے بھی تو جا سکتے ہیں اور....."

"شٹ اپ!" باس دھاڑا۔ "لگتا ہے اب تو ناکارہ ہو گیا ہے اور تجھے ریٹائر کرنا پڑے گا۔"

"باس پلیز مجھے ایک موقع اور دے دیں۔ میں دراصل اس کے غیر ملکی ساتھی کی وجہ سے دھوکہ کھا گیا۔ اکبر کے ساتھ بھی ایک امریکن سفر کر رہا ہے۔ اس کا نام رابرٹ ہے اور وہ....."

"چلو' امریکی کا پاسپورٹ بھی چیک کئے لیتے ہیں۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ اس کا نام رابرٹ ہے یا جارج پنجم!"

ان کے طلب کرنے سے پہلے ہی برڈ نے اپنا پاسپورٹ نکالا اور بندر نما باس کی طرف بڑھا دیا۔ باس نے اس کے پاسپورٹ کا جائزہ لیا' پھر زہر آلود لہجے میں اپنے ماتحت سے بولا۔ "یہ بھی رابرٹ نہیں ہے۔ اب ان "معزز" لوگوں کو باعزت طریقے سے وہاں چھوڑ کر آؤ جہاں یہ جانا چاہتے تھے اور بارہ گھنٹے کے اندر اندر مجھے اکبر اور اس کا ساتھی چاہئے۔ یہ تمہارے لئے آخری موقع ہے۔" بندر نما باس کا لہجہ اچانک سفاک ہو گیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں یوں دیکھا جیسے کچا کھا جائے گا۔ پھر اس نے ہمیں ٹیکسی میں بٹھایا۔ ہمارا سامان بھی خود ہی اس نے ڈگی میں رکھا اور ہمیں "اومنی ہوٹل ہانگ کانگ" کے مین گیٹ پر اتار کر پیسے لئے بغیر ہی تیزی سے روانہ ہو گیا۔

○

ہمیں دیکھ کر ہوٹل کا ایک پورٹر ہماری طرف لپکا اور ہمارے سوٹ کیس اٹھا لئے۔

کاؤنٹر پر ایک شعلہ جوالا بیٹھی مسکراہٹ کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ جب میں نے اس سے ایک بڑے یا دو چھوٹے کمروں کا مطالبہ کیا تو اس نے مایوسی سے کندھے اچکائے اور بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "ویری از نو روم ایٹ دا مومنٹ۔" اس کی انگلش بھی واجبی سی تھی مگر یہی کیا کم تھا کہ وہ انگلش سمجھ لیتی تھی۔

میں نے کہا۔ "اف یو ڈونٹ مائنڈ' آئی وانٹ ٹو سی مینجر!" (اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہوٹل کے مینجر سے ملنا چاہوں گا۔)

"ویٹ اے منٹ پلیز!" اس نے تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا۔ پھر انٹرکام پر چینی میں کچھ چوں چاں چوں کرنے کے بعد بولی۔ "مسٹر مینجر از کمنگ ہیئر۔"

چند منٹ بعد میرے سامنے تھل تھل کرتے جسم اور باوقار چہرے والا ایک چینی کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے اور برڈ سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہاں واقعی کوئی کمرہ خالی نہیں ہے' ہر کمرے میں مہمان موجود ہیں' صرف دو کمرے خالی ہیں مگر ان کی بھی بکنگ ہو چکی ہے۔ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "اب یہ مت کہئے گا کہ میں اس ہوٹل کے مالک سے ملنا چاہتا ہوں کیوں کہ میں ہی اس ہوٹل کا مالک بھی ہوں۔"

"یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ مالک بھی آپ ہی ہیں۔" میں نے بھی ہنس کر کہا اور کوٹ کی اندرونی جیب سے وہ لفافہ نکال لیا جو میر صاحب نے اومنی ہوٹل کے مالک کے نام مجھے دیا تھا۔ میں نے لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا تعلق پاکستان سے ہے اور مجھے میر صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ اس تیزی سے میری طرف جھپٹا کہ میں اچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "تمہیں میرے یار نے بھیجا ہے اور تم اب تک خاموش کھڑے ہو۔ احمق آدمی' تم دونوں کے لئے تو اس ہوٹل میں پہلے ہی کمرے بک ہو چکے ہیں' اگر کمرے نہ بھی ہوتے تو میں ابھی اور اسی وقت کسی بھی کمرے کو خالی کرا لیتا۔" پھر اس نے کاؤنٹر سے چابی لی اور میرے حوالے کرتا ہوا بولا۔ "یہ تم دونوں کے کمروں کی چابیاں ہیں۔ پورٹر تمہیں کمروں تک پہنچا دے گا۔ تم لوگ فریش ہو جاؤ آرام کرو' میرے پاس ایک پارٹی بیٹھی ہے ورنہ میں بھی تمہارے ساتھ کمرے تک چلتا۔" پھر وہ کاؤنٹر پر بیٹھی حسینہ سے مخاطب ہوا۔ "یہ دونوں میرے خصوصی مہمان ہیں۔ انہیں وی آئی پی توجہ ملنا چاہئے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور کمرے میں آنے کا وعدہ کر کے تھل تھل کرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اومنی ہوٹل واقعی صاف ستھرا اور شاندار ہوٹل تھا۔ میرا اور برڈ کا کمرہ برابر برابر تھا۔ وہ اپنا سوٹ کیس کمرے میں رکھوا کے اور ایک شاور لے کر میرے کمرے میں آ بیٹھا تھا۔ میں بھی اس وقت تک نہا دھو کر فریش ہو چکا تھا اور روم سروس کو کافی کا آرڈر دے چکا تھا۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے برڈ نے کہا۔ "خرم! ہمیں اب پہلی فرصت میں ہتھیاروں کا بندوبست کرنا ہے۔ اس سلسلے میں بھی میر صاحب نے ایک پارٹی کا ایڈریس دیا تھا۔ ابھی کافی پی کر وہیں چلتے ہیں۔ ہتھیار کے بغیر تو میں خود کو ادھورا سمجھتا ہوں۔"

"ارے۔" میں نے مسخرے پن سے کہا۔ "یہ بات تم نے مجھے پہلے نہیں بائی ورنہ میں بازار سے کم از کم ایک شکاری چاقو ہی خرید لیتا۔"

"ہاں' شکاری چاقو پر یاد آیا۔ مجھے مخصوص قسم کے ان خنجروں کی بھی ضرورت ہوگی جو ہر آڑے وقت میں میرے کام آتے ہیں۔ یہاں تو میرے پاس وہ بھی نہیں ہیں مگر یہاں ایک مخصوص دکان پر مل جاتے ہیں۔"

کافی پی کر ہم کاؤنٹر پر پہنچے اور اپنے کمروں کی چابیاں اس شعلہ بدن کے حوالے کرنے کے بعد باہر نکل آئے۔ میری ڈائری میں اس شخص کا پتہ موجود تھا جہاں سے ہمیں بہ قول میر صاحب پوائنٹ ٹوٹو کے ریوالور سے لے کر ہینڈ گرینیڈ تک مل سکتا تھا۔ ہانگ کانگ کی ٹیکسیاں بھی ایسی ہیں جن میں بیٹھنے کی حسرت یہاں کے رؤسا کے دل میں بھی موجود ہے۔ جلد ہی ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور اس سے قبل شاید کسی جہاز کا پائیلٹ رہ چکا تھا۔ اس نے منٹوں میں ہمیں مطلوبہ پتے پر پہنچا دیا۔ وہاں پہنچ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

میں نے برڈ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس بنگلے کے بند گیٹ کو گھور رہا تھا' پھر اس نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "یار خرم! یہ چکر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

میں نے کوئی جواب دیئے بغیر ایک مرتبہ پھر وہ پتہ نکالا۔ وہ کسی مسٹر سی شواکی کا پتہ تھا' گیٹ پر اسی کے نام کی نیم پلیٹ بھی لگی ہوئی تھی۔ بنگلہ نمبر بھی غلط نہیں تھا فکر کی بات یہ تھی کہ یہ وہی بنگلہ تھا جہاں سے کچھ دیر قبل ہمیں روانہ کیا گیا تھا۔ میں نے چند لمحوں تک سوچا' پھر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

کچھ دیر بعد دروازے کی ذیلی کھڑکی کھلی اور کاہل سا ایک چینی نمودار ہوا۔ ہمیں دیکھ کر وہ بھی بری طرح چونک اٹھا۔ شاید اس نے بھی کچھ دیر قبل ہمیں قیدیوں کی حیثیت سے دیکھا تھا۔

"اب کیا بات ہے؟" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ یہ جملہ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں ادا کیا تھا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تمیز سے بات کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور ہماری آمد کی اطلاع مسٹر شواکی تک پہنچا دو۔"

وہ چند لمحے تک مجھے اور برڈ کو گھورتا رہا۔ جیسے فیصلہ کرنا چاہ رہا ہو کہ ہمیں شواکی تک

پہنچایا جائے یا نہیں؟

"جاؤ۔" اچانک برڈ سخت لہجے میں بولا۔

برڈ کے تیور دیکھ کر وہ پھرتی سے اندر غائب ہو گیا۔ اس کی بدحواسی پر برڈ کے ساتھ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ مشکل سے دو منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوا اور بولا۔ "چلو' باس تم لوگوں کو بلا رہے ہیں۔"

ہم گیٹ کی ذیلی کھڑکی سے اندر داخل ہوئے تو وہاں تین مسلح چینی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر بہت نرم لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں کو جامہ تلاشی دینا ہو گی۔ یہ میرا نہیں بلکہ باس کا حکم ہے۔"

"وہ پائپ پینے والا بندر حکم بھی چلاتا ہے۔" میں نے اردو میں کہا۔ چینی نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھا' پھر پھرتی سے میری اور برڈ کی تلاشی لے ڈالی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر وہی چینی ہمیں لے کر پھر اسی کمرے میں پہنچا۔

کمرے کا منظر وہی تھا جو کچھ گھنٹے قبل تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ بندر نما باس صوفے پر بیٹھنے کی بجائے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ اس نے حیرت سے ہمیں دیکھا' پھر پوچھا۔ "اب کیا چاہتے ہو تم لوگ! کیا میرے کسی آدمی نے تمہاری کوئی چیز چھین لی ہے یا وہ ٹیکسی ڈرائیور تمہارا سامان لے اڑا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے مسٹر شواکی۔" میں نے ہنس کر کہا' پھر جیکٹ کی اندرونی جیب سے میر صاحب کا خط نکال کر شواکی کے حوالے کر دیا۔ وہ خط میر صاحب نے اسی کے نام لکھا تھا۔

خط پڑھ کر وہ شکایتی انداز میں بولا۔ "تم نے اسی وقت کیوں نہ بتایا جب وہ الو کا پٹھا ٹیکسی ڈرائیور تمہیں یہاں لایا تھا۔"

"کیسی بات کر رہے ہو۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میر صاحب نے تمہارے ہی لئے وہ خط دیا ہے۔ یہ تو ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ......"

"پلیز!" شواکی نے میری بات کاٹ دی۔ "جو کچھ ہوا مجھے اس کا افسوس ہے۔" اس نے پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اگر انجانے میں تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو میں اپنے دوست کو کیا منہ دکھاتا؟"

"منہ تو خیر تمہارا اب بھی دکھانے کے قابل نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر اردو میں کہا' پھر جلدی سے انگلش میں بولا۔ "اب اس غصے کو ختم کرو۔ ہم بھی سب کچھ بھول گئے۔"

"تو پھر ابھی تک کھڑے کیوں ہو؟" شواکی مسکرایا۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے کسی کو آواز دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک ملازم سر جھکائے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ملازم کم اور بدمعاش زیادہ لگ رہا تھا۔ شواکی نے اس سے کچھ "چوں چنگ چاں کرچوں" کیا

اور وہ سر جھکائے ہوئے الٹے قدموں لوٹ گیا۔

شواکی ہم سے پاکستان اور میر صاحب کے بارے میں پوچھتا رہا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میر صاحب خود بھی یہاں آنے والے ہیں تو وہ اچھل پڑا اور پوچھنے لگا "میر صاحب کب تک آئیں گے؟ میں انہیں ایئرپورٹ پر ریسیو کروں گا۔"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ وہ کس دن یہاں پہنچیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"بس اتنا معلوم ہے کہ دو ایک روز میں پہنچ جائیں گے۔"

اس دوران میں شواکی کا ملازم اشیائے خورد و نوش کی ٹرالی لے کر آ گیا تھا۔ ٹرالی انواع و اقسام کی چیزوں سے بھری ہوئی تھی۔ نچلے حصے میں واڈکا کی ایک بوتل، آئس کیو اور نفیس قسم کے تین گلاس موجود تھے۔

بوتل اور گلاس دیکھتے ہی مجھ سے پہلے برڈ نے کہا۔ "صرف دو گلاس بنانا مسٹر شواکی۔ خرم شراب نہیں پیتا۔"

شواکی نے بندر کی طرح پلکیں جھپکا کر مجھے دیکھا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ "بہت اچھا کرتا ہے۔ پھر میں اس کے لئے کوئی سافٹ ڈرنک منگواتا ہوں۔"

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس دبلے پتلے، گنجے اور ناٹے آدمی کو باس کس الو کے پٹھے نے بنا دیا۔ یہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی ابتدائی شکل تھی۔ پھر اچانک مجھے وانگ یو کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو شواکی کی طرح پستہ قد تھا مگر بلا کا فائٹر تھا۔ شواکی میں کوئی نہ کوئی ایسی خوبی ضرور ہو گی جو وہ باس بنا بیٹھا تھا۔

کھانے پینے سے فارغ ہو کر میں مطلب کی بات پر آ گیا۔ "مسٹر شواکی! ہم لوگوں کو کچھ اسلحہ چاہئے۔"

"فکر مت کرو، تمہیں ہر قسم کا اسلحہ فراہم کر دوں گا۔ آدمیوں کی ضرورت ہو تو وہ بھی مل جائیں گے۔" شواکی نے جواب دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آؤ میرے ساتھ!"

میں اور برڈ اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکلے۔ کوریڈور میں اس کے تین آدمی کھڑے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ ایک دم مستعد ہو گئے۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے رجمنٹ کا سی او اچانک راؤنڈ پر نکلا ہو۔ چلتے چلتے اس نے کسی کو آواز دی۔ فوراً ہی لمبا تڑنگا ایک امریکن کسی کمرے میں سے نمودار ہوا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ شواکی نے اس سے کہا۔ "ولیم! یہ دونوں میرے دوست ہیں۔ انھیں اسلحے والے کمرے میں لے جاؤ اور جو یہ لینا چاہیں، انھیں دے دینا۔ مجھے ایک فون کال کا انتظار ہے۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ اسلحہ لے کر تم لوگ وہیں آ جانا۔" آخری جملہ اس نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

○

ولیم ہمیں کسی کمرے کی بجائے تہہ خانے میں لے گیا۔ اس تہہ خانے میں مختلف کیلوبرز کے اتنے ریوالور، پسٹل اور رائفلز تھیں کہ برڈ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں میں بھی بہت حیران تھا۔ اسلحے کا اتنا بڑا ذخیرہ میں نے بھی اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ہماری حیرانی دیکھ کر ولیم مسکرایا اور بولا۔ "پریشان مت ہو، باس اسلحے کا کاروبار بھی کرتا ہے۔"

"کاروبار!" برڈ نے حیرت سے دہرایا۔ "قانونی طور پر۔" "جو لوگ قانونی طور پر یہ کاروبار کرتے ہیں، بلیک میں اتنا اسلحہ ان کے پاس نہیں ہوتا۔ ہمارے زیادہ تر گاہک بین الاقوامی دہشت گرد اور وہ تنظیمیں ہیں جو طاقت کے بل پر انقلاب لانا چاہتی ہیں۔ کئی ایشیائی ملکوں کے سیاست داں بھی ہمارے گاہک ہیں جو اسلحے کے بل پر ملک میں بدامنی پھیلاتے ہیں۔" مجھے ولیم پر حیرت تھی کہ وہ اپنے باس کے اس کاروبار کی تفصیل ہمیں کیوں بتا رہا ہے۔ اسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ ہم باس کے دوست ہیں۔ آخر میں نے اس سے یہ سوال کر ہی دیا۔

میرے سوال پر وہ یوں مسکرایا جیسے کسی بچے نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ "مسٹر ٹوم! باس کا یہ کاروبار خفیہ نہیں ہے۔ ہمیں تو دنیا کا ہر وہ شخص جانتا ہے۔ جس نے ہم سے مال خریدا ہے۔"

میں نے اس سلسلے میں زیادہ سر کھپانا فضول سمجھ کے موضوع بدل دیا اور ولیم سے کہا۔ "مجھے اور میرے ساتھی کو ایک ایک مشین پسٹل، دو دو پوائنٹ تھری ایٹ کے کولٹ ریوالور، ایک ایک اوزی رائفل اور فاضل راؤنڈ چاہئیں۔"

"ہینڈ گرینڈ اور ٹائم بم نہیں لو گے؟" اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے سے مجھے بالکل یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس نے طنز کیا ہے یا ہمیں یاد دلایا ہے۔

"ممکن ہے بعد میں بھی ہمیں مزید اسلحے کی ضرورت پڑے۔ یہ دستی بم اور ٹائم بم میں بعد میں لے لوں گا۔" پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ "پلاسٹک بم ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔"

"سب کچھ مل جائے گا۔" ولیم نے ہنس کر کہا۔ "جتنا مال خرچ کرو گے، اتنا ہی اسلحہ مل جائے گا۔ ویسے تم لوگوں کا تعلق کس تنظیم سے ہے؟" وہ ہمیں شاید اسلحے کا کوئی گاہک سمجھ رہا تھا۔

"ہمارا تعلق کسی دہشت گرد تنظیم سے نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "نہ ہم کسی

ملک میں کوئی چھاپا مار کارروائی کریں گے۔"

"یہ اسلحہ کیا تحفے کے طور پر لے جاؤ گے؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ ہمارے دشمنوں کے لیے تحفہ ہی ہوگا۔" برڈ نے تلخ لہجے میں کہا۔ "موت کا تحفہ۔"

"ارے یار' تم تو برا مان گئے۔" ولیم جلدی سے بولا۔ "آؤ تمہاری مطلوبہ چیزیں تمہیں دے دوں۔" وہ ایک دیوار گیر الماری کی طرف بڑھا اور سوئچ بورڈ کے کسی بٹن کو پش کیا۔ دیوار گیر الماری ایک طرف کھسک گئی۔

"اس ذخیرے میں انتہائی قیمتی ہتھیار سجائے ہیں میں نے۔" ولیم نے کہا اور دیوار میں پیدا ہونے والے خلا میں داخل ہوگیا۔ دیوار کی دوسری جانب ایک اور کمرا تھا۔ اس میں جی تھری' سیون ایم ایم اوزی اور اسٹین گن سے لے کر چھوٹے بڑے انتہائی قیمتی پستول' ریوالورز اور ماؤزر وغیرہ کا ایک ڈھیر تھا۔

میں اور برڈ نے اپنے مطلب کی چیزیں وہاں سے لے لیں۔ ولیم نے جلدی جلدی تمام چیزوں کو بڑے سے ایک کارٹن میں پیک کیا۔ رائفلیں دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں۔ تمام ہتھیار رکھنے کے بعد اس نے کارٹن میں ان کے بے شمار راؤنڈ بھی بھر دیے۔

پیک ہونے کے بعد وہ کارٹن اتنا بھاری ہو گیا کہ میں اور ولیم نے مل کر بہ مشکل تمام اسے اٹھایا اور تہہ خانے سے باہر آگئے۔ میں نے وہ اسلحہ لے تو لیا تھا مگر اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے رکھوں گا کہاں؟

"تم لوگوں کو گاڑی کی ضرورت بھی پڑے گی؟" شواکی نے پوچھا۔

"ظاہر ہے' میں اس کارٹن کو ٹیکسیوں میں لے کر کہاں پھروں گا۔ میں نے تو خود تم سے گاڑی مانگنے والا تھا۔"

"میرے پاس تمہارے مطلب کی دو گاڑیاں ہیں ایک کسی ایمرجنسی کے لیے میرے پاس رہتی ہے دوسری تم لے جاؤ۔ اس گاڑی کی اگلی اور پچھلی نشست کے نیچے اتنی گنجائش ہے کہ اس سے دگنا اسلحہ سیٹوں کے نیچے چھپایا جاسکتا ہے۔ ویسے میرا ایک مشورہ مانو گے؟" شواکی نے اچانک پوچھا۔

"تمہارا مشورہ اچھا ہی ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر ایسا کرو کہ فی الحال ریوالورز کے علاوہ صرف ایک ایک رائفل لے جاؤ۔ یہ رائفلیں بریف کیس میں بھی آجائیں گی۔ یہ مت سمجھنا کہ اسلحہ دینے میں مجھے کوئی اعتراض ہے۔ چاہو تو میرا پورا ذخیرہ لے جاؤ۔ یہ تو میرا ایک مشورہ ہے۔ خواہ مخواہ اتنے بوجھ اٹھائے پھرو گے۔"

میں نے بھی سوچا کہ شواکی کی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے فی الحال ہمارے لیے ایک ایک

ماؤزر اور پوائنٹ تھری ایٹ کا ریوالور کافی تھا۔ دو کی بجائے ایک رائفل سے بھی کام چل سکتا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "مسٹر شواکی تمہارا مشورہ بہت مناسب ہے۔"

"واقعی فوری طور ہم اتنے زیادہ اسلحے کا کیا کریں گے۔"

شواکی نے ایک ملازم سے چوں چاں چونگ کرکے دو بریف کیس منگالیے۔ ہم نے ضروری اسلحہ بریف کیسوں میں رکھا اور جانے کو تیار ہوگئے۔ میں نے شواکی بتا دیا کہ ہم لوگ ہوٹل اومنی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنا مخصوص فون نمبر مجھے دیا اور بولا۔ "کسی موقع پر میری ضرورت پڑے تو اس نمبر پر رنگ کرلینا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو بھی ہدایت کردوں گا۔ اگر تمہارا فون میری غیر موجودگی میں آیا تو وہ بیس منٹ کے اندر اندر تم تک پہنچ جائیں گے۔"

شواکی نے آواز دی تو وہی ملازم سر جھکائے ہوئے داخل ہوا جو اس سے پہلے ہمارے لیے مشروبات لے کر آیا تھا۔ وہ اس مصرعے کی تفسیر تھا کہ چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔ شواکی نے اس سے اپنی مادری زبان میں کچھ چوں چاں کی وہ فوراً الٹے قدموں دوڑ گیا' پھر شواکی مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میں نے اناکا کو بلایا ہے۔ اناکا میرا بہترین آدمی ہے اس سے مل کر تمہیں خوشی ہوگی۔"

اس وقت کمرے میں گھٹے ہوئے جسم اور درمیانے قد کا ایک جاپانی داخل ہوا۔ چینی اور جاپانی دیکھنے میں یہ ظاہر ایک نظر آتے ہیں مگر ان دونوں میں واضح فرق ہوتا ہے۔ اس نے جھک کر شواکی کو تعظیم دی۔ پھر سر جھکا کر خاموشی سے کھڑا ہوگیا۔ میں نے ایک بات اور نوٹ کی کہ سر جھکا ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں تیزی کے ساتھ پورے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"اناکا! شواکی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے مہمان ہیں مسٹر شہباز اور مسٹر برڈ۔" اس نے ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہیں ان کے ساتھ رہنا ہے اور ان کی مدد کرنا ہے۔" پھر شواکی ہم سے مخاطب ہوا۔ "یہ اناکا ہے میرا بہترین فائٹر۔"

اناکا نے سر کے مخصوص اشارے سے ہمیں سلام کیا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی جس سے اس کی جسمانی قوت اور گرم جوشی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ شواکی نے اسے ہدایت کی کہ ان لوگوں کو گائیڈ کرنا بھی تمہاری ذمے داری ہے۔ انھیں میرے بہت عزیز دوست نے یہاں بھیجا ہے۔ اس لیے ہر طرح سے ان کا خیال رکھنا۔

"اوکے باس!" اناکا نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ "میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

شواکی سے رخصت ہوکر ہم باہر آئے تو سیاہ رنگ کی ایک سیڈان پورچ میں کھڑی تھی۔ شواکی نے بتایا کہ یہ گاڑی خصوصی طور پر تیار کرائی ہے۔ یہ بلٹ پروف ہے اور اس میں کئی اور خوبیاں ہیں۔ یہ تمہارے لیے ہر طرح سے موزوں رہے گی۔

اناکا نے شوفروں والے انداز میں ہمارے لیے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"مسٹر اناکا۔" میں نے کہا۔ "ہمارے ساتھ رہو گے تو تمہیں اپنا یہ انداز ترک کرنا ہو گا۔ تم ہمارے دوست ہو ملازم نہیں۔"

"جو کچھ یہ کہیں انھیں ماننا تمھارا فرض ہے اناکا!" شواکی نے کہا۔

اناکا نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ میں گھوم کر اگلے دروازے پہ پہنچا تو اناکا اسٹیئرنگ پر بیٹھ چکا تھا۔ برڈ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اناکا کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تاکہ وہ خود کو ہمارا ڈرائیور نہ سمجھے۔ پھر گاڑی ایک جھٹکے سے روانہ ہو گئی۔

"مسٹر شہباز!" اناکا نے پوچھا۔ "آپ کا ساتھی کچھ بیمار ہے کیا؟"

"بیمار تو نہیں ہے مگر برڈ کچھ ہی دن پہلے بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اس کا خون بہت زیادہ ضائع ہو گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے کمزوری ہے۔"

"میں ایک ایسے علاقائی ڈاکٹر کو جانتا ہوں جو جڑی بوٹیوں سے علاج کرتا ہے۔ وہ خاصا بوڑھا ہے مگر اس کے ہاتھ میں جادو ہے۔ بہت سے موقعوں پر میں بھی شدید زخمی ہو کر اس کے پاس پہنچا۔ اس کے پاس ایسی نایاب جڑی بوٹیوں کے عرق اور مرہم ہیں کہ مردے کو پلاؤ تو وہ بھی زندہ ہو جائے۔ جڑی بوٹیوں کے علاج میں چینی یوں بھی ماہر ہوتے ہیں۔ جیسے آپ کے یہاں پرانے حکیم ہوتے ہیں۔"

"کیا ہم ابھی چل سکتے ہیں۔" اناکا نے جواب دیا۔ "آپ کہیں تو میں آپ کو سیدھا وہیں لے چلوں۔"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" برڈ نے منہ بنا کر کہا۔ اسے اپنی کمزوری کے تذکرے پر غصہ آ رہا تھا۔

"تم ایک دفعہ وہاں چلو تو۔" اناکا نے کہا۔ "بوڑھے ڈاکٹر کی ایک ہی خوراک میں کسی گھوڑے کی طرح چاق و چوبند ہو جاؤ گے۔"

برڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اناکا بھی خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ میں نے باہر کے مناظر پر نظریں جما دیں۔ ہانگ ہانگ میں چونکہ جگہ کی قلت ہے اس لیے وہاں رہنے والوں نے ایک ایک انچ زمین کو قابل استعمال بنا دیا ہے۔ وہاں سر بہ فلک عمارتوں کی بہتات ہے۔ آبادی میں اکثریت چینیوں کی ہے۔ ویسے وہاں ہر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ انگریز، جرمن، اتالین، امریکن، حتیٰ کہ بھارت کے سکھ بھی! جسے ہمارے ملک میں ٹرانسپورٹ سکھوں کے ہاتھ میں ہے۔ ہانگ کانگ میں بھی زیادہ تر سکھ مجھے ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں دکھائی دیے۔

گاڑی تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن بھی پرواز کر رہا

تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے اس "مشن" کا آغاز کہاں سے کروں؟ ظاہر ہے وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمیں کسی اوپن مارکیٹ میں تو بکنے سے رہیں۔ مجھے تو زیر زمین دنیا کا زیادہ تجربہ بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے اس سلسلے میں برڈ کے ذہن میں کوئی تدبیر ہو۔ اس کی زندگی زیر زمین دنیا میں گزری تھی۔ اسے ساتھ لاکر میں نے بہت اچھا کیا تھا۔ ورنہ میں تو یہاں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا یا پھر میر صاحب کا انتظار کرتا رہتا۔ میں شواکی پر بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ میر صاحب کا دوست اور بہی خواہ ضرور تھا مگر جب بات کروڑوں ڈالر کی ہو تو بڑی بڑی دوستیاں دشمنیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

میں اپنے خیالات سے چونکا تو اس وقت جب گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ میں نے باہر نظر دوڑائی۔ وہ کوئی گنجان آباد علاقہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کراچی کے علاقے کھارادر میں کھڑے ہوں۔ ٹریفک کا اژدھام' لوگوں کی چیخ پکار' سب کچھ اسی طرح تھا۔ فرق تھا صرف عمارتوں کا۔ یہاں کی عمارتیں اتنی خستہ حال نہیں تھیں جتنی کھارادر کی ہیں۔ اتاکا نے مجھے اور برڈ کو اترنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں نیچے اترے تو وہ ہمیں لے کر ایک عمارت کی طرف بڑھا اور بولا۔ "یہ ہانگ کانگ کا قدیم علاقہ ہے۔ سب سے پہلے یہی علاقہ آباد ہوا تھا۔ اس سامنے والی بلڈنگ کے پانچویں فلور پر وہ بوڑھا ڈاکٹر رہتا ہے۔"

خلاف توقع عمارت میں لفٹ بھی موجود تھی۔ ہم لفٹ کے ذریعے پانچوں فلور پر پہنچے۔ ہر فلور پر آمنے سامنے دو دو فلیٹس تھے۔ اتاکا نے بائیں ہاتھ کے پہلے فلیٹ کی کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

فوراً ہی دروازہ کھلا اور ایک چینی لڑکی کا چہرہ نمودار ہوا۔ اب نہ جانے وہ لڑکی تھی یا عورت چینی خواتین کی عمر کا اندازہ ان کے چہرے سے نہیں ہوتا۔ وہ اتاکا کو دیکھ کر مسکرائی۔ اتاکا نے جلدی جلدی چینی زبان میں کچھ کہا۔ چینی لڑکی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا اور دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ گئی۔

ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو کوئی چیز جلنے کی ناگوار بو محسوس ہوئی۔ وہ کمرا ڈرائنگ روم یا ویٹنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا کیونکہ وہاں دیوار کے ساتھ ساتھ قطار سے صوفے سے لگے ہوئے تھے۔ فرش پر بوسیدہ سا قالین بھی تھا۔ دیواروں پر قدیم چینی آرٹ کے نمونے چسپاں تھے۔ ہم اتاکا کے اشارے پر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ اتاکا نے بتایا کہ بوڑھا ڈاکٹر ابھی ایک زخمی کی مرہم پٹی کر رہا ہے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ ہم سے ملے گا۔

ہم انتظار کرتے رہے۔ برڈ نے انتظار سے اکتا کر کہا۔ "یار شہباز! یہاں سے چلو' یہ ناگوار بو میرے دماغ پر چڑھ گئی ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"یہ ان جڑی بوٹیوں کی بو ہے جو ڈاکٹر استعمال کرتا ہے۔" اتاکا نے بتایا۔ "اب یہاں

تک آ ہی گئے ہیں تو تھوڑا سا انتظار کرلو۔"

برڈ نے بے بسی سے ہونٹ چبائے اور سامنے والی دیوار کو گھورنے لگا۔

اسی وقت اندرونی دروازے سے وہی چینی لڑکی یا عورت نمودار ہوئی۔ اس نے جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی جو اس کے سپاٹ جسم پر بہت بری لگ رہی تھی اس نے اتاکا سے جلدی جلدی کچھ کہا۔ اس کی زبان اتنی تیزی سے چل رہی تھی کہ مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ہماری خواتین بولنے کے سلسلے میں خواہ مخواہ بدنام ہیں۔ وہ اتنی تیز رفتاری سے زبان چلا رہی تھی کہ اتاکا کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔

وہ جونہی سانس لینے کو رکی۔ اتاکا نے جلدی سے کچھ کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی کے اشارے پر وہ ہمیں لے کر ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے ہم اس بوڑھے چینی کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ دبلا پتلا سا شخص تھا۔ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق اسی سال کے لگ بھگ ہوگی۔ چینیوں کے روایتی انداز کے مطابق اس کی ٹھوڑی پر لمبی سی داڑھی بھی تھی اور اوپری ہونٹ کے دونوں سروں کے پاس سے پتلی پتلی مونچھیں بھی لٹک رہی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی۔ وہ بو مزید ناقابل برداشت ہوگئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی عقابی نظریں ہم تینوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اتاکا نے چینیوں کے روایتی انداز میں جھک کر اسے تعظیم دی اور ہمیں بھی ایسا کرنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے بھی اتاکا کی تقلید کی۔ کمرے میں پرانا سا ایک قالین پڑا ہوا تھا۔ فرنیچر کے نام پر صرف بڑی سی ایک میز کمرے کے کونے میں پڑی ہوئی تھی جس پر بے شمار شیشیاں' مرتبان اور چھوٹے بڑے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ بوڑھا چینی فرش پہ دیوار سے پشت ٹھکائے بیٹھا تھا۔ ہم لوگ بھی اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

اس نے باری باری ہماری آنکھوں کو بہ غور دیکھا پھر ٹوٹی پھوٹی انگلش میں برڈ سے بولا۔ "تمہارا خون کچھ زیادہ بہہ گیا ہے مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میری دوا سے تم دس دن کے اندر اندر چاق و چوبند ہو جاؤ گے۔"

میں اس بوڑھے کی بات پر حیران رہ گیا۔ اسے بھلا کیسے معلوم ہوا کہ ہم تینوں میں سے برڈ کو دوا کی ضرورت ہے۔ برڈ بھی حیرت سے اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اتاکا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ دیکھا اس ڈاکٹر کا کمال!

"اب جسم پر کوئی زخم تو نہیں ہے؟" بوڑھے نے برڈ سے پوچھا۔

"زخم تو کوئی نہیں ہے' البتہ کمزوری خاصی ہے۔" برڈ نے جواب دیا۔ وہ بھی بوڑھے چینی سے مرعوب دکھائی دے رہا تھا۔

"فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بوڑھے نے جواب دیا' پھر وہ اس میز کی طرف بڑھ گیا جس پر مرتبان اور ڈبے رکھے

ہوئے تھے۔

"اگر اس فلیٹ سے نکاسی کا ہی ایک راستہ تھا جس کے ذریعے ہم یہاں پہنچے تھے تو پھر وہ زخمی کہاں گیا جس کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ میں نے یہی سوال اناکا سے سرگوشی میں کیا تو وہ ہنس کر آہستہ سے بولا۔ "وہ زخمی اندر والے کمرے میں ہوگا۔ شدید زخمیوں کو ڈاکٹر کئی گھنٹے اور بعض اوقات تک تین تین دن اپنی نگرانی میں رکھتا ہے۔ تم تو ہر بات کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھ رہے ہو۔"

اس دوران میں بوڑھا ایک گلاس میں سیاہی مائل سرخ مشروب لے کر آگیا۔ اس نے وہ گلاس برڈ کی طرف بڑھا دیا اور ہنس کر بولا۔ "یہ دوا بہت کڑوی ہے مگر انتہائی موثر ہے۔ اسے ایک سانس میں اسے پی جاؤ۔"

برڈ نے گلاس لے کر بے بسی سے مجھے اور اناکا کو دیکھا' پھر اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا کر ایک سانس میں خالی کر دیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے نیم کے پتوں کا تلخ عرق پی لیا ہو۔ گلاس رکھ کے اس نے ابکائی سی لی۔ بوڑھے نے جلدی سے ایک اور گلاس اس کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔ "دوا کی کڑواہٹ مارنے کے لیے یہ پی لو ورنہ تمہیں قے ہو جائے گی اور فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔"

برڈ نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح وہ گلاس بھی ایک سانس میں خالی کر دیا۔ دوسری دوا شاید بہت میٹھی تھی جبھی تو برڈ کے چہرے سے ناگواری کے تاثرات آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ وہ مسکرانے لگا۔

بوڑھے نے کہا۔ "میں تمہیں یہ دوا دے بھی دوں گا۔ تمہیں مزید دو خوراک کی ضرورت ہے۔ انھیں بھی اسی طرح پی جانا۔ دو دن میں ایسے چاق و چوبند ہو جاؤ گے جیسے کبھی زخمی ہوئے ہی نہیں تھے۔ یہ دوا نہ صرف توانائی بحال کرتی ہے بلکہ اندرونی چوٹوں کے لیے بھی اکسیر ہے" یہ کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر دواؤں والی میز کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دو چھوٹی بڑی بوتلوں میں وہ دونوں دوائیں بھریں اور برڈ کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "آدھا گلاس پانی میں چائے کا صرف ایک چمچہ دوا ڈالنا۔"

برڈ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جھجکتے ہوئے بولا۔ "آپ کی فیس۔"

"یہ حساب کتاب باس سے کریں گے۔" اناکا جلدی سے بولا۔ "ایک طرح سے یہ باس کے تمام آدمیوں کے معالج ہیں۔"

"گویا باس کے پینل پر ہیں۔" میں ہنس کر بولا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ انھیں اس حد تک انگلش بھی آتی ہوگی کہ کسی ترجمان کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔" برڈ نے کہا۔

اس کی بات سن کر بوڑھا مسکرایا اور بولا۔ "میں گزشتہ چالیس برس سے یہیں ہوں۔

میرے پاس علاج کے لیے انگریز بھی آتے ہیں اسی لیے میں نے انگلش بھی سیکھ لی۔

ہم رخصت ہونے لگے تو بوڑھے نے اسی لڑکی کو آواز دی۔ نہ جانے وہ اس کی بیٹی تھی یا ملازمہ۔ وہ ہمیں لے کر دروازے کی طرف چلی۔ ویٹنگ روم میں دو آدمی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہ شخص میری طرف متوجہ نہیں تھا اس لیے وہ مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا تھا۔ میرے چونکنے پر برڈ بھی چوکنا ہو گیا تھا۔ ہم فلیٹ سے باہر نکلے تو برڈ نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے خرم! تم کس الجھن کا شکار ہو؟"

"یار، وہ جو ویٹنگ روم میں دو آدمی بیٹھے تھے، ان میں سے ایک کا چہرہ کچھ دیکھا بھالا لگ رہا ہے۔ اب مجھے یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے انھیں ایران میں دیکھا ہے یا پاکستان میں؟" میں واقعی الجھ کر رہ گیا تھا۔ ان دونوں کا تعلق کسی یورپی ملک سے تھا۔ ممکن ہے جرمن رہے ہوں۔

"الجھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔" اتاکا نے کہا۔ "اگر تمہیں اس شخص پر شبہ ہے تو ہم اس کا پیچھا کرکے ٹھکانا معلوم کرلیں گے یا پھر اس دوران میں تمہیں یاد آجائے گا تو اسے اغوا کرکے اس سے پوچھ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ پریشان کیوں ہوتے ہو۔"

ہم لوگ ایک مرتبہ پھر سیڈان میں جا بیٹھے۔ اتاکا نے سیڈان ایسے رخ پر کھڑی کرائی تھی کہ ہم دائیں یا بائیں طرف کسی بھی رکاوٹ کے بغیر جاسکتے تھے۔ جن لوگوں کا تعاقب کرنا تھا، وہ نہ جانے کس سمت میں جاتے۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مشکل سے دس منٹ بعد وہ بلڈنگ کے صدر دروازے پر نمودار ہوئے۔ ان کا رخ دائیں طرف کھڑی ہوئی پرانی سی ایک شیورلیٹ کی طرف تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ اس نے سنبھالی جسے دیکھ کر میں چونکا تھا۔ پھر شیورلیٹ کے روانہ ہوتے ہی ہماری گاڑی بھی حرکت میں آئی۔ اس گنجان آباد علاقے اور ٹریفک کے ازدحام میں ڈرائیونگ واقعی کمال تھا مگر اتاکا شاید اکثر اس علاقے میں آتا رہتا تھا اس لیے وہ انتہائی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس لیے اتاکا کو ڈرائیونگ میں کوئی مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ اب تعاقب بھی بہت احتیاط سے کر رہا تھا۔ شیورلیٹ اور ہماری گاڑی کے درمیان تین کاریں تھیں۔

یہ تعاقب تقریباً" آدھا گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر شیورلیٹ ایک کثیر المنزلہ عمارت کے سامنے رکے گی۔ اتاکا گاڑی لیے ہوئے سیدھا نکل گیا اور کچھ فاصلے پر پارکنگ کی جگہ دیکھ کر گاڑی روک دی۔

شیورلیٹ والے اب گاڑی سے اتر کر اس عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے اترنا چاہا تو اتاکا نے مجھے روک دیا۔ "تم ٹھہرو خرم! اگر تم اسے پہچانتے ہو تو وہ بھی تمھیں

پہچان لے گا۔ میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔ فی الحال صرف ٹھکانا ہی تو معلوم کرنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے نیچے اتر گیا۔

شیورلیٹ والے اب بلڈنگ کے صدر دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ وہ جونہیں بلڈنگ میں داخل ہوئے' اناکا نے ان کے پیچھے دوڑ لگا دی اور لمحوں میں وہ بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔

"یار برڈ' میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے؟" میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "میری یادداشت اتنی کمزور تو نہیں ہے۔"

"یار' کبھی کبھی وہم بھی ہوتا ہے کسی بات کا۔" برڈ نے جواب دیا۔ "کوئی چہرہ دیکھ کر بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ ہم نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"یہ میرا وہم نہیں ہے۔" میں جھنجلا گیا۔ مجھے سوچنے دو' میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔" میں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا۔

"یار" ویسے اس بوڑھے چینی کی دوا میں واقعی جادو ہے۔" برڈ نے کہا۔ "میں نے ابھی صرف ایک ڈوزلی ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میری تمام توانائی لوٹ آئی ہو۔"

"کون ہو سکتا ہے وہ شخص؟" میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"لعنت ہو اس شخص پر۔" برڈ بھنا گیا۔ "میں موضوع بدلنے کی کوشش کرتا ہوں مگر گھوم پھر کے تمھاری سوئی وہیں اٹک جاتی ہے۔"

برڈ پلیز' مجھے سوچنے دو کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' سوچتے رہو۔" برڈ بھی جھنجلا گیا۔ "یاد آجائے تو مجھے ضرور بتا دینا۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔" میں نے برڈ سے کہا۔ "ہم یہاں کسی تفریحی دورے پر نہیں آئے ہیں۔" ہمیں چھوٹی سے چھوٹی بات پر نظر رکھنا ہوگی' اس پر غور کرنا ہوگا۔ تم تو ہر جگہ میرے ساتھ ہی رہے ہو۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ شخص یاد کیوں نہیں آرہا۔ تم نے بھی اسے ضرور دیکھا ہوگا۔"

"کئی موقعوں پر میں تمھارے ساتھ نہیں تھا بلکہ کلارا تھی۔" برڈ نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ میری ذہنی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ "ایسے ہی کسی موقع پر یہ تمھارے سامنے آیا ہوگا۔"

اس کی بات پر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آگیا کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا تھا۔ وہاں نہ کلارا تھی' نہ برڈ۔ کچھ لوگ مجھے اغوا کرکے لے گئے تھے اور ایک کمرے میں قید کر دیا تھا۔ وانگ یو کی جاپانی سیکریٹری ان لوگوں سے مل گئی تھی۔ بعد میں موقع پا کر میں نے اس قید سے رہائی حاصل کرلی تھی اور وانگ یو کی سیکریٹری کے علاوہ وہاں

موجود دوسرے لوگوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اس شخص کو میں نے اسی بنگلے میں دیکھا تھا۔ اس نے مجھے باندھنے میں دوسرے آدمی کی مدد بھی کی تھی اور مجھ پر تشدد بھی کیا تھا۔

برڈ بہت غور سے میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس نے اچانک پوچھا۔ "کیا ہوا خرم! کچھ یاد آگیا کیا؟"

"ہاں یار، مجھے یاد آگیا کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے۔" میں نے پر جوش لہجے میں کہا۔ پھر چونک کر بولا۔ "تم مجھے بار بار میرے اصلی نام سے مخاطب کر رہے ہو۔ حالانکہ میر صاحب نے۔"

"سوری۔ شہباز!" برڈ ہنسنے لگا۔ "میں بالکل بھول جاتا ہوں کہ اب تم خرم نہیں ہو مگر تم نام کی اس بحث میں کہاں پڑگئے۔" وہ چونک کر بولا۔ "مجھے تو تم اس شخص کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"یار، اس شخص سے ہمیں کلیو مل سکتا ہے۔ ان لوگوں نے ایک دفعہ مجھے اغوا کیا تھا۔"

"اس شخص نے؟" برڈ نے پوچھا۔

"یہ تو معمولی سا ایک مہرہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر یہ ہمیں اصل آدمی تک پہنچا سکتا ہے۔"

"پھر کیا خیال ہے؟" برڈ کی آنکھوں میں وہی چمک نمودار ہوگئی جو شکار کرنے سے پہلے چیتے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

"اتاکا لوٹ آئے، پھر طے کرتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔" میں نے جواب دیا اور بے چینی سے بلڈنگ کے صدر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

اتاکا کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اب تک اسے لوٹ آنا چاہیے تھا۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا مگر بلڈنگ کے صدر دروازے کے عین اوپر خاصا پاور فل بلب لگا ہوا تھا پھر اسٹریٹ لائٹس بھی روشن تھیں اس لیے اندھیرے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر کلائی کی گھڑی دیکھی، اتاکا کو گئے ہوئے بیس منٹ ہو چکے تھے میں دروازہ کھولتے ہوئے بڑبڑایا۔ "میں دیکھتا ہوں اتاکا کہاں رہ گیا۔"

"ٹھہرو شہباز! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" برڈ نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

اسی وقت مجھے اتاکا دکھائی دیا۔ وہ تیز قدموں سے گاڑی کی طرف آرہا تھا۔ میں اور دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اتاکا ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "بہت دیر لگا دی تم نے؟ کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟"

"دو دونوں تھرڈ فلور کے فلیٹ نمبر سات میں گئے ہیں۔ اسی فلور پہ میرا ایک شناسا رہتا ہے۔ اس کے فلیٹ کا نمبر تین ہے۔ وہ مجھے اپنے فلیٹ میں لے گیا تھا۔ اسی نے

بتایا کہ فلیٹ نمبر سات والوں کی سرگرمیاں مشتبہ ہیں۔ یا تو ان کا تعلق بدمعاشوں کے کسی گینگ سے ہے یا پھر وہ اکیلے ہی غیر قانونی کام کرتے ہیں۔ ان کے فلیٹ پر اکثر و بیشتر نئے چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ بہ ظاہر ان کا ذریعہ معاش کچھ نہیں ہے مگر وہ لوگ پر آسائش زندگی گزارتے ہیں۔"

"ابھی تو صرف وہی دو ہیں' جن کا تعاقب کرتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔" اتاکا نے بتایا۔ "انھوں نے میرے سامنے فلیٹ کا تالا کھولا تھا۔"

"ٹھیک ہے' آؤ میرے ساتھ میں نے اچانک اوپر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اتاکا نے حیرت سے مجھے دیکھا' کچھ کہنے کی کوشش کی پھر ارادہ ترک کر دیا' وہ اگر مجھے روکنے کی کوشش کرتا تو میں اسے اسی وقت واپس بھیج دیتا۔ وہ میرا مددگار تھا' مشیر نہیں۔

ہم تینوں تیزی سے بلڈنگ میں داخل ہوئے۔ اتاکا نے بتایا کہ یہاں لفٹ نہیں ہے۔ ہم زینوں کی طرف بڑھ گئے۔ مجھے برڈ کی فکر تھی کہ ممکن ہے وہ تھرڈ فلور تک چڑھنے کی مشقت برداشت نہ کر سکے۔ لیکن اسے دیکھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ وہ ایسا چاق و چوبند تھا۔ جیسے کبھی زخمی ہوا ہی نہ ہو۔ یہ اس بوڑھے چینی کی جادو اثر دوا کا کمال تھا یا پھر برڈ کی قوت ارادی۔ بہرحال یہ بات میرے لیے خوش آئند تھی۔

دو منٹ سے بھی کم عرصے میں ہم مطلوبہ فلیٹ تک جا پہنچے۔ میں نے جیب کے اندر ریوالور پر گرفت مضبوط کی اور اتاکا کو دستک دینے کا اشارہ کیا۔ اتاکا بھی ایک دم مستعد اور چوکنا نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی وہی تاثر تھا جو کسی شکار پر حملے سے قبل ہوتا ہے۔

اس نے آگے بڑھ کے دروازے پر دستک دی کیونکہ کال بیل کا بٹن موجود نہیں تھا۔ اندر سے کچھ آہٹیں ابھریں' پھر دروازہ کھل گیا۔ میں اور برڈ پیچھے تھے۔ آنے والا سفید فام تھا مگر وہ نہیں تھا جسے دیکھ کر میں چونکا تھا۔ اس نے الجھن آمیز لہجے میں اتاکا سے پوچھا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"تم سے اور تمھارے ساتھی سے کچھ گفتگو کرنا ہے۔" اتاکا کا لہجہ سرد تھا۔

"ہم لوگ فالتو نہیں بیٹھے ہیں۔" سفید فام نے ناگواری سے کہا اور دروازہ بند کرنا چاہا مگر اتاکا نے درمیان میں اپنا پاؤں اڑا دیا اور سفید فام کو پیچھے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

"یہ --- یہ سب کیا ہے؟" سفید فام دہاڑا۔ "کون ہو تم؟"

"خاموش رہو۔" اتاکا نے سرد لہجے میں کہا اور ریوالور نکال لیا۔ "اب آواز نکلی تو پھر کبھی بولنے کے قابل نہ رہو گے۔"

میں اور برڈ پھرتی سے اندر داخل ہوئے اور دروازہ بولٹ کر دیا۔ اپنے ساتھی کی آواز سن کر وہ شخص بھی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا جس کا تعاقب کرتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ اس نے بے یقینی سے اس منظر کو دیکھا' پھر اچانک جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا مگر برڈ کی آواز سن

کر ساکت ہوگیا۔ ”اپنی جگہ سے ملنے کی کوشش مت کرنا ورنہ کھوپڑی اڑادوں گا۔“ برڈ کے سفاک لہجے اور ماؤزر نے ان کا حوصلہ پست کر دیا اور اس نے غیر شعوری طور پر ہاتھ اٹھا لیے۔

انھیں اندر لے چلو“ میں نے کہا۔

اتاکا اور برڈ ان دونوں کو دھکیلتے ہوئے اندر والے کمرے میں آگئے۔ وہ کمرا ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہاں ایک صوفہ سیٹ' چند کرسیاں اور ایک سینٹرل ٹیبل تھی۔ ٹیبل پر شراب کی آدھی بوتل اور دو گلاس رکھے تھے جو تقریباً“ آدھے تھے۔ وہ لوگ شراب سے شغل کر رہے تھے۔ میز پر ہولسٹر سمیت پوائنٹ فور فائیو کا ایک ریوالور بھی موجود تھا۔ ریوالور کی نال پر سائیلسر بھی فٹ تھا۔ شاید وہ لوگ کہیں جانے کا ارادہ رکھتے تھے کیوں کہ ابھی تک پورے لباس میں تھے۔

کمرے میں پہنچ کر اس سفید فام نے اتاکا سے پوچھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ ”آخر تم لوگ ہم سے چاہتے کیا ہو؟“

”میں نے کہا ناکہ خاموش رہو۔“ اتاکا نے بائیں ہاتھ سے اس کے منہ پر اتنا زور دار تھپڑ مارا کہ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور منہ سے خون رسنے لگا۔

”کیا نام ہے تمھارا؟“ میں نے اس آدمی سے پوچھا جو برڈ کے قبضے میں تھا۔

”مارٹن۔“ اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

”تم پاکستان کیوں گئے تھے؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے د لہجے میں پوچھا۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

”دیکھو جھوٹ بولو گے تو سراسر نقصان میں رہو گے۔ بہتر یہی ہے کہ جو کچھ پوچھا جائے سچ سچ بتا دو۔ میں تمھاری جان نہیں لوں گا لیکن اگر تم جھوٹ بولے تو تمہیں زندگی بھر کے لیے معذور کردوں گا۔ پھر تمھاری بقیہ عمر اپاہجوں کی طرح وھیل چیئر پر گزرے گی۔“

وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ پھر وہ تھوک نگل کر بولا۔ ”پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”پاکستان کیوں گئے تھے؟“ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

”وہاں کے لیے کسی نے میری خدمات حاصل کی تھیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مگر ا کا نام مت پوچھنا کیوں کہ میں نام نہیں بتا پاؤں گا۔ مجھے علم ہی نہیں ہے تو کیا بتاؤں گا۔“

”تمھاری خدمات حاصل کی تھیں!“ میں نے حیرت سے دہرایا۔ ”تم ہو کیا جو تمھار خدمات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔“

”میرے سوال پر وہ یوں مسکرایا جیسے کسی بچے نے محمد علی کلے سے پوچھ لیا ہو کہ تمھ باکسنگ آتی ہے یا نہیں۔ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”تم شاید اس فیلڈ میں نئے ہو' اسی لیے ا سوال کر رہے ہو یا پھر میرے اس نام سے واقف نہیں ہو جس سے میں انڈر گراؤنڈ د

میں مشہور ہوں ورنہ ایسا احمقانہ سوال کبھی نہ کرتے۔" اس کا اعتماد آہستہ آہستہ لوٹ رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کے اس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ چٹاخ کی آواز گراؤنڈ فلور تک پہنچ گئی ہوگی۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں نے تمھارا نام پوچھا ہے۔ پیدائشی نام نہیں بلکہ وہ نام جس سے تم پہچانے جاتے ہو۔ تم نے الٹا مجھے مرعوب کرنا شروع کر دیا۔ میں اس فیلڈ میں نیا ہوں یا پرانا یہ تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔ اپنا نام بتاؤ۔"

"زیر زمین دنیا میں بابی کے نام سے مشہور ہوں میں۔" اس نے یوں اپنا نام بتایا جیسے وہ صدر نکسن ہو۔

برڈ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ آناکا بھی اس کا نام سن کر چونک اٹھا تھا۔ ان دونوں کے چونکنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی کوئی نہ کوئی اہمیت ضرور ہے۔

"پاکستان کیوں گئے تھے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"تمھاری خدمات حاصل کی گئی تھیں۔" میں نے جملہ پورا کر دیا۔ "میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ کس سلسلے میں تمھاری خدمات حاصل کی گئی تھیں؟"

"کچھ" "چیزیں وہاں سے لے کر آنا تھیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "میں قفل شکنی سے لے کر ہائی جیکنگ تک ہر کام کر سکتا ہوں۔" "وہ" "چیزیں لے آئے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں بتاؤں گا۔" اس نے پھر اطمینان سے کہا۔

"تم نہیں بتاؤ گے!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے تم بہت بڑے طرم خان ہو، گینگسٹر اور ہائی جیکر ہو مگر میں پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہوں۔ تم شاید مجھے نہیں جانتے!"

"میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس کے اطمینان میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔" کوشش کر دیکھو میری زبان کھلوانے کی۔ جتنا بتایا تھا' میں نے خود ہی بتا دیا۔ تمھارے سامنے پتھر ضرور بول پڑتے ہوں گے مگر میرا نام بوبی ہے۔ میں پتھر نہیں بلکہ فولاد ہوں۔"

"یہ ہمارا وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہا ہے مسٹر شہباز!" آناکا نے کہا۔ "اسے آپ میرے حوالے کردیں۔ میں اس کی زبان کھلوا لوں گا۔" اس نے بڑھ کر میز پر رکھا ہوا لمبی نال والا ریوالور اٹھا لیا۔ "اپنی مت کا بندوبست بھی ان لوگوں نے خود ہی کر رکھا ہے۔ میں اپنے ریوالور پر سائلنسر لگانا بھول گیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ریوالور بوبی کے پیٹ سے لگا دیا۔ "جواب دو گے یا یہ ریوالور تمھارے پیٹ پہ خالی کردوں؟"

اس نے بے پروائی سے کہا۔ "بوبی موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے مار کر میری لاش سے جو

چاہو پوچھ لیتا۔" اس نے یوں کہا جیسے ہماری بے بسی سے لطیف اندوز ہو رہا ہو۔

اناکا نے اچانک ریوالور کا دستہ اس کے سر پہ دے مارا۔ بوبی نے سر جھٹک کر ضرب کے اثر کو کم کرنا چاہا' پھر وہ آگے پیچھے جھولا اور زمین پہ گرنے لگا مگر برڈ نے اسے گرنے سے پہلے ہی سنبھال لیا۔ بوبی کا دوسرا ساتھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر ہم لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا تو باس تم لوگوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ہم کسی معمولی آدمی کے لیے کام نہیں کر رہے ہیں۔"

"اسے سنبھالو برڈ۔" اناکا نے برڈ سے کہا' پھر لالی کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر یوں پکڑ لیا جیسے وہ بیمار ہوا خود اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہ ہو۔" ان دونوں کو یہاں سے لے چلو۔ یہاں ان سے پوچھ کچھ کرنا مناسب نہیں ہے۔"

میں نے بھی مناسب یہی سمجھا کہ انھیں یہاں سے اپنے ٹھکانے پر لے جائیں۔ میں نے بوبی کے ساتھی سے کہا کہ اسے دوسری طرف سے سہارا دو۔ یوں ہم اس کے ساتھی کو اپنے ریوالور کی زد میں بھی رکھتے اور بلڈنگ والوں میں سے کوئی دیکھتا تو اسے شبہ بھی نہ ہوتا۔ میں نے بوبی کے ساتھی کو بھی ہدایت کر دی کہ کوئی پوچھے اس سے یہی کہنا کہ میرا ساتھی سیڑھیوں سے گر کے زخمی ہو گیا ہے۔ اسے ہاسپٹل لے جارہا ہوں۔

بوبی واقعی زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اناکا نے کچھ زیادہ زور سے وار کر دیا تھا۔

ہم نے بہ مشکل بوبی کو سیڑھیوں سے نیچے اتارا۔ اس دوران میں کئی لوگوں سے سامنا ہوا تو بوبی کے ساتھی نے انھیں وہی جواب دیا جو میں اسے بتا چکا تھا۔ نیچے پہنچ کر اناکا کی جگہ برڈ نے سنبھالی اور اناکا تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس نے پھرتی سے گاڑی کا رخ موڑ اور اسے بلڈنگ کے سامنے کھڑا کر دیا۔ برڈ نے پہلے بوبی کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ٹھونسا' پھر اس کے ساتھی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ خود پیچھے ہی بیٹھ گیا۔ میں اناکا کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا اور فوراً ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ہم ان لوگوں کو اغوا کر رہے ہیں۔

○

کھلی سڑک پر آتے ہی اناکا نے گاڑی کی رفتار خوف ناک حد تک بڑھا دی اور مجھ سے کہا کہ احتیاط کے طور پر پیچھے کا دھیان رکھو۔ ممکن ہے ان کا کوئی ساتھی آس پاس موجود ہو اور اب ہمارا تعاقب کر رہا ہو۔ میں نے گھوم کر پیچھے دیکھا ہمارے پیچھے کئی گاڑیاں تھیں مگر یہ کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود میں وقفے وقفے سے پیچھے دیکھتا رہا۔

"اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔" اناکا نے برڈ سے کہا۔ اس کا اشارہ بوبی کے ساتھی کی طرف تھا۔

"تم لوگوں کو پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔" برڈ نے رومال سے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی تو وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"فکر مت کرو۔" برڈ نے ہنس کر کہا۔ "ہمیں پچھتانے کا موقع نہ ملے مگر تمہیں ہم یہ مواقع ضرور فراہم کریں گے۔"

"کیا تم وہیں جا رہے ہو؟" میں نے اناکا سے پوچھا۔

"شہر میں ہمارے کئی ٹھکانے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے ایک مخصوص ٹھکانا ہے۔ میں دیکھوں گا کہ یہ کب تک زبان نہیں کھولتا۔"

میں نے کلائی کی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم جب سے ہانگ کانگ پہنچے تھے' اسی وقت سے بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔ سکون کا وقفہ بھی وہی تھا جو ہم نے ہوٹل میں کافی پیتے ہوئے گزارا تھا۔

تقریباً" ایک گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد اناکا نے گاڑی روک دی۔ اس علاقے میں کثیر المنزلہ عمارتوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے بنگلے بھی بنے ہوئے تھے۔ انھی میں سے ایک بنگلے کے سامنے اناکا نے گاڑی روکی تھی۔ اس نے ہارن بجایا تو فوراً" ہی گیٹ کھل گیا۔ پورچ میں نیلی روشنی کا بلب لگا ہوا تھا مگر مجھے وہاں کھڑے ہوئے دو آدمی صاف نظر آ رہے تھے۔ اناکا نے اترتے ہوئے ان سے کہا۔ "گاڑی میں دو مہمان" ہیں۔ انھیں مہمان خانے میں پہنچا دو۔"

ان دو آدمیوں کو قریب سے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ ان دونوں کا تعلق یا تو پاکستان سے تھا یا بھارت سے۔ انھوں نے بھی مجھے غور سے دیکھا' پھر گاڑی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ برڈ پہلے ہی اتر چکا تھا۔ انھوں نے بوبی اور اس کے ساتھی کو کھینچ کر گاڑی سے باہر نکالا اور بوبی کو بے دردی سے فرش پر بوری کی طرح پھینک دیا۔ انھیں شاید اندازہ نہیں تھا کہ ایک "مہمان" بے ہوش ہے۔ اناکا کے گھورنے پر ان میں سے ایک نے جلدی سے بوبی کو کندھے پر اٹھا لیا اور ہانپتا ہوا اندر کی طرف بڑھا کیوں کہ بوبی کا وزن کسی بھی طرح ڈھائی سو پونڈ سے کم نہ ہوگا۔ اس کا قد مجھ سے بھی شاید دو انچ زیادہ تھا۔

وہ ان دونوں کو اندر لے گئے تو اناکا نے مجھ سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم لوگ پہلے کھانا کھالیں۔ مجھے تو شدید بھوک لگ رہی ہے؟"

بھوک تو مجھے بھی لگ رہی تھی اس لیے میں نے اس کے خیال کی تائید کی۔ اناکا نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود بنگلے کے اندرونی حصے میں غائب ہوگیا۔ میں نے برڈ سے پوچھا۔ "تم بوبی کو جانتے ہو؟ اس کا نام سن کر تم بری طرح چونکے تھے۔"

"ہاں میں نے اس کا نام سنا ہے۔" برڈ نے کہا۔ بوبی یوں تو جرمن ہے مگر اس کی زندگی امریکا میں گزری ہے۔ لاس اینجلس کے کئی کاسینوز میں اس کا حصہ تھا۔ وہ بین الاقوامی دہشت گرد ہے اور ہر قسم کا کام کر سکتا ہے۔ اس نے امریکا کے کئی جہاز ہائی جیک کر کے کیوبا پہنچائے ہیں۔ دنیا کے بڑے سے بڑے سیف کو منٹوں میں کھول سکتا ہے' کرائے پر قتل بھی کرتا ہے' اور ایک خوف ناک سینڈ یکیسٹ کا رکن بھی ہے۔ اناکا نے بروقت اسے بے ہوش کرنے کا فیصلہ کر لیا ورنہ وہ یوں آسانی سے قابو میں نہ آتا۔"

"ارے یار' تم نے تو اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "لگتا ہے تم بھی اس سے مرعوب ہو!"

مرعوب تو خیر میں نہیں ہوں مگر اس کی تعریف بھی نہیں کر رہا ہوں بلکہ حقیقت بتا رہا ہوں۔ وہ مشکل ہی سے زبان کھولے گا۔ ممکن ہے اسی چکر میں تمھارے ہاتھوں مارا جائے۔"

"خیر' دیکھا جائے گا۔" میں نے صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا۔ "اس کے ساتھی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ شاید کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش ہے۔ وہ تو ایک منٹ میں زبان کھول دے گا مگر مجھے یقین ہے کہ اسے کام کی کوئی بات معلوم ہی نہیں ہو گی۔" اس دوران میں اناکا کھانے کی ٹرالی لے کر آ گیا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "اس بنگلے میں چوکیدار کے علاوہ صرف وہی دونوں آدمی ہیں۔ میں نے انہیں بوبی کے سر پر مسلط کر دیا ہے۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش نہیں ہے بلکہ ۔۔"

"بین الاقوامی دہشت گرد ہے۔" میں نے ہنس کر اس کا جملہ پورا کر دیا۔ "ابھی برڈ بھی یہی بتا رہا تھا۔ اس کی تعریفیں چھوڑو' پہلے کھانا کھا لو' مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے۔"

○

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کافی کا دور چلا۔ پھر ہم لوگ تہ خانے کی طرف چلے جسے اناکا مہمان خانہ کہہ رہا تھا۔ وہ تہ خانہ خاصا کشادہ تھا' کسی گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اناکا نے مجھے بتایا تھا کہ یہ تہ خانہ نہ صرف ایئر کنڈیشنڈ ہے بلکہ ساؤنڈ پروف بھی ہے۔ یہاں اگر کسی کو ذبح بھی کر دیا جائے تو آس پاس والوں کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ بوبی اور اس کا ساتھی آہنی کرسیوں پر بندھے بیٹھے تھے۔ اناکا کے دونوں آدمی ان کے سروں پر موت کے فرشتوں کی طرح مسلط تھے۔ بوبی تو مطمئن تھا' البتہ اس کے ساتھی کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔

"یہ کرسیاں فرش میں فکس ہیں اور بہ وقت ضرورت ان میں کرنٹ بھی دوڑایا جا سکتا

ہے۔ "اناکا مجھ سے زیادہ یہ باتیں قیدیوں کو سنا رہا تھا۔ "کرسیوں کے پائے مضبوط لکڑی کے ہیں، اس کے علاوہ فرش پر قالین کے علاوہ ربڑ کا دبیز انڈر لے ہے اس لئے کمرے میں موجود دوسرے افراد اس الیکٹرک کرنٹ سے محفوظ رہیں گے۔ میرا خیال ہے ابتدا اس خرگوش سے کی جائے" اناکا نے بوبی کے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ اس تہ خانے میں ان کرسیوں کے علاوہ تین آہنی کرسیاں اور تھیں، دیوار کے نزدیک ایک صوفہ سیٹ اور کئی آرام دہ کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بوبی کے سہمے ہوئے ساتھی کے سامنے جا پہنچا مجھے دیکھ کر وہ مزید خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا "دیکھو مسٹر! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تم یوں بھی غیراہم آدمی ہو اس لئے میں تم پر زیادہ وقت ضائع نہیں کروں گا۔ بہتر یہی ہے کہ جو کچھ تمہیں معلوم ہو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مجھے بتا دو تو شاید بچ جاؤ ورنہ یہاں آنے کے بعد بہت کم خوش نصیب ایسے ہیں جو زندہ واپس گئے ہیں۔" میں نے اسے مزید دہشت زدہ کرنے کو کہا میں نے دیکھا میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی تھی۔ "بتاؤ، تم کس کے لئے کام کر رہے ہو؟"

"مم --- میں --- اسے جانتا --- نہیں ہوں --- بس ---"

"میں تم سے اس کا شجرہ نہیں پوچھ رہا ہوں بلکہ نام پوچھ رہا ہوں"

وہ بہت بڑا آدمی ہے۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ کسی حکومت کے لئے کام کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم میرا قیمہ بھی کر دو گے تو میں کچھ بتا نہیں سکوں گا۔" وہ تھوک نگل کر بولا اس کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ میں نے پوچھا۔ "بوبی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "میں تو یہاں کے ایک نائٹ کلب کا ملازم ہوں۔ میرے ایک دوست نے مجھے بوبی سے متعارف کرایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ بوبی کو جزوقتی طور پر ایک نشانے باز کی ضرورت ہے۔ بوبی نے بھاری معاوضے پر مجھے ملازم رکھ لیا۔"

"کلب کی ملازمت سے نشانے بازی کا کیا تعلق ہے؟"

میں نے جرح کرنے والے انداز میں پوچھا۔

"میں امریکی ہوں اور ویت نام کی جنگ میں حصہ لے چکا ہوں۔ نشانے بازی کی مشق میں نے فوجی ملازمت کے دوران میں کی تھی۔" اس نے جلدی سے کہا! میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور گرج کر بولا۔ "سچ سچ بتاؤ بوبی نے تمہیں اپنے ساتھ کیوں رکھا ہے؟ اس کی وجہ محض نشانے بازی نہیں ہو سکتی۔"

"میں --- ایئرفورس میں تھا اور --- پیشہ ور پائلٹ ہوں" وہ شکستہ لہجے میں بولا"۔

"گڈ!" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب تم سچ بول رہے ہو۔ تم یہاں ہانگ کانگ میں کب

سے ہو۔ یہ مت کہنا کہ نائٹ کلب میں ملازمت کر رہے ہو۔"
میں گذشتہ ہفتے سے ہانگ کانگ میں ہوں۔ بوبی نے پاکستان سے مجھے ٹیلی گرام دے کر یہاں پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ شاید مجھے وہ ایک روز میں کوئی طیارہ اڑانا پڑے گا۔"
"اس بوڑھے چینی کے پاس کیوں گئے تھے؟"
"کئی دن سے میرے پیٹ میں شدید درد ہے۔ درد اچانک ہی اٹھا ہے۔ بوبی کو فکر تھی کہ کہیں عین موقع پر درد نہ اٹھے اس لئے کسی کے بتانے پر وہ مجھے اس وچ ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ جب سے میں نے اس کی دوا پی ہے' مجھے درد محسوس نہیں ہوا۔""
آ اکا کے دونوں آدمی بھی وہیں موجود تھے۔ میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "اسے اوپر لے جاؤ اور وہاں ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دو اگر یہ شور کرے تو بے دھڑک اسے ذبح کر دینا۔"
میں نے یہ جملہ اردو میں ادا کیا تھا۔ میں اپنے اندازے کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ ان دونوں کا تعلق برصغیر سے ہے یا یہ میرا وہم ہے۔ وہ دونوں میری بات سن کر مسکرائے' پھر ان میں سے ایک بولا۔ ہمارا بھی اندازہ یہی تھا کہ آپ کا تعلق پاکستان سے ہے۔"
"کیا تم لوگ پاکستانی ہو؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔"
"ہم دونوں کا تعلق بھارت سے ہے۔"
"ٹھیک ہے اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ تم اس "مہمان کو اوپر لے جاؤ۔ میں ذرا "مہمان خصوصی" کی خبر لے لوں۔ "میں نے بوبی کی طرف اشارہ کیا۔ مہمان دونوں کے جانے کے بعد میں بوبی کی طرف بڑھا۔ اس نے بے نیازی سے مجھے دیکھا' پھر بولا۔ "ممکن ہو تو مجھے ایک سگریٹ پلا دو۔"
برڈ نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔
بوبی نے طویل کش لیا اور نیم وا نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سگریٹ اس کے ہونٹوں سے نکال لی تاکہ وہ بولنے میں پریشانی محسوس نہ کرے۔ "ہاں اب بولو' تم کس کے لئے کام کر رہے ہوں؟" میں نے پوچھا۔
"اپنے پیٹ کے لئے۔" وہ مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔
میں نے جلتی ہوئی سگریٹ اس کی گردن پر مسل دی۔ اس کے منہ سے سسکاری سی نکلی مگر اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔ میں نے پھر پوچھا "بتاؤ تم کس کے لئے کام کر رہے ہو؟"
جواب میں وہ خالی خالی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔
"ہینگ راڈ لاؤ۔" میں نے چیخ کر آ اکا سے کہا۔
وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور تہ خانے میں موجود ایک دیوار گیر الماری سے ہینگ راڈ

نکال لی۔ وہ عام قسم کی راڈ تھی جیسی عموماً پانی گرم کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اناکا نے اس کا پلگ شوئچ بورڈ میں لگا کر سوئچ آن کر دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ راڈ انگارے کی طرح سرخ ہو گئی۔

میں نے پلگ نکال کر راڈ کا ہینڈل پکڑا اور بوبی کی آنکھوں کے سامنے وہ راڈ لہرا کر بولا۔ "اب بھی بتا دو ورنہ تمہاری چربی تک بہہ جائے گی۔"

جواب دینے کی بجائے اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

میں نے اچانک وہ راڈ اس کے سینے کے کھلے حصے پر لگا دی۔ بال اور گوشت جلنے کی بو کمرے میں پھیل گئی مگر مجھے بوبی کی قوت برداشت پر شدید حیرت ہوئی۔ اس نے چیخ روکنے کے لئے اتنی سختی سے ہونٹ بھینچے تھے کہ اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ مجھ پر بھی اس وقت جنون سوار ہو گیا تھا۔ میں نے راڈ سینے سے ہٹا کر ایک دم اس کی گردن پر رگڑ دی۔ گردن کی نازک جلد جلی تو وہ اپنی بے ساختہ قسم کی چیخ کہ نہ روک سکا۔ میں نے وہ راڈ ایک مرتبہ پھر اناکا کے حوالے کر دی کہ اسے دوبارہ گرم کرو۔ بوبی کے سینے کا گوشت بری طرح جھلس گیا تھا' چربی تک پگھل گئی تھی اور سینے پر دائرہ سا بن گیا تھا اس کی گردن کا بھی یہی حال تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون بہہ رہا تھا اس کے باوجود وہ ہوش میں تھا۔ راڈ ایک مرتبہ پھر سرخ ہو چکی تھی۔ میں نے اس کا ہینڈل پکڑا اور بوبی سے کہا۔ "اس مرتبہ یہ راڈ میں تمہاری آنکھوں میں لگاؤں گا۔ زبان کھولو گے یا زندگی بھر اندھی آنکھیں لئے بھٹکتے رہو گے؟ اندھوں کو کوئی بھی قبول نہیں کرتا۔ تمہارا باس بھی تمہیں راستے کے پتھر کی طرح ٹھوکر مار دے گا۔ بتاتے ہو یا۔۔"

"بکواس بند کرو۔" بوبی وحشت زدہ لہجے میں دہاڑا۔ "تمہیں جو کچھ کرنا ہے' کر ڈالو۔ تم میرے ٹکڑے بھی کر دو گے تو میری زبان نہیں کھلے گی۔ یہ باس سے وفاداری نہیں بلکہ میری انا کا سوال ہے۔ میں زندگی بھر بغیر آنکھوں کے جی لوں گا مگر زبان نہیں کھولوں گا اور کیا معلوم میری زندگی کتنی ہے۔ ممکن ہے میری موت تمہارے ہی ہاتھوں لکھی ہو۔" وہ رک کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس دوران میں راڈ کی سرخی غائب ہو چکی تھی۔ میں نے وہ راڈ ایک مرتبہ پھر اناکا کے حوالے کر دی۔ بوبی تلخ لہجے میں بولا۔ "بندھے ہوئے شیر پر مریل کتے بھی غرانے لگتے ہیں۔ تم اگر اتنے ہی جی دار ہو تو مجھے کھول دو۔ اگر تم نے مجھے زیر کر لیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے' تفصیل سے تمہیں بتا دوں گا لیکن اگر مجھے زیر نہ کر سکے تو وعدہ کرو کہ مجھے یہاں سے جانے دو گے۔"" اس نے عجیب صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اناکا نے اشارے سے مجھے منع کیا' برڈ بھی نفی میں گردن ہلا رہا تھا ان کے انکار سے میری کھوپڑی بالکل الٹ گئی۔ آخر وہ کیا چیز تھا جو بہ قول شواکی کے اناکا ایسا خوفناک فائٹر جو بیس آدمیوں پر بھاری تھا' وہ بھی انکار کر رہا تھا اور برڈ بھی! اناکا کو تو

اندازہ نہیں تھا مگر برڈ تو مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ کیا اس کا بھی یہی خیال تھا کہ بوبی مجھے توڑ پھوڑ دے گا۔ میں نے لمحوں میں فیصلہ کر لیا اور بوبی سے کہا۔ "مجھے منظور ہے مگر بعد میں اپنے وعدے سے پھر مت جانا۔"

"یہی بات میں تم سے بھی کہوں گا' اپنے ساتھیوں کو ہدایت کردو کہ وہ تمہارے وعدے کو نبھائیں۔ تم تو شاید اس پوزیشن میں نہیں ہو گے کہ کوئی بھی وعدہ نبھا سکو۔"

وہ دوسرے لفظوں میں مجھے یہ باور کرانا چاہ رہا تھا کہ اس مقابلے کے بعد میں زندہ نہیں رہوں گا۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میرے ساتھیوں میں سے کوئی دخل اندازی نہیں کرے گا۔" پھر میں برڈ کی طرف مڑا۔ "اگر میں اس مقابلے میں ہلاک ہو جاؤں تو تم بوبی کو یہاں سے جانے دینا۔" اسے کھول دو۔ "آخری جملہ میں نے اتاکا کو مخاطب کر کے کہا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو خرم! برڈ نے اضطرابی کیفیت میں میرا اصلی نام لے لیا۔

"خرم!" بوبی نے چونک کر کہا۔ "وانگ یو کا آئرن مین۔ تمہارا نام تو بہت سنا تھا مگر دیکھا پہلی مرتبہ ہے' تم سے مقابلہ کر کے مجھے افسوس نہیں ہو گا۔ اگر مروں گا تو کسی عام آدمی کے ہاتھوں نہیں مروں گا۔"

"مسٹر برڈ!" اتاکا نے کہا۔ تم گواہ رہنا کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں' اپنی مرضی سے کر رہے ہیں۔ باس تو مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے گا۔"

"اچھا اب اسے کھول دو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا

"کیا بات ہے خرم!" بوبی ہنس کر بولا۔ "تمہارے ساتھی تمہاری طرف سے بہت مایوس ہیں۔"

"اس کا فیصلہ ابھی ہو جائے گا کہ کون مایوس ہے۔"

میری ہدایت پر اتاکا نے اسے کھول دیا تھا۔ مجھے بوبی کی قوت برداشت پر حیرت تھی۔ اس کا سر زخمی تھا' سینے پر جلنے سے گہرا زخم پڑ گیا تھا' گردن کی چربی تک پگھل گئی تھی مگر وہ یوں بول رہا تھا جیسے اسے ذرہ برابر تکلیف نہ ہو۔

آزاد ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے پھرتی سے اپنی شرٹ اتار پھینکی۔ اس کا فولادی جسم دیکھ کر مجھے رشک آیا اور افسوس بھی ہوا کہ اتنا خوبصورت جسم اب ناکارہ ہو جائے گا۔ میں نے جیکٹ اتارنے کی بجائے اس کی زپ اوپر تک بند کر لی تاکہ جیکٹ کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ بوبی نے مخصوص قسم کی دو تین ایکسرسائز کیں اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ برڈ کے ہاتھ میں جو ریوالور تھا اس کا رخ بوبی کی طرف تھا۔ اتاکا بھی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور ہو گا اور خطرے کی صورت میں وہ فائر کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

بوبی اچھل کر ایک دم میرے سامنے آ گیا۔ وہ قد میں بھی مجھ سے زیادہ تھا اور وزن میں بھی۔ میں ہمیشہ دشمن کو پہل کرنے کا موقع دیتا ہوں۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا اس کے حملے کا انتظار کرتا رہا۔ بوبی بھی شاید میرے حملے کا منتظر تھا۔ جب میں نے اس پر حملہ نہیں کیا تو وہ کچھ مایوس سا ہو گیا۔ میں بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے اچانک لات گھمائی۔ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر وہ گویا ہوا میں اڑتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں بھی اسی تیزی سے پیچھے ہٹا مگر ہٹتے ہٹتے بھی اس کے پیر کا ایک حصہ میری پشت سے ٹکرا گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری پیٹھ میں انگارے بھر گئے ہوں۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ سے اچھلا تو میں بھی اچھل گیا اور اوپر ہی اوپر اس کے منہ پر پوری قوت سے گھونسا مارا۔ وہ دھپ سے قالین پر گرا مگر فوراً" ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

میری نظر اچانک اس کے جوتوں پر پڑی۔ وہ مخصوص قسم کے لانگ شوز تھے۔ ان کی ٹو میں چھوٹے چھوٹے خنجر سے لگے ہوئے تھے۔ کسی طریقے سے وہ خنجر جوتے میں واپس چلے جاتے ہوں گے کیوں کہ اس سے قبل بھی میری نظر اس کے جوتوں پر پڑی تھی۔ اس وقت ان کی ٹو میں خنجر نہیں تھے۔ شاید اس کا خنجر والا جوتا میری پشت پر لگا تھا اور جیکٹ اور شرٹ کو کاٹتا ہوا میری جلد میں پیوست ہو گیا تھا۔ میرے جسم پر اگر وہ دبیز جیکٹ نہ ہوتی تو شاید بہت کاری زخم آتا۔

میں نے غرا کر کہا۔ "لڑنا ہے تو مردوں کی طرح لڑو' اوچھی حرکتیں مت کرو ورنہ میرا کوئی ساتھی تمہیں گولی مار دے گا۔ جوتے اتارو۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس نے پھر اچھل کر مجھ پر حملہ کیا۔ میں اس کی چلائی ہوئی کک سے بچ کر ایک طرف ہٹا اور بجلی کی سی تیزی سے اس کی پشت پر پہنچ گیا۔ اس نے پلٹنے کی کوشش کی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچ لی اور بایاں ہاتھ اس کی کمر کے گرد ڈال دیا۔ دونوں جگہ میری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ کوئی عام آدمی ہوتا تو اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا مگر بلاشبہ بوبی بہت طاقتور تھا۔ اسے قابو کرنے میں مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔ میں نے پشت سے جس کی بھی گردن دبوچی تھی وہ کسی کینچوے کی طرح ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ میں چاہتا تو اس کی گردن پر دباؤ بڑھا کے گردن توڑ سکتا تھا مگر اس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مرنے کے بعد بھلا وہ مجھے کیا بتاتا۔ میں نے اچانک اسے چھوڑ کر سامنے کی طرف دھکا دیا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے اچھل کر اس کی پشت پر فلائنگ کک ماری۔ میں نے کوشش کی تھی کہ ضرب ذرا ہلکی ہی رہے ورنہ اس کی ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ وہ پوری قوت سے سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرا تو میں نے اس کے بال پکڑ کے اس کا سر ایک مرتبہ پھر دیوار سے دے مارا۔ وہ الٹ کر فرش پر گرا۔ میں نے اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا' دوسرے پاؤں سے میں نے اس کا ایک ہاتھ دبا دیا۔ اس کا بایاں

ہاتھ آزاد تھا۔ بوبی نے اسی ہاتھ سے میرا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی مگر میں نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ اذیت سے بری طرح چیخا' پھر ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ میں جانتا تھا کہ اس کا ہاتھ زندگی بھر کے لئے ناکارہ ہو گیا ہے۔ میں نے اس کی گردن سے پاؤں ہٹایا اور گھوم کے اس کے دونوں پاؤں پکڑ لئے۔ میں اس کے پیروں کو بھی وہی مخصوص جھٹکا دینا چاہتا تھا جو اس کے ہاتھوں کو دیا تھا مگر اس نے اشارے سے مجھے روک دیا اور تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ "تم جیت گئے خرم! تم واقعی ناقابل تسخیر ہو۔ وانگ یو نے واقعی تم پر بہت محنت کی ہے۔"

میں اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور اس سے کہا۔ "اٹھ کر صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہاری فرسٹ ایڈ کا بندوبست کرتا ہوں۔" وہ گہرے گہرے سانس لیتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا بایاں ہاتھ بے جان ہو کر پہلو میں جھول رہا تھا۔ وانگ یو نے مجھے جوڑ بٹھانے کا طریقہ بھی سکھایا تھا۔ میں صرف وہی جوڑ بٹھا سکتا تھا جنہیں میں نے ناکارہ کیا ہو۔ مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جوڑ کس انداز سے نکلا ہو گا۔ میں نے اس کا بایاں ہاتھ پکڑا تو تکلیف ہے وہ بلبلا کر رہ گیا۔ میں نے اس کی کلائی اور بازو پکڑ کے کہنی کے جوڑ کو مخصوص جھٹکا دیا۔ وہ بری طرح چیخا اور بولا۔ "اب تو میں اپنی ہار تسلیم کر چکا ہوں خرم! اب ـــ"

"میں تمہارے ہاتھ کو ناکارہ ہونے سے بچا رہا ہوں احمق ـــ" میں نے ہنس کر کہا۔

اس دوران میں اتاکا فرسٹ ایڈ باکس لے آیا اور اس کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ اس کے سینے اور گردن پر اتاکا نے کوئی زرد زرد مرہم لگا دیا' تھوڑی دیر میں بوبی بالکل پرسکون ہو گیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "ہاں' اب بتاؤ' تم کس کے لئے کام کر رہے ہو؟"

"میں نے وعدہ کیا ہے تو ضرور بتاؤں گا۔" وہ تھکے تھکے انداز میں مسکرایا۔ "میں یہ بھی بتاؤں گا کہ وہ مائیکرو فلز اور دستاویزات کس کے قبضے میں ہیں۔"

اچانک تہ خانے کا دروازہ کھولا اور مجھے ریوالور کی نال نظر آئی۔ خطرہ بھانپتے ہی میں صوفے سمیت پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اسی وقت فائر ہوا اور گولی سامنے والی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ میں نے الٹی قلابازی کھائی اور ریوالور کی رینج سے نکل گیا۔ بوبی البتہ ریوالور کی رینج میں تھا۔ برڈ اور اتاکا بھی زمین پر لیٹ گئے تھے۔

اچانک برڈ نے دروازے کی طرف فائر کر دیا۔ اس دوران میں بوبی بھی اچھل کر محفوظ جگہ پر پہنچ گیا۔ فائر کرنے والا دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ باہر اچانک زوردار فائرنگ ہونے لگی۔ باہر اتنی زبردست فائرنگ ہو رہی تھی کہ لگتا تھا گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ میں نے باہر نکلنا چاہا مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ اس وقت باہر نکلنا گویا خودکشی کرنا ہے۔ انجانے میں مجھے اپنوں ہی کی کوئی گولی بھی چاٹ سکتی تھی۔ برڈ اور اتاکا بھی پوری طرح مستعد تھے۔ ان کی نظریں تہ خانے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں' پھر جس طرح اچانک فائرنگ

شروع ہوئی تھی، اسی طرح ختم ہو گئی اور باہر سناٹا چھا گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اب کسی بھی لمحے پولیس آ جائے گی۔ ہم دشمنوں سے تو بچ گئے تھے مگر پولیس ہمیں نہیں بخشے گی۔ برڈ اور اناکا بھی الجھن آمیز انداز میں دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صرف بوبی ایسا تھا جو اس ہنگامے سے بے نیاز سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

اچانک تہ خانے کا دروازہ کھلا تو برڈ اور اناکا دونوں کے ریوالورز کا رخ دروازے کی طرف ہو گیا اور وہ فائر کرنے کے لئے بالکل تیار ہو گئے۔ پھر تہ خانے میں ایک شناسا آواز گونجی۔ "فائر مت کرنا۔ فی الحال خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

دوسرے ہی لمحے انہی دونوں بھاری نوجوانوں میں سے ایک کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ہلکی پھلکی سگ رائفل تھی۔

"فائرنگ میں کوئی مارا تو نہیں گیا ہے؟" اناکا نے پوچھا۔

"تین آدمی مارے گئے ہیں۔" آنے والے نے جواب دیا "آس پاس کے گھروں میں سے کسی نے پولیس کو ٹیلی فون کر دیا ہو گا۔ کسی بھی لمحے پولیس آ سکتی ہے۔"

"احمق آدمی تمہیں باس سے رابطہ کرنا چاہئے تھا۔" اناکا جھنجلا کر بولا۔ "تم سب نکمے ہو گئے ہو۔"

"میں باس کو اطلاع دے چکا ہوں۔ آنے والے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، باس کے آنے سے پہلے ان لاشوں کو وہاں سے ہٹا دو۔" اناکا نے حکم دیا۔

"

"مگر وہ لاشیں تو حملہ آور لے گئے۔"

"یہ اچھا ہوا۔" اناکا مطمئن ہو کے بولا۔ "تم نے کسی کو پہچانا، وہ کون لوگ تھے؟" اناکا نے استفسار طلب نظروں سے اسے دیکھا، پھر وہ چونک کر بولار "وہ قیدی کہاں ہے؟"

"وہ قیدی۔ اسے تو ۔۔ وہ لوگ ۔۔ لے گئے۔" آنے والے نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔"

"شٹ اپ، یو باسٹرڈ!" اناکا دہاڑ کر بولا۔ "تم لوگ بالکل ناکارہ ہو گئے ہو۔ باس تمہاری کھال میں بھس بھر دے گا۔" مارے غصے کے اناکا کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ باس تو بعد میں آئے گا، میں خود ہی تمہاری کھال گرا دوں گا۔" اس نے بھنا کر کہا اور آنے والے کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔

وہ دوسرا تھپڑ مارنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ٹیک اٹ ایزی مسٹر اناکا!" میں نے نرم لہجے میں کہا "اس نے قیدی کو جان بوجھ کر ان کے حوالے نہیں کر دیا۔ یہ تمہارے ساتھ ہوتا تو تم کیا کرتے! کیا باس تمہاری کھالوں میں بھس بھرتا؟"

"مسٹر خرم!" اناکا نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم باس کے مہمان ہو اس لئے تمہارا

خیال رکھنا میرا فرض ہے مگر پلیز میرے کام میں دخل اندازی مت کرو۔ باس نے تمہاری مدد کرنے کی ہدایت کی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ۔۔"

"ختم کرو یار۔ "میں نے بیزاری سے کہا۔ "وہ میرا قیدی تھا اس لئے فکر بھی مجھے ہونا چاہئے اور تم یہ کیوں بھول گئے کہ باس نے یہ بھی کہا تھا کہ تم میرے احکامات کی تعمیل کرو گے!"

"ختم کرو یار۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "وہ میرا قیدی تھا اس لئے فکر بھی مجھے ہونا چاہئے اور تم یہ کیوں بھول گئے کہ باس نے یہ بھی کہا تھا کہ تم میرے احکامات کی تعمیل کرو گے!"

"خرم پلیز!" برڈ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "دماغ ذرا ٹھنڈا رکھو۔ یہ ان لوگوں کے ڈسپلن کا معاملہ ہے اور پھر تم نے ان لوگوں کو ہائر نہیں کیا ہے کہ تم ان سے اس لہجے میں بات کرو۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا' پھر خود ضبط کر کے اپنی زبان روک لی۔ اآکا کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا تھا۔ شاید چینی باس کے آدمیوں میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ وہ اس لہجے کا عادی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بقول اس کے وہ باس کی وجہ سے میرا خیال کر رہا تھا ورنہ اب تک شاید مجھ سے بھڑ گیا ہوتا۔ وہ بھارتی باشندہ سہما ہوا ایک طرف کھڑا تھا گو کہ اس کے ہاتھ میں سگ کی خوفناک رائفل تھی مگر وہ اآکا سے خوف زدہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اس اجنبی سرزمین پر اآکا اور اس کا باس ہی تو میرے مددگار ہیں۔ مجھے ان کا خیال رکھنا چاہئے۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہمارے بہت سے مسائل حل ہو گئے تھے اور آئندہ بھی وہ ہمارے کام آ سکتے تھے۔ یہ سوچ کر میں نے نرم لہجے میں اآکا سے کہا۔ "آئی ایم سوری اآکا! دراصل میرا ذہن اتنا الجھا ہوا ہے کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میری کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔" میں نے مصلحت کے تحت اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

وہ میری اس حرکت سے گویا ڈھیر ہو گیا۔ اس نے تڑپ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور بولا۔ "میرے دوست! مجھے شرمندہ مت کرو۔ معافی مانگنا یا ہاتھ جوڑنا تم جیسے آدمی کو زیب نہیں دیتا۔ ایسے لوگ تو صرف حکم چلانے کے لئے پیدا ہوتے ہیں' معافی مانگنے کو نہیں۔"

"اب تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔ میں ۔۔"

میرا جملہ ادھورا رہ گیا کیوں کہ اوپر سے دوسرا آدمی نیچے آ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ پولیس آ چکی ہے۔ وہ لوگ اس بنگلے کے مالک سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے پولیس انسپکٹر کو ڈرائنگ روم بٹھا دیا ہے۔

"ٹھیک ہے' تم چلو میں آ رہا ہوں۔ مگر ٹھہرو" اآکا نے اسے روک لیا۔ "تم نے انسپکٹر

کو کوئی بیان تو نہیں دیا ہے؟"

"نو سر!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں نے انسپکٹر کو بتایا ہے کہ میں تو خود ابھی پہنچا ہوں۔ میں بھلا کیسے بتا سکتا ہوں کہ یہاں فائرنگ ہوئی تھی اور ہوئی تھی تو کیوں ہوئی تھی۔"

"بات مختصر کیا کرو۔" اناکا اکتا کر بولا۔ "اب تم اوپر جاؤ اور اسے بتانا کہ صاحب سونے کے لئے لیٹ چکا ہے۔ میں اسے بیدار کر کے آیا ہوں۔"

وہ چلا گیا تو اناکا تہ خانے سے ملحق باتھ روم میں چلا گیا اور وہاں سے ہاتھ دھو کر برآمد ہوا۔

"میں اوپر جا رہا ہوں خرم!" اناکا نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ اس وقت تک باس بھی پہنچ گیا ہو گا۔ ہاں' یہ کوئی حرکت کرنے کی کوشش کرے تو کوئی رعایت مت کرنا۔" اس نے جاتے جاتے بوبی کی طرف اشارہ کیا۔

بوبی نے گھور کے اسے دیکھا اور تلخ لہجے میں کہا۔

"مسٹر اناکا میرا نام بوبی ہے اور بوبی جو بات ایک دفعہ کہہ دے اس پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔"

اس دوران میں اناکا تہ خانے سے باہر نکل چکا تھا۔ میں نے بوبی سے کہا۔ "ہاں اب تم بتاؤ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز کہاں ہیں"

"ذرا صبر سے کام لو خرم!" بوبی کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنا بڑا رسک لے رہا ہوں۔ ان لوگوں کو بھنک بھی مل گئی کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" وہ سانس لینے کو رکا پھر بولا۔ "اور انھیں معلوم ہی ہو جائے گا کیوں کہ چند مخصوص لوگوں کے علاوہ یہ بات صرف میں جانتا ہوں۔ یہ تو انھیں معلوم ہی ہے کہ میں تمھارے قبضے میں ہوں۔ انھیں دو اور دو چار کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی۔"

"تم کہنا تو کیا چاہتے ہو" میں الجھ گیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اس نے کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کرلیا ہو اور اب ان باتوں سے مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم پریشان مت ہو۔" بوبی نے ہنس کرکہا۔ "میں نے تمہیں زبان دی ہے تو ضرور بتاؤں گا۔ اب یہ جان رہے یا جائے۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ میں اب زندہ نہیں رہوں گا۔"

"مجھے حیرت ہے بوبی!" میں نے کہا۔ "تم سا مضبوط اور جی دار آدمی ایسی مایوسی کی بات کر رہا ہے۔"

"تمہیں حیرت اس لیے ہے کہ تمہیں اندازہ نہیں ہے اس معاملے میں دنیا کی بڑی طاقتیں ملوث ہیں۔ ان کی خفیہ ایجنسیاں سرگرم عمل ہیں۔ ان کے ایجنٹ اتنے سفاک ہیں کہ اپنے مفاد کے لیے انسانوں کو مکھی کی طرح مار دیتے ہیں۔ تمہیں وانگ یو نے اتنا بے خبر تو نہیں رکھا ہوگا۔ جب دنیا کی سپر پاورز بر سرپیکار ہوں تو ہم جیسے لوگ ان کی نظر میں کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔"

"اتنا اندازہ تو مجھے بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں اندازہ ہوتا تو حیرت نہ کرتے۔ دونوں سپر پاورز کے حلقہ اثر میں جو ملک ہیں ان کی خفیہ ایجنسیاں بھی میدان میں ہیں۔ ان میں سر فہرست بھارت کی "را" اور اسرائیل کی "موساد" ہے۔ ان کی پشت پناہی سی آئی اے کے جی بی کر رہی ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ سینڈیکیٹ ایسے ہیں جیسے پہاڑ کے مقابلے میں گلہری۔"

"ارے یار تم تو کچھ زیادہ ہی مرعوب ہو ان لوگوں سے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"مرعوب نہیں ہوں بلکہ تمہیں حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔" بوبی نے جواب دیا۔ "میں ان سے خوف زدہ ہوتا تو کسی بھی قیمت پر تمہیں کچھ نہ بتاتا۔"

"بات اصل میں یہ ہے مسٹر بوبی۔" میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ لوگ لاکھ طاقتور اور سفاک سہی مگر میں انھیں یوں آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ زیادہ یہ ہو گا کہ میں اس مشن میں کام آجاؤں گا تو ٹھیک ہے" مجھے اس کی پروا بھی نہیں ہے مگر مرنے سے پہلے انھیں اتنا نقصان پہنچا دوں گا کہ وہ برسوں یاد رکھیں گے۔ انھیں اندازہ ہوجائے گا کہ پاکستانی قوم بزدل نہیں ہے اور وہ لوگ تر نوالہ نہیں ہیں۔ آئندہ پاکستان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ لوگ سو مرتبہ سوچیں گے۔ بات آن کی ہو تو ہر پاکستانی ان کے لیے خرم ثابت ہوگا۔"

"ارے یار، تم نے تو لیکچر شروع کر دیا۔" بوبی ہنس کر بولا۔ " تمھارا جذبہ قابل قدر ہے خرم! حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تم کسی لالچ، کسی معاوضے کے بغیر جان دینے کو تیار ہو۔ یہی سوچ اگر ہر پاکستانی کی ہے تو کے جی بی، سی آئی اے، را اور موساد مل کر بھی پاکستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔"

اچانک تہ خانے کا دروازہ کھلا تو میں پھرتی سے پلٹا اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ مجھے گنجے باس کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ نپے تلے قدموں سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ اس نے گہری نظروں سے وہاں کا جائزہ لیا، پھر اس کی نظریں بوبی پر ٹک گئیں۔ وہ چند لمحے تک پلک جھپکائے بغیر بوبی کو گھورتا رہا، پھر میری طرف دیکھے بغیر مجھ سے بولا۔ "میں مان گیا خرم، تم واقعی وانگ یو کے سچے جانشین ہو۔ بوبی جیسے زبردست آدمی کو قابو کرنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ جی خوش کر دیا تم نے۔ اس کارنامے پر تو تم انعام کے مستحق

ہو۔ بولو کیا مانگتے ہو؟" اس نے شاہانہ انداز میں پوچھا۔

"میں جو کچھ مانگوں گا' وہ تم دے نہیں سکو گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میرے بارے میں تم کچھ جانتے نہیں ہو اس لیے ایسی بات کہہ رہے ہو۔ بوبی کو میرے حوالے کرو اور اپنی خواہش بتاؤ۔" باس منہ بنا کر بولا۔ شاید اسے میری بات سخت ناگوار گزری تھی۔

"بوبی کو تمہارے حوالے کردوں!" میں نے الجھ کر پوچھا۔ "کیوں کردوں تمہارے حوالے؟"

"اس لیے کہ یہ ہم سب کا بہت پرانا دشمن ہے۔" باس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"دشمن ہے نہیں بلکہ تھا۔ یہ کبھی تمہارا دشمن!"

"یہ اب بھی ہمارا دشمن ہے۔" باس منہ بنا کر بولا۔ "ہوگا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "تم نے میری خواہش پوچھی ہے نا!" میں نے کہا۔ "تو سنو' وہ دستاویزات اور مائیکرو فلم میرے حوالے کردو۔ بس یہی میری خواہش ہے۔"

"میرے پاس دستاویزات کب ہیں احمق!" باس نے بھنا کر کہا۔

"میں نے کب کہا کہ وہ اشیاء تمہارے پاس ہیں۔ میں تو صرف اپنی خواہش بیان کر رہا ہوں۔ اگر کر سکتے ہو تو پوری کردو۔"

"اوکے اوکے۔" باس نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم میرے مہمان اور میرے دوست کے آدمی ہو ورنہ کس میں جرات ہے کہ شواکی کے آگے زبان کھول سکے۔" پھر وہ خفیف سا مسکرایا۔ "اور میں بہادر آدمیوں کا یوں بھی قدر دان ہوں۔"

"عزت افزائی کا شکریہ!" میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔ "میں بوبی کو ضرور تمہارے حوالے کر دیتا مگر میں اسے زبان دے چکا ہوں اس لیے۔"

"بس ختم کرو۔" باس نے میری بات کاٹ دی۔ "میں نے پولیس کو یہاں سے ٹال دیا ہے۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔ اناکا مدد کے لیے تمہارے ساتھ رہے گا۔ کسی بھی مرحلے پر تمہیں پریشانی نہیں ہوگی۔ جس چیز کی ضرورت ہو' اناکا کو بتا دینا۔" وہ جاتے جاتے مڑا اور کچھ سوچ کر بولا۔ "تمہیں بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیوں کہ بوبی تمہارے ساتھ ہے اور اس کے بڑے اس کے لیے موت کی سزا تجویز کر چکے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت دوسرا حملہ کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ نپے تلے قدم رکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

بوبی کے چہرے پر خوف کی بجائے وحشت آمیز مسکراہٹ تھی۔ اس نے مخصوص انداز میں سر جھٹکا اور تلخ لہجے میں بولا۔ "بوبی تر نوالہ نہیں ہے کہ جو چاہے اسے ہضم کر لے۔ میں خود ان سب کو موت کی سزا سناتا ہوں۔" اس نے ہذیانی انداز میں کہا۔ پھر وہ جھٹکے سے میری طرف مڑا۔ "خرم! آج سے تمہارے دشمن میرے بھی دشمن ہیں۔ میں تمہاری

طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ تم میری بات پر اعتبار تو نہیں کرو گے اور تمہیں کرنا بھی نہیں چاہئے مگر۔۔۔"

"مجھے تم پہ اعتبار ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

وہ لپک کر میرے گلے سے لگ گیا۔ ایسا کرتے ہوئے تکلیف کی شدت سے اس کی سسکاری نکل گئی کیوں کہ سینے کا جلا ہوا [illegible] میری جیکٹ سے رگڑ کھا گیا تھا۔

"اتاکا!" میں نے [illegible] سوچ کر کہا۔ "تم نے بتایا تھا کہ یہاں کے علاوہ تمہارے اور بھی کئی ٹھکانے ہیں!"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔" اتاکا جلدی سے بولا۔ "ہمیں فی الحال یہ ٹھکانا چھوڑ دینا چاہیے۔"

"ان لوگوں سے اتنا بھی خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" بوبی تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"بات خوف زدہ ہونے کی نہیں ہے۔" اتاکا نے منہ بنا کر کہا۔ "بلکہ یہ مصلحت کا تقاضہ ہے۔ ہم ان لوگوں سے خوف زدہ ہو کر کہیں فرار نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ تو جنگی حکمت عملی ہے۔"

○

پھر آدھے گھنٹے سے بھی کم عرصے میں ہم نے وہ ٹھکانا چھوڑ دیا۔ ہمارا نیا ٹھکانا ایک کثیر لمرلہ عمارت کے بیس مینٹ میں تھا۔ یہ جگہ بھی شواکی کی ملکیت تھی۔ اتاکا نے بتایا کہ ایسے نہ جانے کتنے ٹھکانے یہاں موجود ہیں۔ اس جگہ کا علم سوائے اتاکا کے کسی کو بھی نہیں تھا۔ دوسرے دن اتاکا اسی چینی ڈاکٹر سے بوبی کے لیے کوئی مرہم لے آیا۔ مرہم لگتے ہی اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ ذرا سی دیر میں بوبی کی تکلیف میں نمایاں کمی واقع ہوگئی۔ مرہم پہنچانے کے بعد اتاکا کہیں چلا گیا تھا۔ وہ جاتے جاتے مجھے ہدایت کر گیا تھا کہ یہاں سے باہر مت نکلنا۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ فریج کھانے پینے کی اشیاء سے بھرا ہوا تھا۔ اتاکا تو کوئی ملازم بھی بھیجنا چاہتا تھا۔ مگر برڈ نے انکار کر دیا۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ کسی کو بھی ہماری یہاں موجودگی کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ یہاں آکر راز کھلا کہ برڈ کھانا بھی بہت اچھا پکالیتا ہے۔

اتاکا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آج شام شاید نہ آؤں مگر وہ خلاف توقع رات نو بجے کے قریب آگیا' وہ چہرے سے بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا اور مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اسے پریشان دیکھ کر میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے اتاکا! تم کچھ پریشان ہو؟"

"پریشانی تو ہے" اتاکا نے جواب دیا۔ "مگر تم تو خود اتنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہو کہ تمہیں کچھ بتاتے ہوئے بھی شرمندگی ہوتی ہے۔"

"پریشانیاں اور فکریں تو ہر آدمی کے ساتھ لگی ہوئی ہیں اتاکا' ہر شخص کسی نہ کسی پریشانی سے دو چار ہے مگر مجھے تمھاری اس بات سے افسوس ہوا ہے کہ تم مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے۔ اگر تم مجھے دوست سمجھتے تو اپنی الجھن بھی بتاتے۔ آخر تم بھی تو میری مدد کر رہے ہو۔ پھر مجھ سے یہ حق کیوں چھیننا چاہتے ہو؟"

"ارے یار' بات اتنی بڑی بھی نہیں ہے۔" اتاکا نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ "دراصل آج ہمارا لاکھوں روپے کا مال پکڑا گیا ہے۔ مجھے نقصان کی فکر نہیں ہے۔ فکر تو مجھے اس بات کی ہے کہ پولیس میں مخبری کس نے کی ہے۔ مخبر ہماری ہی صفوں میں موجود ہے۔ یہی بات میرے لیے پریشانی کا سبب بن رہی ہے۔"

"اس بات کا کتنے لوگوں کو علم تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے سوا چار آدمیوں کو علم تھا کہ ہمارا مال آ رہا ہے۔" اتاکا نے کہا۔ "مگر وہ چاروں ہی ہماری تنظیم کے اہم آدمی ہیں۔ باس مجھ سے جواب طلب کرے گا کیوں کہ اس مال کی وصولیابی کا ذمے دار میں تھا۔ اسے اب تک مخبری کا علم ہو گیا ہوگا۔ وہ سب سے پہلے اس مخبر کا مطالبہ کرلے گا۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ مخبر ان چاروں ہی میں سے کوئی ہے۔ انھی سے معلوم کرو۔"

"اور مخبر مجھے بتا دے گا کہ میں نے مخبری کی ہے!" اتاکا طنزیہ لہجے میں بولا۔

"اس کا ایک حل اور بھی ہے۔" برڈ پر خیال انداز میں بولا۔ ان میں سے کسی کو ابھی تو معلوم نہیں ہوا ہے کہ بوبی ہمارے ساتھ مل گیا ہے؟"

"نہیں' اس بات کا علم باس کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہے۔" اتاکا نے جواب دیا۔

"تو پھر ان چاروں کو کسی ایک جگہ بلا لو اور ان سے کہو کہ ہم میں سے کسی نے مخبری کی ہے۔ ہمارے دشمنوں کا ایک آدمی اس مخبر کو پہچانتا ہے جو اس وقت قبضے میں ہے۔ ہم میں سے جو بھی غدار ہے وہ رضا کارانہ طور پر سامنے آجائے تو اس کی غلطی کو معاف کر دیا جائے گا ورنہ ان سب کو دشمن کے اس آدمی کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔"

"ویل ڈن مسٹر اتاکا ویل ڈن!" اچانک وہاں شواکی کی آواز گونجی تو ہم سبھی بری طرح اچھل پڑے۔ وہ نہ جانے کب وہاں آگیا تھا۔ یقینی طور پر وہاں داخل ہونے کا کوئی خفیہ راستہ بھی تھا جس کا علم ابھی تک ہمیں بھی نہیں ہوا تھا۔ شواکی اپنے مخصوص انداز میں چلتا ہوا ہمارے سامنے آٹھہرا۔ "تم تو باتیں ہی بناتے رہو گے مگر میں نے غدار کا سراغ بھی لگا لیا ہے۔" شواکی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کیسے باس؟“ اتاکا نے حیرت سے پوچھا۔
”اتاکا! تم جانتے ہو مجھے کیوں‘ اور کیسے‘ قسم کے الفاظ سے نفرت ہے۔ شواکی کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”چلو خرم‘ تم بھی اس غدار کا انجام دیکھ لو۔ میں بڑی سے بڑی غلطی کے معاف کر دیتا ہوں مگر غدار کے لیے میرے پاس کوئی رعایت نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ اتنا سفاک تھا کہ لمحے بھر کو میں بھی خوف زدہ ہوگیا۔

○

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

"بلڈنگ کے باہر شواکی کی لیموزین کار موجود تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اناکا اور برڈ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں اور بوبی' شواکی کے ساتھ پچھلی نشست پر تھے۔ کار مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی چھوٹی سی ایک جیٹی پر جار کی۔ وہاں کئی بوٹس اور اسٹیمرز لنگر انداز تھے۔ شواکی کو دیکھتے ہی ایک درمیانی سائز بوٹ سے ایک آدمی کود کر نیچے اترا اور لپکتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ اس نے سر جھکا کر شواکی کو تعظیم دی اور بوٹ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ اناکا نے آہستہ سے مجھے بتایا کہ یہ بوٹ بھی باس کی ملکیت ہے۔ میں حیرت سے اس لگژری بوٹ کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ڈھیلا ڈھالا اور کاہل سا نظر آنے والا شواکی وہاں کی خاصی اہم شخصیت تھا۔ ہر قدم پر میں اس سے مرعوب ہو رہا تھا۔

بوٹ اندر سے اس سے کہیں زیادہ شاندار تھی جتنی باہر سے نظر آتی تھی۔ ہمارے سوار ہوتے ہی بوٹ کا انجن اسٹارٹ ہوگیا۔ یہ سفر ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں شواکی یوں خاموش بیٹھا رہا جیسے مراقبے میں ہو۔ اناکا بار بار اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے پرائمری اسکول کا کوئی بچہ ہیڈ ماسٹر کو دیکھتا ہے کہ اب کیا سزا ملتی ہے۔ ہم میں کوئی بھی کچھ نہ بولا۔ سبھی اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

○

سفر کے اختتام پر ہم بوٹ سے باہر نکلے تو وہاں چم چم کرتی ایک نسلے کار شواکی کے لیے موجود تھی۔ اس مرتبہ ڈرائیور موجود نہیں تھا۔ البتہ گاڑی کے اگنیشن میں چابی موجود تھی۔ اناکا نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالی لی۔ برڈ حسب سابق اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم لوگ پچھلی سیٹ پر' شواکی نے اناکا کو ہدایت کی کہ تھری کی طرف چلو۔

تھری اور تھری شاید اناکا کے کسی خفیہ ٹھکانے کا نام تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر شواکی ہمیں وہاں کیوں لے جا رہا ہے۔ مجھے یا برڈ کو بھلا اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ ان کے غدار کا کیا انجام ہوتا ہے؟

گاڑی ایک آٹھ منزلہ عمارت کے سامنے رک گئی۔ شواکی گاڑی سے اترا تو بلڈنگ کے چوکیدار نے اسے سر جھکا کر تعظیم دی۔ وہ اس کے سلام کا جواب سر کی جنبش سے دیتا ہوا

لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ہم سب اس سے چند قدم پیچھے چل رہے تھے۔ اس بلڈنگ کا تمرا فلور شاید مکمل طور پر شواکی کے قبضے میں تھا کیوں کہ وہاں داخلی راستے کے پاس شواکی کے مسلح گارڈز موجود تھے۔ ہم جس فلیٹ میں داخل ہوئے اس میں ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں تبدیل کر دیا گیا تھا ورنہ کسی فلیٹ میں اتنا بڑا ڈرائنگ روم نہیں ہوتا۔ فرش پہ وال ٹووال کارپٹ تھا اور دیوار کے ساتھ ساتھ انتہائی نفیس قسم کے صوفے لگے ہوئے تھے۔ ہم وہاں بیٹھے تو ملازم نما ایک شخص مشروبات کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ پھر پینے پلانے کا دور شروع ہوا تو میں نے خود کو انتہائی احمق محسوس کیا۔ وہاں میرے سوا ہر شخص پی رہا تھا۔ اسی دوران میں ملازم ایک مرتبہ پھر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے چینی زبان میں شواکی سے کچھ کہا۔ شواکی نے اثبات میں گردن ہلا کر اسے جواب دیا۔

فوراً ہی ڈرائنگ روم میں چار آدمی داخل ہوئے۔ ان کا تعلق بھی مشرق بعید کے کسی ملک سے تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شواکی نے انھیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا' وہ تھوڑی دیر تک نووارد افراد کو گھورتا رہا' پھر بولا۔ ''تم لوگ جانتے ہو کہ آج میرا لاکھوں روپے کا مال پکڑا گیا ہے؟''

''نہیں باس۔'' ان میں سے ایک حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''یہ کب ہوا ہے؟''

''ابھی کچھ گھنٹے قبل ہی مجھے علم ہوا ہے کہ ہمارا مال پکڑا گیا۔'' پھر اس نے کچھ توقف کے بعد ڈرامائی لہجے میں کہا۔ ''اور غدار تم چاروں میں سے کوئی ایک ہے۔ مجھے خود ہی بتادو کہ تم چاروں میں سے کس نے غداری کی ہے' کس نے پولیس کو اطلاع دی ہے۔'' پھر وہ ایک دم لہجہ بدل کے بولا۔ ''ایک بات ذہن نشین کر لو۔ میرے قبضے میں پولیس کا وہ ٹاؤٹ بھی ہے۔'' شواکی نے خاموش ہو کے چند لمحے تک ان کا جائزہ لیا' پھر اچانک ریوالور جیب سے نکالا اور اسے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ ''تم میں سے جو بھی غدار ہے' وہ یہ ریوالور اٹھائے اور اپنے ہاتھوں سے اپنے ناپاک وجود کا خاتمہ کردے۔ میں اس کے گندے خون سے اپنا ہاتھ بھی رنگنا نہیں چاہتا۔ میں پانچ تک گنوں گا۔ اس عرصے میں اگر غدار سامنے نہ آیا تو میں مجبوراً اسے خود شوٹ کردوں گا۔ ہری اپ ---- ون ---- ٹو ----- تھری---''

ان چاروں میں سے ایک تڑپ کر آگے بڑھا اور شواکی کے قدموں میں گر گیا۔ ''مجھے معاف کردو باس! میں نے غداری نہیں کی ہے بلکہ مجھے اس پر مجبور کر دیا گیا تھا باس --- انھوں نے میرے بچوں کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میں مجبور ہو گیا تھا باس!''

شواکی نے اس کی پسلیوں میں زوردار لات ماری وہ کتے کے پلے کی طرح اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔

''کھڑا ہو جا۔'' شواکی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''بیوی بچے تنظیم سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔'' پھر شواکی نے اچانک میز پر رکھا ہوا ریوالور اٹھایا اور اس پر فائر کر دیا۔ گولی اس کی

پیشانی کے وسط میں پیوست ہوئی اور کھوپڑی توڑتی ہوئی پیچھے سے نکل گئی۔ گولی کھا کے وہ دھڑام سے فرش پر آ رہا۔ چند لمحوں پہلے وہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ اب ٹوٹے ہوئے کسی کھلونے کی طرح زمین پر پڑا تھا اور اس کا خون دبیز قالین میں جذب ہو رہا تھا۔ اچانک شواکی کی طرف سے میرے پورے وجود میں نفرت کی ایک لہر دوڑی مگر میں نے بہ مشکل تمام خود کو کچھ بولنے سے باز رکھا۔ برڈ بھی حیرت سے مرنے والے کی لاش کو گھور رہا تھا۔ بوبی کا چہرہ البتہ بالکل سپاٹ تھا۔ یہی کیفیت اتاکا کی بھی تھی۔ مجھے شواکی کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ شخص جس نے اپنی زندگی کے بہترین برس اس کی خدمت میں گزار دیے تھے' ایک ارا سی بھول سے موت کا حقدار قرار پایا تھا۔ اس نے غداری بھی نہیں کی تھی بلکہ اپنے بال بچوں کی زندگی بچانے کے لیے ایک جوا کھیلا تھا جس میں وہ اپنی زندگی ہار گیا تھا۔

پندرہ منٹ سے بھی کم عرصے میں شواکی کے ملازمین نے نہ صرف مرنے والے کی لاش وہاں سے ہٹا دی بلکہ کارپٹ سے خون کا وہ دھبا بھی صاف کر دیا۔

"مسٹر شواکی' میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آخر تم ہم لوگوں کو یہاں کیوں لائے ہو؟" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا محض یہ دکھانے کہ انسانی جان کی تمھارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے!"

شواکی نے سفاک انداز میں مجھے گھور کے دیکھا' پھر فوراً ہی خود پر قابو پالیا اور نرم لہجے میں بولا۔ "بات یہ ہے خرم کہ تم نے میرے لیے اتنا زبردست کارنامہ انجام دیا ہے کہ میں سنجیدگی سے تمھیں اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کر رہا ہوں۔"

"کوئی کارنامہ انجام دیا ہے؟ میں نے!" میں الجھ کر بولا۔

"ہاں' میری نظروں میں یہ بہت بڑا کارنامہ ہے ورنہ بوبی کو قابو کرنا کسی عام آدمی کا کام نہیں ہے۔" اس نے خاموش ہو کر بوبی کی طرف دیکھا' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ گویا میرے لیے سادہ چیک ہے' اب میں اس چیک کو اپنی مرضی کے مطابق کیش کراؤں گا۔"

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

"میں بوبی کے ذریعے سودے بازی کروں گا' تمھارا کام ختم' اب میرا کام شروع ہو گا۔"

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ "مسٹر شواکی!" میں نے ٹھہرے ہوئے اور پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "بوبی اب میرا دوست ہے۔ جتنا اہم میرے لیے برڈ ہے' اتنا ہی اہم بوبی بھی ہے۔ یہ کوئی مال غنیمت نہیں ہے کہ تم اس کی سودے بازی کر سکو۔"

"تم میرا سودا کرو گے' تم!" بوبی حقارت سے بولا۔ "تمھاری یہ خواہش میری زندگی میں پوری ہوگی نہیں' میری لاش کی سودے بازی کرنا چاہو تو کر لینا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ تمھیں یہاں کیوں لے کر آیا ہوں۔" شواکی طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "اس لیے کہ تمھاری سودے بازی یہیں ہوگی۔"

"اچھی طرح غور کرلو مسٹر شواکی!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں یہاں اجنبی اور بے سہارا ضرور ہوں مگریوں آسانی سے تمہیں من مانی نہیں کرنے دوں گا۔"

"تم خاموش رہو خرم!" شواکی ایک دم پھر گیا۔ "مجھے میر صاحب کی دوستی کا لحاظ ہے ورنہ میرے سامنے اس لہجے میں بات کرنے والا زیادہ دیر زندہ نہیں رہتا۔"

"مجھے بھی میر صاحب کا خیال ہے ورنہ اس قسم کے خود غرض لوگوں سے مجھے بھی نفرت ہے۔"

"زیادہ بکواس کرو گے تو میں یہ بھول جاؤں گا۔ تمہیں میر صاحب نے بھیجا ہے۔ دوستی اپنی جگہ پر مگر میں اپنے مفاد پر ضرب نہیں پڑنے دوں گا۔"

"تو پھر بھول جاؤ۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ پہل تمہاری طرف سے ہو تاکہ میرا ضمیر مطمئن رہے۔"

"مجھے مجبوراً" یہی کرنا پڑے گا۔" شواکی نے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہیں اور تمہارے ساتھی کو کم از کم چوبیس گھنٹے میری تحویل میں رہنا ہوگا۔" پھر وہ ایک دم اتاکا کی طرف گھوما۔ "اتاکا! ہمارے دوستوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا دو۔"

جواب میں اتاکا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ برڈ چیتے کی طرح اچھلا اور شواکی کو ------ دیوار تک لے گیا۔ پھر اس نے دیوار سے پشت لگا کے شواکی ڈھال بنا لیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ "تم لوگ اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ میں اس چینی گڈے کی گردن مروڑ دوں گا۔"

اتاکا کی توجہ شواکی اور برڈ کی طرف تھی۔ میں نے اچھل کر اچانک اسے دبوچ لیا۔ "لاؤ ریوالور مجھے دو۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "ورنہ تم جانتے ہو کہ میں خالی ہاتھوں سے انسان کو ٹکڑوں میں تبدیل کر سکتا ہوں۔"

اس نے خاموشی سے ریوالور میرے حوالے کر دیا اور گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "تم یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔ اگر نکل بھی گئے تو اس ملک کی زمین تم پر تنگ ہو جائے گی۔ شواکی کا نام یہاں دہشت کی علامت ہے۔"

میں نے ریوالور بولی کی طرف اچھالا جسے اس نے ماہرانہ انداز میں کیچ کر لیا' پھر میں اتاکا سے مخاطب ہوا۔ "مجھے خون خرابے کا شوق نہیں ہے لیکن اب تم نے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کی تو تمہیں فوری طور پر ٹھکانے لگادوں گا۔"

کمرے میں اس وقت اتاکا کے علاوہ شواکی کا کوئی آدمی نہیں تھا مگر کسی بھی لمحے کوئی وہاں آسکتا تھا۔ پھر وہاں سے ہمارا نکلنا بہت مشکل ہو جاتا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور اتاکا کو ناک آؤٹ کر دیا۔ وہ لمحوں میں میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ شواکی مضطربانہ انداز میں بولا۔ "کیا تم نے اسے مار دیا! اگر ایسا ہوا تو میں دنیا کے دوسرے سرے تک تمہارا پیچھا کروں گا۔ یہ میرا بہت قیمتی آدمی تھا۔"

"ضرور کرنا پیچھا۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "زندہ رہو گے تو پیچھا کرو گے نا! یہ کہہ کر میں اناکا کو گھسیٹتا ہوا باتھ روم کی طرف لے چلا۔ میں نے اسے باتھ روم میں پھینک کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ شواکی کی طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ وہ اگر خوف زدہ تھا تو ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ یہ اس کے آہنی اعصاب کا کمال تھا۔ وہ یونہی تو اتنے بڑے اور منظم گینگ کا باس نہیں بن گیا تھا۔ اس کے قریب جاکے میں نے اس کی کن پٹی پر بھی جچا تلا ہاتھ رسید کیا۔ وہ بھی برڈ کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

"یہ تم نے کیا کیا خرم؟" برڈ نے شواکی کو صوفے پر لٹاتے ہوئے کہا۔ "میں نے سوچا تھا کہ اسے گن پوائنٹ پر لے کر باہر نکل جائیں گے۔"

"یہ اتنا آسان نہیں تھا۔" بوبی نے جواب دیا۔ "شواکی یہاں کی ایک طاقت ور تنظیم کا باس ہے' کوئی معمولی اچکا نہیں ہے جسے ہم گن پوائنٹ پر لے کر نکل جاتے۔"

میں کمرے سے باہر نکلا تو کوریڈور کے دوسرے سرے پر دو گارڈ مستعد نظر آئے۔ میں نے انھیں اشارے سے بلایا اور بتایا کہ "باس کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے' اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔"

وہ دونوں وہاں سے بھاگتے ہوئے کوریڈور کے دوسرے سرے پر غائب ہوگئے۔ فوراً ہی وہ ایک اور شخص کے ساتھ نمودار ہوئے۔ وہ شاید گارڈز انچارج تھا۔ اس نے کمرے میں آکر شواکی کا جائزہ لیا' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "مسٹر اناکا کہاں ہیں؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ہمارے ساتھ ہی تھے۔" میں نے جواب دیا۔ "اب خدا نہ جانے کہاں ہیں؟"

"مسٹر اناکا کی فکر چھوڑو۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "باس کو پہلی فرصت میں ہاسپٹل لے چلو۔"

میرے تحکمانہ انداز اور سخت لہجے سے وہ کچھ مرعوب ہو گیا اور جلدی سے بولا۔ "ہاسپٹل لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ باس کے لیے تو پورا ہاسپٹل یہیں آجائے گا۔ میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔"

اس کی بات سن کر مجھے اپنا منصوبہ چوپٹ ہوتا دکھائی دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ جب شواکی کو ہاسپٹل لے جایا جائے گا تو اس کے ساتھ ہم لوگ بھی نکل جائیں گے مگر وہ مردود ڈاکٹر کو وہیں بلا رہا تھا۔ میں نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر کے یہاں آنے میں دیر بھی لگ سکتی ہے' بہتر ہے کہ باس کو فوری طور پر ہاسپٹل لے جایا جائے۔"

میں نے کمرے میں پہنچ کر بوبی اور برڈ کو اپنے منصوبے کی ناکامی کے بارے میں بتایا تو وہ لوگ بھی فکر مند ہوگئے۔ برڈ نے پر خیال انداز میں کہا۔ "شواکی کے گارڈز ہمیں اس کے ساتھ آتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ ہمیں نہ روکیں۔ ہم باہر نکلنے کی کوشش

تو کریں۔"

اس کی بات سن کر بوبی بولا۔ "میرے دوست' شاید تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ ہم کہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہاں سے تو اگر اناکا بھی شواکی کی اجازت کے بغیر جانا چاہے گا تو اسے بھی روک لیا جائے گا۔ صرف وہی آدمی باہر جا سکتا ہے جسے شواکی اجازت دے۔"

"تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی کے ایک آدمی سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا۔" بوبی نے بتایا۔ "بہر حال ڈاکٹر کو آنے دو۔ اس کے بعد ہی کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

"ڈاکٹر کے آنے کے بعد تو ہم بالکل ہی پھنس جائیں گے۔" برڈ نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کے آنے کے بعد شواکی کو ہوش آجائے گا۔ ممکن ہے اس وقت تک اناکا بھی ہوش میں آجائے۔"

"میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر کے آنے کے بعد شواکی کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں' ڈاکٹر کے آتے ہی ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ ابھی اگر ہم نے یہ کوشش کی تو ہر شخص مشتبہ ہو جائے گا کہ باس کو ایسی حالت میں چھوڑ کر یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

اسی وقت وہ شخص ڈاکٹر کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر نے شواکی کا معائنہ کیا' اس کی نبض دیکھی' آنکھوں کے پپوٹے کھول کر دیکھے' پھر منہ ہی منہ میں گ بڑبڑایا۔ "کوئی خاص بات تو دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ بہر حال میں انھیں دوا دے دیتا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہوش آجائے گا۔"

جو شخص ڈاکٹر کو لایا تھا' میں نے اس سے پوچھا۔ "مسٹر اناکا کہاں ہیں؟"

اس نے کندھے جھٹک کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"بوبی' تم دیکھو ذرا مسٹر اناکا کو!" میں نے بوبی کو آنکھوں میں باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

"مسٹر اناکا اس بلڈنگ سے باہر نہیں گئے ہیں۔" اسی شخص نے جواب دیا۔ "آپ باس کے پاس ٹھہریں' میں مسٹر اناکا کو دیکھتا ہوں۔"

جونہی وہ مڑا' بوبی نے اس کی کھوپڑی پر کراٹے کا ایک ہلکا سا وار کیا۔ وہ کارپٹ پر ڈھیر ہوا تو ڈاکٹر وحشت زدہ انداز میں ہمیں دیکھنے لگا۔

"سنو ڈاکٹر!" میں نے کہا۔ "شور مچایا تو جان سے جاؤ گے۔ باس کو بھی ہم نے بے ہوش کیا ہے۔ فوری طور پر اس کے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ تم اس کے ہوش میں آنے تک یہیں ٹھہرو۔ اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو خواہ مخواہ مارے جاؤ گے۔"

ڈاکٹر نے اثبات میں گردن ہلا کر ہمیں یقین دلایا کہ وہ ہماری ہدایات پر عمل کرے گا۔

پھر ہم تینوں پھرتی سے باہر نکلے اور لفٹ کی بجائے زینے کی طرف چلے۔ زینے کے سرے پر بھی ایک مسلح محافظ موجود تھا۔ اس نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔ پھر بولا۔ "پاس ورڈ سر!"

"مائٹ زرائٹ۔" میں نے یونہی اندھیرے میں تیر پھینکا۔

یہ سنتے ہی اس نے شانے سے لٹکی ہوئی رائفل اتارنے کی کوشش کی مگر بوبی نے اسے موقع نہ دیا۔ لمحوں میں وہ ڈھیر ہوگیا۔ ہم اس کا بے ہوش جسم پھلانگتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ بلڈنگ کے داخلی دروازے پر حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ دو گارڈز تو سامنے ہی دکھائی دے رہے تھے اور نہ جانے کتنے سائیڈ میں بنے ہوئے گارڈ روم میں موجود تھے کیوں کہ اندر سے قہقہوں اور باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ بلڈنگ کے باہر بھی محافظ موجود ہوں گے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ دونوں گارڈ مستعد ہوگئے جو دروازے کے بالکل ساتھ کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک مشینی انداز میں ہماری طرف گھوما اور بولا۔ "پاس ورڈ سر!"

میں نے مزید آگے بڑھنے کی کوشش کی تاکہ وہ دونوں میری پہنچ میں رہیں۔ اس پر دوسرا گارڈ سخت لہجے میں بولا۔ "پاس ورڈ پلیز' ڈونٹ موو!" اس نے شانے سے رائفل اتار کے ہماری طرف تان لی۔

○

میں نے مڑ کے بوبی کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ اس نے بھی وہی پاس ورڈ دہرا دیا جو میں نے اوپر والے گارڈ کو بتایا تھا۔ بوبی کے جواب پر دونوں گارڈز نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بس یہی حیرت انھیں مہنگی پڑی۔ میں نے اچانک ان پر چھلانگ لگا دی۔ اور دونوں کو ایک ساتھ دبوچتا ہوا دوسری طرف جاگرا۔ بوبی نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے ان دونوں کو ناک آؤٹ کر دیا۔ برڈ نے لپک کر دوازہ کھول لیا۔ دروازہ سختی سے بند تھا۔ اس نے زور لگایا تو دوازہ تو کھل گیا مگر اسی کے ساتھ ہی تیز آواز میں سائرن گونجنے لگا۔ نہ جانے ہم سے کیا غلطی ہوئی تھی یا ہم میں سے کسی نے کوئی چیز چھیڑ دی تھی جس سے الارم بجنے لگا۔ یہ وقت اس پر غور کرنے کا نہیں تھا کیوں کہ گارڈز روم میں سے حواس باختہ گارڈز باہر کی طرف بھاگے آرہے تھے۔ میں نے اور بوبی نے باہر نکلنے سے پہلے ان محافظوں کی آٹومیٹک رائفلیں اٹھالی تھیں جنھیں ناک آؤٹ کیا تھا۔ وہ جدید قسم کی جرمن رائفلیں تھیں جن میں ایک سوبیس گولیوں کا میگزین فٹ ہوتا ہے۔ برڈ کے پاس اتاکا سے چھینا ہوا ریوالور تھا۔ بوبی نے وہ ریوالور برڈ کے حوالے کر دیا تھا۔

میں تو بھاگ کر بلڈنگ کے مین گیٹ کی طرف جانا چاہتا تھا مگر بوبی نے مجھے روک دیا

اور اندھیرے میں دائیں طرف دوڑ لگا دی۔ اب ہم بلڈنگ کے پارکنگ ایریا میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں بہت سی گاڑیاں پارک تھیں۔ فورڈ کی ایک ویگن دیکھ کر بوبی رک گیا۔ گاڑی لاک نہیں تھی مگر اس کے ایگنشن میں چابی بھی نہیں تھی۔ اس نے مجھے بھی گاڑی میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ میں بوبی کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ برڈ پچھلی نشست پر تھا۔ بوبی نے پیٹ کی واچ پاکٹ سے ماسٹر کی نکالی اور گاڑی اسٹارٹ کرلی۔ اس سارے کام میں ہمیں مشکل سے دو منٹ لگے ہوں گے۔ پھر طاقتور انجن والی وہ فورڈ کسی درندے کی طرح غراتی ہوئی مین گیٹ کی طرف بڑھی۔

"راستے میں کوئی بھی آئے اسے بھون کر رکھ دینا۔" بوبی نے دانت پر دانت جماکر کہا اور فورڈ کی اسپیڈ ایک دم بڑھا دی۔ اس وقت تک بلڈنگ میں بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ دو تین گاڑیاں ہم سے پہلے بھی مین گیٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ ہم گیٹ تک پہنچے تو دو محافظ گیٹ پر موجود تھے۔ میں نے کھڑکی سے گردن باہر نکالی اور بارعب انداز میں بولا۔ "یہاں سے کوئی مشکوک شخص تو باہر نہیں نکلا؟"

"نو سر!" محافظ نے مستعدی سے جواب دیا۔

"اچھا گیٹ کھولو۔" میں نے اسی بارعب انداز میں کہا۔

محافظ مشینی انداز میں گیٹ کی طرف آیا اور گیٹ کھول دیا۔ بوبی نے گاڑی آگے بڑھانی چاہی تو محافظ پھرتی سے سامنے آگیا اور بولا۔ "سوری سر مگر آپ نے پاس ورڈ تو بتایا ہی نہیں۔"

"اسے پاس ورڈ بتاؤ۔" بوبی نے مجھ سے کہا۔

میں رائفل کی نال کھڑکی سے باہر نکالی اور ایک ہوائی فائر کر دیا۔ محافظ بوکھلا کر سامنے سے ہٹ گیا۔ بوبی نے زناٹے سے فورڈ باہر نکال لی۔ پھر اس نے تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑ دیے۔ ایک بارونق جگہ رک کر اس نے فورڈ چھوڑ دی اور گلیوں میں پیدل ہی روانہ ہوگیا۔ میں نے کوئی ٹیکسی کرنے کی تجویز پیش کی مگر بوبی نے انکار کر دیا۔ اس نے بتایا کہ یہاں کے نوے فیصد ٹیکسی ڈرائیور ایسے ہیں جو ہمیں کہیں اتارتے ہی فون پر شواکی کو اطلاع بھی دے دیں گے کہ انھوں نے ہمیں کہاں چھوڑا ہے۔

ایک جگہ ہمیں ایک کر سیفر کار نظر آئی۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ اگیشین میں چابی بھی موجود تھی۔ ہم پھرتی سے اس گاڑی میں سوار ہوئے اور بوبی نے چشم زدن میں گاڑی وہاں سے نکال لی۔

"اب کہاں کا ارادہ ہے؟" میں نے بوبی سے پوچھا۔

"اب میں تمھیں اپنے ایک مخصوص ٹھکانے پر لے جاؤں گا۔" بوبی نے جواب دیا۔ "بوبی احسان فراموش نہیں ہے۔ جب تم میری وجہ سے شواکی سے دشمنی مول لے سکتے ہو

میں بھی آخری دم تک تمھارا ساتھ دوں گا۔"

"تمھاری گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم شواکی کے بارے میں خاصا جانتے ہو۔" میں
نے کہا۔

"ہاں' مجھے خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی شواکی کو کسی صورت میں مت چھیڑنا۔ اس
ے بگاڑ کے ہمیں فائدے کی بجائے نقصان ہی ہوگا۔ میری بھی کوشش تھی کہ کسی بھی
مرحلے میں شواکی یا اس کے آدمی سے ٹکراؤ نہ ہونے پائے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شواکی
تمھاری وجہ سے اس معاملے میں ملوث ہو جائے گا۔ میرے بڑوں نے بھی شاید شواکی سے
مفاہمت کرنا چاہی تھی۔ انھوں نے کہا ہوگا کہ بوبی کو ہمارے حوالے کر دیا جائے ہم خود ہی
اں سے نمٹ لیں گے۔ شواکی نے اس پر ان سے خاصی بھاری رقم کا مطالبہ کیا ہوگا۔ وہ
ت اس پر بھی راضی ہوگئے ہوں گے کہ اس طرح شواکی کے عذاب سے پیچھا چھوٹ گیا
ی' انھیں شاید یہ علم نہیں ہوگا کہ تمھاری پشت پناہی بھی شواکی کر رہا ہے۔ ورنہ وہ کسی
سرے انداز میں سودا کرتے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے! کیا شواکی کے ملوث ہونے سے ان دستاویزات اور مائیکرو فلمز کا
ا رک جائے گا؟"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" بوبی نے ہنس کر کہا۔ "اس سودے بازی میں تو سپر پاورز
ت ہیں۔ شواکی اتنا طاقت ور بہرحال نہیں ہے کہ سپر پاورز سے ٹکرا سکے۔ بس وہ لوگ
مخواہ کے خون خرابے سے بچنا چاہتے ہوں گے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا شواکی سے
رابطہ ہو۔"

میں بوبی کی باتوں میں اتنا محو تھا کہ مجھے رستہ طے ہونے کا احساس ہی نہیں ہوا میں تو
وقت چونکا جب بوبی نے گاڑی روک کر ہمیں اترنے کو کہا۔

وہاں کی فضا میں عجیب قسم کی بو رچی ہوئی تھی۔ لہروں کے شور سے مجھے اندازہ ہوا کہ
حل سمندر کے نزدیک ہیں۔ پھر مجھے یاد آگیا کہ ہم ساحل سمندر کے نزدیک ہیں۔ پھر
د آگیا کہ ہم نے کچھ فاصلہ ایک بوٹ میں بھی طے کیا تھا۔ وہاں بھی اندھیرے میں دو
ٹس لہروں میں ہچکولے کھاتی نظر آ رہی تھیں۔ بوبی کو دیکھ کر نہ جانے کہاں سے ایک
نمودار ہوا اور والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گیا۔ پھر وہ پر تشویش لہجے میں بولا۔ "تم
تے پھر رہے ہو بوبی! باس کے آدمی تمھاری تلاش میں ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ تم
ں سے مل گئے ہو؟"

"یہ سب مقدر کے کھیل ہیں رابرٹ۔" بوبی نے جواب دیا' پھر وہ میری طرف اشارہ
بولا۔ "یہ میرا دوست خرم ہے اور وہ برڈ!" اس نے برڈ کی طرف اشارہ کیا پھر مجھ
"خرم! یہ میرا جگری یار رابرٹ ہے۔ یہ بھی اس شخص کے لئے کام کر رہا ہے جس

کے لئے میں کر رہا تھا۔"

میں نے آگے بڑھ کے لمبے تڑنگے رابرٹ سے مصافحہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ خاصا مضبوط اور طاقتور شخص ہے۔ چاند کی مدھم روشنی میں اس کے خدوخال واضح نہیں تھے۔ اس نے باری باری مجھ سے اور برڈ سے ہاتھ ملایا' پھر ہمیں لے کر بوٹ کی طرف بڑھا۔ وہ بوٹ زیادہ بڑی تو نہیں تھی مگر اس کا انجن بہت پاور فل تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب بوٹ حرکت میں آئی۔

ہم بغیر کسی رکاوٹ کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ وہاں بھی رابرٹ کا ایک دوست موجود تھا۔ اس کی گاڑی میں بوبی اپنے اس ٹھکانے پر پہنچا جس کا اس نے تذکرہ کیا تھا۔ فی الحال یہ ٹھکانا ہر طرح سے محفوظ ہے۔" بوبی نے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"فی الحال سے کیا مراد ہے؟" برڈ نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ابھی اس جگہ کا علم نہ میرے بڑوں کو ہے نہ شواکی کو۔ ممکن ہے ان دونوں میں سے کوئی دو چار روز میں ہمارا سراغ لگا لیں مگر اس وقت تک ہم یہ ٹھکانا چھوڑ چکے ہوں گے۔"

"ہاں! تم نے بتایا نہیں کہ وہ کاغذات اور مائیکرو فلمز کس کے پاس ہیں؟" میں نے بوبی سے پوچھا۔

"ان کاغذات کا کل شام کو سودا ہو گا۔ میں تمہیں صبح ہی میں کسی وقت وہ بلڈنگ دکھا دوں گا جس کے پانچویں فلور پر وہ لوگ جمع ہوں گے اور کاغذات کی سودے بازی کریں گے۔ ہم کل ہی یہ پلاننگ کریں گے کہ وہاں تک کیسے پہنچا جائے۔"

پھر ہم لوگ رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ نیند ہم میں سے کسی کو بھی نہیں رہی تھی۔ میں نے بوبی سے اس کے آئندہ پروگرام کے بارے میں پوچھا تو اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا کہ آئندہ کا پروگرام تو اس وقت طے کروں گا جب آئندہ مجھے جینے کا موقع ملے گا۔

"کیا وہ لوگ اتنے ہی بااختیار ہیں کہ تمہیں دنیا کے کسی بھی حصے میں زندہ نہیں چھوڑیں گے؟ برڈ نے پوچھا۔

"اس سے بھی کہیں زیادہ" بوبی ہنس کر بولا۔ "اب میں جتنے دن بھی زندہ رہوں گا یہی دھڑکا لگا رہے گا کہ نہ جانے کس کی گولی مجھے چاٹ جائے۔"

"جب وہ لوگ اتنے ہی سفاک ہیں تو تم نے میرا ساتھ ہی کیوں دیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس وقت تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں تم سے شکست کھا جاؤں گا۔ میں نے جوش میں آ کر وہ دعویٰ کر دیا تھا۔"

"مگر تم بعد میں اپنے کئے ہوئے وعدے سے پھر بھی تو سکتے تھے" میں نے ہنس کر کہا۔

"بس یہی تو مجھ میں خامی ہے۔" بوبی بھی مسکرایا۔
"ایک مرتبہ جو وعدہ کر لیتا ہوں پھر ہمیشہ اس پر قائم رہتا ہوں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرے مقابل وانگ یو کا تربیت یافتہ شخص ہے ورنہ میں ایسا کوئی وعدہ نہ کرتا۔"
"گویا تم بے خبری میں مارے گئے۔" میں نے کہا۔ "اگر ایسا ہے بوبی تو تم اب بھی مجھے کچھ مت بتاؤ میں نہیں چاہتا کہ تم بقیہ زندگی دشمنوں سے چھپتے ہوئے گزار دو۔"
"اب بہت دیر ہو چکی ہے خرم! انہیں بھلا میں کیسے یقین دلاؤں گا کہ میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا' پھر یقین دلانے کی نوبت تو بعد میں آئے گی۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اپنے بڑوں تک پہنچ بھی پاؤں گا یا نہیں؟ ممکن ہے وہ لوگ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔ پھر ساری وضاحتیں دھری رہ جائیں گی۔"
"تم میرے ساتھ چلو' میرے ملک میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"
"پاکستان میں!" بوبی نے پوچھا۔ "پاکستان تو اس وقت سپر پاورز کے ایجنٹوں کا گڑھ ہے۔ سب سے زیادہ غیر محفوظ تو تمہارا ہی ملک ہے۔ دیکھو خرم' میری کسی بات کا برا مت ماننا میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔"
"برا ماننے کا کیا سوال ہے۔" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں خود بھی جانتا ہوں کہ وہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر یہ سب کچھ ایک مخصوص طبقہ کر رہا ہے۔ میرے ملک کے لوگ بہت معصوم اور سیدھے سادھے ہیں۔ وہ ایسی معاشی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں کہ انہیں کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہے' ان کی زندگیوں کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھیں۔"
" ارے یار تم تو جذباتی ہو گئے۔" بوبی نے ہنس کر کہا۔ "یہ بات دنیا مانتی ہے کہ پاکستانی قوم جی دار ہے۔"
ہم دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے' پھر نہ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔ صبح میری آنکھ کھلی تو مجھ پر تھکن غالب تھی' جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا' میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج سارا دن آرام کروں مگر وہ دن بہت اہم تھا بہت قیمتی تھا۔ اگر میں وہ دن سونے میں گزار دیتا تو میرے وہاں جانے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ نیم گرم پانی سے شاور لینے کے بعد میری حالت خاصی سنبھل گئی۔ برڈ اور بوبی مجھ سے پہلے ہی تیار ہو چکے تھے۔ ہم نے جلدی جلدی ناشتہ کیا' پھر اپنے مشن پر نکل کھڑے ہوئے۔ بوبی نے نہ جانے کہاں سے ایک سیڈان کا بندوبست کر لیا تھا۔ اس پر وہ مثل صادق آتی تھی کہ ہاتھی مر کے بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔
گاڑی میں لے کر وہ ہمیں اسی طرح روانہ ہو گیا جہاں وہ بلڈنگ واقع تھی جس کے تیسرے فلور پر آج شام کاغذات کا سودا ہونے والا تھا۔ راستے میں بوبی نے مجھے بتایا کہ اس

سیڈان کار میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ ریوالور اور دور مار رائفلوں سے لے کر دستی تک موجود ہیں، اسٹین گنیں بھی ہیں۔" اس پر برڈ نے ہنس کر کہا۔ "بس ٹینک اور توپوں کسر رہ گئی ہے۔"

اس کے اس جملے پر ہم تینوں ہی ہنسنے لگے۔ چلتے چلتے بوبی نے کار کی رفتار بالکل کم کر دی اور دائیں طرف کی ایک بلڈنگ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہ ہے وہ بلڈنگ۔" پھر اس نے کچھ آگے جا کر گاڑی روک دی اور پانچویں منزل کے ایک دفتر کی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ "اس کمرے میں ان کاغذات کی سودے بازی ہو گی۔"

○

میں نے بہ غور اس جگہ کا جائزہ لیا۔ وہ ایک کثیر المنزلہ عمارت تھی۔ اس کے بالکل سامنے سڑک کی دوسری طرف ایک عمارت کو توڑا جا رہا تھا شاید اس جگہ کا مالک پرانی بلڈنگ کو توڑ کے وہاں نئی بلڈنگ یا کوئی شاپنگ پلازہ بنانا چاہتا ہو گا۔ میں نے سوچا کہ سامنے والی شکستہ بلڈنگ کے ملبے میں چھپ کے میں اس عمارت کی نگرانی کر سکتا ہوں۔

"اس بلڈنگ میں حفاظتی انتظامات بھی بہت سخت ہیں۔" بوبی نے کہا۔ "دو بجے سے پوری بلڈنگ میں مسلح محافظ پھیل جائیں گے، داخلی دروازہ بھی خودکار ہے۔ اسے اندر سے ریموٹ کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ دروازے کا شیشہ بلٹ پروف ہے اور یہاں حفاظتی الارم بھی نصب ہے۔"

"یہ سارے انتظامات حال ہی میں کیئے گئے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں اتنی جلدی تو یہ انتظامات ہو بھی نہیں سکتے۔"

بوبی نے جواب دیا۔ "اس بلڈنگ میں دراصل اٹلی کی ایک سینڈیکیٹ کا برانچ آفس ہے۔ بظاہر اس میں مختلف فرموں کے دفاتر ہیں مگر اصل میں وہ آفس اسی سنڈیکیٹ کا ہیں۔"

اس کا مطلب ہے کہ ان کاغذات میں اٹلی بھی دلچسپی لے رہا ہے؟ میں نے پوچھا

"نہیں ایسا نہیں ہے" بوبی نے میرے خیال کی تردید کر دی۔ "سپر پاورز کے علاوہ اس سودے بازی میں دو تین ممالک دلچسپی لے رہے ہیں، باقی وہ لوگ ہیں جو ان کاغذات کے ذریعے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کاغذات میں ڈرگ مافیا بھی ملوث ہے۔"

"چلو تم نے پہچان بھی لیا تو کیا فرق پڑے گا؟ بوبی نے کہا۔

"یہ فرق پڑے گا کہ میں یہاں بیٹھ کر کچھ پلاننگ کر سکوں گا۔ ویسے بھی اب ہمیں کوئی خاص کام نہیں ہے۔"

"دیکھو خرم' جلد بازی میں کوئی حماقت کرنے کی کوشش مت کرنا۔" بوبی نے کہا۔ "اس بلڈنگ میں تو کچھ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ میں اپنے ذرائع سے یہ معلوم کر لوں گا کہ وہ کاغذات اور مائیکرو فلمز کس نے خریدی ہیں' پھر ہم اس شخص یا پارٹی سے ان چیزوں کے حصول کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمہیں معلوم ہو ہی جائے گا؟ میں نے پوچھا۔

"یہ تو خیر مجھے رابرٹ سے بھی معلوم ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں یہاں بیٹھ کر صرف نگرانی کروں گا۔"

"پھر میں بھی یہیں رکتا ہوں۔" برڈ نے کہا۔

"میں تو خود تم سے یہی کہنے والا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ بوبی بھی یہیں ٹھہرے مگر اس کا یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے ہم بھی نظروں میں آ جائیں گے۔"

"یہ بات تو ہے۔" بوبی نے کہا۔ "یہاں آنے والے بیشتر لوگ اور بلڈنگ کے محافظ مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ بس مجھے ایک بار اس خریدار کا نام معلوم ہو جائے جو ان اشیاء کا سودا کرے گا' پھر میں اس کے ٹھکانے پر دھاوا بولنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔"

میں اور برڈ گاڑی سے اتر آئے۔ بوبی نے ایک مرتبہ پھر مجھے حماقت سے باز رہنے کی تاکید کی اور رخصت ہو گیا۔

○

وہ سڑک زیادہ مصروف تو نہیں تھی مگر اتنی ویران بھی نہیں تھی کہ وہاں بالکل سناٹا ہوتا' شہر کے دوسرے بارونق علاقوں کے مقابلے میں البتہ وہاں رش کم تھا۔ میں اور برڈ یونہی ٹہلتے ہوئے سامنے والی عمارت کی طرف چلے گئے جہاں بڑی بڑی کرینیں' بلڈوزر اور اسکریپر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ عمارت آدھی سے زیادہ گرائی جا چکی تھی اور مزید گرائی جا رہی تھی۔ وہاں بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر "محتاط رہیئے" کا بورڈ لگا ہوا تھا کیوں کہ اس وقت بھی اس عمارت کو گرانے کا کام جاری تھا۔ ایک دیو قامت کرین میں ٹھوس لوہے کا منوں وزنی گولہ سا لٹک رہا تھا۔ کرین آپریٹر اس گولے کو بلڈنگ کے اس حصے پر مارتا تھا جسے گرانا مقصود تھا۔ منوں وزنی اس گولے کی دو تین ضربوں ہی میں عمارت کا وہ حصہ تڑخ جاتا تھا۔ اس وقت ہمارے ملک میں ایسی جدید مشینری نہیں آئی تھی۔ یہی کام اگر ہمارے ملک میں ہوتا تو سینکڑوں مزدور اسے ہتھوڑوں اور چھینیوں کی مدد سے کرتے۔ کرین کے ذریعے جو کام گھنٹوں میں ہو رہا تھا' وہ ہتھوڑوں سے دنوں اور ہفتوں میں ہوتا۔ میرے لئے کرین کی کارکردگی خاصا

دلچسپ منظر تھا۔ برڈ البتہ بیزاری سے وہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کے لئے وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

وہاں سے کچھ فاصلے پر چھوٹا سا ایک ریسٹورنٹ تھا۔ ہم وہاں کھڑے کھڑے تھک گئے کہ برڈ نے ریسٹورنٹ میں بیٹھنے کا مشورہ دیا۔ میری گھڑی میں اس وقت دن کا ڈیڑھ بجا تھا۔ ابھی ہمارے پاس خاصا وقت تھا۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا ابھی کھانا بھی کھا لینا چاہئے' ممکن ہے بعد میں کھانا کھانے کا موقع ہی نہ ملے۔ یہی سوچ کر ہم لوگ ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

کھانے اور کافی پینے میں ہمیں ایک گھنٹا لگ گیا۔ اب بھی ہمارے پاس ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ میں اطمینان سے اٹھا اور بل دینے کے لئے کاؤنٹر کی طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ ایک لحیم شحیم نیگرو نے میرا راستہ روک لیا۔ میں نے استفسامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "کیا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ وہ مجھ سے بھی کم از کم چار پانچ انچ لمبا ہو گا۔

"آئی وانٹ ہنڈرڈ چپس۔" اس نے سفید سفید دانتوں کی نمائش کی۔

"کس لئے دوں تمہیں سو ڈالرز؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"سو ڈالرز نہیں بلکہ سو امریکن ڈالرز!" اس نے گویا میرے جملے کی تصحیح کی۔ "سو امریکن ڈالرز میری فیس ہے۔ ایک طرح سے اس رقم میں تم اپنا انشورنس کراؤ گے۔" اس نے پھر دانت نکالے۔

"میں اب بھی نہیں سمجھا" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "کیا تم کسی انشورنس کمپنی کے ایجنٹ ہو؟"

"میں خود چلتی پھرتی انشورنس کمپنی ہوں۔" وہ اپنے مسخ چہرے کو مزید بگاڑتے ہوئے بولا۔ "سو ڈالر دے کے تم اپنی جان کی سلامتی خریدو گے۔ نہ دینے کی صورت میں اس سے کہیں زیادہ کی ٹوٹ پھوٹ ہو جائے گی۔ اب یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔"

"سو ڈالر تو میرے پاس ہیں نہیں اس لئے مجبوری ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم مجھے توڑ پھوڑ دو۔"

اس نے اچانک اتنی پھرتی سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ لمحے بھر کو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کم بخت کا ہاتھ بھی بہت سخت تھا۔ تھپڑ کی گونج پورے ریسٹورنٹ میں سنی گئی تھی اور لوگ کسی متوقع جھگڑے کے پیش نظر تیزی سے اٹھ کر باہر کی طرف لپک رہے تھے۔ میرا بایاں رخسار بری طرح جل رہا تھا اور کانوں میں ابھی تک سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اچانک تھپڑ مار بیٹھے گا ورنہ میں پہلے سے ہوشیار ہوتا۔

"اوکے۔" میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں اس سے خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ "سو ڈالر تو

تمہیں دینا ہی پڑیں گے۔" میں نے بے بسی طاری کرتے ہوئے کہا۔ "بڑا نوٹ چلے گا یا چھوٹے نوٹ؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جو بھی تمہارے پاس ہے نکال دو۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

برڈ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ آنکھوں آنکھوں میں مجھے اشارے کر رہا تھا کہ میں جھگڑا نہ بڑھاؤں۔

"نئے نوٹ چلیں گے یا پرانے؟" میں نے اسی سنجیدگی سے پوچھا۔

"یو ایڈیٹ۔" نیگرو بپھر گیا۔ "بکواس ہی کئے جاؤ گے' مال نکالو' جلدی کرو۔"

"یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ہم دو آدمی ہیں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "سو ڈالر میں دونوں کا انشورنس ہو جائے گا یا دو سو ڈالر دوں؟"

نیگرو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اتنا احمق شکار تو اسے کبھی ملا ہی نہ ہو گا جو خود اسے سو کی بجائے دو سو ڈالر کی پیش کش کر رہا تھا۔ "دو سو ڈالر دے دو۔" اس نے پھر دانت نکالے۔

"ثابت یا پسے ہوئے؟" میں نے پھر سنجیدگی سے سوال کیا۔

میرے اس سوال پر برڈ کے حلق سے بے ساختہ قسم کا قہقہہ برآمد ہوا۔ وہ نیگرو بھی سمجھ گیا کہ میں اب تک اسے گھسنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ مارے غصے کے اس کا چہرہ مزید سیاہ ہو گیا۔ وہ بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح میری طرف بڑھا اور باکسروں کے انداز میں اس نے مجھے لفٹ ہک مارنا چاہا۔ میں پوری طرح ہوشیار تھا اس لئے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اگر اس کا یہ مکا میرے جبڑے پر پڑ جاتا تو میرا چہرہ ہمیشہ کے لئے بگڑ جاتا۔ اس نے دوسرا ہاتھ چلایا جسے میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے روکا اور جوابی طور پر اس کے منہ پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ اس کے چہرے کی کھال پھٹ گئی۔ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ "یہ اس تھپڑ کا بدلہ تھا جو ابھی تم نے میرے منہ پر مارا تھا۔"

اس نے اچانک کمر کے گرد لپٹی ہوئی موٹر سائیکل کی چین کھول کے ہاتھ میں پکڑ لی۔ یہ چین شاید اس نے خصوصی طور پر اسی مقصد کے لئے تیار کی تھی کیوں کہ اس کے ایک سرے پر ربڑ کا پائپ چڑھا کر ہینڈل سا بنایا گیا تھا۔ اس نے پوری قوت سے وہ چین ہوا میں لہرائی' اور مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اگر جمناسٹ نہ ہوتا تو میری کھوپڑی پاش پاش ہو جاتی۔ موٹر سائیکل کی بھاری بھرکم چین میرے کھوپڑی کی بجائے ایک ٹیبل پر پڑی تھی۔ وہ ٹیبل درمیان سے کریک ہو گئی۔ اس نے دوبارہ چین گھمائی۔ میں نے پھرتی سے ایک کرسی اٹھا کر اس کے سامنے کر دی۔ چین کرسی کے ایک پائے سے لپٹ گئی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا میں نے کرسی کو زور دار جھٹکا دے کر نیگرو کو چین سمیت گھسیٹنا چاہا مگر اس کی بجائے کرسی کا پایا اکھڑ گیا۔

برڈ نے چیخ کر کہا۔ "ختم کرو خرم! پیچھے ہٹو میں اس کلوٹے پر فائر کر رہا ہوں۔"

"پاگل مت بنو" میں نے نیگرو کی حرکت پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "ہم اس کا قتل فی الحال افورڈ نہیں کر سکتے۔ یہ میرے ہاتھوں خود ہی مرنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

میرے اس جملے سے تو گویا وہ پاگل ہو گیا۔ اس نے بھرپوری قوت سے چین میری سر پر یوں ماری جیسے وہ چین نہ ہو کلہاڑی ہو اور اس کے ذریعے وہ میرے دو حصے کرنا چاہتا ہو۔

میں ایک مرتبہ پھر اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس مرتبہ چین فرش پر پڑی۔ میں نے پھرتی سے اس پہ پاؤں رکھ دیا مگر یہ حرکت مجھے مہنگی پڑی۔ اس نے پوری قوت سے چین کھینچی تو اس کے ساتھ ہی میرے جوتے کا تلا بھی نکل گیا اور میرے پاؤں میں بھی ایسا زبردست جھٹکا لگا کہ لمحے بھر کو تو وہ ٹانگ بالکل ناکارہ ہو گئی۔

میں اب تک صرف اپنا دفاع کر رہا تھا مگر اب میں اس کھیل سے اکتا گیا تھا۔ چین گھسٹ کر وہ جونہی پیچھے ہٹا' میں نے اس کے منہ پر زوردار کک ماری۔ وہ زخمی درندے کی طرح غرایا۔ دوسری مرتبہ میں نے گھوم کے اسے بیک کک ماری جو اس کے کدو سے سر پر پڑی۔ پھر میں نے اچھل کر دونوں ہاتھوں سے اس کے کان پکڑ لیے اور پورے وزن سے جھول گیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے ذبح ہوتے ہوئے بیل کی طرح ڈکرایا اور میرے بوجھ سے نیچے جھکا تو میں نے اس کی ناک پہ زوردار ٹکر مار کر اسے چھوڑ دیا۔ یہ میرے حساب سے فیصلہ کن ضرب تھی مگر وہ ابھی اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تھا۔ موٹر سائیکل کی چین ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اس کی کلائی پر کھڑی ہتھیلی کا ہلکا سا وار کیا اور اطمینان سے چین اس کے ہاتھ سے نکال لی۔ پھر میں نے دھکا دے کر اسے کرسی پر بٹھا دیا اور میز پر رکھا ہوا پانی کا جگ اس کے منہ پر الٹ دیا۔ اس سے اس کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ میں نے چین لہراتے ہوئے اس کے لہجے میں کہا۔ "ٹو ہنڈرڈ چپس!"

اس نے آنکھیں چندھیا کر مجھے دیکھا۔

"ٹو ہنڈرڈ! امریکن ڈالرز!" میں نے سخت لہجے میں کہا اور چین سے شیشے کے جگ کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

اس نے بوکھلا کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو ڈالر کے کچھ نوٹ نکالے۔

میں نے سارے نوٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیے۔ پہلے ان میں سے دو سو ڈالرز نکالے' پھر سو ڈالر کا ایک نوٹ اور گھسیٹ لیا اور بقیہ نوٹ اسے واپس کرتے ہوئے بولا۔ "یہ مزید سو ڈالر میرے جوتے کی قیمت ہے۔" میں نے اسے بغیر تلے کا جوتا دکھایا۔ "امید ہے آئندہ تم آدمی دیکھ کر بات کرو گے۔" پھر میں جھٹکے سے کاؤنٹر کی طرف گھوما۔ "میں اس ریسٹورینٹ کے مالک سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں ہی اس ہوٹل کا مالک ہوں۔" کاؤنٹر پر کھڑا ہوا شخص عالم اضطراب میں تولیہ سے گلاس چمکاتے ہوتے بولا۔ وہ برطانیہ کا باشندہ لگ رہا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے لہجے سے

ہوا تھا۔

"اگر تم مالک ہو تو اس نیگرو کی بدمعاشی دیکھ کر تم نے پولیس کو فون کیوں نہیں کیا؟"

میں فون کرنے والا تھا۔ وہ تھوک نگل کر بولا۔

"بکواس کرتے ہو۔" میں ڈپٹ کر بولا۔ "یہ نیگرو تمہارا آدمی ہے' اور تم بھی ان پیسوں میں برابر کے شریک ہو۔"

"میری بات کا یقین کرو۔ میں اس بدمعاشی سے خود بھی بہت پریشان ہوں۔"

"بکو مت۔" میں نے اس کے منہ پر بھی تھپڑ جڑایا۔ "فون مجھے دو۔ میں خود پولیس کو طلب کروں گا۔"

میری بات سن کر وہ بدمعاش نیگرو دیوانہ وار باہر کی طرف بھاگ لیا۔

"تم یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اب اس علاقے کے بدمعاش ہم ہیں' سمجھے! وہ کالیا دوبارہ یہاں نظر آیا تو تم بے موت مارے جاؤ گے۔" میں نے لہجے کو خوف ناک بنا کر کہا اور برڈ کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اس ہنگامے میں بہت سا وقت ضائع ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود ہمارے پاس ایک گھنٹا تھا۔ ہم لوگ ٹہلتے ہوئے پھر اسی بلڈنگ کے سامنے جا کھڑے ہوئے جہاں بوبی کی اطلاع کے مطابق مختلف ممالک کے ایجنٹ اکٹھے ہونے والے تھے۔

"خرم! بعض اوقات تم بہت بچکانہ حرکتیں کر بیٹھتے ہو۔" برڈ نے کہا۔ "کیا ضرورت تھی اس نیگرو سے الجھنے کی؟ اگر ابھی پولیس کا بکھیڑا کھڑا ہو جاتا تو!" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"تم کیا چاہتے تھے کہ میں اسے سو ڈالر پکڑا دیتا!"

"سو ڈالر ان دستاویزات اور مائیکرو فلمز سے زیادہ قیمتی ہیں۔" برڈ منہ بنا کر بولا۔ "اگر ابھی پولیس آجاتی تو نہ جانے کب گلو خلاصی ہوتی اور تمہارا مشن دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ کم از کم کچھ دن کے لیے تو یہ جذباتی پن چھوڑ دو۔ ہر جگہ تم اسی حماقت سے کام لیتے ہو۔ اس سے پہلے تم بوبی سے لڑنے کو تیار ہو گئے تھے۔ یہ بھی تو ضروری نہیں ہے کہ تم ہمیشہ دوسروں کو زیرو کر لو۔ اگر بوبی تمہیں زیر کر لیتا تو تمہارا راشن تو رکھا رہ جاتا' پلیز خرم' ذرا مصلحت سے کام لینا بھی سیکھو۔ طاقت ہر جگہ اور ہر موقع پر کام نہیں آتی۔"

"سوری برڈ!" میں نے جلدی سے کہا۔ "اب میں کوشش کروں گا کہ ٹھنڈے دماغ و دل سے کام لیا جائے۔ فی الحال تو یہ سوچو کہ اس بلڈنگ میں کیسے داخل ہوا جائے۔"

میں نے وہیں سے اس آفس کا جائزہ لیا اس آفس کی کھلی ہوئی کھڑکی نظر آرہی تھی۔ وہ آفس اگر فورتھ فلور پر نہ ہوتا' گراؤنڈ پر ہوتا تو شاید مجھے زیادہ وقت پیش نہ آئی۔ فورتھ فلور تک جانے ہی میں ہمارا کام تمام ہو جاتا۔ سامنے والی مخدوش بلڈنگ میں ابھی تک توڑ پھوڑ جاری تھی۔

اس دیو قامت کرین کو دیکھ کر ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں آیا کہ

اگر میں اس کرین کے ذریعے اس فلور تک پہنچنے کی کوشش کروں گا کامیابی کے امکانات ففٹی پر سٹ ہو سکتے ہیں۔ کرین کے ذریعے وہاں تک پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ اس آپریٹر کو راضی کرنا تھا۔ وہ بھلا کیوں راضی ہوتا کہ میں اس کی کرین کے ذریعے وہاں تک پہنچوں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی اور معاملہ پولیس تک پہنچتا تو وہ کرین والا بھی پکڑ میں آتا۔ میں نے سوچا کہ اس سے بات کرنے میں کیا قباحت ہے۔ بھروں پر سٹ اس بات کا امکان تھا کہ کرین آپریٹر پیسوں کے لالچ میں ہماری بات مان لے۔ میں نے اپنی اس اسکیم سے برڈ کو بھی مطلع کیا۔ پھر ہم لوگ اس طرح بڑھے جہاں کرین آپریٹر بیٹھا تھا۔ میں نے ڈرامائی انداز میں جیب سے دو سو ڈالرز نکالے اور اس کے سامنے لہرا کر بولا۔ "دو سو ڈالر کمانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

اس نے غور سے میرا جائزہ لیا' پھر بولا۔ "خیال تو نیک ہے مگر مجھے کرنا کیا پڑے گا؟"

"میرا دوست اپنے کچھ دوستوں کو سرپرائز دینا چاہتا ہے۔" برڈ نے جلدی سے کہا۔" اس کے وہ دوست سامنے والی بلڈنگ کے آفس میں اکٹھے ہوں گے۔ "برڈ نے اشارے سے وہ کھلی ہوئی کھڑکی بھی دکھائی۔ "میرا دوست تمھاری اس کرین کے ذریعے اس کھڑکی تک پہنچنا چاہتا ہے۔"

"اس کرین کے ذریعے؟" کرین آپریٹر نے حیرت سے کہا۔ وہ حلیے اور چہرے مہرے سے میکسیکو کا باشندہ لگ رہا تھا۔ "تمھارا دوست مرنا تو نہیں چاہتا؟"

"یہی تو سرپرائز ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ویسے تم فکر مت کرو' میں جمناسٹ ہوں اور اس قسم کے کرتب میرے لیے معمولی بات ہیں۔"

"نہیں مسٹر!" کرین آپریٹر نے انکار میں سرہلایا۔ "میں نہیں چاہتا کہ مذاق ہی مذاق میں تمھاری جان چلی جائے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ پولیس تو مجھے پکڑے گی۔"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "چلو دو سو کی بجائے تین سو ڈالرز لے لینا۔"

"پانچ سو ڈالرز بھی نہیں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس میں سوا پانچ بج رہے تھے۔ اب تک بوبی کا بھی کوئی پتا نہیں تھا۔ حالانکہ اس نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کرتا پھر رہا تھا۔ میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے کرین آپریٹر سے کہا۔ "اچھا چلو ایک ایک ہزار ڈالر لے لو دیکھو' اب انکار مت کرنا۔"

"مسئلہ کیا ہے؟" وہ کچھ مشکوک ہو کے بولا۔ "کہیں تم لوگ کوئی غیر قانونی کام تو نہیں کرنا چاہ رہے؟"

"قانونی اور غیر قانونی کے چکر میں مت پڑو۔ تم پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔" میں نے

نرم لہجے میں آئے کہا۔ "بعد میں تم سے پوچھا جائے تو کہہ دینا کہ ان لوگوں نے گن پوائنٹ پر مجھے مجبور کیا تھا۔"

یہ سن کر وہ مزید بھڑک گیا۔ "گن پوائنٹ پر؟" وہ تھوک نگل کر بولا۔ "معاملہ کیا اتنا ہی اہم ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ۔" میں نے لہجے کو ذرا سخت کیا۔ "میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ وہ ہزار ڈالرز لے لو۔ انکار کی صورت میں ہم واقعی گن پوائنٹ پر یہ کام کرلیں گے اور تمھاری لاش بعد میں یہیں چھوڑ جائیں گے۔"

کرین آپریٹر واضح طور پر کانپنے لگا۔ اس نے آہستہ آہستہ اقرار میں سر ہلایا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم اگر واقعی مرنا چاہتے ہو تو دو ہزار ڈالر کیوں خرچ کرتے ہو۔ تمھاری ضرورت اتنی ہی اہم ہے تو میں بغیر کسی پیسے کے یہ کام کردوں گا۔ مجھے موت کی دھمکی مت دو۔" پھر وہ کرین کے مختلف لیورز کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "میں کرین کو نیچے لا رہا ہوں۔ تم خود دیکھ لو کہ اس پر بیٹھ سکتے ہو یا نہیں۔ اس پر تو پاؤں جمانا بھی ایک مسئلہ ہوگا۔" پھر وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "دیکھو، تم نوجوان ہو۔ ابھی تم نے دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا ہے۔ اپنی جان کو کیوں ہلاکت میں ڈالتے ہو؟"

"مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے۔" میں نے کرین کے اس منوں وزنی گولے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر میں نے رسک نہ لیا، تب بھی میری جان کو خطرہ ہے۔"

کرین آپریٹر جواب میں کچھ نہیں بولا، بس ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ وہ مجھے پاگل سمجھ رہا تھا، ایسا خطرناک پاگل جو اگر اپنی جان کو خطرے میں ڈال سکتا تھا تو کسی کی جان لے بھی سکتا تھا۔

کرین کا وہ گولہ ایک بہت مضبوط آہنی رسے میں لٹکا ہوا تھا۔

میں نے جوتے اتارے کیوں کہ ایک جوتا یوں بھی بیکار ہوگیا تھا، برڈ سے ریوالور لے کر اس کا میگزین چیک کیا اور ریوالور کو اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ پھر میں اللہ کا نام لے کر اچھل کے اس آہنی گولے پر چڑھ گیا اور آہنی رسا پکڑ کر گولے پر مضبوطی سے قدم جما دیے۔ میں نے برڈ سے کہا کہ تم اس کرین آپریٹر کا خیال رکھنا، یہ کوئی گڑ بڑ کرنے کو کوشش کرے تو اسے ٹھکانے لگا کر خود کرین کا لیور سنبھال لینا۔

میں نے دیکھا، کرین آپریٹر منہ ہی منہ میں کچھ بڑ بڑا رہا ہے۔ مجھے صرف اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر اس نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور کرین کا لیور کھینچ لیا۔ کرین فضا میں بلند ہونے لگی۔ پھر اس کا رخ اس بلڈنگ کی طرف ہو گیا جہاں وہ اہم کانفرنس ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے عین سامنے پہنچ کر آپریٹر نے گولے کو ایک جھکولا دیا اور اسے کھڑکی تک پہنچانے کی کوشش کی مگر پہلی کوشش ناکام ہو گئی۔ وہ گولے کو

سوئنگ دے کر پیچھے لایا' پھر گولی کی رفتار سے بلڈنگ کی طرف بڑھا۔ اچانک میرے ذہن میں یہ ہولناک خیال آیا کہ کرین آپریٹر اس کرین کے ذریعے عمارتیں ڈھانے کا ماہر ہے۔ وہ گولے کو کھڑکی کے سامنے معلق کیسے کرے گا۔ یہ خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ یقیناً" اس گولے کو بلڈنگ کی دیوار سے ٹکرا دیتا اور میں منوں وزنی اس گولے اور کنکریٹ کی مضبوط دیوار کے درمیان چپاتی بن کر رہ جاتا۔ میں نے خود سے کہا۔ میاں خرم' بہت جی لیے۔ خود کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے' کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اب دیکھو تمھارا انجام کیا ہوگا۔ تمھاری لاش کی شناخت بھی نہ ہو سکے گی۔ یہ سارے خیالات ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں میرے ذہن میں آئے۔ میں نے چیخ کر کرین آپریٹر کو روکنے کی کوشش بھی کی مگر میں اتنی بلندی پر تھا کہ میری آواز اس تک نہیں پہنچ سکی' پھر وہ ماہرانہ انداز میں کرین کے مختلف لیوروں سے الجھا ہوا تھا۔ بڑھی بھی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کی پوری توجہ کرین آپریٹر کی طرف تھی۔ بلڈنگ کی دیوار تیزی سے نزدیک آتی جا رہی تھی۔ بالکل آخری وقت میں مجھے کلمہ پڑھنے کا خیال آیا۔ میں نے کلمہ پڑھا' تو دیوار بالکل میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

پھر ایک زور دار دھماکا ہوا۔ ایک لمحے کو تو مجھے ایسا لگا جیسے میں مر چکا ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہوئے۔ کمرے کی کھڑکی کی چوکھٹ سمیت اکھڑ کر اندر جا پڑی تھی۔ کھڑکی کے بالکل ساتھ جو دو آدمی بیٹھے تھے' وہ دیوار اور کھڑکی کے ملبے میں دب کر رہ گئے تھے۔ میں اس طویل آبنوسی میز پر براجمان تھا جس کے گرد وہ سب بیٹھے تھے۔ وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے اور مجھے یوں گھور رہے تھے جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ میں نے سرعت سے ان کا جائزہ لیا۔ ان میں کوئی بھی چہرہ شناسا نہیں تھا۔ میرا چہرہ بھی شاید دھول اور مٹی میں اٹا ہوا تھا اس لیے وہ سب مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ دھول اور مٹی مجھے خود اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔

پھر ان میں سے ایک آدمی کچھ حواس میں آیا اور اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"میں!"

میں نے احمقوں کی طرح کہا۔ "میں' میں ہوں۔" اس دوران میں مجھے احساس ہوگیا تھا کہ مجھے سوائے چند ایک خراشوں کے کوئی چوٹ نہیں آئی ہے۔ ہاں اگر سامنے کھلی ہوئی کھڑکی نہ ہوتی تو میرا کچومر نکل جاتا۔ میں نے دیکھا کہ جس شخص نے مجھ سے بات کی تھی' اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ جیب کی طرف جا رہا تھا۔

دوسرے تو ابھی تک صدمے سے گنگ تھے۔ شاید انھیں ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ کوئی آدمی اتنی بلندی پر واقع کھڑکی میں سے کود کر اندر آسکتا ہے اور وہ بھی اتنے دھوم

دھڑکے کے ساتھ! صرف وہ ایک آدمی ایسا تھا جس نے سب سے پہلے سنبھالا لیا تھا۔ شاید وہ خاصے آہنی اعصاب کا مالک تھا۔

یہ بھانپتے ہوئے کہ وہ ریوالور کے لیے جیب میں ہاتھ ڈال رہا ہے' میں نے وہیں لیٹے لیٹے جمپ لگائی اور اس شخص پر جا پڑا۔ اس نے پینترا بدل کے میری گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ میرا بد مقابل کوئی عام آدمی نہیں تھا بلکہ کسی ملک کی خفیہ ایجنسی کا تربیت یافتہ ایجنٹ تھا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کے میری گرفت سے نکل گیا۔ اس نے جوابی طور پر میرے گھٹنے پر کراٹے کا وار کیا۔ میں اگر عین وقت پر قلا بازی نہ کھا جاتا تو میری ٹانگ سوکھی لکڑی کی طرح ٹوٹ جاتی۔ میں پیچھے ہٹا تو کسی نے مجھے دبوچ لیا' پھر بہ یک وقت کئی آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے اور میں بری طرح سے بے بس ہو کر رہ گیا۔ وہ سب تربیت یافتہ ایجنٹ اور مختلف ملکوں کے کمانڈوز تھے۔ ذرا سی دیر میں انھوں نے میرے کس بل نکال دیے۔ میں نے دیکھا کچھ لوگ ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے جھانک کر باہر کی صورت حال کا اندازہ لگا چکے ہیں۔

"کرین آپریٹر کو پکڑو۔"

وہی آدمی چیخ کر بولا جس نے سب سے پہلے مجھ سے سوال جواب کیے تھے۔

فوراً ہی دو آدمی بھاگتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ مجھے اس کرین آپریٹر کی فکر تھی۔ برڈ تو موقع کی مناسبت سے اپنا دفاع کر سکتا تھا' خطرے کی صورت میں وہاں سے فرار بھی ہو سکتا تھا مگر وہ کرین آپریٹر تو بیچارہ معصوم آدمی تھا۔ وہ بے خبری میں مارا جاتا۔ ان لوگوں نے میرا ریوالور بھی نکال لیا تھا اور نقدی بھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ سبھی مسلح ہوں گے۔ اتنے لوگوں کے درمیان سے بھاگنے کی کوشش خود کشی کے مترادف ہوتی۔ میں دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا کہ یوں ہیرو بننے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر اسی شخص نے مجھے دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ جو سب سے پہلے مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔ میں بلا چوں و چرا دیوار کی طرف گھوم گیا۔

"تم کون ہو اور یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

"میں موت کا فرشتہ ہوں اور مجھے اللہ میاں نے خاص طور پر تمھارے لیے بھیجا ہے۔"

"ابھی ساری شوخی ہوا ہو جائے گی۔" جیمز بانڈ کے باپ نے غراتے ہوئے کہا۔ "باندھ دو اسے۔ میں ابھی اس کے سارے کرتب نکالتا ہوں۔"

فوراً ہی کئی آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں انھوں نے مجھے اتنی مضبوطی سے باندھ دیا کہ ہاتھ پیر ہلانا تو درکنار میرا دوران خون بھی رکنے لگا۔

میں نے کسی قسم کی کمزوری دکھائے بغیر کہا۔ "میں تم سب کو کتے کی موت مار دوں

گاں تم لوگوں کو اندازہ نہیں ہے کہ تم نے مجھے پکڑ کر کتنی بڑی مصیبت کو دعوت دی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" جیمزبانڈ کے باپ کہلانے والے نے میرے منہ پر لات مارنے کی کوشش کی جو میرے شانے پر پڑی۔ پھراس نے کہا۔

"آج کا پروگرام کینسل! آیندہ تاریخ کی اطلاع بعد میں دی جائے گی۔ پہلے تو مجھے یہ دیکھنا پڑے گا کہ یہ کمبخت کون ہے اور اس کا تعلق کسی ملک سے ہے یا کسی مافیا سے ہے!"

پھر وہ اپنے آدمیوں کی طرف گھوما۔ "اسے لے چلو' میں معلوم کروں گا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔"

اس وقت وہ دونوں آدمی ہانپتے کانپتے واپس آگئے جو کرین آپریٹر کو پکڑنے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔ "باس! دھماکے کی وجہ سے روڈ پر ٹریفک بلاک ہو گیا ہے' آس پاس کی بلڈنگز سے لوگ نکل کر اس بلڈنگ کے نیچے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اس ہنگامے میں معلوم ہی نہیں ہوا کہ کرین آپریٹر کون ہے۔"

"یہ تو خیر شہر کی ڈویلپمنٹ اتھارٹی سے معلوم ہو جائے گا کہ کرین آپریٹر کون تھا۔" باس نے منہ بنا کر کہا۔ "اسے تو میں گھر سے پکڑ لوں گا۔ اس کا کوئی ساتھی بھی نظر آیا؟"

"وہاں تو بہت سے لوگ تھے باس!" آنے والے نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ان لوگوں میں بھلا اس کے ساتھیوں کی شناخت کیسے ہوتی؟"

"اچھا دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" باس جھنجلا کر بولا تو وہ فوراً ہی دفع ہو گیا۔ پھر وہ ایک اور شخص سے مخاطب ہوا۔ "گاڑی کو بلڈنگ کے دروازے کے بالکل نزدیک لے آؤ۔ نیچے پولیس بھی ہوگی۔ ممکن ہے وہ لوگ اوپر آ رہے ہوں۔ ہمیں وقت ضائع کیے بغیر یہاں سے نکلنا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اسے فی الحال اسی فلور پر کسی اور جگہ منتقل کر دیں۔" ایک اور باوقار سا شخص بولا۔ وہ مجھے زیادہ عقل مند لگا۔ "پولیس یہاں پہنچنے ہی والی ہوگی۔ اگر یہ پولیس کے ہتھے چڑ گیا تو ہمیں کچھ بھی معلوم نہ ہوسکے گا۔ دیوار ٹوٹنے کے بارے میں پولیس کو یہی بتایا جائے گا کہ کرین آپریٹر کی غلطی کی وجہ سے کرین کا رخ اس طرف ہوگیا۔ یہاں جو لوگ زخمی ہوئے ہیں' انھیں ہاسپٹل بھیج دیں اور اسے یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔" پھر وہ سوچ کر بولا۔ "مگر اس حالت میں نہیں۔ اسے بندھی ہوئی حالت میں دیکھ کر تو ہر شخص مشتبہ ہو جائے گا۔ اس کے پیروں میں جوتے بھی نہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیں اور جوتے پہنا کر شریفانہ طریقے سے گاڑی تک لے جائیں۔ ہاں اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے تو بلا تامل گولی مار دی جائے۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا' اللہ تمہارا بھلا کرے۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی صورت میں تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب کچھ امید پیدا ہو چلی تھی کہ شاید میں کچھ کر سکوں۔ مجھے امید تھی کہ باہر برڈ بھی موجود ہوگا۔ وہ بھی میرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ پھر یہ لوگ اس بھرے پرے علاقے میں مجھے گولی مارنے کی جرات نہیں کر سکیں گے۔ یہ صرف مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں' خوف زدہ کر رہے ہیں۔ اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کے بعد میرا کھویا ہوا اعتماد خاصی حد تک لوٹ آیا۔

فوراً" ہی میرے لیے جوتوں کا بندوبست کر دیا گیا اور میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے گئے۔ ہاتھ پاؤں کھولتے ہوئے اس نے مجھے ایک مرتبہ پھر تنبیہ کی کہ کسی بھی قسم کی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ بھون کر رکھ دیا جائے گا۔ یہاں کی انتظامیہ اور پولیس دونوں میری مٹھی میں ہیں۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

اس کا اندازہ تو مجھے اسی وقت ہوگیا تھا وہ پولیس کی آمد سے پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ میاں جیمز بانڈ! تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس موت کے فرشتے سے واسطہ پڑا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس بلڈنگ سے باہر نکلتے ہیں اس جیمز بانڈ کے باپ کو ڈھال بنا لوں گا۔

"چلو! آگے چلو۔" باس نے مجھے آگے کی طرف دھکیلا' پھر اس نے اپنے آدمیوں کی طرف مڑ کر کہا۔ "وکٹر! یہ کچھ بھی حرکت کرے اسے گولی مار دینا۔ اگر یہ فرار ہونے میں کامیاب ہوا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"آپ مطمئن رہیں باس!" لحیم شحیم وکٹر نے سینہ پھلا کر کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ میں اڑتے پرندے کو بھی ریوالور سے مار گراتا ہوں۔ یہ تو میرے لئے بہت آسان ٹارگٹ ہو گا۔" پھر وہ ایک اور شخص سے مخاطب ہوا۔ "سائمن! تم وکٹر کو پیچھے سے کور دینا۔ گو کہ اس کی ضرورت تو نہیں ہے مگر ہمیں ہر صورت حال کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ میرے پاس بھی مشین پسٹل ہے۔ سب سے پہلے تو اسے میں ہی گولی ماروں گا۔"

"باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔" وہی با وقار آدمی بولا جس نے میرے ہاتھ پیر کھولنے کی بات کی تھی۔ "ابھی تک دوسری پارٹی کو یہ علم نہیں ہے کہ ہم یہاں سودے بازی کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ انہیں اگر بھنک بھی مل گئی تو ہمارا کام بہت دشوار ہو جائے گا۔"

"اس کا مطلب تھا کہ وہاں کوئی دوسری پارٹی بھی تھی جو ان دستاویزات کے لئے کوشاں تھی اور بوبی کی یہ اطلاع ناقص معلومات پر مبنی تھی کہ یہاں تمام ممالک کے لوگ اکٹھے ہو کر سودے بازی کریں گے۔ میں سوچتا ہوا وکٹر اور سائمن کی نگرانی میں لفٹ کی طرف بڑھا۔ باس کہلانے والا شخص میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ جیب میں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور ہو گا اور اس کی انگلی ٹریگر پر ہو گی۔ لفٹ میں مجھے حرکت

کرنے کا بہترین موقع مل سکتا تھا۔ اس وقت وہ تینوں ہی میرے ہاتھوں اور پیروں کی پہنچ میں ہوتے مگر باس بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا۔ اس نے لفٹ سے جانے کی بجائے زینوں کو ترجیح دی تو میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ میں اب کسی دوسرے موقع کی تلاش میں تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے ذرا بھی موقع نہیں ملا کہ میں کچھ کر سکتا۔

بلڈنگ سے باہر مجھے سیاہ رنگ کی ایک بیوک دکھائی دی۔ اس کا باوردی شوفر پچھلی نشست کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ باس نے پہلے مجھے گاڑی میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ میں نے ایک نظر اور اردگرد کا جائزہ لیا تو مجھے کچھ فاصلے پر بوبی اور برڈ نظر آئے۔ بوبی ایک گاڑی کا بونٹ کھولے ہوئے انجن پر جھکا ہوا تھا اور برڈ گاڑی سے ٹیک لگائے اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ میرے عین پیچھے وکٹر موت کے فرشتے کی طرح کھڑا تھا' اس سے کچھ فاصلے پر سائمن تھا اور باس میری دائیں جانب کھڑا تھا۔

میں اچانک گھوما اور باس کو گھیرتا ہوا گاڑی سے کچھ فاصلے پر نکل گیا۔ فوراً" ہی فائر کی تڑتڑاہٹ گونجی اور پھر گویا گولیوں کی بارش ہونے لگی۔

ان لوگوں نے مجھے خوف زدہ کرنے کے لئے شاید ہوائی فائرنگ کی تھی کیوں کہ اس سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا' پھر وہاں اتنے لوگ تھے کہ اگر ہوائی فائرنگ نہ کرتے تو ان میں سے کسی نہ کسی کو گولی ضرور لگتی۔ سب سے بڑا خطرہ تو ان کے باس کے لئے تھا۔ وہ مجھ پر فائر کرتے تو وہ بھی محفوظ نہ رہتا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "تم لوگوں نے اگر میرا راستہ روکا تو میں تمہارے اس باس کی گردن توڑ دوں گا۔ مجھے موت کی پرواہ نہیں ہے۔ ابھی تم لوگ دیکھ ہی چکے ہو کہ میں کس طریقے سے اوپر پہنچا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی گرفت باس کی گردن پر بڑھا دی اور اردگرد کا جائزہ لیا۔

وہ جہاں تھے' وہیں رک گئے تھے۔ فوری طور پر شاید وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو بیٹھے تھے۔ شاید انہیں یقین آگیا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے' اس پر عمل بھی کر بیٹھوں گا۔ جو شخص اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کرشر کے ذریعے اوپر پہنچ سکتا ہے' وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

میرے پاس وہی چند لمحے تھے۔ وہ لوگ سنبھل جاتے تو مجھے گھیرنے کی کوئی اور تدبیر کرتے۔ وہ مختلف ممالک کی خفیہ ایجنسیز اور سنڈیکیٹس کے گھاگ اور تربیت یافتہ تھے' اتنی آسانی سے مجھے نکلنے نہ دیتے۔ ان کا باس غصے میں ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی علامات تو تھیں مگر اس سے زیادہ اس پر جھنجلاہٹ طاری تھی۔ میری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اگر وہ مزاحمت کی کوشش کرتا تو اس کی گردن واقعی ٹوٹ جاتی۔ میں اسے ڈھال بنا کر الٹے قدموں اس گاڑی کی طرف بڑھا جس سے برڈ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس دوران میں اس کا بونٹ بند ہو چکا تھا اور بوبی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر

ہا تھا۔ برڈ البتہ ابھی تک باہر کھڑا تھا۔ مجھے گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے پھرتی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

"کتو، کمینو!" باس غرا کر بولا۔ "دیکھتے کیا ہو؟ جہنم رسید کر دو ان لوگون کو۔" وہ اپنے آدمیوں سے مخاطب تھا۔

فائرنگ کی آواز سن کر وہ پولیس والے نیچے آ گئے تھے جو اس حادثے کی تحقیقات کرنے آئے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ پولیس کی دو گاڑیاں مزید وہاں پہنچ گئی تھیں۔ میں نے سوچا' کاش میں اس وقت پاکستان میں ہوتا۔ ہمارے ملک کی پولیس اتنی مستعد کب ہے۔

"میری پرواہ مت کرو۔" باس پھر غرایا۔

میں نے اچانک اسے برڈ کی طرف دھکیل دیا۔ برڈ نے پھرتی سے اسے گاڑی میں گھسیٹ لیا۔ میں بھی برق رفتاری سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ بوبی نے گاڑی ایک دم جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

اچانک وہاں جیسے بھونچال آ گیا۔ ان سب نے ایک ساتھ گاڑی پر فائرنگ کی تھی مگر کوئی بھی گولی گاڑی کو نقصان نہ پہنچا سکی۔ فائرنگ سے ان کے اپنے ہی کچھ آدمی مارے گئے تھے۔ اچانک برڈ نے نیچے جھک کر کوئی چیز اٹھائی اور کھڑکی سے باہر اچھال دی۔ ہلکا سا دھماکہ ہوا اور فضا میں چاروں طرف دھواں پھیل گیا۔ برڈ نے ایک مرتبہ پھر یہی حرکت کی۔ اس مرتبہ اس نے بہت طاقت ور دستی بم پھینکا تھا۔ اس کا دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ ہماری گاڑی بھی لرز کر رہ گئی۔ اذیت ناک انسانی چیخوں اور کراہوں سے فضا بوجھل ہو گئی۔ بوبی نے اچانک گاڑی کی رفتار خوف ناک حد تک بڑھا دی۔

دشمنوں کا ایک آدمی ابھی تک ہمارے قبضے میں تھا۔ وہ میرے اور برڈ کے درمیان سینڈوچ بنا ہوا تھا۔ "معا" مجھے اس کی تلاشی کا خیال آیا۔ میں نے بے دردی سے اس کا ہاتھ مروڑا اور لباس کی تلاشی لی تو بغلی ہولسٹر سے اعشاریہ چار پانچ کا خوف ناک ریوالور برآمد ہوا۔ مزید تلاشی لینے پر اس کی جیب سے ایک تیز دھار خنجر بھی برآمد ہوا جو چمڑے کے کور میں پوشیدہ تھا۔

"تم لوگ آگ سے کھیل رہے ہو۔" ہمارا شکار بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"آگ سے کھیلنا ہی تو میرا پیشہ ہے۔" میں تضحیک آمیز انداز میں بولا۔ "میں پاکستان میں سرکس میں ملازم تھا۔ وہاں میں منہ سے آگ کے گولے نکالا کرتا تھا۔"

"جب قیامت سر پر منڈلائے گی تو ساری شوخی ہوا ہو جائے گی۔"

"یہ تو شریف آدمی ہے۔" برڈ نے ہنس کر کہا۔ "قیامت تو میرے سر پہ منڈلاتی ہے۔ پانچ فٹ تین انچ کی خوب صورت قیامت! وہ لڑکی اتنی ہی خوبصورت ہے کہ میں اسے قیامت کہتا ہوں۔ واقعی وہ سر پر منڈلاتی ہے تو ساری شوخی بھول جاتا ہوں۔"

ہمارے یرغمالی نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اب کچھ نہ بولنے کا تہیہ کر چکا ہو۔

بوبی تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتا ہوا نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ ایک جگہ گاڑی روک کر اس نے گاری کی اگلی پچھلی دونوں نمبر پلیٹیں تبدیل کیں اور پھر روانہ ہو گیا۔ یقیناً گاڑی کا نمبر نوٹ کیا گیا ہو گا۔ مجھے خود بھی یہی فکر تھی کہ پولیس جلد ہی ناکہ بندی کر کے ہمیں روک لے گی مگر اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ شہر میں اس میک' ماڈل اور کلر کی بہت سی گاڑیاں ہوں گی۔ پولیس کس کس کو چیک کرے گی؟

پھر گاڑی کی کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا کا جھونکا اندر آیا تو اس میں سمندر کی مخصوص بو تھی۔ میں نے چونک کر باہر دیکھا' ہم ایک مرتبہ پھر ساحل کے نزدیک تھے۔ مشکل سے دو منٹ چلنے کے بعد بوبی نے گاڑی روک دی۔ وہاں سے سمندر کی لہروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ بوبی نے ہمیں اترنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اتر گیا۔ برڈ نے یرغمالی باس کو بے دردی سے باہر گھسیٹ لیا۔ باس گھٹنوں کے بل پختہ سڑک پر گرا اور گالیاں دیتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ جواب میں برڈ کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور برڈ غرا کر بولا۔ "آئندہ زبان کو قابو میں رکھنا ورنہ کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

وہ جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر بوبی پر پڑی۔ وہ بوبی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور بولا۔ "بوبی! تم..... تم ان لوگوں کے ساتھ!؟"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" بوبی تلخ لہجے میں بولا۔ "تم لوگ تو میری موت کا پروانہ جاری کر چکے ہو۔ زندہ رہنے کا تو مجھے بھی حق ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے' میں خود اپنی گردن پیش کر دیتا کہ اس پر خنجر پھیر دو۔"

"تو اب تمہارا کیا خیال ہے ذلیل آدمی! تم بچ جاؤ گے؟"

برڈ نے ایک مرتبہ پھر اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ مارا اور بولا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔"

"ارے ارے۔" بوبی نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ "یہ باس ہیں بھئی ان کی بے عزتی تو مت کرو۔ انہی کے حکم سے تو میری موت کا فرمان جاری ہوا ہو گا۔"

"یہ باس ہے؟" برڈ نے جان بوجھ کر حیرت کا مظاہرہ کیا۔ "ایسا ہوتا ہے باس! یہ تو کسی میمنے کی طرح سہا ہوا ہے۔ اگر یہ باس ہے تو بقیہ لوگ کیسے ہوں گے؟"

پھر بوبی اس طرف روانہ ہو گیا جہاں ایک درمیانے درجے کی لانچ پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ یہ وہی لانچ تھی جس پر بوبی کے دوست رابرٹ سے ملاقات ہوئی تھی۔ لانچ دیکھتے ہی ہمارا یرغمالی بڑبڑایا۔ "اس کا مطلب ہے کہ رابرٹ بھی تمہارا ساتھ دے رہا ہے۔ گویا ہماری تنظیم میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور..... مگر میں ان غداروں میں سے ایک کو بھی نہیں

چھوڑوں گا' سب کو اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا۔"

برڈ نے گردن پکڑ اسے لانچ کی طرف دھکا دیا۔

اس مرتبہ باس اپنی توہین برداشت نہ کر سکا اور جنونی انداز میں برڈ کی طرف لپکا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا کالر پکڑ لیا اور اسے دوبارہ لانچ کی طرف دھکیلا۔

رابرٹ کو دیکھتے ہی باس آپے سے باہر ہو گیا اور بپھرے ہوئے انداز میں بولا۔ "حرامزادے! تو بھی تنظیم سے غداری کر رہا ہے؟"

برڈ نے جھپٹ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے بوٹ کے چوبی فرش پر پٹخ دیا۔ پھر وہ پھرتی سے سینے پر سوار ہو گیا اور وہی خنجر نکال لیا جو باس کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ برڈ کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر باس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ میں نے بے نیازی سے کہا۔ "گھبراؤ مت' یہ تمہیں مارے گا نہیں' صرف زبان کاٹے گا۔ اس نے کہا تھا ناکہ اب تم نے اپنی زبان پر قابو نہ پایا تو کاٹ دوں گا۔ تم شاید جانتے نہیں ہو کہ برڈ جو کہہ دیتا ہے' اس پر عمل بھی کرتا ہے۔"

"یہ..... یہ زبان کاٹے گا میری؟" باس کے لہجے میں وحشت تھی۔

"اس نے کہا تھا تو ضرور کاٹے گا۔" بوبی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

برڈ بھی اس وقت بہترین اداکاری کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف باس کو خوف زدہ کرنا چاہتا ہے مگر اس کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر تھا کہ ایک لمحے کو تو مجھے بھی ایسا لگا جیسے برڈ واقعی اس کی زبان کاٹ دے گا۔ اس نے سفاک لہجے میں کہا۔ "اپنی زبان باہر نکالو ورنہ یہ خنجر تمہارے گلے پر پھیر دوں گا۔"

باس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

"اس خنجر کو پہچانو!" بوبی کا لہجہ سرد تھا۔ "یہ وہی خنجر ہے جس سے تم کئی لوگوں کی گردنیں کاٹ چکے ہو۔ تم تو گلے پہ چھری پھیرنے میں ماہر ہو' اتنے ماہر کہ چند لمحے تک تو ذبح ہونے والے کو بھی علم نہیں ہوتا کہ اس کی گردن کٹ چکی ہے۔ غور سے دیکھو' یہ وہی خنجر ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" باس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں..... وعدہ کرتا ہوں کہ اب..... اب..... اپنی زبان....."

"بکو مت!" برڈ سفاک لہجے میں غرایا۔ "زبان باہر نکالو ورنہ..... اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر تیز دھار والا وہ خنجر باس کی گردن پر رکھ دیا۔

باس نے سانس تک روک لی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے برڈ کو دیکھنے لگا۔ وہ اتنی منظم تنظیم کا سرکردہ رکن تھا' یقیناً لڑنے بھڑنے کے فن میں بھی طاق ہو گا۔ اگر وہ ذرا سی کوشش کرتا تو برڈ کو اچھال پھینکتا مگر موت کو سامنے دیکھ کر بڑے سے بڑے سورما کا پتا پانی ہو جاتا

ہے۔ میں نے برڈ سے کہا۔ "یہ اپنی غلطی پر نادم ہے' اسے ایک موقع اور دے دو۔"

برڈ نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا اور اسے چھوڑ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا وجہ سے اسے چھوڑ رہا ہوں ورنہ تم جانتے ہو کہ آج تک میں نے جو کچھ کہا ہے' اس عمل بھی کیا ہے۔"

"رابرٹ!" بوبی نے اچانک رابرٹ کو مخاطب کیا۔ "لانچ کھلے سمندر میں لے چلو ہمیں باس سے کچھ مذاکرات کرنا ہیں۔"

پھر بوبی ہمیں لے کر ایک اور آراستہ کیبن میں جا بیٹھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہاں ملازم ا ایک شخص نمودار ہوا تو بوبی نے اسے ڈرنکس لانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ملازم ٹر میں وہسکی کی بوتل' برف اور سوڈا وغیرہ لے کر آ گیا۔ بوبی نے میرے لئے کافی کا آرڈر دیا پھر باس گویا وہسکی پر ٹوٹ پڑا۔ اسے شاید اس کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ برڈ ا بوبی بھی پینے میں مصروف ہو گئے اور میں ایک مرتبہ پھر احمقوں کی طرح ان کی شکلیں دیکھ لگا۔

○

پھر جب تک لانچ کھلے سمندر میں نہیں پہنچ گئی' بوبی خاموشی سے وہسکی پیتا رہا۔ ملاز اس دوران میں کافی بھی لے آیا تھا۔ کافی کے ساتھ سینڈوچز بھی تھے۔ سینڈوچز دیکھ کر مجھ احساس ہوا کہ مجھے شدید بھوک لگی ہے۔ میں سینڈوچز پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد کافی پی میں مصروف ہو گیا۔

"ہاں تو مسٹر جان!" بوبی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ باس سے مخاطب تھا گویا اس ا نام جان تھا۔ "اب تم یہ بتاؤ کہ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز کہاں ہیں؟"

"وہ تمہارے تصور سے بھی دور ہیں بوبی!" جان نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ وہسکی نے اس پر حیرت انگیز اثر ڈالا تھا۔ اس کا کھویا ہوا اعتماد لوٹ آیا تھا۔

"تم سے جتنا پوچھا جا رہا ہے' اس کا جواب دو۔" برڈ نے بھڑک کر کہا۔ "وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز کہاں ہیں؟"

"یہ تو میں تمہیں نہیں بتا سکوں گا۔"

"کیوں؟" برڈ غرا کر کھڑا ہو گیا۔

"اطمینان سے سوچ سمجھ کر جواب دو جان!" بوبی نے کہا۔ "ہمیں مجبور مت کرو کہ ا بھی تمہارے ساتھ ہی سلوک کریں جو تم اب تک دوسروں کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔ جانتے ہو کہ میرے سامنے گونگے بھی بول پڑتے ہیں۔"

"مجھے دھمکیاں مت دو۔" جان جھنجلا کر بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم تشدد کرنے م

ماہر ہو۔"

"تو پھر بتاؤ وہ دستاویزات اور فلمیں اس وقت کہاں ہیں؟" بوبی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم ان لوگوں کے لئے اپنے ملک سے غداری کر رہے ہو؟" جان نے کہا۔ "کس پارٹی سے تعلق ہے ان کا؟"

"وہ کاغذات اور فلمیں میرے وطن کی امانت ہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تو گویا تم پاکستانی ہو؟" جان نے کہا۔

"ہاں' میں پاکستانی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور مجھے اس پر فخر ہے۔ میں نے بغیر لالچ کے محض ان کاغذات کی خاطر پاکستان سے یہاں کا سفر کیا ہے۔"

"تم بغیر کسی معاوضے کے یہاں صرف ان کاغذات کے لئے آئے تھے؟" جان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جب قوم کی امانت خطرے میں ہو' اس کی عزت و وقار داؤ پر لگا ہو تو اس کی آبرو کا تحفظ بغیر کسی معاوضے ہی کے کیا جاتا ہے۔" میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "مگر یہ بات تم نہیں سمجھو گے کیوں کہ تم صرف اور صرف دولت کی خاطر ان کاغذات کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہو۔ میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے ان کاغذات کا پتہ بتا دو ورنہ جو شخص اپنی جان کی پرواہ نہ کرے' دوسرے کی جان اس کے لئے کیا اہمیت رکھتی ہے۔"

میری بات سن کر جان کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا' پھر وہ چونک کر بولا۔ "مگر بوبی..... یہ تو بغیر معاوضے کے اپنے باپ کا کام بھی نہ کرے۔ اسے تم نے کتنی رقم کی آفر کی ہے؟"

"کسی رقم کی نہیں۔" میں اس کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "اس نے مجھے زبان دی تھی کہ اگر میں نے اسے زیر کر لیا تو یہ مجھے کاغذات کا پتہ بتا دے گا ورنہ میں اسے رہا کر دوں گا۔ میں نے اسے زیر کر لیا تو اس نے بھی اپنی زبان کا پاس رکھا۔"

"تو پھر اسی سے پوچھ لو کاغذات کا پتہ بھی۔" جان نے اطمینان سے جواب دیا۔

"یہ مجھے بتا چکا تھا۔ جلد بازی میں حماقت سرزد ہو گئی ورنہ وہ کاغذات اور فلمیں اب تک میرے قبضے میں ہوتیں۔"

"وقت ضائع مت کرو خرم!" برڈ نے بیزاری سے کہا۔ "یہ کچھ بتاتا ہے تو بتائے ورنہ اسے مار کے سمندر میں پھینک دو۔" برڈ نے یوں کہا جیسے اس نے کسی کتے کو مارنے کی بات کی ہو۔

بوبی نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی' پھر جان سے بولا۔ "وقت واقعی بہت کم ہے۔

جلدی بولو کاغذات کس کے پاس ہیں؟" پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ "یہ بہت سفاک لوگ ہیں۔ میں تو ان کا تشدد برداشت کر گیا مگر تم نہ کر سکو گے۔ تم نے وانگ یو کا نام تو سنا ہے نا! یہ خرم اسی کا تربیت یافتہ ہے۔"

جان نے چونک کر مجھے دیکھا' پھر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ "اچھا تو تم ہو خرم! تم سے ملنے اور تمہیں دیکھنے کی تو بہت خواہش تھی۔"

"جی بھر کے اپنی خواہش پوری کرو۔ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "مگر ان کاغذات کا پتہ بتا دو۔"

"ایک شرط پر بتا سکتا ہوں۔" جان پرخیال لہجے میں بولا۔

"چلو پھر پہلے اپنی شرط بتا دو ممکن ہوا تو تمہاری وہ شرط بھی پوری کر دوں گا۔"

"میں کاغذات اور مائیکرو فلمز تمہارے حوالے کر دوں گا پھر تمہیں ہمارے ساتھ کام کرنا ہو گا۔ اس کا تمہیں اتنا معاوضہ ملے گا کہ تم نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو گا۔"

"میں کوئی پیشہ ور بدمعاش نہیں ہوں مسٹر جان!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "مجھے تم سے یا تمہاری تنظیم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس تنظیم کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ میں تمہارا ساتھ کیسے دے سکتا ہوں؟"

"بس اب میں پانچ تک گنوں گا۔" برڈ نے چیخ کر کہا۔ "اگر تم نے زبان کھول دی تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہیں بولنے کے قابل ہی نہ چھوڑوں گا' پھر تم لکھ کر بتاؤ گے۔ تب بھی نہ بتایا تو میں تمہیں ایک دم نہیں ماروں گا بلکہ آہستہ آہستہ' قسطوں میں تمہاری جان لوں گا۔" برڈ کا لہجہ سفاک تھا۔ پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ "ون!..... اتنا کہہ کر اس نے جیب سے پھر وہی خنجر نکال لیا جس سے وہ تھوڑی دیر پہلے جان کی زبان کاٹنا چاہتا تھا۔

جان کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ خوشامدانہ لہجے میں برڈ سے بولا۔ "دیکھو' تم تو ایسا ظلم مت کرو' تم تو میرے ہم مذہب اور ہم وطن ہو۔"

"ٹو....." برڈ نے اس کی آہ و بکا پر کان دھرے بغیر کہا۔

"اب تمہیں مذہب اور وطن یاد آ گیا!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہارا مذہب تو پیسہ ہے' صرف اور صرف پیسہ!"

"تھری!" برڈ نے بلند آواز میں کہا اور جھپٹ کے ایک مرتبہ پھر جان کو پچھاڑ دیا۔ جان نے بالکل بھی مزاحمت نہیں کی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہے۔ برڈ پہلے کی طرح ایک مرتبہ پھر اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور اس کے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر اپنے گھٹنوں سے دبا دیئے۔ پھر وہ جان کا گلا دبانے لگا۔ اس کی زبان خود بہ خود باہر نکل آئی۔

جان پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔ "بتاتا ہوں' بتاتا ہوں۔"

"تم نے بہت دیر کردی مسٹر جان!" برڈ نے کہا۔ "اب تم بتا بھی دو گے تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"ٹھہر جاؤ برڈ!" بوبی نے اسے روک دیا۔ "مسٹر جان زندگی میں پہلی دفعہ اتنے دہشت زدہ نظر آ رہے ہیں مجھے۔ آخر یہ ایک گینگ کے بڑوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ تو رعایت کرو۔"

برڈ نے اپنی گرفتار ذرا ڈھیلی کر دی۔ "ہاں بولو!" "وہ مائیکرو فلمز اور دستاویزات....."

"ہاں' بولو' وہ کہاں ہیں؟" برڈ نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ میرے ایک خاص آدمی پیٹر کے پاس ہیں۔" جان نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"پیٹر کے پاس!" بوبی نے دہرایا۔ "پیٹر اب تمہارے ساتھ کام کر رہا ہے؟"

"ہاں' وہ اب ہمارے ساتھ ہے۔" جان نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"اور تم نے اس پر اتنا اعتماد کر لیا کہ اسے وہ قیمتی اسٹف دے بیٹھے!" بوبی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"تمہاری طرح وہ بھی زبان کا دھنی ہے۔" جان نے جواب دیا۔

"میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کتنا فیئر ہے۔ بہرحال یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ اس وقت پیٹر کہاں ملے گا؟"

"اس وقت وہ کسی نائٹ کلب میں ہو گا۔ مجھے علم نہیں ہے کہ وہ کس نائٹ کلب میں ہو گا۔"

"مجھ سے اڑنے کی کوشش مت کرو۔" بوبی نے اسے جھڑک دیا۔ "مجھے اس کا صحیح ٹھکانا بتاؤ۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت....."

"مجھے یہ بتاؤ کہ وہ ٹھہرا ہوا کہاں ہے؟" بوبی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جہاں بھی ہو گا' بالآخر گھوم پھر کے جائے گا تو وہیں۔"

"وہ..... ہوٹل شوارز میں مقیم ہے۔" جان نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' ہم اسے وہیں چھاپ لیں گے۔ اس وقت تک تم ہماری قید میں رہو گے اور اگر یہ جھوٹ ہوا تو....."

"مجھے تھرڈ کلاس لوگوں کی طرح بار بار دھمکیاں مت دو۔" جان جھنجلا گیا۔

"رابرٹ!" بوبی نے آواز دی۔ رابرٹ شاید انجن روم میں تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی وہ آ گیا۔ "ہمارے اس مہمان کو بہت حفاظت سے رکھنا۔ بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔" رابرٹ نے جواب دیا۔
"اسے یوں نہ چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "اس کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھ دو۔ پھ
اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکے گا۔"
رابرٹ نے فوراً ہی رسی کا ایک لچھا مہیا کر دیا۔ برڈ نے آگے بڑھ کر اسے ا
مضبوطی سے باندھا کہ اس کے لئے سانس لینا بھی محال ہو گیا۔ پھر اسے ایک کیبن میں مق
کر دیا گیا۔

○

اس سے فارغ ہو کر ہم پھر اس کیبن میں جا بیٹھے جس میں تھوڑی دیر قبل بیٹھے ہو
تھے۔ مجھے بے چینی ہو رہی تھی کہ آخر بولی کیا سوچ رہا ہے۔ اسے تو فوراً ہوٹل شوا
چلنا چاہئے تھا۔ بولی نے شاید میرے چہرے سے اندرونی اضطراب کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے
تشویش انداز میں کہا۔ "میں خود بھی فوری طور پر پیٹر کو گھیرنا چاہتا ہوں مگر میری چھٹی ح
مجھے خبردار کر رہی ہے کہ اس میں جان کی کوئی چال نہ ہو۔"
"میں سمجھا نہیں۔" میں نے الجھ کر کہا۔
"جان ایسے لوگ اتنی آسانی سے زبان نہیں کھولتے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہو
مر جاتا مگر منہ سے کچھ نہ بولتا۔ اس کا ڈرنا اور دہشت زدہ ہونا تو سو فی صد اداکاری تھی۔
انتہائی خطرناک صورت حال میں بھی کبھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ بس یہی سوچ کر میں فو
طور پر وہاں جانے سے گریز کر رہا ہوں۔"
"وہاں ہمیں کس قسم کا خطرہ ہو سکتا ہے؟" میں جھنجلا گیا۔ "کیا جان کو علم غیب تھا
ہم اسے قیدی بنا لیں گے جو وہ پہلے سے کوئی سیٹ اپ تیار کر سکے۔"
بولی پھیکے سے انداز میں مسکرایا، پھر بولا۔ "جان دنیا کی ایک بڑی مافیا کا سرکردہ ر
ہے۔ اسے خبط الحواس لوگوں کی طرح گھگھیاتے دیکھ کر تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟" پھر وہ
توقف کے بعد بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ جان کتنا سخت جان اور دلیر آدمی ہے۔ اس نے
تنظیم میں کسی کو سفارش سے یہ مقام نہیں بنایا ہے۔ وہ بدترین حالات میں بھی اپنے حو
نہیں کھوتا ہے، پھر....."
"بس کرو یار!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے تو باقاعدہ جان کی شخصیت
لیکچر دینا شروع کر دیا۔"
"یہ لیکچر نہیں ہے میرے دوست بلکہ میں تمہیں حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔ چالا
سے چالاک شخص بھی کہیں نہ کہیں مار کھا جاتا ہے۔ ہمیں دھوکہ دیتے وقت جان یہ بھول
کہ میں اس سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔"

"پھر اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟" برڈ نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہم یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟"

"نہیں ہم لوگ پیٹر کے ہوٹل ضرور جائیں گے۔" بوبی نے جواب دیا۔ پھر وہ پرخیال انداز میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ پیٹر تمہیں یا خرم کو نہیں پہچانتا ہے۔ اگر تم لوگ......"

"اگر پیٹر پاکستان گیا ہو گا تو وہ خرم کو بھی ضرور پہچانتا ہو گا۔" برڈ نے کہا۔ "اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ ان کاغذات اور مائیکرو فلمز کے لئے پاکستان گیا ہو گا۔"

"ہاں' اس بات کا امکان ہے۔" بوبی نے کہا' پھر وہ عالم اضطراب میں ٹہلنے لگا۔ "ہمیں فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا ہو گا۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

"اس کی ایک ہی صورت ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "برڈ میرے ساتھ وہاں جائے گا چاہے وہ ہمیں پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو۔ ہر صورت میں ہمیں وہاں جانا ہے۔ تم ہم سے کچھ فاصلے پر رہنا تاکہ خطرے کی صورت میں ہمیں کور دے سکو۔"

"چلو پھر اٹھو۔" بوبی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے رابرٹ کو حکم دیا کہ لانچ دوبارہ ساحل کی طرف لے چلو' پھر وہ ہم سے مخاطب ہوا۔ "ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا ہے۔ پیٹر اس وقت کسی کلب یا بار میں ہو گا۔ ہم اس کے کمرے میں گھات لگا کر بیٹھ سکتے ہیں۔"

"ہم تینوں نہیں' صرف میں اور برڈ۔" میں نے کہا۔ "تم ہوٹل سے باہر رہ کر نگرانی کرنا۔"

اس دوران میں ہم دوبارہ ساحل پر پہنچ چکے تھے۔ ہم تینوں بوٹ سے اتر کر اس طرف آئے جہاں ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے پاس جا کر اس نے اچانک گاڑی میں سوار نہ ہونے کا فیصلہ کیا اور بولا۔ "گاڑی کی باڈی پر فائرنگ کے نشانات ہیں۔ گاڑی دیکھتے ہی پولیس ہمیں دھر لے گی۔ ہمیں کسی اور گاڑی کا بندوبست کرنا ہو گا۔ میں رابرٹ سے پوچھتا ہوں۔ ممکن ہے اس سلسلے میں وہ کچھ مدد کر سکے۔" وہ ہمیں چھوڑ کر دوبارہ لانچ کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اسی ملازم سمیت نمودار ہوا جس نے مجھے کافی سرو کی تھی۔ بوبی نے اشارے سے ہمیں وہیں رکنے کو کہا اور خود اس ملازم کے ساتھ اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا۔ میں اور برڈ وہیں کھڑے بور ہوتے رہے۔

پھر ہم دور سے کسی گاڑی کے ہیڈلیمپ دیکھ کر چونک اٹھے۔ گاڑی تیز رفتاری سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر ہم دونوں نے ریوالور نکال لئے اور اسی گاڑی کی آڑ میں پوزیشنیں لے لیں جس کے نزدیک ہم کھڑے تھے۔

آنے والی گاڑی ہمارے بالکل نزدیک آ رکی۔ برڈ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ونڈا سکرین پر فائر کرنا چاہا مگر بوبی کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ وہ بلند آواز میں بول رہا تھا۔ "خرم!..... برڈ'

فائر مت کرنا۔"
اس کی آواز سنتے ہی ہم نے ریوالور دوبارہ جیبوں میں ڈال لئے۔
بوبی ہنستا ہوا گاڑی سے اترا اور بولا۔ "مجھے سو فی صد یہی خدشہ تھا کہ تم لوگ دشمن سمجھ کر مجھ پر فائر کرو گے۔"
"میں واقعی فائر کرنے والا تھا۔" برڈ نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں جانے سے پہلے بتا دینا چاہئے تھا کہ تم گاڑی لینے جا رہے ہو۔"
"چلو اب بیٹھو گاڑی میں۔" بوبی نے کہا پھر چونک کر بولا۔ "مگر پہلے ضروری سامان تو لے لو۔" یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور اس میں سے مخصوص ساخت کے دو بریف کیس نکال لایا۔ اس نے ایک بریف کیس میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں سگ کی دور مار کرنے والی ہلکی پھلکی' جدید آٹومیٹک رائفل اور ایک مشین پسٹل ہے۔ اس کے ساتھ رائفل اور پسٹل کے فاضل راؤنڈز بھی ہیں۔ ایک ایک کولٹ ریوالور اور تم لوگوں کے پاس ہے۔ میرے خیال میں اتنا اسلحہ کافی ہے۔"
"اگر وہاں مقابلے پر پوری بٹالین ہوئی تو یہ اسلحہ ناکافی ہو گا۔" برڈ نے سنجیدگی سے کہا۔
بوبی چند لمحوں تک حیرت سے اسے دیکھتا رہا' پھر زوردار قہقہہ لگا کر بولا۔ "مجھے ایسے ہی لوگ پسند ہیں جو کسی خطرناک مشن پر جاتے ہوئے زندہ دلی کا مظاہرہ کریں۔" پھر وہ برڈ کے کندھے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "تم فکر مت کرو۔ اگر پوری بٹالین ہوئی تو تمہاری بجائے میں آگے ہو جاؤں گا' چلو اب بیٹھو گاڑی میں۔"
تھوڑی دیر بعد ہماری گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ اسٹیرنگ حسب معمول بوبی کے ہاتھ میں تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم شہر کے بارونق علاقے میں پہنچ گئے۔ ابھی رات کے گیارہ بجے تھے اس لئے شہر کی رونق عروج پر تھی۔ پھر میں نے ہوٹل شوارز کا روشن سائن بورڈ دیکھا مگر بوبی وہاں رکا نہیں بلکہ ہوٹل سے کافی فاصلے پر اس نے گاڑی پارک کی۔ پارکنگ اس نے کچھ ایسے انداز میں کی تھی کہ اگر ہمیں وہاں سے عجلت میں روانہ ہونا پڑے تو کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔
"اب تم لوگ جاؤ۔" بوبی نے مجھے اور برڈ کو مخاطب کیا۔ "بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ پیٹر کا پورا نام پیٹر اینڈرسن ہے۔ ممکن ہے اس نے اینڈرسن کے نام سے کمرہ لیا ہو۔"
ہم دونوں گاڑی سے اتر کر ٹہلنے والے انداز میں ہوٹل کی طرف بڑھے۔ میرے ہاتھ میں نفیس قسم کا وہ بریف کیس تھا جس میں موت بند تھی۔ دوسرا بریف کیس بوبی نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ رائفل' مشین پسٹل اور فاضل راؤنڈز کی وجہ سے وہ بریف کیس بہت وزنی ہو گیا تھا مگر میں نے اسے اس انداز میں اٹھا رکھا تھا جیسے اس میں صرف کاغذات ہوں۔ برڈ

مجھ سے دو قدم پیچھے تھا اور یوں اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا جیسے وہاں کی رونق سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ میں نے وہاں جا کر بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ مجھے پیٹر کے علاوہ شواکی کے آدمی بھی پہچان سکتے تھے۔ میں بہت اعتماد سے ہوٹل میں داخل ہوا اور نپے تلے قدم رکھتا ہوا استقبالیہ کاؤنٹر تک پہنچ گیا۔ کاؤنٹر پر خوب صورت سی چینی گڑیا نے دلکش مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا اور مودب انداز میں بولی۔ "لیں پلیز!"

"مجھے ایک صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ "ان کا نام پیٹر ہے۔ شاید انہوں نے میرے بارے میں آپ کو مطلع کیا ہو۔"

"مسٹر پیٹر!" چینی گڑیا نے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی۔ "ہاں مجھے یاد آگیا۔" یہ کہہ کر وہ رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگی۔ پھر سر اٹھا کر بولی۔ "مسٹر پیٹر روم نمبر ایٹ ون سکس میں ٹھہرے ہوئے ہیں مگر وہ تو اس وقت موجود نہیں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ وہ موجود نہیں ہیں کہ کیا انہوں نے میرے بارے میں آپ کو کوئی ہدایت نہیں دی؟ میرا نام ڈینی ہے۔ میں نیویارک سے آیا ہوں۔"

"مسٹر پیٹر نے آپ کے بارے میں تو کوئی اطلاع نہیں دی۔" چینی لڑکی نے بہ دستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ شاید بھول گئے ہوں گے۔" میں بھی جواب میں مسکرایا۔ "اینی ہاؤ۔" میں نے شانے اچکا کر کہا۔ "مجھے یہاں کوئی کمرہ مل جائے گا؟"

"شیور مسٹر ڈینی!" لڑکی مسکرائی اور اندراج کا رجسٹر اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے وہی نام پتہ لکھایا جو میں اسے بتا چکا تھا۔

اس نے وہ رجسٹر اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک دوسری لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ دوسری لڑکی نے رجسٹر میں کمرہ نمبر درج کیا اور کی اسٹینڈ سے ایک چابی اتار کر میری طرف بڑھائی۔ "روم نمبر سیون او فور مسٹر ڈینی!" اس نے مودب انداز میں کہا۔

فوراً ہی ہوٹل کا ایک باوردی پورٹر نمودار ہوا اور اس نے مجھ سے بریف کیس لینا چاہا مگر سر کی ہلکی سی جنبش سے میں نے انکار کر دیا۔ اس نے صرف چابی لی اور مجھے لفٹ کی طرف لے گیا۔ جب میں لفٹ میں سوار ہوا تو برڈ بھی میرے ساتھ ہی لفٹ میں سوار ہو گیا۔ لفٹ میں دو ایشیائی مرد اور دو نیگرو لڑکیاں بھی تھیں۔ میں نے برڈ کو سنانے کے لئے بلند آواز میں پورٹر سے پوچھا۔ "روم نمبر؟"

"سیون او فور سر!" وہ جلدی سے بولا۔

پھر میں ساتویں منزل پر اتر گیا مگر برڈ اوپر چلا گیا۔

پورٹر کے جانے کے بعد میں نے بریف کیس احتیاط سے دیوار گیر الماری میں رکھا اور جوتوں سمیت بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ سے میرا جسم بری طرح ٹوٹ رہا

تھا۔ بلڈنگ کرشر کے گرنے کے باعث میرے دائیں گھٹنے اور کمر میں شدید چوٹ آئی تھی جو فوری طور پہ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اب میں سکون سے لیٹا تو تکلیف کا احساس ہوا۔ اس بھاگ دوڑ میں میرے کپڑے بھی میلے ہو گئے تھے مگر جینز اور جیکٹ جتنی زیادہ میلی ہو اتنی ہی قیمتی ہوتی ہے اس لئے کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی تھی۔

مجھے لیٹے ہوئے مشکل سے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے لیٹے لیٹے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مشین پسٹل گرفت میں لے لیا اور محتاط انداز میں بولا۔ ''بس' کم ان.....''

دوسرے ہی لمحے برڈ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''تم بھی بعض اوقات پیٹ بھر کے احمق ہو جاتے ہو۔''

''میں نے کیا حماقت کر دی بھائی افلاطون!'' میں نے کروٹ بدلتے ہوئے پوچھا۔

''اس استقبالیہ کلرک سے خواہ مخواہ بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' برڈ ایک دم طیش میں آ گیا۔

''تو ایسی کیا قیامت آ گئی؟'' میں بھی جھنجلا گیا۔

''ہم یہاں پکنک پر نہیں آئے ہیں۔'' برڈ منہ بنا کر بولا۔ ''پیٹر کے آتے ہی وہ اسے ڈینی کے بارے میں اطلاع دے گی اور یہ بھی بتا دے گی کہ مسٹر ڈینی فلاں فلاں کمرے میں مقیم ہیں۔ جایئے اور جا کر ان کا گلا دبا دیجئے۔ پیٹر بہت اطمینان سے آپ کو ٹھکانے لگائے گا اور ثبوت کے طور پر آپ کا سر کاٹ کر لے جائے گا۔ پھر آپ کی روح ان کاغذات اور مائیکرو فلمز کے لئے بھٹکتی رہے گی اور جب تک وہ چیزیں حاصل نہیں کرے گی' اس وقت تک یہ لوگوں کا ناطقہ بند رکھے گی۔''

اس کے جلے کٹے انداز پر بے ساختہ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''میری روح سب سے پہلے تمہاری گردن دبوچے گی کہ تم خاموش تماشائی کیوں بنے رہے؟''

''اب آپ دانت مت نکالیں اور نکلیں یہاں سے؟'' برڈ اسی لہجے میں بولا۔

''اوکے باس!'' میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا اور اٹھ بیٹھا' پھر ہنس کر بولا۔ ''ویسے تم غصے میں کسی اٹالین بیوہ کی سی حرکتیں کرتے ہو' بیوہ جو کثیرالعیال بھی ہو اور شرارت پر بچوں کو جلی کٹی سنا کر خود اپنی بوٹیاں نوچنے لگے۔''

''برڈ نے بھنا کر میری گردن پکڑ لی۔'' اس بکواس کے لئے ساری عمر پڑی ہے احمق! اس کمرے سے باہر نکلو۔ میں نے نویں منزل پر ایک اور کمرہ بک کر لیا ہے۔'' اس نے گردن پکڑ کے مجھے دروازے کی طرف دھکیلا۔

''ارے یار' مجھے اپنا بریف کیس تو لینے دو۔ ایسی بھی کیا جلدی!'' یہ کہتے ہوئے میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا ورنہ برڈ کا گھمایا ہوا ہاتھ میرے منہ پر پڑتا۔ میں نے بریف کیس لے

کر چلتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے۔ یہ تم نے کلارا کی جگہ کب سے لے لی؟"

میری بات کا جواب دیئے بغیر اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور بولا۔ "روم نمبر ائین ون فائیو۔" یہ کہہ کر وہ پھرتی سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کھوپڑی سہلائی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرہ لاک کرنے کے بعد میں نے لفٹ کی بجائے زینہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور ٹہلتا ہوا زینے لی طرف بڑھ گیا۔ کوریڈور بالکل سنسان تھا۔ برڈ کا دور دور پتہ نہیں تھا۔

کمرہ نمبر نو سو پندرہ زینے کے نزدیک ہی تھا۔ میری دستک کے جواب میں فوراً ہی برڈ نے دروازہ کھول دیا۔ اس کا موڈ ابھی تک آف تھا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد میں نے کہا۔ "ایسے یار، تم سے بھی کبھی کبھی عقل مندی کی کوئی حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔ واقعی میں نے انتہائی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔"

"زیادہ باتیں مت بناؤ۔" برڈ نے کہا۔ "پہلے ہمیں کچھ کھا پی لینا چاہیئے، پھر نہ جانے اب موقع ملے۔"

"یار، تم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بکواس نہیں کرنے لگے ہو!" برڈ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یا پھر واقعی پیٹر سے خوف زدہ ہو؟"

"میرا خیال ہے پہلے میں نہا لوں ورنہ یونہی بکواس کرتا رہوں گا۔" یہ کہہ کر میں باتھ روم میں گھس گیا۔

میں باتھ روم سے نکلا تو خود کو خاصا فریش محسوس کر رہا تھا۔ برڈ نے روم سروس سے کھانا منگوا لیا تھا۔ کھانا دیکھتے ہی میری بھوک چمک اٹھی اور میں بغیر کچھ کہے سنے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد برڈ نے کافی منگوائی اور ڈسپرین کی دو ٹیبلس نکال کر مجھے دے دیں۔ اس وقت واقعی میں ان کی ضرورت محسوس کر رہا تھا، گھٹنے کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے دونوں گولیاں نگل کے کافی کے دو کپ پیئے اور بیڈ پر نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔

برڈ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم ایک گھنٹے کی نیند لے لو۔ پیٹر ڈھائی تین بجے سے پہلے نہیں آئے گا۔ میں اس کا دھیان رکھوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ہم کوئی کارروائی چار بجے کے بعد ہی کریں۔

"مگر تم جاگتے رہنا۔ یہ نہ ہو کہ پھر ہم دونوں کی روحیں بھٹکتی پھریں۔" یہ کہہ کر میں پھیل گیا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے اتنا تھکا دیا تھا کہ میں فوراً ہی بے خبر ہو گیا۔

○

اچانک میری آنکھ کھل گئی مگر فوری طور پر آنکھ کھلنے کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر

ٹک کی ایک آواز گونجی۔ آواز میرے سرہانے کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ
برڈ بھی سامنے والے صوفے پر موجود نہیں تھا۔ میرا ہاتھ مشینی انداز میں جیکٹ کی جیب
تک گیا اور مشین پسٹل نکال کر میں ایک دم الٹی قلا بازی کھا گیا۔

"فائر مت کرنا خرم!" برڈ کی وحشت زدہ آواز سنائی دی۔ اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر
جاتی تو گولی اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیتی۔

میں نے دیکھا' وہ بریف کیس سے رائفل نکال کر جوڑ چکا تھا۔ شاید میری آنکھ بھی
رائفل جوڑنے کے کھٹکے سے کھلی تھی۔ دوسری دفعہ اس نے رائفل میں میگزین فٹ کیا
تھا۔ میں جھنجلا کر بولا۔ "اب بتاؤ احمق کون ہے؟ اگر میں ابھی تمہارا جھٹکا کر دیتا تو!"

"یار' میں نے تو اس خیال سے تمہیں نہیں اٹھایا کہ تم کچھ دیر مزید آرام کر لو۔ مجھے
یاد ہی نہیں رہا کہ تم خفیف سی آواز سے بھی چوکنے ہو جاتے ہو۔ میں نے سوچا کہ فا
وقت میں رائفل ہی جوڑ لی جائے۔"

میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اس وقت پونے چار بجے تھے۔ میں نے برڈ
پیٹر کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ پیٹر دو ہی بجے اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

مجھے بوبی کی بھی فکر تھی۔ وہ بیچارہ تو ہمارے انتظار میں سوکھ گیا ہو گا۔ میں نے سو
کم از کم اسے کمرے کا نمبر ہی بتا دوں۔ یہی سوچ کر میں دروازہ لاک کر کے نیچے گیا تھا
بھی اتفاق ہی ہے کہ اسی وقت پیٹر یہاں پہنچا تھا۔"

"کیا تم پہچانتے ہو پیٹر کو؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"یار' پوری بات سنا کرو۔" برڈ جھنجلا گیا۔ "وہ استقبالیہ کاؤنٹر پر کھڑا تھا اور استا
کلرک اسے ڈینی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ بری طرح چونک اٹھا' پھر لڑکی سے پوچھا
مسٹر ڈینی اس وقت کہاں ہیں؟ لڑکی نے بتایا کہ وہ اس وقت آرام کر رہے ہیں۔ اس
حسب توقع اسے تمہارے کمرے کا نمبر بھی بتا دیا۔"

"پھر!" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر کیا' وہ اپنے کمرے میں گیا اور لیٹ کر اطمینان سے سو گیا۔ بہ ظاہر تو یہی لگتا
کیوں کہ پھر وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا۔" برڈ نے کہا' پھر بولا۔ "میں بوبی کی تلاش میں
نکلا تو مجھے وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں مایوس ہو کر لوٹنے ہی والا تھا کہ ایک قدرے
گوشے سے بوبی نمودار ہوا۔ وہ گاڑی ہی میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر مضطرب لہجے میں
لگا کہ سب خیریت تو ہے؟ میں نے بتایا کہ ابھی تک تو سب خیریت ہے۔ وہ مجھ سے
ابھی ابھی پیٹر واپس آیا ہے۔ اس کے ساتھ چار آدمی اور بھی ہیں۔ ان میں سے دو
رہ گئے تھے' وہ اسی ہوٹل میں مقیم ہیں۔ ممکن ہے بقیہ دو بھی یہیں کہیں بیٹھے ہو
بہت چالاک لوگ ہیں۔ خاص طور پر پیٹر لومڑی کی طرح مکار ہے۔ نسلی اعتبار سے

ہے اور اسرائیلی خفیہ تنظیم موساد کا سفاک ترین ایجنٹ ہے۔ تم واپس خرم کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے میں الٹے قدموں لوٹ آیا۔"

برڈ کی گفتگو سے میری نیند اڑ گئی تھی۔ میں نے پھرتی سے جوتے پہنے اور جیکٹ چڑھا کر تیار ہو گیا۔

"میرا خیال ہے کہ پیٹر سے پہلے ہم اس کے کمرے پہ ہلہ بول دیں۔" برڈ نے کہا۔

"ہم کسی جنگل یا ویرانے میں نہیں ہیں' شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں چند منٹ میں پولیس کی بھاری جمعیت بھی پہنچ جائے گی اور ہوٹل کی سیکورٹی بھی بہت مستعد ہو گی۔"

"پھر کیا ہم انتظار کریں کہ پیٹر کی طرف سے کوئی کارروائی ہو؟" برڈ جھنجلا گیا۔

"میں خاموشی سے اس کے کمرے میں داخل ہو جاؤں گا اور اسی خاموشی سے پیٹر کو قابو کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "تم پیچھے رہ کر مجھے کور دینا۔"

"ٹھیک ہے' یونہی سہی۔" برڈ نے گہرا سانس لے کر کہا اور اپنے مشین پسٹل کا میگزین چیک کرنے لگا۔ اس نے کئی فاضل میگزین بھی اپنی جیکٹ اور پینٹ کی جیبوں میں ڈال لئے۔ میں نے وہ رائفل بھی اسی کو دے دی۔ وہ جدید قسم کی فولڈنگ رائفل تھی جس کا دستہ علیحدہ ہو جاتا تھا یا پھر فولڈ ہو کر وہ چھوٹی ہو جاتی تھی۔ برڈ نے اسے فولڈ کر کے عمودی حالت میں اپنی بائیں ٹانگ کے نیچے دبا لیا۔ پھر ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے زینے کی طرف بڑھے۔ لفٹ استعمال کرنے میں بھی خطرہ تھا۔ ممکن ہے نیچے پیٹر کا کوئی آدمی موجود ہو اور وہ لفٹ سے اندازہ لگا لے کہ کوئی اس فلور پر گیا ہے جس پر پیٹر کا کمرہ ہے۔ ہم اس وقت نویں منزل پر تھے' پیٹر آٹھویں منزل پر مقیم تھا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نچلی منزل پر پہنچے۔ ابھی ہم نے کوریڈور میں قدم رکھا ہی تھا کہ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ پیٹر کے کمرے سے کوئی آدمی دبے پاؤں باہر نکلا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ وہ لفٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ اس دوران میں برڈ بھی میرے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا مگر' میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پیٹر کے کمرے سے نکلنے والا اگر مڑ کر دیکھ لیتا تو ہم اس کی نظروں میں آ جاتے اور وہ ہوشیار ہو جاتا۔ سیڑھیوں پر دبیز قالین تھا اس لئے ذرا سی بھی آہٹ پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لفٹ میں داخل ہونے سے پہلے برڈ نے بھی اس کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اس نے سرگوشی میں مجھے بتایا کہ یہی پیٹر ہے۔ ہم دونوں تیزی سے لفٹ تک پہنچے تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ وہ کس فلور پر گیا ہے۔ لفٹ کے اوپر سات نمبر کا نشان روشن ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پیٹر ساتویں منزل پر گیا تھا۔ میں پھر زینے کی طرف لپکا۔ ہم دونوں پھرتی سے منزل پر پہنچے تو پیٹر میرے کمرے کے دروازے پر جھکا ہوا کچھ کر رہا تھا' پھر اس نے دیکھتے

ہی دیکھتے دروازے کا لاک کھول لیا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں نے سرگوشی میں برڈ سے کہا۔ میں کمرے میں جا کر اسے گھیرتا ہوں۔ تم باہر رہ کر نگرانی کرنا۔" یہ کہہ کر میں سرعت سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں جونہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ پیٹر دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا اعشاریہ چار پانچ کا خوف ناک ریوالور تھا۔ ریوالور پر سائلنسر فٹ تھا اور اس کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ کمرے میں ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پیٹر کا چہرہ پتھریلا اور ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ اس نے غراتے ہوئے کہا۔ "حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہاری کھوپڑی کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ کون ہو تم اور میری تلاش تمہیں کیوں ہے؟"

"میں نے کب کہا کہ مجھے تمہاری تلاش ہے۔ یہ میرا کمرہ ہے اور یہ سوال تو مجھے کرنا چاہئے کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"گڈ!" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اگر یہ تمہارا کمرہ ہے تو پھر تم ڈینی ہو۔ کم از کم تم نے ہوٹل کے رجسٹر میں یہی نام لکھوایا ہے اور ڈینی کو میری تلاش تھی۔ میں خود ہی آ گیا ہوں۔ اب بولو تم مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہے تھے؟"

"کہاں کی ہانک رہے ہو؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے بھلا تمہاری تلاش کیوں ہو گی؟ میں ابھی ہوٹل کے سیکورٹی آفیسر سے بات کرتا ہوں کہ تم غیر قانونی طور پر میرے کمرے میں داخل ہوئے ہو۔"

"زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" پیٹر نے مجھے جھڑک دیا۔ "میں تمہیں یوں آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔ ہاتھ اٹھاؤ اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

میں نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے ہاتھ اٹھائے اور دیوار کی طرف گھوم گیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ مجھے اس وقت تمہارے تعاقب کا علم نہیں ہوا تھا جب لفٹ کی طرف جا رہا تھا' اسی وقت میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔" اس نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ "پیٹر پشت پہ بھی آنکھیں رکھتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا۔

سامنے والی دیوار پہ شیشے کے فریم میں خاصی بڑی ایک سینری لگی تھی۔ مجھے اس میں پیٹر کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ میری تلاشی لینا چاہتا ہے مگر جب وہ میرے نزدیک پہنچا تو ریوالور اس نے نالی کی طرف سے پکڑا اور دستہ میرے سر پر مارنا چاہا۔ میں پھرتی سے جھکائی دے کے پلٹ گیا اور اس کے ریوالور والے ہاتھ پہ زبردست کک ماری۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کے دور جا پڑا۔ اس کے چہرے پر شدید حیرانی تھی۔ شاید اسے مجھ سے اس پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ میں نے دوبارہ اس کے چہرے کو نشانہ بنانا چاہا مگر اب

وہ محتاط تھا۔ اس نے بائیں طرف جھک کے اطمینان سے اپنا چہرہ بچایا پھر الٹی قلا بازی کھا کے بیڈ پہ جا کھڑا ہوا۔ وہاں سے اس نے پھر جمپ لگائی اور اس کا جسم دائرہ سا بناتا ہوا فرش کی طرف آیا۔ پھر لگاتار اس نے کمرے ہی میں تین قلا بازیاں کھائیں اور اس کی مہارت پہ میں اش اش کر اٹھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ میرا سامنا ایسے دشمن سے ہوا تھا جو ہر لحاظ سے میرا ہم پلہ تھا بلکہ قد و قامت اور جسامت میں وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ ظاہر ہے طاقت میں بھی مجھ سے زیادہ رہا ہو گا۔ قلا بازیں کھانے کے بعد وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا اور تحقیر آمیز انداز میں بولا۔ "تم اب تک اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ یہ جمناسٹک کے کرتب دکھا کر جسے چاہو گے مرعوب کر لو گے۔ پہلے تو مجھے شبہ تھا مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم خرم ہو۔ تمہارا نام تو بہت سنا تھا مگر دیکھا نہیں تھا۔ مجھے حسرت ہی رہی کہ پاکستان میں تم سے ٹکراؤ ہو جائے اور میں وانگ یو کے تربیت یافتہ ناقابل تسخیر شاگرد کے کس بل نکال سکوں۔"

"میں واقعی اتنا معروف ہوں؟" میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اس کا مضحکہ اڑا رہا ہوں۔

"لوگوں نے خواہ مخواہ تمہیں ہوا بنا رکھا تھا۔ آج میں دیکھوں گا کہ وانگ یو نے تمہیں کیا کچھ سکھایا ہے۔"

"لگتا ہے تم وانگ یو سے بھی خوف زدہ ہو۔ یار وہ بیچارہ تو اس دنیا میں نہیں ہے اب۔"

"اسے ٹھکانے بھی تو میں نے ہی لگایا تھا۔"

"تم نے؟" میں چڑانے والے انداز میں ہنسا۔ "وانگ یو کے قاتلوں کو تو میں نے اپنے ہاتھوں جہنم رسید کیا تھا۔"

میری بات پہ اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "وہ سب تو کرائے کے بدمعاش تھے۔ تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی میں نے وانگ یو کو قریب المرگ کر دیا تھا۔ مرتے مرتے بھی وہ مجھے ڈاج دے گیا۔ میں نے اصل کے دھوکے میں دوسرا بریف کیس لیا اور وہاں سے کھسک گیا۔ مجھے بریف کیس چیک کرنے کا تو موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ لوگ جو تمہارے ہاتھوں مارے گئے وہ وانگ یو ایسے خوف ناک فائٹر کو قتل کرنا تو دور کی بات ہے۔ اسے ہاتھ لگانے کے اہل بھی نہیں تھے۔"

"اہل تو خیر تم بھی نہیں تھے، تم نے بھی پیچھے سے اس پر وار کیا ہو گا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" پیٹر برا مانے بغیر بولا۔ "لیکن میں اس سے کوئی دوستانہ یا نمائشی مقابلہ کرنے نہیں گیا تھا۔"

"چلو تم نے وانگ یو کو بڑا فائٹر تو تسلیم کیا۔"

اس نے اچانک چھلانگ لگائی اور میرے سینے پر فلائنگ کک مارنا چاہی میں پھرتی سے بیٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہو گا۔ قلا بازی کھا کے وہ میری پشت پر پہنچ گیا تھا۔ میں پھرتی سے فرش پہ اوندھے منہ گرا اور چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا تیزی سے آگے نکل گیا۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے ٹھیک اسی جگہ چھلانگ لگائی تھی جہاں میں چند لمحے پہلے تھا۔ جواب میں اپنے جسم سے کئی دائرے میں نے بھی بنائے اور اسی دوران میں اس کے منہ پر لات مارنا چاہی۔ وہ چہرہ بچا کے ایک دم ہاتھوں کے بل کھڑا ہو گیا اور اسی پوزیشن میں لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ میں نے اور زیادہ برق رفتاری سے گھومتے ہوئے اس کی کمر کو نشانہ بنایا۔ اس نے بچنے کی کوشش کی مگر اسے ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ لات کمر کی بجائے اس کے سینے پر پڑی۔ وہ کراہ کے اوندھے منہ گرا۔ میں نے بجلی کی طرح تڑپ کے اسے پشت سے دبوچ لیا۔ پھر میں نے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے گھٹنا اس کی کمر پہ ٹکا دیا۔ یہ میرا ایسا ناک وار تھا کہ اگر وہ ذرا سی قوت لگاتا یا مزاحمت کرتا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا اور اس داؤ کا توڑ مخصوص طریقے سے کرے گا۔ وہ مردے کی طرح قالین پر پڑ گیا۔ میرا شبہ یقین میں بدل گیا کہ اس نے کراٹے اور جمناسٹک کی تربیت وانگ یو سے حاصل کی ہے یہ خیال آتے ہی اس کے خلاف نفرت کی شدید لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔ "ذلیل آدمی! تو نے اپنے استاد ہی کو قتل کر دیا۔ تیری فائٹ کا انداز دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تو بھی وانگ یو کا شاگرد ہے مگر نالائق شاگرد جو چند داو پیچ سیکھ کر اپنے استاد ہی کے خلاف میدان میں ڈٹ جاتا ہے۔" میں نے اس کی کمر پہ گھٹنے کا دباؤ بڑھا دیا۔ "آج میں دیکھوں گا کہ تو کتنا بڑا خفیہ ایجنٹ ہے۔"

پیٹر گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔

"بتا وہ کاغذات اور مائیکرو فلمز کہاں ہیں؟" میں نے بپھر کر کہا۔ "ورنہ ابھی تیری ریڑھ کی ہڈی توڑ کے تجھے ہمیشہ کے لئے معذور کر دوں گا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو زوردار جھٹکا دیا اور اس کی پشت پر گھٹنے کا دباؤ بڑھا دیا۔

وہ بری طرح کراہنے لگا اور بولا۔ "مجھے ذرا سکون کا سانس تو لینے دو۔ میرا دم نکل رہا ہے۔"

میں نے اس کی کمر پہ گھٹنے کا دباؤ کچھ کم کر دیا اور بازوؤں پہ بھی گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ چوٹ کھائے ہوئے بلے کی طرح ہانپنے لگا۔

"تم..... شاید..... یقین نہ کرو..... کہ..... میں....." وہ اٹک اٹک کر بولنے لگا۔ "کہ..... میں دل..... کا مریض ہوں..... مجھے..... شاید دل..... کا دورہ پڑا ہے۔ میں....." اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

"مجھے بتاؤ کہ وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز کہاں ہیں؟" میں نے وحشت زدہ انداز میں پوچھا۔ منزل مجھ سے پھر دور ہو رہی تھی۔

"وہ..... مائیکرو فلمز..... وہ..... میں..... شاید مر..... رہا ہوں..... میں نے وہ..... چیزیں..... اتنا کہہ کر اس کی آواز ڈوب گئی۔"

"ہاں ہاں، بولو..... کہاں ہیں وہ چیزیں؟" میں نے اضطراب کے عالم میں اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے بالکل ہی گردن ڈال دی۔

"یہ شاید مر گیا خرم!" کمرے میں برڈ کی آواز گونجی تو میں چونک اٹھا۔ "دیکھو اس کے منہ سے تو جھاگ بہہ رہا ہے۔" برڈ نہ جانے کب دبے پاؤں کمرے میں آ گیا تھا اور شکار کو میرے قبضے میں دیکھ کر اس نے شاید مداخلت کرنے سے گریز کیا تھا۔

میں نے جھک کر پیٹر کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور منہ سے واقعی جھاگ نکل رہا تھا۔ میں نے ابھی تک اسے نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں نے اسے چھوڑ دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب یہاں سے نکل چلو۔" برڈ نے کہا۔ "ورنہ اس کے قتل کے الزام میں دھر لئے جاؤ گے۔"

"مگر یہ کمرہ تو میرا ہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ارے یار یہ کمرہ ڈینی کا ہے۔ تمہارا نام خرم ہے۔ پولیس کسی امریکن ڈینی کو تلاش کرتی رہے گی۔ بس اب نکل چلو۔" برڈ جھنجلا گیا۔

اس کے ایک ہاتھ میں مشین پسٹل اور دوسرے ہاتھ میں وہی فوڈنگ رائفل تھی۔

میں دروازے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اچانک پیٹر کا مردہ جسم اچھلا اور برڈ کو زوردار فلائنگ کک مارتا ہوا مجھ پہ آ پڑا۔ اس غیر متوقع حملے سے نہ میں سنبھل سکا نہ برڈ۔ اس کے دونوں شانوں میں اتنی بھرپور لاتیں پڑی تھیں کہ نہ صرف رائفل اور مشین پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا بلکہ وہ خود بھی دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ پیٹر نے پھر دونوں ہاتھوں سے میری گردن جکڑ لی تھی اور وہ اپنے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی سے میری گردن ٹٹول رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جوابی کارروائی کرتا اس نے زور سے میری گردن مسل دی۔

لمحے بھر کو مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا پھر میں کٹے ہوئے درخت کی طرح قالین پر دھڑام سے گر پڑا مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مجھے ذرا بھی چوٹ نہیں آئی۔ مجھے گرتا دیکھ کر وہ اطمینان سے برڈ کی طرف پلٹا تو مجھ پہ یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ میرا پورا جسم مفلوج ہو گیا ہے۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر زبان بھی ہلانے سے معذور ہو گیا۔ میرا ذہن پوری طرح بیدار تھا۔ مجھے سب کچھ نظر بھی آ رہا تھا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی برقرار تھی بس جسم مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اس مکار اور عیار پیٹر نے میری گردن کی کوئی مخصوص

رگ مسل دی تھی جس کی وجہ سے میرا یہ حال ہوا تھا۔ میں پیٹر کو برڈ کی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ برڈ بالکل نہتا تھا۔ اس کی رائفل اور ریوالور دور جا پڑا تھا۔ پیٹر نے اچانک برڈ پر چھلانگ لگائی مگر اسے یہ چھلانگ بہت مہنگی پڑی۔ برڈ نے نہ جانے کب اپنا مخصوص ہتھیار باریک پھل والا خنجر نکال لیا تھا۔ پیٹر نے اسے دبوچنا چاہا تو اس نے پوری قوت سے وہ خنجر پیٹر کے سینے میں گھونپنا چاہا مگر وار اوچھا پڑا۔ خنجر اس کے سینے میں پیوست ہونے کی بجائے بائیں شانے کو بری طرح ادھیڑ گیا۔ لمحوں میں پیٹر کی شرٹ خون سے رنگین ہو گئی۔ برڈ نے دوسرا وار سینے پر کرنے کی کوشش کی مگر پیٹر نے کلائی کے جوڑ کے پاس سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ برڈ ایسا شخص بھی خنجر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر مجھے جس بات کا خطرہ تھا وہی ہوا پیٹر نے برڈ کی کلائی کو مخصوص قسم کا جھٹکا دیا۔ سوکھی لکڑی کے چٹخنے کی سی آواز آئی اور برڈ کا دایاں ہاتھ بے جان سا ہو کر پہلو میں جھول گیا۔ اس نے اپنی بے ساختہ قسم کی چیخ کو دانتوں سے ہونٹ بھینچ کر روک لیا۔ برڈ نے تکلیف ضبط کرتے ہوئے بائیں ہاتھ کو جھٹکا دیا تو اس کے ہاتھ میں ایک اور خنجر نظر آنے لگا۔

"آئی سی۔" پیٹر ہنس کر بولا۔ "یعنی سبھی لوگ مداری ہیں۔ کوئی سرکس کے کرتب دکھاتا ہے کوئی آستینوں میں سے خنجر برآمد کرتا ہے۔" پیٹر کا لہجہ توہین آمیز تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ برڈ بائیں ہاتھ سے اس پر وار کرتا' اس نے جھپٹ کر برڈ کی بائیں کلائی بھی پکڑنے کی کوشش کی مگر برڈ نے اتنی قوت سے اس کے سینے پر وار کیا کہ اگر خنجر پیٹر کو لگ جاتا تو دستے تک دھنس جاتا۔ یہ وار بھی پیٹر کا شانہ ادھیڑ گیا۔

تکلیف کی شدت سے پیٹر کراہ کر رہ گیا' پھر وہ غضب ناک ہو کے برڈ کی طرف لپکا۔ دوسرے ہی لمحے برڈ کا خنجر پیٹر کے ہاتھ میں تھا۔ برڈ کا ایک ہاتھ ناکارہ ہو چکا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے مزاحمت کرنا چاہی۔ پیٹر نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی کلائی کے پاس سے توڑ دیا۔ برڈ کے منہ سے اذیت میں ڈوبی ہوئی چیخ بلند ہوئی' پھر وہ چیخ بھی اس کے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ پیٹر نے باریک پھل والا خنجر دستے تک اس کے پیٹ میں اتار دیا تھا۔ پھر پے در پے اس نے کئی وار کئے۔ برڈ لڑکھڑانے لگا۔ گاڑھا گاڑھا سرخ خون فوارے کی طرح بہنے لگا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں' اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی ایسا ہو گیا ہے۔ پیٹر نے آخری وار برڈ کی شہ رگ پر کیا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود برڈ ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑا تھا مگر شہ رگ کٹتے ہی وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے فرش پر آ رہا۔ پیٹر نے خنجر میرے نزدیک پھینکا اور سفاک لہجے میں بولا۔ "میں جا رہا ہوں۔ اب اس قتل کا الزام بھی تمہارے سر آئے گا۔ میں تمہیں بھی قتل کر سکتا تھا مگر تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں ار پولیس سے بچ گئے تو پھر میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکو گے۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

مجھ میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ میں مرتے ہوئے برڈ کے نزدیک ہی جا سکتا۔ میرا دوست میرا جانثار ساتھی میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا اور میں اس کے حلق میں پانی کے چند قطرے بھی ٹپکانے سے قاصر تھا۔ صرف اسے مرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ برڈ کا چہرہ میری طرف تھا اس نے بہت مشکل سے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی' عجیب سی چمک تھی۔ میں اسے کوئی نام نہیں دے سکا۔ میں تو اس سے ہمدردی کے دو بول بھی نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "خدا حافظ میرے دوست' مجھے معاف کر دینا۔ تم مجھے خود غرض سمجھ رہے ہو گے کہ میں تمہاری موت کا تماشا دیکھتا رہا اور تمہاری مدد کو نہیں آیا۔ میں تو خود اپنی مدد کرنے سے بھی قاصر ہوں۔"

برڈ نے آخری ہچکی لی اور ساکت ہو گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کے روؤں مگر میں تو اتنا بدنصیب تھا کہ رو بھی نہیں سکتا تھا' میں سکتے کی سی حالت میں برڈ کی ویران آنکھوں کو گھور رہا تھا۔ مجھے تو پولیس کی بھی فکر نہیں تھی۔ پیٹر نے جاتے جاتے یقینی طور پر پولیس کو مطلع کر دیا ہو گا۔ مجھے امید تھی کہ ابھی چند لمحوں میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی اور مجھے اپنے جگری یار کے قتل کے الزام میں دھر لے گی۔ میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گا۔ ظاہر ہے وہ کمرہ میں نے غلط نام سے حاصل کیا تھا۔ پولیس اسی سے مشکوک ہو جائے گی۔ مجھے اب کسی بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں یونہی ساکت فرش پر پڑا رہا اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

مجھے اس حالت میں پڑے ہوئے نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ دس منٹ یا دس گھنٹے یا دس دن! مجھے کچھ احساس نہیں تھا کہ میں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ برڈ مر چکا تھا مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ ابھی ہنستا ہوا اٹھے گا اور قہقہ لگا کر کہے گا کہ دیکھا' کیسا بے وقوف بنایا۔ برڈ کے گرد خون کا ایک تالاب سا بن گیا تھا۔ اس کے پیٹ اور گردن سے اب بھی خون رس رہا تھا۔

○

اچانک دروازے پر آہٹ سی ہوئی۔ میں نے اس توقع میں دروازے کی طرف دیکھا کہ پولیس آ پہنچی مگر وہاں بوبی کھڑا تھا' کمرے کا منظر دیکھ کر وہ جھپٹ کر اندر آیا اور جھک کر برڈ کا چہرہ دیکھنے لگا پھر اس نے تاسف سے سرہلایا اور میری طرف متوجہ ہوا۔ "کیا ہوا خرم! تم ٹھیک تو ہو؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بس سکتے کی سی حالت میں اسے گھورتا رہا۔

"خرم!" اس نے مجھے جھنجوڑ دیا مگر مجھے کچھ احساس نہ ہوا۔ "میں سمجھ گیا۔" بوبی منہ میں بڑبڑایا۔ "پیٹر نے تم پر اپنا مخصوص داؤ استعمال کیا ہے۔ پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے۔"

اس نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا۔ میں تو لاش کی طرح ہاتھ پاؤں ڈالے پڑا تھا۔ اس نے بہ مشکل مجھے کندھے پر اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت اس کی نظر برڈ کی رائفل اور ریوالور پر پڑی۔ اس نے جھک کر وہ دونوں چیزیں اٹھا لیں۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ یہاں سے باہر نکلنے کی بجائے اوپر اس کمرے میں چلو جو برڈ نے بک کر لیا ہے مگر میں بھلا کیسے کہہ سکتا تھا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے میں مرچکا ہوں اور اب موت کے بعد کا منظر دیکھ رہا ہوں۔

بوبی مجھے اٹھائے یوں لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ وہ نیچے جانے کی بجائے نویں منزل پر جا رہا تھا۔ پھر مجھے یاد آگیا کہ برڈ اس سے مل کر آیا تھا۔ ممکن ہے اس وقت اس نے بوبی کو بتایا ہو کہ ہوٹل میں ایک دوسرا کمرہ بھی بک ہے۔ بوبی مجھے لے کر برڈ کے کمرے میں پہنچا۔ جلدی میں ہم نے اسے لاک بھی نہیں کیا تھا۔ بوبی نے ہینڈل گھما کر اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر مجھے بیڈ پر لٹا دیا۔ پھر وہ باتھ روم سے تولیہ گیلا کر کے لایا اور میرے چہرے کو گیلے تولیے سے تھپ تھپانے لگا۔ مجھے اس سے کافی آرام ملا۔ پھر اس نے میری گردن ٹٹولی اور انگلیوں سے ہلکی ہلکی مالش کرنے لگا۔ تقریباً دس منٹ بعد مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرے جسم میں حرارت سی آ گئی ہو۔ اس سے

پہلے تو میرا جسم برف کے تودے کی طرح سرد اور بے جان لگا۔ بوبی نے اپنا عمل جاری رکھا۔ آہستہ آہستہ میں پلکیں جھپکانے کے قابل ہو گیا۔ ورنہ اس سے قبل تو میں پلک بھی نہیں جھپکا سکتا تھا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی زبان ہلا سکتا ہوں۔ میں نے بہ مشکل تمام کہا پانی۔ میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے اور زبان بری طرح اینٹھ رہی تھی۔

بوبی نے جلدی سے پانی کا جگ اٹھایا اور پانی گلاس میں انڈیل کر میرا سر تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

پانی کا پہلا گھونٹ بہ مشکل تمام میرے حلق سے اترا۔ میں نے دو تین گھونٹ پیئے تو میری حالت قدرے سنبھل گئی۔ میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

بوبی ایک مرتبہ پھر مخصوص انداز میں میری گردن کی مالش کرنے لگا۔ میری حالت بہ تدریج سنبھلتی جا رہی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت دے سکتا ہوں۔ میں نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو اسے اٹھانے میں کامیاب ہو گیا مگر مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اپنے ہاتھ سے منوں وزن اٹھا رکھا ہے۔ مارے خوشی کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔

"اب کیسی طبیعت ہے خرم!" بوبی نے پوچھا۔

میں نے بہ مشکل تمام جواب دیا۔ "اب...... بہتر...... ہوں...... مگر برڈ......" یہ کہہ کر میرا دل بری طرح بھر آیا اور میں بلک بلک کر رونے لگا۔

بوبی نے مجھے رونے دیا۔ جب میں رو رو کر نڈھال ہو گیا تو اس نے کہا۔ "اس کیفیت میں رونا تمہارے لئے بہت بہتر ہے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم اٹھ سکتے ہو۔ اٹھ کے ہاتھ منہ دھو لو اور میرے ساتھ چلو۔"

اس کا کہنا ٹھیک ہی تھا۔ میں نے جسم کی پوری قوت جمع کر کے اٹھنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہا لیکن صرف اٹھ کر بیٹھتے ہی میں بری طرح ہانپنے لگا۔ بوبی نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور باتھ روم کی طرف لے کر چلا' میں گھسیٹتا ہوا اس کے ساتھ چل دیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اپنا وزن اپنے پیروں پر اٹھانے کی کوشش کرو' قدم بڑھاؤ ہمت کر کے! میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ جی تو میرا چاہ رہا تھا کہ میں لیٹوں اور سو جاؤں مگر ہمارے پاس وقت واقعی کم تھا۔ میں نے نیم گرم پانی سے منہ دھویا تو مجھے تازگی اور فرحت کا احساس ہوا۔ گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ میری توانائی بحال ہو رہی تھی۔ میں باتھ روم سے واپس آیا تو ہمت کر کے آہستہ آہستہ بوبی کے سہارے کے بغیر ہی چل رہا تھا۔

میرا بریف کیس وہیں رکھا تھا۔ بوبی نے رائفل فولڈ کر کے دوبارہ بریف کیس میں رکھی' مشین پسٹل اور فاضل میگزین بھی اسی میں ڈالے اور چلنے کو تیار ہو گیا۔

ہم لوگ ہوٹل سے باہر نکلے تو ہر طرف سناٹا تھا۔ پیٹر نے پولیس کو اطلاع نہیں دی

تھی اگر ایسا ہوتا تو اب تک ہوٹل کے چاروں طرف پولیس ہوتی۔

ہم لوگ گاڑی میں بیٹھے تو موسم زیادہ سرد نہیں تھا اس کے باوجود بوبی نے ہیٹر آن کر دیا۔ ہیٹر کی خوش گوار حرارت نے میرے جسم پر بہت اچھا اثر ڈالا اور میری توانائی بہت تیزی سے بحال ہونے لگی۔ ایک میڈیکل اسٹور پر رک کر اس نے دو تین قسم کی ٹیبلٹس لیں اور وہیں سے منرل واٹر کی ایک بوتل لے کر وہ ٹیبلٹس مجھے کھلا دیں۔ اس نے بتایا کہ پیٹر نے یہ حرکت پہلے بھی کچھ لوگوں کے ساتھ کی تھی۔ اس نے احتیاطاً" مجھے اس کا توڑ بھی بتایا تھا۔

ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو میرے جسم میں مزید توانائی آ چکی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بالکل ٹھیک ہوں' بالکل نارمل اور صحت مند۔

بوبی کا رخ ایک مرتبہ پھر ساحل سمندر کی طرف تھا۔ ہم دوبارہ اسی بوٹ میں پہنچ گئے۔ بوٹ میں پہنچ کر میں نے تھوڑی سی اچھل کود کی۔ میں یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ میں بالکل صحت مند ہو گیا ہوں یا ابھی کچھ کسر باقی ہے۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ میں پہلے کی طرح چاق و چوبند اور ہشاش بشاش ہوں۔

اچانک مجھے جان کا خیال آیا۔ ہم لوگ اسے باندھ کر ایک کیبن میں بند کر گئے تھے۔ میں نے رابرٹ سے پوچھا۔ "مسٹر رابرٹ! قیدی کا کیا حال ہے؟"

"قیدی بہت شور کر رہا ہے۔" رابرٹ نے ہنس کر کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے دھمکی دی تھی کہ اب شور مچایا تو اسی حالت میں سمندر کے حوالے کر دوں گا۔"

جان کا خیال آتے ہی میرا دماغ سنسنانے لگا' خون میری کن پٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اسی بدبخت نے تو ہمیں پیٹر کی طرف بھیجا تھا۔

"کتے..... حرامزادے!" میں حلق پھاڑ کر چیخا۔ "میں تجھے بھی اسی طرح ماروں گا جیسے پیٹر نے برڈ کو مارا ہے۔"

"ہوش میں آؤ خرم!" بوبی نے مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ تم اس کی جان لینا چاہتے ہو مگر ابھی ہم اس سے بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ میں اس سے معلومات کر لوں' پھر اسے خود اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کر دوں گا۔"

"نہیں بوبی!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "وہ میرا شکار ہے اور میں اسے تڑپا تڑپا کر سسکا سسکا کر ماروں گا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ پہلے اسی سے معلومات کی جائے' پھر اسے موت کے گھاٹ اتارا جائے۔" یہ کہہ کے میں اس کیبن کی طرف بڑھا جس میں جان کو بند کیا گیا تھا۔ میں نے رابرٹ سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ جان دروازے کے عین سامنے فرش پر پڑا تھا اور پلکیں جھپکائے بغیر دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا میں نے اندر داخل ہوتے ہی اس کی پسلیوں میں ایک زوردار لات رسید کی اور غرا کر کہا۔ "یو باسٹرڈ! تیری وجہ سے

میرا بہترین دوست مجھ سے بچھڑ گیا میں تجھے ایسی بھیانک موت ماروں گا کہ جو دیکھے گا۔ عبرت پکڑے گا۔"

"مگر..... اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو تمہیں پیٹر کے بارے میں صرف یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری مطلوبہ اشیاء اس کے پاس ہیں۔"

"بکواس بند کر!" میں نے بھنا کے اسے دوسری ٹھوکر ماری' وہ بلبلا کر رہ گیا۔ "تو نے جان بوجھ کر ہمیں پیٹر کی طرف بھیجا تھا۔ حالانکہ اس کے پاس کوئی دستاویز یا مائیکرو فلم نہیں تھی۔" میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

"وہ جھوٹ بولتا ہے۔" جان نے منہ بنا کر کہا۔

"میں اتنا کچا کام نہیں کرتا ہوں۔" میں نے اسے دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ "تو کیا سمجھتا تھا کہ پیٹر بہت بڑا تیس مار خان ہے جو وہ تینوں کو ٹھکانے لگا دے گا۔ میرا ایک ساتھی ضرور کام آیا ہے مگر میں تمہارے اس سور پیٹر کو بھی زخمی کر کے باندھ لایا ہوں اب اس کی موجودگی میں یہی بات کہنا کہ مائیکرو فلم اور کاغذات اس کے پاس ہیں۔"

"تم..... پیٹر کو لے آئے ہو؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں' میں اسے لے آیا ہوں۔ اب اس کے سامنے بکواس کر تو کیا کہہ رہا تھا۔" پھر میں گھوم کر رابرٹ سے مخاطب ہوا۔ "رابرٹ پیٹر کو یہاں لے آؤ۔"

"پیٹر ابھی ہوش میں نہیں ہے مسٹر خرم!" رابرٹ نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے انتہائی سے جھوٹ بولا۔ "میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جونہی ہوش میں آیا اسے یہاں لے آؤں گا۔"

"وہ ہوش میں ذرا مشکل سے آئے گا۔" میں نے جان کو سنانے کو کہا۔ "میں نے اسے شدید زخمی کر دیا ہے مگر وہ مرے گا نہیں۔"

"ٹھیک ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر رابرٹ وہاں سے چلا گیا۔

"ہاں مسٹر جان!" میں جان کی طرف گھوما۔ "جب تک پیٹر ہوش میں آئے مجھے حقیقت سے آگاہ کر دو ورنہ میں تمہارا بھی وہی حشر کروں گا جو پیٹر کا کیا ہے۔ یہ سمجھ لینا کہ اگر اب بھی تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اور میں تو بعد میں ماروں گا' پہلے تو پیٹر ہی تمہیں نہیں چھوڑے گا۔ تمہاری ہی وجہ سے تو اس کا ایک بازو ناکارہ ہوا ہے۔"

"تم نے..... اسے معذور کر دیا۔" جان نے عالم اضطراب میں اٹھنے کی کوشش کی مگر بندھا ہونے کے سبب اس میں کامیاب نہ ہوا۔

"ہاں' میں نے اسے ناکارہ کر دیا ہے اور تمہاری تو ریڑھ کی ہڈی توڑ دوں گا' تاکہ تمہاری باقی عمر وہیل چیئر پر بھیک مانگتے گزر جائے۔"

میں نے پہلی دفعہ جان کے چہرے پر خفت اور تشویش کے آثار دیکھے۔ اس نے تھوک نگل کر کہا۔ "اگر تم مجھے سزا دینا چاہتے ہو تو پھر جان سے مار دو' اپاہجوں والی زندگی مجھے پسند نہیں ہے۔ مجھے نفرت ہے وہیل چیئر اور معذوروں سے!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

"اس کا ایک ہی حل ہے کہ تم مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو۔"

"تم مجھ سے وعدہ کرتے ہو کہ اس کے بعد مجھے معذور نہیں کرو گے' چاہو تو میری جان لے سکتے ہو۔"

"اگر تم نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں بغیر کسی نقصان کے یہاں سے جانے دوں گا مگر تمہاری بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق ہونے کے بعد! بولو منظور ہے؟"

"مجھے منظور ہے۔" جان جلدی سے بولا۔

"ایک بات یاد رکھنا۔" میں نے کہا۔ "اگر اس مرتبہ تم نے مجھے دھوکہ دیا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہیں بچا سکے گی۔"

"میں جو کچھ کہتا ہوں' اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔" جان سرد لہجے میں بولا۔ "آج پہلے وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز واقعی پیٹر کے پاس تھیں مگر اب نہیں ہیں۔ اب ان کی سودے بازی شاید ہی یہاں ہو۔"

"میں نے پوچھا ہے کہ وہ چیزیں اس وقت کہاں ہیں؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"میں وہی بتا رہا ہوں۔" جان ٹھہرتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم کبھی اچھے سیکرٹ ایجنٹ نہیں بن سکتے۔ سیکرٹ ایجنٹ تو بہت پر سکون رہتا ہے۔" اگر تمہیں وہ کاغذات واقعی حاصل کرنا ہیں تو بہت ہمت اور حوصلے سے کام کرنا ہو گا۔" جان بولتے بولتے ایک مرتبہ پھر رک گیا۔ وہ شاید میرے صبر کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ٹوکا نہیں' بس بہ غور اسے دیکھتا رہا۔ "تم میں ہمت اور حوصلہ تو ہے مگر صبر کا مادہ نہیں ہے۔" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ میرے جی میں تو آئی کہ میں اسے ایک جھانپڑ رسید کر دوں اور کہوں کہ میں یہاں تجھ سے سیکرٹ ایجنٹ بننے کی تربیت حاصل کرنے نہیں آیا مگر میں خاموش رہا۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس کے چہرے پر کچھ اسی قسم کا تاثر تھا کہ وہ اپنی شکست تسلیم کر چکا ہے۔ اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا میری ایک شرط ہے۔"

"تمہاری کوئی شرط بھی ہے؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ "ہاں' میری شرط یہ ہے کہ اس کے بعد تم مجھے زندہ مت چھوڑنا۔"

"زندہ مت چھوڑنا!" بوبی نے کافی دیر بعد زبان کھولی۔

"ہاں' میں نہیں چاہتا کہ بعد میں میرے اپنے ہی لوگ مجھے اذیت ناک طریقے

ہلاک کریں۔ ممکن ہے وہ مجھے ہلاک نہ کریں بلکہ معذور کر کے کسی بھی شہر کی بارونق سڑک پر بھیک مانگنے پہ مجبور کر دیں۔ میں معذور ہو کر مرنا نہیں چاہتا۔ بوبی! تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہے ہو گے۔" وہ یکایک بوبی سے مخاطب ہوا۔

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں مگر تم اس پر اتنے بہ ضد کیوں ہو؟ انسان اگر مرنے کا فیصلہ ہی کرے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں روک سکتی۔"

"اپنے ہاتھوں اپنی جان لینا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ ممکن ہے عین وقت پر مجھے دنیا کی رنگینی اپنی طرف کھینچ لے۔ تم دونوں مجھ سے وعدہ کرو کہ بعد میں مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔"

میں جانتا تھا کہ اگر بوبی نے وعدہ کر لیا تو پھر وہ ہر صورت میں اپنے وعدے پر قائم رہے گا۔ میں خود بھی اپنے الفاظ کا پاس کرنا جانتا تھا اس لئے اس سے وعدہ کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جب دشمن خود ہی موت کی خواہش کرے تو مارنے والے کے دل میں ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی ہوا تھا۔ کافی دیر تک وہاں سناٹے کا راج رہا۔ ہم تینوں میں سے کوئی بھی کچھ نہ بولا لہروں کا شور اس سناٹے کو مزید گہرا کر رہا تھا۔ سمندر شور کی علامت ہے مگر اس لمحے میرا تاثر کچھ اسی قسم کا تھا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" میرے حلق سے بھرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی' مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر کوئی اور بول رہا ہو۔ یہ آواز اس خرم کی تھی جو اپنے ملک کی آن پر ایک جان تو کیا ایسے ایسے ہزاروں جان موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔

جان کے چہرے پر سکون پھیل گیا۔ اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم ساجی دار اور باہمت نوجوان اپنے وعدے پر قائم رہے گا۔" پھر وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ "وہ کاغذات اس وقت ہانگ کانگ کے سب سے بڑے بدمعاش زینکو کے پاس ہیں وہ انتہائی سفاک آدمی ہے' انسانی جان اس کے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اس کے محافظوں کا اتنا کڑا پہرہ ہوتا ہے کہ اس کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی بھی اجازت کے بغیر اس سے نہیں مل سکتی۔" پھر کچھ سوچ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "ہاں بیٹی کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ وہی بیٹی اس کی کمزوری بھی ہے اور گنتی کے چند افراد کو علم ہے کہ وہ آج کل ہانگ کانگ میں ہے۔"

"آج کل ہانگ کانگ میں ہے؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"تم پھر بیچ میں بولے!" اس نے خفگی سے کہا۔ "پہلے بات پوری ہونے دیا کرو۔ اپنی حالت پر قابو پاؤ ورنہ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔"

"سوری۔" میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں اس کا لیکچر پھر شروع نہ ہو

"خیر تو میں یہ بتا رہا تھا کہ اس کی بیٹی گوشی آج کل ہانگ کانگ میں ہے۔ وہ کیلے فورنا میں رہتی ہے۔ اس بات کا علم بھی بہت کم لوگوں کو ہے۔ وجہ یہی ہے کہ کوئی دشمن اس کی اس کمزوری سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ یہ راز کی بات تمہیں میرے سوا کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر تم اس کی بیٹی کو اغوا کر لو تو زینکو وہ کاغذات اور فلم تھال میں رکھ کے تمہیں پیش کر دے گا۔ اپنی بیٹی کے لئے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی ٹکرا جائے گا۔" وہ سانس لینے کو رکا پھر بولا۔ "اس کی بیٹی آج کل ایک جزیرے پر ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کی نیگرو ملازمہ اور اٹالین بٹلر کے سوا کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اب اگر تم لوگ میرے ہاتھ کھول دو تو میں تمہیں اس کا ایڈریس دے دوں۔ وہ ایڈریس میری پاکٹ ڈائری میں لکھا ہے۔" بوبی نے اس کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ ہنس کر بولا۔ "وہ ایڈریس کوڈ ورڈز میں ہے۔ میرے اپنے مخصوص کوڈ میں۔ تمہاری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔"

میں نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ کھول دیئے اور اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔ پھر میں ہمدردی سے بولا۔ "اگر تم وہسکی پینا چاہو تو پی سکتے ہو۔"

"تھینک یو! میں واقعی وہسکی کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

بوبی نے رابرٹ کو آواز دے کر کہا کہ ملازم کے ہاتھ وہسکی کی بوتل اور گلاس بھیج دے۔

جب تک وہسکی آئی جان خاموش رہا۔ میں نے اس دوران میں اسے اٹھا کر کیبن میں فکس ایک ایزی چیئر پر بٹھا دیا تھا۔ وہسکی کے دو چار بڑے بڑے گھونٹ پینے کے بعد اس نے اپنی پینٹ کی ہپ پاکٹ میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹی سی ایک ڈائری برآمد کی پھر اس نے شرٹ کی جیب سے پین نکالا اور گوشی کا انڈریس لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ "تم جزیرے تک اسی بوٹ میں جا سکتے ہو۔ رابرٹ تمہیں وہاں تک لے جائے گا۔ لڑکی کو اغوا کرنے سے پہلے کسی مناسب جگہ کا بندوبست کر لینا۔ زینکو اس کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دے گا۔ اگر تم اسے ڈاج دینے میں کامیاب رہے تو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کاغذات تمہارے قبضے میں ہوں گے۔" اس نے اپنی بات ختم کر کے ایک ہی گھونٹ میں ساری وہسکی اپنے معدے میں انڈیل لی اور دوبارہ پیگ بنانے لگا۔ دوسرا پیگ پینے کے بعد وہ پرسکون لہجے میں بولا۔ "میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب تم بھی اپنا وعدہ پورا کرو۔ اپنا مشین پسٹل نکالو اور مجھے زندگی کی قید سے آزاد کر دو۔"

"مشین پسٹل!" میں حیران رہ گیا۔ "تمہیں کیسے علم ہوا کہ میری جیب میں مشین پسٹل ہے؟"

"میری پوری زندگی انہی ہتھیاروں سے کھیلتے گزری ہے۔" جان ہنس کر بولا۔

محض جیب کا ابھار دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ جیب میں پوائنٹ تھری ایٹ کا ریوالور ہے یا پوائنٹ تھری ٹو کا! اس کا میک اور ماڈل بھی بتا سکوں ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ہتھیار میری نظروں سے گزرا ہی نہ ہو۔ اس صورت میں' میں تو کیا اسلحے کا بڑے سے بڑا ماہر بھی کچھ نہیں بتا سکتا اور ابھی تک کوئی ایسا ہتھیار ایجاد نہیں ہوا ہے جو میں نے دیکھا نہ ہو۔ بہرحال اب تم جلدی سے اپنا وعدہ پورا کرو۔" اس نے یوں کہا جیسے سگریٹ کی فرمائش کی ہو۔

میں نے بوبی کی طرف دیکھا وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

"اچھا ایک منٹ ٹھہرو۔" جان نے کہا "ذرا مجھے باتھ روم لے چلو۔"

بوبی نے آگے بڑھ کے اس کے پیروں کی رسیاں بھی کھول دیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا باتھ روم کی طرف روانہ ہو گیا۔

"یار' کہیں یہ بھی اس کی کوئی چال نہ ہو؟" میں نے بوبی سے کہا۔

"میری سمجھ میں خود نہیں آیا کہ وہ جان دینے پر کیوں آمادہ ہے؟" بوبی نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خیر ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ کوئی چال ہے یا واقعی جان دینا چاہتا ہے۔"

جان باتھ روم سے واپس آیا تو بوبی نے اچانک ریوالور نکال لیا اور سرد لہجے میں بولا۔ "مسٹر جان میں فائر کرنے والا ہوں۔ آخری وقت میں تم کچھ کہنا چاہو یا کوئی خواہش کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ ہمارے بس میں ہوا تو تمہاری آخری خواہش ضرور پوری کریں گے۔"

"میری آخری خواہش بس یہی ہے کہ تم مجھے زندگی کی قید سے نجات دلا دو۔"

مجھے اچانک خیال آیا کہ معذور ہونے کے تصور سے جان پر ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور سرد لہجے میں کہا۔ "بوبی! اسے یوں آسانی سے مت مرنے دو۔ اس کی وجہ سے میں نے اپنے جگری یار کو کھویا ہے۔ میں اسے سسکا سسکا کر ماروں گا بلکہ میں اسے دوسروں کے لئے عبرت کا نمونہ بنا کر پارک کی کسی بھری ہوئی پر پھینک دوں گا۔ بقیہ زندگی یہ گھسٹ گھسٹ کر گزارے گا۔"

"نہیں۔" جان نے گھبرا کر کہا۔ "تم تو وعدہ کر چکے ہو کہ......"

"ہم نے وعدہ ضرور کیا ہے۔ اسے پورا بھی کریں گے مگر ایک شرط پر!"

"اپنی شرط بتاؤ۔" جان نے مردہ لہجے میں کہا۔ "ویسے بھی وعدے کی صریح خلاف ورزی ہے۔"

"تم ہمیں سچ سچ بتاؤ کہ تم کیوں مرنا چاہتے ہو؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اگر تم نے ہمیں مطمئن کر دیا تو ہم بھی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے ورنہ دوسری صورت میں وہی ہو گا جو......"

"سچ ہی سننا چاہتے ہو تو سنو۔" جان نے مردہ لہجے میں کہا۔ "اصل میں زینکو نے وہ کاغذات زبردستی پیٹر سے چھین لئے ہیں۔ پیٹر نے یہ بات صرف مجھے بتائی تھی۔ چونکہ اس مشن کا انچارج میں تھا اس لئے پیٹر کے ساتھ ساتھ مجھے بھی سزا ملے گی۔ میں تو اس میٹنگ ہی میں ایکسپوز ہو جاتا اور میری موت کا فرمان جاری ہو جاتا مگر تمہاری وجہ سے اس کی نوبت نہیں آئی۔ پھر جب تم مجھے زبردستی وہاں سے لا رہے تھے تو اس میں میری مرضی بھی تھی ورنہ مجھے زبردستی کہیں لے جانا اتنا آسان نہیں ہے۔ پھر میں نے تمہیں پیٹر کے پاس اسی لئے بھیجا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھوں مارا جائے اور میں کہہ سکوں کہ تم لوگوں نے پیٹر کو قتل کر کے دستاویزات ہتھیا لیں مگر مجھے تمہارے لہجوں سے اندازہ ہو گیا کہ پیٹر تمہارے ہاتھ سے بچ نکلا۔ خاص طور پر خرم کے رویے سے مجھے اس بات کا یقین آ گیا تھا۔ پیٹر اگر تمہارے قبضے میں ہوتا تو خرم اتنے جارحانہ انداز میں مجھے مخاطب نہ کرتا۔ پیٹر نے اب تک اوپر یہ رپورٹ پہنچا دی ہو گی کہ وہ دستاویزات اور فلمیں اس سے چھین لی گئی ہیں ممکن ہے اب تک اسے ٹھکانے بھی لگا دیا گیا ہو۔ میری موت کا پروانہ بھی جاری ہو گیا ہو گا اور وہ ایسے سفاک لوگ ہیں کہ مجھے پاتال میں سے بھی کھود نکالیں گے۔ پھر وہ مجھے ایک دم نہیں ماریں گے بلکہ سسکا سسکا کر معذور کر کے ماریں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ میں تم لوگوں کے ہاتھوں مارا جاؤں۔"

اچانک ساحل کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں آئیں پھر رابرٹ کا ملازم دوڑتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "کچھ نامعلوم لوگوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں جان بچا کر بوٹ کی طرف بھاگا تو وہ بوٹ پر فائرنگ کر رہے ہیں۔"

بوبی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "رابرٹ سے کہو کہ بوٹ کو کھلے سمندر میں لے چلے۔" وہ چیخ کر بولا اور بریف کیس کھول کر فولڈنگ رائفلز جوڑنے لگا۔ وہ آتے ہوئے گاڑی سے اپنا بریف کیس بھی لیتا آیا تھا۔ پھر اس نے پھرتی سے رائفلز جوڑیں' ایک رائفل میرے حوالے کی اور دوسری خود لے کر عرشے کی طرف دوڑ گیا۔ اس دوران میں فائرنگ شدت اختیار کر چکی تھی۔ پھر بوٹ کا انجن غرایا اور بوٹ جھٹکے سے کھلے سمندر کی طرف روانہ ہو گئی۔

گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ ہماری بوٹ اس دوران میں کھلے سمندر میں آ چکی تھی مگر فائرنگ کرنے والے ایک ہلکی پھلکی تیز رفتار بوٹ میں ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ ہماری لانچ خاصی بڑی تھی اس لئے اس کی رفتار بھی کم تھی۔ تعاقب کرنے والی بوٹ اور ہمارے درمیان فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ بوبی نے چیخ کر کہا۔ "ابھی فائر مت کرو خرم! ایمونیشن ضائع کرنا حماقت ہے۔ میں رابرٹ سے کہتا ہوں کہ لانچ کو مزید کھلے سمندر میں لے جا کر روک دے تاکہ حملہ آور ہماری فائرنگ کی رینج میں آ جائیں۔" پھر وہ چھپکلی کی طرح سینے اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا انجن روم کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے دوربین کی مدد سے دیکھا' حملہ آوروں کی تعداد چھ تھی۔ ممکن ہے مزید افراد مجھے دکھائی نہ دے رہے ہوں۔ ہماری لانچ کی اسپیڈ اچانک کم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی بوبی رینگتا ہوا دوبارہ پہنچ گیا۔ لانچ کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ رابرٹ نے اس کا رخ حملہ آوروں کی طرف کر دیا ہے۔ میں نے دورین آنکھوں سے لگا لی۔ حملہ آوروں کی بوٹ تیز رفتاری سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ بوبی نے ایک جوا کھیلا تھا۔ اگر حملہ آوروں کی بوٹ اسی رفتار سے ہماری لانچ کے ساتھ ٹکرا جاتی تو وہ لوگ نہ صرف خود تباہ ہوتے بلکہ ہماری لانچ بھی ڈوب جاتی۔

مجھے اب تعاقب کرنے والوں کے چہرے بھی واضح طور پہ دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے چہروں پر سراسیمگی کے آثار تھے۔ اچانک بوبی کی رائفل گرج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی حملہ آروں کا ایک آدمی جھٹکے سے الٹ گیا۔ میں نے بھی دوربین رکھ کر رائفل اٹھا لی۔ دوسرا آدمی میری گولی کا نشانہ بنا۔ اسو قت تک بوبی کی رائفل ایک اور آدمی کو چاٹ چکی تھی۔ پھر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا اور لگا اچانک زوردار دھماکہ ہوا اور حملہ آروں کی بوٹ کے پرخچے اڑ گئے۔ اب سطح آب پر تباہ شدہ لانچ کا ڈھانچہ اور جلے ہوئے تختے تیر رہے تھے۔ اسی وقت مجھے رابرٹ دکھائی دیا۔ بوبی نے اسے دیکھتے ہی خوش دلی سے کہا۔ "ویل ڈن رابرٹ' تم نے تو واقعی کمال کر دکھایا۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ لانچ میں بم موجود ہیں۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "اب تم جلدی سے لانچ کو کسی قریبی ساحل سے لگا دو۔ فائرنگ اور دھماکے کی آواز دور دور تک سنی گئی ہو گی اور ابھی کچھ ہی دیر میں سمندر کا یہ حصہ پولیس کی لانچوں اور موٹر بوٹوں سے اٹ جائے گا۔"

"فکر مت کرو' اس سے پہلے ہی میں لانچ کو ساحل سے لگا دوں گا۔" یہ کہہ کر رابرٹ انجن روم کی طرف بڑھ گیا۔

"خرم! آؤ جب تک ہم جان کی لاش کو سمندر کے حوالے کر دیں۔ ساحل پر پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ ہو گا۔"

میں خود بھی بوبی سے یہی کہنے والا تھا۔ ہم دونوں نے جان کی لاش سمندر میں پھینکی اور ملازم کو بلا کر خون کے دھبے صاف کرنے کی ہدایت کی۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم کیبن میں جا بیٹھے۔ بوبی نے کیبنٹ کھول کر وہسکی کی بوتل نکالی اور پانی ملانے کا تکلف کئے بغیر بوتل ہی سے منہ لگا کر دو چار بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور ہتھیلی کی پشت سے منہ صاف کرتا ہوا بیڈ پر جوتوں سمیت نیم دراز ہو گیا۔

"یار' میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ لوگ کون تھے اور ہمیں کیوں مارنا چاہتے تھے۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

"تمہیں ابھی بھی تجسس ہے کہ حملہ آور کون تھے۔ ظاہر ہے ہمارے دشمنوں کے علاوہ

اور کون ہو سکتا ہے!" بوبی نے جواب دیا۔ "ممکن ہے انہیں کسی مخبر کے ذریعے اطلاع ملی ہو گی کہ باس اسی لانچ پر قید ہے۔ یہ سنتے ہی وہ لوگ چڑھ دوڑے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہوٹل سے واپسی پر پیٹریا اس کے کسی آدمی نے ہمارا تعاقب کیا ہو اور ہمیں بوٹ پر سوار ہوتے دیکھ لیا ہو۔" بوبی نے ہنس کر کہا۔

"ممکن ہے، پولیس نے ہمارا تعاقب کیا ہو اور....."

"نہیں یار۔" بوبی نے میری بات کاٹ دی۔ یہاں پولیس اور بحری پولیس کے پاس مخصوص قسم کی موٹر بوٹس ہیں۔ وہ پولیس والے ہوتے تو پہلے میگافون پر ہمیں وارننگ دیتے، یوں چوروں کی طرح حملہ نہ کرتے۔" پھر اس نے بلند آواز میں رابرٹ کو مخاطب کیا۔

"ہے برٹی!..... ہم کتنی دیر میں ساحل تک پہنچ جائیں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ ہم بیس منٹ کے اندر ساحل کو ٹچ کر لیں گے۔" رابرٹ نے وہیں سے چیخ کر جواب دیا۔ پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ "اب تم سکون سے بیٹھو۔ خطرے کی کوئی بات مجھے اب تک نظر نہیں آئی۔ میں انجن روم میں جا رہا ہوں، خطرہ محسوس ہوا تو تم لوگوں کو آگاہ کر دوں گا۔" رابرٹ نے جواب دیا، پھر خاموشی چھا گئی۔

میں اور بوبی دونوں ہی اپنے خیالات میں گم تھے۔ سوائے لہروں کے شور کے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کر رہا تھا۔ مجھے جان کی اس تجویز سے اتفاق تھا کہ زینکو پر پریشر ڈالنے کے لئے اس کی بیٹی کو اغواء کر لیا جائے مگر سب سے بڑا مسئلہ کسی محفوظ ٹھکانے کا تھا، کوئی ایسا ٹھکانا جو زینکو ایسے بدمعاش کی رسائی سے بھی دور ہو اور دوسرے دشمن بھی اس تک نہ پہنچ سکیں۔

"کیا سوچ رہے ہو خرم؟" بوبی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "ہم شاید ساحل پر پہنچنے والے ہیں۔" اس نے کیبن کے کھلے دروازے سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی اٹھ کر باہر کا جائزہ لیا۔ ساحل کی روشنیاں وہاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں عرشے پر نکل آیا۔ کچھ ہی فاصلے پر مختلف قسم کی موٹر بوٹس اور لانچیں لنگر انداز تھیں۔ ہماری لانچ بھی لحہ بہ لحہ ساحل سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بوبی نے اپنی رائفل کو فولڈ کر کے بریف کیس میں رکھ دیا ہے۔ میں نے بھی جلدی جلدی اپنی رائفل فولڈ کی اور بریف کیس میں رکھ کے چلنے کو تیار ہو گیا۔

ہم ساحل پر اترے تو رات کے آٹھ بجے کا عمل تھا۔ وہ نہ جانے ہانگ کانگ کا کون سا حصہ تھا۔ ساحل پر مختلف ملکوں کے چھوٹے جہاز اور لانچیں لنگر انداز تھیں اور بھانت بھانت کے لوگ وہاں گھوم رہے تھے۔ یہاں ہمارے پاس کوئی گاڑی بھی نہیں تھی۔ بوبی نے کسی ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں تو میں نے اچانک اسے چونکتے دیکھا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں میری نظر خوبصورت سی ایک قیمتی لانچ پر پڑی۔ اس پر خاصے واضح حروف میں

"گوشی" لکھا ہوا تھا۔ نام پڑھ کر میں بھی چونک اٹھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لانچ زینکو کی ملکیت تھی۔ میں نے بوبی کو اپنے اندازے سے آگاہ کیا تو اس نے بھی میرے خیال کی تائید کی۔

"بوبی! میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ "اگر ہم اسی لانچ کے ذریعے اس جزیرے تک چلیں تو بغیر کسی پریشانی کے پہنچ جائیں گے' کیا خیال ہے؟"

بوبی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو' پھر وہ بولا۔ "لگتا ہے' پے در پے ہونے والے ناخوشگوار واقعات کی وجہ سے تمہارا ذہن بھی متاثر ہوا ہے ورنہ ایسی حماقت آمیز بات کبھی نہ کہے۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا' پھر بولا۔ "اول تو اس کی لانچ کو ہائی جیک کرنا ہی ایک مسئلہ ہے' فرض کرتے ہیں ایسا ہو بھی گیا تو زینکو کو ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اس کی اطلاع مل جائے گی۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ ہمیں سمندر میں گھیرے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد میری لاش شارک مچھلیوں اور مگرمچھوں کی خوراک بنے۔ چلو ایک لمحے کو یہ بھی فرض کر لو کہ ہم سمندر میں کسی نہ کسی طرح زینکو کے ہتھے چڑھنے سے محفوظ رہے تو وہ جزیرے پہ بہ نفس نفیس ہمارے استقبال کو موجود ہو گا۔"

"ارے بابا' میں نے تو ایک امکان ظاہر کیا تھا' تم نے تو تقریر شروع کر دی۔ معذرت چاہتا ہوں کہ....."

"خرم!" بوبی جھنجلا گیا۔ "یہ تقریر نہیں ہے بلکہ میں تمہیں حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں کہ کہیں بے خبری میں نہ مارے جاؤ!"

"تو کیا باخبری کے چکر میں ہم بیٹھے انتظار کرتے رہیں کہ کب حالات سازگار ہوں اور کب زینکو ہم سے درخواست کرے کہ آیئے اپنی امانت سنبھالئے۔" میں نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

بوبی کو بے اختیار ہنسی آئی۔ "تم اس وقت اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو؟" وہ ہنس کر بولا۔ "آپریشن شروع کرنے سے پہلے ہمیں مناسب جگہ کا بندوبست کرنا ہو گا تاکہ ہم زینکو ایسے آدمی کے سامنے ڈٹ سکیں' اپنی قوت مجتمع کرنا ہو گی ابھی ہمارے پاس کیا ہے' صرف دو رائفلیں اور دو تین ریوالور!"

"تو ہمیں کیا دو چار بریگیڈ چاہیں۔" میں نے پھر اسی لہجے میں کہا۔

"اچھا یار' مجھے کچھ سوچنے دو۔" بوبی نے جھنجلا کر کہا اور خاموش ہو گیا۔

میں نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔ اسی دوران میں بوبی نے ایک ٹیکسی روکی اور ہم اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ اسی نے ٹیکسی ڈرائیور کو کوئی پتہ بتایا تھا۔ میں نے تو اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہم دونوں ہی اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔ میں

بھی سنجیدگی سے اس صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ ہم نہ جانے ہانگ کانگ کے کس حصے میں تھے مگر وہاں بھی ٹریفک کم نہیں تھی۔ میں خالی الذہنی کے عالم میں سڑک پہ دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔

ایک سگنل پر ٹیکسی رکی تو اس کے برابر میں آف وہائٹ کلر کی ایک کرسلز بھی آ ٹھہری۔ میں نے سرسری انداز میں اس کا جائزہ لیا تو بری طرح چونک اٹھا۔ اچانک سگنل کھل گیا اور کرسلر گاڑیوں کے سیلاب میں آگے بڑھ گئی۔ میں نے چیخ کے ڈرائیور سے کہا۔ "اس آف وہائٹ کرسلر کار کا پیچھا کرو۔"

ڈرائیور مقامی تھا مگر انگلش بھی سمجھتا تھا۔ اس نے بوبی کی طرف دیکھا تو بوبی نے بھی میری بات دہرا دی۔ ڈرائیور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا' پھر ٹیکسی کرسلر کے پیچھے ڈال دی۔

"کون ہے اس گاڑی میں؟" بوبی نے ونڈا سکرین پہ نظریں جمائے جمائے پوچھا۔

"اس گاڑی میں میر صاحب ہیں۔ میں انہی کی سفارش پر شواکی سے ملا تھا۔"

"شواکی دوست! بوبی نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ جلدی سے بولا۔ "مگر خرم! شواکی اب ہمارا دشمن ہو رہا ہے اور تم بتا رہے ہو کہ میر صاحب شواکی کے دوست ہیں۔"

"شواکی ضرور ہمارا دشمن ہے مگر میر صاحب میرے دوست ہیں۔ وہ پاکستانی ہیں اور پاکستان میں ابھی تھوڑی بہت مروت باقی ہے۔" میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

اچانک کرسلر دائیں ہاتھ کی ایک سڑک پر گھومی اور کچھ دور چلنے کے بعد ایک کثیرالمنزلہ بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔ میں نے بھی ٹیکسی والے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ کرسلر کا پچھلا دروازہ کھول کر میر صاحب باہر نکلے۔ وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ اس کا تعلق یا تو ترکی سے تھا یا پھر جرمنی سے۔

بوبی نے ٹیکسی ڈرائیور کو پیسے دیئے اور ہم دونوں بھی باہر نکل آئے۔ اس وقت تک میر صاحب اس نوجوان کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھ چکے تھے۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ان کے نزدیک پہنچا اور بلند آواز میں کہا۔ "السلام علیکم!"

میر صاحب بری طرح چونک اٹھے۔ انہوں نے گھوم کے مجھے دیکھا' پھر والہانہ انداز میں گلے لگا لیا اور بولے۔ خرم! تم..... خیریت سے تو ہو میں تو تمہاری طرف سے بہت فکرمند تھا..... اچھا آؤ میرے ساتھ چلو..... تفصیلی گفتگو بعد میں ہو گی۔"

پھر انہوں نے بوبی کی طرف دیکھا اور مجھ سے بولے۔ "یہ تمہارے ساتھ ہے؟"

"جی ہاں' یہ میرا دوست بوبی ہے۔" میں نے اس کا تعارف کرایا۔ بوبی نے آگے بڑھ کر ان سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

پھر میر صاحب کو اپنے ساتھی نوجوان کا خیال آیا۔ وہ مجھ سے بولے۔ "یہ اینڈریو ہے'

جرمن ہے مگر امریکہ میں پیدا ہوا ہے۔"

"ہیلو۔" اینڈریو نے باری باری ہم دونوں سے مصافحہ کیا۔ پھر ہم لوگ لفٹ کے ذریعے بارہویں منزل پر پہنچے۔ میر صاحب وہیں ایک فلیٹ میں مقیم تھے۔ اس فلیٹ میں دو یورپین اور تین مقامی آدمی پہلے سے موجود تھے۔ وہ میر صاحب کو دیکھ کر مودب انداز میں کھڑے ہو گئے۔ میر صاحب نے سر کے اشارے سے ان کے سلاموں کا جواب دیا اور ایک آراستہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہم تینوں ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ کمرے میں پہنچ کر انہوں نے کہا۔ "میرا خیال ہے پہلے کھانا کھالیں' باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ مجھے تو بھئی بھوک لگ رہی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے کسی ملازم کو آواز دی اور اسے کھانا لگانے کو کہا۔

کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے میں نے انہیں تفصیل سے آگاہ کیا۔

ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ ہونٹ بھینچ کر بولے۔ "اس شواکی کی اتنی جرات میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔" پھر وہ بوبی سے مخاطب ہوئے۔ "تم فکر مت کرو۔ تم نے خرم کا ساتھ دیا ہے تو تم میرے بھی دوست ہوئے۔ اور میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ میں آج ہی ہانگ کانگ پہنچا ہوں۔ ابھی شواکی سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے ایک آدمی کو آواز دی اور شواکی سے رابطہ کرنے کو کہا۔

ٹیلی فون اسی کمرے میں موجود تھا۔ ان کا آدمی تقریباً دس منٹ تک مختلف نمبر ڈائل کر کے شواکی کے بارے میں پوچھتا رہا' پھر ایک کال کے بعد وہ اچانک میر صاحب سے مخاطب ہوا۔ "مسٹر شواکی لائن پر ہیں۔"

"ہیلو مسٹر شواکی!" میر صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں..... اچھا آواز پہچان گئے!..... ہاں' میں آج ہی پہنچا ہوں..... یہاں کیا صورت حال ہے؟"..... ہاں..... وہ ہمارا دوست خرم تو خیریت سے ہے؟" میر صاحب مجھے دیکھ کر مسکرائے اور دوسری طرف کی بات سننے لگے۔" وہاٹ ڈو یو مین!..... کیا..... وہ تمہارے پاس نہیں ہے؟..... اچھا..... مگر یہ کیسے ممکن ہے..... اچھا..... مگر میں نے تو تمہارے پاس بھیجا تھا اسے!..... کب..... ویری سیڈ!..... اچھا تم ایسا کرو کہ فوری طور پر مجھ سے ملو..... ہاں' یہ تو تم نے عجیب خبر سنائی..... میرا ٹھکانہ تو وہی ہے..... ہاں ٹھیک ہے..... میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں..... او کے!" وہ ریسیور رکھ کے ہماری طرف مڑے۔ ان کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر بولے۔ "وہ مردود مجھ سے اب بھی جھوٹ بولتا ہے کہہ دیا کہ خرم ایک معمولی بات پر ناراض ہو کر چلا گیا۔ میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔ میں نے ابھی اسے یہیں بلایا ہے۔"

پھر ہم لوگ وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے۔ میں میر صاحب سے پاکستان کی تازہ ترین سیاسی صورت حال کے بارے میں پوچھتا رہا۔ انہوں نے بتایا کہ پاکستان میں آج کل

ہنگامے زوروں پر ہیں۔ نو مخالف جماعتوں نے مل کر حکومت کے خلاف تحریک چلائی ہے۔ ممکن ہے حکومت گھٹنے ٹیک دے اور دوبارہ الیکشن کرانے کی حامی بھر لے۔"

اسی وقت ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے شواکی کے آنے کی اطلاع دی۔ میر صاحب نے مجھے اور بوبی کو اندرونی کمرے میں جانے کا اشارہ کیا' پھر اپنے آدمی سے کہا کہ مسٹر شواکی کو یہیں لے آؤ۔

ہم دونوں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے اور دروازے کے قریب ٹھہر گئے تاکہ میر صاحب اور شواکی کی باتیں سن سکیں۔ پھر میر صاحب کی آواز آئی۔ "ہیلو مسٹر شواکی! کیسے ہیں آپ"

"کوائٹ فائن!" شواکی نے جواب دیا۔ "آپ کب آئے؟"

"میں آج ہی پہنچا ہوں۔" میر صاحب نے جواب دیا' پھر وہ بولے۔ "ہاں' وہ خرم کا کیا قصہ ہے؟"

"خرم ہمیں ڈبل کراس کرنے کے چکر میں ہے۔" شواکی نے جواب دیا۔ "وہ نہیں چاہتا کہ آپ بھی ان کاغذات سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ بالا ہی بالا ان کاغذات اور مائیکرو فلمز کی سودے بازی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی مخالفت کی تو وہ میرے ہی خلاف ہو گیا۔" شواکی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا تھا۔

"تو کیا وہ چیزیں اس نے حاصل کر لی تھیں؟" میر صاحب نے انجان بن کر پوچھا۔

"ابھی اس نے وہ چیزیں حاصل تو نہیں کی تھیں مگر مخالف پارٹی کے ایک آدمی بوبی سے ساز باز کر رکھی تھی۔"

"مسٹر شواکی!" میر صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔ "آپ میرے ساتھ کب سے ڈیل کر رہے ہیں؟"

"تقریباً بیس سال تو ہو چکے ہیں۔" شواکی کے لہجے میں الجھن تھی۔

"اس عرصے میں کبھی میں نے آپ سے جھوٹ بولا' کبھی دھوکہ دیا!"

"ایسا نہیں ہوا جب ہی تو ہمارے تعلقات آج تک قائم ہیں۔" شواکی ابھی تک الجھا ہوا تھا۔

"پھر آپ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟ غلط بیانی سے کام کیوں لے رہے ہو؟ کیا آپ تعلقات بگاڑنا چاہتے ہیں؟ خرم مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔"

"تو کیا خرم پاکستان پہنچ گیا!" شواکی حیرت زدہ رہ گیا۔ "مگر..... یہ ناممکن ہے۔ وہ اگر ہانگ کانگ چھوڑتا تو مجھے ضرور اطلاع مل جاتی۔"

"اس لئے کہ آپ کے آدمی اسے ہمارے شہر میں تلاش کر رہے ہیں اور ایئرپورٹ پر بھی موجود ہیں!" میر صاحب کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" شواکی جھنجلا گیا۔
"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خرم پاکستان میں نہیں بلکہ یہیں ملا تھا مجھے۔ اس نے سب کچھ مجھے تفصیل سے بتا دیا ہے۔ اب آپ بتائیے' آپ نے غلط بیانی سے کام کیوں لیا؟"
"میں نے خرم کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ یہ بوبی قابل اعتبار آدمی نہیں ہے۔ اس پر بھروسہ مت کرو اور اسے میرے حوالے کر دو مگر اس نے کچھ ماننے ہی سے انکار کر دیا۔ اس کے ہاتھوں میرے تین آدمی مارے گئے ہیں' پھر بھی آپ کہہ رہے ہیں کہ میں اس سے دشمنی کیوں کر رہا ہوں۔"
"خرم!" میر صاحب نے مجھے پکارا۔ "ادھر آ جاؤ اور بوبی کو بھی لیتے آؤ۔"
میں اور بوبی کمرے میں داخل ہوئے تو شواکی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "تم مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے۔" وہ مجھ سے مخاطب تھا۔
"میں تمہیں نقصان پہنچانا بھی نہیں چاہتا ہوں۔ یوں بھی ہم لوگ گھر آئے مہمان کی عزت کرتے ہیں۔ حالانکہ تم نے ایسا نہیں کیا۔" پھر میں توقف کے بعد بولا۔ "اور جسے تم ناقابل اعتبار کہہ رہے ہو' اس نے قدم قدم پر میرے لئے جان کی بازی لگائی ہے اور آج بھی میری وجہ سے جان ہتھیلی پر لئے گھوم رہا ہے۔"
میر صاحب اچانک کھڑے ہو گئے۔ "او کے مسٹر شواکی!" وہ سرد لہجے میں بولے۔
"آج کے بعد میں تم سے کسی قسم کی کوئی ڈیل نہیں کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم لڑ بھڑ کے علیحدہ ہوں' بس میری یہ گزارش ہے کہ میرے کسی کام میں رکاوٹ مت ڈالنا ورنہ پاکستان کی سرحدوں میں قدم بھی نہ رکھ سکو گے۔ تم خوب جانتے ہو کہ میں جو کچھ کہتا ہوں' اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔" وہ بولتے بولتے رکے' ذرا توقف کیا' پھر بولے۔
"میرا خیال ہے کہ تمہیں وہسکی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ملازم کو آواز دے کر وہسکی اور گلاس وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ "ہم دوستانہ ماحول میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں تو بہتر ہے۔" میر صاحب خاموش ہو کر اس اکیوریم کو گھورنے لگے جو کمرے کے ایک گوشے میں تھا۔
شواکی کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ شدید الجھن میں گرفتار ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہے۔ میں غور سے اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔ "مسٹر غلام حسین! میں نہیں چاہتا کہ ہمارے برسوں کے تعلقات ایک ذرا سی بات پر ختم ہو جائیں۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں معذرت چاہتا ہوں اور....."
"معذرت خرم سے کریں۔" میر صاحب نے جواب دیا۔ "آپ نے اس پر الزام لگایا ہے کہ یہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز کی سودے بازی کر رہا تھا۔ آپ نے اس کی حب الوطنی پر شک کیا ہے۔ انہی کاغذات کی خاطر خرم نے بارہا اپنی جان کی بازی لگائی ہے۔ اس کی پشت

پناہ کوئی حکومت یا ادارہ نہیں ہے بلکہ یہ تنہا اس مشن پر نکلا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ ان کاغذات کی سودے بازی کر رہا تھا۔“

”سوری خرم!“ شواکی میری طرف گھوم گیا۔ ”میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے تم پر الزام تراشی کی۔“ پھر وہ بوبی سے مخاطب ہوا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ بھی زیادتی کی۔“

میر صاحب! مسکرانے لگے اور مجھ سے بولے۔ ”دیکھا خرم! اسے کہتے ہیں دوستی۔ تمہیں شاید اندازہ نہ ہو کہ شواکی کتنا بڑا آدمی ہے۔ یہ چاہتا تو مجھے ہانگ کانگ سے زندہ نہ نکلنے دیتا مگر اس نے محض دوستی کا لحاظ کیا ہے۔“

”اب یہ تم مجھ پر طنز کر رہے ہو۔“ شواکی مسکرا کر بولا۔

پھر اچانک ماحول پر پرچھائی ہوئی کشیدگی کا خاتمہ ہو گیا۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا ورنہ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اب میر صاحب اور شواکی میں ٹھن جائے گی۔ شواکی، میر صاحب کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر میر صاحب نے اسے خوبصورتی سے ٹال دیا۔

○

اس کے جانے کے بعد میں نے میر صاحب سے وہ سوال کر ہی لیا جو بہت دیر سے میرے ذہن میں اٹکا ہوا تھا۔ میں نے میر صاحب سے پوچھا۔ ”اگر شواکی آپ سے بھی دشمنی پر کمربستہ ہو جاتا تو آپ کیا کرتے؟“

میر صاحب خوش دلی سے مسکرائے۔ ”خرم! میں بھی جانتا تھا کہ شواکی تعلقات ختم کرنے پر کبھی رضامند نہیں ہو گا۔“

”کیوں، اس بات کا یقین کیسے تھا آپ کو؟“ بوبی نے پوچھا۔

”زنکو بھی مجھ سے ڈیلنگ کرنے کا خواہش مند ہے۔“ میر صاحب نے ہنس کر کہا۔

”چونکو مت، یہ وہی زینکو ہے جس کا تذکرہ تھوڑی دیر پہلے تم نے کیا تھا۔ شواکی ایسے آدمی بھی زینکو کو جھک کے سلام کرتے ہیں۔ شواکی نے بھی سوچا ہو گا کہ اس سے تعلقات منقطع ہونے کے بعد میں زینکو سے جا ملوں گا۔“

”مگر آپ تو اس کی دوستی کی تعریف کر رہے تھے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”دراصل ابھی میں بھی اس سے بگاڑنا نہیں چاہتا۔ ہم دونوں ہی مجبور ہیں۔“ میر صاحب مسکرائے۔ ”ابھی میں شواکی کو زینکو کے خلاف استعمال کروں گا۔“

اس پر مجھے جان کی تجویز یاد آئی۔ میں نے میر صاحب سے بھی اس تجویز کا تذکرہ کر دیا۔

وہ دیر تک آنکھیں موندے کچھ سوچتے رہے، پھر بولے۔ ”خرم! یہ تجویز تو معقول ہے

مگر پہلے ہمیں کسی ایسے ٹھکانے کا بندوبست کرنا پڑے گا جہاں پرندہ پر بھی نہ مار سکے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ کام ہم لوگ اپنے طور پر کریں۔" بوبی نے کہا۔ "شواکی کو اس معاملے کی ہوا بھی نہ لگنے دیں۔" میر صاحب نے استفہامیہ نظروں سے بوبی کو دیکھا تو اس نے جواب دیا۔ "دیکھئے نا! ابھی آپ ہی نے تو بتایا ہے کہ شواکی کو آپ کی طرف سے خطرہ ہے کہ تعلقات منقطع کرنے کے بعد آپ زینکو سے مل جائیں گے۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرلے گا۔ زینکو کو اطلاع دے کر نہ صرف وہ اپنے نمبر بڑھائے گا بلکہ آپ کے اور زینکو کے درمیان ایک خلیج بھی حائل کر دے گا۔"

میر صاحب کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "بات تو تم نے ذہانت کی کی ہے۔" وہ مسکرا کر بولے۔ پھر پرخیال انداز میں کہنے لگے۔ مگر ایسی کوئی محفوظ جگہ شواکی کے تعاون کے بغیر مل بھی نہیں سکتی۔"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" بوبی نے کہا۔ "جگہ کا بندوسبت کرنا میری ذمہ داری ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم جگہ کا بندوسبت کرو۔ ہم آپریشن شروع کرتے ہیں۔" میر صاحب نے کہا۔

"ہمیں ایک گاڑی کی بھی ضرورت ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس جرمن نوجوان نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ "اتنا تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ ابھی ہم لوگ جس گاڑی میں آئے ہیں۔ وہ بھی میری ہی ملکیت ہے۔"

ہم لوگ وقت ضائع کئے بغیر جگہ کی تلاش میں نکل گئے۔ اب وہی کرسلر ہمارے پاس تھی اور اسٹیرنگ پر بوبی تھا۔ اس کا رخ ایک مرتبہ پھر ساحل کی طرف تھا۔ میں خاموشی سے مستقبل میں پیش آنے والی ممکنہ صورت حال پر غور کر رہا تھا۔

ساحل پر پہنچ کر ہمیں ایک اور دھچکا لگا۔ رابرٹ کی لانچ پولیس کے قبضے میں تھی۔ پولیس والے ساحل پر بھی پھیلے ہوئے تھے۔ مجھے رابرٹ اور اس کے ملازم کی فکر تھی مگر ان کے بارے میں کسی سے پوچھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بوبی بھی متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پرخیال انداز میں کہا۔

"رابرٹ تو خیر ان کے قبضے میں نہیں آیا ہو گا مگر مجھے لانچ کا افسوس ہے۔ اب ہمیں ایک لانچ کا بندوبست بھی کرنا ہو گا۔"

ہمارے منصوبے میں بنیادی اہمیت لانچ کی تھی۔ بوبی ایک مرتبہ پھر واپسی کے لئے مڑ گیا تھا۔ پھر وہ شہر کے گنجان آباد علاقے سے نکل کر ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں اونچی اونچی عمارتیں تو تھیں مگر گاڑیوں کا اتنا ہجوم نہیں تھا۔ وہیں کی ایک پرانی سی ملٹی اسٹوری بلڈنگ کا پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ نیچے اتر آیا۔ اس کا رخ بلڈنگ کے اس

راستے کی طرف تھا جو پارکنگ لاٹ سے اندر ہی اندر بلڈنگ کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں گاڑیوں کا ہجوم تھا۔ سوائے ایک چوکیدار کے کوئی ذی روح وہاں موجود نہیں تھا۔ چوکیدار بھی پارکنگ لاٹ کے داخلی دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ بوبی وہاں سے بلڈنگ میں داخل ہوا۔ کوریڈور میں مدھم روشنی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ اس وقت تو رات تھی مگر میرا اندازہ تھا کہ یہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا ہو گا۔ کوریڈور بالکل سنسان پڑا تھا۔ وہاں سے ہم لفٹ تک پہنچے۔ لفٹ مین بھی موجود نہیں تھا۔ بوبی نے بتایا کہ یہاں دس بجے کے بعد کوئی لفٹ مین نہیں ہوتا۔ پھر اس نے لفٹ میں سوار ہو کر ٹوپ فلور کا بٹن دبا دیا۔ ٹوپ فلور پر پہنچ کر اس نے ایک فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک مقامی لڑکی تھی۔ وہ بوبی کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ بوبی نے مجھ سے کہا۔ ”خرم! یہ پنکی ہے‘ میری بہترین دوست۔“ پھر وہ پنکی سے مخاطب ہوا۔ ”یہ میرا دوست خرم ہے۔“

پنکی نے دلاویز انداز میں پلکیں جھپکائیں اور بہت ادا سے بولی۔ ”ہیلو!“

”ہیلو۔“ میں نے بھی جوابی طور پر خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”پنکی!“ بوبی نے کہا۔ ”ہمیں کچھ دنوں کے لئے تمہارا فلیٹ چاہئے۔“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ چینیوں والے مخصوص لہجے میں اس نے انگلش کا جملہ ادا کیا۔ ”تم جب تک چاہو اس فلیٹ کو استعمال کر سکتے ہو۔“

”تمہیں کچھ دن کے لئے کہیں اور منتقل ہونا پڑے گا۔“ بوبی نے کہا۔

”اس فلیٹ میں تین کمرے ہیں۔“ پنکی نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک ٹی وی لاؤنج بھی ہے۔ میں تو ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔ تم مجھے یہاں سے ہٹانا کیوں چاہتے ہو؟“ اتنے عرصے کے بعد تو تم سے ملاقات ہوئی ہے۔“

”بات سمجھنے کی کوشش کرو پنکی!“ بوبی نے نرم لہجے میں کہا۔ ہم لوگ اس دوران میں ڈرائنگ روم تک پہنچ گئے تھے۔ ”یہاں سے ہٹنا تمہارے ہی حق میں بہتر ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری وجہ سے تم بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔“

”صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم مجھ سے غیریت برت رہے ہو۔ تم نہیں چاہتے کہ مجھے کچھ معلوم ہو‘ حالانکہ تم اچھی طرح مجھے جانتے ہو۔“

”اس دفعہ معاملہ بہت سنگین ہے‘ پنکی۔“ بوبی کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

”میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ تمہیں خطرے میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“

”اچھا تم ہمیں کافی تو پلاؤ۔“ بوبی نے اسے ٹالنے کو کہا۔

وہ کافی بنانے چلی گئی تو میں نے اس سے کہا۔ ”اس لڑکی پر ہم کس حد تک اعتبار کر سکتے ہیں؟“

”آخری حد تک۔“ بوبی نے جواب دیا۔ ”یہ اپنی جان دے دے گی مگر ہمارے اعتماد کو

ٹھیس نہیں پہنچائے گی۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ یہیں رہے تو ہمارے لئے بہتر ہو گا۔ یہ فلیٹ اس کا ہے۔ کسی بھی غیر متوقع صورت حال کو وہ بہتر طریقے سے کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اسے اعتماد میں لے لو بوبی!" "میں نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" بوبی نے طویل سانس لے کر کہا۔ "میں تو اس خیال سے ہچکچا رہا تھا کہ کہیں تم اعتراض نہ کرو۔"

"بوبی!" میں شکایت بھرے لہجے میں بولا۔ "تم میرے دوست ہو۔ میرے ساتھ جان کی بازی لگا رہے ہو اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر سر کھپا رہے ہو!"

بوبی کوئی جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ پنکی لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی جس میں بھاپ اگلتے کافی کے مگ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے کافی کے مگ ہمارے آگے رکھے اور بوبی سے بولی۔ "بوبی! تم نے بارہا میرا فلیٹ استعمال کیا ہے مگر پہلے تو تم نے کبھی رازداری نہیں برتی۔"

"یہ معاملہ ذرا دوسری نوعیت کا ہے۔" بوبی نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال تم ضد کر رہی ہو تو تمہیں بتانا پڑے گا۔" وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا' پھر گھمبیر لہجے میں ب ولا۔ "پنکی ہم ایک لڑکی کو اغواء کر کے یہاں لائیں گے۔"

"بس' اتنی سی بات!" پنکی مسکرائی۔

"یہ اتنی سی بات اس وقت نہیں رہے گی جب میں تمہیں اس لڑکی کے باپ کا نام بتاؤں گا۔" بوبی اسی لہجے میں بولا۔ "وہ لڑکی زینکو کی بیٹی ہے۔"

"کیا؟" پنکی نے حیرت سے دہرایا اور وہ اس بری طرح چونکی کہ کافی اس کے کپڑوں پر چھلک گئی۔ "کیا..... کیا کہا تم نے؟" اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ خوف کا عنصر تھا۔ "تم زینکو کی بیٹی کو اغواء کرو گے! تم....."

"آہستہ بولو پنکی!" بوبی نے اسے جھڑک دیا۔ "میں اسی لئے تمہیں بتانا نہیں چاہ رہا تھا۔ زینکو کا نام سنتے ہی تمہارے اوسان خطا ہو گئے نا!"

"یہ بات نہیں ہے۔" پنکی کھسیانے انداز میں ہنسنے لگی۔ "میں سمجھی' تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔ اگر تم واقعی سیریس ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتی ہوں بوبی! یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔"

"پھر زینکو کا نام سن کر تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑنے لگیں۔" بوبی بھی مسکرایا۔

"میں اصل میں توقع نہیں کر رہی تھی کہ تم بہ راہ راست زینکو ہی کو للکار بیٹھو گے۔"

"اچھا' اب یہ بتاؤ کہ اپنا فلیٹ دے رہی ہو یا نہیں؟" بوبی نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"نہ صرف فلیٹ دوں گی بلکہ اس ایڈوینچر میں تمہارے ساتھ بھی رہوں گی۔"

"ٹھیک ہے پنکی!" بوبی نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اس کے لئے ایک دو دن تمہیں گھر تک ہی محدود ہونا پڑے گا۔ ہم کسی بھی وقت لڑکی کو یہاں لا سکتے ہیں۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "ہاں، میں تو بھول ہی گیا، تم نے تو سنگ ٹریننگ بھی لے رکھی ہے۔ اب ہمارا کام مزید آسان ہو جائے گا۔ اگر لڑکی شور مچانے کی کوشش کرے تو تم اسے خواب آور دوا کا انجکشن بھی لگا سکتی ہو۔"

اس کے بعد ہم مزید دس منٹ وہاں ٹھہرے۔ بوبی نے اس دوران میں پنکی کو تفصیلات سے آگاہ کیا اور اسے اچھی طرح سمجھانے کے بعد ہم روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ چلتے چلتے مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے پنکی سے پوچھا کہ اس فلیٹ میں فون تو ہو گا؟

"ہاں، یہاں فون موجود ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "کیا کہیں فون کرنے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں، میں اس لئے پوچھ رہا تھا کہ بعد میں ہمیں فون کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

اب ہمیں کسی تیز رفتار بوٹ کا بندوبست کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں وہی جرمن نوجوان اینڈریو ہماری مدد کر سکتا ہے جس نے ہمیں گاڑی دی تھی۔ وہاں سے ہم سیدھے میر صاحب کے فلیٹ پر پہنچے۔ میں نے میر صاحب کو بتایا کہ جگہ کا بندوبست ہو گیا ہے۔

"اس جگہ کا شواکی کے کسی آدمی یا تمہارے گینگ کے کسی فرد کو تو علم نہیں؟"

"وہ فلیٹ اصل میں میری ایک دوست کی ملک ہے۔ اس کا میرے گینگ یا شواکی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" بوبی نے جواب دیا، پھر میر صاحب سے بولا۔ "اب ہمیں صرف ایک تیز رفتار موٹر بوٹ کی ضرورت ہے۔"

"بوٹ کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔" میر صاحب مسکرائے۔ "میں جانتا تھا کہ تمہیں موٹر بوٹ کی ضرورت بھی پڑے گی۔ اینڈریو نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔"

"میرا خیال ہے ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔" اینڈریو بہت کام کا آدمی ہے۔ یہ نہ صرف بوٹ چلانے میں ماہر ہے بلکہ ہر قسم کا اسلحہ بھی ماہرانہ انداز میں استعمال کرنا جانتا ہے۔"

ہماری کرسلر ایک مرتبہ پھر ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس مرتبہ اسٹیرنگ اینڈریو کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی ڈرائیونگ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ وہ ڈرائیونگ میں بھی ایکسپرٹ ہے۔ وہ بہت اسپیڈ میں مگر بڑے ماہرانہ انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس نے گاڑی کے بریک شاذ و نادر ہی استعمال کئے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ کسی طرح زگ زیگ بنا کر اور کٹ مار کے گاڑی کو نکال لے۔ ہماری حیرت دیکھ کر وہ خود ہی بولا۔ "ٹریفک کے جتنے بھی حادثات ہوتے ہیں، ان میں سے نائنٹی پرسنٹ بریک استعمال کرنے سے ہوتے

ہیں۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے کہ بریک استعمال ہی نہ کیا جائے۔"

"بریک استعمال کیا جائے مگر بہت زیادہ ناگزیر صورت حال میں۔" وہ گاڑی کو لہراتے ہوئے بولا۔ "آپ نے دیکھا کہ اب تک میں نے صرف دو یا تین موقعوں پر بریک استعمال کیا ہے۔"

اس کا عجیب و غریب فلسفہ سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہنسنے لگا۔ انہی باتوں کے دوران میں ہم ساحل پر پہنچ گئے۔ اس نے اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ کے دور افتادہ حصے میں پارک کی اور ہم پیدل سال کی طرف بڑھے۔ وہاں بہت سی لانچیں اور بوٹس پانی میں کھڑی ڈول رہی تھیں۔ رابرٹ کی لانچ اب بھی اسی جگہ موجود تھی مگر اس میں اندھیرا تھا اس لئے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اب بھی پولیس کے قبضے میں ہے یا پولیس والے جا چکے ہیں۔ کچھ فاصلے پر زینکو کی لانچ "گوشی" بھی کھڑی تھی۔ اس کے عرشے پر بھی روشنی ہو رہی تھی اور لانچ کی اندرونی لائٹس بھی آن تھیں۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر چھوٹی سی ایک موٹر بوٹ پانی کی لہروں پر کھڑی ڈول رہی تھی۔ اس کا رنگ سفید تھا' درمیان میں سرخ اور سبز پٹیاں تھیں اور اس پر جلی حروف میں (Rapid Queen) کے الفاظ تحریر تھے۔ اینڈریو نے بتایا کہ یہ میری بوٹ ہے۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر بڑی سی ایک لانچ موجود تھی۔ لانچ کیا' وہ چھوٹا سا ایک جہاز تھا۔ اس کے عرشے کی تیز روشنی میں اینڈریو کی موٹر بوٹ کا رنگ اور نام واضح ہو گیا تھا ورنہ اندھیرے میں اسے اتنی تفصیل سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

موٹر بوٹ کے اندر مدھم سی رہ روشنی کا صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ بوٹ ساحل سے کچھ فاصلے پر تھی۔ اس پر جانے کے لئے ہمیں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اترنا پڑتا۔ میں نے دیکھا کہ اینڈریو اپنے جوتے اتار رہا ہے۔ میں نے بھی اپنے جوتے اتار کے ہاتھ میں پکڑ لئے اور پینٹ کے پائنچے گھٹنے تک چڑھا لئے۔ میرے دوسرے ہاتھ میں وہی بریف کیس تھا جس میں گن کی خوفناک فولڈنگ رائفل بند تھی۔ ہم تینوں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلتے ہوئے بوٹ کے پاس پہنچے۔ میں اچھل کر بوٹ میں سوار ہونا چاہتا تھا کہ اینڈریو نے اشارے سے مجھے روک دیا اور بلند آواز میں آواز دی۔ "جیک!"

دوسرے ہی لمحے جیک اچھل کر سامنے آ گیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا قد ساڑھے تین فٹ رہا ہو گا مگر جسم خوب گٹھا ہوا تھا۔ اس نے گرج دار آواز میں اینڈریو سے کہا۔ "ہیلو مسٹر اینڈریو' مجھے آپ کا پیغام مل گیا تھا۔ آیئے اوپر آ جایئے۔" اس نے سہارے کے لئے اپنا چھوٹا سا مضبوط ہاتھ اینڈریو کی طرف بڑھایا۔

اینڈریو اس کا ہاتھ پکڑ کے بوٹ میں سوار ہو گیا۔ پھر اس نے باری باری مجھے اور بوبی کو بھی اوپر گھسیٹ لیا اور مسکرا کر بولا۔ "جانتے ہو' میں نے اس سے پہلے تمہیں اوپر جانے

سے کیوں روکا تھا؟ اگر تم اپنی آمد کی اطلاع دیئے بغیر بوٹ میں سوار ہو جاتے تو جیک بے دریغ تمہیں گولی مار دیتا۔ وہ ایسا ہی سر پھرا مگر بلا کا نشانے باز ہے۔"

ہم لوگ، آگے بڑھے ہی تھے کہ اچانک میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ کتا اتنا ہی خوف ناک تھا۔ بوبی بھی بھٹک کر رک گیا تھا کیوں کہ اسی قسم کا ایک خوف ناک کتا اس پر بھی جھپٹا تھا۔ جیک نے ڈانٹ کر انہیں واپس بلایا اور ہم سے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "سوری سر! دراصل آپ لوگ اچانک یہاں پہنچے ہیں اس لئے مجھے کتوں کو باندھنے کا خیال ہی نہیں رہا۔"

میں ستائشی نظروں سے ان خونخوار کتوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ گرے ہاؤنڈز کا جوڑا تھا۔ مجھے بھی بچپن ہی سے کتے پالنے کا شوق تھا مگر وقت اور حالات نے مجھے اس کا موقع نہ دیا۔ میری زندگی کا پرسکون دور وہ تھا جب میں ماما کے ساتھ رہتا تھا مگر وہ بیچارے گرے باؤنڈز یا بلڈ باؤنڈ ایسا کتا پالنے کی عیاشی نہیں کر سکتے تھے اس لئے میں دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔

دونوں کتے پھر کسی تاریک گوشے میں جا بیٹھے۔

میں نے ہنستے ہوئے اینڈریو سے کہا۔ "اب اگر کوئی اور محافظ بھی ہو تو اس کے بارے میں بھی بتا دو ورنہ میں تو دہشت سے مر جاؤں گا۔"

اینڈریو ہنسنے لگا اور بولا۔ "بس اب کچھ نمودار نہیں ہو گا۔ آپ بے فکر رہیں۔"

اس موٹر بوٹ میں صرف ایک ہی چھوٹا سا کیبن تھا لیکن وہ کیبن خاصا آرام دہ تھا۔ دیوار کے ساتھ نفیس قسم کی تین کرسیاں نسب تھیں' ایک سرے پر چھوٹا سا ایک بیڈ تھا۔ وہ بھی کیبن کی دیوار کے ساتھ فکس تھا' کرسیوں کے ساتھ ہی ایک گول میز پڑی تھی۔ میں کیبن کا تفصیلی جائزہ لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوبی مجھ سے پہلے ہی ایک کرسی پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "یار' تم ابھی سے تھک گئے؟"

"ابھی سے!" وہ حیرت سے بولا۔ "کئی دن ہو گئے ہمیں اس بھاگ دوڑ میں۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ مت دو میرا ساتھ۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ بوبی اچانک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور مجھے گھورنے لگا۔ "مجھے گھورو مت۔" میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری وجہ سے تم کیوں اپنی....."

"خرم!" بوبی نے میری بات کاٹ دی۔ "اگر آئندہ تم نے ایسی کوئی بات کی تو..... میں....."

"تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گا۔" میں نے ہنستے ہوئے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

"تو میں تمہیں جیک اور اس کے کتوں کے حوالے کر دوں گا۔"

"سوری سر!" اچانک جیک کی آواز سن کر میں اور بوبی دونوں اچھل پڑے۔ "

کتے بہت نازک مزاج ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "اتنا ثقیل گوشت ان سے ہضم نہیں ہو گا۔"

بوبی بے تحاشا قہقہے لگانے لگا۔ ہنسی تو مجھے بھی بہت آ رہی تھی مگر میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ "مسٹر جیک! میرا خیال ہے کہ ہم آپس میں ابھی اتنے فری نہیں ہوئے ہیں۔" میرے تلخ لہجے سے جیک کا چہرہ اتر گیا۔ "تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو ورنہ ایسی بات ہرگز نہ کرتے۔"

"معذرت چاہتا ہوں سر!" جیک تھوک نگل کر بولا۔ "مجھے علم نہیں تھا کہ آپ اس حد تک برا مان جائیں گے۔"

"تم نے بات ہی ایسی کی تھی۔" بوبی نے ہنسی روک کر کہا۔ "شکر کرو کہ تم نے کتوں کو بروقت پیچھے ہٹا دیا ورنہ یہ تو کتوں کے دشمن ہیں۔"

وہ کچھ اور بھی کہتا مگر اینڈریو کے آنے سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "مسٹر خرم! میری طرف سے تمام انتظامات مکمل ہیں۔ میں نے بوٹ کے انجن کی جنرل چیکنگ کر لی ہے۔ بوٹ کا انجن اے ون کنڈیشن میں ہے۔ اگر تم کہو تو ہم ابھی دس منٹ میں روانہ ہو سکتے ہیں۔"

"تھینک یو ڈیئر۔" بوبی نے جواب دیا۔ "بس تم ذرا حلق تر کرنے کا انتظام کر دو، میں اس دوران میں راستے کا نقشہ فائنل کرتا ہوں۔"

○

رات اندھیری اور سرد تھی۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں اس لئے آسمان بالکل تاریک تھا۔ رہی سہی کسر گھرے سیاہ بادلوں نے پوری کر دی تھی۔ ہم تیز رفتاری اور احتیاط سے اس جزیرے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں اس کی اطلاع کے مطابق گوشی موجود تھی۔ وہ جزیرہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ جیک کی تیز رفتار بوٹ کے ذریعے ہم ایک گھنٹہ چالیس منٹ میں اس جزیرے تک پہنچ گئے۔ بوٹ چٹانوں کی آڑ میں چھپا دی تھی۔ جیک اپنے کتوں سمیت بوٹ پر موجود تھا۔ ہم نے اس سے کہہ دیا تھا کہ کسی بھی صورت میں آدھے گھنٹے سے زیادہ ہمارا انتظار مت کرنا۔

"ممکن ہے ہم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔ اس صورت میں ہمیں یہ تو اطمینان ہوگا کہ ہماری گرفتاری کی اطلاع میر صاحب کو مل چکی ہے۔" بوبی نے کہا۔

"اگر برا نہ مانیں خرم صاحب تو میں کچھ کہوں!" پستہ قد جیک نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ مجھے ساتھ لے چلیں اور مسٹر اینڈریو کو بوٹ میں چھوڑ دیں تو....."

"کیوں؟" بوبی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پہلی بات تو یہ کہ مسٹر اینڈریو بہت مہارت اور برق رفتاری سے بوٹ چلا سکتے ہیں۔ میں تو ان کے مقابلے میں اناڑی ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کتے مجھ سے مانوس ہیں۔ کسی بھی خطرے کی صورت میں ہمارے بہت کام آئیں گے۔"

اس بونے کی بات میں وزن تھا۔ کتے واقعی ہمارے بہت کام آ سکتے تھے۔ میں نے کچھ دیر سوچا' پھر استفسار طلب نظروں سے باری باری بوبی اور اینڈریو کی طرف دیکھا۔

اینڈریو نے کہا۔ "مسٹر خرم! اگر آپ جیک کو لے جانا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میر صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی کہ مجھے آپ کی ہر بات پر عمل کرنا ہے۔ آپ کا حکم....."

"ٹھیک ہے یار۔" میں اس کی طویل گفتگو سے بور ہو کر بولا۔ "جیک کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔" میں نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"جیک بہت کام کا آدمی ہے۔" اینڈریو نے کہا۔ "اس کے قد اور جسامت پر نہ جائیں۔ اس نے ساڑھے چھ فٹ کے طاقت ور اور توانا مردوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس کا نشانہ بھی غضب کا ہے۔ اندھیرے میں آواز پر فائرنگ کرتا اور....."

"جاپان اسمبلڈ ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مارکیٹ میں فاضل پرزے بھی دستیاب ہیں۔ ایک سال کی گارنٹی ہے۔ یار' تم تو ایسے بتا رہے ہو کہ جیک آدمی نہیں کوئی مشین ہے۔"

"واقعی وہ کسی مشین کی طرح کام کرتا ہے۔" اینڈریو نے سنجیدگی سے کہا۔

پھر یہ طے ہوا کہ میں بوبی اور جیک جائیں گے' اینڈریو بوٹ ہی میں ہمارا انتظار کرے گا۔

ہم اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے محل نما عمارت کی طرف بڑھے' جہاں گوشی موجود تھی۔ ہم تینوں ہر قسم کے خطرے سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ حیرت تو مجھے دونوں کتوں پر تھی۔ وہ بھی بغیر کوئی آواز نکالے ہمارے ساتھ چل رہے تھے۔ جیک نے واقعی انہیں بہت محنت سے ٹرینڈ کیا تھا۔

اونچے نیچے ٹیلوں اور ناہموار زمین سے نکل کر ہم اچانک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں زمین بالکل ہموار تھی۔ وہ زمین خاص طور پر ہموار کی گئی تھی۔ میں نے وہیں رک کر کوٹھی کا جائزہ لیا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ضرور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے اور یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم نے سمجھ لیا ہے۔ میری طرح بوبی بھی کسی سوچ میں گم تھا اور پرخیال انداز میں کوٹھی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ سرگوشی میں بولا۔ "خرم! یہ ممکن ہی نہیں کہ زینکو کی بیٹی اس کوٹھی میں موجود ہو اور یہاں کوئی محافظ نہ ہو۔"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر وہاں کوئی محافظ ہوا تو جونہی

ہم اس کھلے میدان میں نکلیں گے' وہ ہمیں دیکھ لے گا۔"

"اگر آپ کہیں تو میں چلا جاؤں۔" جیک نے کہا۔

"تم کیسے جاؤ گے؟" میں نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ دیکھنے والا تمہیں نہیں دیکھ سکے گا!؟"

"جی ہاں' میرا یہی خیال ہے۔" جیک نے جواب دیا۔ "میں زمین کے ساتھ چپک کر گیٹ تک پہنچوں گا۔ کسی کے فرشتے بھی مجھے نہیں دیکھ پائیں گے۔ اگر میں نے وہاں کوئی خطرہ محسوس کیا تو ایک دفعہ الو کی آواز نکالوں گا' راستہ صاف ہوا تو میں حلق سے دو دفعہ الو کی آواز نکالوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے کتوں کو عجیب سا اشارہ کیا اور وہ خود پیٹ کے بل زمین پر لیٹ گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھا' جیک کسی تیز رفتار چھپکلی کی طرح سینے کے بل رینگتا آگے بڑھا۔ اس کے دونوں کتے ہمارے ہی پاس رک گئے تھے۔ میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ کوئی میری طرح سینے کے بل نہیں چل سکتا' مگر بلا مبالغہ جیک کی رفتار مجھ سے دگنی تھی۔ جیک کچھ دور تک تیزی سے رینگتا تھا' پھر بے سدھ ہو کر پڑ جاتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہی تھا کہ اگر کوئی کوٹھی سے دیکھ بھی رہا ہو تو اسے احساس نہ ہو سکے کہ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔

مگر یہ میری خوش فہمی تھی کہ جیک کسی کی نظروں سے آئے بغیر وہاں تک پہنچ جائے گا۔

"کون ہے؟" اچانک ایک گرجدار آواز گونجی۔ بولنے والے نے میگافون استعمال کیا تھا۔ یقینی طور پر جیک کی نقل و حرکت دیکھ لی گئی تھی۔ ہماری یہ خوش فہمی دور ہو گئی تھی کہ اس وسیع و عریض کوٹھی میں کوئی محافظ نہیں ہو گا۔

پھر میرے کانوں میں کتے کے بھونکنے کی آواز آئی تو میں بری طرح اچھل پڑا۔ جیک کے دونوں کتے ابھی ہمارے پاس ہی تھے۔ میں نے حیرت سے سوچا کہ یہ تیسرا کتا کہاں سے آیا۔ پھر یہ سوچ کر میں سن ہو کر رہ گیا کہ محافظوں نے میدان میں نقل و حرکت محسوس کرتے ہی اپنے کتے چھوڑ دیئے ہوں گے اور وہ چشم زدن میں جیک کو ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ کتے کے بھونکنے کی آواز سنتے ہی جیک کے دونوں کتوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ کتے کے بھونکنے کی آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی گرج دار آواز میں کسی نے کتے کو ڈانٹا' پھر خاموشی چھا گئی۔ ہم لوگ تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑے رہے۔ وقت ایک لمحہ گویا جم کر رہ گیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ہفتوں سے وہیں کھڑا ہوں۔ مجھے شدید الجھن ہو رہی تھی۔ یہی حال بوبی کا بھی تھا۔

اسی وقت الو کی مکروہ آواز نے سناٹے کو مجروح کر دیا۔ میں نے بوبی کی طرف دیکھا' وہ

بھی اندھیرے میں مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا مگر میں نے جھپٹ کر اسے روک لیا اور سرگوشی سے کہا۔ "ہمیں بھی جیک کی طرح سینے کے بل رینگ کر وہاں تک جانا ہو گا۔"

پھر میں اور بوبی کہنیوں اور سینے کے بل رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں چاہتا تو تیز رفتاری سے آگے بڑھ سکتا تھا مگر بوبی میرا ساتھ تو نہیں دے سکتا تھا اس لئے مجبوراً میں بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ دونوں کتے البتہ تیزی سے اس سمت روانہ ہو گئے تھے جدھر جیک گیا تھا۔ مجھے ان کتوں پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ واقعی عجیب و غریب کتے تھے۔

○

ہم عمارت کے مین گیٹ سے کچھ ہی فاصلے پر تھے کہ وہ پورا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔ اندھیرے سے اچانک روشنی میں آنے کے سبب میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں اور چند لمحے تک تو مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ جب میں دیکھنے کے قابل ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرے سر پر ایک مسلح محافظ موجود تھا۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا' اس کے کچھ فاصلے پر دو مسلح آدمی مزید کھڑے تھے۔ ان کے درمیان مجھے جیک نظر آیا۔ اس نے آنکھوں کے اشارے سے مجھے پرسکون رہنے کی ہدایت کی۔ پھر میں آہستہ آہستہ زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے پیچھے بوبی تھا۔ وہ بھی ایک رائفل بردار کے نشانے کی زد میں تھا۔ دونوں کتے البتہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

محافظوں کے چہروں سے ان کی قومیت کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ بہرحال مقامی باشندے نہیں تھے۔ ان میں سے ایک ڈپٹ کر بولا۔ "کون ہو تم لوگ؟"

"میں بتا تو چکا ہوں کہ ہم لوگ ماہی گیر ہیں۔" جیک نے جلدی سے کہا۔ شاید وہ ہمیں سنانے کے لئے بولا تھا تاکہ ہم سب کا بیان یکساں رہے۔

ایک محافظ نے پلٹ کر اس کے منہ پر زوردار ہاتھ مارا اور غرایا۔ "تم اپنا منہ بند رکھو بونے کی اولاد!" پھر وہ میری طرف پلٹا۔ "تم بتاؤ' کون ہو تم؟"

"میرے ساتھی نے بتایا تو ہے کہ ہم ماہی گیر ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے کہا۔

"اور سمندر کی بجائے خشکی پر لیٹ کے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔" محافظ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"دراصل ہماری لانچ میں کچھ خرابی واقع ہو گئی ہے۔" بوبی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ ہم کسی مدد کی توقع میں ادھر آ گئے تھے۔"

"تم لوگ شاید زمین پر لیٹ کر چلتے ہو!" محافظ نے پھر طنز کیا۔

اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ظاہر ہے جواب ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے طائرانہ انداز میں ان چاروں کا جائزہ لیا۔ وہ چاروں چہروں ہی سے تربیت یافتہ بدمعاش لگ رہے تھے۔ انہیں دھوکہ دینا بہت مشکل تھا۔ پھر ان کے ہاتھوں میں جدید قسم کی خوفناک رائفلیں تھیں اور وہ کسی بھی لمحے ہم پر فائر کھول سکتے تھے۔ ان لوگوں سے بنیادی غلطی یہ ہوئی تھی کہ انہوں نے ہماری تلاشی نہیں لی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں جو رائفلیں تھیں، وہ ہم نے زمین سے اٹھتے وقت وہیں چھوڑ دی تھیں اور وہ لوگ شاید مطمئن ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی میری اور بوبی کی جیبوں میں مشین پسٹلز اور پوائنٹ تھری ایٹ کے خوف ناک ریوالورز تھے۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا!" محافظ نے غرا کر میری پسلیوں میں رائفل کی نال سے ٹھوکا دیا۔ "تم لوگ زمین پر لیٹ کر کیا کر رہے تھے؟"

میں بھنا کر رہ گیا مگر میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "لیٹ کر کیا ہو سکتا ہے؟"

میری بات سن کر اس نے حیرت سے پہلے مجھے پھر اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ کرخت چہرے والا دوسرا محافظ آگے بڑھا اور ڈپٹ کر بولا۔ "مجھے بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو ورنہ میں فائر کر دوں گا۔"

"یہ علاقہ کیا پرائیویٹ پراپرٹی ہے؟" بوبی نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" محافظ نے منہ بنا کر کہا۔ "ورنہ ہمیں کیا ضرورت تھی پوچھ گچھ کرنے کی!"

"تو پھر پوچھو۔" جیک نے چڑانے والے انداز میں کہا۔

ایک محافظ نے گھوم کر اس کے منہ پر زوردار ہاتھ مارا مگر جیک کے بجائے اس کا ہاتھ دوسرے محافظ کے چہرے پر لگا۔ جیک نے بندر کی طرح الٹی قلا بازی کھائی اور ہاتھ مارنے والے کے کندھوں پر سوار ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ریوالور نکال لیا۔ میرا خیال تھا کہ ان سب کا دھیان اس وقت جیک کی طرف ہے مگر وہ لوگ اتنے نہیں تھے۔ ان میں سے ایک بجلی کی سی پھرتی سے گھوما اور اس نے میرا نشانہ لے کر فائر کرنا چاہا۔ پھر میری نظروں میں برق سی کوند گئی۔ جیک نے اس پہ چھلانگ لگائی اور اس کی رائفل چھینتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ پھر میں نے ایک اور حیرت انگیز واقعہ دیکھا۔ نہ جانے کہاں سے جیک کے دونوں کتے بقیہ دو محافظوں پر جھپٹ پڑے اور پلک جھپکتے میں صورت حال بدل گئی۔ بوبی نے جھپٹ کے اس آدمی کو پکڑ لیا جس کے کندھوں پر جیک نے سواری کی تھی۔ بوبی نے لمحوں میں اسے بے سود کر دیا۔ جیک پھر اچھل کے آیا اور جس سے رائفل چھینی تھی، اسی کے سر پر رائفل کا کندہ رسید کر دیا۔ وہ تیورا کے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ بقیہ دو کو کتوں نے ادھیڑ کے رکھ دیا۔ انہیں تو پہنچنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ یہ ساری کارروائی پانچ منٹ سے

بھی کم وقت میں ہو گئی۔ اب سرچ لائٹس کی تیز روشنی میں وہ چاروں بے یار و مددگار پڑے تھے اور دو تو یقینی طور پہ مر چکے تھے کتوں نے انہیں بری طرح چیڑ پھاڑ کے رکھ دیا تھا۔ بقیہ وہ بھی اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہے تھے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس آدمی نے بھی دم توڑ دیا جسے جیک نے زخمی کیا تھا۔

بوبی نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کوٹھی میں ان لوگوں کے علاوہ کوئی محافظ نہیں ہے۔"

"اپنے خیال کو چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے بھی تو ہمارا خیال یہی تھا کہ یہاں کوئی محافظ نہیں ہو گا۔" پھر میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ "ویسے تمہارا اندازہ درست بھی ہو سکتا ہے۔ کوٹھی میں مزید کوئی محافظ ہوتا تو اپنے ساتھیوں کی مدد کو ضرور آتا' نہ بھی آتا تو وہیں سے فائر کر کے ہم میں سے ایک آدھ کو ٹھنڈا کر دیتا۔"

"اینی ہاؤ۔" بوبی نے کہا۔ "ہمیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔ ممکن ہے بقیہ محافظ کوٹھی کے اندر کہیں موجود ہوں اور ہم بے خبری میں مارے جائیں۔" پھر کچھ سوچ کر جیک سے مخاطب ہوا۔ "اس دفعہ بھی تمہی اندر جاؤ گے اور ہمیں لائن کلیر کا سگنل دو گے۔"

"میں خود بھی یہی کہنے والا تھا۔" جیک نے سر اٹھا کر بوبی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بوبی کے دراز قد کے سامنے وہ مزید چھوٹا لگ رہا تھا۔

"اچھا پہلے ان لوگوں کی لاشیں تو یہاں سے ہٹا کر کسی تاریک گوشے میں ڈال دو۔"

"یہاں بھلا کون آئے گا باس!" جیک نے کہا۔ "میں ایسا کرتا ہوں کہ لاشیں ڈھونے کی بجائے یہ لائٹس آف کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

بات اس کی بھی معقول تھی۔ ہمیں فوری طور پر وہاں سے نکلنا تھا۔ وہاں ان لاشوں کی موجودگی یا عدم موجودگی سے کیا فرق پڑتا۔

"او کے' تم اندر جا کر پہلے یہ لائٹس آف کرو' اس کے بعد ہی کچھ کیا جائے گا۔"

جیک کوٹھی کی باؤنڈری وال کے ساتھ چلتا ہوا کچھ دور گیا' پھر اس نے دیوار پر چڑھنے کے لئے ہاتھ لگایا ہی تھا کہ چیخ مار کے الٹ گیا۔ میں اور بوبی گھبرا کے اس کی طرف بڑھے۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا ہوا جیک' تمہاری طبعیت تو ٹھیک ہے؟"

اس نے میری بات کا جواب دینے کی کوشش کی مگر اس کی آواز نہ نکل سکی۔ بوبی اس کے جسم کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے بھی غور سے اس کا جائزہ لیا۔ بوبی کا خیال تھا کہ اس پر شاید کہیں سے بے آواز فائر کیا گیا ہے مگر اس کے جسم پر تو خراش تک نہیں تھی۔ پھر جیک نے بہ مشکل تمام اکھڑے ہوئے سانسوں کے درمیان بتایا کہ دیوار میں بہت زبردست الیکٹرک کرنٹ دوڑ رہا ہے اور مجھے کرنٹ لگا ہے۔ اس کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑتی جا رہی

تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگی۔ میں نے بوبی سے کہا۔ "تم فوراً اسے بوٹ پر لے جاؤ اور ممکن ہو تو اسے اسپتال پہنچا دو۔"

"آ..... پ..... پریشان..... ن..... نہ ہو..... ں۔" جیک کا سانس اکھڑ گیا۔ "میں ابھی..... ٹھیک..... ہو....." اس کا جملہ ادھورا رہ گیا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کے دونوں کتے بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کتے نے اسے سونگھا اور اتنی بھیانک آواز میں رویا کہ میں دہل کر رہ گیا۔ پھر دونوں کتے مل کر رونے لگے۔ مجھے جیک کی موت سے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ وہ میری خاطر' میرے وطن کی خاطر قربان ہو گیا تھا۔ دنیا والوں کی نظروں میں وہ برا آدمی تھا مگر میرے لئے تو اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کیں اور دونوں کتوں کو بہ مشکل تمام اس کے پاس سے ہٹایا۔

میں نے ایک بار پھر کوٹھی کی باؤنڈری وال کا جائزہ لیا۔ وہ بارہ فٹ بلند تو رہی ہو گی۔ اب ایک ہی طریقہ تھا کہ ہم دونوں میں سے کوئی اس باؤنڈری وال کو اچھل کے پار کرے اور کوٹھی کے اندر کود جائے۔ یوں بلا دیکھے بھالے اندر کودنا بھی گویا موت کے کنویں میں چھلانگ لگانا تھا' مگر اس کے سوا ہمارے پاس کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے اندر کچھ اور محافظ ہماری تاک میں بیٹھے ہوں' اور کودنے سے پہلے ہی وہ ہمیں گولی مار دیں۔ میں نے خود ہی یہ خطرہ لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے ایک اور جان ضائع ہو۔ میں نے اپنے ارادے سے بوبی کو مطلع کیا تو وہ بہ ضد ہو گیا کہ میں اندر جاؤں گا۔ میں نے بہ مشکل تمام اسے راضی کیا اور بتایا کہ اندر اور باہر یکساں خطرہ ہے۔ تم باہر رہ کر مجھے کور دینا۔ وہ مطمئن تو نہیں ہوا مگر میرا حتمی لہجہ دیکھ کے وہ بادل نخواستہ راضی ہو گیا۔ دس بارہ فٹ بلند دیوار پھاندنا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر اصل مسئلہ اندر کودنا تھا۔ جب کودنے والے کو یہی علم نہ ہو کہ دوسری طرف وہ زمین پر اترے گا یا کسی گہری کھائی میں جا گرے گا' وہ کودنے کا رسک کیسے لے سکتا تھا؟

میں نے بوبی کو محتاط رہنے کی تاکید کی اور دیوار سے کچھ دور چلا گیا۔ پھر میں نے بھاگ کے ایک ہی زقند میں دیوار عبور کر لی۔ اندر کی سمت میں لان میں گرا اور گرتے ہی میں سینے اور کہنیوں کے بل رینگ کر کیاری کی طرف چلا گیا۔ کیوں کہ وہ گوشہ قدرے تاریک تھا۔ میں نے دم سادھ کر تھوڑی دیر اردگرد کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی خفیف سی بھی آہٹ نہیں تھی۔ کوٹھی کا مین گیٹ وہاں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اگر کوئی محافظ وہاں تھا بھی تو وہ گیٹ کے نزدیک ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا' پھر کھڑا ہو گیا۔ کیاریوں کے ساتھ ہی ڈم ڈم کی باڑھ تھی۔ میں اسی باڑھ کی اوٹ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا۔ میں نے مشین پسٹل ان لاک کر کے دائیں بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

گیٹ کے اوپر بھی تیز روشنی والا بلب روشن تھا۔ اس کے نزدیک ہی محافظوں کے لئے مختصر سا ایک کمرہ بنا ہوا تھا جیسا عام طور پر بڑی بڑی فیکٹریوں کے مین گیٹ کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہاں بھی مکمل سناٹا تھا۔ میں رک کے چند لمحے وہاں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ خفیف سی ایک آہٹ سن کے ٹھٹک گیا۔ کوئی محافظ ساتھ والے کمرے میں موجود تھا۔ میں ڈم ڈم کی باڑھ کے پیچھے چھپ گیا۔ وہاں سے بھی مجھے گیٹ کے اردگرد کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ پھر ایک محافظ اس کمرے سے برآمد ہوا' اس کے ہاتھوں پر موٹے ربڑ کے دستانے اور پیروں میں ربڑ کے لانگ شوز تھے۔ اس قسم کے دستانے اور جوتے عام طور پر الیکٹرک کے لائن مین استعمال کرتے ہیں۔ اس نے گیٹ پہ لگی ہوئی ایک ناب محتاط انداز میں گھمائی تو گیٹ میں چھوٹا سا چوکور خلاء پیدا ہو گیا۔ محافظ نے اس خلاء سے باہر دیکھنے کی کوشش کی' پھر بلند آواز میں بولا۔ "یہاں سے تو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟"

"آرام سے اندر آ کر بیٹھ جاؤ۔" کمرے سے ایک آواز آئی۔ "ممکن ہے براؤن کو وہم ہوا ہو۔ یہاں بھلا کون آئے گا!"

"آ بھی گیا تو زندہ واپس نہ جا سکے گا۔" کمرے سے باہر والے نے کہا۔ "دیوار میں اتنا زبردست کرنٹ ہے کہ اسے ایک مرتبہ چھونے والا دوسرا سانس مشکل ہی سے لے سکتا ہے۔"

واقعی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جیک نے میرے دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ دیا تھا۔ نہ جانے ان خبیثوں نے دیوار میں کتنے وولٹ کا کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ باہر آنے والا ایک مرتبہ پھر اندر کمرے میں چلا گیا۔ میں محتاط انداز میں کمرے کی طرف بڑھا اور ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کی' مگر اب وہاں سناٹا تھا۔ گیٹ کے ساتھ ساتھ بجری کی ایک روش اقامتی حصے تک گئی تھی۔ اسی روش کے ساتھ ساتھ چھوٹ چھوٹ گملے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک گملا اٹھایا اور گیٹ کی طرف اچھال دیا۔ گملا پرشور آواز کے ساتھ گیٹ سے ٹکرایا' پھر فرش پہ گر گیا۔ کمرے میں سے دونوں محافظ دوڑتے ہوئے باہر نکلے تو میں نے کہا۔ "ہینڈز اپ"۔

وہ دونوں یوں اچھلے جیسے ان کا پاؤں غلطی سے دہکتے ہوئے انگاروں پر پڑ گیا ہو' پھر ان دونوں نے مشینی انداز میں ہاتھ اٹھا دیئے۔ میری طرف ان دونوں کی پشت تھی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور ان میں سے ایک کے سر پہ مشین پسٹل کا دستہ رسید کر دیا۔ وہ تیورا کر گرا تو دوسرا بدک کے میری طرف گھوم گیا۔

"اب ہلنے کی کوشش مت کرنا۔" میں نے غرا کر کہا۔ "ورنہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "کوٹھی میں مزید کتنے محافظ ہیں؟"

"اندر دو آدمی اور ہیں۔" وہ مشینی انداز میں بولا۔

"پہلے یہ سرچ لائٹس آف کرو اور دیوار میں دوڑنے والا الیکٹرک کرنٹ بھی آف کرو، جلدی کرو۔" میرا لہجہ کرخت تھا۔

"یہ دونوں سوئچ اندر برآمدے میں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"میرے ساتھ چلو اور وہ سوئچ آف کر دو۔" میں نے آگے بڑھ کے مشین پسٹل کی نال اس کی گردن پہ لگا دی۔ "چلو آگے بڑھو۔" میں نے اس کا رخ اقامتی حصے کی طرف کر کے دھکا دیا۔ "کوئی چالاکی دکھائی تو کم از کم میں تمہیں تو جہنم رسید کر ہی دوں گا۔"

وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ میں اس سے دو قدم پیچھے تھا مگر کسی بھی خطرے کی صورت میں ایک دم اسے دبوچ سکتا تھا۔ وہ کنکھیوں سے دائیں طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید اس طرف کوئی محافظ اور ہو کیوں کہ اس کے دیکھنے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا۔ میں نے سرگوشی میں اس سے کہا۔ "ایک بار پھر ذہن نشین کر لو کہ اگر کوئی چالاکی دکھائی تو....." میں نے جان بوجھ کے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

برآمدے میں پہنچنے کے بعد وہ دائیں جانب گھوم گیا۔ پھر چند قدم چلنے کے بعد وہ ایک دروازے کے سامنے رک گیا اور بولا۔ "وہ دونوں سوئچ اسی کمرے میں ہیں۔"

"اندر جاؤ اور دونوں سوئچ آف کر دو۔" میں نے سخت لہجے میں سرگوشی کی۔

وہ تھوڑا سا ہچکچایا، پھر دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں مدھم روشنی کا ایک بلب جل رہا تھا مگر اس کی روشنی اتنی تھی کہ مجھے وہاں کی ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی، فرش پہ البتہ دبیز قالین بچھا ہوا تھا، دیوار کے ساتھ لکڑی کی ایک بڑی سی الماری رکھی تھی۔ وہ ہچکچاتا ہوا سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا۔ اس بورڈ کے ساتھ ہی ایک بریکٹ تھا جس پر بجلی کے تار اور کٹ آؤٹ وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھا، پھر اچانک کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

اندھیرا ہوتے ہی میں پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا۔ اسی لمحے شعلہ سا لپکا اور گولی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ اس مردود نے آخر چالاکی دکھا ہی دی تھی۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ وہ کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا کیوں کہ میں دروازے کے بالکل نزدیک لیٹا ہوا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اس کمرے میں کوئی اور دروازہ بھی نہیں ہے۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "حرامزادے! تو نے آخر میری بات نہیں مانی۔ اب میں تجھے مارے بغیر آگے نہیں بڑھوں گا۔"

جواب میں اس نے ایک اور فائر کیا اور گولی پھر دیوار میں پیوست ہو گئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کے ریوالور پر سائلنسر فٹ تھا ورنہ اب تک بقیہ محافظ بھی پہنچ گئے ہوتے۔ میں

رینگ کر دروازے کے بالکل نزدیک چلا گیا' اتنا نزدیک کہ اگر وہ دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو میں ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگ پکڑ لیتا۔ پھر میں خاموشی سے لیٹا رہا تاکہ اسے محسوس نہ ہو سکے کہ میں کمرے کے کس حصے میں ہوں۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں زیادہ دیر انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ میں سوئچ بورڈ تک پہنچوں اور کمرے کا سوئچ آن کر دوں۔ مجھے اندازہ تھا کہ سوئچ بورڈ کس طرف ہے۔ میں فیصلہ کرنے کے بعد غیر محسوس طریقے سے سوئچ بورڈ کی طرف کھسکنے لگا۔ میرے کان کسی آہٹ پر لگے ہوئے تھے اور میں فائر کرنے کو بالکل تیار تھا۔ میں کسی بھی خطرے کی صورت میں بے دریغ فائر کھول دیتا۔ لیٹے ہی لیٹے میں اس دیوار تک پہنچ گیا جس پر سوئچ بورڈ تھا۔ میں نے ہاتھ سے دیوار ٹٹولی اور بہت آہستگی سے کھڑا ہو گیا۔ بورڈ پہ جدید قسم کے سوئچ تھے۔ ان کے کھولنے یا بند کرنے میں خفیف سی آواز بھی پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے یکے بعد دیگرے دو سوئچ آن کئے مگر اندھیرا بہ دستور رہا' تیسرا سوئچ آتے ہی کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ سوئچ آن کرتے ہی میں گھوم کے بیٹھ گیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تھا آج زندہ بھی نہ ہوتا۔ روشنی ہوتے ہی اس منحوس نے پھر فائر کیا تھا اور گولی میری بجائے پھر دیوار میں دھنس گئی تھی۔ اب میں اس سے رعایت کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ اب تک تین دفعہ مجھ پہ حملہ کر چکا تھا۔ میں نہتے دشمن کو معاف کر دیتا تھا مگر ایسا دشمن جو نہ صرف مسلح ہو' تین دفعہ حملہ بھی کر چکا ہو' کسی طور رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ میں نے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر مزید فائر کرتا' میں نے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔ مشین پسٹل کے مخصوص دھماکے کے ساتھ مرنے والے کی دلدوز چیخ بھی گونج کر رہ گئی۔ مرنے والے کے خون سے قالین رنگین ہو رہا تھا اور اس کے دماغ اور کھوپڑی کے کچھ حصے اس دیوار پہ چپک گئے جس کے ساتھ وہ کھڑا تھا۔

باہر اچانک بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں۔ میں نے پھرتی سے سوئچ بورڈ پر لگے ہوئے سوئچ آف کر دیئے اور سرعت سے باہر نکل آیا۔ پھر میں باڑھ کی اوٹ میں تیزی سے مین گیٹ کی طرف لپکا۔ میں گیٹ اور اس کے ارگرد کا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ محافظ ابھی تک گیٹ کے پاس پڑا تھا جسے میں نے بے ہوش کیا تھا۔ میں اسے گھسیٹ کے محافظوں کے چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ پھر میں نے احتیاط کے طور پر اس کے گلوز اور جوتے اتار کے خود پہن لئے۔ اس وقت تک اندر اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں اب گیٹ کی طرف آ رہی تھیں۔ میں نے جونہی دروازے سے باہر جھانکا' میرا دماغ گھوم گیا۔ ان لوگوں نے سرچ لائٹس اور دیوار گیر الیکٹرک کرنٹ کا سوئچ پھر آن کر دیا تھا۔ پہلے کی طرح گیٹ پہ پھر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے آنے والوں کو

دیکھا' وہ تعداد میں دو تھے اور تیزی سے گیٹ کی طرف آ رہے تھے۔ میں نے بھنا کر مشین پسٹل ان لاک کی اور باری باری دونوں کی کھوپڑیاں اڑا دیں۔ پھر میں نے اکیلے ہی گوشی کو وہاں سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ایک مرتبہ پھر اس کمرے میں جا کر سوئچ آف کرتا' پھر گیٹ کھول کر بوبی کو بلاتا اور ہم دونوں اندر داخل ہوتے۔ مجھے صرف یہ فکر تھی کہ بوبی کہیں جوش میں آکر اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کرے مگر میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ بوبی' جیک کا حشر دیکھ چکا ہے' جان بوجھ کر خود کو مت کے منہ میں نہیں جھونکے گا۔ ہاں وہ میری طرح اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا تھا اور بات تھی۔

میں ابھی حالات پر غور کر رہا تھا کہ کسی کے کراہنے کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ وہی آدمی کراہ رہا تھا جسے میں نے بے ہوش کیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے اسے ہلایا جلایا' پانی کا جگ بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے اس میں پانی لے کر اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا' پھر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے مجھے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اندازے سے دیوار کو ٹٹولا تو میرا ہاتھ سوئچ بورڈ سے ٹکرایا۔ میں نے سوئچ آن کیا تو کمرہ روشنی سے نہا گیا۔ وہ آنکھیں چندھیا کر مجھے دیکھنے لگا' پھر یوں اچھل کر اٹھ بیٹھا جیسے میری بجائے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"لیٹے رہو۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"کون ہو تم؟" وہ گھبرا کر بولا۔

"میں کوئی بھی ہوں۔" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" میں مسکرایا۔ "مگر اس وقت تک جب تک تم میرے ساتھ تعاون کرو گے۔"

"تمہارے ساتھ تعاون!" وہ الجھ کر بولا۔

"ہاں میرے ساتھ تعاون کرو گے تو کچھ دن مزید جی لو گے ورنہ اپنے ساتھیوں کی طرح تم بھی جہنم رسید ہو جاؤ گے۔" اچانک میرا لہجہ سرد اور سفاک ہو گیا۔ میں اس قسم کی گفتگو کرنے کا عادی نہیں تھا مگر مجبوری میں ایسا کرنا پڑتا تھا۔

"تم..... تم نے..... تم نے سب کو مار دیا؟" وہ سہم کر بولا۔

"نہیں تمہیں بھی ماروں گا۔" میں نے لہجے کو مزید سفاک بنا کر کہا۔ "اگر تم نے مجھ سے تعاون نہ کیا تو تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"کیا..... چاہتے ہو مجھ سے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"صرف یہ کہ مجھے تم گوشی کے کمرے تک پہنچا دو۔"

"تم..... اسے اغواء کرنے آئے ہو....." وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "مگر وہ

تمہارے ساتھ..... مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"تم زینکو کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"زینکو تک تو بات پہنچے گی بھی نہیں' فریڈرک اس سے پہلے ہی تم سب کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔"

"کون فریڈرک؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"فریڈرک' گوشی کا باڈی گارڈ ہے۔ وہ اٹالین ہے اور خود کو گولی کا خانساماں ظاہر کرتا ہے۔ وہ انتہائی ظالم شخص ہے' کئی افراد کو میری آنکھوں کے سامنے ذبح کر چکا ہے۔"

"میں اس سے زیادہ سفاک ہوں۔" میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ "مجھے بھی انسانوں کو ذبح کر کے سکون ملتا ہے۔ تم مجھے گوشی کے کمرے تک لے چلو۔"

"لیکن میں....."

"اٹھو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی اور ریوالور کی نال کنپٹی سے لگا دی۔ "یہاں جتنے بھی گارڈ تھے' وہ سب میرے ہاتھوں مارے گئے ہیں' میں نہیں چاہتا کہ تم بھی....."

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔

مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ اگر فریڈرک اتنا ہی بے خبر ہے تو اسے اس ہنگامے کی اطلاع بھی ضرور مل گئی ہو گی' پھر وہ اب تک سامنے کیوں نہیں آیا۔ یہی سوال میں نے اس محافظ بھی کر دیا۔

"وہ..... آج یہاں موجود نہیں ہے۔" محافظ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ورنہ تم اب تک زندہ نہ ہوتے۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہا۔ "مہینے میں ایک آدھ دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ فریڈرک ایک رات کے لئے باہر چلا جاتا ہے۔ تمہیں شاید علم تھا کہ وہ آج موجود نہیں ہو گا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع نہیں ملا۔" میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔ "بہرحال' تم مجھے گوشی کے کمرے تک لے چلو۔"

برآمدے میں بائیں طرف جانے کے بعد وہ ایک کاریڈور میں مڑ گیا۔ دونوں جانب کمرے تھے۔ محافظ درمیان کے ایک کمرے کے سامنے رک گیا اور سرگوشی میں بولا۔ "یہی بے بی کا کمرہ ہے۔"

○

میں نے آگے بڑھ کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ میری پوری توجہ اس بند دروازے کی طرف تھی۔

"ہینڈز اپ!" میرے پیچھے سے کسی نے ڈپٹ کر کہا۔

میں بری طرح اچھل پڑا۔ نہ صرف اچھلا بلکہ فرش پر گر گیا اور جہاں سے ہینڈز اپ کی آواز آئی تھی، اسی طرف الٹی قلا بازی کھائی۔ مجھے للکارنے والی کوئی لڑکی تھی۔ الٹی قلابازی کھاتے ہوئے مجھے اس کی ایک جھلک نظر آئی تھی۔ قلا بازی کھاتے وقت میں نے اس کے ہاتھ پہ کک مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ہاتھ پر کچھ زیادہ زور سے کک لگ گئی۔ اس کے حلق سے سریلی سی ایک چیخ برآمد ہوئی۔ اور چھوٹا سا ایک پسٹل اڑتا ہوا سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں نے اچھل کر اسے دبوچ لیا۔

اس نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "کون ہو تم اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھ پر پستول کیوں تانا تھا؟" میں نے اپنے شبے کی تصدیق کرنا چاہی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہی گوشی ہے۔

"میرا نام سنو گے تو دہشت سے بے ہوش جاؤ گے۔" اس نے رعونت سے کہا۔

میں نے اس محافظ کو زوردار کک ماری جو مجھے یہاں تک لے کر آیا تھا کیوں کہ وہ مجھے باتوں میں مصروف دیکھ کر جھک کے لڑکی کا ریوالور اٹھا رہا تھا۔ کک اس کی گردن پہ لگی، سوکھی لکڑی چٹخنے کی سی آواز آئی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں پرسکون لہجے میں لڑکی سے بولا۔ "ہاں، تو تم مجھے دہشت زدہ کر رہی تھیں اپنا نام بتا کر، مجھے بتاؤ اپنا نام۔ میں بہت دنوں سے دہشت زدہ نہیں ہوا ہوں۔"

"ساری شوخی ہوا ہو جائے گی۔" وہ بپھر کر بولی۔ "میرا نام گوشی ہے۔"

"تمہارا نام تو سرگوشی ہونا چاہئے تھا ہنی۔" میں نے لہجہ رومانٹک بنا کر کہا۔ "میں تمہاری ہی تلاش میں تو یہاں آیا تھا۔ مجھے صرف تمہارا نام سن کر تم سے عشق ہو گیا تھا۔ چلو میرے ساتھ۔"

"تمہیں شاید علم نہیں کہ میں۔ میں زینکو کی بیٹی ہوں۔"

"اس بندر کا نام مت لو میرے سامنے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "اگر وہ میرے سامنے آ گیا تو اسے بھی چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔ تمہیں پانے کے لئے میں نے آگ اور خون کا ایک سمندر عبور کیا ہے ہنی!" میں نے پیشہ ور عاشقوں والے انداز میں کہا۔ "تمہارا باپ ہمارے بیچ میں دیوار نہیں بن سکے گا چلو میرے ساتھ۔" میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"چھوڑ دو مجھے۔" وہ مچل کر بولی۔

مجھے اس نرم و نازک گڑیا سی لڑکی پر ترس بھی آیا جس نے ایک بدمعاش کے گھر جنم لیا تھا مگر خود وہ بہت معصوم تھی۔ میں نے اس کی کلائی چھوڑ کر اس کا سر پکڑ لیا اور داہنے ہاتھ سے اس کی کن پٹیاں مخصوص انداز میں دبائیں۔ چند لمحوں بعد وہ بے سدھ ہو کر میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ میں نے اسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔ وہ پھولوں کی طرح نازک اور ہلکی پھلکی تھی۔ اسے کندھے پر اٹھاتے ہوئے میں دوبارہ اس کمرے میں گیا جہاں سرچ

لائٹس اور الیکٹرک آف کرنے کے سوئچ موجود تھے۔ میں نے دونوں سوئچ آف کئے اور
پھرتی سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ پھر میں نے آہستگی سے گیٹ کھولا اور باہر نکل گیا۔

باہر نکلتے ہی مجھے بوبی کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ جھپٹ کر میرے نزدیک آیا اور بولا۔ "سب
خیریت تو ہے خرم!"

"یار، سب خیریت ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں گوشی کو لے آیا ہوں۔ بس اب
یہاں سے نکل چلو۔"

"ٹھہر جاؤ، میں اپنے اس ننھے دوست کو بھی ساتھ لے لوں جس نے ہمارے لئے اپ
جان قربان کر دی۔" اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا اور اس طرف بڑھ گیا جہاں جیک کی لاش
پڑی تھی۔

دونوں کتے اب بھی جیک کی لاش کے پاس بیٹھے تھے۔ بوبی نے جھک کر جیک کو اٹھا
اور آگے بڑھ گیا۔ دونوں کتے بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔ ہمارا رخ اب ساحل کی
طرف تھا۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں اینڈریو گھبرا کر واپس نہ چلا جائے۔ اس سے یہی ل
طے ہوا تھا کہ اگر ہمیں دیر ہو جائے تو تم مزید مدد لے کر جزیرے پر آنا۔

اگر ہمیں پانچ منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اینڈریو روانہ ہو جاتا کیوں کہ وہ ہماری طرف
سے مایوس ہو کر واپسی کی تیاری کر رہا تھا اور بوٹ کا انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ انجن کی
گڑگڑاہٹ بہت خفیف تھی مگر میں نے اور بوبی نے سن لی۔ بوبی نے وہیں سے چیخ کر کہا
"اینڈریو! جانا مت ہم لوگ آ رہے ہیں۔" پھر اس نے بلند آواز سے یہی جملہ کئی مرتبہ دہرا
اور تیزی سے ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔

"وہ کھانا کھانے سے انکار کر رہی ہے۔" پنکی نے کمرے میں آ کر کہا۔

"پھر کوشش کرو۔" بوبی نے وہسکی کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا تو پنکی شانے اچکا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

ہم بغیر کسی رکاوٹ اور پریشانی کے گوشی کو یہاں لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہم نے جیک کی لاش کو سمندر کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کے دونوں کتے اب اینڈریو کے پاس تھے۔ میں نے ان کتوں کو لینا چاہا تھا مگر اینڈریو نے درخواست کی تھی کہ یہ کتے میرے پاس ہی رہنے دیں کیوں کہ یہ میرے دوست جیک کی نشانی ہیں۔ ہمیں پنکی کے فلیٹ پر پہنچے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے گوشی کو ہوش آ گیا تھا۔ پوری رات ہم لوگوں نے بے آرامی میں گزاری تھی۔ اب مجھے شدید نیند آ رہی تھی مگر اس مرحلے پر میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں پنکی کو اتنی بڑی ذمے داری سونپنے کے حق میں نہیں تھا حالانکہ بوبی کا خیال تھا کہ پنکی کسی بھی قیمت پر گوشی کو یہاں سے نہیں نکلنے دے گی۔ ممکن ہے اس کا خیال درست ہو مگر میں کسی بھی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے میر صاحب کا انتظار تھا۔ ان کے آنے کے بعد ہی میں آرام کر سکتا تھا۔ میں نے پنکی سے کہا تھا کہ گوشی کو کچھ کھلانے کی کوشش کرو۔ اب صبح ہو رہی تھی اور میں ایک دفعہ سو جاتا تو پھر شام ہی کی خیر لاتا کیوں کہ کئی راتوں سے میں مسلسل بے آرام تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گوشی کو کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو۔ نہ جانے میرے سونے کے بعد کوئی اس کا خیال بھی رکھتا یا نہیں۔ بوبی اور پنکی تو اسے دشمن سمجھ رہے تھے۔ میری نظروں میں وہ دشمن نہیں تھی، ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ اس کا میرا تعلق ہی کیا تھا۔ وہ بے چاری بھی حالات کے جبر کا شکار ہوئی تھی۔ اس کا قصور صرف اتنا ہی تو تھا کہ وہ زینکو کی بیٹی تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ پنکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "وہ مجھے بہت خوف ناک قسم کی دھمکیاں دے رہی ہے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "اور کھانے کی ٹرے اٹھا کر دیوار سے مار دی ہے۔"

"چلو، میں دیکھتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور پنکی کے پیچھے پیچھے پہنچا جہاں ہم نے گوشی کو رکھا تھا۔ اس کمرے میں آرام دہ بیڈ روم فریج تھا، اٹیچ باتھ روم تھا، غرض اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بھر کر کھڑی ہو گئی اور چیخ کر بولی۔

"کیوں لائے ہو تم مجھے یہاں؟"

"آرام سے بیٹھو بے بی اور میری بات غور سے سنو۔" میں نے بزرگانہ انداز میں کہا۔

"شٹ اپ!" وہ حلق پھاڑ کر چیخی۔ "میرا باپ تم سب کی کھال کھینچ لے گا۔"

میں نے پنکی کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور گوشی سے نرم لہجے میں کہا۔ "دیکھو گوشی! تم ایک سمجھ دار لڑکی ہو۔ تمہارے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں ہے' دشمنی تمہارے باپ کے ساتھ بھی نہیں ہے مگر وہ انجانے میں میرا دشمن بن گیا ہے۔ میں تمہارے ذریعے اس سے کچھ سودے بازی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں خطرے میں دیکھے گا تو میری بات مان لے گا۔ میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

"تو یہ کہو کہ تم نے مجھے یرغمال بنایا ہے' تاوان کے لئے اغواء کیا ہے۔ تم میرے باپ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو مگر کان کھول کر سن لو' میں تمہیں کوئی فائدہ اٹھانے نہیں دوں گی۔"

"مجھے غلط مت سمجھو گوشی۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "زینکو کے پاس میرے ملک کی بہت اہم اور خفیہ نوعیت کی دستاویزات اور مائیکرو فلمز ہیں۔ میں صرف وہ چیزیں اس سے لینا چاہتا ہوں۔ مجھے اور اسے کچھ نہیں چاہئے۔ یہ چیزیں حاصل کرنے کے بعد میں خود تمہیں باعزت طریقے سے باپ کے حوالے کروں گا۔"

"مجھے باتوں سے بہلانے کی کوشش مت کرو۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم میرے ذریعے میرے باپ کو بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ میں ایک بلیک میلر سے یہ امید کیسے رکھوں کہ وہ میری عزت پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔"

"میں بلیک میلر نہیں ہوں گوشی۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "نہ میں پیشہ ور بدمعاش ہوں۔ مجھے صرف ان کاغذات اور مائیکرو فلمز کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد میں تمہیں ایک لمحہ بھی نہیں روکوں گا۔"

"اگر واقعی ایسا ہے تو پھر میں خود ڈیڈی سے کہوں گی کہ وہ تمہاری امانت لوٹا دیں۔ یہاں کہیں فون ہو تو ڈیڈی سے میری بات کراؤ۔"

"تمہارے ڈیڈی سے ابھی تک رابطہ بھی نہیں ہو سکا ہے۔" میں نے اسے ٹالنے کو جھوٹ بولا۔ میر صاحب کے آنے تک میں زینکو سے بات کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ "جونہی ان سے رابطہ ہوا' میں تمہاری بات کرا دوں گا۔ اب تم پلیز پرسکون ہو جاؤ اور بے پرواہ ہو کر رہو۔ تمہاری عزت پر آنچ نہیں آئے گی۔"

"تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟" اس نے اچانک پوچھا' پھر خود ہی بولی۔ "میرے خیال میں تم ترک ہو!"

"نہیں' میرا تعلق ترکی سے نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں پاکستانی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تم مسلمان ہو!" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "تمہاری کتنی بیویاں ہیں؟"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "فی الحال تو کوئی نہیں ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مگر میں نے تو سنا ہے کہ تم لوگ چار چار شادیاں کرتے ہو اور....."

"ہر مسلمان چار شادیاں نہیں کرتا' وہ افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ "البتہ وہ لوگ ضرور ایک سے زائد شادیاں کر لیتے ہیں جو افورڈ کر سکتے ہیں۔"

"مجھے حیرت ہے کہ تمہاری کوئی بیوی نہیں ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "کیلے فورنیا میں میرے کئی کلاس فیلوز عرب مسلمان ہیں۔ ان کی تو....."

"عربوں کی بات چھوڑو۔" میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تیل کی دولت نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے اور انہوں نے برسوں سے عقل کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ میری قوم بہت جفاکش ہے۔ اس کا عربوں سے کیا مقابلہ!" پھر میں نے موضوع بدلنے کو کہا۔ "چھوڑو اس بحث کو' تم بس مجھ سے تعاون کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔" میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے بولا۔ "تم اطمینان سے کھاؤ پیو' آرام کرو۔ جونہی تمہارے ڈیڈی سے رابطہ قائم ہوا' میں ان سے تمہاری بات کرا دوں گا۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ کمرے کے باہر پنکی موجود تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے دروازہ بند کیا اور اسے لاک کر دیا۔

○

پھر مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں گوشی کے کمرے سے واپس آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہی تھا کہ میر صاحب آ گئے۔ میں نے انہیں مختصراً گوشی کو وہاں تک لانے کی روداد سنا دی۔ وہ دیر تک کچھ سوچتے رہے' پھر کھنکار کر بولے۔ "خرم! اصل مرحلہ تو اب شروع ہو گا جب ہم زینکو سے سودے بازی کریں گے۔ اسے جلدی ہی علم ہو جائے گا کہ گوشی تمہارے قبضے میں ہے۔"

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔ "کیسے معلوم ہو جائے گا انہیں؟"

"بھئی بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ تم بھی ان کاغذات کے چکر میں ہو۔ ہم اس سے جونہی کاغذات اور دیگر چیزوں کا مطالبہ کریں گے' وہ اس معاملے سے تعلق رکھنے والے ایک ایک آدمی کو کریدے گا اور یوں اسے تمہارے بارے میں علم ہو جائے گا۔"

"اسے علم ہوتا ہے تو ہوا کرے۔" میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "ہمیں صرف ان چیزوں کے حصول سے مطلب ہے۔"

"مگر تم یہ بھول رہے ہو کہ تم یہ چیزیں لے کر ہانگ کانگ سے باہر نہ لے جا سکو گے۔"

"ضروری نہیں کہ وہ کاغذات اور مائیکرو فلمز میں ہی یہاں سے لے جاؤں۔ وہ چیزیں آپ بھی لے جا سکتے ہیں' میں کلارا کو کراچی سے بلا سکتا ہوں۔ وہ امریکن نیشنل ہے' اس پر کوئی شبہ بھی نہیں کرے گا۔ ان چیزوں کو یہاں سے نکالنا کوئی مسئلہ نہیں ہے' اصل مسئلہ ان کا حصول ہے۔ میں ابھی زینکو سے بات کرتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔" میر صاحب' نے جلدی سے کہا۔ "زینکو کو دو منٹ کے اندر اندر علم ہو جائے گا کہ یہ کال کہاں سے کی گئی ہے' پھر اطمینان سے یہاں دھاوا بول دے گا اور نہ صرف اپنی بیٹی کو لے جائے گا بلکہ ہم سب کو ٹھکانے لگا جائے گا۔"

میں کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا' پھر میرے ذہن میں اس مسئلے کا حل بھی آ گیا۔ میں نے ان سے کہا۔ میں یہاں سے فون کرنے کی بجائے زینکو کو کسی پبلک ٹیلی فون بوتھ سے کال کروں گا اور ایک منٹ سے زیادہ بات نہیں کروں گا۔"

"اور یہ کوشش کرنا کہ ایک دفعہ بات کرنے کے بعد وہ ٹیلی فون بوتھ دوبارہ استعمال نہ ہو۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "مگر زینکو اپنی بیٹی سے بات کیسے کرے گا؟"

"نو پرابلم!" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں نے گوشی کو کوآپریٹ کرنے کے لئے رضامند کر لیا ہے۔ وہ میرے ساتھ کہیں بھی جا کر اپنے ڈیڈی سے بات کرے۔"

"گڈ!" میر صاحب نے توصیفی انداز میں کہا۔ "پھر تم زینکو سے ابھی بات کر لو۔ میں وہ تمام فون نمبرز لے آیا ہوں جہاں زینکو سے بات ہو سکتی ہے۔"

"آپ نے خواہ مخواہ اتنی زحمت کی۔ اس کا صرف ایک فون ہی کافی تھا۔ میں اس نمبر پر رنگ کرتا اور زینکو نہ ملتا تو صرف اتنا کہتا کہ مسٹر زینکو کو اطلاع دے دو کہ ان کی بیٹی میرے قبضے میں ہے۔ اگر اس کی زندگی چاہتے ہو تو آدھے گھنٹے بعد مجھ سے بات کر لیں۔ میں اسی نمبر پر دوبارہ فون کروں گا۔ اگر زینکو پاتال میں بھی ہوتا تو یہ اطلاع پا کر فون سے چپک کر بیٹھ جاتا۔" میں نے ہاتھ ہلا کر کمرے سے باہر نکلنا چاہا' اسی وقت بوبی کمرے میں داخل ہوا۔

جب سے معلوم ہوا کہ میں تنہا ہی زینکو سے بات کرنے جا رہا ہوں تو وہ برا مان گیا اور بولا۔ "او کے' خرم! تم وہاں اکیلے ہی جانے پر بہ ضد ہو تو میں تمہیں روکوں گا نہیں مگر یہ بات ذہن میں رکھنا کہ زینکو کوئی معمولی چور اچکا نہیں بلکہ ہانگ کانگ کا بے تاج بادشاہ ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے لئے زمین آسمان ایک کر دے گا اور....."

"ارے یار' تم تو واقعی سنجیدہ ہو گئے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم تو ضرور میرے ساتھ جاؤ گے مگر فی الوقت میں کسی جنگ پر نہیں بلکہ زینکو سے ٹیلی فون پر گفتگو کرنے جا رہا ہوں۔ میں اور بوبی دونوں بلڈنگ سے باہر نکلے تو اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ ہمارے پاس ابھی

تک وہی کر سلر تھی' اسٹیرنگ بوبی کے ہاتھ میں تھا۔ ہم لوگ کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ بوبی نے ایک ٹیلی فون بوتھ دیکھ کر گاڑی روک دی۔ پھر ہم دونوں بوتھ کے باہر انتظار کرنے لگے کیوں کہ اندر پہلے ہی سے کوئی موجود تھا۔

اس کے باہر نکلتے ہی میں اور بوبی بوتھ میں داخل ہو گئے۔ پھر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ زینکو کا نمبر ڈائل کیا۔ فون زینکو کی پی اے نے اٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے زینکو لائن پر تھا۔ وہ غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "کون ہے؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کون ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اہم بات یہ ہے کہ اس وقت تمہاری بیٹی گوشی میرے قبضے میں ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم!" زینکو اتنی زور سے چیخا کہ میرے کان میں جھنجناہٹ ہونے لگی۔

"میں تمہیں آدھے گھنٹے بعد فون کروں گا۔"

"سنو مسٹر!" زینکو نے باوقار انداز میں کہا۔ "آدھے گھنٹے کو چھوڑو' مجھے ابھی بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو! میرا مطلب ہے' بیٹی کے بدلے میں تمہیں کتنی رقم چاہئے۔"

"مجھے نہ کیش چاہئے نہ چیک۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"جلدی کرو خرم!" بوبی نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ "یہاں سے ابھی نکل چلو ورنہ......"

"ایسی بھی کیا قیامت ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"تم شاید بھول گئے کہ ابھی تھوڑی دیر میں زینکو کے آدمی اور پولیس دونوں علاقے کی ناکہ بندی کر لیں گے۔ تمہیں یہ بھی دھیان نہیں رہا کہ زینکو جان بوجھ کر گفتگو کو طول دے رہا ہو گا تاکہ وہ تمہارا ٹھکانہ معلوم کر سکے اور یہ موقع آپ نے اسے خود فراہم کر دیا ہے۔"

ابھی ہم فون بوتھ کے باہر نکلے ہی تھے کہ چار گاڑیاں ایک ساتھ پہنچیں اور ان میں سے مسلح افراد کود کے نیچے اترنے لگے۔ وہ تعداد میں دس تھے۔ وہ سب ہمارے ارد گرد دائرہ تنگ کرنے لگے۔ میں نے ریوالور نکالنے کی کوشش کی مگر بوبی نے اشارے سے مجھے روک دیا۔

پھر آنے والوں میں سے ایک بولا۔ "تم دونوں کو ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"تو پھر ہم لوگ مجبوراً تمہیں مردہ حالت میں لے جائیں گے۔"

بوبی نے غیر محسوس طریقے سے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو دوسرے ہی لمحے ایک بے آواز فائر ہوا اور بوبی کی اذیت بھری کراہ نے گویا مجھے پاگل کر دیا۔

میں نے اچھل کر فائر کرنے والے کو لات ماری اور اس سے پہلے کہ وہ لوگ کچھ سمجھ سکتے' میں الٹی قلا بازی کھا کے ان کے گھیرے سے نکل گیا۔ پھر جیسے ہی وہ سنبھلتے میں فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی ہوئی کرسلر کی آڑ لے چکا تھا۔ اس دوران میں ریوالور بھی میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ میں چاہتا تو ان میں سے دو چار کو ٹھکانے لگا سکتا تھا مگر اس میں ایک قباحت تو یہ تھی کہ دھماکے سے پولیس ہماری طرف متوجہ ہو سکتی تھی۔

کیوں کہ میرے ریوالور پر سائلنسر نہیں تھا۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ بوبی خطرے میں تھا۔ ممکن ہے اس فائر سے وہ صرف زخمی ہوا ہو۔ اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کے بعد تو حملہ آور مشتعل ہو کر اسے ٹھکانے لگا سکتے تھے۔ یہ سارے خیالات میرے ذہن میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں آ گئے۔ میں کچھ کرنے یا نہ کرنے کی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ ہلکی سی ٹھک کی آواز سنائی دی' پھر تڑاخ سے ایک گولی گاڑی کی چھت سے اچٹتی ہوئی گزر گئی۔

میں نے دیکھا کہ ایک آدمی دبے پاؤں میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں گاڑی کی ڈکی سے بالکل چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران میں حملہ آور کئی فائر کر چکے تھے اور کرسلر کا ونڈ اسکرین چکنا چور ہو گیا تھا۔ میری طرف بڑھنے والا جونہی میرے نزدیک آیا میں نے پھرتی سے اس کی گردن دبوچ کے اسے گھسیٹ لیا۔ اس نے حلق سے آواز نکالنا چاہی مگر غیر شعوری طور پر میری گرفت کچھ زیادہ ہی سخت ہو گئی تھی۔ وہ آواز نکالے بغیر ہی ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں بھی پوائنٹ فور فائیو کا خوفناک ریوالور تھا۔ سائلنسر ہونے کی وجہ سے وہ ریوالور کچھ زیادہ ہی خوفناک لگ رہا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں اس ریوالور پر قبضہ کر لیا۔ اب میں بھی حملہ آوروں کو گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ میرے دشمن ابھی تک مجھے غیر مسلح سمجھ رہے تھے۔ مجھے بوبی کی بھی فکر تھی وہ نہ جانے کس حال میں تھا۔ بہرحال اب اس کے لئے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں اپنے شکار کا ریوالور لے کر چھپکلی کی طرح کرسلر کے نیچے رینگ گیا۔ گاڑی کے نیچے سے مجھے بوبی نظر آیا۔ وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ یا تو وہ شدید زخمی تھا یا پھر دشمنوں نے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر خون میری کھوپڑی میں ٹھوکریں مارنے لگا مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دشمن مجھے بھی چوہے کی طرح شکار کر لیں۔

وہ لوگ تعداد میں دس تھے' ایک کو میں نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ ممکن ہے ان کے مزید ساتھی بھی گاڑی میں ہوں مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کچھ گاڑی کی پشت پر پہنچ چکے ہوں۔

ابھی میں اسی شش و پنج میں تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہئے کہ فضا کسی گاڑی کے انجن کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ روشنی کی ایک لکیر بھی دور تک چلی گئی۔ پھر کرسلر کے عین پیچھے کوئی گاڑی آ کر رکی تو حملہ آوروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس کے ساتھ

ہی زوردار فائرنگ شروع ہو گئی۔ رات کے سناٹے میں فائرنگ کی وہ آواز بہت بھیانک لگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی زخمی ہونے والوں کی کراہوں سے ایک قیامت کا سا سماں تھا۔ پھر فائرنگ جس تیزی سے شروع ہوئی تھی' اسی تیزی سے ختم ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنے والے کون ہیں اور باہر کیا ہو رہا ہے۔ میں یونہی دم سادھے لیٹا رہا۔ میری نظریں بوبی پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر کسی نے لپک کر بوبی کو ہلایا جلایا اسے آوازیں دیں تو میں چونک اٹھا۔ وہ اینڈریو تھا۔ مجھے یہ جان کر بھی خوشی ہوئی کہ بوبی زندہ تھا کیوں کہ وہ بہت دھیمی آواز میں کراہ کر رہ گیا تھا۔

میں نے کچھ دور آگے کھسک کر محتاط انداز میں باہر کا جائزہ لیا اور پھر پھرتی سے باہر نکل آیا۔ اینڈریو بجلی کی سی تیزی سے پلٹا۔ میں نے چیخ کر کہا "فائر مت کرنا میں خرم ہوں۔"

اینڈریو نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ بوبی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالو۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "خرم! تم خیریت سے تو ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں مگر بوبی....."

"بوبی زخمی ہو گیا ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "زخموں کی نوعیت کا اندازہ تو بعد میں ہی ہو گا۔ فی الحال یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔" یہ کہہ کر وہ کرسلر میں سوار ہو گیا اور مجھے بھی گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ چابی گاڑی کے اگنیشن میں موجود تھی۔ دوسری گاڑی بھی اسی تیزی سے ہمارے پیچھے روانہ ہو گئی۔

"اگر ہم بہ عافیت یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایک معجزہ ہو گا۔" اینڈریو منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "ممکن ہے زینکو نے پولیس کے ذریعے علاقے کی ناکہ بندی کرا دی ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے اتنی جلدی اس جگہ کا علم کیسے ہو گیا؟" میں نے اٹھ رکھا۔

"تم شاید بھول گئے کہ زینکو اس علاقے کا بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کے ذرائع لامحدود ہیں۔ یہ معلوم کرنا تو اس کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے کہ اسے کہاں سے فون کیا جا رہا ہے۔ اس نے تمہیں باتوں میں الجھا لیا ہو گا۔"

"اس کے باوجود اتنے کم وقت میں اس کے آدمیوں کا یہاں پہنچنا حیران کن ہے۔" میں نے کہا۔

"کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس نے اس علاقے کے قریب ترین لوگوں کو تمہارے بارے میں اطلاع دی ہو گی۔ خدا کرے کہ وہ انہیں یہاں بھیج کر مطمئن ہو گیا ہو اور مزید لوگوں کو یہاں نہ بھیجا ہو ورنہ یہاں سے نکلنا ناممکن ہو گا۔" اس نے گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھاتے

ہوئے کہا۔ ”سڑک بالکل صاف ہے۔ اس سے لگ تو یہی رہا کہ زینکو نے پولیس کو مطلع نہیں کیا ہے ورنہ ہانگ کانگ کی پولیس بہت مستعد ہے۔ اب تک اس نے ایسی ناکہ بندی کی ہوتی کہ کسی چڑیا کے بچے کا گزرنا بھی مشکل ہوتا۔ پھر بھی پولیس کے یہاں پہنچنے کا امکان ہے۔“ اینڈریو نے مضطرب انداز میں کہا۔ ”فائرنگ کی آواز دور تک سنی گئی ہو گی اور پولیس کی کوئی موبائل وین نزدیک نہ بھی ہو گی تو علاقے کے کسی فرد نے پولیس کو فون کر دیا ہو گا۔“

میں جواب میں کچھ نہ بولا۔ بس خاموشی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتا رہا۔

”خرم تم! تم ایسا کرو کہ پچھلی سیٹ پر چلے جاؤ۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اینڈریو نے مجھے مخاطب کیا ”اگر پولیس سے مڈبھیڑ ہو ہی جائے تو ہم بھرپور مزاحمت کریں گے۔ وہاں کئی آدمی مارے گئے ہیں۔ پولیس نے اگر ہمیں گرفتار کر لیا تو سیدھا سیدھا الیکٹرک چیئر پر بٹھا دے گی۔“

میں وہیں سے قلابازی کھا کے پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔

”سیٹ کو تھوڑا سا آگے کھسکا کر اٹھاؤ۔“ اینڈریو نے عقبی شیشے میں دیکھتے ہوئے مجھے ہدایت دی۔

میں نے اس کی ہدایت کے مطابق سیٹ آگے کھسکائی اور بولٹ کی طرح اوپر اٹھا دی۔ سیٹ کا نچلا حصہ خصوصی طور پر بنوایا گیا تھا۔ اس میں سگ کی دو آٹومیٹک اور انتہائی مہلک قسم کی دور مار رائفلز‘ پوائنٹ فور فائیو اور تھری رایٹ سے بنی ریوالورز‘ انتہائی تباہ کن ہینڈ گرنیڈ اور کافی تعداد میں اسموک بم تھے۔ رائفلز اور ریوالورز کے لاتعداد فاضل میگزین ان کے علاوہ تھے۔

میں نے دونوں رائفلز‘ بے شمار راؤنڈز‘ دو دستی بم اور وہ کیمو فلاج بم نکال کر سیٹ برابر کر دی۔

”ذرا احتیاط کرنا خرم!“ اینڈریو نے عقبی شیشے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دستی بم کی پن ہلکے سے اشارے سے نکل جاتی ہے اور یہ انتہائی تباہ کن بم ہے۔ اگر ہماری ذرا سی بے احتیاطی سے یہ پھٹ گیا تو نہ صرف ہمارے پرخچے اڑیں گے بلکہ اگر آگے پیچھے کوئی گاڑی ہوئی تو اسے بھی نقصان پہنچے گا۔“

”فکر مت کرو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”مجھے اس مہلک کھلونوں کا خوب تجربہ ہے اور میں اس چھوٹے سے دستی بم کی تباہ کاریوں سے بھی واقف ہوں۔“ میں نے اسے مرعوب کرنے کو ڈھٹائی سے جھوٹ بولا حالانکہ اس سے قبل میں نے نہ اس قسم کے بم دیکھے تھے اور نہ سگ کی اس ماڈل کی رائفلز!

گاڑی اس وقت جیٹ طیارے کی طرح دوڑی جا رہی تھی۔ باہر کے منظریوں چشم زدن

میں گزر رہے تھے گویا ہم بلٹ ٹرین میں بیٹھے ہیں۔ میں نے جھانک کے اسپیڈ میٹر پر نظر ڈالی' اس کی سوئی ایک سو پچاس اور ایک سو ساٹھ کے درمیان تھرک رہی تھی۔ اسپیڈ میٹر دیکھ کر میرا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک سو ساٹھ میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے کا مطلب تھا زبردست حادثہ! اس اسپیڈ میں گاڑی کسی بھی وقت حادثے کا شکار ہو سکتی ہے۔ میں نے اینڈریو کو ٹوکنا چاہا مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ ٹوکنے سے اس کا دھیان ہٹے گا۔ میں سڑک پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا کہ کوئی گاڑی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہی ہے۔ سڑک پہ اس وقت کوئی ایسی گاڑی نہیں تھی جس پہ تعاقب کا گمان ہوتا۔

پھر اینڈریو نے گاڑی ایک بھری پری شاہراہ پر موڑ لی۔ اس کی اس حرکت سے میرے اعصاب مزید کشیدہ ہو گئے۔ اب کسی بھی چوراہے پہ ہمیں ٹریفک پولیس یا پولیس کی کوئی موبائل وین روک سکتی تھی۔ ہماری گاڑی کا ونڈ اسکرین ٹوٹا ہوا تھا' عقبی شیشے پہ بھی ریوالور کی گولیوں کے واضح نشانات تھے۔ اسی قسم کی ٹوٹی پھوٹی گاڑیاں پاکستان میں تو بغیر کسی شک و شبے کے چل جاتی ہیں مگر ترقی یافتہ ملکوں میں ایسی گاڑی کو دیکھتے ہی روک لیا جاتا ہے۔

اچانک مجھے اس گاڑی کا خیال آیا جو ہمارے پیچھے بوبی کو لے کر روانہ ہوئی تھی۔ اس کا بھی دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ میں نے اس کے بارے میں اینڈریو سے پوچھا تو وہ ہنس کر بولا "کہ وہ گاڑی دوسرے راستے سے گئی ہے۔" پھر اچانک اس نے گاڑی تنگ سی ایک گلی میں موڑ دی اور کچھ دور میں چلنے کے بعد گاڑی کو دائیں ہاتھ کے ایک ورکشاپ میں لیتا چلا گیا۔

"یہ بھی اپنا ہی آدمی ہے۔ کل تک اس گاڑی پہ فائرنگ کا ہلکا سا نشان بھی نہیں ہو گا۔" یہ کہتا ہوا وہ دروازہ کھول کے اتر گیا۔

میں بھی نیچے اتر آیا۔ گاڑی رکتے ہی پستہ قد کا ایک چینی وہاں آ گیا تھا۔ اس نے پرتپاک انداز میں اینڈریو کا استقبال کیا۔ پھر مجھ سے مصافحہ کر کے اینڈریو سے بولا۔ "خیریت تو ہے ماسٹر؟"

"ہاں خیریت ہے' مجھے فوری طور پہ کوئی دوسری گاڑی چاہیئے۔"

"آپ کچھ دیر تشریف تو رکھیں' مجھے بھی کبھی خدمت کا موقع دے دیا کریں۔"

"یہی بہت بڑی خدمت ہے جو تم کرتے رہتے ہو۔" اینڈریو نے ہنس کر کہا۔ پھر معنی خیز انداز میں بولا۔ "میری گاڑی کا بیگج بھی اس گاڑی میں منتقل کر دینا۔"

"بیگج تو پھر ڈکی میں یا بیک سیٹ پر رکھنا پڑے گا ماسٹر۔" چینی دانت نکال کر بولا۔ "کیوں کہ میرے پاس کوئی خصوصی گاڑی تو ہے نہیں۔"

"نو پرابلم!" اینڈریو نے کہا۔ "پھر وہ بیگج میری گاڑی میں ہی رہنے دو۔ مجھے صرف اپنی گاڑی دے دو۔"

چینی نے جیب سے چابی نکالی اور بولا۔ "میرے پاس اس وقت پرانے ماڈل کی جیگوار ہے مگر چلتی خوب ہے' آپ کو پریشان نہیں کرے گی۔" وہ باتیں کرتا ہوا ورکشاپ کے اس حصے میں چلا گیا جہاں گاڑیوں کی سروس کی جا رہی تھی۔ وہیں ریڈ کلر کی ایک جیگوار کھڑی تھی۔

اینڈریو نے مجھ سے بیٹھنے کو کہا' پھر اسٹیرنگ سنبھالتا ہوا چینی سے بولا۔ "میری گاڑی کل شام تک ہر صورت میں تیار کر دینا۔"

"اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں ماسٹر!" چینی نے دانت نکالے۔

اینڈریو نے گاڑی ریورس کر کے پھر ورکشاپ سے نکال لی۔

○

آدھے گھنٹے بعد ہم پنکی کے فلیٹ پر پہنچے تو اینڈریو کے آدمی پہنچ چکے تھے۔ بوبی وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے پنکی سے بوبی کے بارے میں معلوم کیا تو وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "بوبی شدید زخمی ہو گیا ہے۔ گولی نے اس کے دائیں شانے کی ہڈی توڑ دی ہے اور تمہارے یہ آدمی فوری طور پر اسے اسپتال لے جانے کی بجائے یہاں اٹھا لائے۔ اس کی حالت تشویشناک ہے' خون بہت زیادہ ضائع ہو گیا ہے۔ اگر اسے فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا جاتا تو اس کی حالت اتنی نہ بگڑتی۔" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"بوبی اس وقت کہاں ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں اسے اسپتال لے گئی تھی میں تم لوگوں کو اطلاع دینے یہاں آئی تھی تنہا اسے نہیں سنبھال سکتی' پھر اخراجات۔"

"اخراجات کی فکر مت کرو۔" میں نے جواب دیا۔ "پیسہ جتنا بھی خرچ ہو گا ہم کریں گے۔"

"پیسہ کسی کی زندگی کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتا نا!"

"ٹھیک ہو جائے گا وہ۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "وہ بہت حوصلہ مند اور مضبوط آدمی ہے۔ چلو مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

"میں بھی چلتا ہوں۔" اینڈریو نے کہا' پھر اپنے آدمیوں سے مخاطب ہوا۔ "ہماری غیر موجودگی میں کوئی بھی اجنبی یہاں آئے تو اسے اندر مت گھسنے دینا۔"

پنکی مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ مجھے اس لڑکی پہ حیرت بھی ہو رہی تھی۔ وہاں کی لڑکیاں دوست تو ایک طرف رہے' شوہروں کے لئے اتنی فکرمند نہیں ہوتیں۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بوبی اس پہ اتنا اعتماد کیوں کرتا تھا۔

بوبی بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور

دیکھنے میں وہ برسوں کا مریض لگ رہا تھا۔ پنکی کی یہ اطلاع غلط تھی کہ رائفل کی گولی نے اس کے شانے کی ہڈی توڑ دی ہے۔ ایکسرے رپورٹ کے مطابق اس کی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ البتہ گولی شانے میں دھنس گئی تھی جسے آپریشن کے بعد نکال دیا گیا تھا۔ اس کا خون بہت زیادہ ضائع ہو گیا تھا۔ اسی لئے اس کی حالت تشویش ناک تھی۔ پھر پولیس کا چکر بھی تھا۔ اس وقت بھی پولیس کا ایک سارجنٹ وہاں موجود تھا۔ میں نے اس پہلو پہ تو غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ کوئی پاکستان نہیں تھا کہ معاملے کو دبا دیا جاتا۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ کوئی مخصوص ڈاکٹر بوبی کا علاج کرتا' ایسا ڈاکٹر جو پولیس رپورٹ کی پروا نہ کرتا ہو مگر پنکی گھبراہٹ میں بوبی کو ہانگ کانگ کے ایک بڑے اسپتال میں لے گئی تھی۔ اس نے پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ بوبی کسی نہ کسی طرح اس کے پاس پہنچا تھا' پھر بے ہوش ہو گیا تھا اس لئے میں نہیں جانتی کہ یہ زخمی کیسے ہوا ہے۔ پولیس سارجنٹ بوبی کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال سے کیسے نمٹا جائے۔ ویسے بوبی کی حالت خطرے سے باہر تھی اور اسے کسی بھی وقت ہوش آ سکتا تھا۔ میں نے اینڈریو سے کہا۔ "پولیس اگر کسی نہ کسی طرح پنکی کے فلیٹ پر پہنچ گئی تو گوشی کو بھی برآمد کرلے گی۔ کیا اسے فوری طور پر کہیں اور شفٹ کیا جا سکتا ہے؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" اینڈریو نے پرخیال انداز میں کہا۔ "بوبی ہوش میں آنے کے بعد اپنے زخمی ہونے کا کیا جواز پیش کرے گا۔ پولیس ان لوگوں کی تلاش میں بھی ہو گی جنہوں نے اس پبلک ٹیلی فون بوتھ کے پاس تباہی پھیلائی ہے۔ وہ لوگ بوبی پر زور شبہ کریں گے۔ یہاں سے فوراً نکلنے کی کوشش کرو خرم!" اینڈریو اچانک مضطرب دکھائی دینے لگا۔

"مگر بوبی....."

"اس کی فکر مت کرو۔ میں اپنے ایک خاص آدمی کو اس کی دیکھ بھال کی ہدایت کر دوں گا' پھر اس کے پاس پنکی بھی ہے۔"

"مگر پولیس کے چکر!" میں الجھ کر بولا۔ "بوبی بیچارہ بری طرح پھنس جائے گا۔"

"ہم اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ پنکی کی حماقت ہے۔ ممکن ہے پولیس اس پر شبہ نہ کرے بہرحال تم تو یہاں سے نکلو۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہم وہاں رہتے تو ہم بھی پھنس سکتے تھے۔ آزاد رہتے تو بوبی کی کچھ مدد بھی کر سکتے تھے۔ پھر یہاں پر میر صاحب اور شواکی بھی تھے۔ مجھے شواکی سے تو کچھ امید نہیں تھی مگر میر صاحب اسے بوبی کی مدد پر آمادہ کر سکتے تھے اور یہ سب میرے مفروضے تھے۔ ممکن ہے پولیس بوبی کے بیان سے مطمئن ہو کر اس کا پیچھا چھوڑ دیتی۔ یہ تو بوبی کی ذہانت پر منحصر تھا کہ وہ پولیس کو کیا بیان دیتا ہے۔ میں نے فوری طور پر وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم گاڑی میں برق رفتاری سے پنکی کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے راستے میں اینڈریو سے پوچھا۔ "مگر ہم گوشی کو لے کر جائیں گے کہاں؟"

"میں تمہیں فی الحال ہانگ کانگ کی حدود سے نکال دوں گا۔ وہاں رہ کر تم زینکو سے سودے بازی بھی کر سکو گے۔ ہانگ کانگ سے باہر زینکو کا اتنا اثر و رسوخ نہیں ہے۔"

"مگر میں ہانگ کانگ سے نکلوں گا کیسے؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔ "وہ بھی ایک ایسی لڑکی کو لے کر جس کی تلاش میں زینکو نے زمین آسمان ایک کر دیئے ہوں گے۔"

"میں تمہیں سمندر کے راستے یہاں سے نکال دوں گا۔" اینڈریو نے کہا۔ "ہانگ کانگ کی بحری پولیس میں میرے کچھ دوست موجود ہیں۔ وہ اس موقع پر میری مدد ضرور کریں گے۔"

اسی دوران میں ہم پنکی کے فلیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ میں فلیٹ میں داخل ہوا تو میر صاحب کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ اضطراب کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہے تھے' مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "خرم تم! فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ شواکی کو کسی طرح علم ہو گیا ہے کہ گوشی ہمارے قبضے میں ہے۔ اس نے یہ اطلاع زینکو تک بھی پہنچا دی ہے۔ زینکو جلد ہی تمہیں ڈھونڈ نکالے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں تک پہنچے تم گوشی کو لے کر روانہ ہو جاؤ۔" پھر وہ اینڈریو سے مخاطب ہوئے۔ "اینڈریو تم....."

"میں نے پہلے ہی منصوبہ بنا لیا ہے سیٹھ!" اینڈریو نے کہا۔ "میں ابھی خرم سے یہی کہہ رہا تھا کہ یہاں سے فوری طور پر نکل جاؤ۔" پھر اینڈریو مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم لڑکی کو لے کر آؤ۔ میں کچھ ضروری ٹیلی فون کر لوں۔" یہ کہہ کر وہ فون کی طرف بڑھ گیا۔

گوشی بیڈ پر نیم دراز تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تلملا کر اٹھ بیٹھی اور تیز لہجے میں بولی۔ "آخر تم لوگ ڈیڈی سے میری بات کیوں نہیں کراتے؟"

"تمہارے ڈیڈی سے ابھی تک رابطہ قائم نہیں ہو سکا ہے۔" پھر میں ذرا توقف کے بعد بولا۔ "گوشی' یہاں ہمارے لئے خطرہ ہے۔ ہمیں فوراً نکلنا پڑے گا۔"

"ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟" گوشی چونک اٹھی۔ "کیا میرے لئے بھی خطرہ ہے؟"

"اصل خطرہ تو تمہارے ہی لئے ہے گوشی۔ میں نے دانستہ جھوٹ بولا۔ مجھے افسوس بھی ہوا کہ میں اس معصوم لڑکی سے جھوٹ بول رہا ہوں جو میری ہر بات کو سچ سمجھ رہی ہے۔" زینکو کے کچھ خطرناک دشمنوں کو علم ہو گیا ہے کہ تم یہاں موجود ہو۔ وہ میرے بھی دشمن ہیں اس لئے فوری طور پر میں تمہیں یہاں سے لے کر نکل رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں ہلکی سی خراش بھی آئے۔ میں نے تمہیں اغواء ضرور کیا ہے مگر میں صرف تمہارے ڈیڈی سے اپنی امانت وصول کرنا چاہتا ہوں' تمہاری عزت کی حفاظت میں اپنی جان سے بڑھ کر کروں گا۔"

میری بات سن کر گوشی کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ وہ میری جذباتی تقریر سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں تمہارے ساتھ کہیں بھی جانے کو تیار ہوں' چلو کہاں چلنا ہے؟"

"میرا ساتھی ضروری انتظامات میں مصروف ہے۔ ہم ابھی یہاں سے روانہ ہونے ہی والے ہیں۔ تم بھی فریش ہو جاؤ۔ بھوک لگی ہو تو کچھ کھا لو۔ ممکن ہے ہمیں آئندہ کئی گھنٹے تک کچھ کھانے پینے کا موقع نہ ملے۔"

"بھوک تو واقعی مجھے لگ رہی ہے۔" گوشی مسکرا کر بولی۔ وہ اس دوران میں پہلی مرتبہ مسکرائی تھی۔ مسکراتی ہوئی وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

"میں ابھی تمہارے لئے کچھ لاتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" گوشی پھر مسکرائی۔ "فریج مختلف قسم کی چیزوں سے بھرا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر وہ فریج کی طرف بڑھ گئی۔

○

میں دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہاں اینڈریو ابھی تک فون کرنے میں مصروف تھا۔ اسے وہاں مصروف چھوڑ کر میں بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہاں جا کر میں نے جینز اور چمڑے کی جیکٹ پہنی' دونوں ریوالور چیک کر کے جیب میں رکھے اور فولڈنگ رائفلز والے وہ دونوں بریف کیس اٹھا لئے جو اس سے پہلے بھی ہمارے کام آتے رہے تھے۔ ہر طرح سے مسلح اور تیار ہو کر میں کمرے سے نکلا تو اینڈریو روانگی کے لئے تیار تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ لڑکی کو بے ہوش کر کے گاڑی تک لے چلو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"لڑکی کو بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہے۔ میں نے اسے جھوٹی سچی کہانی سنا کر رضامند کر لیا ہے۔" یہ کہہ کر میں گوشی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ بھی تیار بیٹھی تھی کہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہم جیگوار میں روانہ ہوئے تو گوشی پچھلی نشست پر نیم دراز تھی تاکہ اسے باہر سے دیکھا نہ جا سکے۔

"اندھیرا پھیلنے تک ہمیں کہیں چھپنا پڑے گا۔" اینڈریو نے ونڈ اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے پرخیال انداز میں کہا۔ "فی الحال میں تمہیں اپنے ایک دوست کے ٹھکانے پر لے جا رہا ہوں وہاں ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے' اندھیرا ہوتے ہی وہاں سے نکل جائیں گے۔" ایسا لگ رہا ہے جیسے اینڈریو خود کلامی کر رہا ہو کیوں کہ اس کی بات کا جواب ہم میں سے کوئی بھی نہیں دے رہا تھا۔

"تم لوگ کہیں اور جانے کی بجائے میرے ڈیڈی کے پاس کیوں نہیں چلتے؟" اچانک گوشی بولی.....

"تمہارے ڈیڈی کے پاس جانے کا مطلب ہے جان بوجھ کر اندھے کنویں میں چھلانگ لگانا۔" اینڈریو نے بیزاری سے کہا۔ "وہ دیکھتے ہی ہمیں گولی مار دے گا۔"

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔" گوشی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "تم لوگوں کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔"

"تمہارا باپ ہماری جان بخشی تو کر دے گا مگر اس سے ہمارا مقصد پورا نہیں ہو گا۔" اینڈریو کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "وہ ہمیں کسی بھی قیمت پر وہ مائیکرو فلمز اور کاغذات نہیں دے گا۔ اس سے ہمیں کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔"

"تم مجھے ایک دفعہ ڈیڈی کے پاس لے تو چلو۔" گوشی بہ ضد ہو گئی۔ "میں کوشش کروں گی کہ ڈیڈی وہ چیزیں تمہیں لوٹا دیں۔ ڈیڈی میری کوئی بات ٹالتے نہیں ہیں۔"

"مگر وہ یہ بات ضرور ٹال دیں گے۔" اینڈریو نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اس معاملے میں حکومتیں ملوث ہیں بے بی! رینکو کی کمزوری صرف تم ہو۔ جونہی اس کی یہ کمزوری دور ہوئی وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر ہمارے ہاتھ کیا آئے گا! تمہیں کیا معلوم کہ ان چیزوں کے لئے خرم نے کیا قربانیاں دی ہیں' اپنے کیسے کیسے ساتھی کھوئے ہیں۔ ان قربانیوں میں میرے ایک ساتھی جیک کی قربانی بھی شامل ہے۔ کیا ان سب لوگوں کا خون رائیگاں جائے گا۔ نہیں بے بی نہیں' میں تمہارے باپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں کسی بھی قیمت پر تمہاری یہ بات نہیں مانوں گا۔"

"اینڈریو ٹھیک کہہ رہا ہے گوشی!" میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "زینکو تمہارے لئے صرف باپ ہے۔ تم اسے ایک بیٹی کی نظر سے دیکھتی ہو۔ تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ کتنا ظالم ہے۔ انسانی جان کی اس کے نزدیک کوئی وقعت نہیں ہے۔ وہ صرف تمہارے بدلے میں وہ کاغذات اور مائیکرو فلمز ہمارے حوالے کر سکتا ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "تمہیں ہم سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں تو تمہاری وجہ سے فکرمند ہوں۔ تمہیں اس وقت دہرے خطرے کا سامنا ہے۔ ایک طرف میرے ڈیڈی ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو تمہارے اور ڈیڈی کے مشترکہ دشمن ہیں۔"

"خطرات سے کھیلنا ہماری ہابی ہے بے بی!" اینڈریو نے جواب دیا۔ "تم ہماری فکر مت کرو۔"

"ایز یو لائیک انکل!" گوشی نے چڑ کر کہا اور خاموش ہو گئی۔

○

تھوڑی دیر بعد ہم پھر ایک کثیرالمرلہ عمارت کے پارکنگ لاٹ میں کھڑے تھے۔ گوشی کے لئے اینڈریو ایک میکسیکن ہیٹ لے آیا تھا۔ ہیٹ گوشی نے اس انداز سے پہنا تھا کہ اس کا چہرہ نصف سے زیادہ چھپ گیا تھا۔ اینڈریو نے لفٹ کی طرف جانے کی بجائے بیسمنٹ کا رخ کیا۔ وہاں کا زینہ سیلن زدہ تھا' سیڑھیوں کے آغاز میں مدھم سی روشنی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی یرقان زدہ روشنی میں عجیب سی پراسراریت تھی۔ نیچے پہنچے تو ہمیں بہت سے لوگوں کے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ عجیب طرح کا شور تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سارے آدمی ایک ساتھ بول رہے ہوں اور کوئی کسی کی نہ سن رہا ہو۔ ہم اس وقت ایک کوریڈور میں چل رہے تھے وہ آوازیں دائیں طرف کے ایک کمرے سے آ رہی تھیں۔

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟" گوشی نے منہ بنا کر ناگواری کا اظہار کیا۔

"خاموشی سے میرے پیچھے چلتی رہو۔" اینڈریو نے کہا۔

اچانک ایک آدمی نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ اس کا قد چھوٹا مگر جسم خوب پھیلا ہوا تھا۔ سر انڈے کی طرح شفاف تھا۔ گنجے سر پر اس کے بڑے بڑے کان بہت عجیب لگ رہے تھے۔ اس نے پہلے پھپھوند زدہ دانتوں کی نمائش کی اور اینڈریو سے بولا۔ "ہیلو ماسٹر! بہت دن کے بعد ادھر کا رخ کیا۔"

"ہاں بس ذرا مصروف تھا۔" اینڈریو نے جواب دیا' پھر بولا۔ "سردار جی کہاں ہیں؟ تم لوگ اتنے بے پرواہ ہو گئے ہو کہ کوئی بھی بلا روک ٹوک اندر آ سکتا ہے۔ کیا سردار جی نے یہاں سے کاروبار سمیٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ماسٹر!" گنجے نے پھر اپنے بدنما دانت نکالے۔ "جیکب اور راجیت ڈیوٹی پر ہیں اگر کوئی اجنبی اندر قدم رکھتا تو وہ فوراً اس کا راستہ روک لیتے۔ ویسے انہوں نے مجھے آپ کے متعلق بتا دیا تھا کہ آپ دو مہمانوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔" پھر وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "آج کیا کھیلنے کا موڈ ہے؟"

"نہیں میں کچھ دیر یہاں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" اینڈریو نے جواب دیا۔

"سردار جی اپنے کمرے میں موجود ہیں۔" گنجے نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

اینڈریو آگے بڑھ کے دائیں جانب کے آخری کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ کمرہ آفس کے طور پر استعمال ہو رہا تھا لمبی چوڑی جہازی سائز میز کے پیچھے ایک لحیم شحیم سیٹھ بیٹھا تھا۔ وہ اینڈریو کو دیکھ کر گویا کھل اٹھا اور کرسی سے اٹھ کر والہانہ انداز میں اس کی طرف لپکا۔

"آؤ ماسٹر' آج تو بڑے دن بعد تمہاری شکل دکھائی دی۔"

اینڈریو آگے بڑھ کے اس سے بغل گیر ہو گیا' پھر بولا۔ "سردار جی' اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"ارے تو بولو یار کتنے پیسے چاہئیں؟"

"پیسوں کا مسئلہ نہیں ہے۔" اینڈریو نے جواب دیا۔ "مجھے اور میرے دوستوں کو چند گھنٹے کے لئے پناہ چاہئے۔"

سردار جی نے چونک کر باری باری مجھے اور گوشی کو دیکھا' مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔ "تسی تے ساڈے لہور دے لگدے او!"

میں نے چونک کر اسے دیکھا اس کے کہنے پر مجھے یاد آگیا تھا کہ میرا آبائی شہر تو لاہور ہی ہے۔ گو کہ میں نے وہاں بہت کم وقت گزارا تھا مگر اپنا آبائی شہر کون بھول سکتا ہے۔ لاہور میں نے برسوں پہلے چھوڑ دیا تھا مگر وہاں کا نام سن کر اب بھی میرے سینے میں ہوک سی اٹھتی ہے۔

"او کس سوچ وچ پے گئے باشاہو۔" سردار جی نے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"مینوں یقین نئیں آیا سردار جی کہ تسی وی لہور دے او۔"

"ہلکے بھئی' مینوں تے خوشبو آگئی سی لہور دی۔ ہن تے پریشان ہون دی کوئی گل ای نئیں۔"

"یہ تم لوگ کس زبان میں بات کر رہے ہو بھئی؟" اینڈریو ہنس کر بولا۔

"تم نہیں سمجھو گے یار۔" سردار جی نے جھٹکے دار انگلش میں کہا۔ "یہ میرا گرائیں ہے۔"

"گرائیں ہے؟" اینڈریو نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ یہ بھی میرے شہر کا رہنے والا ہے۔"

"واقعی؟" اینڈریو نے ہنس کر کہا۔ "مگر یار میرے سامنے تو اپنی زبان میں بات مت کرو۔ ورنہ میں پاگلوں کی طرح تم دونوں کا منہ دیکھتا رہوں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے' نہیں کرتے۔" سردار جی نے گویا اس پر احسان کرتے ہوئے کہا۔ پھر مجھ سے بولے۔ "تو فکر مت کر کاکا' میری چھت کے نیچے کوئی تجھے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ جب تک مرضی آئے یہاں رہ۔" پر یہ بی بی کون ہے؟" انہی نے گوشی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ بی بی ہماری دوست ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اصل میں کچھ بدمعاش اس کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم یہاں پناہ لینے آئے ہیں۔ بس ہمیں اندھیرا

پھیلنے کا انتظار ہے۔"

"بس اب تم لوگ فکر ہی مت کرو۔" سردار جی نے کہا پھر انٹرکام پر کسی سے کہا۔ "اجیت کو ذرا میرے پاس بھیجو۔"

"یہ اجیت کون ہے سردار جی؟" میں نے پوچھا۔

"اجیت سنگھ بھی پنجاب کا رہنے والا ہے' تم سے مل کر بہت خوش ہو گا۔"

تھوڑی دیر بعد دروازہ ناک کر کے ورزشی جسم اور دراز قامت کا ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔

سردار جی نے مجھ سے کہا۔ "یہ اجیت سنگھ ہے۔" پھر سردار جی مجھ سے بولے۔ "کاکا تو نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

میں نے اٹھ کر اجیت سے مصافحہ کیا اور بولا۔ "میرا نام خرم ہے اور میں پاکستانی ہوں۔"

میرا خیال تھا کہ سردار کی طرح اجیت بھی لمبے لمبے بالوں اور گھنی داڑھی مونچھوں والا ہو گا مگر وہ کلین شیو نوجوان تھا۔

"اجیت' یہ میرے مہمان ہیں۔ کچھ دشمن ان کے پیچھے ہیں۔ اب یہاں کوئی اجنبی شخص داخل نہ ہونے پائے۔"

"ٹھیک ہے سردار جی!" اجیت نے کہا۔ اب تو میں چڑیا کے بچے کو بھی اندر نہیں آنے دوں گا بلکہ میں بیسمنٹ کا دروازہ ہی بند کئے دیتا ہوں۔"

"ایسا کوئی کام مت کرنا۔" اینڈریو نے کہا۔ "جس سے یہاں مستقل آنے والوں کو کوئی شبہ ہو' جانے پہچانے لوگوں کو روکنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لو جی' یہ کام تو ہو گیا۔" سردار جی نے اجیت کے جانے کے بعد کہا۔ "اب اس بیسمنٹ میں کوئی دشمن اجیت کو مار کر ہی داخل ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں آپ لوگ بھی آرام کریں۔ میں اپنا بیڈ روم کھلوائے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی ایک ملازم وہاں آ گیا۔

سردار جی نے اس سے کہا۔ "انہیں میرے بیڈ روم میں لے جاؤ۔"

"بیڈ روم میں پہنچنے کے بعد ہمیں تنہائی ملی تو اینڈریو نے کہا۔ "میں نے تم لوگوں کے لئے بوٹ کا بندوبست کر لیا ہے۔ بوٹ والا بہت ہوشیار اور تجربہ کار ہے۔ وہ تمہیں آسانی سے نکال لے جائے گا۔ اب جیک تو رہا نہیں کسی اور کا بندوبست کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"تم لوگ کہاں جانے کی بات کر رہے ہو؟" گوشی نے پوچھا۔

"میں تمہیں ایک جزیرے پر بھجوا رہا ہوں۔ وہاں سے تم زینکو سے رابطہ بھی کر سکو

گی۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "تم لوگ یہاں آرام کرو۔ میں ایک دو ضروری کام نمٹا کر آتا ہوں۔" اینڈریو یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس نے آرام کا تذکرہ کیا تو مجھے یاد آگیا کہ میں گزشتہ چوبیس گھنٹے سے جاگ رہا ہوں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ گھنٹ ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔ اس وقت دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ مجھے آرام کا خیال آیا تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ کچھ دیر کی نیند ہی لے لوں۔ میں نے گوشی سے کہا میں کچھ دیر کے لئے سونا چاہتا ہوں۔ تم اکیلی یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔" پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے سوتے ہی گوشی یہاں سے نکل بھاگی تو میں کیا کر سکوں گا۔ وہ بھاگ کر اپنے باپ کو فون بھی کر دیتی تو میرا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ میں نے سوچا کہ سردار جی اور اجیت کو یہ ہدایت دے آؤں کہ میرے ساتھ جو لڑکی ہے وہ یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کرے یا فون استعمال کرنا چاہے تو اسے مت کرنے دینا۔ میں نے گوشی سے کہا۔ "سونے سے پہلے ذرا میں میر صاحب سے فون پر بات کر لوں۔ وہ بیچارے بھی ہماری طرف سے فکرمند ہوں گے۔ تم بیٹھو' میں فون کر کے ابھی آیا۔" میں جلدی سے باہر نکل گیا۔

سردار جی اپنے کمرے میں موجود تھے۔ مجھ دیکھ کر بولے۔ "کاکا تو سویا نہیں۔ ماسٹر تو کہہ گیا ہے کہ تو سو رہا ہے۔"

"سردار جی میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ میرے ساتھ جو لڑکی ہے۔ اسے باہر مت جانے دینا۔ وہ میرے دشمنوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے میں اپنے دشمنوں تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ یہاں سے نکل گئی تو میری ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ اگر وہ کہیں فون کرنا چاہے تو اسے فون بھی مت کرنے دینا۔"

"او کاکا فکر ہی مت کر۔ میں ابھی اجیت کو بلا کر سمجھا دیتا ہوں۔ تو بے فکر ہو کر سو جا تیری آنکھوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تو ساری رات سویا نہیں ہے۔ جا کاکا! تو جا کے آرام کر۔ ماسٹر نے کہا تھا کہ تجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔"

میں سردار جی کے کمرے سے باہر نکلا تو گوشی بیڈ روم کے دروازے پر کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "خرم! پلیز آج رات یہاں سے نکل جانا ورنہ میں یہاں کی گھٹن سے مر جاؤں گی۔"

"صرف چند ہی گھنٹوں کی تو بات ہے۔ اس وقت تک یہ ناگوار بو اور سیلن زدہ بیسمنٹ برداشت کرنا پڑے گا۔" میں بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا۔ "میں سو رہا ہوں مگر خدا کے واسطے تم بھی مت سو جانا۔ مجھے ان لوگوں کا بالکل اعتبار نہیں ہے۔ میں ۔نے کروٹ

بدل کر آنکھیں موند لیں۔ پھر نہ جانے کب میں گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا۔

○

میری آنکھ کھلی تو کوئی بری طرح مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ نیند کی وجہ سے میری آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں اور میرا اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر پھر سونے کی کوشش کی۔ مجھے پھر کسی نے جھنجوڑا' پھر گوشی کی آواز سنائی دی۔ "خرم اٹھو ہم خطرے میں ہیں۔"

اس کی آواز نے جادو کا کام کیا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "کیا ہوا گوشی' کیسا خطرہ؟" میں نے غیر شعوری طور پر ریوالور نکال لیا۔

"ہمارے دشمن باہر آ پہنچے ہیں۔ سردار جی ابھی مجھے بتا کر گئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم خرم کو اٹھاؤ میں تمہیں یہاں سے نکالنے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

میں نے جلدی جلدی جوتے پہنے اور بریف کیس اٹھا کر چلنے کو تیار ہو گیا۔

"کمرے کا دروازہ کھلا اور سردار جی کا وحشت زدہ چہرہ دکھائی دیا۔ مجھے تیار دیکھ کر بولے۔ "چل کاکا جلدی کر۔ میں تجھے دوسرے راستے سے باہر نکال دوں۔ ماسٹر کا تو اب تک کوئی پتہ ہی نہیں ہے۔ میرا آدمی تم لوگوں کو کسی محفوظ جگہ چھوڑ آئے گا۔"

"سردار جی' یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اس ملک سے ہی نکل جائیں؟" میں نے اردو میں کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گوشی بھی یہ بات سنے۔

"ہو سکتا ہے بالکل ہو سکتا ہے۔" سردار جی جلدی سے بولے "مگر پہلے تو یہاں سے خیر خیریت سے نکل جا۔ میرا آدمی تجھے کسی محفوظ جگہ لے جائے گا۔ ایک دو دن میں تم دونوں کے جعلی پاسپورٹ اور ویزے تیار ہو جائیں گے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ بس تو یہاں سے نکل جا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل آئے۔ "آ میرے ساتھ۔"

ان کا رخ زینے کی مخالف سمت میں تھا۔ کوریڈور کے آخری سرے پر ایک دروازہ تھا۔ سردار جی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک کمرہ ہے۔ انہوں نے اسی کمرے کی ایک دیوار پر بنی الماری کھولی اور اس کے کپڑوں کو نکال کر باہر ڈھیر کرنے لگے۔ اس کمرے میں ایک صوفہ سیٹ اور دو تین کرسیوں کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ الماری سے کپڑے نکالنے کے بعد انہوں نے اندر لگی ہوئی چھوٹی سی ایک ناب کو پہلے دو دفعہ بائیں جانب پھر دو دفعہ دائیں جانب گھما کر آہستہ سے باہر کھینچ لیا۔ الماری میں دیکھتے دیکھتے ہی ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ہم سردار جی کے پیچھے پیچھے اس خلا میں داخل ہوئے تو خود کو ایک اور زینے پر پایا۔ سردار جی نے دوبارہ کمرے میں جا کر سارے کپڑے سمیٹے اور الماری کے پٹ بند کر کے انہیں درمیانی ڈنڈے پر لٹکا دیا۔ پھر انہوں نے زینے کے پاس لگا ہوا ایک

الیکٹرک سوئچ کئی بار آن آف کیا۔ پھر اسے آف کر کے آہستہ سے اندر کی طرف دبا دیا۔ الماری کا خلا پھر برابر ہو گیا۔ زینہ چڑھنے کے بعد پھر ہم ایک کوریڈور میں کھڑے تھے۔ سردار جی چند لمحے وہاں کھڑے سوچتے رہے' پھر بولے۔ "او کاکا' میری عقل پہ بھی پتھر پڑ گئے ہیں۔ تجھے بھلا یہاں سے نکلنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس زینے کے نیچے ایک خفیہ کمرہ ہے۔ میں نے وہ برسوں پہلے بنوایا تھا کسی کا باپ بھی وہاں نہیں پہنچ سکا۔" پھر وہ گوشی سے مخاطب ہوا۔ "بی بی' تمہارا وہ ہیٹ کہاں ہے؟"

"وہ تو وہیں بیڈ روم میں رہ گیا۔" گوشی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' میں وہ ہیٹ کسی اور لڑکی کو پہنا دوں گا۔ کسی نے تمہیں پہچان کر مخبری کی ہے کہ لڑکی اور کاکا ساتھی سردار جی کے کیسینو میں موجود ہیں۔ میں ان سے کہہ دوں گا کہ بتانے والے کو دھوکہ ہوا ہے۔ یہاں کوئی ایسی لڑکی موجود نہیں ہے۔ میں انہیں ہیٹ والی لڑکی بھی دکھا دوں گا یہ ہے وہ لڑکی جس پر تمہیں دھوکہ ہوا ہے۔" اس دوران میں ہم ایک مرتبہ پھر سیڑھیاں اتر چکے تھے۔ زینے کے سامنے ہی ایک اور دروازہ تھا۔ سردار جی نے اس دروازے کے ہینڈل کو مخالف سمت میں گھمایا تو بائیں جانب کی دیوار میں ایک مستطیل خلا پیدا ہو گیا۔ سردار جی نے خلا کے اندر ٹٹول کر سوئچ بورڈ تلاش کیا اور لائٹ آن کر دی۔ وہ گرد و غبار میں اٹا ہوا ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں ایک بیڈ اور چند کرسیاں موجود تھیں مگر ہر چیز پر گرد کی تہیں تھیں۔ کمرے میں عجیب ناگوار سی بو رچی ہوئی تھی۔

سردار جی نے ہم سے کہا۔ "تم لوگ یہاں ٹھہرو میں ذرا اس کمرے کی جھاڑ پونچھ کر دوں۔"

"اسے چھوڑیں سردار جی۔" میں نے انہیں ٹوک دیا۔ "آپ اپنے آفس میں جائیں۔ وہاں نہ جانے کیا حالات ہوں گے۔ آپ جا کر وہاں کا کام نمٹائیں۔ جھاڑ پونچھ تو ہم خود بھی کر لیں گے۔"

"اچھا پھر میں جاتا ہوں۔ تم اندر جاؤ تو میں راستہ بند کر دوں۔ میری ضرورت پڑے تو یہاں انٹرکام موجود ہے۔ سات نمبر دبا دینا۔ مجھ سے بات ہو جائے گی۔"

ہم دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو سردار جی نے دیوار والا راستہ بند کر دیا۔ اب اس کمرے سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے گھوم کے گوشی کو دیکھا۔ وہ کمرے کے درمیان میں حیران پریشان کھڑی تھی۔ وہ شاید فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کہیں بیٹھے یا یونہی کھڑی رہے۔ وہاں ہر چیز پر اتنی گرد تھی کہ بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ گرد کو صاف کر دوں' پھر خیال آیا کہ صفائی کرنے سے جو گرد اڑے گی اس سے ہمارا دم گھٹ کے رہ جائے گا کیوں کہ وہاں تازہ ہوا کی آمد کے لئے کوئی معمولی سا روزن بھی نہیں تھا۔ گوشی بے بس کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ میرے ہنسنے پر وہ

شرمندہ سی ہو گئی اور چڑ کر بولی۔ ”آخر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

میں نے ہنستے ہنستے اس سے کہا۔ ”تم ایسا کرو کہ کچھ دیر کے لئے باتھ روم میں چلی جاؤ میں یہاں گزارے لائق صفائی کر لیتا ہوں۔“

”یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں۔“ وہ مزید چڑ گئی۔

”برا مت مانو گوشی!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تم پر طنز نہیں کر رہا ہوں۔ تم نے شاید کبھی اس قسم کے کام کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اس لئے تمہیں دشواری ہو گی۔ میں اس قسم کے کام کرنے کا عادی ہوں‘ پلیز میری بات مان لو۔“

وہ چند لمحے تک تذبذب کی کیفیت میں رہی پھر شانے اچکا کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں اچانک میری نظر ویکیوم کلینر پر پڑی۔ میں نے لپک کر اسے چیک کیا۔ اس کا پلگ ساکٹ میں لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ قابل استعمال ہے۔ میں نے ویکیوم کلینر سے دس منٹ کے اندر اندر کمرے کو شیشے کی طرح چمکا دیا۔ اس میں جمع ہونے والی گرد کو پھینکنے کا میں نے یہ حل نکالا کہ کرسی پر اٹی ہوئی گدی کا ریگزین کور پھاڑ کے فوم باہر نکال دیا۔ پھر اسی گدی میں جمع ہونے والی گرد سے بھر دیا۔ صفائی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کمرے کا پنکھا پوری رفتار سے چلا دیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ جو تھوڑی بہت گرد کمرے میں موجود تھی وہ ختم ہو گئی اور ناگوار قسم کی بو بھی خاصی حد تک کم ہو گئی۔ کام سے فارغ ہو کر میں نے گوشی کو آواز دی وہ کمرے میں داخل ہوئی تو حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے حیرت زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا پھر بولی۔ ”خرم...... یہ...... یہ سب کیسے ہو گیا؟“

”مجھے جادو بھی آتا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”منتر پڑھا اور ساری گرد یوں غائب ہو گئی جیسے کبھی یہاں تھی ہی نہیں۔“

”اچھا میں سمجھ گئی۔“ اس نے ویکیوم کلینر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”جب تمہیں معلوم تھا کہ یہاں ویکیوم کلینر موجود ہے تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ اس سے تو میں بھی صفائی کر سکتی تھی۔“

”اچھا تو پھر ایسا کرو کہ تم باتھ روم کی گرد صاف کر دو۔“

اس نے بغیر کچھ کہے ویکیوم کلینر لیا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے میں بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے کئی گھنٹے سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا مگر اس وقت نہ بھوک کا احساس تھا‘ نہ کسی اور بات کا۔ اس وقت زندگی کی سب سے بڑی عیاشی نیند تھی۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ گوشی کہاں سوئے گی۔ پھر لیٹتے ہی مجھے نیند نے دبوچ لیا۔

○

آنکھ کھلی تو وقت کا احساس ہی نہ ہو سکا کیوں کہ کمرے میں حسب سابق ٹیوب لائٹ

کی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے گوشی کی تلاش میں اردگرد نظریں دوڑائیں تو وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے کہ میری اب تک کی محنت رائیگاں گئی اور گوشی یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی مگر کیسے؟ اس نے یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ کیسے دریافت کیا۔ میں نے بیڈ سے نیچے اترنے کی کوشش کی تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ گوشی نیچے قالین پر لیٹی سو رہی تھی۔ کرسی کی ایک گدی کو اس نے سر کے نیچے تکیے کے طور پر رکھ لیا تھا۔ اس کے لمبے اور گھنے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ معصوم بچے کی طرح لگ رہی تھی۔ میں نے پہلی دفعہ غور سے اسے دیکھا۔ وہ بلاشبہ حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کی پلکیں اتنی گھنی تھیں کہ اس کی آنکھوں پر جھالر سی بن گئی تھی۔ میں تھوڑی دیر مبہوت سا اسے دیکھتا رہا' پھر سر جھٹک کر باتھ روم میں چلا گیا۔ میں نے خود کو ملامت کی کہ اگر میں اس کے حسن کا اسیر ہو گیا تو زینکو سے اپنا مطالبہ بھی پورا نہ کرا سکوں گا۔ مجھے باتھ روم دیکھ کر حیرت ہوئی گوشی نے اسے خوب اچھی طرح صاف کر دیا تھا۔ میں نہا دھو کر باتھ روم سے نکلا تو گوشی کارپٹ پر لیٹی پلکیں جھپکا رہی تھی۔ شاید وہ اسی وقت بیدار ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے کہا۔ "تم فرش پر کیوں سوئیں؟"

"پھر کہاں سوتی؟" اس نے سے جواب دیا۔

"بھئی تم مجھے اٹھا دیتیں' میں فرش پر سو جاتا۔ میں تو ان صعوبتوں کا عادی ہوں۔ تمہارا پھول سا نازک جسم یہ سختیاں برداشت نہیں کر سکتا۔"

گوشی کا چہرہ اپنی تعریف سن کر زرد ہو گیا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "تمہیں اٹھانا تو چاہتی تھی کیوں کہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور اس بند کمرے میں وحشت سی ہو رہی تھی مگر تم سوتے ہوئے اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ تمہیں بیدار کرنے کو دل ہی نہیں چاہا۔" گوشی روانی میں یہ بات کر تو گئی مگر جب میں نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا تو وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر مجھے عجیب سی جگمگاہٹ کا احساس ہوا۔ کیلے فورنیا میں پرورش پانے والی لڑکیاں ایسی نہیں ہوتیں مگر وہ کیلے فورنیا میں رہنے کے باوجود شرمیلی تھی یا پھر یہ میرا احساس تھا۔ میں اس کی اس ادا کو کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ بس ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ اس نے خاموشی کو توڑا اور موضوع بدل کر بولی۔ "کیا تمہیں بھوک نہیں لگ رہی ہے؟"

"اب سے کچھ دیر پہلے لگ رہی تھی مگر اب تو میری بھوک پیاس سب اڑ گئی۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے کلارا کا خیال آ گیا۔ میں شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ کلارا اس سے کم حسین تو نہیں تھی' پھر اس نے تو ایسے مشکل وقت میں میری مدد کی تھی جب میری جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ میں فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا۔

میری سنجیدگی کو گوشی نے بھی محسوس کر لیا۔ وہ جلدی سے بولی۔ "خرم! تمہیں میری

کوئی بات بری لگ گئی کیا؟"

"نہیں، تم نے یاد دلایا تو مجھے بھوک کا احساس ہو رہا ہے۔" میں نے انٹرکام کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا جو بیڈ کے بڈریک پر رکھا تھا۔

میں نے ریسور اٹھا کر سات نمبر کا بٹن دبا دیا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی ریسور اٹھا لیا گیا اور سردار جی کی پنجابی زدہ انگریزی سنائی دی۔ "لیس' سردار پرنام سنگھ اسپیکنگ!؟"

"سردار جی میں آپ کا مہمان بول رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"او کاکا! جاگ گیا اوئے!؟" سردار جی چہکے۔ "پتر معلوم ہوتا ہے تو کئی راتوں سے سویا نہیں تھا۔ کچھ معلوم بھی ہے اس وقت کیا وقت ہوا ہے؟"

میں نے جلدی سے کلائی کی گھڑی دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ میں نہاتے ہوئے باتھ روم میں بھول گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "سردار جی' اس وقت میری کلائی پہ گھڑی نہیں ہے اس لئے مجھے نہیں معلوم کہ کیا ٹائم ہوا ہے!"

"اوئے اس وقت شام کے پانچ بج رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تجھے بھوک لگی ہے میں تیرے لئے کھانا لے کر آتا ہوں۔"

سردار جی' یہاں باتھ روم میں صابن' ٹوتھ پیسٹ کچھ بھی نہیں' شیونگ کا سامان بھی لیتے آئیں۔" میں نے یوں کہا جیسے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی روم سروس کو آرڈر دے رہا ہوں۔

"ٹھیک ہے کاکا! سب کچھ مل جائے گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے انٹرکام رکھ دیا۔

میں ان سے فالتو بکواس کرتا رہا اور یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ کل ہوا کیا تھا! انہوں نے اپنے والوں کو کیسے مطمئن کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب وہ کھانا لے کر آئیں گے تو خود ہی تفصیل بتا دیں گے۔ پھر میں نے باتھ روم میں جا کر اپنی گھڑی اٹھائی واقعی اس میں پانچ بج رہے تھے۔ سردار جی یہ کہہ رہے تھے کہ شام کے پانچ بجے ہیں تو پھر شام ہی ہو گی کیوں کہ مجھے تو وہاں وقت کا اندازہ ہو نہیں رہا تھا۔ کھانے کا تذکرہ سن کر میری بھوک چمک اٹھی تھی۔ مجھے شدت سے سردار جی کا انتظار تھا۔

"خرم! کیا بہت بھوک لگی ہے؟" گوشی نے ہنس کر کہا۔ "پھر طنزیہ لہجے میں بولی۔" تم ان صعوبتوں کے عادی ہو' تم میں تو قوت برداشت بھی ہے۔ مسئلہ تو مجھ ایسی نازک اندام لڑکی کا ہے۔"

"روانہ ہونے سے پہلے تم نے ٹھونسا تو تھا کھانا۔" میں نے چڑ کر بولا۔ "میں نے تو کل صبح سے ہلکا سا ناشتہ کیا تھا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی۔ "تم غصے میں مزید اچھے لگتے ہو۔"

"اور تم مجھے ہنستی ہوئی زہر لگتی ہو۔" مجھے نہ جانے کیوں اس پر غصہ آ گیا تھا۔ شاید یہ

میری فطرت تھی۔ میں کھانے کے معاملے میں اسی طرح بے تاب ہو جایا کرتا تھا۔ ویسے مجھے دو دن کھانے کو نہ ملے تو احساس نہیں ہوتا تھا مگر یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اب کھانا آنے والا ہے اس میں تاخیر ہو تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔

"ارے ٹہلنے سے تو پیٹ کا خلا اور بڑھ جائے گا۔" گوشی نے پھر مجھ پر چوٹ کی۔ وہ مسلسل مجھے تنگ کر رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ یہ بھی ایک کمزوری ہے۔ میری اس کمزوری سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اپنی اس کمزوری پر قابو پاؤں۔ وانگ یو کہتا تھا کہ انسان کی یہی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں اسے بعض اوقات ناقابل تلافی نقصان پہنچاتی ہیں۔ جب بھی انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ مجھ میں یہ کمزوری ہے وہ اس پر فوری طور پر قابو پا لے تو کامیاب ہو سکتا ہے ورنہ اگر یہ سوچ لیا جائے کہ اس پر قابو پانے کی کوشش کروں گا تو وہ کمزوری کبھی دور نہیں ہوتی کیوں کہ وہ آئندہ کبھی نہیں آتا۔ یہی سوچ کر میں نے خود پہ جبر کر کے گوشی سے کہا۔ "تمہیں تو بھوک نہیں لگ رہی ہے نا!"

"میں بھوکی ضرور ہوں مگر صرف کھانا کھاؤں گی۔ تمہاری طرح کسی انسان کو نہیں کھاؤں گی۔"

"اور اگر فوری طور پر کھانا نہ ملے تو؟" میں نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"تو کیا میں ابھی مزید دو چار گھنٹے بھوکی رہ سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے' سردار جی اس وقت جو کھانا لا رہے ہیں۔ میں اس میں سے تمہیں ایک لقمہ بھی نہیں دوں گا۔" میں نے بمشکل تمام ہنسی روکی۔ "تم تو چار گھنٹے بعد بھی کھا سکتی ہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس وقت شام کے پانچ بج رہے ہیں۔ کھانا اس وقت تیار نہیں ہے اور جو کچھ بچا کھچا موجود ہے وہ میرے لئے بھی ناکافی ہو گا۔"

"تمہارے لئے تو میں دو دن مزید بھوکی رہ سکتی ہوں۔" گوشی نے محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے اس انداز پہ میں اپنی کھوپڑی سہلا کر رہ گیا اور جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دیوار میں سرسراہٹ ہوئی پھر مجھے دیوار میں مستطیل خلا دکھائی دیا اور دوسرے ہی لمحے سردار جی کا چہرہ سامنے آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ ان کے ہاتھ پہ کھانے کی ٹرے ہو گی مگر وہ تو خالی ہاتھ آئے تھے۔ میں بری طرح جھنجلا گیا اور غصے میں سردار جی سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ مستطیل سے گزر کے کمرے میں آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے کئی شاپنگ بیگز تھے۔

"اوئے کاکا! ناراض نہ ہونا۔ اصل میں میرے پاس کچھ اہم قسم کے مہمان آ گئے تھے اس لئے دیر ہو گئی کیسینو کے کسی بھی شخص کو میں یہاں بھیجنا نہیں چاہتا تھا۔" سردار جی

نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں تو یہ سمجھ رہا کہ آپ کھانا لے کر نہیں آئے ہیں کیوں کہ بہ ظاہر مجھے آپ کے دونوں ہاتھ خالی نظر آ رہے تھے۔"

"سردار جی، اس وقت اگر آپ کھانا نہ لائے ہوتے تو یہ شاید آپ ہی کو کھا جاتے۔" گوشی نے شوخ لہجے میں کہا۔

"لے، مجھے کیوں کھاتا، پتر پہلا نمبر تو تیرا تھا۔"

"چھوڑیں سردار جی۔" میں نے کہا۔ "آپ کھانا نکالیں۔ انہوں نے ایک تھیلے میں سے کئی لنچ باکس برآمد کیے۔ میں نے جب پانی کے لئے کہا تو سردار جی ہنس کر بولے۔ "اوئے تمہارے بیڈ کے ساتھ ہی تو فریج رکھا ہے۔ اسے آن کر لیتے اور پانی بھر کے رکھ لیتے۔"

ان کے کہنے پر میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ بیڈ ہی کے کلر کا فریج تھا۔ یورپ میں ایسے بیڈ روم سیٹ عام ہیں جن کے ساتھ اسی سے میچ کرتا ہوا فریج بھی ہوتا ہے۔ میں پہلی نظر میں اسے کیبنٹ سمجھا تھا۔ گوشی نے شاید اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا بلکہ میرا خیال ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی کھا گیا تھا۔ گوشی اس دوران میں فارغ ہو چکی تھی اور عجیب سے انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ فریج میں سے بوتل نکال کر وہ باتھ روم سے پانی بھی لے آئی تھی۔ کھانا کھا کے میں نے پانی پیا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔ سردار جی ایک کرسی پر بیٹھے بیئر سے شغل کر رہے تھے۔ انہوں نے بیئر کا ایک ٹن مجھے بھی آفر کیا مگر میں نے ان سے معذرت کر لی اور کہا۔ "سردار جی، میں ابھی تک اس "نعمت" سے محروم ہوں۔"

"ہئکے بھئی، تو تو پکا مسلمان ہے کاکا!" سردار جی نے توصیفی انداز میں کہا۔

میں نے ان سے پوچھا۔ "سردار جی، اب بتایئے کہ کل کیا ہوا تھا؟"

"میں نے تجھے جان بوجھ کر نہیں بتایا تھا ورنہ تو کھانا بھی نہیں کھاتا۔" سردار جی نے افسردگی سے کہا۔

"کیا ہوا سردار جی!" میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "سب خیریت تو ہے نا!"

خیریت نہیں ہے کاکا!" سردار جی نے کہا۔ "کل بہت نقصان ہو گیا ہے۔ ان بدبختوں نے ماسٹر کو گولی مار دی۔"

"کیا مطلب؟" میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا انہوں نے اینڈریو کو مار دیا؟" میں نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"حوصلہ کر کے سن کاکا!" سردار جی نے کہا۔ "ماسٹر کا کوئی ساتھی زخمی حالت میں اسپتال میں بھی تھا۔ پولیس اس سے بیان لینے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ بچ نہ سکا۔

"کیا..... بوبی بھی....."

"ہاں، شاید اس کا نام یہی تھا۔" سردار جی نے کہا۔ "وہ بے چارہ بے ہوشی ہی کی حالت میں مر گیا۔ پھر بدمعاشوں نے اس لڑکی کو اٹھا لیا جو اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ آج صبح اس کی لاش بھی کوڑے کے ایک ڈھیر سے ملی ہے۔ ایسا لگتا ہے کاکا، جیسے اسے زینکو نے ہلاک کیا ہے۔ زینکو مارنے کے بعد اپنے معتوبین کے دونوں کان کاٹ لیتا ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ اس لڑکی کی زینکو سے کیا دشمنی تھی؟"

"اور اینڈریو..... اسے کیا ہوا تھا؟"

"یہاں سے جانے کے بعد ماسٹر شاید اپنے اسی دوست کو دیکھنے ہاسپٹل گیا تھا۔ وہ یہاں آ رہا تھا کہ دشمن اس کے پیچھے لگ گئے، پھر انہیں یہ بھی اطلاع مل گئی تھی کہ ماسٹر یہاں کسی نوجوان اور لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ ماسٹر کو چند منٹ کی تاخیر ہو گئی ورنہ شاید وہ نہ مرتا، مرتے مرتے بھی اس نے دشمنوں کے کئی آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس حملے میں میرا شیر اجیت سنگھ بھی کام آ گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے تم لوگوں کو یہاں پہنچایا تھا۔ پھر پولس نے میرے کیسینو پر ہلہ بول دیا مگر انہیں یہاں سے کچھ بھی نہ مل سکا۔ میں نے اس بی بی کا ہیٹ اپنے کیسینو کی ایک لڑکی کو پہنا دیا تھا اس لئے میں صاف مکر گیا کہ یہاں کوئی نہیں آیا اور مجھے تو علم بھی نہیں ہے کہ یہ سب چکر کیا ہے۔ میں نے پولیس سے کہا کہ میرے آدمی نے بدمعاشوں کو روکنے کی کوشش کی تھی کیوں کہ اس کا کام ہی یہ تھا۔ وہ لوگ نہیں مانے تو اس نے فائر کھول دیا۔"

میں کافی دیر تک سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ گوشی بھی سہم کر رہ گئی تھی اور ٹکٹکی باندھے سردار جی کو دیکھ رہی تھی۔ کافی دیر بعد میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "سردار جی! مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے اتنے لوگ مارے گئے مگر میرے افسوس کرنے سے وہ لوگ واپس تو نہیں آ جائیں گے۔ آپ بھی میری وجہ سے مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں سردار جی، بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔" میں نے بہ مشکل تمام آنسو روکے۔

"فکر نہ کر اوئے۔" سردار جی نے خالص لاہوری لہجے میں کہا۔ "جدوں تک ہرنام سنگھ زندہ اے، توں کلا کس طرح ہو سکتا اے کاکا!"

"نہیں سردار جی!" میں نے جواب دیا۔ "میں اب آپ کو مزید مصیبت میں نہیں ڈالوں گا۔ میں آج ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"او پاگلا!" سردار جی نے شفقت بھرے انداز میں کہا۔ تجھے ساری عمر تو ادھر نہیں رہنا ہے مگر ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ ایک دو دن صبر کر لے، میں خود تجھے یہاں سے باہر نکال دوں گا۔" پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں اب چلتا ہوں۔ پولس کے آدمی بار بار یہاں چکر لگا رہے ہیں۔" یہ کہہ کر سردار جی بوجھل قدموں سے باہر نکل گئے اور کمرے کا خلا پھر برابر

ہو گیا۔

کتنا عظیم تھا وہ انسان! یہ جانتے بوجھتے کہ میری وجہ سے اس پر مصیبت نازل ہوئی ہے' اس کا ایک آدمی مارا گیا ہے اور مزید مصیبتیں بھی نازل ہو سکتی ہیں' وہ میری مدد کرنے پر آمادہ تھا مگر اب مجھے کسی کی مدد کی پرواہ نہیں تھی۔ میں سردار جی کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک یونہی گم سم بیٹھا رہا۔

"کیا سوچ رہے ہو خرم؟" گوشی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"اب سوچنے کے لئے رہ ہی کیا گیا ہے۔ ایک ایک کر کے میرے تمام ساتھی موت کو گلے لگا چکے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ جئے جا رہا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے گوشی کہ تمہیں آج ہی تمہارے باپ کے پاس بھجوا دوں گا۔"

"نہیں خرم!" گوشی نے اٹل لہجے میں کہا تو میں حیرانی سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ "میں اب اپنے باپ کے پاس جانا نہیں چاہتی۔ اس کے نزدیک اپنی بیٹی کی تو اہمیت ہے' دوسروں کی بیٹیوں کو ہلاک کر کے وہ ان کے کان کاٹتا ہے اور انہیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینکوا دیتا ہے۔ اسے اپنا باپ کہتے ہوئے بھی مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔ مجھے یہ تو اندازہ تھا کہ میرا باپ برا آدمی ہے وہ ناجائز ذرائع سے دولت کماتا ہے' اسمگلنگ اور چور بازاری کرتا ہے مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ اتنا شقی القلب ہے۔ نہیں خرم! میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔" گوشی کا چہرہ غصے کی شدت سے تمتا رہا تھا۔

"یہ تو تمہارے باپ کے ظلم کی ایک جھلک ہے بے بی!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ہانگ کانگ کے لوگ تو اس کے تصور سے بھی سہم جاتے ہیں۔ شاید اسی لئے اس نے تمہیں کیلیے فورنیا بھیج دیا تھا تاکہ تم اس سے متنفر نہ ہو جاؤ۔"

"کچھ بھی ہو' میں اب اپنے باپ کے پاس جانا نہیں چاہتی۔" گوشی نے ضدی بچوں کی طرح کہا۔

"تو پھر ایسا کرو' تم واپس کیلیے فورنیا چلی جاؤ۔"

"میں لعنت بھیجتی ہوں کیلیے فورنیا پر۔" وہ بپھر کر بولی۔ وہاں بھی تو میرے باپ ہی کا پیسہ بھی اپنی ذات پر لگانا جرم سمجھتی ہوں۔ اب میں جو کچھ کروں گی خود کروں گی۔"

"بہرحال' میری طرف سے تم آزاد ہو۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "جہاں دل چاہے چلی جاؤ۔"

"اور تم! تم کہاں جاؤ گے؟"

"میں اپنے ملک لوٹ جاؤں گا۔ وہاں میری بہن ہے' دوست ہیں اور سب سے بڑھ کر میری بیوی ہے۔"

"تمہاری بیوی؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا۔ "مگر

تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہاری اب تک شادی ہی نہیں ہوئی ہے۔"

"ہاں' یہ سچ ہے کہ میری اب تک شادی نہیں ہوئی ہے مگر کلارا نے اس سے پہلے مجھ پر بیویوں والا حق جتانا شروع کر دیا ہے۔"

"تمہاری ہونے والی بیوی کا نام کلارا ہے؟" گوشی نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا مسلمانوں میں بھی اس قسم کے نام ہوتے ہیں؟"

"وہ امریکن ہے اور ابھی تک مسلمان نہیں ہوئی ہے مگر میں شادی سے پہلے اسے مسلمان کر لوں گا۔"

گوشی نے طویل سانس لی اور شکستہ لہجے میں بولی۔ "اور تمہارے اس مشن کا کیا ہو گا جس کے لئے تم یہاں آئے تھے! کیا اتنے لوگوں کی قربانیوں کو ضائع کر دو گے۔ تمہی نے تو بتایا ہے کہ اس مشن کی تکمیل میں تمہارے کئی ساتھی کام آ گئے ہیں۔ کیا ان سب کا خون تمہری گردن پر نہیں ہو گا۔ اگر تم دل برداشتہ ہو کر ہتھیار ڈال دو گے خرم تو ان سب کا خون رائیگاں ہو گا۔ تمہارا ضمیر ہمیشہ تمہیں کچوکے لگاتا رہے گا کہ جب منزل دو چار ہاتھ کے فاصلے پر تھی تو تمہارا حوصلہ جواب دے گیا۔ تمہارے ساتھی کیا کرائے کے آدمی تھے؟ نہیں خرم وہ محض تمہاری وجہ سے اپنی جان پر کھیل گئے' اب تم اس مشن ہی کو نامکمل چھوڑ کر جا رہے ہو۔"

"خاموش ہو جاؤ گوشی۔" میں اتنی زور سے چیخا کہ میرے حلق میں خراشیں پڑ گئیں۔ "پلیز کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاؤ اور مجھے کچھ سوچنے دو۔" میں نے وحشت زدہ لہجے میں کہا اور عالم اضطراب میں اٹھ کے ٹہلنے لگا۔

گوشی ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ ان کاغذات اور مائیکرو فلمز کی وجہ سے بہت لوگ اپنی جان سے گئے تھے۔ اس کی ابتداء وانگ یو سے ہوئی تھی' پھر وانگ یو پر حملہ کرنے والے بھی انہی کاغذات کی وجہ سے مارے گئے۔ رضوانہ ماری گئی' شہلا کو باپ بن کر پالنے والے بھی انہی کاغذات کی بھینٹ چڑھے۔ برڈ اور بوبی مارے گئے' اسی لپیٹ میں پنکی بھی آ گئی اور اجیت سنگھ بھی۔ اینڈریو بھی اس وجہ سے جان ہار بیٹھا۔ اتنے لوگوں کی قربانیاں لینے کے بعد میں کہہ رہا تھا کہ میں اس مشن کو ادھورا چھوڑ دوں گا۔ یہ تو خود غرضی بلکہ کمینگی کی انتہا تھی۔ اس کا احساس بھی مجھے ایک ایسی لڑکی دلا رہی تھی جو میرے پاس یرغمال تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا' تم پر لعنت ہو خرم! تم حیوانوں سے بھی بدتر ہو۔

"سوری گوشی!" میں نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں اپنے ساتھیوں کی قربانیوں کو ضائع نہیں کروں گا۔"

"میں بھی اس مشن میں تمہارے ساتھ ہوں خرم!" گوشی نے جذباتی انداز میں کہا۔ "میں اپنے باپ کی ناانصافیوں اور ظلم و زیادتی کی تلافی اسی طرح کر سکتی ہوں کہ اسے نقصان

پہنچاؤں اور میں ضرور ایسا کروں گی۔"

"میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں تیزی سے یہ سوچ رہا تھا کہ زینکو سے رابطہ کیسے کیا جائے' پھر گوشی کا بھی مسئلہ ہے۔ وہ اپنے باپ کے پاس جانے پر رضامند نہیں تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنا مطلب نکلنے کے بعد اسے زمانے کی ٹھوکروں میں چھوڑ دوں۔ مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ضدی لڑکی ہے اور جو کچھ کہتی ہے' پھر اسی پر قائم بھی رہتی ہے۔ اونہہ دیکھا جائے گا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میں گوشی کو راضی کروں گا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ ہی رہے۔

"کیا سوچ رہے ہو خرم؟" گوشی نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا' پھر اچانک بولی۔ "کیا کلارا بہت خوبصورت ہے؟" اس کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی۔

"ہاں گوشی' کلارا واقعی بہت خوبصورت ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر تم لوگ تو چار چار شادیاں بھی کر لیتے ہو۔" اس کے انداز میں بچوں کی معصومیت تھی۔

"ہاں کر لیتے ہیں مگر صرف وہی لوگ جو چار شادیاں افورڈ کر سکتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا تم نہیں کر سکتے؟" اس نے بھولپن سے پوچھا۔ "اب تم اتنے بھی قلاش نہیں ہو گے؟"

"بات قلاش یا دولت مند ہونے کی نہیں ہے گوشی۔" میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ امریکن لڑکیاں دوسری بیوی کا وجود برداشت نہیں کر سکتیں۔ کلارا بھی امریکن ہے اور اب تو پاکستان میں بھی دوسری شادی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

"اچھا مت کرو مجھ سے شادی مگر مجھے ملازمہ کے طور پر تو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو؟" اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"یہ سب باتیں ابھی قبل از وقت ہیں گوشی!" میں نے اس موضوع کو ختم کرنا چاہا۔ "ممکن ہے اپنے ساتھیوں کی طرح میں بھی اس مشن میں کام آ جاؤں۔"

"پلیز خرم!" گوشی رو دینے والے انداز میں بولی۔ "مت کرو ایسی باتیں۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ گوشی! تم نے آخر مجھ میں ایسی کون سی بات دیکھ لی ہے۔ میں نے تمہیں اغواء کیا' اپنی قید میں رکھا اور تم....."

تم نے مجھے اغواء بھی کیا ہے تو کسی نیک مقصد کی خاطر۔ میں تین دن سے تمہارے قبضے میں ہوں مگر اب تک میری عزت محفوظ ہے۔ مجھے تمہاری شرافت نے اسیر کر لیا ہے خرم! میں نے مسلمان اس سے پہلے بھی دیکھے ہیں' ان سے ملی ہوں مگر ان میں اور ایک غیر

مسلم میں ذرا برابر فرق نہیں دیکھا۔ تم پہلے آدمی ہو جو میرے حسن سے متاثر نہیں ہوئے۔ ممکن ہے یہ میری خوش فہمی ہو کہ میں بہت حسین ہوں۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"ایسی بات نہیں ہے گوشی!" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو۔ کوئی بھی مرد تمہارے حسن و دلکشی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں بھی تم سے متاثر ہوا ہوں۔ مگر میرا مقصد کچھ اور ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری عزت پر آنچ آئے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ جب تک تم میرے ساتھ رہو گی' تمہاری عزت محفوظ رہے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں اب تک اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے باپ سے کہاں رابطہ ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسی جگہ جہاں سے وہ ہمیں ٹریس نہ کر سکے۔"

"میرے علم میں تو ایسی کوئی جگہ نہیں ہے مگر ایک ترکیب ہے۔ اس نے پرخیال انداز میں کہا۔ "تم اسے فون کرو اور دھمکی دو کہ اگر تم نے مجھے گزند پہنچانے کی کوشش کی تو میرے ساتھی تمہاری بیٹی کو بالکل اسی طرح ہلاک کر دیں گے جیسے تم نے پنکی کو کیا تھا۔ پھر اس کی کلن کٹی لاش بھی تمہیں کوڑے کے کسی ڈھیر پر پڑی ملے گی۔"

اس کی بات سن کر میری آنکھیں چمکنے لگیں۔ یہ سامنے کی بات آخر میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی تھی۔ میں نے کہا۔ "میں آج ہی اس سے بات کرتا ہوں۔ اگر وہ واقعی تم سے اتنی محبت کرتا ہے تو مجھے ٹریس کرنے کی کوشش ہی نہیں کرے گا' ٹریس کر بھی لیا تو دور دور سے میری نگرانی کرائے گا۔"

اچانک انٹرکام کا بزر بول اٹھا۔ میں نے بڑھ کر انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا اور خاموشی سے انتظار کرنے لگا۔ میں کسی بھی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ ممکن ہے دوسری طرف پولیس کا کوئی آدمی ہو۔

"کاکا خرم!" سردار جی کی آواز انٹرکام پر ابھری۔ "پتر پھر سو گیا کیا؟"

"نہیں سردار جی' میں جاگ رہا ہوں' کوئی خاص بات؟"

"ہاں کاکا" میں فوٹوگرافر کو لے کر آ رہا ہوں تاکہ تم دونوں کے نئے پاسپورٹ بن سکیں۔"

سردار جی کے پیچھے پیچھے ادھیڑ عمر کا ایک آدمی بھی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پیشہ ور فوٹوگرافرز کی طرح کیمرہ تھا اور شانے سے بڑا سا ایک بیگ لٹک رہا تھا۔

"کاکا" یہ آنند صاحب اپنے فن کے ماہر ہیں۔ یہ بہترین فوٹوگرافر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین میک اپ مین بھی ہیں۔ یہ تم دونوں کے چہروں میں ایسی تبدیلی کر دیں گے کہ تمہارے نزدیکی جاننے والے بھی تمہیں پہچان نہیں سکیں گے۔"

آنند صاحب نے اپنا بیگ کھولا اس میں سے انواع و اقسام کی کریمز' لوشن' وگز اور میک

اپ کا دوسرا سامان نکال کر بیڈ کے سائیڈ پر جما دیا۔ آنند نے پہلے گوشی کو اشارہ کیا کہ پہلے آپ اپنا میک اپ کرا لیں۔

آنند نے اپنے تھیلے سے مختلف قسم کی مزید پندرہ سولہ وگز نکالیں اور بغور گوشی کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے اپنے بیگ سے کوئی بوتل نکالی اور گوشی کے بالوں پر اسپرے کرنے لگا۔ دس منٹ کے اندر اندر اس کے سیاہ بال سنہرے ہو گئے۔ پھر اس نے کانٹیکٹ لینز گوشی کی آنکھوں پر لگائے تو اس کی آنکھیں بھی براؤن ہو گئیں پھر چہرے پر سنہرے فریم کا خوبصورت چشمہ لگانے کے بعد میں بھی گوشی کو نہ پہچان پایا۔ ان تبدیلیوں سے اس کی پوری شخصیت ہی تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر اس نے پندرہ بیس منٹ مجھ پر بھی محنت کی تو میں نے باتھ روم میں جا کر آئینہ دیکھا تو بری طرح اچھل پڑا۔ می ے رے سامنے لائٹ براؤن بالوں اور مونچھوں اور نیلی آنکھوں والا کوئی امریکن کھڑا تھا۔ میں اس کے فن کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

پھر اس فوٹوگرافر نے مختلف زاویوں سے ہماری کئی تصویریں بنائیں اور اپنا سامان سمیٹ کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد سردار جی نے مجھ سے کہا۔ "کاکا! تجھے کل یہاں سے نکلنا پڑے گا کیوں کہ لڑکی کی تلاش بڑے پیمانے پر شروع ہو چکی ہے۔"

میں سردار جی کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میرے ساتھ زینکو کی بیٹی ہے اور وہ آج کل سب کام چھوڑ کر صرف اپنی بیٹی کو تلاش کرا رہا ہو گا۔ نہ صرف اس کے آدمی بلکہ پولیس اور دیگر سرکاری ایجنسیاں بھی حرکت میں ہوں گی۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سردار جی نے کہا۔ "کاکا! تو واقعی نر بچہ ہے۔ تو نے کڑی تو بھی اٹھائی ہانگ کانگ کے سب سے زیادہ خطرناک آدمی کی۔"

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ انہوں نے یہ جملہ اردو میں کہا تھا اس لئے گوشی لاتعلقی سے ان کا منہ دیکھتی رہی۔ میں نے حیرت سے کہا۔ "سردار جی! آپ کو معلوم تھا کہ یہ کس کی بیٹی ہے؟"

سردار جی طنزیہ انداز میں ہنسے اور بولے۔ "او کاکا! ہم بھی اسی تالاب کی مچھلی ہیں۔ ہمیں بھلا معلوم نہیں ہو گا کہ یہ کس کی بیٹی ہے۔" پھر وہ موضوع بدل کر بولے۔ "تم لوگوں کے پاسپورٹ اور ویزے کل تک تیار ہو جائیں گے۔ کل تم شام کی فلائٹ سے انڈونیشیا کی طرف نکل جاؤ۔ جکارتہ میں میرے کچھ دوست ہیں۔ وہ تمہیں بوٹ کے ذریعے وہاں سے آگے نکال دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ ہمارا جواب سنے بغیر وہاں سے نکل گئے۔

"خرم! یہاں سے جانے کے بعد ہمارا مشن کیسے پورا ہو گا؟" اس نے "ہمارا مشن" کہہ کر خود کو میرے ساتھ شریک کر لیا تھا۔ "سردار جی کو منع کر دو۔ ہم ابھی یہاں سے کہیں

نہیں جائیں گے۔"

"میں کچھ اور سوچ رہا ہوں گوشی!" میں نے کہا۔ "ہم وہاں سے بھی تو تمہارے باپ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ وہاں ہم زیادہ محفوظ ہوں گے۔ میں اس سے کہوں گا کہ وہ تمام چیزیں لے کر پاکستان پہنچ جائے۔ اس کی بیٹی اس کے حوالے کر دی جائے گی۔"

"تو کیا تم مجھے پاکستان لے جاؤ گے۔" گوشی کی آواز مارے خوشی کے کانپ رہی تھی۔

"ہاں، اب پاکستان ہی میرے لئے سب سے زیادہ محفوظ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

دوسرے دن وعدے کے مطابق سردار جی نے ہمارے پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیئے۔ وہ امریکن پاسپورٹ تھے ہم دونوں کو میاں بیوی ظاہر کیا گیا تھا اور ان پاسپورٹوں کے مطابق ہم سیاحت کی غرض سے امریکہ، جاپان، سنگاپور اور ہانگ کانگ ہوتے ہوئے اب انڈونیشیا جا رہے تھے۔ میں نے سردار جی سے کہا بھی کہ اگر یہاں انڈونیشیا کی بجائے پاکستان کا ویزہ ہوتا تو اچھا رہتا۔ سردار جی نے جواب دیا کہ فی الحال تمہارا پاکستان جانا مناسب نہیں ہے کیوں کہ زینکو علم ہو گیا ہے کہ اس کی بیٹی کے اغواء میں کسی پاکستانی کا ہاتھ ہے۔ اس کے آدمی پاکستان میں بھی موجود ہیں اور ہر مسافر کو بہت سختی سے چیک کر رہے ہیں۔"

"مگر یہاں سے نکلنا بھی تو مسئلہ ہو گا۔" میں نے تشویش سے کہا۔

"مسئلہ تو ہو گا مگر میرے آدمی تم لوگوں کو یہاں سے نکال دیں گے۔" سردار جی نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا۔ "پھر انہوں نے ایک ہوٹل کی رسید میرے حوالے کی جو کسی مسٹر اور مسز سائن کے نام تھی۔ انہوں نے بتایا کہ تم لوگوں نے ہوٹل فلوریڈا میں قیام کیا تھا۔ یہ اس کی رسیدیں ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ہوٹل کا عملہ بھی گواہی دے گا کہ یہ لوگ وہیں مقیم تھے۔ آج شام سات بجے تم لوگوں کو لفھنسا ایئرلائن سے فلائی کرنا ہے۔ تیاری کر لو۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "اور ہاں، یا کسی قسم کا ہتھیار اپنے ساتھ مت لے جانا۔ وہاں تمہیں ہر قسم کا ہتھیار مل جائے گا۔" سردار جی نے مجھے ایک خط بھی دیا جو انہوں نے اپنے کسی دوست سردار رنبیر سنگھ کے نام لکھا تھا جو جکارتہ میں مقیم تھا۔

○

ہم ایئرپورٹ پر پہنچے تو میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ مجھے اپنی موت کا خوف نہیں تھا' صرف یہ فکر تھی کہ اگر ہم لوگ پکڑے گئے تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

مجھے اس دن امریکن پاسپورٹ کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ہمارے پاسپورٹ دیکھتے ہی متعلقہ لوگوں نے اتنی جلدی ہمیں فارغ کیا کہ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو گئی تو شاید وہ زیر عتاب آ جائیں گے۔ ہم بہ خیر و عافیت جکارتہ کی فلائٹ پر سوار ہو گئے۔

جکارتہ میں سردار رنبیر سنگھ کا ایڈریس ڈھونڈنے میں ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ جب میں نے اسے سردار جی کا خط دیا تو اس نے پرتپاک انداز میں ہمارا خیرمقدم کیا اور خط پڑھ کر تو وہ گویا مارے خوشی کے پاگل ہو گیا۔ اس نے والہانہ انداز میں مجھے گلے لگا لیا اور بولا۔ ”تم نے زینکو کو زک پہنچائی ہے' تم واقعی بہادر آدمی ہو' سردار ہرنام سنگھ کسی عام آدمی کو میرے پاس بھیج ہی نہیں سکتا۔

ہم لوگ بہ مشکل تمام دو دن جکارتہ میں رہے' پھر سردار رنبیر سنگھ نے ہمیں بوٹ کے ذریعے وہاں سے نکال دیا۔ نہ جانے اس نے یہ بات مجھ سے کیوں خفیہ رکھی تھی کہ ہماری اگلی منزل کہاں ہو گی۔

بوٹ میں ہمارے صرف دو آدمی اور تھے مگر دونوں ہماری زبان سے ناآشنا تھے۔ وہ نہ انگلش سمجھتے تھے' نہ فرنچ' نہ جرمن۔ یہ تینوں زبانیں گوشی کو آتی تھیں۔ میں نے بھی اس پر زیادہ سر نہیں کھپایا اور بوٹ کے سفر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ آخر وہ کہیں نہ کہیں تو پہنچتے ہی۔ یہ ضرور تھا کہ وہ ہمارے کہنے پر بوٹ کو موقع دیکھ کر کسی جزیرے یا ساحل پر لنگر انداز کر دیتے تھے مگر سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگے رہتے تھے۔ یہ تو بہت بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ہم ایک طرح سے ان کی قید میں ہیں۔ گویا سردار رنبیر سنگھ نے ہمیں دھوکہ دیا تھا۔

اس دن بھی بوٹ ایک ساحل پر لنگر انداز تھی۔ میں اور گوشی ساحل پر ٹہل رہے تھے۔ وہ کوئی بے آباد جزیرہ تھا یا ممکن ہے آبادی رہی ہو۔ وہاں کی سرسبز و شاداب زمین دیکھ کر میں نے وہاں ایک دن رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ دونوں حسب معمول موت کے فرشتوں کی طرح ہمارے ساتھ تھے۔ میں ان سے بری طرح اکتا گیا تھا۔

ایک موقع پر میں نے آگے بڑھنا چاہا تو ان میں سے ایک ریوالور نکال کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور انتہائی توہین آمیز انداز میں مجھے ساحل کی طرف دھکیلا۔ میری کھوپڑی ایک دم گھوم گئی۔ میں نے نتائج کی پرواہ کیئے بغیر اس پر چھلانگ لگا دی اور ایک ہی وار میں اس کی گردن توڑ دی۔ دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی مگر مجھ پر تو خون سوار تھا۔ میں نے دوڑ کر اسے بھی دبوچ لیا۔ گوشی چیختی ہی رہ گئی مگر میں نے اسے بھی اس وقت چھوڑا جب اس کے سانس کی ڈوری ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے ان دونوں کی لاشوں کو وہیں چھوڑا اور گوشی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔

گوشی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خرم! یہ تم نے کیا کیا۔ اب بوٹ کون چلائے گا؟"

"تم پریشان مت ہو۔ اتنا عرصہ دیکھ دیکھ کر مجھے بھی کچھ تجربہ ہو گیا ہے فی الحال تو میں ذہنی سکون چاہتا ہوں۔ آؤ ذا آگے تک گھوم کے آئیں۔ دیکھو آگے جنگل کتنا ہرا بھرا ہے۔

میں ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اچانک جھاڑیوں میں جنبش ہوئی اور ایک عجیب الخلقت آدمی جھاڑیوں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔

اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی وحشت تھی اور اتنی سرخ ہو رہی تھیں گویا سرخ سرخ دو انگارے رکھے ہوں' جسم پر صرف ایک لنگوٹی تھی اور جسم بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے عجیب سی زبان میں کچھ کہا اور دانت بھینچ کر درندے کی طرح غراتا ہوا میری طرف لپکا۔ میں غیر شعوری طور پر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دانت نکوسے اور پھر مجھے پکڑنا چاہا۔ میں نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور اس کی ٹانگوں میں اپنی دائیں ٹانگ اڑا دی۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گرا مگر اسی پھرتی سے پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس بار وہ غضب ناک ہو کر میری طرف جھپٹا۔ میں نے پھر جھکائی دینا چاہی مگر شاید وہ میرا ارادہ بھانپ گیا تھا۔ اس نے بھی اتنی پھرتی سے اپنا رخ تبدیل کیا کہ مجھے حیران ہونے کا بھی موقع نہ ملا۔ اس نے میرے دونوں شانے دبوچ لئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے شکنجے میں جکڑ دیا ہو۔ اس خبیث کی گرفت اتنی ہی مضبوط تھی۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے مزید بھیانک ہو گیا تھا' منہ سے تعفن کے بھپکے اٹھ رہے تھے اور میں اس کے سامنے یوں کھڑا تھا۔ جیسے کسی پہلوان کے سامنے کوئی آٹھ دس سال کا بچہ! میں نے جھٹکا دے کر خود کو چھڑانا چاہا مگر مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ اگر میں نے مزید زور لگایا تو میرے دونوں شانوں کے جوڑ نکل جائیں گے۔ وہ کمبخت اپنے ہاتھوں کا دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا' مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یونہی مجھے پیس کر رکھ دے گا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میں مفلوج سا ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے اپنی بے بسی پر ہنسی بھی آئی کہ وانگ یو کا ناقابل تسخیر مرد آہن یوں چوہے کی طرح بے بس ہو گیا ہے کہ اب کسی بھی لمحے اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔ مجھے اپنے مرنے کا کوئی افسوس

نہیں تھا' افسوس تھا تو صرف اس بات کا کہ میں جس مقصد کے لئے پاکستان سے آیا تھا' وہ پورا نہیں ہوا۔

آہستہ آہستہ میرے حواس جواب دے رہے تھے۔ اس دیو نما آدمی نے اچانک مجھے زمین پر دے مارا۔ زمین پر گرنے سے مجھے شدید چوٹ لگی اور میں چند لمحے کے لئے بالکل ساکت ہو کر رہ گیا۔ شاید وہ دیو یہ سمجھا تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا ہوں اور یہی اس کی بھول تھی۔ میں چند منٹ تک یونہی ساکت و جامد پڑا رہا تاکہ میرے جسم میں کچھ توانائی آ جائے۔ اس دوران میں وہ مردود گوشی کی طرف بڑھ گیا تھا جو مارے خوف کے پہلے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔

میرے اوسان کچھ بحال ہوئے تو میں نے دیکھا' اس دیو نے گوشی کو کھلونے کی طرح دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا ہے اور جنگل کے گھنے حصے کی طرف جا رہا ہے۔ مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ میں گوشی کے ساتھ نہتا باہر کیوں نکل آیا۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی تو میری نظر درخت کی ایک سوکھی شاخ پر پڑی۔ میں ہمت کر کے اٹھا اور وہ شاخ اٹھا لی۔ وہ خاصی مضبوط لکڑی تھی اس کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس لکڑی سے اس دیو کا کچھ بگاڑ پاؤں گا۔ مجھے یہ بھی فکر تھی کہ اگر وہ ایک مرتبہ بھی اس گھنے جنگل میں داخل ہو گیا تو پھر اس پہ قابو پانا بہت مشکل ہو گا۔ یہ بھی خدشہ تھا کہ اس کے مزید ساتھی نہ ہوں یا اس کی بستی کہیں نزدیک ہی ہو۔ ایسی صورت میں گوشی کو اس سے چھڑانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا۔

میں لکڑی کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھام کر محتاط انداز میں اس کی طرف دوڑا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کے کدو سے سر پر ایک ہی بھرپور وار کر کے اسے ناک آؤٹ کر دوں گا مگر عین اسوقت وہ گھوم گیا۔ مجھے بالکل ایسا لگا جیسے اس کی کھوپڑی کے پیچھے بھی دو آنکھیں ہیں۔ میں بھی جھنجلا کر رہ گیا اور جو وار اس کے سر پر کرنا چاہتا تھا' وہ اس کے گھٹنوں پر کیا۔ اگر اس کے ہاتھوں میں گوشی نہ ہوتی تو میں اس کے چہرے یا سر ہی پر وار کرتا مگر وار اچٹ کے گوشی کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر بھی میں نے پوری قوت سے وار کیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کی ٹانگوں کی ہڈی ہی ٹوٹ جاتی مگر وہ صرف تلملا کر رہ گیا' پھر اس نے اپنے حلق سے بندر کی طرح لایعنی آوازیں نکالیں اور پیچھے ہٹ کر گوشی کو احتیاط سے زمین پر لٹانے لگا۔ میں اسے موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ نیچے جھکا تو میرے لئے وار کرنے کا بہترین موقع تھا۔ میں نے لکڑی کو دونوں ہاتھوں میں تولا اور پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ آگے پیچھے جھولنے لگا۔ میں اگر بڑھ کے پوری قوت سے اسے پیچھے نہ دھکیل دیتا تو وہ گوشی پر گرتا اور وہ نرم و نازک لڑکی اس کے بوجھ تلے پس کر رہ جاتی۔ حیرت تو مجھے اس دیو نما شخص پر تھی۔ اتنی بھرپور ضرب

اگر بیل کے سر پر بھی پڑی ہوتی تو اس کی کھوپڑی تڑخ گئی ہوتی مگر وہ منحوس اب بھی نہ صرف ہوش میں تھا بلکہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ البتہ اس کا تربوز نما سر پھٹ گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔ اس کا بھیانک چہرہ خون میں تر ہو کے مزید بھیانک لگ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے پوری قوت سے اس کے منہ پر کک ماری۔ ایسی آواز آئی جیسے سوکھی لکڑی چٹختی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ڈکراتا ہوا پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ میں نے طمانیت بھری سانس لی اور سر جھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ کبھی نہیں اٹھ سکے گا۔

مجھے خود پر حیرت ہوتی ہے کہ ایک انسان کی جان لینے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا تھا' پھر یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ بقاء کی جنگ لڑی۔ کسی کی جان بھی لی تو اپنی یا اپنے وطن کی بقاء کے لئے۔ میری سرکشی اور خون ریزی میں سب سے بڑا ہاتھ میری ماں کا تھا۔ لوگوں کے لئے ماں کا لفظ تقدس' عزت اور احترام کی علامت ہے مگر میرے لئے تو یہ لفظ جیسے انتہائی غلیظ گالی بن گیا تھا۔ میں جب دوسروں کی ماؤں کو دیکھتا تھا تو یہ احساس شدید ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے مگر میری ماں تو مجھے جیتے جی ایک ایسے جہنم میں جھونک گئی تھی جو کبھی سرد ہی نہیں ہوتا۔ میرے سینے میں انتقام کا جو جوالا مکھی بھڑک رہا تھا اس کی شدت میں کمی ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں اپنی ماں کی آوارگی کا انتقام دنیا سے لے رہا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ میرے ان منہ زور جذبوں کا رخ ماما نے مثبت سمت میں موڑ دیا تھا۔ اس کا محرک میری بہن شہلا بھی تھی اور ذکیہ باجی بھی ورنہ میں یقیناً برائی کے راستے پر چلتا ہوا اتنی دور نکل جاتا کہ میرے لئے سب کچھ بے معنی ہو جاتا۔

اب تک نہ جانے کتنے لوگ میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر میرے ذاتی مفاد کی خاطر موت کی وادی میں اتر گئے تھے۔ اس لمحے نہ جانے کیوں مجھے گزری ہوئی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ شاہ کا خزانہ لوٹ کے بھلا میں نے وطن کی کیا خدمت انجام دی تھی؟ اس معرکے میں نہ صرف بہت سے لوگ میرے ہاتھوں مرے تھے بلکہ کئی افراد میری وجہ سے بھی مرے تھے۔ وانگ یو کے سلسلے میں بھی کئی افراد میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس وقت تو مجھے علم بھی نہیں تھا کہ اس بریف کیس میں اتنے قیمتی راز بند ہیں جن کی خریدار حکومتیں ہوں گی۔ میں انسانی خون بہا بہا کر اتنا تھک چکا تھا کہ اب زندگی ہی میرے لئے بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اب میری زندگی کا صرف ایک مقصد تھا کہ میں وطن کی امانت وطن کے لوگوں تک پہنچا دوں۔ میں اس وقت تک زندہ رہنا بھی چاہتا تھا کہ وہ کاغذات اور مائیکرو فلمز اپنی حکومت کے حوالے کر دوں ورنہ شاید مرنے کے بعد بھی میری روح بھٹکتی رہتی۔ مجھے اس وقت اپنی تنہائی کا بھی شدت سے احساس تھا۔ اسی پرخار راہ میں برڈ مجھ سے بچھڑا تھا اور اب بوبی بھی رستے کی دھول ہو گیا تھا۔ اب جو کچھ مجھے کرنا تھا تنہا

ہی کرنا تھا۔

میں نے اس دیو نما شخص پر نظر ڈالی جو کچھ دیر پہلے میری جان لینے کے درپے تھا۔ مگر ابھی میرا وقت پورا نہیں ہوا تھا ورنہ مجھے یقین ہے کہ وہ اس میں کامیاب بھی رہتا۔ اس وقت وہ ایک ایسے کھلونے کے مانند تھا جسے کسی ضدی بچے نے غصے میں آ کر توڑ پھوڑ دیا ہو۔ اس سے کچھ فاصلے پر گوشی پڑی تھی۔ وہ نازک اندام دوشیزہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں نے اسے تاوان کی خاطر اغواء کیا ہے' مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ میں اس ناسمجھ لڑکی کو کیسے سمجھاتا کہ اس کا باپ میرے خون کا پیاسا ہے۔ اس کا بس چلتا تو وہ زندہ حالت میں میری کھال کھنچوا لیتا۔

وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے گوشی کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور اپنی بوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہم لوگ بے خیالی میں بوٹ سے کافی دور نکل آئے تھے مگر گوشی کو اٹھا کر چلتے ہوئے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہو رہی تھی' مگر تھی تو صرف اس بات کی کہ راستے میں کسی سے ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ مجھے رہ رہ کر خود پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر بغیر ہتھیار لئے بوٹ سے اترنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

اچانک ایسی آاز آئی جیسے خشک پتے کسی کے قدموں تلے چرچراتے ہوں۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ آواز میری بائیں جانب سے آئی تھی۔ وہ آواز پھر آئی۔ میں بہت احتیاط سے پیچھے ہٹا اور گوشی کو لئے ہوئے آہستہ سے زمین پر بیٹھ گیا۔

گوشی کو احتیاط سے زمین پر لٹانے کے بعد میں بہ غور جھاڑیوں کو دیکھنے لگا۔ وہاں اب سوائے ہوا کی سرسراہٹ کے کوئی آواز نہ تھی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر خود پر غصہ آیا کہ بغیر کسی ہتھیار کے کیوں چلا آیا۔ جھاڑیاں اب بالکل ساکت تھیں۔ وہاں جو کوئی بھی تھا' شاید حملہ کرنے کے لئے کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ میں نے کسی ایسی چیز کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں جس کے ذریعے میں اپنا دفاع کر سکوں مگر وہاں کوئی ایسی چیز ہی نہ تھی۔ جس لکڑی سے میں نے اس دیو نما شخص کو زخمی کیا تھا' وہ بھی جلدی میں وہیں رہ گئی تھی۔ مجھ سے پے در پے غلطیاں ہو رہی تھیں۔ وانگ یو کہتا تھا کہ ایسا آدمی بہت جلد دشمنوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جس کا ذہن ہی حاضر نہ ہو۔ اس نے کہا تھا کہ اگر تمہارے ساتھ کبھی ایسا ہو تو بدحواس ہونے کی بجائے سکون سے اس صورت حال پر قابو پانا۔ بدحواس آدمی دشمنوں کے لئے لقمہ تر ہوتا ہے۔ میں نے سر جھٹک کر اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا اور پرسکون ہونے کی کوشش کی۔ میں گوشی کی طرف سے بھی فکرمند تھا۔ وہ کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتی تھی۔ وہ ہوش میں آ کر بے اختیار کچھ بولتی یا اٹھنے کی کوشش کرتی تو حملہ آور کی نظروں میں آ جاتی۔ میں نے سوچا' کاش میرے پاس ریوالور ہوتا۔

جھاڑیاں ایک مرتبہ پھر ہلیں اور ایسا لگا جیسے کوئی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا ہو۔ میں پھرتی

سے زمین پر لیٹ گیا اور چھپکلی کی سی تیز رفتاری سے ان جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ پھر ایسی آاز آئی جیسے کوئی خشک پتوں پر بھاگ رہا ہو۔ حملہ آور میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھے تو آدھی فتح تو یونہی ہو جاتی ہے۔ میں نے اٹھ کر ایک زقند لگائی اور جھاڑیوں کو عبور کر کے حملہ آور کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا۔ اسے دیکھ کر بے ساختہ میرا قہقہہ نکل گیا۔ وہ کوئی انسان نہیں بلکہ بندر تھا۔ میں نے طویل سانس لے کر بندر سے کہا۔ "ارے یار! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" جواب میں بندر نے دانت نکالے اور جھپٹ کے اوپر چڑھ گیا۔

میں ہنستا ہوا جھاڑیوں سے باہر نکلا اور اس طرف بڑھ گیا جہاں میں نے گوشی کو چھوڑا تھا۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ گوشی وہاں نہیں تھی۔ میں لپک کر آگے بڑھا تو مجھے کچی زمین پر انسانی قدموں کے نشان نظر آئے۔ وہ نشان ایک آدمی کے نہیں بلکہ ایک سے زیادہ آدمیوں کے تھے۔ پھر میں انہی نشانات کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ اس گھنے جنگل میں گوشی کی ب ازیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر گوشی مجھے نہ ملی تو میرے سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ پھر وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز مجھے کبھی نہ مل سکیں گی۔ اس وقت میرے اندر سے آواز آئی۔ تم کتنے خود غرض اور کمینے ہو خرم! اس وقت بھی تم اپنے ہی مطلب کی بات سوچ رہے ہو۔ ایک معصوم لڑکی کی جان اور آبرو خطرے میں ہے اور تمہیں اپنی پڑی ہے۔"

"نہیں' میں خود غرض نہیں ہوں۔" میں نہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ میں نے گوشی سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کروں گا اور میں نے کی۔ میں نے جان بوجھ کر تو اس سے دوسروں کے حوالے نہیں کر دیا۔"

اچانک ایک نسوانی چیخ سے جنگل کا سناٹا مجروح ہو گیا۔ چیخ میری دائیں طرف سے آئی تھی اور وہ آواز گوشی کی تھی۔ انسانی پیروں کے نشان بھی اسی طرف جا رہے تھے۔ میں دیوانہ وار اس طرف ڈھلوان میں اترتا چلا گیا۔

نیچے اترتے ہی میں نے انہیں دیکھ لیا۔ وہ تعداد میں تین تھے' تینوں ہی خاصے تند و مند اور وحشی تھے۔ ان میں سے ایک نے گوشی کو کندے پر اٹھا رکھا تھا۔ گوشی بری طرح مچل رہی تھی' ہاتھ پیر چلا رہی تھی مگر اسے اٹھانے والا یوں بے نیازی سے چل رہا تھا جیسے اس نے گوشی کی بجائے ننھی سی کسی بچی کو اٹھا رکھا ہو۔ وہ تینوں اپنے حلیے اور لباس سے جنگلی لگ رہے تھے۔ ان کے اوپری جسم برہنہ تھے۔ نچلے حصے پر انہوں نے دھوتی کی طرح کپڑا باندھ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھے اور بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ان میں سے کسی کی نظر ابھی تک مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ بھاگتے بھاگتے مجھے گرا ہوا

ایک درخت نظر آیا۔ میں نے اس میں سے مضبوط سی ایک شاخ توڑ لی اور اسے لے کر پھر ان کے پیچھے دوڑ پڑا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس شاخ کے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کرتا۔ اتنی دیر میں وہ لوگ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے۔

چلتے چلتے پھر ایک ڈھلوان آ گئی۔ وہ لوگ تیز رفتاری سے اس نشیب میں اتر گئے۔ میں وہاں تک پہنچا تو اچانک گوشی نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "خرم! مجھے ان لوگوں سے بچاؤ۔"

گوشی کے بولتے ہی وہ تینوں ٹھٹک کر رک گئے اور مڑ کر دیکھنے لگے۔ پھر ان تینوں نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "اس لڑکی کو کہاں لے جا رہے ہو؟"

وہ تینوں خاموشی سے مجھے تکنے لگے جیسے میری بات ان کے پلے نہ پڑی ہو۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا۔

ان میں سے ایک ایسی نامانوس زبان میں کچھ بولا جس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا۔

یہی غنیمت تھا کہ وہ رک گئے تھے۔ گوشی ابھی تک اس آدمی کے شانے پر تھی مگر اب مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں چند لمحوں میں ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ تینوں نیم دائرے کی شکل میں پھیل گئے ان کے نیزوں کا رخ میری طرف تھا۔ میں نے سوچا کہ اس قسم کے قبائل اپنے نیزوں اور خنجروں کو کسی مہلک زہر میں بجھاتے ہیں۔ ان کا لگایا ہوا وار بہت خوف ناک ہوتا ہے۔ اس کا زخم کبھی نہیں بھرتا اور آخر کار اس کی وجہ سے انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کی کہ اگر میری موت اسی طرح لکھی ہے تو کوئی اسے ٹال نہیں سکتا اور اگر ابھی میرا وقت پورا نہیں ہوا ہے تو یہ تین آدمی کیا' دنیا کی کوئی سپر طاقت بھی مجھے نہیں مار سکتی۔ یہ سوچ کر میں بالکل پرسکون ہو گیا اور درخت کی شاخ سنبھال کر ایک نئے اعتماد سے ان کی جانب بڑھا۔ حیرت تو مجھے اس شخص پر تھی جس کے کندھے پر گوشی تھی۔ اس نے گوشی کو بائیں ہاتھ سے سنبھال رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں نیزہ لئے مجھ پر حملے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔

پھر وہ وحشیانہ لہجے میں بولا۔ "اے تے کو دورا نو کو کو شاما!" مطلب اس کا کچھ بھی رہا ہو مگر میری سمجھ میں یہی آیا تھا..... "کو کو شاما..... کو کو شاما!"

میرے بائیں طرف والے جنگلی نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا اور اچانک مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میں بجلی کی تیزی سے زمین پر گرا اور قلابازی کھا گیا۔ حملہ آر اپنی ہی جھونک میں دوسری طرف نکل گیا مگر اس کی پھرتی قابل داد تھی۔ وہ اتنی تیزی سے مڑا کہ میں حیران رہ گیا۔ جنگلی جانوروں کا شکار کر کر کے وہ لوگ بہت پھرتیلے ہو گئے تھے۔ وہ مجھے بھی اسی

طرح شکار کرنا چاہ رہے تھے۔ اس نے پلٹ کر پھر مجھ پر حملہ کیا مگر اس دفعہ بھی اسے ناکامی ہوئی۔ اس کا نیزہ زمین میں اس جگہ دھنس گیا جہاں میں لیٹا تھا مگر ایک لمحے پہلے میں وہاں سے ہٹ چکا تھا۔ میں نے وہیں سے لیٹے لیٹے لات چلائی جو پوری قوت سے حملہ آور کے سینے پر پڑی۔ وہ ذرا سا لڑکھڑایا۔ میں نے اچھل کر اسے دوسری بھرپور لات ماری تو نیزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے جھپٹ کر نیزہ کھینچ لیا۔ یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ میں چاہتا تو حملہ آور کو اسی کے نیزے سے ہلاک کر سکتا تھا کیوں کہ اس کے دونوں ساتھی حملہ کرنے کی بجائے حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ بلاوجہ میں ان میں سے کسی کو بھی ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے وہی نیزہ اٹھا کر ہوا میں اچھالا اور اپنی دونوں ٹانگوں سے بیک وقت اس کے چہرے اور سینے پر وار کیا۔ وہ چیختا ہوا الٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ نہیں اٹھ سکے گا۔

اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر وہ دونوں نیزے لہراتے ہوئے ایک ساتھ میری طرف بڑھے۔ وہ زور زور سے "انکریو کاتو..... انکریو کاتو۔" قسم کا نعرہ لگا رہے تھے۔

"ابے کیا بکتا ہے' جسم پر دھجیاں لپیٹ رکھی ہیں اور ہینگر مانگتا ہے۔" میں نے انہی کے لہجے میں کہا۔ "ابے کہاں سے لاؤں ہینگر؟" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی دائیں جانب والے حملہ آور درخت کی جھاڑی دار شاخ اچھال دی۔ وہ بری طرح گر بڑا گیا۔ میں نے نیزے کے پچھلے سرے سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ میں نے اپنا ہاتھ ذرا نرم رکھا تھا ورنہ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو جاتی۔ وہ آگے پیچھے جھولا اور دھڑام سے زمین پر آ رہا۔

اب میرے مقابلے پر صرف ایک آدمی رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور وہ پھر "بندیئر ہاما....." قسم کی جناتی زبان میں نعرے لگا رہا تھا۔ پھر اس نے جھٹکے سے گوشی کو زمین کی طرف اچھال دیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ گوشی بلی کی طرح چاروں ہاتھ پیروں کے بل زمین پر گری۔ اس کے باوجود اسے اچھی خاصی چوٹ لگی ہو گی۔ کیوں کہ وہ گرتے ہی پہلو کے بل لڑھک گئی۔ حملہ آور گوشی کو پھینک کر غراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ قد آور اور زیادہ مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کا فولادی جسم کسی باڈی بلڈر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اچانک نیزہ میری طرف پھینکا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مجھ پر اس انداز سے حملہ آور ہو گا۔ بس میری قسمت ہی اچھی تھی یا پھر یہ میری ٹریننگ تھی کہ میں پلک جھپکنے میں پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ نیزہ سنسناتا ہوا میرے اوپر سے گزر گیا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ نیزہ میرے جسم کے آر پار ہو جاتا۔ زمین پر الٹتے ہی قلابازی کھا کر میں پھر کھڑا ہو گیا۔ اب اس جنگلی کے ہاتھ میں لمبے پھل والا دو دھاری خنجر تھا۔ خنجر دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس کی کمر سے لومڑی کی دم کی طرح کوئی چیز لٹک رہی تھی۔ اصل میں وہ دم نہیں بلکہ اس خنجر کا کیس تھا۔

وہ خنجر ہوا میں لہراتا ہوا وحشیانہ انداز میں میری طرف بڑھا۔ میں نے نیزے سے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور ایک دم نیزے پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے نیزہ اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ حملہ آور کے بازوؤں میں بلا کی طاقت تھی۔ میں نے پہلے سے زیادہ قوت سے زور لگایا تو اس نے اچانک نیزہ چھوڑ دیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنے ہی زور میں پیچھے کی طرف الٹ جاتا مگر میں ایسے انداز میں کھڑا تھا کہ مجھے معمولی سا جھٹکا لگا۔ یہ بھی وانگ یو کی تربیت ہی کا ایک حصہ تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اگر کسی حریف سے اس طرح کی کھینچاتانی ہو تو اس امکان کو بھی ذہن میں رکھو کہ وہ اچانک حرکت بھی کر سکتا ہے۔ نیزہ ایک مرتبہ پھر میرے ہاتھ میں تھا۔ حملہ آور اتنا جھنجلا گیا تھا کہ اس نے نیزے کی پرواہ کئے بغیر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ وہ نہ صرف طاقت ور تھا بلکہ انتہائی جی دار بھی تھا۔ اس نے خنجر سے میرے سینے پر وار کرنا چاہا تھا۔ میں نے نیزہ چھوڑ کر اچانک اس کی خنجر والی کلائی تھام لی۔ اس نے کلائی چھڑانا چاہی مگر کامیابی نہ ہوئی' ہو بھی نہیں سکتی تھی' یہ تو میرا پسندیدہ داؤ تھا۔ اگر وہ مزید زور لگاتا تو اس کی کلائی کا جوڑ ہی نکل جاتا۔ معا" اس نے بائیں ہاتھ سے میری گردن دبوچ لی۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے خود سے کہا۔ "خرم! بہت ہو چکی انسانی ہمدردی۔ اگر تو نے اب بھی دشمن کے ساتھ رعایت کی تو' تو بھی اس کے ساتھیوں کے ساتھ زمین پر لمبا لمبا لیٹا نظر آئے گا۔"

میرا ایک ہاتھ آزاد تھا۔ میں نے وہی ہاتھ اس کے چہرے پر رکھا اور پوری قوت سے اس کی ناک مروڑ دی۔ وہ درندے کی طرح غرایا ور میری گردن پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں نے اس کی کلائی پہ گرفت بڑھائی اور مخصوص انداز میں اسے جھٹکا دیا۔ چٹاخ کی آواز آئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے گر پڑا وہ چوٹ کھائے ہوئے سانڈ کی طرح پاؤں زمین پر پٹخنے لگا۔ میں نے یہ داؤ بارہا آزمایا تھا۔ اس کے بعد کسی حملہ آر میں مزید حملہ کرنے کی ہمت نہیں رہتی تھی مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہوا۔ پیر پٹختے پٹختے اس نے اچانک بائیں ہاتھ سے میرے چہرے پر اپنا گرز نما مکا دے مارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے سے ناچ گئے۔ اس نے دوسرا وار کیا تو اس کا ہاتھ میری گرفت میں آ گیا۔ میں نے جھنجلا کر اسے بھی جوڑ سے علیحدہ کر دیا۔ پھر اس کے گھٹنوں پر لاتیں مار کے اسے زمین پر گرا دیا۔

اس کے گرتے ہی گوشی بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ پھر وہ روتے ہوئے بولی۔ "خرم! پلیز یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ یہ کس دور کے لوگ ہیں! کیا اس سائنسی دور میں بھی انسان اس انداز میں رہ سکتا ہے؟"

"اب یہاں سے نکل چلو!" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ورنہ اور کچھ ہو نہ ہو اس

سائنسی دور میں ہم ضرور مارے جائیں گے۔" یہ کہہ کے میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسی طرف دوڑا جہاں سے یہاں تک پہنچا تھا۔ چلتے ہوئے میں وہاں سے خنجر اور ایک نیزہ لینا نہیں بھولا تھا۔

سورج بھی غروب ہونے ہی والا تھا۔ مجھے یہ بھی فکر تھی کہ اندھیرا پھیلنے کے بعد ہم یہاں بھٹک نہ جائیں۔ بھٹکنے کے امکانات تو اب بھی تھے مگر کم تھے۔ گوشی میرے ساتھ دوڑنے کی بجائے گھسٹ رہی تھی۔ وہ دوڑتے دوڑتے چیخ کر بولی۔ "آہستہ چلو خرم ورنہ میں بھاگتے بھاگتے مر جاؤں گی۔"

"یہاں رک گئیں تو کون سی زندہ رہو گی تم۔" میں نے بھاگتے بھاگتے کہا اور اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہاں قریب ہی کہیں جنگلیوں کی آبادی تھی۔ اگر ان سب نے ایک ساتھ ہلہ بول دیا تو وانگ یو کی ٹریننگ کام آئے گی نہ میری جمناسٹک! ان کے نیزے چشم زدن میں مجھے اور گوشی کو چھلنی کر دیں گے۔

بھاگتے بھاگتے گوشی کا پاؤں پھسلا اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ بری طرح ہانپتے ہوئے بولی۔ "اب..... مجھ سے..... بھی..... نہیں چلا جائے گا..... خرم!..... مجھے چھوڑ دو..... میں....."

"گوشی!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "خود کشی کرنا ہی ہے تو اس کے کئی آسان طریقے بھی ہیں۔ چھلنی ہو کے مرنے سے کیا فائدہ!"

گوشی کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے میرے طنز کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں موند کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

میں نے جھک کے اسے اٹھایا اور کندھے پر ڈال کے روانہ ہو گیا۔ گوشی بیچاری احتجاج ہی کرتی رہ گئی۔ میں پھر اسی رفتار سے بھاگنے لگا بلکہ اب تو میری رفتار پہلے سے زیادہ تیز تھی۔ اس تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا میں اس جگہ پہنچا جہاں میں نے گوشی کو بے ہوشی کی حالت میں لٹایا تھا۔

وہاں ٹھہر کر میں نے سمت کا تعین کیا پھر اسی تیز رفتاری سے بھاگنے لگا۔ ساحل ابھی بھی خاصا دور تھا۔

پھر میں اس جگہ پہنچا جہاں وہ دیو میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کی کھوپڑی سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا پھر میں وہاں پہنچا جہاں رنبیر سنگھ کے دونوں آدمی پڑے تھے۔ وہاں میں نے گوشی کو کندھے سے اتارا اور پھرتی سے ان دونوں کے ریوالور اپنے قبضے میں کر لئے۔ ریوالور ہاتھ میں آتے ہی میری آدھی پریشانی ختم ہو گئی۔ اب اگر کسی سے ٹکراؤ ہو بھی جاتا تو میں وقت ضائع کئے بغیر محض فائر کے دھماکے سے اسے راستے سے ہٹا دیتا۔

میں نے گوشی کو دوبارہ کندھے پر لادنے کی کوشش کی تو وہ جھنجلا کر بولی۔ ”میں ابھی معذور نہیں ہوئی ہوں‘ اپنے پیروں پر چل سکتی ہوں‘ سمجھے۔“

میں نے اسے چھیڑنے کو کہا۔ ”اچھا‘ اچھا تم چل بھی سکتی ہو! بڑی خوشی ہوئی یہ سن کر مگر ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہاری ٹانگوں کو کیا ہو گیا تھا؟“

”میرا مذاق مت اڑاؤ۔“ گوشی نے برا مانتے ہوئے کہا۔ ”میں ساری زندگی میں اتنی پیدل نہیں چلی ہوں جتنی تمہارے ساتھ چلی ہوں۔“

”اچھا‘ ذرا تیزی سے قدم اٹھاؤ ورنہ تمہیں پھر کندھے پر اٹھانا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو شروع سے ہی کہہ رہا ہوں کہ تم اپنے باپ کے پاس لوٹ جاؤ۔ تم ان صعوبتوں کی عادی نہیں ہو مگر تم.....“

”خرم!“ گوسی نے ہانپتے ہوئے شاکی لہجے میں کہا۔ ”کیوں مسلسل مجھے چڑکے لگا رہے ہو؟ تم نے مذاق میں ایک بات کہی تھی۔ میں نے اس کا جواب دے دیا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہوں۔ آئندہ مجھ سے ایسی طنزیہ بات مت کرنا۔“

”تم یہیں کھڑی روتی دھوتی رہیں تو ہم جیتی ہوئی بازی ہار جائیں گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں بھی تو مذاق کر رہا تھا۔ اگر تم برا مانتی ہو تو وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تم سے مذاق نہیں کروں گا۔“ میں نے مسکین سے لہجے میں کہا۔

گوشی روتے روتے بے اختیار ہنس پڑی اور بولی۔ خرم! میں سوچ رہی تھی کہ ان جنگلیوں سے تو تم آسانی سے نمٹ سکتے ہو کہ ان کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے مگر شہر کے ان مہذب جنگلیوں سے کیسے نمٹو گے جو تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔ ویسے میں نے آج تک تم سا بے جگر اور خوف ناک فائٹر نہیں دیکھا۔“ اس نے تعریفی انداز میں کہا۔

”فلموں میں بھی نہیں؟“ میں نے مسخرے پن سے پوچھا۔

”بکواس مت کرو۔“ وہ جھنجلا کر بولی۔ ”میں فلمیں نہیں دیکھتی۔“

”اگر تم نے فلمیں دیکھی ہوتیں تو یہ بات کبھی نہ کرتی۔“ میں نے کہا۔ ”فلم کا ہیرو تو اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو روک لیتا ہے۔ خالی ہاتھوں سے آدم خور شیر کا جبڑا چیر کر رکھ دیتا ہے‘ لات مار کے ریلوے انجن کو نہ صرف روک لیتا ہے بلکہ الٹ بھی دیتا ہے‘ پوری پوری فوج سے ہی ٹکرا جاتا ہے اور فوج کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے مگر وہی ہیرو نازک سی ایک ہیرون سے زیر ہو جاتا ہے۔ ہے نا افسوس کا مقام!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کر چکے بکواس!“ گوشی منہ بنا کر بولی۔ ”اگر مجھے کبھی موقع ملا تو ایک فلم ضرور بناؤں گی جس کے ہیرو تم ہو گے۔ پھر اپنی ساری حسرتیں پوری کر لینا۔“

اچانک میرے کانوں میں عجیب سے شور کی آاز آئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سے لوگ ایک سات مل کر چیخ رہے ہوں یا نعرے لگا رہے ہوں۔ ہم اس وقت قدرے بلند پر

تھے۔ میں نے جھانک کر نیچے دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ نشیب میں بے شمار جنگلی شور مچاتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ ان کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے' خنجر اور لاٹھیاں تھیں اور چہروں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"بھاگو!" میں نے وحشت زدہ انداز میں گوشی سے کہا اور ریوالور نکال کے اس کا چیمبر چیک کیا۔ ریوالور پوری طرح لوڈ تھا۔

میں نے اس کا سیفٹی کیچ بھی ہٹا دیا اور دیوانہ وار لانچ کی طرف دوڑ پڑا۔ اگر وہ دو چار یا آٹھ دس بھی ہوتے تو ان سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا مگر وہ تو بے شمار تھے۔ میں ان میں سے کتنوں کو مار سکتا تھا! آخرکار وہ ہم دونوں کی تکا بوٹی کر دیتے۔ وہ کیفیت ہماری زبان بھی نہیں سمجھتے تھے اسی لئے ہم اپنی صفائی میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اب نجات کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ جلد از جلد ہم لانچ تک پہنچ جائیں۔

گوشی نے کچھ دور تو میری طوفانی رفتار کا ساتھ دیا پھر وہ رکنے لگی' آخر ایک جگہ وہ منہ کے بل گر پڑی اور ہانپتے ہوئے بولی۔ "خرم پلیز! تم جاؤ' اپنی جان بچاؤ۔"

میں نیچے جھکا اور اسے اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ بھاگ نہیں سکے گی۔ اسے کندھے پر ڈال کے میں پھر اسی رفتار سے پورٹ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ لوگ لحہ بہ لحہ ہمارے نزدیک آتے جا رہے تھے اور مجھے لانچ نظر آنے لگی تھی مگر اب بھی وہ خاصے فاصلے پر تھی۔ اگر میں اسی رفتار سے بھاگتا رہتا تو شاید لانچ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ گو کہ اس کے امکانات اب کم تھے کیوں کہ گوشی کو اٹھانے ر وجہ سے میری رفتار میں فرق پڑ رہا تھا اور میرا سانس بھی اکھڑ رہا تھا مگر یوں حملہ آروں کے ہاتھ آنا بھی مجھے گوارہ نہیں تھا۔ بھاگتے ہوئے میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں کوئی ایسا طریقہ سوچ رہا تھا جس سے تھوڑی دیر کے لئے حملہ آوروں کی پیش قدمی رک جائے۔ مجھے اگر تھوڑا سا بھی وقت مل جاتا تو پھر وہ میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے مگر ایسا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آ رہات ھا۔

پھر ایک نئی افتاد نازل ہوئی۔ وہ مجھ پر تیر برسانے لگے۔ گو کہ وہ لوگ ابھی مجھ سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ان کا نشانہ صحیح نہیں لگ رہا تھا مگر جس تیزی سے وہ فاصلہ گھٹا رہے تھے اس سے مجھے امید تھی کہ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے اور گوشی کو چھلنی کر دیں گے۔

میں بھاگتے بھاگتے رکا اور ان کی طرف رخ کر کے ریوالور سے فائر کر دیا۔ زوردار دھماکے کی گونج دور تک سنی گئی ہو گی۔ حملہ آوروں کا شور یک لخت ختم ہو گیا۔ میں یہ دیکھنے کے لئے نہیں رکا کہ وہ لوگ رک گئے یا میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ گوشی کے چہرے کا رخ البتہ ان کی طرف تھا۔ اس نے بتایا کہ حملہ آروں میں بھگدڑ مچ گئی ہے اور وہ وحشت زدہ ہو کے واپس جا رہے ہیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا مگر ٹھہرا نہیں گوشی پھر سہمی ہوئی

آاز میں بولی۔ "خرم! وہ لوگ پھر ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں اور وہ..... وہ پھر.... ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔"

"تم ایسا کرو' یہ ریوالور رکھ لو۔" میں نے اپنا ریوالور اسے دیتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر بعد پھر ایک فائر کر دینا اور وقفے وقفے سے کرتی رہنا۔"

"مگر خرم! جب ہمارے ریوالور خالی ہو جائیں گے تو....."

"اس وقت تک ہم لانچ میں پہنچ جائیں گے۔ لانچ میں بہت اسلحہ ہے' اتنا ہے کہ میں اکیلا ہفتے بھر تک ان لوگوں کو روک سکتا ہوں کہ ان کے پاس سوائے نیزوں اور تیروں کے کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ بس لانچ تک پہنچنا شرط ہے' پھر ہم ان لوگوں سے محفوظ ہوں گے۔"

اسی طرف گوشی نے فائر کر کے دوسرا دھماکہ کیا۔ حملہ آوروں کا شور ایک مرتبہ پھر تھم گیا۔ گوشی نے رننگ کمنٹری کے انداز میں بتایا کہ حملہ آر ایک مرتبہ پھر رک گئے ہیں اور آپس میں کسی بات پر بحث کر رہے ہیں۔" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔ "وہ پھر ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔"

"اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے بھاگتے بھاگتے کہا۔ "اب اگلے پانچ منٹ میں ہم لانچ پر ہوں گے۔" میں نے لانچ سامنے دیکھ کر اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔

حملہ آروں کو بھی شاید احساس ہو گیا تھا کہ ہم ان کی پہنچ سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ بھی جوش و خروش سے ہمارا پیچھا کرنے لگے۔ اب تو وہ ریوالور کے دھماکوں سے بھی نہیں رک رہے تھے۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس دھماکے سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیوں کہ میری ہدایت کے مطابق گوشی ہوائی فائرنگ کر رہی تھی۔

پھر میں اس ساحل تک پہنچ گیا جہاں ہماری لانچ لنگر انداز تھی۔ لانچ تک جانے کے لئے مجھے کمر کمر تک پانی میں اترنا پڑا۔ میں ٹھنڈے یخ پانی میں اچھلتا ڈولتا بالاخر لانچ تک پہنچ ہی گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کم از کم آدھے گھنٹے تک بے حس و حرکت لیٹا رہوں کیوں کہ میں بری طرح تھک گیا تھا' حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے اور سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ پہلے میں نے لانچ کا انجن اسٹارٹ کیا پھر لنگر اٹھا کے انجن روم کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ حملہ آور کنارے پر پہنچ گئے۔ اس وقت تک لانچ ساحل سے کچھ فاصلے پر آ چکی تھی۔ میں نے چیخ کر گوشی سے کہا۔ "گوشی تم لانچ کو کنٹرول کر سکتی ہو؟"

"کام چلا سکتی ہوں۔" گوشی نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' تم انجن روم میں جاؤ اور لانچ کو کھلے سمندر میں لے جانے کی کوشش کرو' میں ان لوگوں سے نمٹتا ہوں۔"

گوشی بھاگتی ہوئی انجن روم میں چلی گئی۔ میں اپنے کیبن کی طرف دوڑا اور بریف کیس

سے رائفل کے پارٹس نکال کر اسے بجلی کی تیزی سے اسمبلڈ کیا اور کارتوسوں کا ایک ڈبہ لے کر دوڑتا ہوا دوبارہ عرشے پر آ گیا۔

کچھ حملہ آور پانی میں چھلانگیں لگا چکے تھے اور تیرتے ہوئے لانچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے انہیں دھمکانے کو ایک ہوائی فائر کیا مگر رائفل کی گرج پر ڈی رائفل سے بھی زیادہ تھی۔ فائر کے دھماکے کے باوجود وہ لوگ لانچ کا تعاقب کرتے رہے۔ میں نے سوچا جب تک ان میں سے کچھ زخمی نہیں ہوں گے۔ یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے اسٹیٹ فائر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

گوشی بہت مہارت سے لانچ کو کنٹرول کر رہی تھی اور لحہ بہ لحہ اسپیڈ بڑھاتی جا رہی تھی۔ لانچ تیز رفتاری سے کھلے سمندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جنگلیوں سے ہمارا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ لوگ لاکھ ماہر پیراک سہی مگر لانچ سے زیدہ تیز تو نہیں تیر سکتے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ اب وہ لانچ تک نہیں پہنچ سکیں گے تو میں نے انہیں نقصان نہ پہنچانے کا فیصلہ کیا اور رائفل شانے پر لٹکا کر انجن روم کی طرف بڑھ گیا۔

گوشی پسینے میں شرابور لانچ کے انجن سے الجھی ہوئی تھی۔ مجھے اس نازک دوشیزہ کو اس حال میں دیکھ کر افسوس بھی ہوا۔ زینکو نے اسے بہت ناز و نعم میں پالا تھا۔ اس نے تو شاید کبھی ہل کر پانی بھی نہ پیا ہو گا۔ اب وہی نازک اندام لڑکی کیسی صعوبتیں برداشت کر رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اسے میری آمد کا بالکل احساس نہ ہوا۔ وہ بہ دستور لانچ کے انجن سے نبرد آزما تھی۔ میں نے اسے ڈرانے کو بھاری آواز میں کہا۔
”کھیل ختم ہو گیا گوشی!“

میری آواز سن کر وہ اس بری طرح اچھلی گویا اس کا پاؤں بجلی کے ایسے ننگے تار پر پڑ گیا ہو جس میں زبردست کرنٹ دوڑ رہا ہو۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں اس کے لئے اجنبی ہوں۔

اسے چونکا کر میں خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ میں نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔ ”اتنی خوف زدہ کیوں ہو گئیں گوشی! میں خرم ہوں۔“ وہ اچانک بلک بلک کر رونے لگی۔ ”ارے ارے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تو مذاق کیا تھا۔ تم اتنی سنجیدہ ہو گئیں؟“

”تم شروع سے لے کر اب تک میرے ساتھ مذاق ہی کرتے آئے ہو خرم!“ اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری ہر بات مذاق ہے۔ تم نے مجھے مذاق ہی مذاق میں اغواء کیا۔ مذاق میں ہانگ کانگ سے نکالا اور اب مذاق میں.....“

”گوشی!“ میں ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ تم اپنے باپ کے پاس لوٹ جاؤ۔“

”ورنہ تم مجھ سے اسی قسم کے سنگین مذاق کرتے رہو گے؟“ اس کا لہجہ تلخ تھا۔

"تمہارا مطلب کیا ہے؟" میں نے بھی جھنجلا گیا۔ "میں نے کب کہا ہے کہ میں نے تمہیں مذاق میں اغواء کیا تھا۔ میں نے تمہیں جس مقصد سے اغواء کیا تھا اس سے تم اچھی طرح واقف ہو۔" میں نے بہ غور اس کا جائزہ لیا میرے سخت لہجے سے اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ "میں نے تم سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ تمہاری عزت پر آنچ نہیں آئے گی۔ میں اپنے اس وعدے پر بھی قائم ہوں۔ البتہ یہ وعدہ پورا نہیں کر سکا کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اس کے لئے میں تم سے معذرت خواہ ہوں کہ میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں۔"

"خرم پلیز!" گوشی چیخی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اب چھوڑو اس موضوع کو ورنہ خواہ مخواہ بات میں بات نکلتی رہے گی۔ مستقبل کے بارے میں سوچو اب ہمیں کہاں جانا ہے؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو گوشی!" میں نے کہا۔ "اب یہ سوچنا پڑے گا کہ ہمیں کہاں جانا چاہئے۔"

میرے ذہن میں سے یہ بات محو نہیں ہوئی تھی' بس وقتی طور پر بھول گیا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے اس بات پر غور کیا کہ اب مجھے کہاں جانا چاہئے؟ ہم اس وقت کھلے سمندر میں تھے۔ میں تو سمت کا تعین بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا سوچنے لگے خرم؟" گوشی نے مجھے چونکا دیا۔

"میں یہی سوچ رہا ہوں کہ اب یہاں سے ہمیں کہاں جانا چاہئے' پھر میں تو سمت کا تعین بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ لانچ میں فیول کتنا ہے' خوراک کا ذخیرہ ہے کہ نہیں۔ ہم ایسے بے خبری میں کب تک چل سکیں گے؟ ممکن ہے ہم کبھی خشکی تک پہنچ ہی نہ سکیں یا پھر بین الاقوامی سمندر کی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑے جائیں۔ تمہیں تو کسی نہ کسی طرح تمہارا باپ بچا لے گا۔ مارا تو میں جاؤں گا۔"

"تم بہت عقل مند بنتے ہونا! یہ بات تو تمہیں سردار رنبیر سنگھ کے آدمیوں کو ہلاک کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے تھی۔" گوشی نے طنز کیا۔

"کسی نہ کسی موقع پر ذہین سے ذہین آدمی کی عقل بھی خبط ہو جاتی ہے۔ میری عقل بھی اس وقت خبط ہو گئی تھی کہ ذہن میں بس یہ تھا کہ مجھے کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کی قید سے رہائی حاصل کرنا ہے۔" میں نے دور تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی مجھ سے اتنی بڑی غلطی ہوتی ہے کہ اس کا ازالہ بھی ناممکن ہوتا ہے۔ خیر' میں مایوس اب بھی نہیں ہوں۔ جب تک سانس تب تک آس۔" میں نے ہنس کر کہا۔

گوشی بے اختیار ہنسنے لگی اور بولی۔ ”لہجے سے تو تم بالکل مایوس لگ رہے ہو۔ بہرحال گھبراؤ مت‘ مجھے تو تم کسی قابل ہی نہیں سمجھتے نا مگر اب میں ہی تمہارے کام آؤں گی۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔ ”مجھے حیرت سے مت دیکھو۔ میں نے بچپن سے لانچ پر سفر کیا ہے۔ پھر میں نے لانچ چلانے کی باقاعدہ تربیت حاصل کی اور اب نقشے اور کپاس کی مدد سے میں دنیا کے کسی بھی علاقے میں جا سکتی ہوں۔ میں نے چیک کر لیا ہے۔ لانچ میں اتنا فیول ہے کہ ہم واپس جکارتہ پہنچ سکتے ہیں۔“

”مگر تمہیں کیا معلوم کہ اس وقت ہم کہاں ہیں اور جکارتہ کتنی دور ہے؟“

گوشی غرائی تم اس میپ کو کیوں بھول رہے ہو جسے جہاز راں استعمال کرتے ہیں‘ ویسا ہی ایک میپ یہاں بھی موجود ہے۔ ان لوگوں نے اس جزیرے پر نظرانداز ہونے کے بعد اسے میپ پر بھی انڈر لائن کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم جکارتہ سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ لانچ کے فیول کے علاوہ اتنا ہی فاضل فیول بھی موجود ہے جو کسی ایمرجنسی کی صورت میں ہمارے کام آ سکتا ہے۔ بس اب اگر سمندر رف نہ ہوا تو ہم صبح تک بہ خیریت جکارتہ پہنچ جائیں گے۔“

”اور اگر سمندر رف ہوا تو؟“ میں نے بچوں کی طرح پوچھا۔

”تو پھر ہمیں کہیں مچھلیوں کی خوارک بن جائیں گے۔“ گوشی نے اطمینان سے جواب دیا‘ پھر بولی۔ ”اب تم ذرا اچھی سی چائے بنالو۔ بھاگ بھاگ کے میرا تو حشر خراب ہو گیا ہے۔ برا مت ماننا خرم! اگر تم لانچ کو کنٹرول کر سکتے تو میں تم سے کبھی چائے نہ بنواتی‘ پلیز!“

”ارے بھئی اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے!“ میں نے خوش دلی سے کہا اور انجن روم سے باہر نکل گیا۔

مجھے واقعی برا لگا تھا۔ جو کام اس کے کرنے کا تھا وہ میں کرنے جا رہا تھا۔ میں سر جھٹک کر چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے لانچ کی پینٹری کا بھی جائزہ لیا وہاں کھانے پینے کی اشیاء وافر مقدار میں موجود تھیں۔ پانی کا بھی خاصا ذخیرہ تھا۔ بیر کی بوتلوں کے کریٹ کے کریٹ تھے۔ کافی اور چائے کی پتی بھی وافر مقدار میں موجود تھی۔ میں نے چائے کی بجائے کافی کے دو مگ تیار کیے فرج سے گوشت نکال کر فرائی کیا اور ٹرے میں رکھ کر انجن روم میں لے گیا۔

کافی کے ساتھ فرائی گوشت دیکھ کر گوشی کھل اٹھی اور بولی۔ ”ارے‘ تم نے تو میرا ذہن بھی پڑھ لیا۔ میں بھوک تو محسوس کر رہی تھی مگر شرمندگی کی وجہ سے کہا نہیں تھا۔“

”اب جلدی سے کافی پی لو ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ میں نے کہا‘ پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”پینٹری میں وہسکی اور بیر کے کریٹ بھی موجود ہیں مگر اس وقت میں تمہیں پینے نہیں دوں گا۔ تم اگر بے سدھ ہو گئیں تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

"تم اتنے عرصے سے میرے ساتھ ہو۔ تم نے کبھی مجھے بیر یا وہسکی پیتے دیکھا ہے؟"
گوشی نے کہا۔ "نہ جانے کیوں مجھے ان چیزوں سے رغبت نہیں ہے۔ حالانکہ مجھ پہ کوئی روک ٹوک بھی نہیں تھی مگر میں نے کبھی ان چیزوں کو منہ نہیں لگایا۔" گوشی نے کافی کا گھونٹ بھر کے مجھے دیکھا۔

میں جواب میں کچھ نہ بولا۔ بس وہاں لگے ہوئے ڈائلوں کو گھورتا رہا۔ اپنی کافی ختم کر کے گوشی دوبارہ انجن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"تم اگر چاہو تو کچھ دیر آرام کر لو۔" گوشی نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ تم کچھ دیر آرام کر لو۔ مجھے صرف یہ سمجھا دو کہ ہمیں کس ڈائرکشن میں چلانا ہے اور کس رفتار سے چلنا ہے۔ ابھی کوئی خاص پریشانی نہیں ہے اس لیے میں لانچ کنٹرول کر لوں گا۔ تین چار گھنٹے بعد تمہیں اٹھا لوں گا۔"

○

ہمارے پاس چونکہ پاسپورٹ موجود تھے اس لیے جکارتہ پہنچنے کے بعد ہمیں زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ ہم لوگ ٹیکسی کے ذریعے معقول سے ایک ہوٹل میں پہنچے اور لمبی تان کر سو گئے۔

اگلے دن میں نے سب سے پہلے سردار رنبیر سنگ سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے گوشی کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو اس نے شدید مخالفت کی اور بولی کہ رنبیر سنگھ کو نہ چھیڑنا ہی اچھا ہے۔ ہم آزادی سے اپنا کام تو کر سکیں گے۔"

"احمق ہو تم!" میں نے کہا "اسے اب تک اطلاع مل چکی ہوگی کہ لانچ پورٹ پر موجود ہے مگر اس میں کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ ہمارا دوست یا دشمن' ہر صورت میں ہماری تلاش کا آغاز کر چکا ہوگا۔"

"پھر ---- کیا ارادہ ہے تمہارا؟" گوشی نے طویل سانس لے کر پوچھا۔

"ابھی ابھی میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ ہم انڈونیشیا ہی چھوڑ دیں ۔ وہ ہمیں جکارتہ میں تلاش کرتا رہے گا۔ اور ہم یہاں سے میلوں دور بیٹھے ہوں گے۔"

"گڈ آئیڈیا!" گوشی خوش ہو گئی۔" میرا خیال ہے کہ ہم یہاں سے کیلی فورنیا چلیں۔ ہمارے پاس امریکن پارسپورٹ ہیں اس لیے وہاں جانے میں کوئی دشواری بھی نہیں ہوگی۔"

مجھے گوشی کی بات پسند آئی اور میں ـنے فون پر آپریٹر سے فلائٹ انکوائری کا نمبر مانگا۔ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں لائن مل گئی۔ انکوائری سے مجھے معلوم ہوا کہ آج شام سات بجے پین ایم کی ایک فلائٹ نیو یارک کے لیے روانہ ہوگی۔ میں نے اس فلائٹ میں مسٹر اور مسز سائن کے لیے دو نشستیں کنفرم کرا لیں کہ ہمارے پاسپورٹ انھی ناموں سے

تھے۔

"اب خیال رکھنا' میں گوشی نہیں بلکہ میری ہوں۔" گوشی ہنس کر بولی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہم جکارتہ سے تو نکل جائیں گے مگر نیویارک پر امیگریشن والے بہت باریک بینی سے ہمارے پاسپورٹ چیک کریں گے۔ وہاں سے نکلنا مجھے مشکل لگ رہا تھا۔

میں نے اپنی اس پریشانی سے گوشی کو آگاہ کیا تو وہ ہنس کر بولی۔ "امریکن امیگریشن والے صرف غیر ملکی پاسپورٹ باریک بینی سے چیک کرتے ہیں۔ ہمارے پاسپورٹ پر تو امیگریشن کی مہر بھی موجود ہے۔ اپنے پاسپورٹ تو وہ لوگ سرسری اندزا میں دیکھتے ہیں۔"

گوشی نے یہ کہہ کر بہ ظاہر مجھے مطمئن کر دیا مگر میں مطمئن ہوا نہیں تھا۔

اسی شام ہم نیویارک کے لیے فلائی کر گئے۔ نیویارک ائیرپورٹ پر اترتے وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ گوشی نے سخت لہجے میں کہا۔ "اپنا چہرہ ٹھیک کرو' تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں! اس صورتحال میں تو امیگریشن والے خواہ مخواہ ہم پر شبہ کریں گے۔"

"سوری' میں خوف زدہ نہیں ہوں' بس ذرا۔"

"اچھا خاموش رہو۔" گوشی نے مجھے ٹوک دیا کیوں کہ ہم امیگریشن کاؤنٹر کے سامنے پہنچ گئے تھے۔

"ہیلو!" امیگریشن آفسر مسکرا کر بولی۔ وہ خاصی خوش اخلاق خاتون لگ رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ اگر اسے ہم پر ذرا سا بھی شبہ ہوگیا تو اس کی ساری خوش اخلاقی ہوا ہو جائے گی۔

جواب میں مجھے بھی مسکرا کر ہیلو کرنا پڑا' پھر میں نے اپنا اور گوشی کا پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا۔

اس نے سرسری انداز میں پاسپورٹ چیک کیے' پھر ان پر مہر لگا کے ہمیں واپس کر دیے اور مسکرا کر بولی۔" ویلکم ٹو بیک ہوم۔"

"تھینک یو" گوشی نے مسکر کر جواب دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

ائیرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے اپنا ذہن ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ جب تک میں ائیرپورٹ کی عمارت میں موجود رہا' مجھے یہی خدشہ رہا کہ ابھی کوئی آ کے مجھے گرفتار کر لے گا۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی یہاں سے میں زینکو سے بھی رابطہ کر سکتا تھا۔

میں اور گوشی ٹہلتے ہوئے آگے بڑھے تو پیچھے سے کسی نے مجھے پکارا۔ "خرم!"

میں اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم لوگ پہچان لیے گئے۔ میں نے تھکے تھکے انداز میں پلٹ کر دیکھا تو وہ کلارا تھی وہ بھاگتی ہوئی میری نزدیک پہنچی مگر مجھے نزدیک

دیکھ کر ٹھٹک گئی اور بولی۔ ”سوری مسٹر! آپ کی چال ڈھال دیکھ بالکل میرے ایک دوست کی طرح ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میری بجائے گوشی نے جواب دیا پھر بولی۔ ”کیا نام تھا آپ کے اس دوست کا؟“

”خرم!“ کلارا نے جواب دیا۔ ”وہ پاکستانی ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر معذرت چاہوں گی کہ میں نے آپ لوگوں کو ڈسٹرب کیا۔“

”تم۔ کلارا ہو؟“ گوشی نے سرتاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ' میں کلارا ہوں مگر تم مجھے کیسے جانتی ہو؟“

”میں تمہیں ایسے جانتی ہوں کہ اس وقت واقعی تمہارے سامنے خرم کھڑا ہے مگر بدلے ہوئے حلیے میں!“

حسب عادت کلارا نے میری طرف جھپٹنے کی کوشش کی مگر میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”پلیز کلارا یہاں نہیں۔ چلو گھر چلو۔“

”تم کیسے مسکین بنے کھڑے رہے۔ اتنے عرصے بعد ملے اور پھوٹے منہ سے یہ بھی نہ بولے کہ میں ہی خرم ہوں۔ میں خواہ مخواہ معذرت کرتی رہی' معافیاں مانگتی رہی۔“ پھر وہ چونک کر بولی۔ ”یہ کون ہے؟“ اس کا اشارہ گوشی کی طرف تھا۔

”تو کیا' سب کچھ یہیں کھڑے کھڑے پوچھ لوگی۔ پہلے کوئی ٹیکسی پکڑو۔“

”میرے پاس گاڑی موجود ہے۔ ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے؟“

کلارا کا محل نما بنگلا دیکھ کر میرے ساتھ ساتھ گوشی بھی حیران رہ گئی۔

”ہاں اب بتاؤ خرم! تم یہاں کیسے پہنچے؟“ کلارا نے پوچھا۔

ہم لوگ اس وقت فریش ہو کر کلارا کے ساتھ سٹنگ روم میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ اب تک نہ جانے اس نے کیسے صبر کیا تھا۔

”پہلے تم بتاؤ کلارا!“ میں نے کہا۔ ”تمہیں تو میں کراچی میں چھوڑ کر آیا تھا۔ تم یہاں کیسے آگئیں؟“

کلارا افسردہ دکھائی دینے لگی۔ ”تمہارے وہاں سے جانے کے بعد میں نے فون پر ڈیڈی سے رابطہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ شدید بیمار ہیں۔ انہوں نے فوراً نیویارک پہنچنے کی تاکید کی۔ میں نے بھی سوچا کہ تمہاری غیر موجودگی میں ایک چکر لگا ہی لوں۔ ڈیڈی بھی خوش ہو جائیں گے اور میرا دل بھی بہل جائے گا۔ میں نے رضا کو تاکید کر دی تھی کہ خرم کے آتے ہی مجھے فون کر دینا۔ ویسے تو میری کوشش یہی تھی کہ تمہاری واپسی سے قبل ہی پاکستان پہنچ جاؤں۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیڈی کو کینسر ہے اور وہ چند ہفتوں کے مہمان ہیں۔ ہاسپٹل میں ان سے صرف میری ایک ملاقات ہوئی انہیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ میں

نے نشے سے توبہ کر لی ہے اور عنقریب شادی کرنے والی ہوں۔ انہوں نے تم سے ملنے کی خواہش بھی ظاہر کی مگر ظاہر ہے میں ان کی یہ خواہش کیسے پوری کر سکتی تھی۔ پھر۔ پھر تیسرے ہی دن وہ---- اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔" کلارا بری طرح سسکنے لگی۔

"حوصلہ کرو کلارا!" میں نے اسے تسلی دی۔ "تمہارے ڈیڈی کو کم از کم یہ سکون تو تھا کہ ان کی بیٹی نہ صرف راہ راست پر آگئی بلکہ گھر بھی لوٹ آئی۔ ان کی روح بھی مطمئن ہوگی۔"

"ہاں، وہ مرتے وقت پر سکون تھے۔ پھر میں یہاں کاروبار کے بکھیڑوں میں الجھ گئی۔ اگر آج تم سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو میں کل پاکستان فلائی کر جاتی۔"

"کیوں، کیا تمہیں رضا کا فون موصول ہو گیا کہ میں پاکستان لوٹ آیا ہوں؟"

"یہ رضا تو انتہائی غیر ذمے دار شخص ہے۔ اس سے تو میں پاکستان جا کر سمجھوں گی۔"

"ارے، اس میں رضا بیچارے کا کیا قصور ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں وہاں پہنچا ہوتا تو وہ تم سے رابطہ کرتا نا! میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔"

"میں نے اس سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ویسے وہ فون ہی نہ کرے۔"

"اچھا چھوڑو اس کے ذکر کو یہ بتلاؤ شہلا کیسی ہے؟"

"وہ بیچاری بھی تمہاری وجہ سے پریشان تھی۔ میں نے تو اس سے کہا تھا کہ میرے ساتھ چلی چلو مگر اس نے انکار کر دیا کہ بھیا خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔"

پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اپنی کہانی چھیڑ دی اور اسے شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ سوائے اس کے کہ گوشی مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اگر میں اسے یہ بتا دیتا تو وہ اسی وقت گوشی کو وہاں سے چلتا کر دیتی۔

میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ دیر تک خاموش بیٹھی رہی، پھر افسردہ لہجے میں بولی۔ "تم کتنے خوش قسمت ہو خرم کہ قدم قدم پر تمہیں جانثار ساتھی ملے ہیں۔ بتاؤ، تمہیں برڈ سا کوئی دوسرا دوست مل سکے گا، رضوانہ ملے گی؟ تہمینہ ملے گی؟" وہ یہ کہتے ہوئے خاصی جذباتی ہو گئی تھی۔

مجھے ڈر تھا کہ وہ پھر رونا دھونا شروع نہ کر دے۔ برڈ کی موت سے اسے شاک پہنچا تھا۔ میں نے موضوع بدلنے کو کہا۔ "تم نے میرے دوستوں میں اپنا نام نہیں لیا۔ مجھے دوسری کلارا ابھی تو نہیں ملے گی۔"

"تم ابھی تک اس خوش فہمی میں ہو کہ میں تمہاری دوست ہوں۔ میرے اور تمہارے رشتے کے لیے دوستی بہت چھوٹا لفظ ہے خرم! اور دوسری کلارا تو جبھی ملے گی جب پہلی کلارا تمہارا پیچھا چھوڑے گی۔ ایسا صرف اسی وقت ممکن ہے کہ میں زندہ ہی نہ رہوں۔ پھر تم شوق سے دوسری کلارا ڈھونڈتے رہنا۔" اس نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"ارے یار" اگر مجھے شبہ بھی ہوتا کہ تم یہاں موجود ہو تو میں یہاں آنے کی بجائے کسی اور ملک کا رخ کرتا۔" میں نے اسے چڑانے کو کہا۔" وہ تو گوشی نے ضد کی کہ امریکا چلو۔"

"اچھا خیال اس موضوع کو چھوڑو اب ذرا کام کی بات کرو۔ میرا خیال ہے' زینکو سے آج ہی رابطہ کر لیا جائے۔"

"رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے مگر وہ۔"

"اگر مگر کیا خرم! یہ ہانگ کانگ نہیں نیویارک ہے۔ یہاں ایسے نہ جانے کتنے زینکو موجود ہیں۔"

"تم یہ کیوں بھول رہی ہو کلارا کہ ہم اس سے کوئی بزنس ڈیل نہیں کریں گے۔ اس کی بیٹی کا تاوان وصول کریں گے۔ اگر اس نے وہاں کی پولیس کو آگاہ کر دیا کہ میری بیٹی ان لوگوں کے قبضے میں ہے اور یہ لوگ مجھ سے تاوان طلب کر رہے ہیں تو تمہارا کیا خیال ہے! پولیس کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہوں گی؟" پولیس زینکو کا ساتھ دے گی اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر گوشی کو برآمد کر کے زینکو کے حوالے کر دے گی۔ ہمارا تو جو حشر ہوگا سو ہوگا۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"باتیں تو تمہاری درست ہیں۔ ہمیں کچھ اور سوچنا ہوگا۔"

"اس کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "زینکو کو یقین دلایا جائے کہ اگر اس نے پولیس سے رجوع کیا تو اس کی بیٹی کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ اگر اسے اپنی بیٹی سے واقعی محبت ہے تو وہ خاموشی سے ہماری مطلوبہ چیزیں ہمارے حوالے کر دے گا اور اپنی بیٹی کو لے جائے گا۔"

"مگر میں اپنے ڈیڈی کے پاس جانا نہیں چاہتی۔" گوشی نے تلملا کر کہا۔ "میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں؟" گوشی کے لہجے میں بے بسی اور جھنجلاہٹ تھی۔

اس کی بات پر کلارا نے چونک کر مجھے دیکھا' پھر گوشی سے بولی۔ "یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ تم لوگ تھکے ہوئے ہوگے اس لیے آرام کرو' میں چلتی ہوں۔ تم دونوں کے کمرے سیٹ ہو چکے ہیں' گڈ نائٹ!" یہ کہہ کہ وہ خراماں خراماں وہاں سے چلی گئی۔

○

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے بھی واقعی نیند آ رہی تھی۔ میں نے بستر پر گر کر آنکھیں موند لیں۔ اس وقت میں نیم نیند کی کیفیت میں تھا کہ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو کلارا دندناتی ہوئی اندر آ گئی۔ میں اس وقت اسے دیکھ کر

بالکل حیران نہیں ہوا کیوں کہ مجھے اندازہ تھا کہ کلارا آج کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔

"تم سو رہے تھے؟" کلارا نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میری قسمت میں نیند کہاں" میں نے مسکین سے لہجے میں کہا۔ "میں تو تمہیں یاد کر رہا تھا۔"

"بکواس مت کرو۔" کلارا نے کہا۔ "یہ بتاؤ یہ گوشی کون ہے؟"

"اب کون سی گوشی رہ گئی ہے جس کے بارے میں پوچھ رہی ہو؟" میں نے جواب دیا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ زینکو کی بیٹی ہے اور ہمارے پاس یرغمال ہے۔"

"کوئی یرغمال اغوا کرنے والے کے گلے نہیں پڑتا۔ اگر وہ اپنے باپ کے پاس جانا نہیں چاہتی تو نہ جائے۔ وہ ہمارے ساتھ رہنے پر کیوں مصر ہے؟"

"اس لیے کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔" میں نے اسے چڑانے کو کہا۔

"اور تم!" کلارا نے بالکل مشرقی عورتوں کی طرح پوچھا۔

"میں کیا کہوں۔" میں نے کن آنکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تو مجبور ہو گیا ہوں۔ اس کا دل بھی توڑنا نہیں چاہتا پھر تم تو ویسے بھی مسلمان ہونے والی ہو۔ تم جانتی ہو کہ مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔"

"بکواس کرتے ہو!" کلارا بپھر گئی۔ "میں تمہارے ملک میں کافی عرصہ رہی ہوں۔ وہاں کی عورتیں بھی دوسری وبیوی کو برداشت نہیں کرتیں۔" پھر وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ "اگر وہ تمہیں اتنی ہی پسند ہے تو میں راستے سے ہٹ جاتی ہوں۔ ویسے بھی وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے۔"

اس کی بات پر بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔ "بس جل گئیں نا! میں تو تمہیں آزما رہا تھا۔ گوشی کو معلوم ہے کہ میں تم سے شادی کرنے والا ہوں۔ تمہیں یاد نہیں جب ائیرپورٹ پر تم نے میرا نام لیا تھا تو اس نے اندازے سے تمہیں پہچانا تھا۔ وہ بیچاری تو صرف یہ چاہتی ہے کہ باپ کے پاس نہیں جائے گی۔ اگر اسے یہاں کوئی ملازمت مل گئی تو وہ ہنسی خوشی یہاں رہ جائے گی۔ میں اسے پہلے ہی تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔ اس کے باوجود اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو گوشی سے تنہائی میں پوچھ لینا کہ میں نے اس سے کیا کہا تھا؟" میرا لہجہ خود بہ خود تلخ ہو گیا۔

"آئی ایم سوری خرم!" کلارا نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ "بس تم مجھ سے اس قسم کا مذاق مت کیا کرو۔"

"ویسے مجھے حیرت ہے کہ گوشی بھی وہی بات کر رہی تھی جو تم نے کہی۔ اس کا خیال ہے کہ تم اس سے زیادہ حسین ہو۔ تم اسے حسین کہہ رہی تھیں۔"

"وہ واقعی حسین ہے۔" کلارا نے اعتراف کیا۔ "اس کے چہرے پر ایک بھولپن اور

معصومیت ہے۔"

"تم اسے کہیں جاب دلا دو۔ اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"یہ ساری باتیں قبل از وقت ہیں۔ ممکن ہے اس کا باپ منا کر اسے لے جائے۔ اگر واقعی وہ زینکو کے ساتھ نہ گئی تو جاب تو اسے اپنی کمپنی میں دے سکتی ہوں۔" پھر وہ پر خیال لہجے میں بولی۔ "ابھی تو تم صرف یہ سوچو کہ زینکو سے ڈیل کیسے کرو گے؟"

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں یہاں زیر زمین دنیا میں کسی سے رابطہ کرتا ہوں۔" پھر اسی کو سامنے لاؤں گا۔ خود ڈیل نہیں کروں گا۔"

"مگر ایسا آدمی ملے گا کہاں؟" کلارا نے پوچھا۔

کیسیٹوز کے چکر لگاتا ہوں۔ اس قسم کے لوگ انھی جگہوں پر ملتے ہیں اور پیسے کے لالچ میں ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا تم اب آرام کرو، صبح اس موضوع پر بات ہوگی۔" کلارا اٹھتے ہوئے بولی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں بھی سونے جا رہی ہوں۔" کلارا نے حیرت سے جواب دیا۔

"تو سو جاؤ۔" میں نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نیچے کارپٹ پر سو جاؤں گا۔"

"شٹ اپ" اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ "اچھے بچوں کی طرح سو جاؤ۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ آج ہی سے کام شروع کر دوں یوں بھی میں جکارتہ میں خوب دل بھر کر سویا تھا میں بھی باہر جانا چاہتا ہوں۔ ممکن ہو تو کچھ کیش بھی دے دو۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" کلارا نے کہا۔

"نہیں کلارا!" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "ایسی بدنام جگہوں پر تمہارا جانا مناسب نہیں ہے۔ وہاں اچھے لوگ نہیں ہوتے۔"

"تم شاید بھول گئے خرم کہ میں نے کئی برس تک ہپیوں والی زندگی گزاری ہے۔ میں ہر قسم کے آدمی سے نمٹ سکتی ہوں۔ تم میری فکر مت کرو۔" پھر وہ جاتے جاتے بولی۔ "میں تیار ہو کر آگئی ہوں تم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" وہ ہوا کے معطر جھونکے کی طرح وہاں سے چل دی۔

وہ تیار ہو کر آئی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز اور چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی، پیروں میں لونگ شوز تھے اور سنہرے بال پونی ٹیل کی شکل میں باندھ رکھے تھے۔ وہ مجھ سے بولی۔ "ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو کیا پہلی دفعہ دیکھا ہے؟"

"ہاں، تمہارا یہ روپ تو پہلی ہی دفعہ دیکھا ہے۔" میں نے توصیفی انداز میں کہا۔ "جب تم پہلی بات مجھے ملی تھیں اور وقت بھی جینز ہی پہنے ہوئے تھیں مگر اس کلارا میں اور آج

کی کلارا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔" وہ مدقوق' مجہول سی ایک ہیبی لڑکی تھی' جس کے بال الجھے ہوئے اور بے رونق تھے اور جس پر میل کی تہیں تھیں اور یہ کلارا صاف شفاف' پھولوں کی طرح مہکتی ہوئی' سبک خرام' خوش ادا اور ....."

"اچھا اب اٹھو بھی۔" کلارا اپنی تعریف پر کچھ جھینپ سی گئی۔" وانگ یو نے تمہیں باتیں بنانے میں بھی طاق کر دیا ہے۔"

"وانگ یو بیچارے کو کیوں بدنام کرتی ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہ تو تمہاری شخصیت کا کمال ہے۔" میں ہنستا ہوا اٹھ گیا۔

○

سب سے پہلے ہم نیویارک کے اس کیسینو میں گئے جہاں اونچے پیمانے پر جوا ہوتا تھا۔ مجھے اس موقع پر برڈ بہت یاد آیا۔ وہ اگر ہمارے ساتھ ہوتا تو کھیلے بغیر نہ رہتا۔ وہاں ہر شخص اپنی ہی دھن میں لگتا تھا۔ کسی کو جیت کی خوشی تھی' کوئی ہار کے صدمے سے دو چار تھا۔ لاکھوں ڈالرز ادھر سے ادھر ہو رہے تھے۔ نیلے' پیلے اور ہرے چپس گردش میں تھے۔ کیسینو کی ملازم لڑکیاں کھیلنے والوں کو بڑھاوا دے رہی تھیں اور ان کی جیبیں ہلکی ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک رولٹ ٹیبل پر میں نے بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے لکی نمبر پر دو سو ڈالر لگا دیئے۔ رولٹ کی سوئی گردش میں آئی اور رقم لگانے والوں کے چہرے تجسس اور جوش سے تمتمانے لگے۔ میں نے وہ بازی ہارنے کے بعد مزید دو سو ڈالر ہارے پھر میں اس کھیل سے اکتا گیا۔ کلارا کیسینو کے دوسرے حصے میں تھی۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس کے آگے چپس کا ڈھیر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ جب سے آئی تھی۔ مسلسل جیت رہی تھی۔ پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ ہزاروں ڈالرز کے دو چپس ایک ہی بار داؤ پر لگا دیئے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ پھر جیت گئی۔ اس نے تمام چپس سمیٹے اور انہیں بیگ میں بھر کے کیش کاؤنٹر کی طرف چل دی۔ وہ دانستہ مجھ سے لاتعلقی ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے بھی اسے مخاطب کرنا ضروری نہ سمجھا اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے لاتعلقی سے چلتا رہا۔ کلارا نے چپس کاؤنٹر سے کیش کرائے تو کاؤنٹر کلرک نے اسے جیتنے پر مبارک باد دی۔ وہ کرنسی نوٹ بیگ میں ٹھونس کر کیسینو کے دروازے کی طرف بڑھی تو میں بھی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے چل رہا تھا... وہ بہت ست رفتاری سے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہماری گاڑی قدرے اندھیرے میں کھڑی تھی۔ وہ تھوڑی دیر گاڑی کے پاس کھڑی رہی' پھر دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ میں بھی ٹہلتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے پارکنگ لاٹ سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اتنی خطیر رقم دیکھ کر کوئی نہ کوئی مجھے لوٹنے کی کوشش کرے گا۔ پھر ہم اس کے

ذریعے دوسرے افراد تک پہنچ جائیں گے مگر لگتا ہے یہاں جوا بھی بہت فیئر طریقے سے ہوتا ہے۔"

"یہاں تو ویسے بھی شرفا آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کسی ایسی جگہ چلو جو واقعی اس سلسلے میں بدنام ہو۔"

"میں اب ایسے ہی ایک کیسینو میں جا رہی ہوں۔"

"مناسب یہ ہے کہ کلارا کہ تم مجھے وہاں چھوڑ کر چلی جاؤ۔ ایسی جگہوں پر تمہارا جانا مناسب نہیں ہے۔"

چلتے چلتے اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی اور پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔ "دیکھو' میری بھی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ سامنے کی بات بھی مجھے نہیں سوجھ رہی ہے۔"

"تمہاری عقل پر پتھر تو خیر ہمیشہ سے پڑے ہوئے ہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ تمہارے اس خوبصورت سر میں دماغ کی جگہ بھی پتھر ہی ہے مگر خیر' تم بتاؤ' ایسی کون سی عقل کی بات سوجھ گئی؟" میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

کلارا نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ "گھورنے کے لیے تو عمر پڑی ہے' بہت موقع ملیں گے۔ تم جلدی سے وہ بات بتا دو پلیز!"

کلارا مجھے گھورتے گھورتے اچانک مسکرانے لگی اور بولی۔ "تم بھی پورے کلاؤن ہو۔ میں یہ کہنے والی تھی کہ یہ کام ہم کسی پرائیویٹ جاسوس سے بھی تو لے سکتے ہیں۔ بہت سے مجرمانہ ذہنیت کے ریٹائرڈ پولیس والوں اور وکیلوں نے ایجنسیاں کھول رکھی ہیں۔"

"ویری گڈ آئیڈیا" میں واقعی اچھل پڑا۔ "اب تو ماننا پڑے گا کہ واقعی تمہارے پاس عقل بھی ہے۔" "خرم! میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔" کلارا دانت بھینچ کر بولی۔

"اچھا اب گھر چلو' صبح کی ایجنسی سے رابطہ کریں گے۔" میں نے گویا صلح کی سفید جھنڈی لہرائی ورنہ وہ تو گاڑی ہی میں ریٹ شروع کر دیتی۔

○

وہ دراز قامت اور ورزشی جسم کا مالک تھا' عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہوگی۔ اس کے بال کن پٹیوں پر سے سفید ہو چلے تھے' ٹھوڑی پر زخم کا نشان تھا اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک! وہ ایک پرائیویٹ جاسوس تھا' اس سے قبل آٹھ سال تک پولیس کے ہوم سائیڈ ڈپارٹمنٹ میں رہ چکا تھا اور قتل کے ایک کیس کے ثبت و شواہد ضائع کرنے پر نوکری سے نکالا گیا تھا۔ پولیس کو اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ مل سکا تھا اس لیے وہ سزا سے بچ گیا تھا۔ پھر اس نے جاسوسی کا ادارہ کھول لیا اور اب جائز و ناجائز ہر کام کرنے کو تیار تھا۔

شرط صرف یہ تھی کہ فیس معقول ملے۔ یہ ساری معلومات ہمیں کلارا کے ایک ملازم نے فراہم کی تھیں۔ اس کے نتیجے میں فلپ شیلڈن ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔

"مسٹر شیلڈن !" کلارا نے کہا۔ "جو کام آپ کو بتایا جائے گا' اس میں مکمل رازداری شرط ہے۔"

"ہر راز ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا میڈم!" شیلڈن نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔" پھر بولا۔ "آپ بے فکر ہو کر مجھ پہ اعتماد کر سکتی ہیں۔ میں پولیس اور دیگر سرکاری اداروں کو چکر ضرور دیتا ہوں مگر اپنے کلائنٹس سے فیئر رہتا ہوں۔"

"اگر میں تم سے کہوں کہ میں کسی کو اغوا کرانا چاہتی ہوں ؟" کلارا نے کہا۔

"سوری میڈم!" شیلڈن نے کہا۔ "اگر پولیس کے کسی اہل کار کو اغوا کرانا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے ' دوسری صورت میں معذرت چاہوں گا۔" شیلڈن نے سنجیدگی سے کہا۔

"اگر تمہیں اس کام کا معاوضہ ایک لاکھ ڈالرز دیا جائے تو!" کلارا نے کہا۔

شیلڈن کا منہ پھٹے کا پھٹا رہ گیا۔؟ کک---- کیا کہا آپ نے ۔ ایک لاکھ ڈالرز؟" اس نے حیرت زدہ ہو کے پوچھا۔ "ایک لاکھ امریکن ڈالرز؟"

"ہاں ایک لاکھ امریکن ڈالرز!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"مجھے منظور ہے۔" شیلڈن جلدی سے بولا۔ "بتایئے کسے اغوا کرنا اور کب؟"

"اتنی جلدی مت کرو مسٹر شیلڈن!" کلارا نے اسے جھڑک دیا۔ "پہلے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لو۔"

"آپ کچھ بتائیں گی تو میں غور کروں گا نا!" شیلڈن الجھ کر بولا۔

"میں ہاورڈ ہیوز کی بیٹی کو اغوا کرانا چاہتی ہوں۔" کلارا نے جان بوجھ کر ایک امریکن ارب پتی کا نام لیا۔

"نو پرابلم!" شیلڈن مسکرا کر بولا۔ "اتنے پیسوں میں تو میں سی آئی اے کے سربراہ کو بھی اٹھا کر لا سکتا ہوں۔"

"زیادہ بڑی بڑی باتیں مت کرو مسٹر شیلڈن۔" میں نے بھنا کر کہا۔

"میں بڑھ نہیں ہانک رہا ہوں۔ "شیلڈن برامان گیا۔" آپ بتایئے ہاورڈ کی بیٹی کو کب اغوا کرنا ہے۔ مجھے کم از کم تین دن ضرور ملنا چاہئیں۔"

"کلارا نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا' گویا پوچھ رہی ہو کہ اسے اصل صورت حال بتاؤں یا نہ بتاؤں ؟ میں نے رسک لینے کا فیصلہ کیا اور اثبات میں سرہلا کر اپنی رضا مندی ظاہر کر دی۔

میری طرف سے گرین سگنل ملنے کے بعد کلارا نے کہا۔ "سنو مسٹر شیلڈن! میں ایک

دفعہ پھر واضح کر دوں کہ اس کام میں رازداری اولین شرط ہے۔ اگر حسب منشاء ہو گیا تو میں فیس میں اضافہ بھی کر سکتی ہوں۔"

"نہیں میڈم!" شیلڈن نے منہ بنا کر کہا۔ "میں نے جس آفر پر کام کرنا قبول کیا ہے' اس سے ایک ڈالر بھی زیادہ نہیں لوں گا۔ میرے بھی کچھ اصول ہیں۔"

اس کی اس بات نے مجھے متاثر کیا۔

"تو پھر سنو۔" کلارا نے کہا۔ "ہم نے ایک لڑکی کو اغوا کیا ہے جو اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم اس کے باپ سے تاوان وصول کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ڈیل تم کرو گے۔"

"اوکے۔" شیلڈن ایک مرتبہ پھر حیران رہ گیا۔ "ہاں میں نے اس کا نام سنا ہے مگر نو پرابلم! آپ بتایئے' آپ نے اس سے کتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے" یہ کام تو مشکل ہے مگر میں اسے چیلنج سمجھ کر قبول کر رہا ہوں۔"

"زینکو کے قبضے میں کچھ دستاویزات اور مائیکرو فلمز ہیں' ہمیں صرف وہ چیزیں چاہئیں۔" میں نے یوں بے نیازی سے کہا جیسے نہ وہ فلمیں میرے لیے اہم ہیں' نہ دستاویزات!

"اور اس کی بیٹی کو کب اور کہاں اس کے حوالے کریں گے آپ لوگ؟" شیلڈن نے پوچھا۔

"یہ ہمارا مسئلہ ہے۔" کلارا نے کہا۔ "تمہارا کام زینکو سے ان چیزوں کی بازیابی کرنا ہے۔ اسی کام کے تمہیں ایک لاکھ ڈالرز دیئے جا رہے ہیں۔"

"سوری میڈم! جب میں کسی سے کوئی وعدہ کر لیتا ہوں تو اسے پورا ضرور کرتا ہوں۔ لڑکی خود زینکو کے حوالے کروں گا۔"

میں نے کہا نا کہ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" کلارا چڑ کر بولی۔

"پھر میں معذرت چاہوں گا۔" شیلڈن نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میرے اپنے کچھ اصول اور ضابطے ہیں۔ جب میں زینکو سے یہ کہہ کر وہ کاغذات اور مائیکرو فلمز لوں گا کہ تمہاری بیٹی تمہارے حوالے کر دی جائے گی تو پھر میں وہ چیزیں لینے کے بعد اس کی بیٹی کو واپس بھی کروں گا۔" شیلڈن اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے اجازت دیں۔ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔ میرے وقت کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے۔ جو وقت میں نے آپ کو دیا' اس کابل میں آپ کو بھجوا دوں گا' گڈ بائے۔" وہ جھٹکے سے دروازے کی طرف مڑ گیا۔

"ٹھہرو مسٹر شیلڈن!" میں نے اس سے کہا۔ "اتنی جلدی بازی مت کرو۔ میں مانتا ہوں کہ تمہارے بھی کچھ اصول ہیں۔ بیٹھ کر میری بات دھیان سے سنو۔"

شیلڈن مجھے گھورتا ہوا بیٹھ گیا۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ زینکو کی بیٹی خود باپ کے پاس نہیں جانا چاہتی۔"

"یہ کوئی مسئلہ [illegible] اگر وہ رہنا نہیں چاہے گی تو زینکو اُسے قید کرنے سے رہا۔ اپنی مرضی سے وہ جب چاہے [illegible] آسکتی ہے۔ آپ اسے سمجھا سکتے ہیں کہ ابھی وہ باپ کے ساتھ چلی جائے، پھر موقع ملنے میں چھوڑ دے۔"

"مگر اس کا باپ اسے نہیں چھوڑے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔" شیلڈن نے کہا۔

بات تو کچھ بھی نہیں تھی، محض کلارا نے اسے طول دے دیا تھا مگر اس پر شیدل کا جو ردعمل ظاہر کیا، وہ مجھے پسند آیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گوشی کو سمجھایا جا سکتا تھا۔

"اوکے مسٹر شیلڈن!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "تم اپنا کام شروع کرو۔"

"فیس کے علاوہ روزانہ [illegible] اخراجات ہوں گے، ان کا بل الگ سے ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" کلارا [illegible] اور چیک بک نکال کر چیک لکھنے لگی۔ "یہ پانچ ہزار ڈالر کا چیک ہے۔ فی الحال یہ رکھو۔"

"تھینک یو۔" شیلڈن نے [illegible] رکھتے ہوئے کہا۔ "روزانہ شام کے وقت آپ کو رپورٹ ملتی رہی گی۔"

"اگر میں بھی تمہارے ساتھ رہوں مسٹر شیلڈن!" میں نے پوچھا۔ "تو تمہیں کوئی اعتراض ہوگا؟"

"اعتراض تو مجھے ہوگا۔" شیلڈن کچھ پرخیال انداز میں بولا۔ "میں زیادہ بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتا ہوں مگر اس معاملے کی نوعیت مختلف ہے اس لیے آپ میرے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یوں بھی آپ کو کوئی پہچانتا نہیں ہے۔ میڈم کلارا تو یہاں کے تجارتی حلقوں میں جانی پہچانی جاتی ہیں۔ آپ لنچ کے بعد میرے پاس آسکتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تھینک یو مسٹر شیلڈن!" میں نے اس کے ساتھ گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کلارا سے کہا۔ "تمہیں آخر اس سے بحث کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس ایک بات منہ سے نکل گئی تھی۔ اصل میں اس وقت مجھے گوشی کا خیال تھا۔"

"گوشی جب چاہے واپس آ سکتی ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری بات ٹالے گی نہیں۔" پھر میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "مجھے ایک ریوالور اور دور مار رائفل کی ضرورت پڑے گی۔"

"یہ کوئی پرابلم نہیں۔" کلارا نے کہا۔

○

شیلڈن کا آفس زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اسٹاف بھی بہت مختصر تھا۔ ایک اس کی پی اے

تھی۔ وہ جونیئر جاسوس تھی اور ایک اکاؤنٹ تھا۔ البتہ شیلڈن کا کمرا خوب آراستہ تھا۔ میں اس وقت اس کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

"مسٹر سائن! آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ کو ساتھ رکھنے پر رضامندی کیوں ظاہر کی ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ اس کھیل کا علم میرے اسٹاف کو بھی نہ ہونے پائے۔ آپ یقیناً میرے لیے کارآمد ثابت ہوں گے۔ جو زینکو ایسے بین الاقوامی بدمعاش اور بارسوخ شخص کی بیٹی کو اغوا کر سکتا ہے۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔" پھر وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

"میں ابھی تھوڑی دیر میں زینکو سے رابطہ کروں گا۔ میں نے اس کے فون نمبر انکوائری سے حاصل کر لیے تھے۔ پھر اس نے فون اپنی طرف کھسکایا اور جیب سے نوٹ بک نکال کر زینکو کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس نے ٹیلی فون سیٹ کے ساتھ ایک ایریل فٹ کیا تھا۔ اس کے ذریعے ہم لوگ ایک ساتھ نہ صرف زینکو کی بات سن سکتے تھے بلکہ کمرے میں موجود تمام افراد اس سے گفتگو بھی کر سکتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد زینکو کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔ "یس زینکو اسپیکنگ!"

"مسٹر زینکو! میں نیویارک سے بول رہا ہوں۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ــــ"

"مجھے معلوم ہو گیا ہے مگر فکر مت کرو، آئندہ مال کی ترسیل میں تاخیر نہیں ہوگی۔"

"تم غلط سمجھے مسٹر زینکو!" شیلڈن نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ گوشی میرے قبضے میں ہے اور ــــ"

"شٹ اپ یو باسٹرڈ!" زینکو گرج کر بولا۔ "نیویارک میری پہنچ سے دور نہیں ہے۔ میں وہاں پہنچ کر بھی تمہاری گردن دبوچ سکتا ہوں۔"

"ضرور دبوچنا!" شیلڈن نے چڑانے والے انداز میں کہا۔ "مگر فی الحال گوشی کی فکر کرو۔ وہ بیچاری خواہ مخواہ ماری جائے گی۔"

"بولو کیا چاہتے ہو؟" زینکو نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"مجھے وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز چاہئیں مسٹر زینکو!"

"وہاٹ!" زینکو چیخ کر بولا۔ "تمہارا مطلب ہے وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز جن کا پچھلے دنوں ہانگ کانگ میں سودا ہونے والا تھا۔"

"ہاں وہی مائیکرو فلمز اور دستاویزات!" شیلڈن نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"اور اگر میں تمہیں یہ چیزیں نہ دوں تو؟" زینکو نے پوچھا۔

"تو پھر بیٹی تمہیں زندہ نہیں ملے گی۔" شیلڈن نے سفاک لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں سوچنے کے لیے ایک گھنٹہ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد بھی تم نے انکار کیا تو پھر بیٹی سے ہاتھ دھو لو گے۔ میں اسے اذیت دے کر ماروں گا اور تمہیں وقتاً فوقتاً اس کے جسم کے مختلف حصے تمہیں ملتے رہیں گے۔" یہ کہہ کر شیلڈن نے سلسلہ منقطع کر دیا، پھر مجھ سے بولا۔

"ایک گھنٹہ تو بہت زیادہ ہے' زینکو ابھی کچھ دیر میں ہمیں رنگ کرے گا۔"

"مگر تمہارا نمبر کب ہے اس کے پاس؟ میں نے کہا۔

شیلڈن نے ریسیور اٹھایا تو آپریٹس کے ذریعے دوسری طرف کی آواز مجھے بھی سنائی دی۔ آواز سنتے ہی میں چونک اٹھا کیوں کہ دوسری طرف زینکو تھا۔

"ہیلو مسٹر شیلڈن!" زینکو نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ وہ چیزیں کہاں لینا پسند کرو گے؟"

"کہاں سے کیا مراد ہے مسٹر زینکو!" شیلڈن نے کہا۔

"ظاہر ہے مجھے ان چیزوں کی ڈلیوری ہوتے ہی گوشی تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔" شیلڈن نے جواب دیا۔

"مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ----

"لسن مسٹر زینکو!" شیلڈن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں اصولی آدمی ہوں۔ اس لیے ضمانت قسم کے الفاظ کم از کم مجھ سے نہ بولیں۔ آپ کو میری زبان پر اعتبار کرنا پڑے گا۔" شیلڈن نے حتمی لہجے میں کہا۔

"اوکے!" زینکو نے طویل سانس لے کر کہا۔ "میرا آدمی کل وہ اشیاء لے کر نیویارک پہنچے گا۔ تم اس سے کہاں ملنا پسند کرو گے؟"

"اپنے آدمی سے کہو کہ وہ میٹرو ہوٹل میں قیام کرے اور کاؤنٹر کلرک کو ہدایت کر دے کہ شیلڈن اس سے ملنے آئے تو اس کی ملاقات کرادی جائے۔ اپنا اطمینان کرنے کے بعد میں گوشی کو تمہارے حوالے کر دوں گا یا اسے ہانگ کانگ کی فلائٹ پر سوار کرا دوں گا۔ اس سے پہلے تمہاری تسلی کے لیے فون پر تم سے اس کی بات کرا دوں گا' اوکے!"

"ٹھیک ہے' کوئی بات ضروری ہوئی تو میں پھر تمہیں فون کر لوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

شیلڈن نے ریسیور رکھنے کے بعد مجھ سے کہا۔ "مسٹر خرم! یہ سب مجھے جتنا آسان لگ رہا ہے' اتنا ہے نہیں۔"

"میری چھٹی حس بھی خطرے کا الارم بجا رہی ہے۔ زینکو سا ضدی اور بارسوخ شخص اتنی آسانی سے کیسے مان گیا۔ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔"

"ہمیں بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔" شیلڈن نے جواب دیا۔

پھر میں تھوڑی دیر شیلڈن کے ساتھ مزید بیٹھا۔

○

میں گھر پہنچا تو کلارا بے چینی سے میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کہنے لگی۔ "تم نے

کہا تھا کہ مجھے فون کرو گے۔ تم نے فون کیوں نہیں کیا۔ میں ابھی تمہاری تلاش میں نکلنے ہی والی تھی۔"

"ایسی کیا آفت آگئی؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"آفت آ بھی سکتی ہے۔" کلارا نے جواب دیا۔ "گوشی نے ابھی کچھ دیر پہلے اپنے باپ سے فون پر بات کی ہے۔"

"کیا؟" میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ "یہاں سے! تمہارے گھر سے فون کیا تھا اس نے؟"

"نہیں، فون تو اس نے باہر سے کیا تھا مگر اس نے اپنے باپ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ واپس نہیں آنا چاہتی۔"

"گوشی ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ٹیرس میں بیٹھی ہے۔" کلارا نے جواب دیا۔

میں اسی وقت ٹیرس میں پہنچا۔ گوشی آرام دہ کرسی پر بیٹھی خلاؤں میں تک رہی تھی۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ کھوئے کھوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے نزدیک جا کر کہا۔ "کیا بات ہے گوشی! تم پریشان ہو؟"

"دنیا میں کس پر بھروسا کیا جائے خرم!" وہ بری طرح سسکنے لگی۔

"لیکن ہوا کیا؟" میں نے حیرت زدہ ہو کے پوچھا۔

"میں نے آج ڈیڈی سے فون پر بات کی تھی۔" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے بتایا۔ "انہوں نے مجھے لعن طعن کی کہ میری وجہ سے انہیں دو دو ٹکے کے آدمیوں کی بات ماننا پڑ رہی ہے اور یہ کہ اگر میں مرجاتی تو کم از کم ان کی اتنی بے عزتی تو نہ ہوتی۔ میں نے بھی ان سے کہہ دیا کے سمجھ لیں گوشی آپ کے لیے مرگئی۔"

"پھر۔۔۔۔ پھر کیا کہا انہوں نے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"انہوں نے کوئی جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا۔ میں ان کی نظروں میں اتنی ہی بے وقعت ہوں خرم! انہیں تو بے تاب ہو جانا چاہیے تھا، میری خیریت پوچھنا چاہیے تھی۔ الٹا وہ مجھے لعن طعن کرنے لگے۔" گوشی بلک بلک کر رونے لگی۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے خرم کہ وہ میری رہائی کے لیے وہ قیمتی چیزیں دے دیں گے۔ ایسا نہیں ہوگا خرم! ایسا نہیں ہوگا۔"

میرا سر چکرانے لگا۔ اگر واقعی گوشی کا کہا درست ہو جاتا تو میری اب تک کی ساری محنت پر پانی پھر جاتا۔

"تم فکر مت کرو گوشی!" میں نے اسے تسلی دی۔ "وہ چیزیں نہیں ملتی ہیں تو نہ ملیں۔ تم سے زیادہ قیمت نہیں ہے ان کی!" میں نے کہا۔ "اب تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔"

میں اس کے پاس سے واپس آیا تو کلارا بے چینی سے لاؤنج میں ٹہل رہی تھی۔ میں نے اسے گوشی کے خدشات سے آگاہ کیا تو وہ بھی فکر مند ہو گئی۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں زینکو ہی کو نیویارک بلانا پڑے گا۔" میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

"اور تمہارے کہنے سے وہ دوڑا آئے گا۔" کلارا نے طنزیہ انداز میں ہنس کر کہا۔ "اسے جب اپنی بیٹی کی پروا نہیں ہے تو وہ بھلا کیوں آئے گا نیویارک؟"

"میں ابھی شیلڈن کے پاس جا رہا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم یہیں گوشی کے پاس ٹھہرو۔ وہ بہت زیادہ مایوس ہے' کہیں ہمارے ہاتھ سے نکل ہی نہ جائے۔ تم اس کا دھیان رکھنا اور اسے تنہا باہر مت نکلنے دینا۔" یہ کہہ کر میں گھر سے باہر نکل آیا۔

شیلڈن آفس ہی میں موجود تھا۔ میری بات سننے کے بعد وہ دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ "مسٹر سائمن! مجھے لگتا ہے کہ زینکو نے گوشی کے ساتھ بلف کیا ہے۔"

"بلف کیا ہے؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"دیکھئے نا! وہ اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اپنے طور پر بھی معلومات کی ہیں۔ مجھے ہر جگہ سے یہی معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنی بیٹی پر جان چھڑکتا ہے۔ جب گوشی نے اس سے کہا کہ میں آپ کے پاس واپس نہیں آنا چاہتی تو وہ سمجھ گیا ہو گا کہ یا تو گوشی کو یہ کہنے پر مجبور کیا جا رہا ہے یا پھر وہ خود ہی مخالفین سے مل گئی ہے۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ اسے گوشی کی پروا ہی نہیں ہے۔ حقیقت میں ایسا ہے نہیں ورنہ وہ پہلے ہی ہم سے صاف صاف کہہ دیتا کہ گوشی جیئے یا مرے' وہ چیزیں واپس نہیں کروں گا۔"

شیلڈن کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ زینکو نے گوشی کے ذریعے ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اسے گوشی کی بالکل پروا نہیں ہے تاکہ ہم لوگ مایوس ہو جائیں۔

"مسٹر شیلڈن! زینکو کو فون کرو اور کہو کہ ہمیں ڈلیوری اسی کے ہاتھ سے چاہیے۔ اسے بہ نفس نفیس نیویارک آنا پڑے گا۔"

"اس سے فائدہ کیا ہو گا؟" اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"فائدہ یہ ہو گا کہ اگر اس نے کوئی چالاکی دکھائی تو ہم زبردستی اس سے اپنی مطلوبہ اشیاء حاصل کر سکیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

شیلڈن میری بات سن کر مسکرانے لگا۔ "تم زینکو پر سختی کرو گے! اس سے زبردستی وہ چیزیں حاصل کرو گے! تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ہاتھی مرنے کے بعد بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ پھر زینکو ابھی مرا نہیں بلکہ زندہ ہاتھی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ نیویارک میں وہ بالکل بے یار و مددگار ہو گا۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے کیوں کہ زینکو جیسے آدمی دنیا

میں کہیں بھی تنہا نہیں ہوتے۔ وہ ایک سنڈیکیٹ کا سرغنہ ہے' یہاں آیا بھی تو نہ صرف اس کے گارڈز بلکہ مقامی پولیس بھی اس کی حفاظت کرنے' اسلئے ہم لوگ ہی پھنس جائیں گے۔"

"پھر---- پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں الجھ کر رہ گیا۔

"بس خاموشی سے آنے والے وقت کا انتظار کرو۔" شیلڈن نے کہا۔ "ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ زینکو کی اگلی چال کیا ہوگی؟"

پھر وہ کچھ سوچ کر بولا "ہاں "گوشی کا اب بہت زیادہ دھیان رکھنا۔ اس کی کڑی نگرانی کی ضرورت ہے۔ کہیں وہ ہمارے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔"

میں شیلڈن کی باتوں سے قائل تو ہوگیا مگر مطمئن نہیں ہوا۔ جو دشمن اپنی بیٹی کو ٹوٹ کر چاہتا ہو وہ اس سے اتنی بے رخی سے پیش نہیں آ سکتا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر زینکو کو بیٹی کی پرواہ نہ ہوتی تو وہ سرے سے اس موضوع پر بات ہی نہ کرتا۔ میں عجب گومگو کی کیفیت میں واپس آگیا۔

کلارا' گوشی کے کمرے میں تھی۔ میں بھی وہیں چلا گیا۔ گوشی ابھی تک اداس تھی۔ اس کے باپ نے اگر بناوٹ سے بھی کام لیا تھا تو اپنی بیٹی پر ظلم کیا تھا۔ اسے زینکو کے رویے سے شدید صدمہ پہنچا تھا اور وہ چند ہی گھنٹوں میں برسوں کی مریضہ لگ رہی تھی۔

میں نے اس سے کہا۔ "گوشی! جو کچھ تمہارے باپ نے تم سے کہا' وہ سب ڈراما تھا۔ اگر اسے تمہاری پروا نہ ہوتی تو وہ کبھی ہم سے سودے بازی نہیں کرتا۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ ہانگ کانگ میں ہمیں گھیرتا' اپنے آدمیوں کی جان خطرے میں ڈالتا اور اب بھی وہ ہم سے سودے بازی کیوں کر رہا ہے؟"

میں نے دیکھا' میری بات گوشی پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

"میں نے اس وقت تمہیں نہیں بتایا تھا کہ فون پر تمہارے ڈیڈی سے بات ہو چکی ہے۔ اس کا ایک آدمی کل نیویارک پہنچ رہا ہے۔ ممکن ہے وہ خود بھی یہاں آ جائے۔ کیا کوئی ایسا شخص یہ سب کچھ کر سکتا ہے جسے اپنی بیٹی کی پروا نہ ہو؟"

"مگر ڈیڈی نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟" گوشی بچوں کی طرح مچلی۔

"میرے خیال میں اس کی دو وجوہ ہیں' پہلی یہ کہ اس کے خیال میں ہم نے زبردستی تم سے فون کرایا ہے' دوسری یہ کہ تم خود ہمارے ساتھ شامل ہوگئی ہو۔ دونوں صورتوں میں وہ تمہارے ذریعے ہمیں یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ اسے تمہاری پروا نہیں ہے۔ اگر یہ بات وہ براہ راست ہم سے کہتا تو اس پر بالکل یقین نہ کرتے' یقین تو خیر ہم نے اب بھی نہیں کیا ہے مگر تمہارا باپ تو شاید یہ سمجھ رہا ہے۔"

"مگر تم لوگوں نے مجھے یہاں قید کیوں کر دیا ہے؟ کیا مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

"قید کر دیا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں' اس کے بعد مجھے یہاں سے باہر نہیں نکلنے دیا گیا۔"
میں نے ہنس کر کہا۔ "اچھا۔۔۔۔ اچھا' یہ بات ہے۔ بھئی یہ قید نہیں' تمہاری حفاظت ہے۔ تم نے اپنے باپ کو فون کیا ہے تو اسے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ تم کس علاقے سے بول رہی ہو۔ ممکن ہے اس کے آدمی تمہاری تلاش میں ہوں۔ یہ صرف احتیاط کے طور پر کیا گیا ہے۔"
میری باتوں سے اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "مگر میں اپنے ڈیڈی کے پاس جاؤں گی نہیں۔"
اس کے لیے کوئی تمہیں مجبور بھی نہیں کرے گا۔ "میں نے دانستہ جھوٹ بولا۔ اس وقت میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ ہم نے اس کی واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔

میں اور شیلڈن ایک ساتھ میٹرو پہنچے تھے مگر ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تعلق تھے۔ میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور گہری نظر سے ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نپے تلے قدموں سے استقبالیہ کاؤنٹر تک گیا اور استقبالیہ کلرک سے کہا۔ "میں شیلڈن ہوں۔ میرا ایک مہمان یہاں مقیم ہوگا۔"
"جی ہاں' مسٹر بار پر روم نمبر سات سو گیارہ میں آپ کے منتظر ہیں۔" استقبالیہ کلرک کاروباری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولی۔
"تھینک یو ویری مچ!" شیلڈن اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔
میں بھی ٹہلتا ہوا لفٹ کی طرف چل دیا۔ شیلڈن ساتویں منزل پر اتر گیا۔ میں نویں منزل پر لفٹ سے اترا اور زینے کے ذریعے واپس ساتویں منزل پر آیا۔ کمرا نمبر گیارہ کا دروازہ بند تھا۔ میں کچھ دیر وہیں کوریڈور میں ٹہلتا رہا' پھر آواز آئی جیسے کوئی دیوار سے ٹکرایا ہو۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا' کوریڈور بالکل سنسان پڑا تھا۔ میں نے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ شیلڈن کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ سامنے کی طرف گھور رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اندر جاؤں یا باہر ہی ٹھہر کر شیلڈن کا انتظار کروں۔ پھر میں نے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے دروازے کو دھکیلنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ اندر سے بند ہے۔
میں دستک دینا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے کسی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں سرگوشی "دو منٹ مسٹر خرم!"
میں سن ہو کر رہ گیا اور آہستہ آہستہ مڑ گیا۔ بولنے والے کی شکل دیکھ کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہ پیٹر تھا۔ وہی پیٹر جس سے ہانگ کانگ میں میرا ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ وہ موساد

کا بہت خوفناک اور چالاک ایجنٹ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ برڈ کا قاتل تھا۔

"میں نے کہا تھا ناکہ کبھی نہ کبھی تم سے ملاقات ضرور ہوگی۔" پیٹر نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "تمہیں بھی مجھ سے ملنے کی حسرت ہوگی۔ تو آج تمہاری حسرت پوری ہوگئی۔"

"مجھے واقعی تم سے ملنے کی حسرت تھی۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کئی پرانے قرض بے باک کرنا ہیں۔"

پیٹر نے درشت لہجے میں کہا۔ "ایک بات اور ذہن نشین کر لو کہ آج ہم دونوں میں سے کوئی ایک زندہ رہے گا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ میں رہوں گا مگر میں تمہیں بھی زندہ رہنے کا پورا موقع دوں گا۔"

میں کوئی جواب دیے بغیر اسے گھورتا رہا۔ وہ جینز اور چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے پیٹر مجھ سے انتہائی دوستانہ ماحول میں گفتگو کر رہا ہو مگر میں جانتا تھا کہ اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور ہوگا جس کا رخ میری جانب ہوگا۔ میں ذرا سی بھی حرکت کرتا تو وہ مجھے گولی مار دیتا۔

"مجھے شبہ تھا کہ زینکو کی بیٹی کو تم ہی نے اغوا کیا ہے۔ وہ الو کا پٹھا اپنی بیٹی کی خاطر کروڑوں روپے کی دستاویزات تمہارے حوالے کرنے پر آمادہ ہوگیا ہے مگر میرا نام بھی پیٹر ہے۔ میں تمہیں کامیاب، نہیں ہونے دوں گا۔"

"ابھی تو میرے پاس کچھ نہیں ہے، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"زینکو کی بیٹی تمہارے قبضے میں ہے۔ ہم زینکو ایسے بااثر آدمی کو ناراض نہیں کرنا چاہتے ورنہ مجھے اتنی پریشانی نہ ہوگی۔ خاموشی سے میرے ساتھ چلو اور لڑکی کو میرے حوالے کر دو۔"

"لڑکی نیویارک میں نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ نیویارک میں ہے یا نہیں، وہ جہاں بھی ہے اسے میرے حوالے کرو۔"

"یار، وہ میری جیب میں تو ہے نہیں کہ نکالوں اور تمہیں دے دوں۔"

وہ گھوم کر میری پشت پر آیا اور جیکٹ کی جیب کے اندر ہی سے ریوالور کی نال میری کمر سے لگا دی۔ "خاموشی سے میرے ساتھ چلے چلو ورنہ میں فائر کرنے میں دیر نہیں کروں گا۔"

○

اندر سے پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی دھڑام سے فرش پر گرا ہو۔ پیٹر نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ میں گردن موڑے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ جونہی اس

نے دروازے کی طرف دیکھا، مجھے موقع مل گیا۔ میں بجلی کی سی تیزی سے بیٹھ گیا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے اس کے پیٹ میں پوری قوت سے گھونسا مارا۔ اس کے حلق سے 'اوہ' کی آواز نکلی اور وہ دہرا ہوگیا۔ میں اس دوران میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر کک ماری تو وہ اچھل کر دروازے سے ٹکرایا۔ اس کی ٹکر سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔ شیلڈن اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاید وہ اسی وقت دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔ میں بھی سرعت سے اندر داخل ہوگیا۔ شیلڈن نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ میں پیٹر کو موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار سنبھل جاتا تو اسے قابو کرنا مشکل ہو جاتا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ مسلح ہے اور موقع ملتے ہی ریوالور نکال لے گا۔ میں نے ایک دم اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے پشت سے دبوچ لیا۔ میں نے گھٹنا پیٹھ میں اڑا کے اس کی دونوں کلائیاں جکڑ لیں۔ اس نے سر سے میرے چہرے پر ٹکر مارنا چاہی مگر میں نے ایک طرف جھک کر اپنا چہرہ بچایا اور اس سے کہا۔ "میں جانتا ہوں پیٹر کہ تم بہت طاقت ور ہو مگر اس وقت طاقت استعمال مت کرنا ورنہ دونوں کلائیوں کے جوڑ نکل جائیں گے۔" پھر میں شیلڈن سے مخاطب ہوا۔ "اس کی تلاشی لو اور اسے باندھ دو۔"

شیلڈن نے پھرتی سے اس کی تلاشی لے ڈالی۔ اس کی ایک جیب سے مشین پسٹل اور دوسری سے پوائنٹ فور فائیور کا ریوالور نکلا۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنا بڑا ریوالور جیکٹ کی جیب میں کیسے آگیا۔ میں نے شیلڈن سے پوچھا تو اس نے یہ بتا کر میری الجھن رفع کر دی کہ شاید اس نے جیبیں خاص طور پر ریوالور رکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اس لیے معمول سے زیادہ بڑی ہیں۔

پیٹر کو باندھنے کے لیے اس نے باتھ روم کا تولیہ پھاڑ ڈالا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھنے کے بعد وہ مجھ سے بولا۔ "مسٹر سائن! زینکو کے آدمی کے پاس وہ چیزیں نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب ہے۔" میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

"جی ہاں، وہ یہی کہہ رہا تھا کہ وہ چیزیں مجھ سے کسی نے پہلے ہی لے لیں۔"

"کس نے لے لیں؟" میں الجھ کر بولا۔ "وہ ہے کہاں؟"

"اسے میں نے باتھ روم میں ڈال دیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ یہی کہہ رہا ہے کہ وہ چیزیں اس کے پاس نہیں ہیں۔"

میں جھلا کر باتھ روم کی طرف بڑھا۔ شیلڈن نے اس پر اچھا خاصا تشدد کیا تھا۔ اس کی آنکھ کے نیچے چوٹ کا نشان تھا، ہونٹوں سے بھی خون رس رہا تھا۔

"دیکھو مسٹر! سچ سچ بتا دو کہ وہ چیزیں کہاں ہیں ورنہ میرا ساتھی تمہیں یہیں ذبح کر دے گا۔"

”میں بتا تو چکا ہوں کہ کہ وہ بریف کیس اب میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے اب زندگی کی پروا بھی نہیں ہے۔ تم لوگ اگر چھوڑ بھی دو گے تو باس نہیں چھوڑے گا۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر گولی مار دیتا ہے‘ یہ تو اس کی بیٹی کی زندگی کا معاملہ ہے۔“

”پھر ہمیں اس آدمی کا نام بتا دو جس نے تم سے وہ بریف کیس لیا ہے۔“

”وہ آدمی باس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس کا نام پیٹر ہے اور موساد-----“

”میں جانتا ہوں ۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مگر اس نے تم سے بریف کیس لے کیسے لیا۔“

”بس وہ اچانک ہی کمرے میں گھس آیا اور گن پوائنٹ پر وہ بریف کیس مجھ سے چھین لیا۔“

”ٹھیک ہے‘ میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں باتھ روم سے نکل آیا۔ پیٹر اسی حالت میں پڑا تھا۔

”کیا ہوا‘ اس نے بتایا کچھ؟“

”ہاں‘ وہ بریف کیس اس کے پاس ہے۔“ میں نے شیلڈن کو بتایا۔

”بریف کیس کہاں ہے؟ شیلڈن نے لات مار کر پیٹر کو سیدھا کر دیا۔ پیٹر یوں مسکرایا جیسے شیلڈن نے اسے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

” شیلڈن! ایک بار پھر اس کی تلاشی لو۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسی ہوٹل کے کسی کمرے میں مقیم ہے۔ اس کی جیب میں کمرے کی چابی ہوگی۔ اس پر کمرہ نمبر درج ہوگا۔“

شیلڈن نے جلدی جلدی اس کی تلاشی لے ڈالی مگر کوئی چابی نہیں ملی۔ اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں ہوٹل کے کلرک سے اس کا کمرا نمبر معلوم ہو سکتا ہے۔“

”اس نے رجسٹر میں نہ جانے اپنا نام کیا لکھایا ہوگا۔“ پھر مجھے یاد آگیا کہ اس قسم کے بڑے ہوٹلوں میں غیر ملکیوں کا پاسپورٹ اور مقامی گھروں کا ڈرائیونگ لائسنس چیک کیا جاتا ہے۔

میں نے اس کا ڈرائیونگ لائسنس نکالا تو ہوٹل کی ایک رسید بھی نکل آئی۔ اس پر کمرا نمبر بھی درج تھا۔ میں نے شیلڈن کو وہیں چھوڑا اور لفٹ کے ذریعے بارھویں منزل پر پہنچا۔ پیٹر کا کمرا اسی منزل پر تھا۔ میں نے جیب سے تار نکالا جو میں اس قسم کے تالے کھولنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں تالا کھل گیا۔ ایک بریف کیس بیڈ کے سائیڈ پر رکھا ہوا تھا مگر اس میں پیٹر کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ مطلوبہ بریف کیس بیڈ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی۔ مگر وہ لاک تھا۔ میں نے احتیاط کے طور پر یہ دونوں بریف کیس اٹھا لیے اور دوبارہ اس کمرے میں پہنچا جہاں پیٹر کو چھوڑا تھا۔

شیلڈن نے زینکو کے آدمی کو باتھ روم سے نکال کر کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا دیا

تھا۔ میں نے دونوں بریف کیس اسے دکھا کر اصل بریف کیس کے متعلق پوچھا تو اس نے
اسی بریف کیس کی طرف اشارہ کیا جو مجھے بیڈ کے نیچے سے ملا تھا۔ اس نے مجھے لاک کا کمبی
نیشن بھی بتایا۔

میں نے بے تابی سے بریف کیس کھول لیا۔ اندر وہی خاکی لفافہ موجود تھا۔ جس میں
میں نے وہ دستاویزات اور مائیکرو فلمز رکھی تھیں۔ اس پر میری ہی تحریر میں "ٹاپ
سیکریٹ" بھی لکھا ہوا تھا۔

"اسے کھول دو۔" میں نے شیلڈن سے کہا۔ "ہمارا کام ہو گیا ہے۔"

"پیٹر کا کیا کیا جائے؟" شیلڈن نے پوچھا۔

"ہو سکے تو اسے کسی طرح میڈم کلارا کے بنگلے تک پہنچا دو۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس
سے اپنے کچھ قرض بیباق کرنا ہیں۔"

"ٹھیک ہے' یہ وہاں پہنچ جائے گا مگر اس کام کی فیس علیحدہ ہوگی۔"

"فیس کی فکر مت کرو بس تم اسے وہاں پہنچا دو۔" میں بریف کیس اٹھا کر دروازے کی
طرف بڑھ گیا۔

اس وقت میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ میری محنت رنگ لائی تھی
میرے دوستوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔ اب میں پہلی فرصت میں وہ بریف کیس
پاکستانی سفارت خانے کے کسی ذمے دار افسر کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔

میں وہاں سے سیدھا کلارا کے پاس پہنچا۔ بریف کیس دیکھ کر کلارا اور گوشی دونوں
خوش ہو گئیں۔ میں نے کلارا سے کہا میں اس امانت کو آج ہی سفارت خانے کے کسی افسر
کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ ٹیلیکس کے ذریعے پاکستان کے وزیر خارجہ کو بھی مطلع کر دوں
تاکہ یہ امانت بہ حفاظت واپس پاکستان پہنچ جائے۔ میں اور کلارا اسی وقت بریف کیس لے کر
نکل گئے۔

○

میرا پورا جسم نفرت کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ پیٹر میرے سامنے پڑا تھا اور میری
آنکھوں میں برڈ کی اذیت ناک موت کا منظر گھوم رہا تھا۔

"میں تیری بوٹی بوٹی نوچ کر' تجھے سسکا سسکا کر ماروں گا۔ یہودی کتے!" میں نے
سفاک لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر اس کے منہ پر بھرپور لات ماری۔ اس کے سامنے کے
دانت جھڑ گئے اور بری طرح خون بہنے لگا۔

وہ خون تھوک کر بولا۔" بندھے ہوئے شیر پر تو گلیوں کے آوارہ کتے بھی غرانے لگتے
ہیں' میرے ہاتھ پاؤں کھول دو' پھر دیکھوں تیری بہادری!" میں نے تجھے یا تیرے ساتھی

باندھ کر نہیں مارا تھا۔

"تیری یہ حسرت بھی پوری کیے دیتا ہوں۔" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"پاگل پن مت کرو خرم!" کلارا نے گھبرا کر کہا۔ "اس یہودی کی باتوں میں مت آؤ۔"

"ہاں خرم!" گوشی نے بھی میری خوشامد کی۔ "پلیز کلارا کی بات مان لو۔"

"تم لوگ بس یہ دھیان رکھنا کہ یہ بھاگنے نہ پائے۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے تو بے دریغ فائر کر دینا۔ ویسے تو باہر گارڈز بھی ہیں اور کتے بھی!" میں پیٹر ہی کا مشین پسٹل اور ریوالور کلارا اور گوشی کو دیتے ہوئے کہا۔ پھر آگے بڑھ کر پیٹر کے ہاتھ پیر کھول دیے۔

ہاتھ کھلتے ہی وہ الٹی قلا بازی کھا کر نہ صرف کھڑا ہو گیا بلکہ مجھ پر حملہ بھی کر دیا۔ اس کی لات میرے سینے پر پڑی۔ میں الٹ کے پیچھے گرا' بالکل ایسا لگا جیسے میرے سینے پر دس کلو کا ہتھوڑا مار دیا گیا ہو۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے پیٹر نے لات مار کے دوبارہ گرا دیا اور مجھے دبوچنے کے لیے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ یہی حرکت اسے مہنگی پڑی۔ میں نے پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور پہلے ہی جھٹکے میں سوکھی لکڑی کی طرح توڑ دی۔ پھر میں نے کھڑی ہتھیلی کا وار اس کے گھٹنے پر کیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے گھٹنے کا جوڑ چٹاخ کی آواز کے ساتھ نکل گیا۔ پھر تو گیا مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔

پیٹر تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ زندہ حالت میں اس کی کھال کھینچ لوں۔ میں نے میز پر رکھی ہوئی تیز دھار کی چھری اٹھائی اور جنونیوں کی طرح پیٹر کے جسم پر کئی چرکے لگا دیے۔

"کھڑا ہو اور مجھ سے مقابلہ کر!" میں نے اس کے پہلو میں لات مارتے ہوئے کہا۔ وہ ہانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ میں نے پھر اتنی بھرپور لات اس کے سینے پر ماری کہ وہ فرش پر گر کے مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ شاید میری ضرب سے اس کی کوئی پسلی ٹوٹ گئی تھی۔ پھر تو میں نے اسے لاتوں پر رکھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے سامنے پیٹر کی بجائے گوشت کا ایک لوتھڑا پڑا تھا۔ اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا اور روح جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

اسی رات کو گوشی میرے کہنے پر واپس ہانگ کانگ چلی گئی۔

○

ڈیفنس میں میرا شاندار گھر ہے' خوبصورت بیوی ہے اور پیارے پیارے تین بچے ہیں۔ کلارا نے مجھے اتنی محبت دی ہے کہ میری ساری محرومیاں دور ہو گئی ہیں۔ میں نے شہلا کی شادی رضا سے کر دی تھی۔ دونوں آج کل نیویارک میں رہتے ہیں۔ میں اور کلارا ہر مہینے نیویارک کا ایک چکر لگا لیتے ہیں۔

میرے بچے گوشی سے بہت مانوس ہیں۔ وہ بھی آج کل نیویارک میں رہتی ہے اور کلارا کی فرم کی ڈائرکٹر ہے مگر اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ میں اسے سمجھاتا ہوں کہ اب تمہیں بھی شادی کر لینا چاہیے تو وہ منہ پھلا لیتی ہے۔

مجھے اللہ نے اتنا دیا ہے کہ میں اسے اللہ کی راہ میں دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہوں' اس کے باوجود میری دولت بڑھتی جاتی ہے۔

مجھے برڈ شدت سے یاد آتا ہے۔ کبھی کبھی تو میں اسے یاد کر کے بچوں کی طرح رونے لگتا ہوں۔ خاص طور پر پچیس مئی کو! اسی دن تو برڈ کی برسی ہوتی ہے۔

آج بھی پچیس مئی تھی۔ میں ماضی میں کھویا ہوا تھا کہ میرے پانچ سالہ بیٹے ارسلان نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "ڈیڈی! مما کہہ رہی تھیں کہ آپ بہت اچھے جمناسٹ تھے۔ ڈیڈی کیا آپ جمناسٹ تھے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "میں جمناسٹ تھا نہیں بلکہ اب بھی ہوں۔"

"ڈیڈی!---- مجھے بھی ---- جمناسٹک سکھا دیجئے۔"

"نہیں۔" میں پوری قوت سے چیخا اور ارسلان کے منہ پر زور دار تھپڑ مارا۔

وہ زندگی میں پہلی بار میرے ہاتھ سے پٹا تھا اس لیے یوں بلک بلک کر رویا کہ میرا دل پھٹنے لگا۔ میرے چیخنے کی آواز سن کر کلارا دوڑتی ہوئی وہاں آگئی اور وحشت زدہ ہو کے بولی۔ "کیا ہوا۔ کیا ہوا بنٹی؟" وہ ارسلان کو پیار میں بنٹی کہتی تھی۔

وہ سسکتے ہوئے بولا۔ "میں نے ڈیڈی سے کہا تھا کہ مجھے بھی جمناسٹک سکھا دیں۔ ڈیڈی نے مجھے پہلے تو ڈانٹا پھر زور سے تھپڑ مارا۔"

کلارا جھٹکے سے میری طرف مڑی۔ "آخر اس میں اتنا ریش ہونے کی کیا بات تھی؟"

"میں نہیں چاہتا کلارا کہ کوئی دوسرا خرم پیدا ہو۔ میں اپنے بچوں کو اس خرم کے سائے سے بھی دور رکھنا چاہتا ہوں جو زمانے کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ اس سے کہہ دو آئندہ مجھ سے ایسی کوئی بات نہ کرے۔"

ارسلان آہستہ آہستہ میرے پاس آیا اور اپنے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "سوری ڈیڈی! پلیز مجھے معاف کر دیں۔"

میں نے ایک دم اسے سینے سے لگا لیا۔ بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے مگر یہ خوشی کے آنسو تھے۔

○

ختم شد